کلامِ ہمایوںؔ

پیغامِ عمل

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

ہے رہنمائے خلق عمل جس کے نیک ہوں
کافر ہو وہ عقیدہ میں یا دین دار ہو

بہتر ہے گر عمل سے عقیدہ ہُوا کرے
ایسے سبق ہمیں نہ پڑھایا کرے کوئی

ہمایوں! تیرے مدفن پر بنائیں مقبرہ کیوں ہم؟
یہاں حُسنِ عمل ہے سب سے بہتر یادگاروں میں

حضرتِ ہُمایوںؔ (مرحوم)

بزمِ ہُمایوں

کم از کم آج کل کی دُنیا میں ہمارا مشاہدہ اور تجربہ ہمیں یہ بتاتا اور سکھاتا ہے کہ زندگی میں ترقی کشمکش سے ہے۔ یہ بات اب ہر کہ و مہ کی زبان پر ہے کہ زندگی نام ہے جدوجہد کا۔ بلکہ بعض تو لگی لپٹی چھوڑ کر صاف صاف صرف یہی نہیں کہتے کہ صلح چاہتے ہو تو جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ بلکہ مسولینی کی طرح ڈنکے کی چوٹ اعلان کرتے ہیں کہ جنگ زندگی کی ترقی کے لئے لازم ہے۔ یہ بات درست ہو نہ ہو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جہاں جمود آیا، وہاں زندگی غائب ہوئی اور ترقی کے معنی ہیں عمل اور ردِ عمل اور پھر عمل اور پھر ردِ عمل !

یہ بات ہماری زبان اُردو پر بھی خوب صادق آتی ہے۔ ایک زندہ زبان جو ہندوستان بھر میں سمجھی جائے اور جا بجا بولی جائے، صاف ستھری، نکھری ہوئی، دلکش اور اور دلکشی پانے والی، وسیع اور اور وسعت پا سکنے والی صحیح معنوں میں ملک کی قومی و ملکی زبان لیکن کبھی کبھی جو اسے جھپکی سی آگئی تو ہندی والوں نے آکر اسے جھنجھوڑا اور جگایا اور پھر ذرا اُونگھنے لگی تو پھر اُن بے چین ترقی والوں نے اسے آچھیڑا۔ خیر یار سے چھیڑ چلی جائے اسد۔ دن ہارے سونا بُرا ہے خواہ وہ کسی شیر کا سونا ہی کیوں نہ ہو۔ بہرحال خدا کا شکر ہے کہ اُردو کا شیر پھر دھاڑ رہا ہے !

اُردو کو اگر ہندی بعض جگہوں سے نکالنے کی کوشش کر رہی ہے اُردو کو اگر بعض ہندو چھوڑنے میں مصروف ہیں تو اس میں زیادہ حرج نہیں۔ اُردو میں اور ہندو مسلمان اُردو والوں میں اگر جان باقی ہے اور یقیناً جان باقی ہے اور وہ مصروفِ عمل ہے اور اَور زیادہ مصروف و کوشاں ہونے والی ہے پھر اس حال میں ایسی بناوٹی مخالفت سے مطلق نہ گھبرانا چاہئے۔ یہ مخالفت ہمارے لئے ایک موقع ہے اپنے عمل کے لئے اور آخرکار ایک زیادہ صحیح باہمی موافقت کے لئے۔

پچھلے دو سال میں اُردو کی دُنیا میں جو اہم واقعات ہوئے اُن کی مختصر ڈائری یہ ہے :-

قبل ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۶ء میں : گاندھی جی کی کوششیں ہندی کے لئے اور اُردو کے خلاف

۱۲ اپریل ۱۹۳۶ء : اُردو اجلاس۔ انجمن حمایت اسلام لاہور

۲۴ ″ ″ : بھارتیہ ساہتیہ پرشد کا اجلاس (جس میں ہندی اکھوا ہندوستانی کا شگوفہ پھوٹا)

۸ مئی ″ : انجمن اُردو پنجاب کا قیام۔

۲۴ اکتوبر ″ : آل انڈیا اُردو کانفرنس علی گڑھ

۱۹۳۷ء : گاندھی جی کی کوششیں بدستور ہندی کے لئے اور اُردو کے خلاف مصالحانہ رنگ میں۔

مارچ ۱۹۳۷ء — : ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ میں شعبۂ اُردو کا اجلاس۔

۴ر اگست ۱۹۳۷ء : پنڈت جواہرلال نہرو کا رسالہ "زبان کا مسئلہ" شائع ہوا۔

۳۰ر " " : بہار کمیٹی کے سلسلے میں مولوی عبدالحق اور راجندر بابو کا مشترکہ بیان

۱۷ اکتوبر " آل انڈیا مسلم لیگ منعقدہ لکھنؤ کی قرارداد زبان سے متعلق۔

اِن واقعات کے ساتھ ساتھ اُردو ہندی لیڈروں کی تُو تُو میں میں برابر جاری رہی۔

گاندھی جی کی کارروائیوں کو دیکھ کر بابو سندر لال جی نے ایک خط اُن کے نام لکھا جس میں اُن پر واضح کیا کہ اُردو اکثر ہندوؤں کے گھر کی زبان ہے اور وہ ہندی جسے گاندھی جی اور بعض اور ہندو لیڈر رائج کرنا چاہتے ہیں فقط ایک کتابی اور "تصاوی" زبان ہے جو کہیں بولی سمجھی نہیں جاتی۔ سیّد محمود کے جواب میں پنڈت جواہرلال نے لکھا کہ زبان کے سوال کو خواہ مخواہ ایک فرقہ وارانہ سوال بنا لیا گیا ہے اور یہ بھی لکھا کہ خود میری زبان اُردو ہے۔ ڈاکٹر تاراچند کی "اُردو ہندی" کے مقابل میں مولانا ابوالقاسم نے اپنی ٹھیٹ اُردو کی لکھت رکھ دی اور پھر اپریل ۱۹۳۷ء میں مہاتما جی سے بھی ایسی ہی دو دو ٹھیٹ باتیں کر کے اُردو کے تیس صفحوں اور ناگری کے سو صفحوں میں لکھوا کر پیش کر دیں۔ ابھی دو ماہ ہوئے اس "ہندی کی چندی" کی آخری لاجواب قسط مولانا نے پھر ڈاکٹر صاحب کے نام نشر کی ہے۔ انہوں نے اپنے ایکتا، کولاہل، رکشا، سمبندھ، دشا کی بابت لکھا تھا کہ ہماری طرف کے ہر شہر اور گاؤں میں لوگ انہیں بولتے اور سمجھتے ہیں۔ اُنہوں نے الہ آبادی ہندوؤں سے پوچھا تو وہ کانوں پر ہاتھ دھرنے لگے کہ ہم نے یہ شبد نہ کبھی دیکھے نہ سُنے۔ مولانا نے ڈاکٹر صاحب کو یہ بتا کر پوچھا ہے کہ آخر جیسی اُردو وہ ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۵ء میں لکھتے تھے کیا مصیبت آ پڑی کہ اُس کی جگہ اب وہ ایک جناتی سی زبان لکھنے لگے۔ اب "مقصد" کی جگہ کیوں "ادیدیش" نے لے لی؟ اخیر میں مولانا نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ ایک کمیٹی ہندو مسلمانوں کی بنائی جائے جس میں فریقین ایک دوسرے کے مشکل لفظوں کی جگہ آسان عام فہم لفظ تجویز کریں اور یوں ایک قومی سمجھوتے پر پہنچ جائیں۔

پنڈت جواہرلال نہرو نے زبان کے مسئلے کا جو حل پیش کیا ہے وہ گو بظاہر معقول معلوم ہوتا ہے مگر مولوی عبدالحق صاحب نے خوب لکھا ہے کہ پنڈت جی بھی ہندی والوں کے ہنگامے سے متاثر ہیں اس کے علاوہ یہ غلط ہے کہ ہندوستان میں صرف وہ بارہ زبانیں ہی زبانیں سمجھی جائیں جو نہرو صاحب نے گنوائی ہیں۔ نہ یہ درست ہے کہ اُردو شہروں کی اور ہندی دیہات کی زبان ہے۔ اور اصطلاحوں کا مسئلہ خاصا پیچیدہ ہے۔ آخر میں مولوی صاحب نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اُردو کی کتابیں لازم ہے کہ اُردو کے ادیب ہی تیار کریں ورنہ خواہ مخواہ زبان خراب ہو جائے گی اور تنبیہ کی ہے کہ دیہاتیت کی قربان گاہ پر ملک کی ترقی کو بھینٹ نہ چڑھا دینا چاہئے۔

جناب سکرٹری صاحب انجمن ترقیٔ اُردو مبارک باد کے مستحق ہیں کہ اُنہوں نے گذشتہ سال میں مدراس اور ملیبار اور بہار اور ناگپور اور لکھنؤ اور کئی اور مقامات کا دَورہ کر کے ہر جگہ اُردو کی بنیادیں مضبوط کیں۔ مانا کہ ہندی والے روپے پیسے والے ہیں اور اُردو والوں کے ہاں چند پھوٹی کوڑیاں ہی ہیں لیکن دُنیا دیکھے گی کہ اُردو اور اُردو والوں کے دل کھرے ہیں اور اگر قدرت کو ہمارے وطن کی بہتری منظور ہے تو یہ مُلکی ترقی کی ترازو میں ضرور پورے اُتریں گے۔

انجمنِ اُردو پنجاب نے بھی اپنی بساط کے مطابق پچھلے پونے دو سال میں کچھ نہ کچھ کام کیا۔ کم از کم ۲۳ جلسے ہوئے اور ۲۳ بار ریڈیو پر تقریریں بھی ہوئیں۔ علاوہ بریں اخبارات و رسائل میں مضامین شائع ہوئے اور مذاکرے اور مختلف اُردو مساعی ہوتی رہیں۔ آئندہ کے لئے ارادہ ہے کہ اُردو کا عوام سے ایک زیادہ گہرا تعلق پیدا کیا جائے اور انشا پردازوں کو بیش از بیش موجودہ تحریکات کی طرف متوجہ کیا جائے۔

پچھلے سال ہمارے ملک میں جو اہم سیاسی تبدیلیاں ہوئی ہیں اُس کا ہمارے ادب پر نمایاں اثر پڑا ہے۔ کئی ادیب ادب کا چولا اُتار کر سیاست کے میدان میں اُتر آئے ہیں اور یہ کچھ تعجب کی بات نہیں۔ نپولین نے جب جرمنی پر حملہ کیا اور وہاں کی قومی زندگی میں ایک ہلچل مچ گئی تو کئی جرمن ادیب ادب کو چھوڑ کر سیاست میں حصّہ لینے لگے۔ ہم یہ تو نہیں چاہتے کہ ہمارے ادیب اُردو سے دامن چھڑا کر اپنے گلے سے صرف سیاسی پھندا اٹکا لیں کیونکہ ادب بھی آخر ملکی و انسانی زندگی کا ایک مظہر ہے لیکن ایک ایسے وقت میں جب ملک کی تمام زندہ قومیں اُس کے سیاسی محاذ پر جمع ہو رہی ہیں ادیبوں کا اپنی قوم کے نعرے پر لبیک کہنا مناسب و موزوں ہے۔ ہاں یہ ہرگز نہ ہونا چاہئے کہ اس سے غیر جانبدار ادب کا پاکیزہ دامن کسی سطحی اور نا صاف سیاست سے آلودہ ہو جائے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اُردو کے علمی و ادبی رسالے "کانگرسی" اور "لیگی" اور "اتحادی" بن رہے ہیں۔ خدا کرے یہ سب قوم کے مختلف فرقوں کو یگانگت کی راہ دکھائیں اور اُس سرد مزاجی اور معقولیت سے کام لیں جو سچے ادیبوں کی شان کے شایاں ہو۔

ہمایوں کے صفحات ہمیشہ ہر خیال کے ادیبوں کی معقول جولانیوں کے لئے کھلے ہیں۔ زبان کے معاملے میں ہمایوں روادار ہے لیکن اُردو کی نگہداشت کرنے میں اُس کا اعتقاد ہے کہ "وفاداری بشرطِ اُستواری اصل ایماں ہے"۔ اگر اُردو رسالے ہی عملی طور پر اُردو کی حمایت نہ کریں گے تو اُنھیں زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اس کے علاوہ کیا یہ واقعہ نہیں کہ اُردو اور صرف اُردو ہی ہندوستان کی ملکی زبان ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے؟ یہ درست ہے کہ حاسد مخالفین فضول خاک اُڑا رہے ہیں لیکن "کہیں خاک ڈالے سے چھپتا ہے چاند؟" البتہ ہندوستان کی دوسری زبانیں اس چاند کے ساتھ تارے بن کر چمکیں تو ہمارے سر آنکھوں پر!

گزشتہ سال ہمایوں میں "پنجاب میں بہن کے ترانے" اور لالہ طور کے ہندی ترجمہ "کیلاش کنول" کی اشاعت سے ہمارا رویہ صاف ظاہر ہے۔ پنجاب کی علمی و تمدنی زبان اُردو ہے بہت سے پنجابیوں کی بولی پنجابی ہے۔ اور ہندی اُردو کی چھوٹی بہن ہے۔ اُردو کا حلقہ اتنا وسیع ہے کہ اگر یہ زبانیں اپنی اپنی فطری اور مخصوص جگہوں میں کام کرتی رہیں تو اُردو اور یہ سب کی سب، اُردو کی رہنمائی میں، ملک و قوم کی بڑی خدمت سرانجام دے سکتی ہیں۔

بشیر احمد

جہاں نما

۱۹۳۷ء کے اہم واقعات یہ تھے :-

یکم جنوری :- جناح کی اپیل ہندو مسلم اتحاد کے لئے۔

۲۴ " :- فرانس اور ترکی کا سمجھوتا اسکندرونہ کے متعلق۔

۳۱ " :- ماسکو میں تیرہ ملزموں کو پھانسی کی سزا۔

:- کونسلوں کے انتخابات میں ہندوستان کے چھ صوبوں میں کانگرس کی فتح۔

۲۴ مارچ :- حبشہ میں اطالویوں کے ہاتھوں چھ ہزار باشندوں کا قتل۔

یکم اپریل :- نئے دستور کے نفاذ پر ہندوستان میں ہڑتال۔

۱۲ مئی :- شاہ انگلستان کی تاج پوشی۔

۲۷ " :- مصر لیگ کا رکن بنا۔

۱۲ جون :- کمال اتاترک نے اپنی ساری جائداد قوم کی نذر کر دی۔

۲۴ " :- فلسطین کی کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی۔

۷ جولائی :- کانگرس نے عہدے قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔

۳۱ " :- انڈمان کے قیدیوں کی بھوک ہڑتال۔

۴ اگست :- گاندھی جی کی وائسرائے سے ملاقات۔

۹ " :- جاپانی فوجیں پیپنگ میں داخل ہوئیں۔

۳۰ " :- چین اور رُوس کے درمیان ایک غیر جارحانہ معاہدہ ہُوا۔

۱۹ ستمبر :- امریکہ نے اعلان کیا کہ وہ دوسری قوموں کی لڑائی میں حصّہ نہ لے گا۔

۲۶ " :- مسولینی اور ہٹلر کی ملاقات۔

۴ اکتوبر :- انگلستان اور فرانس نے اطالیہ سے درخواست کی کہ وہ سپین سے اپنے رضاکار واپس بُلالے۔

" " :- لیگ کمیٹی نے رپورٹ کی کہ جاپان چین پر زبردستی کر رہا ہے۔

۱۵ " :- آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہُوا۔

۵ نومبر :- اطالیہ اور جرمنی اور جاپان نے آپس میں ایک معاہدہ کیا۔

۲۸ ؍ :- فرانسیسی وزیروں نے لندن میں آکر برطانیہ سے بین الاقوامی حالات کے متعلق گفتگو کی۔

۲۹ ؍ :- گائے کی حفاظت کے لئے ایک آل انڈیا نسوانی کانفرنس کلکتہ میں منعقد ہوئی۔

۱۰ دسمبر :- جاپانیوں نے چینیوں کو زبردست شکستیں دے کر نانکن کو فتح کر لیا۔

اس نقشے پر نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ سال کے قابل غور اور اہم ترین واقعات یہ ہیں:-
ہندوستان میں کانگرس کی کامیابیوں کی وجہ سے ایک نئی صورت حالات پیدا ہوگئی ــــــ فلسطین کی کمیشن کی رپورٹ کے مطابق فلسطین کی مجوزہ تقسیم سے ساری اسلامی دنیا میں ہلچل مچ گئی۔ ــــــ جاپان نے دنیا بھر سے بے پروا ہو کر چین پر دھاوا بول دیا ہسپانیہ میں اشتراکیت اور فاشیت کی جنگ شد و مد سے جاری رہی۔ ــــــ دول عظمےٰ کے دو بڑے گروہ بن گئے، ایک طرف جرمنی اطالیہ اور جاپان اور دوسری طرف رُوس فرانس اور غالباً انگلستان۔ ــــــ اور حسد رقابت خودغرضی اور شیطنت کی تاریکیوں میں ایک نئی آنے والی جنگِ عالمگیر کی بجلیاں دُور افق پر چمکنے لگیں۔

اب مختلف ملکوں پر نظر ڈالو کہ اُن کا کیا حال رہا؟
انگلستان اپنے نئے بادشاہ کو تخت پر بٹھا کر اپنی وسیع سلطنت کے بچاؤ کے لئے جوڑ توڑ کرتا رہا۔ کبھی اطالیہ سے گفت و شنید کبھی جرمنی سے بات چیت، کبھی فرانس سے صلاح و مشورہ اور اندر ہی اندر خدا جانے کس کس سے کیا باتیں مگر سب کا مدعا صرف اِک یہی کہ کسی طرح بغیر لڑے برطانوی سلطنت قائم رہے۔ غالباً انگلستان جرمنی کو چند نوآبادیات دینے پر کم از کم دل میں راضی ہو چکا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اِک عرصے سے انگریزوں کی قومی حکومت میں کمزوری اور خوف و ہراس کے آثار پیدا ہو رہے ہیں اور جنگی تیاریاں محض مجبوراً کی جا رہی ہیں۔ انگلستان کی سلطنت اتنی وسیع اور اُس کی ذمہ داریاں اتنی سخت ہوگئی ہیں کہ انگلستان کی حکمت عملی مضبوط اصُول پر قائم نہیں رہی۔

فرانس انگلستان سے بھی زیادہ بزدلی سے کام لے رہا ہے۔ دقت یہ ہے کہ فرانس میں حسب معمول پارٹی بازی جاری ہے اور گو وہاں کی حکومت آج کل اشتراکی ہے لیکن ساڑھے چار کروڑ میں سے دو کروڑ باشندے اشتمالیت کے سخت مخالف ہیں۔ اس اختلاف سے قومی طاقت میں ضعف پیدا ہوگیا ہے۔

رُوس میں اشتمالیت کی جڑیں مضبوط ہو رہی ہیں اور گو گاہے گاہے عجیب و غریب سازشوں کا انکشاف ہوتا ہے اور حکومت جبر و تعدی پر بھی اُتر آتی ہے لیکن دسمبر ۱۹۳۶ء کے نئے جمہوری نظام کے نفاذ نے جس میں فرد کی آزادی اور دیہاتیوں کے حقوق کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے حکومت کو اندرون ملک میں اور متمدن دُنیا میں ہر دلعزیز بنا دیا ہے۔ ۲ کروڑ گھرانے مشترکہ قطعات اراضی میں جن کا رقبہ ۲۸ کروڑ ایکڑ ہے حصہ دار ہیں۔ چند ماہ ہوئے ایک

پادری نے لکھا ہے کہ یہ خیال کہ رُوس کی تہذیب محض مادی ہے غلط ہے، مثلاً وہاں یہ خلافِ تہذیب سمجھا جاتا ہے کہ کوئی زیادہ جنسیت پرست ہو یا غلیظ رہے۔ بدکاری کا پیشہ نام کو باقی نہیں رہا۔ مرد عورت کے تعلقات شریفانہ ہیں، خاندانی زندگی مضبوط ہے، بچوں سے لگاؤ ہے، نوجوان صفائی پسند ہیں۔ رُوس کے اخلاق کی بنا اس کی جدوجہد پر ہے کہ انقلاب اعتماد کے بغیر نہیں چل سکتا اور رُوسیوں کا خیال ہے کہ انقلاب کے بعد بھی انسانی فطرت کی قدرتی نیک روش اُسے بھلائی پر قائم رکھے گی۔ رُوس میں شادی رجسٹری کے ذریعے یا فریقین کی رضامندی سے ہو سکتی ہے۔ ناجائز بچے ناجائز نہیں سمجھے جاتے لیکن اس کے باوجود ان کی کثرت نہیں ہے۔ البتہ نئی آزاد طرزِ زندگی کی وجہ سے رُوسی سوسائٹی میں بھی کئی خرابیاں موجود ہیں جن کا خود رُوسی افسر رینگو نے اپنے ایک مقالے میں اعتراف کیا ہے اور رُوسیوں کو تنبیہ کی ہے کہ انہیں دُور کریں۔ رُوسی حکومت کم از کم اپنے نظام کی بعض کوتاہیوں کو نہیں چھپاتی کیونکہ اُس کی رائے میں اُن کا چھپانا رُوس میں اشتراکیت کو بجائے مضبوط کرنے کے کمزور کر دے گا۔ رُوس امن پسند ہے لیکن موجودہ حالات کے پیش نظر وہ جنگی تیاریوں میں دن رات مصروف ہے۔ اس وقت فوج کی تعداد ۱۳ لاکھ ہے اور اس کے علاوہ ایک کروڑ سپاہی بوقتِ ضرورت طلب کیے جا سکتے ہیں۔ رُوس کی ہوائی طاقت زبردست ہے۔ ہوابازی بہت ہر دلعزیز ہے۔ ۱۹۳۶ء کے پہلے چھ ماہ میں ۵۰۰،۰۰۰ غیر فوجی ہوائی جہازوں سے نیچے کودے۔ فوجی ہوابازوں کی تعداد اس وقت ایک لاکھ ہے۔

امریکہ میں بڑے بڑے سرمایہ داروں کی مخالفت کے باوجود پریذیڈنٹ رُوزولٹ کا انتخاب عوام کے جمہوری خیالات کی کامیابی کا مظاہرہ ہے۔ رُوزولٹ "بھولے بسرے آدمی" کا محافظ اور صحیح قسم کی جمہوریت کا علم بردار ہے۔ بین الاقوامی معاملات میں امریکی حکمتِ عملی اُلجھن میں پڑی ہے۔ اِدھر وہ کسی جنگ میں حصہ لینا نہیں چاہتی اُدھر جاپان کی بڑھتی ہوئی طاقت اُسے اور مسلح اور مضبوط ہونے پر مجبور کر رہی ہے۔

جرمنی میں شہری آزادی کا جنازہ کبھی سے ہٹلر کے کندھوں پر نکل چکا ہے۔ قیدی بارکوں میں معمولی قصور کی بنا پر موت کی سزا مل سکتی ہے۔ مشہور جرمن مصنف ایمل لڈوگ نے حال میں لکھا ہے کہ سارے اعلےٰ جرمن مفکروں کو دیس نکالا دیا جا چکا ہے اور جرمن آزادی کی روایات کا باقاعدہ قلع قمع کیا گیا ہے۔ جرمن بچوں میں کس طرح فوجی خیالات ٹھونسے جاتے ہیں اس کی ایک مثال جرمن سکولوں کی ایک حساب کی کتاب میں دیکھو جس میں ایک یہ سوال درج ہے کہ جنگِ عالمگیر میں جرمنی اور اُس کے حلیفوں نے ۱۰،۰۰۰،۰۰۰ سپاہی تیار کیے اور جرمنی کے دشمنوں نے ۴۲،۰۰۰،۰۰۰۔ بتاؤ کہ جنگ کے محاذ پر جرمنوں کے ہر دس سپاہیوں کو کتنے اتحادیوں کا سامنا کرنا پڑا! یورپ میں جرمنی مرکزی اور مشرقی یورپ میں اقتدار بڑھانا اور سپین سے خام پیداوار حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یورپ سے باہر وہ اپنی کھوئی ہوئی نوآبادیات پھر حاصل کرنا چاہتا ہے۔ آسٹریا اُس کے زیر اثر ہے۔ چیکوسلوویکیا اُس سے ڈر رہا ہے۔ انگلستان گا ہے گاہے اُس کے ساتھ ساز باز کرتا ہے اور اطالیہ اور جاپان کے ساتھ اتحاد ہونے کی وجہ سے اُس کی قوت اور رُعب میں واقعی خاصا اضافہ ہو گیا ہے اور وہ رُوس پر علانیہ دانت پیس رہا ہے لیکن بعضوں کا خیال ہے کہ یہ محض گیدڑ بھبکیاں ہیں اور جرمنی کی اندرونی حالت اچھی نہیں!

اطالیہ حبشہ کو ظلم و تعدی سے دبا رہا ہے۔ سپین میں وہ فاشیت کا جھنڈا اُڑا رہا ہے اور بحیرۂ روم میں اپنی بحری و ہوائی طاقت کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ وہ اور جرمنی دونوں کا ایک سا حال ہے۔ دونوں کے ہاں ملکی آزادی مفقود ہے لیکن باہر دُنیا میں وہ خوب آپ اپنا ڈنکا بجا رہے ہیں اور دوسروں کی خوشحالی کو دیکھ کر چلاتے ہیں کہ ہم جب چین سے بیٹھیں گے اور بیٹھنے دیں گے کہ اس صدیوں کی لوٹ

مارہیں سے جس پر آج آپ امن اور شائستگی کے ساتھ قابض ہیں ہمیں بھی حصّہ دیا جائے۔

جاپان اب اس قدر طاقتور ہے کہ اُسے کسی کی پروا نہیں۔ وہ اطالیہ اور جرمنی کا ہم خیال ہے اور حلیف۔ یورپ دُور اپنے مناقشات میں غرق ہے یہ ادھر بھاری بھرکم چین کی گت بنانے میں مصروف ہے۔ وہ کم از کم مشرقی ایشیا کا راہنما اور حاکم بننا چاہتا ہے۔ جاپان نے یہ طاقت بڑی محنت سے حاصل کی ہے۔ جاپان کے ۹۹ ½ فی صدی بچے تعلیم پاتے ہیں۔ مشرق سے اور مغرب سے جو کچھ بھی جاپانی سیکھ سکتے ہیں وہ سیکھنے میں مصروف ہیں۔ امریکہ اور یورپ میں طلبہ سال میں تقریباً ۱۵۰ دن سکول جاتے ہیں جاپان میں ۲۲۰ سے لے کر ۲۴۰ دن تک۔ اُن پر بوجھ اتنا ہے کہ سال بھر میں ۳۰۰۰ جاپانی طلبہ خودکشی کرتے ہیں مگر اس پُرہمت قوم کو اس قربانی کی پروا نہیں۔ پچھلے سال میں اس جفاکش شگفتہ قوم نے ورزش اور ریاضت سے اپنا قد اوسطاً ایک انچ بڑھا لیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج اس قوم کا کوئی دوسری کالی گوری یا پیلی قوم مقابلہ نہیں کرسکتی۔ جاپانی جانتے ہی نہیں کہ سردی، بھوک یا تکان کیا چیز ہے۔ حیف ہے کہ ایک ایسی عظیم الشان قوم ایک کمزور پڑوسی کو اپنے پاؤں تلے روندنا اپنے لئے باعثِ ننگ نہ خیال کرے!

چھوٹی قوموں میں ترکی نہایت استقلال کے ساتھ اپنے کمال کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے اور کمال کی دُوراندیش حکمت نے افغانستان ایران اور عراق کے ساتھ مل کر اسلامی ریاستوں کے ایک ایسے اتحاد کی بنیاد رکھی ہے جس سے اسلام کا بکھرا ہوا شیرازہ پھر جمع ہو رہا ہے۔

فلسطین کی مجوزہ تقسیم نے اسلامی دُنیا میں ایک ہلچل مچا دی ہے۔ برطانیہ کی یہود نواز پالیسی نے یہودیوں کو دُنیا کے کونے کونے سے لاکر فلسطین کے ساحلوں پر لا ڈالا ہے اور اب دس لاکھ عربوں کے مقابل میں اُن کی آبادی پانچ لاکھ کے لگ بھگ ہے ملک کا زرخیز ساحلی حصّہ بیشتر یہودیوں کو بخش دیا گیا ہے۔ صحرائی علاقہ عربوں کی نذر کیا گیا ہے اور بیت المقدس کا علاقہ انگلستان کے تصرف میں رکھا گیا ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے کہ انگلستان کی شہنشاہیت کے لئے فلسطین کی بندرگاہیں اور ہوائی مرکز ضروری ہیں۔

چین کو اکیلا پاکر جاپان اُس پر جھپٹ پڑا ہے۔ چین اتحاد و تنظیم کا سبق پڑھ رہا ہے لیکن بہت دیر میں۔

ہندوستان کی پچھلے سال کایا پلٹ گئی ہے۔ کانگرس اب سات صوبوں میں حکمران ہے اور گو مسلمانوں کی اکثریت اُس کے ساتھ نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اُس نے شہنشاہیت کا زور توڑنے اور ایک جمہوری سی حکومت قائم کرنے میں بڑا بھاری ملکی کام سرانجام دیا ہے۔

دنیا کا تمدّن اِس وقت ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہے۔ سیاسی اور معاشی اور معاشری اور اخلاقی تحریکات کی نئی روش دُنیا کو ایک اَور دُنیا بنا رہی ہے۔ جنگ کے بعد کئی چھوٹی قوموں کو آزادی کی نعمت ملی لیکن پچھلے چند سالوں سے طاقتور قوموں میں طاقت اور رعونت کا ایسا خبط سمایا ہے کہ کمزور قوموں کے لئے عرصۂ حیات تنگ ہو رہا ہے۔ پہلے حبشہ مٹا اب چین مٹ رہا ہے کہیں چیکوسلوویکیا کانپ رہا ہے کہیں ترکی نئے جہاز خرید رہا ہے کہ مبادا کوئی بد دماغ آدھمکے۔ پھر ایک طرف اشتراکیت کی دھمکیاں دوسری طرف فاشیت کے دعوے ہیں اور پاس ہی جمہوریت اور شاہنشاہیت اپنی دلائل اور فریب کاریاں پیش کر رہے ہیں۔ اِن سب میں ایک عالمگیر نتیجہ خیز جنگ

آج

(نوروز)

آج میں ہوں اور میری زندگی
زندگی، رخشندگی، تابندگی!

سامنے پھیلا ہوا ہے اک جہاں
آج میں ہوں اور زمین و آسماں!

دیکھ اے دل دیکھ اُفق کی سمت تو
ہے طلوعِ آفتابِ آرزو!

کیا ہوا کیا روشنی ہے کیا فضا
رُوح پرور دل کُشا جنت نما!

آگیا بس آج جینے کا مزا
زندگی ہے اک نظارہ آج کا

دل میں اُٹھتی ہیں اُمنگیں صد ہزار
زندگی! اے بحرِ ناپیداکنار

بشیر احمد

اُستاد اور شاگرد

اُستاد نے گھُرکی دی اور غائب ہوگیا کم از کم اس تصویر میں غائب ہے اور شاگرد کوئی حیران ہے کوئی خفا ہے اور اکثر ڈر گئے ہیں، جھجک رہے ہیں۔ اِدھر دُنیا اب محض "جورِ اُستاد بہ زمہرِ پدر" کہہ کر مطمئن نہیں ہوجاتی بلکہ دیکھنے والے زیادہ تر اس حیرانی اور خفگی اور ڈر اور جھجک کے سمجھنے والے ان سے ہمدردی رکھنے والے اور اِن کی مدد کرنے والے ہیں۔

وہ زمانہ گیا کہ جنابِ اُستاد کی سخت کلامی اور سخت گیری آسمانی رہنمائی سے تعبیر کی جاتی تھی اور ماں باپ بھی اپنے بچے کو پٹتے دیکھ کر اور اسے ایک روحانی ریاضت جان کر باعثِ سعادت تصوّر کرتے تھے۔ اب تو ایک غلط انداز نظر بھی اُستاد کے لئے ایک گناہِ کبیرہ سمجھی جاتی ہے کبھی اُستاد کی مطلق العنانی تھی، اب شاگرد کی آزادی کا زمانہ ہے۔ اُس وقت شاگرد کو قدم قدم پر اُستاد کے تیور دیکھنے پڑتے تھے۔ اب اُستاد کو بات بات میں شاگرد کا نبض شناس بننا پڑتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب وہ اُستادی شاگردی کا زمانہ حجریہ ختم ہوچکا، اب اُستاد ایک ہمدرد رہنما ہے جسے خود روز بروز فطرت شناسی کا سبق پڑھنا ہے اور یہ سبق وہ شاگرد کے ذریعے سے پڑھتا ہے اور ہر شاگرد اُس کے لئے قدرت کی ایک خدا گانہ مقدس تصنیف ہے جس کا ایک ایک ورق دیکھنے والے کے لئے روپہلی اور سنہری ہے۔ نہیں نہ اُستاد نہ شاگرد بلکہ خاندانِ انسانیت کے دو فرد، ایک بڑا دوسرا چھوٹا، بڑا تجربہ کار اور شاید عقلمند، چھوٹا نازک احساس اور یقیناً معصوم! پھر بڑے کو چھوٹے پر فوقیت کیسے ہوسکتی ہے؟ اُسے فخر کرنا چاہئے کہ اُسے اس کی خدمت و رہنمائی کا موقع ملا۔

یہ ہیں شاگردوں اُستادوں کے نئے حقوق و فرائض لیکن گو خیالات اکثر نئے ہو رہے ہیں عمل ابھی کم از کم ہماری نیم پُرانی دُنیا میں پُرانے خیالوں ہی پر ہے۔ اِس لئے زیرِ نظر تصویر ہمارے حالات کے عین مطابق ہے۔ اُستاد نے گھُرکی دی اور محض ذرا سی دیر کے لئے مُنہ پھیرا اور اب جو پھر دیکھیگا اور شاگردوں کے چہروں کو دیکھیگا تو ضرور پھر ایک گھُرکی دیگا اور یہ گھُرکیوں اور لرزشوں کا سلسلہ یونہی جاری رہے گا۔ اور کہا جائیگا کہ یہ ہمیشہ سے یونہی تھا ہے اور رہے گا! ۔ اِس "ہمیشہ" نے، اِس پُرانے تجربے نے، اِس انسانی فطرت نے نوعِ انسان کو اس قدر تنگ کیا ہے کہ تنگ آمد بجنگ آمد، انسان نے خود اپنی فطرت پر گولہ باری شروع کردی ہے کہ یا یہ بدلے یا تباہ ہوجائے۔ اور فطرت جو زندہ رہنا چاہتی ہے، جو زندہ رہنے کے لئے بنی ہے، بدل سکتی ہے بدلنا چاہتی ہے بدل رہی ہے اور بدل کے رہیگی۔

اس کے علاوہ فطرت کو کسی نے ٹھیک سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی، جو موٹی سی بات سمجھ میں آگئی بس اُسی کو پتھر کی لکیر سمجھ لیا لیکن اب تو بات بات میں باریکیاں نظر آنے لگی ہیں اب نہ پانی کی دھارے پتھر کی لکیریں بھی مٹا چاہتی ہیں!

یہ شاگرد ہی پیچھے آنے والی نسلوں کے ہمدرد اُستاد اور شفیق باپ ہوں گے۔ اے آج کے اُستادو! ان کل کے رہنماؤں کے آگے ادب نہ سہی محبت سے بات کرو!

بشیر احمد

ہمایوں گولڈ میڈل مشاعرہ

آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین ہمایوں مرحوم کی یادگار

۱۹ نومبر ۱۹۳۷ء (جمعہ) کی شام کو وائی۔ ایم۔ سی۔ اے لاہور کے ہال میں ایک عظیم الشان انعامی مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت آنریبل سر عبد القادر نے فرمائی۔ پنجاب یونیورسٹی سے ملحقہ کالجوں کے طلبہ کو اس انعامی مقابلے میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔ اور بہترین نظم کیلئے میاں بشیر احمد صاحب بیرسٹرایٹ لا۔ ایڈیٹر ہمایوں نے اپنے والدِ محترم کی یادگار کے طور پر "ہمایوں گولڈ میڈل" کے نام سے ایک طلائی تمغہ پیش کیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ وائی، ایم سی، اے کی طرف سے ایک نقرئی تمغہ اس طالب علم کو دیا جائے گا جس کی نظم کو حاضرینِ جلسہ کثرتِ آراء سے بہترین قرار دیں گے۔ جلسہ کی کارروائی شروع ہونے سے پیشتر حاضرین کو اپنی اپنی رائے درج کرنے کے لئے کاغذات تقسیم کر دیئے گئے تھے۔

سب سے پہلے صدرِ محترم نے آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین ہمایوں مرحوم کے متعلق ایک تقریر کی جس میں ممدوح کی زندگی کے اخلاقی، علمی و ادبی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی۔ اس کے بعد میاں بشیر احمد صاحب نے "کلامِ ہمایوں" کے چند نمونے پیش کئے جن سے حاضرین بہت محظوظ ہوئے۔

پھر انعامی مقابلے کی دس بہترین نظمیں پڑھی گئیں۔ طلائی تمغے کے متعلق تین ججوں نے جلسے سے پہلے ہی فیصلہ کر دیا تھا جلسے میں صرف اس کا اعلان کیا گیا۔ "نقرئی تمغے" کے متعلق آراء شماری کی گئی اور جناب صدر نے فیصلے کا اعلان کرتے ہوئے مندرجہ ذیل طلبہ کو انعامات دیئے۔

۱۔ "طلائی تمغہ" (اوّل انعام): سید ضمیر جعفری اسلامیہ کالج لاہور۔ نظم "گاؤں کی ایک شام"

۲۔ "جذباتِ ہمایوں" (دوسرا انعام): برجندر سنگھ سیال دیال سنگھ کالج لاہور۔ نظم "بھائی کا نوحہ"

۳۔ "نقرئی تمغہ" (سامعین کا انعام نمبر ۱): سید فیضی جالندھری سابق متعلم گورنمنٹ کالج لاہور۔ نظم "تلوار"

۴۔ "جذباتِ ہمایوں" (سامعین کا دوسرا انعام): اشرف ریاض جمیلی۔ سابق متعلم گورنمنٹ کالج لائل پور۔ نظم "درۂ خیبر میں چند لمحے"

مشاعرہ غیر معمولی طور پر کامیاب رہا۔ حاضرین کے فیصلے پر انعام دیئے جانے کی جدت کو بہت پسند کیا گیا جس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اپنی رائے کا اظہار کرنے کے لئے سامعین کثیر تعداد میں تشریف لائے تھے اور ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ اس مشاعرہ کی چند نظمیں ناظرینِ "ہمایوں" کی دلچسپی کے لئے آئندہ صفحات میں درج کی جاتی ہیں۔

(بی۔ ایل۔ رلیا رام۔ جنرل سیکرٹری وائی۔ ایم سی۔ اے لاہور)

گاؤں کی ایک شام

ازسید ضمیر صاحب جعفری

لہلہاتے کھیت اور اُن پر شفق کی سُرخیاں — آسماں پر منتشر یہ ننھی ننھی بدلیاں

اک کھُلا میدان تا حدِ نظر پھیلا ہوا — غرقِ شعریت ہوائیں، بے خودی پرور فضا

اِک طرف ننھے کبڈی کھیلنے والوں کا شور
اور ڈھلانوں میں اُدھر سے بہتے پانی کا زور

ڈاب پر معصوم و سادہ لڑکیوں کی ٹولیاں
میٹھے میٹھے قہقہے اور پیاری پیاری بولیاں

پانی بھرنے والیوں کے پاؤں کی یہ نرم چاپ
یہ دُھندلکا شام کا، یہ دونوں وقتوں کا ملاپ

دُھندلی دُھندلی ٹیڑھی دیواریں یہ گارے کے مکاں
کچھ گھروں میں جل رہی ہیں دھیمی دھیمی بتّیاں

روٹی پکنے کی یہ آوازیں، یہ تنوروں کی آگ
گھر کو واپس آتے چرواہوں کے دردانگیز راگ

دُور قبرستان سے یہ ہیر گانے کی صدا
گھونسلوں میں طائروں کے پھڑپھڑانے کی صدا

شام اور یہ شام کی دلکش ملاحت ریزیاں
موسمِ باراں کی کافر ولولہ انگیزیاں

یہ ہرے کھیتوں پہ اِک رُومانیت چھائی ہوئی
پتّی پتّی اپنی رعنائی پہ اترائی ہوئی

کاش اِن لمحات میں وہ انجمن آرا بھی ہو
لُطفِ نظارہ ہے جب وہ جانِ نظارہ بھی ہو

۱ ایک چشمہ کا نام

آہ ماں جایا!

(از برجیندر سنگھ صاحب سیال)

جانئے کیا ہُوا ہے کیا دل کو
آج کچھ بھی نہیں مجھے بھاتا

جام و مینا کو کیا کروں ہمدم
دل میں وہ ولولے نہیں پاتا

لُٹ گئی دولتِ شکیب و قرار
صبر کرتا ہوں، پر نہیں آتا

ہوش بھی آہ ہو گیا رُخصت
عشق کے ولولوں کو ٹھکراتا

آج آنسو ہی بن رہے ہیں شعر
ورنہ کچھ بھی نہیں کہا جاتا

ہائے کم بخت مانتا ہی نہیں
جی کو باتوں سے کیسے بہلاؤں

غم کا دریا چڑھا ہُوا ہے آج
کیوں نہ دل کو وہیں ڈبو آؤں

درد کی داد کون دیتا ہے
کس کو سینے کے داغ دکھلاؤں

دلِ صد چاک کی زبوں حالی
کون مانے ہے، کس کو سمجھاؤں

آج کچھ لُطف ہے تو رونے میں
کاش میں اشک بن کے بہ جاؤں

زیست میں درد ہے جدائی ہے
ایسی باتوں سے کب رہائی ہے

نام ہی نام ہے خدا کا فقط
اصل میں موت کی خُدائی ہے

بیکسوں پر جفائیں ڈھاتے ہیں
کیا یہی شانِ کبریائی ہے

حُسن میں کھیلتا شباب مٹا
درد نے آگ سی لگائی ہے

ہم سے سُن اُس کا مرثیہ ہمدم
مرنے والا ہمارا بھائی ہے

اُس کی باتوں میں لوچ تھا، اک لوچ
وہ زباں، وہ دہن، وہ لب نہ رہے

اُس کی آنکھوں میں مسکراہٹ تھی
دل رُبائی کے آہ ڈھب نہ رہے

جل گئے اُس کے گھنگرالے بال — نہ رہے پیار کا سبب نہ رہے
ہائے وہ اُس کے پیارے پیارے ہاتھ — کس طرح میں کہوں کہ اب نہ رہے

مرنے والوں کی خوبیاں بے سُود
آہ بیچارے آپ جب نہ رہے

وہ پلک بھی نہیں جھپکتا اب — گو یا نرگس کی مانگ لیں آنکھیں
سُرخ ڈوروں میں بھر گیا پانی — مٹ گئیں ہائے وہ حسیں آنکھیں
چہرۂ زرد اُس کا سونا تھا — اور اُس پر تھیں دو نگیں آنکھیں
موت نے اُن کو کر دیا بے نور — اب دکھیں گے دل نشیں آنکھیں

کیا کہیں ہم اُسے بُھلا نہ سکے
اُس نے گو ہم سے پھیر لیں آنکھیں

مے اُلفت کا ایک متوالا — حسنِ فطرت کا ایک شیدائی
پاکبازی میں ایک بیراگی — طبعِ سادہ میں ایک صحرائی
درد و غم میں ہر ایک کا ہمدرد — میرا بھائی، مرا جواں بھائی
موت کے ہاتھوں ان دنوں ہائے آہ! — اُٹھ گئی زندگی کی رعنائی

اُس کے دم توڑنے کا حال نہ پوچھ
ہچکیاں لے رہی تھی برنائی

تجھ کو تیری خدائی کی سوگند — زیست کو برقرار رہنے دے
اُس کو جینے دے، یہ شباب کے دن — میرے پروردگار رہنے دے
ایک مستانۂ شباب کے بیر — ستم بے شمار رہنے دے
خوفِ صیاد اور بیمِ خزاں — یارب ایسی بہار رہنے دے

آہ! یہ اشک باریاں کب تک
دل پہ کچھ اختیار رہنے دے۔

تلوار

(از سید فیضی جالندھری)

آسمانی قہر ہے اس کی رگِ خونریز میں — خون کی دھاریں چھپی ہیں اس کی نوکِ تیز میں
رہرووں پر بند کر دیتی ہے یہ راہِ حیات — کشمکش سے زندگانی کو دلاتی ہے نجات
شیر سے کڑیل جوانوں کو سُلا دیتی ہے یہ — زندگی کو موت کا رستہ بتا دیتی ہے یہ
خُونِ انسانی سے بھر لیتی ہے یہ اپنے ظروف — اس کی سُرخی سے لکھے جاتے ہیں تاریخی حروف
بھیرویں میں اس کی پوشیدہ ہے تاثیرِ "بہاگ" — اس کی آنچیں سرد کر دیتی دُلھن کا ہیں سُہاگ
اس کا سیمیں ہالہ چھا جاتا ہے جب جنگاہ پر — بجلیاں یکساں برستی ہیں غریب دشت پہ
کانپنے لگتے ہیں اس کے نام سے اورنگ و تاج — ظلم سے لیتی ہے یہ اپنی روانی کا خراج

ہر طرف ایجاد کرتی ہے گلستاں لالہ رنگ
اس کے ہنگاموں سے اٹھتی ہے شہادت کی اُمنگ

جنگ کی حدت ہے اس کے شعلۂ رخسار میں
نصرتوں کے بھید پوشیدہ ہیں اس کی دھار میں

اس کے زیر و بم پہ ہوتا ہے قیامت کا گماں
کوندتی ہیں اس کی ہر جنبش میں لاکھوں بجلیاں

یوں چمکتی ہے جہنم مرحبا کہنے لگیں
ریگ زاروں میں لہو کی ندیاں بہنے لگیں

بزدلوں کی ہے یہ دشمن، سورماؤں کی رفیق
اس کے ڈر سے زہرۂ دوزخ بھی ہوتا ہے رقیق

برق کی تندی رگ و ریشہ میں اس کے عام ہے
ایک بار اس کا چمکنا جنگ کا پیغام ہے

حاکموں کو یہ سکھاتی ہے حکومت کا شعور
اس کے بل بوتے پہ نازاں ہے سپاہی کا غرور

اس طرح پھرتی ہے میدانوں میں بل کھاتی ہوئی
گردنیں شاہوں کی جھک جاتی ہیں تھرّاتی ہوئی

اللہ اللہ اس خنک بجلی کے لہراتے شرار
راہواروں سے اُتر پڑتے ہیں نیچے شہسوار

نغمۂ خونیں ہے پیدا اس کی ہر جھنکار سے
لوہا منواتی ہے اپنا نخوتِ اغیار سے

موجِ خوں سے سینچتی ہے سرزمینِ جنگ کو
سُرخیاں دیتی ہے یہ مَردوں کے نام و ننگ کو

گو عروسی شکل ہے، خوئے عروسانہ نہیں
کاٹ میں اس کی رعایت کا کوئی خانہ نہیں

درۂ خیبر میں چند لمحے

(از اشرف ریاض صاحب جمیلی)

شام کا رنگیں سماں اور تھی شفق ہنگامہ خیز
جھک گیا تھا شمس سجدے میں ہوا تھی عطر بیز

شام کی دُھندلاہٹوں سے بڑھ رہی تھی آبِ حسن
پی رہا تھا آنکھ سے شاعر شرابِ نابِ حسن

ہو چکے تھے کیف زا نغموں کے ہنگامے خموش
بڑھ رہا تھا دشت میں ہر سمت سناٹوں کا جوش

تھی نظر میں بے خود و خاموش منظر کی بہار
سو چلے تھے مست جنگل کے سہانے شاہکار

جا رہے تھے کھیت سے دہقان بستی کی طرف
آ رہی تھی خامشی گردون سے پستی کی طرف

بے خود و معصوم نظریں منظروں کو چومتی
اس فرشتوں کی زمیں میں چار سُو تھیں گھومتی

جا رہا تھا سرحدی افغان با رعب و جلال
ایک کاندھے پر تھی بندوق ایک کاندھے پر کدال

کارتوسوں کا پٹا سینے سے لٹکائے ہوئے
زندگی کو زندگی کا راز سمجھائے ہوئے

دل میں آزادی کا جذبہ جسم پر میلا لباس ۔۔۔ بھوک اور افلاس کا رَوندا ہوا چہرہ اُداس
کالجوں کے شوخ لڑکوں کو تھا تکتا اس طرح ۔۔۔ حاکموں کو بے گنہ مجبور قیدی جس طرح
ریل گاڑی کو تھا سامانِ تعیش جانتا ۔۔۔ اپنی آزادی غلامی سے بُری گردانتا
ظاہراً آزاد باطن بھوک کا مارا ہوا ۔۔۔ دل میں حسرت لب پہ مرگِ ناگہانی کی دُعا
مجھ پہ اس مغموم منظر سے ہوا گہرا اثر ۔۔۔ اشک بھر آئے مری آنکھوں میں اُس کو دیکھ کر
گر زمانے کا یونہی بڑھتا گیا کبر و غرور ۔۔۔ عرش تک ہوگی رسائی ان کے نالوں کی ضرور
منعموں کے آج تک سہتے چلے آتے جو ناز ۔۔۔ پاس تیرے کچھ نہیں ان کے لئے اے کارساز

کھول دے اُن پہ بھی اب تو بابِ رحمت کھول دے
موتیوں کے ساتھ ان کے آنسوؤں کو تول دے

ایک طویل نظم سے اقتباس :۔

کوئل

(از محمد منور صاحب قریشی عازم الہاشمی)

سُن لی گئیں دنیا کی دُعائیں ۔۔۔ چلنے لگیں پورب سے ہوائیں
یوں اُٹھیں ساون کی گھٹائیں ۔۔۔ جیسے ناگ کہیں لہرائیں
بگلوں سے بھرپور فضا ہے ۔۔۔ ٹکڑے ٹکڑے چاند ہوا ہے
فوج نہیں بگلوں کی یہ آئی ۔۔۔ اُڑتے ہیں دُودھ اور بالائی
بادل بگلے ہیں ہم جولی ۔۔۔ مِل کر کھیلیں آنکھ مچولی
گاؤں میں جتنے چھوٹے بڑے ہیں ۔۔۔ سب میدان میں آپہنچے ہیں
آڑ میں ہوکر، چھپ کر، بچ کر ۔۔۔ تاک کے وہ گنجے کے سر پر
نیلے انڈے پھوڑ رہے ہیں ۔۔۔ جیٹھ کا جادُو توڑ رہے ہیں
چھوٹے بچے بھولے بھالے ۔۔۔ گورے گورے کالے کالے
چھوٹے چھوٹے بال ہیں اُن کے ۔۔۔ پھول سے نازک گال ہیں اُن کے
[illegible]

ایک لنگوٹی اور اِک کُرتا ۔۔۔ ہے اُن کا بس سارا بانا
ہاتھ میں چکر گھوم رہا ہے ۔۔۔ پہلو میں دل جھوم رہا ہے

اُمڈا ہوا ہے حُسن کا دریا ۔۔۔ ڈھونڈ رہا ہے پریم کی نیا
سونے سے خالی ساز ہے دُنیا ۔۔۔ سازِ اِک بے آواز ہے دُنیا
حُسن ہے راگ اور عشق گویا ۔۔۔ لیکن سُننا، ٹھیرو بھیا
دیکھو یہ آواز ہے کیسی ۔۔۔ درد میں ہے سنے ڈوبی ہوئی سی
سینے سے منہ کو دل لپکا ۔۔۔ کوئل بولی - ہاں میں سمجھا
کوئل ہاں آموں کی رانی ۔۔۔ کوئل ہاں - ساون کی جوانی
جس کو آپ سنیں نارائن ۔۔۔ کوئل ہے وہ سندر کامنی

کوئل ہے یا جوگن کوئی پریم روگ کی روگن کوئی
چھوڑ چکی دنیا کے دھندے توڑ چکی لالچ کے پھندے
دُنیا من سے بھلائے ہوئے ہے مولا سے لگائے ہوئے ہے
ہمجنسوں سے دُور پڑی ہے پریم نشے میں چُور پڑی ہے
گیتوں میں دریا کی روانی سُن سُن کر موجیں ہوں پانی
اور آواز میں رُعب ہے ایسا وصف ہے جو مولا والوں کا

بیٹھی ہے آموں کی گپھا میں مست ہے بس بھگوان کتھا میں
دُنیا والے لوبھی بندے تن کے چنگے، من کے گندے
لوبھ ہے اور اپرادھ ہے دُنیا شرم وحیا کی سمادھ ہے دُنیا
طور ہے اس دُنیا کا کمینہ غرق ہے یاں نیکی کا سفینہ
اللہ کے دل میں گھر کرلو
پھر ساری دُنیا سر کرلو

طائرِ قفس نصیب سے

(از روشن لال ٹنڈن روشن نکودری)

باغ کی پیاری فضا میں گھومتا رہتا تھا تُو
غنچہ ہائے خوبرو کو چُومتا رہتا تھا تُو

کیف سے مخمور کرتی تھی تجھے کالی گھٹ
شاخ پر جھُولا جھلاتی تھی تجھے ٹھنڈی ہوا

بال و پر پھیلا کے سطحِ چرخ پر اُڑتا تھا تُو
جس طرف جی چاہتا تھا اُس طرف مڑتا تھا تُو

مُنہ اندھیرے جب کبھی گلگشت کو جاتا تھا تُو
فرش اِک سبزے کا زیرِ پا بچھا پاتا تھا تُو

جب درختوں کی گھنی چھاؤں میں سو جاتا تھا تُو
عشرتِ دُنیا سے بیگانہ سا ہو جاتا تھا تُو

نُور برساتا تھا ہر دم آسماں تیرے لئے
گیت گاتی تھیں خوشی سے ندیاں تیرے لئے

گلستاں تیرے لئے اِک حُسن کا بازار تھا
ہر گُلِ رعنا ترا محبوب تھا دلدار تھا

اپنی میٹھی تان سے جب تُو سناتا تھا ملہار
یہ گماں ہوتا تھا سب کو آئی ساون کی بہار

رشکِ فردوسِ بریں تھا تجھ کو اپنا آشیاں
پتہ پتہ صحنِ گلشن کا تھا تیرا رازداں

تُو بلائے رنج و غم سے بے خبر تھا شاد تھا
دہرِ پُر آشوب کی ہر قید سے آزاد تھا

کس کو یہ معلوم تھا ہوگا تو پابستۂ قفس
چھُوٹ جائیں گے کسی دن تجھ سے تیرے ہم نفس

سایۂ شمشاد میں جو سرو قد استادہ ہے
دیکھ! وہ سب سے بڑا میرا برادر زادہ ہے

اس کے چھوٹے چھوٹے بھائی اس طرف ہیں محوِ سیر
ساتھ اِن کے میرے بچے ہیں نہیں یاں کوئی غیر

دیکھ! کیسے شاد ہیں میرے یہ دونوں بھانجے
غیرتِ شمشاد ہیں میرے یہ دونوں بھانجے

جن سے والد ہیں مخاطب وہ مرے بہنوئی ہیں
ابنِ عم بھی ہیں، انہیں کہتا ہوں "دادا بھائی" میں

بھائی صاحب دھو رہے ہیں ہاتھ مُنہ، دیکھ اِس طرف
کارنامے ان کے ہیں روشن کُن نامِ سلف

والدِ ماجد سے ہے ہم سب کی یہ ساری نمود
اِس وجودِ پاک پر نازاں ہمارا ہے وجود

ہم پہ کب پڑتی نہیں اِن کی نگاہِ التفات
ہم ہی ہیں ان کی نظر میں "باقیات الصالحات"

مرکزِ طلعت ہے "پیریِ کا یہ نورانی فروغ"
یاں نظر آتا ہے کامل ہم کو انسانی فروغ

"اجتماعی زندگی" میں "انفرادی شان" دیکھ
خانداں میں اس "بزرگِ خانداں" کی آن دیکھ

علی منظور
حیدرآبادی

نیمو

(۱)

ثاقب۔ حسینہ تو سبھی بن بیٹھتی ہیں مگر لُوسی کی بات ہی اور ہے۔

ناہید۔ اس میں کیا انوکھاپن ہے؟

ثاقب۔ عورت کیا ہے پیاری اداؤں کا مرقع ہے۔ بس دیکھتے چلے جاؤ۔

ناہید۔ ثقو۔ تم جس پر مرتے ہو تعریفوں کے پُل باندھ دیتے ہو۔ ہاں! تو کیا اب لوسی سے شادی کا ارادہ ہے؟

ثاقب۔ پھر وہی گنوارپن کی بات! شادی کا کیا تذکرہ ہے واللہ تم بھی دیکھو تو لوٹ پوٹ ہو جاؤ۔

ناہید۔ تم تو کوئی جاٹ کی بھی بیاہ لاؤ تو اُس پر بھی میں فدا ہوں گی۔ مجھے باپ دادا کا گھر آباد دیکھنے کی آرزو ہے۔

ثاقب۔ لاحول ولاقوۃ۔ ہندوستانی عورت کبھی عورت بن ہی نہیں سکتی۔ ہمیشہ نانی دادی پھوپھی خالہ بننے کی آرزو میں مَری رہتی ہے۔ تم تو مجھ سے بڑی ہو، ماشاءاللہ پڑھ چڑھ کے فیشن ایبل ہو اور تمہارا ابھی وہی دقیانوسی خیال ہے کہ باپ دادا کا گھر بچوں کی چیاؤں پیاؤں سے خالی نہ ہو۔

ناہید۔ اچھا میں گنوار ہی سہی مگر جو لوسی نے تم سے شادی کی ٹھان لی تو پھر کیا کرو گے؟

ثاقب۔ (کچھ تامل کے بعد) یہ تو تم نے بُری سنائی مگر غالباً لوسی میں یہ کمزوری نہ ہوگی۔

ناہید۔ سچ کہتی ہوں کہ میں اگر گنوار ہوں تو تم پرلے درجے کے احمق ہو۔ لوسی کا اگر شادی کا ارادہ نہ ہو تو وہ کیوں تمہیں یوں مُنہ لگائے۔ ماں انگریزن، باپ پارسی، اچھا سودا کرنا اُن کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔

ثاقب۔ واللہ مجھے تم سے اس قسم کی باتوں کی توقع نہ تھی۔ ساری دُنیا تمہاری خوش مذاقی کی مداح ہے۔ جو ہے سو مجھے مبارک باد دیتا ہے کہ ناہید جیسی روشن خیال آزاد مزاج بہن کے بھائی ہونے کی مجھے عزت حاصل ہے، اور تم سے جو دل کی بات کی تو تم نے وہی شادی کا چرخہ چلا دیا۔

ناہید۔ سنئے ثقو میاں! روشن خیالی آزاد مزاجی محض سوشل لطف کی باتیں ہیں۔ یعنی صرف کہنے کے لئے۔ جہاں بقائے نسل کا سوال ہو وہاں آزاد خیالی کا کیا دخل۔ بھلا سوچو تو کہ تمہارے اور لوسی کے بچے ہم لوگوں کے بچوں سے کیا ملیں گے؟ بیشک گھر بہت صاف ہوگا، بچے بہت گورے چٹے ہوں گے مگر ان کی زندگی کیا ہوگی؟ مسجد کے پاس سے سوا فرنگی بن کر گزر جائیں گے۔ بلا سے ہم لوگ ملحد سہی مگر مسلمان تو ہیں۔

ثاقب۔ مولانا حاجی ناہید صاحبہ۔ اگر آپ کے وعظ کا یہی رنگ ہے تو میری طرف سے شادی کو طلاق ہے۔ یہ خوب رہی کہ بچے تو ہم پیدا کریں اور کام وہ اور لوگوں کے آئیں۔

ناہید۔ تو میری بات ٹھیک نکلی، نا کہ تم شادی پہ آمادہ ہو۔ کیا لوسی سے تم نے سوال کر دیا؟

ثقو۔ قسم لے لو جو ابھی تک [illegible] کیا ہو مگر ایسی غضب کی پیاری پیاری باتیں کرتی ہے کہ اگر دس پندرہ دن تک میری یہی کیفیت رہی تو لڑھک جاؤں گا۔

ناہید۔ تمہیں شرم تو نہیں آتی کہ کہنے کو یوں میرا دم بھرتے ہو کہ آپا میری جان ہے اور آپا میرا ایمان ہے مگر آج تک میرے ہاں نہ لے آئے کہ میں بھی دیکھ لیتی۔ لوگوں سے سُنتی رہی کہ ثقو اور لُوسی یہاں گئے، وہاں گئے، دس دفعہ ناچے، بیس دفعہ سینما گئے مگر مجھ سے پردہ ہی رہا۔ یہاں لے آتے تو میں کیا اسے کاٹ کھاتی؛

ثاقب۔ سچ پوچھو تو تمہاری ڈانٹ ڈپٹ سے ڈرتا رہا۔

ناہید۔ جھوٹا کہیں کا! اچھا آج لنچ پر اسے لاؤ۔ مگر دیر نہ کرنا۔ اور بھئی شادی کے متعلق تمہیں قطعی آزادی ہے۔ میں بیچ میں دخل دینے والی کون۔ تمہاری پسند سب سے مقدم ہے۔

ثاقب۔ ارے لو گھڑی کمرے میں چھوڑ آیا۔ کیا وقت ہے؛

ناہید۔ (گھڑی دیکھ کر) دس بج کر دس منٹ ہوئے ہیں۔

ثاقب۔ (جلدی سے اُٹھ کر) مجھے تو دس بجے لوسی کے ہوٹل جانا تھا۔

ناہید۔ تو کیا ہُوا پندرہ منٹ دیر تو کوئی بات نہیں اور وہ کیا گیارہ بجے سے پہلے طیار ہو گی۔

ثاقب۔ یہ نہ کہو! بلا کی پھرتیلی ہے۔

ناہید۔ اچھا ٹھیک پونے ایک بجے پہنچ جانا۔ میں پانچ منٹ بھی انتظار نہ کروں گی۔

ثاقب۔ ضرور پونے ایک بجے ہم دونوں آنکلیں گے بلکہ کہو تو پہلے ہی آجائیں۔ یہاں مزے سے باتیں کریں گے۔

ناہید۔ ضرور پہلے آجاؤ۔ میں تو خود باہر جارہی ہوں بمشکل ساڑھے بارہ گھر واپس آؤں گی اور ہاں یہ تو کہنا بھول ہی گئی کہ سیالکوٹ سے وہ جو ہماری پھوپھی زاد بہن ہیں وہ بھی آرہی ہیں اور تمہارا ٹینس کا دیوانہ مسٹر ملک بھی آرہا ہے۔

ثاقب۔ کون پھوپھی زاد بہن! کیا مجھے دیکھنے کا اتفاق ہُوا ہے؛

ناہید۔ تم کہاں سے دیکھتے۔ والد مرحوم کی پھوپھی زاد بہن کی بیٹی نعیمہ ہے۔ کالج سے ابھی نکلی ہے۔ شاید ولایت کی بھی سیر کر آئی ہے۔

ثاقب۔ کیسی ہیں؛ یعنی شلوار پوش مولوی ہیں کہ کچھ اس زمانے کی بھی ہوا لگی ہے؛

ناہید۔ دو سال ہوئے دیکھا تھا، سولہ سال کے لگ بھگ تھی۔ شکل بھی کچھ خاص طور پر جاذب نہ تھی۔ خدا جانے ان دو سال میں کیا تغیر ہُوا؛ اور تمہیں اس سے کیا؛ تم ہو گئے لُوسی ہو گی گویا باقی دُنیا نہ ہونے کے برابر ہو گی۔

ثاقب۔ چھیڑ خانی میں بڑی اُستاد ہو۔ لو جارہا ہوں۔ ہاں یہ تو بتا دو کہ دُنیا میں جو دو چار ہمارے رشتہ دار ہیں وہ سب کے سب پنجاب ہی میں کیوں نازل ہوئے؛

ناہید۔ بزرگوں کی غلطی مگر تم اس کمی کو پورا کر دو۔ بمبئی اور بمبئی سے پرے لندن تک رشتہ ڈھونڈو۔

(۲)

پونے ایک بجے کا وقت ہے۔ ناہید کا گول کمرہ خوبصورت سڈول سرو قد جسموں سے زندہ ہو رہا ہے۔ ایک ناہید کیا کم تھی کہ اس کے پہلو میں لُوسی!! چہروں پر تبسموں کی طغیانیاں، آنکھیں مسرت اور سرور کی

سی رسیلی آواز سنائی دی۔

"آپا، آداب"

یہ نعیمہ تھی۔

ناہید بسم اللہ بسم اللہ کہتی جاتی ہے گلے لگا کر پیار کرتی ہے اور پھر تعارف کراتی ہے "مس لوسی ہیبٹن جی سے ملو۔ یہ مسٹر ملک ہیں۔ " یہ ثاقب ہے۔"

نعیمہ۔ "ہاؤ ڈو یو ڈو۔ (لوسی سے) "آپ ہیں ٹینس کے مہاتما" (مسٹر ملک سے)، اور ثاقب سے "آداب امی کی طرف سے دعا پیار۔"

ثاقب۔ اور تمہاری طرف سے۔

نعیمہ۔ آداب۔

ثاقب۔ ہو بڑی ہشیار مگر تمہارا نام بڑا ثقیل ہے۔

نعیمہ۔ مجھے تو سبھی نیمو کہتے ہیں۔ آپ بھی نعیمہ کہنے کا تکلف نہ کیجئے۔

ثاقب۔ اچھا مس نیمو۔

نیمو۔ جی بھائی سنئے!

ثاقب۔ (حاضر جوابی سے بے انتہا خوش ہو کر) ہمارے کنبے میں سبھی کی زبان گز بھر کی ہے۔

اس پر نیمو عجیب انداز سے منہ چڑاتے ہوئے سرخ پتلی نکیلی سی زبان یونہی باہر نکالتی ہے اور مذاق سے کہتی ہے۔

نیمو۔ تم سے تو چھوٹی ہی ہے۔

ثاقب۔ دو منٹ ملاقات کو نہیں ہوئے اور منہ بھی چڑانے لگیں۔ تیری گردن مروڑوں گا۔

اتنے میں ناہید بولی۔ "لوگو میرا تو بھوک کے مارے برا حال ہے۔ چلو کھانا کھاؤ۔"

پہلے لوسی، پھر نیمو، ناہید، ملک اور ثاقب یکے بعد دیگرے کھانے کے کمرے کی طرف بڑھتے ہیں۔ ثاقب نیمو کی سبک رفتاری کو غور سے دیکھ رہا ہے اور پھر دل ہی دل میں محسوس کرتا ہے کہ جس وقت سے نیمو کمرے میں داخل ہوئی اس وقت سے اب تک اس نے لوسی سے نہ کوئی بات کی نہ اس کی طرف دیکھا۔ اب دیکھتا سامنے لوسی کی طرف ہے مگر نگاہ نیمو کے دوپٹے پر الجھ کر رہ گئی۔ وہاں سے پھسلی تو لمبی چٹیا میں اٹکی۔

ناہید۔ لوسی تم وہاں بیٹھو۔ ثاقب میرے بائیں لوسی کے پاس بیٹھو۔ ملک میرے دائیں اور نیمو تم وہاں۔ علو ابھی آتا ہی ہوگا۔ بس بیٹھ جاؤ۔

دو خدمتگار کھانا لاتے ہیں کہ اتنے میں علو Hello hello everybody کہہ کر اپنی کرسی پر بیٹھنے کو ہے کہ بائیں طرف نگاہ نیمو پر پڑی اور نیمو نے جھک کر کہا۔

"آداب، آقا میاں"

علو۔ (جلدی سے گلے لگا کر، پیشانی پر پیار کر کے) نیمو! بلا تو کتنی لمبی ہو گئی ہے؟ کہو امی اچھی ہیں؟

نیمو۔ جی ہاں دعا دیتی ہیں۔

کھانا شروع ہو گیا۔ ثاقب نے ایک آدھ بات لوسی سے کی اور پھر لوسی نے علو سے کہا۔

لوسی۔ آپ سے تو مل چکی تھی۔ آپ کی بیگم سے آج ملی ہوں۔ میری بڑی خوش قسمتی ہے۔

ثاقب۔ نیمو تم ریل سے آئی ہو؟

نیمو۔ موٹر سے۔

ثاقب۔ کتنی دیر لگی؟

نیمو۔ ۸۰ میل سے کچھ زیادہ ہے سُست چلاتی رہی۔ دو گھنٹے لگ گئے۔

ثاقب۔ کیا تم خود تمام رستہ چلاتی رہیں؟

نیمو۔ جی ہاں، موٹر چلتی ہی میں بیٹھی رہی۔ کہیں بھی اُتر کر دھکا دینے کی ضرورت نہیں پڑی۔

ثاقب۔ اگر تم تیز چلاؤ تو گھنٹے بھر میں کتنے میل کر لیتی ہو؟

نیمو۔ پینتالیس بھی۔ اڑتالیس بھی۔ سڑک پر منحصر ہے۔

ثاقب۔ کیا کار ہے تمہاری؟

نیمو۔ آج تو بیوک (Buick) لائی ہوں مگر عام طور پر فورڈ (Ford) ہی استعمال کرتی ہوں۔

ثاقب۔ سنا لُوسی تم نے! یہ سلپ آف اے گرل ساٹھ پینسٹھ میل کی رفتار سے موٹر چلاتی ہے اور تم لوگ مجھے کہتے ہو کہ چالیس سے زیادہ نہ چلاؤ۔

لوسی۔ نیمو تم سے ڈرائیور بھی تو اچھی ہوگی۔ تم چلاتے کدھر ہو دیکھتے کدھر ہو؟

علو۔ لوسی تم پاس ہو تو نگاہ کا بھٹکنا معمولی بات ہے۔

اس پر خوب قہقہہ ہوا اور بات کہیں اور نکل گئی۔ مگر ثاقب کی نگاہ دوپٹہ قمیص سے نہ سنبھلی۔ اس نے محسوس بھی کیا کہ دائیں ہاتھ بہن کی طرف اور بائیں ہاتھ لوسی کی طرف اس نے کم توجہ کی مگر اس وقت اسے یہ غور کرنے کا موقع نہ ملا کہ کھانے کی میز جب گول ہو اور نشست یوں ہو کہ نیمو تقریباً سامنے ہو

ملک — نیمو — ناہید — علو — ثاقب — لوسی

تو یہ بے توجہی خاص جرم نہ تھا۔ انسانوں میں دل نگاہ کا غلام ہے آنکھ اُٹھتی تو نیمو کی جانب، جسم جھکتا تو سامنے کی طرف، دل بیچارا کیا کرتا؟ بڑھا، جھکا، تڑپا۔

(۳)

لنچ ختم ہونے پر کھانے کے کمرے سے پہلے خواتین اور پھر سگرٹوں سے شغلے ہوئے تین نوجوان گول کمرے میں داخل ہوئے۔

علو۔ آؤ بھئی کچھ کھیلیں!

ثاقب۔ جی نہیں۔ ہم تو dance (رقص) کرنا چاہتے ہیں، ہیں نا لوسی! ذرا گراموفون تو منگواؤ، ناہید!

ناہید۔ گراموفون تو آج ہی مرمت کے لئے دُکان پر بھجوائی ہے۔

ثاقب۔ بڑی پھوہڑ ہو ناہیدو!

نیمو۔ ثقو بھائی ضرور لوسی سے dance کیجئے۔

ثاقب۔ موسیقی کے بغیر تو پاگل ناچتے ہیں۔

نیمو۔ آپ یہ قالین اور میز تو ہٹائیے۔

(یہ کہتی ہے اور کمرے کے کونے میں جو شاندار پیانو رکھا تھا اُسے بجانا شروع کرتی ہے)

قالین میز وغیرہ سب ہٹ گئے۔ راگ بڑھتا گیا۔ لوسی کی نازک کمر میں ثاقب کا ہاتھ، خوبصورت polka چار پاؤں کی گلکاریوں کا ممنون تھا۔

جونہی راگ ختم ہوا لُوسی بے اختیار جا کر نیمو سے لپٹ گئی۔ "تھینک یو ڈارلنگ"، "بیوٹیفل ڈارلنگ" کہتی جاتی تھی اور پیار کرتی جاتی تھی۔ ثاقب بھی بے حد مسرور تھا مگر ناچ کے بعد جب اس نے لُوسی اور نیمو کے چہرے پاس پاس

دیکھیے تو اس کی آنکھوں سے گویا پردہ سا اُٹھ گیا۔ کہاں پاؤڈر اور کریم کی ایک خوشنما تعمیر یعنی لُوسی کا چہرہ اور کہاں ایک قدرتی گلاب مگر ساتھ ہی اس کے دل میں لوسی کی عزت بے انتہا بڑھ گئی کہ کس گرمجوشی اور دلی خلوص سے اُس نے نیمو کا شکریہ ادا کیا۔ ثاقب کو یہ غور کرنے کا موقع نہ تھا کہ یہ اٹل قانونِ فطرت ہے کہ محبت جب جاتی ہے تو عزت ہی اس کی جانشین ہوتی ہے چنانچہ اس چھوٹے سے ڈراما کے بعد پہلا فقرہ جو اس نے لوسی سے کہا وہ بجائے معمولی بے تکلفی کے ادب واحترام کا پہلو لئے ہوئے تھا۔ لوسی کا ماتھا وہیں ٹھنکا کہ مجھے بجائے "لُوسی، یُو فُول" کہنے کے اس نے "لوسی ڈیر" کیوں کہا۔ نیک نہاد تھی تجربہ کار نہ تھی۔ بھانپ نہ سکی کہ لُوسی کا پتنگ کٹ چکا۔

ناچ کے بعد ادھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ لُوسی نے ثاقب سے کہا "چلو مجھے پہنچا آؤ"۔

ثاقب۔ تو کیا تم یہاں Tennis (ٹینس) نہ کھیلو گی؟

لوسی۔ بڑے شوق سے کھیلتی مگر کچھ ضروری کام ہے۔

ثاقب نے بھی زیادہ اصرار نہ کیا اور "ابھی آتا ہوں" کہہ کر لُوسی کے ساتھ چل دیا۔

(۴)

اسی شام ٹھیک آٹھ بجے نیمو کے کمرے کے باہر ثاقب کھانے کا لباس پہنے ہوئے دروازے کو انگلیوں سے کھٹکھٹا رہا ہے۔ اندر سے نیمو آواز دیتی ہے "کون ہیں؟"

ثاقب۔ میں ہوں نیمو۔

نیمو۔ (اندر سے) کہیئے خیر تو ہے؟

ثاقب۔ کیا تم سو رہی ہو نو بجنے والے ہیں، کیا کھانے پر نہ آؤ گی؟

نیمو۔ (اندر سے) نو نہ دس۔ ابھی تو آٹھ بجے ہیں۔

ثاقب۔ واللہ تمہاری گھڑی غلط ہے۔ جلدی کرو میں تمہاری راہ تک رہا ہوں۔

نیمو۔ (اندر سے) اچھا ابھی آئی۔

اور تھوڑی دیر کے بعد نکل آتی ہے۔

ثاقب۔ ماشاءاللہ ساڑھی باندھنی بھی آتی ہے۔

نیمو (اضطراب سے) کیا سچ مچ میری گھڑی غلط ہے۔

ثاقب۔ یہ تو محض میرا بہانہ تھا۔ ابھی تو کھانے میں بہت دیر ہے۔ چلو تھوڑی دیر ہوا کھا آئیں۔

نیمو۔ بڑے حضرت ہو۔ مجھے واقعی یقین ہو چلا تھا کہ کہیں میری گھڑی غلط نہ ہو گئی ہو۔

ثاقب۔ اچھا معاف کر دو۔ مگر چلو ضرور۔

نیمو۔ جو آپ کی خوشی۔

چلتے چلتے ایک دلفریب مقام پر موٹر روک لی گئی۔ تنہائی تھی۔ تاریکی نہ تھی۔

ثاقب۔ یونہی بیٹھے بیٹھے اس خوبصورت منظر کا لُطف اُٹھاؤ گی یا کچھ چلو پھرو گی بھی۔

نیمو۔ جی ہاں۔ ضرور چلیئے۔ بیٹھے بیٹھے کیا کریں گے۔

دونوں خراماں خراماں پہلو بہ پہلو اِدھر اُدھر گھومتے ہیں۔ ثاقب ہمہ تن تشویش ہے اور نیمو گویا قطعی بے خبر۔ سطحی باتوں کا سلسلہ جاری ہو کر رُک جاتا ہے "ہوا کس قدر پُرلطف ہے" "یہ مدھم سی روشنی رُوح افزا ہے!" اس سکوت میں زندگی کے نئے معنی ہیں!۔

آخر ثاقب جی کڑا کر کے نیمو کے سامنے کو ہو کر کھڑا ہو

جاتا ہے۔ نیمو بھی جھجک کر رک جاتی ہے۔

ثاقب۔ (لڑکھڑاتی زبان سے) یہ کہنا فضول ہے کہ تم کامیاب ڈاکو ہو۔ صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ موقع دو کہ زندگی بھر کوشش محنت، محبت تمہاری نذر کرتا رہوں۔

نیمو۔ تو کیا آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟

ثاقب۔ اگر تم قبول کرو۔

نیمو۔ (مسکرا کر) میں سمجھی کہ آپ شاید کہیں اور سوال کرنے کی مشق کر رہے ہیں اور ابھی مجھ سے پوچھیں گے کہ کیا اظہارِ عشق کا میں اچھا ایکٹر ہوں۔

ثاقب۔ (اسی لڑکھڑاتے لہجہ میں) نیمو! نیمو!! خدا کے لئے میری زندگی کے پاکیزہ ترین لمحہ کو یوں فقرے بازی کی خاک میں نہ ملاؤ۔ کیا تمہیں اصل اور نقل میں فرق کرنے کی تمیز نہیں؟

نیمو۔ انداز سے تو سچے معلوم ہوتے ہو مگر کسی کے دل کا کیا پتہ؟

ثاقب۔ تمہارا دِل کیا کہتا ہے؟

نیمو۔ میرا دِل بعض دفعہ یہ کہتا ہے کہ love (محبت) سے زیادہ ذلیل حرکت دُنیا میں کوئی نہیں۔ جسے دیکھو love کا شکار ہے۔ میں love کا شکار رہنا پسند نہیں کرتی۔ اپنے دل ودماغ پر میں خود ہی مسلط رہنا چاہتی ہوں۔

ثاقب۔ تم بے انتہا پیاری ہو۔

نیمو۔ یہ کیا کوئی بڑی یا انوکھی بات ہے، قد ہو، شکل ہو، شگفتگی ہو، لباس ہو تو جو کوئی بھی ہو پیاری معلوم ہوگی۔

ثاقب۔ تم یہ سب کچھ رکھتی ہو اور اس سے بھی بہت کچھ زیادہ۔

نیمو۔ وہ کیا؟

ثاقب۔ اکثر حسین صرف حسین ہی ہوتے ہیں۔ تم حسن میں محصور ہو کر بھی حسن پر حکمران ہو۔ حسن تمہارے کہنے میں ہے، تم اس سے بالاتر ہو۔

نیمو۔ یونہی باتیں ملاتے ہو۔ چلو گھر چلیں۔

(۵)

اسی رات کھانے کے بعد اپنی کوٹھی واپس جانے سے پہلے ثاقب اپنی ہمشیرہ ناہید کے کمرے میں دروازے بند کر کے یوں گفتگو شروع کرتا ہے۔

ثاقب۔ نیدو، تمہیں کچھ مروجہ تاریخ سے بھی مس ہے؟

ناہید۔ اخبار پڑھتی ہوں، کبھی کبھی ریڈیو کی خبریں بھی سن لیتی ہوں۔

ثاقب۔ آج کی تازہ ترین خبر یہ ہے کہ تمہارے بھائی ثقو نے شادی کا سوال کر دیا اور اسے ٹکا سا جواب مل گیا۔

ناہید یہ سن کر تھرّا سی جاتی ہے۔ اور پھر نہایت اضطراب سے کہتی ہے۔

ناہید۔ لنچ کے بعد جب تم لوسی کو پہنچانے گئے تو اس وقت تم نے اس سے سوال کیا ہوگا؟ کیا کہہ کر اس نے انکار کیا؟

ثاقب۔ واللہ بے انتہا کوڑ مغز ہو۔ لوسی بیچاری کا کیا تذکرہ تھا۔ یہ قصہ تمہاری اس بلائے جان نیمو کا ہے۔ کھانے سے پہلے اسے موٹر میں لے گیا۔ نہر کے کنارے سوال کیا اور اُس نے مجھے مذاق مذاق میں جتلا دیا کہ میں نہایت احمق ہوں۔

ناہید۔ واللہ بڑے فرمائشی گدھے ہو۔ ثقو تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ تمہاری ایک دن کی ملاقات، میری وہ مہمان۔

ہم دونوں کو وہ کس قدر کمینہ خیال کرتی ہوگی۔ کیا تمہیں اتنی
بھی عقل نہیں کہ مسلمان خاتونیں قطعی آزاد ہو کر بھی شعائرِ اسلام
سے خالی نہیں۔ میں صبح اسے کیسے مُنہ دکھاؤں گی؟

ثاقب۔ غلطی ہوگئی سو ہوگئی اور تم منہ دکھاؤ یا نہ دکھاؤ میں
صبح ناشتہ کے لئے یہاں موجود ہوں گا اور اگر تم نہ کہوگی تو
میں کہہ دوں گا کہ نیمو ہمیں سیالکوٹ اپنے گھر لے چلے۔ شام
کو واپس آجائیں گے۔ نیمو سے تم نے میری شادی نہ کرائی تو

. . . . . .

ناہید۔ (بات کاٹ کر) اب تو تم جاؤ۔ صبح دیکھا جائے گا۔

ثاقب۔ رات بھر مجھے نیند تھوڑی آئے گی۔

ناہید۔ خدا کے لئے اب جاؤ۔ غلط طریقہ خود اختیار کرتے
ہو الزام بہن کے سر تھوپتے ہو۔ شادی کرنی ہے تو اس کے
دل میں اپنی محبت پیدا کرو۔ نہ کہ یہ کہو "نیمو تم پر مرتا ہوں اس
لئے مجھ سے شادی کرلو۔"

ثاقب۔ محبت کو تو نیمو ایک ذلیل حرکت قرار دیتی ہے۔

ناہید۔ تمہاری محبت واقعی ایک ذلیل حرکت ہی ہے۔

ثاقب۔ ناہید ڈارلنگ۔ جس طرح ہو میری مدد کرو۔ دراصل
قصور تمہارا ہے۔ تم نے مجھے پہلے کیوں کبھی نہ بتایا کہ مسلمانوں
میں بھی ایسی لڑکیاں ہیں جو کانی نہیں ہیں۔

ناہید۔ یہ تو میں تب کہتی جب مجھے یقین ہوتا کہ مسلمان لڑکے
کانے نہیں۔ میں تو تمہارے سمیت جسے دیکھتی ہوں کانا ہی
پاتی ہوں۔ کوئی روپیہ کے پیچھے مرتا ہے تو کوئی فیشن کے
پیچھے۔ ایک بھی نہیں جو شرافت اور مسرت کا پرکھتا ہو۔

ثاقب۔ اپنے وعظ اب رہنے دو اور کوئی ترکیب سوچو کہ نیمو
میری بن جائے۔

ناہید۔ شرم تو نہیں آتی۔ اپنا کام مجھ پر ڈالتے ہو۔ اپنے
آپ کو اس قابل کیوں ثابت نہیں کرتے کہ وہ خوشی سے تمہیں
قبول کرے۔

ثاقب۔ یہ تو کروں گا ہی مگر تمہاری مدد کی سخت ضرورت ہے۔

(۶)

دوسری صبح نیمو، ناہید اور ثاقب موٹر میں سیالکوٹ
روانہ ہوئے۔ ثاقب رات بھر نہ سویا تھا۔ موٹر کوئی آٹھ دس
میل لاہور سے نکلی ہوگی کہ سو گیا۔ نیمو موٹر چلا رہی تھی اور اس
کا بایاں کندھا گویا ثاقب کے سر کے لئے تکیہ بن گیا۔ ناہید
چپکی یہ تماشا دیکھتی رہی۔ اتنے میں دونوں حیران ہوگئیں کہ
ثاقب سوتے سوتے بہت ہی رساں رساں کوئی نام لے رہا
ہے۔ یہ نام

نیمو

تھا۔ دفعتہً نیمو کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ فتح یابی کی وہ مسرت جو شباب
کا خاصہ ہے اس کے چہرے پر چمکی مگر باوجود بوجھ محسوس کرنے
کے اس نے کندھے کو پرے نہ کیا۔ جو کام ثاقب جاگتے میں
نہ کرسکتا تھا وہ اس نے گہری نیند کی حالت میں کرلیا۔

سیالکوٹ پہنچ کر نیمو کی والدہ کو ناہید اور ثاقب
نے آداب کہا۔

بیگم۔ (ناہید اور ثاقب کو مخاطب کرکے) بسم اللہ۔ بہت
ہی اچھا کیا کہ تم دونوں آگئے۔ آنکھیں ترس گئی تھیں۔

ثاقب۔ پھوپھی اماں۔ ناہید کی باتوں میں نہ آئیے۔ یہ تو میں
نہیں لایا ہوں۔ یہ گھر سے کب نکلتی ہیں۔

ناہید۔ جی ہاں پھوپھی اماں! یہ بات تو ثاقب ٹھیک کہتا ہے۔

ثاقب۔ پھوپھی اماں۔ مجھے تو آپ کی اجازت ہے ناکہ جب چاہوں آجاؤں میں کوئی نیدرد کی طرح کا قیدی تھوڑا ہی ہوں۔

بیگم۔ بیٹا جب چاہو آؤ۔ تمہارا اپنا گھر ہے۔

اس کے بعد ادھر اُدھر کی باتیں ہوئیں اور نیمو نے آکر کہا کہ کھانا تیار ہے۔ سب کھانے کے کمرے کی طرف بڑھے۔ بیگم کھانے کے کمرے میں سب کے ساتھ آئیں اور یہ کہہ کر کہ "بیٹا مجھے معاف کرو، تم بسم اللہ کرو" چلی گئیں۔ گھر کا چپہ چپہ کونا کونا گویا کہہ رہا تھا کہ اس گھر میں ایسے لوگ رہتے ہیں جن کا دل بے چین نہیں۔ کھانے کے کمرے میں قیمتی چیزیں نہ تھیں مگر ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی اپنی جگہ پر گویا چمک رہی تھی۔ دیواروں پر چند فارسی قطعات تھے، میز پر دو تین خوبصورت گلدان تھے۔ کمرہ گویا زبانِ حال سے یہ کہہ رہا تھا کہ گو گھر کا امیر ہوں مگر دولت کی نمائش سے بالاتر ہوں، مگر ثاقب نے کمرے کو نہ دیکھا۔ نیمو میں محو رہا۔

(۷)

ثاقب نے اپنے جس دوست سے اس تمام ماجرے کا ذکر کیا وہ دوست اب اس سچی سرگزشت کو جھوٹ کے لباس میں پیش کر رہا ہے۔ جب ثاقب بات ختم کر چکا تو دوست نے متعجب ہو کر پوچھا کہ آخر اس تمام واردات میں انوکھی بات کیا ہے؟

ثاقب۔ تم افسانہ نویسوں کے اس مرض کا کوئی علاج نہیں کہ زندگی میں، جو ایک معمولی چیز ہے، غیر معمولی جنس کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہو تمہاری نگاہیں نہیں ہیں کہ بھولے بھالے سیدھے سادے لفظوں کے معجزوں کو دیکھ سکو۔ یا پہچان سکو۔ کوشش کرو اور سمجھو آج پورے چھ مہینے ہوئے کہ نیمو کو پہلی دفعہ دیکھا نہیں یہ غلط ہے۔ پہلے اس کی آواز سنی اور پھر اسے دیکھا۔ اس کا وہ ایک لفظ "آداب" اور ناہید کی خیر مقدم کی بسم اللہ گویا دو جادو چل گئے۔ قلب کی تاریک گہرائیوں کے اندر بجلی سی چمکی اور میں جو اکفرالکفار تھا مسلمان ہو گیا۔ رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ اگر نیمو سے شادی کی تو میرے بچوں کو دنیا بھر کی دولت نصیب ہو گی مگر انہیں کوئی اس محبت سے "بسم اللہ" نہ کہے گا جس محبت سے ناہید نے نیمو کو بسم اللہ کہی۔ بچوں کو بسم اللہ کی دولت سے محروم رکھنا مجھے سب سے بڑا جرم معلوم ہوتا تھا۔ خود بخود میرا دل یہ کہنے لگا کہ جن بچوں کی ماں مسلمان نہیں وہ نہ "آداب" کہہ سکتے ہیں نہ "بسم اللہ" سن سکتے ہیں۔ اندر ہی اندر کشمکش رہی، سخت اور تلخ کشمکش رہی۔ کہ پرانی اوہام پرستی کا شکار نہ ہوں مگر وہ سحر جو انسانی خون میں ہے عقل سے زیر نہ ہوا۔ ماں باپ کے مسلمان خون نے بسم اللہ کو بسم اللہ کہی اور فیشن سے نہ دبا پر نہ دبا۔ لوگ عورت کے پیچھے عیسائی ہو جاتے ہیں۔ میں دو دلکش جملوں کی صداؤں کے لئے مسلمان رہ گیا۔

دوست۔ جب نیمو نے اپنے کندھے سے تمہارا سر نہ ہٹایا اور اس کے بعد اس نے ہمیشہ تم سے خاص محبت کا سلوک کیا تو اب تک تمہاری نسبت کا اعلان کیوں نہیں ہوا؟

ثاقب۔ پھر وہی افسانہ نویسوں والے استفسار۔ خدا جانے آپ حضرات یہ کیوں نہیں سمجھ سکتے کہ زندگی اصلی عملی زندگی، افسانوں کی قیود سے آزاد ہے۔ بندۂ خدا اتنا تو سوچو کہ نیمو مجھ سے کیوں کہنے لگی کہ اس نے میرا سر جان بوجھ کر کندھے سے لگا رہنے دیا۔ ناہید ایسے کمینہ پن کی توقع

کیوں کرتی کہ مجھے نیمو کے خلاف ایک Un fair advantage دیتی۔ یہ واقعہ ہے کہ میں خوش نصیب ہو کر بھی اپنی بیدار مغزی سے بے خبر رہا۔ نیند میں میری قسمت جاگی۔ مجھے جاگ کر بھی اس کا پتہ نہ چلا۔ مگر اب جو تم پوچھتے ہو تو جو واقعہ کل پیش آیا وہ تمہیں بتا دیتا ہوں۔ پھر تمہیں پتہ چل جائے گا کہ کیوں ہماری نسبت نہیں ہوگی مگر شادی جلد ہو جائے گی۔

میں اور نیمو کچھ عرصے سے چند تاریخی واقعات کا مل کر مطالعہ کر رہے ہیں۔ مل کر کام کرنے میں جو روحانی یگانگی پیدا ہوتی ہے وہ بجائے خود ایک حسین دُنیا ہے۔ کل اتفاق سے ہم نورجہاں کے متعلق کچھ مطالعہ کر رہے تھے۔ نیمو کی اور میری یہ گفتگو ہوئی۔

نیمو۔ مؤرخ کس قدر احمق ہیں۔ نورجہاں کا ذکر ہمیشہ یوں ختم کرتے ہیں کہ ملکہ کا مقبرہ دریائے راوی کے کنارے واقع ہے۔ باغ ویران ہے، کتبہ گم ہے۔

ثاقب۔ اور بیچارے کیا لکھیں؟ یہ واقعہ ہے۔

نیمو۔ اس واقعہ کو نورجہاں سے کیا تعلق؟ یہ تو ہماری دُنیا کی کجی کا ثبوت ہے، ورنہ نورجہاں کی مٹی نورجہاں نہیں۔ نورجہاں ایک طاقت تھی، ایک عروج تھا۔ وہ طاقت، وہ عروج زمانہ کے لئے ہمیشہ ایک روشن مثال ہے انسانوں کے بڑھاپے یا موت کا ذکر فضول ہے۔ دیکھنا صرف یہ ہوتا ہے کہ جب وہ کچھ کر سکتے ہوں تو انہوں نے کیا کیا؟

ثاقب۔ یہ تو بالکل ٹھیک ہے مگر نیمو تم بھی تو انسان ہو اور کچھ نہ کچھ کر سکتی ہو۔ بتاؤ تم نے کیا کیا؟

نیمو۔ مجھے تو جو کچھ کرنا تھا وہ کر چکی۔

ثاقب۔ کب اور کیسے؟

نیمو۔ کیا ناہید نے تمہیں نہیں بتایا؟

ثاقب۔ حاشا و کلا۔ اس نے مجھے ہرگز کچھ نہیں بتایا۔

نیمو۔ کیا لاجواب ہستی ہے۔ اگر میں نیمو نہ ہوتی تو ناہید ہونے کی آرزو کرتی۔ کیا اس نے تمہیں نہیں بتایا کہ تمہارے اس کدو سر نے میرے کندھے کو شل کر دیا مگر کسی خیال سے میں نے اسے نہ ہٹایا۔ نورجہاں نے تو صرف کبوتر اُڑائے اور وہ سلیم کے پسند آ گئی۔ ہم بوجھ نہ ہٹائیں تو بھی ہماری قدر نہیں۔

اس فقرے کے بعد میں نے لپٹ کر پیار کرنے کی کوشش کی مگر اسے میرا فقرہ یاد تھا۔ کہنے لگی:-

"گردن حاضر ہے۔ مروڑ لیجئے!"

"فلک پیما"

رعنائیاں

(۱)

کس جلوۂ پُرکیف سے مخمُور ہے دُنیا؟
ہر سمت نئے حسُن سے معمُور ہے دُنیا!

بجلی کے تڑپتے ہوئے کوندوں کی لپک میں
برسات کی بھیگی ہوئی راتوں کی جوانی!
مہتاب سے برسی ہوئی کرنوں کی چمک میں
ہنستے ہوئے دریا کا چھلکتا ہوُا پانی!
شبنم کے کھلائے ہوئے پھولوں کی مہک میں
بیتاب پپیہوں کی جگر دوز کہانی!
جھپکے ہوئے تاروں کی دل افروز جھلک میں
جنگل سے گزرتی ہوئی ندیوں کی روانی!

اے بے خبرِ حسُن تجھے یہ بھی خبر ہے؛
ہر گام پہ اک منظرِ نَو پیشِ نظر ہے!

(۲)

کس جلوۂ پُرکیف سے مخمُور ہے دُنیا؛
ہر سمت نئے حسُن سے معمُور ہے دُنیا!

سرسبز پہاڑوں میں چھلکتے ہوئے جھرنے!
وادی میں مچلتے ہوئے چشموں کا ترنم!

شاما کی دل آویز غزل لُور کے تڑکے!
صحرا کی خموشی میں جمالِ مہ و انجم!
کُہرے میں اُبھرتے ہوئے سُورج کے کرشمے!
مہتاب کے جلووں میں سمندر کا تلاطم!
رنگین دھندلکوں میں ابابیل کے نغمے!
ٹھہری ہوئی جھیلوں میں ستاروں کا تبسّم!

اے بے خبرِ حُسن تجھے یہ بھی خبر ہے؟
ہر گام پہ اِک منظرِ نَو پیشِ نظر ہے؛

(۳)

کس جلوۂ پُرکیف سے مخمُور ہے دُنیا؛
ہر سمت نئے حُسن سے معمُور ہے دُنیا!

ساون کی مہکتی ہوئی گلریز ہوا میں
گُلشن کی لچکتی ہوئی شاخوں کے ترانے!
میدان کی سہمی ہوئی خاموش فضا میں
فرقت کی ستائی ہوئی کویل کے فسانے!
مہتاب کے پُرنور تبسّم کی ضیا میں
تالاب میں پگھلی ہوئی چاندی کے خزانے!
راتوں کو وہ بوچھار کی مخمور صدا میں
بوندوں سے ٹپکتے ہوئے کچھ گیت سہانے!

اے بے خبرِ حُسن! تجھے یہ بھی خبر ہے؛
ہر گام پہ اِک منظرِ نَو پیشِ نظر ہے!

ذوقؔ

سب سے پیچھے کھڑے ہوئے

۱ مسٹر بشیشور پرشاد منور لکھنوی — ۲ مسٹر ڈی ڈی کپور — ۳ مسٹر اختر حسین — ۴ مسٹر ایشور دیال — ۵ مسٹر حسین ملک

کھڑے ہوئے

۶ مسٹر کستوری لال چوپڑہ — ۷ میر محمد مرتضیٰ علی — ۸ مسٹر قدیر احمد خاں قدیر لکھنوی — ۹ میرزا جعفر حسین لکھنوی — ۱۰ سید نجم الحسن — ۱۱ میاں بشیر احمد — ۱۲ مسٹر کشن داس زار — ۱۳ بوم میرٹھی

۱۴ سید حسن فیروز — ۱۵ خان بہادر محمد مظہر — ۱۶ سید نواب میاں — ۱۷ خان بہادر ظفر حسن خاں — ۱۸ سید احمد میاں — ۱۹ مسٹر حبیب ملک

کرسیوں پر بیٹھے ہوئے

۲۰ جناب احسان دانش — ۲۱ پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی — ۲۲ میرزا ثاقب لکھنوی — ۲۳ آنریبل سر سید سلطان احمد (صدر مشاعرہ) — ۲۴ ملک غلام محمد (صدر بزم اردو) — ۲۵ مولانا بیخود دہلوی — ۲۶ بہزاد لکھنوی

فرش پر بیٹھے ہوئے

۲۷ پنڈت بالمکند عرش ملسیانی — ۲۸ مسٹر عبد السلام — ۲۹ مسٹر محمد اسد خاں اسد ملتانی (سکرٹری بزم اردو) — ۳۰ سید تنویر علی — ۳۱ مسٹر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری — ۳۲ مسٹر محمد زمان خان

م۔ک۔ن۔ب

دُنیا بھر کی دلچسپ باتیں بھی اُسی وقت یاد آتی ہیں جب ہم چار پانچ بے تکلف دوست کہیں پھر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ ایک شام گجرات کے مشہور شاعر اُستاد امام دین کے بلند پایہ اشعار سننے کے بعد جب قہقہوں کی آوازیں بند ہو گئیں تو شمیم نے اُستاد کا دیوان "بانگِ دہل" میز پر رکھتے ہوئے کہا "اکرم! ہاں! وہ گھنٹی والی بات تو تم نے ان لوگوں کو سُنائی ہی نہیں"۔ اکرم بولا "ہاں! بھئی سنو ایک اور دلچسپ بات جو میں کبھی نہیں بھولتا۔

جب سب نے اپنے اپنے سگرٹ سلگا لئے تو اکرم نے جسے پُرانی باتیں بیان کرنے میں خاص مہارت ہے ایک لمبا کش لگاتے ہوئے اپنی داستان یوں شروع کی:-

"خاکسار جب تھرڈ ایر میں گیا تو کچھ عرصہ کے بعد پرنسپل نے صرف ذاتی دشمنی کی وجہ سے ہمارے ریاضی کے بھلے چنگے پروفیسر کو کالج سے علیحدہ ہونے پر مجبور کر دیا۔ ہم لوگوں نے بہت شور مچایا مگر کچھ نہ بنا اور چند ہی دنوں میں ہم پر ایک ایسا پروفیسر نازل کر دیا گیا جو تھا تو میری ٹانگ سے ذرا بڑا مگر آتے ہی چاہتا تھا کہ "دو" کھا نسے بھی تو لڑکے ڈر کے مارے کمرے کے کونوں میں دبک جائیں۔ پاکٹ سائز پروفیسر ہم پر روز جتنا رعب بٹھائے ہم اُتنا ہی ہنسیں کہ بٹھا کرتا کیا ہے۔ چند ہی دنوں میں سارے کالج میں مشہور ہو گیا کہ "فرنٹیر" میں نئے پروفیسر کو انگلیوں پر نچایا جاتا ہے۔ ہمارے کمرے کالج کی بڑی عمارت سے ذرا ہٹ کر نئے نئے بنے تھے اور ہم اپنے بلاک کو اپنی آزادی اور بے باکی کی رعایت سے "فرنٹیر" کہا کرتے تھے۔

ایک دن آپ پڑھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ کسی لڑکے نے زور سے سیٹی بجائی۔ پروفیسر نے جھلا کر کہا "کون ہے یہ سیٹی بجانے والا؟" میں نے بیٹھے بیٹھے کہہ دیا "پھجا" (فضل سے بگاڑ کر) آپ کو اور غصہ آ گیا اور سٹیج سے اُتر کر کہنے لگے "مسٹر پھجا کھڑے ہو جائیں" مگر کوئی نہ اُٹھا۔ آپ نے پھر طیش میں کہا "مسٹر پھجا کیوں کھڑے نہیں ہوتے"۔ لڑکے ہنس دیئے۔ آپ نے پھر کڑک کر کہا "مسٹر پھجا خود ہی کھڑے ہو جائیں نہیں تو میں اُن کے خلاف سخت کارروائی کروں گا"۔ اتنے میں ایک لڑکے نے ہنستے ہوئے اُٹھ کر کہا "جناب گستاخی معاف! پھجا تو جماعت میں کسی لڑکے کا نام ہی نہیں پھجا تو ہوسٹل کا حجام ہے"۔ لڑکوں نے ایک زبردست قہقہہ لگایا اور پروفیسر زمین پر پاؤں مارتے ہوئے کمرے سے باہر نکل کر یہ جا وہ جا۔

دوسرے دن پرنسپل کی طرف سے ساری کلاس کو تین تین روپے جرمانہ ہوا اور ساتھ ہی یہ نوٹس بھی ملا کہ اگر آئندہ کسی لڑکے نے ذرا سی بھی شرارت کی تو اُسے پانچ روپے تک جُرمانہ کیا جا سکتا ہے۔ لڑکے جُرمانے سے ڈر گئے اور شرارتیں بہت کم ہو گئیں۔ ایک دن پروفیسر پھُدک پھُدک کر پڑھا رہا تھا میں نے خاموش جماعت کی نالائقی پر ایک لمبی سرد آہ بھری تو صرف آہ بھرنے پر ہی مجھے ایک روپیہ جرمانہ سنا دیا گیا۔

چند دن بعد کا ذکر ہے کہ پروفیسر بورڈ پر کچھ لکھنے کے لئے گیا تو جماعت میں گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ لیکن جب اُس نے ذرا مُڑ کر دیکھا تو آواز فوراً بند ہو

گئی۔ چند منٹ کے بعد جب پھر وہ کچھ لکھ رہا تھا تو گھنٹی بجی اور وہ ابھی مُڑ کر دیکھنے بھی نہ پایا تھا کہ آواز بند ہو گئی۔ پروفیسر کچھ حیران سا ہُوا مگر اُس نے پھر لکھنا شروع کر دیا۔ آہستہ سے ٹن . . . ٹن . . . ٹن کی آواز پھر آئی تو پروفیسر نے طیش سے چاک کا ٹکڑا زمین پر پھینکتے ہوئے کہا "یہ کیا ہے؟" لڑکے خاموش تھے اُسی وقت کوئی شخص پروفیسر سے ملنے کو آ گیا اور وہ چلا گیا۔ دوسرے دن پھر پروفیسر نے آ کر پڑھانا شروع کیا اور ابھی اُس نے بورڈ کی طرف مُنہ موڑا ہی تھا کہ پھر گھنٹی کی آواز آئی ٹن ٹن ٹنا ٹن!!! لیکن اُس نے پلٹ کر دیکھا تو جماعت بالکل خاموش تھی۔ پروفیسر نے جھلّا کر کہا "یہ کل سے ٹن ٹن کی کیا آواز آ رہی ہے۔ کون گھنٹی بجاتا ہے؟" ایک لڑکے نے جواب دیا "وہ باہر گراؤنڈ میں بکری چر رہی ہے اُس کے گلے میں شاید گھنٹی ہو" پروفیسر نے لڑکوں کو کھڑا کر کے ساری کلاس کے ڈسکوں کی تلاشی لینی شروع کر دی اور غصّہ میں کہا "یہ بکری اُسی وقت چرتی ہے جب میں بورڈ کی طرف لکھنے جاتا ہوں"۔ نیچے اوپر تلاش کرنے کے بعد جب پروفیسر کو گھنٹی نہ ملی تو وہ سر کھُجلاتا ہُوا اپنی کُرسی پر جا بیٹھا اور کچھ کہے بغیر پھر پڑھانا شروع کر دیا۔ چند منٹ کے بعد وہ بورڈ کی طرف گیا تو گھنٹی پھر بجی ٹن ٹن ٹنا ٹن ٹن!!!! پروفیسر نے فوراً لڑکوں کو ڈسکوں سے باہر آنے کا حکم دیا اور کھڑا کر کے اُن کی جامہ تلاشی لی۔ ڈسکوں کو دوبارہ دیکھا۔ کمرے کے کونے دیکھے۔ ڈسکوں کے نیچے دیکھا۔ مگر کچھ نہ ملا۔ لڑکے بالکل خاموش تھے۔ پروفیسر حیران تھا۔ غصّہ سے اُس کا مُنہ لال تھا مگر ضبط کرتے ہوئے وہ ہیں "بیٹھ جایئے" کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے دوبارہ لیکچر شروع کر دیا اور جب بورڈ پر لکھنے کے لئے گیا تو اس دفعہ ذرا زیادہ بلند آواز سے گھنٹی بجنے کی آواز آئی ٹن ٹن ٹنا نا نا ٹن!!!۔ اُف پروفیسر کی حالت ایک ایسے بھُوکے شیر کے مانند تھی جو بند پنجرے کی سلاخیں توڑ کر باہر کے لوگوں کو چیر پھاڑ دینا چاہتا ہو۔ مگر وہ بار بار ہماری طرف قہر آلود نظروں سے دیکھنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اتنے میں کالج کی گھنٹی بج گئی اور وہ اپنی کتابیں لے کر چلا گیا۔

تیسرے دن ہم جب ایک دوسرے کمرہ سے آ کر اپنے کمرے میں داخل ہونے لگے تو پروفیسر پہلے ہی دروازے میں کھڑا تھا۔ باری باری اُس نے تقریباً تین پینتیس لڑکوں کی اچھی طرح سے تلاشی لے کر اُنہیں اندر جانے کی اجازت دی۔ جب سب لڑکے اندر آ گئے اور پروفیسر کو کچھ نہ ملا تو وہ اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم نے دیکھا کہ ہمارے کمرے کے باہر کالج کے تین چار چپراسی چکّر لگا رہے ہیں۔ پروفیسر پھر لکھنے کے لئے گیا تو پھر گھنٹی کی آواز آئی۔ اُس نے چپراسیوں کو بُلا کر پوچھا تو اُنہوں نے جواب دیا کہ کمرے کے باہر کوئی لڑکا نہیں۔ چپراسی چلے گئے تو پروفیسر سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس کی حالت اب قابلِ رحم تھی۔ چند منٹ کے بعد اُس نے جماعت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "میرے عزیزو! یہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے . . . . مجھے یقین ہے کہ گھنٹی تم ہی میں سے کوئی بجاتا ہے یا تمہیں علم ہے کہ گھنٹی کس طرح بجتی ہے۔ اگر تم لوگ یہ نہیں چاہتے کہ میں تمہیں پڑھاؤں اور تمہیں میری صورت ہی سے نفرت ہے تو میں کل سے نہیں آؤں گا لیکن میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ شرارت کون کرتا ہے میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ میں شرارت کرنے والے کو کسی قسم کی سزا نہیں دونگا اور میرے دل میں اس کے خلاف کبھی بغض نہ ہو گا۔" بٹوے میں سے دس روپے کا نوٹ نکال کر میز پر رکھتے ہوئے اُس نے کہا "بلکہ میں اُسے انعام دینے کے لئے تیار ہوں۔ یہ سب کچھ میں نے تمہیں ایک پروفیسر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک دوست کی حیثیت سے کہا ہے۔" کلاس میں چند منٹ تک خاموشی رہی۔ لڑکے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں ہنستا ہُوا اُٹھ کر پروفیسر کے پاس گیا اور اپنی پگڑی اُتار کر اُس کی میز پر رکھ دی جس کے لمبے سے مشہدی کلاہ میں چھوٹی سی گھنٹی لٹک رہی تھی۔ پروفیسر نے مُسکراتے ہوئے میری پگڑی پہن لی۔ اور اپنے سر کو ذرا ہلاتے ہوئے کہا "اچھا! یوں بجاتے ہیں اسے" ٹن ٹن ٹنا ٹن ٹن!!!۔ کلاس ایک دفعہ پھر قہقہوں سے گونج اُٹھی۔

فاروق علی خاں

کلامِ شاد

مرسلہ آنریبل شیخ سر عبدالقادر سابق مدیر "مخزن"

میرے ایک دوست ترمبنی سرن صاحب شاد بی-اے، ایل ایل بی ہیں جو آج کل بھوپال میں سب جج ہیں۔ وہ اُردو کے قدردان ہیں اور اُردو غزل خوب کہتے ہیں مجھے اُن کا کلام سننے کا اتفاق ہوا تھا۔ میں نے یہ دو غزلیں اُن سے آپ کے رسالہ "ہمایوں" کے لئے مانگ لی تھیں۔ ارسال خدمت ہیں۔ والسلام

آپ کا مخلص
عبدالقادر

ہمایوں۔ ہم آنریبل سر عبدالقادر کے ممنون ہیں کہ اُنہوں نے شاد صاحب کی یہ دو غزلیں "ہمایوں" کے لئے حاصل کرنے کی زحمت گوارا فرمائی۔

(۱)

آسماں بھی تو آسماں نہ رہا — برق چمکی جب آشیاں نہ رہا

دل کا جلنا کبھی نہاں نہ رہا — شعلے نکلے اگر دھواں نہ رہا

کوئی عنوانِ داستاں نہ رہا — ضبط بھی داخلِ فغاں نہ رہا

بوستاں ہے وہی مگر صیّاد — بوستاں اب وہ بوستاں نہ رہا

دل مرا یا تری نظر ظالم — کون نشتر قریبِ جاں نہ رہا

کیا قفس بھی قفس نہیں اپنا — آشیاں خیر آشیاں نہ رہا

دل کو اچھا کیا مٹا ڈالا — اب کوئی رازدرمیاں نہ رہا

سَمے[1] کی پُکار!

بھوک کے مارے ہند کے پیارے — تُو بھی ہے اِس دُنیا کے اندر
تُو بھی خدا کی زمیں پہ بسا ہے — تجھ کو بھی چاہیئے خود اپنا گھر!
سامنے اپنے حقوق کے اَڑ جا — دل کو قوی کر موت سے مت ڈر!

رزق پہ تیرے یہ پہرہ کیسا — کیوں نہیں راحت تجھ کو میسّر
ہے یہ سمے کا تقاضا تجھ سے — کیوں نہیں سب کی طرح تُو خودسر
دُور ہے کیوں تُو اپنی خودی سے — دل کو قوی کر موت سے مت ڈر!

اپنے وقار کے بل پہ کھڑا ہو — سب کو دکھا دے ضبط کے جوہر
کھول رہا ہے خون بدن میں — جی کو سنبھال لے دل کو قوی کر
سامنے عزم کے سُن نہ کسی کی — اپنی کہے جا مَوت سے مت ڈر!

دیکھ قدم تھرّائیں نہ تیرے — عزم ہے تیرا جان سے بڑھ کر
اب تو سمے کی پکار یہی ہے — خود ہی خدا[2] بن خود ہی پیمبر
سُن نہ کسی کی اپنی کہے جا — دل کو قوی کر مَوت سے مت ڈر!

---

[1] سَمے بمعنی وقت + [2] خدا اور پیمبر سے مطلب ذاتِ وحدہٗ لاشریک اور انبیاء مرسلین نہیں بلکہ مُوجد و مقلّد کے جیسے "خدائے سخن" — "در شعر مکیں پیمبرانند" وغیرہ جملوں میں۔

خوف کے بادل گھور رہے ہیں — جیسے بھیانک بھوت ڈرائیں
ضبط کی آنکھ سے دیکھ لے تُو گر — ہو کے غبار ہوا ہو جائیں
دیکھ جھجک نہ ذرا بھی کسی سے ـــــــ دِل کو قوی کر مَوت سے مَت ڈر

توپ کے گولے بم کے دھماکے — اپنی ہی مَوت کے آپ نشاں ہیں
جسم تو جسم سے ٹوٹ سکے گا — رُوح کے آگے سب یہ دُھواں ہیں
جی کے مَرے اور مَر کے جیئے تُو ـــــــ ضبط سے کام لے مَوت سے مَت ڈر!

پھُونک دے صور، بگل کو بجا دے — جیتے ہوئے مُردوں کو جلا دے
نام گھُمنڈ کا جگ سے مِٹا دے — خاک میں دھن کے دھڑلّے[1] مِلا دے
توڑ دے ظلم کی زنجیروں کو ـــــــ دِل کو قوی کر مَوت سے مت ڈر!

آنکھ نہ پھیر حقوق سے اپنے — چھوٹنا حق سے ہے جی سے گزرنا
بل پہ اسی کے ہے قوم بھی قائم — خودکُشی خود ہی نہ چاہیئے کرنا
بھُوک کے مارے ہند کے پیارے ـــــــ دل کو قوی کر موت سے مَت ڈر!

تجھ کو قسم ستّ تتّو[2] کی ہندو! — جوش میں لا پھر شکتی ساگر
تجھ کو قسم توحید کی مُسلم! — قوم میں وحدت پھر سے بپا کر
ضبط سے کام لے اصدق! اپہ اَڑ جا ـــــــ دل کو قوی کر موت سے مت ڈر!

سیّد مقبول حسین احمد پوری

[1] دھڑلّے معنی قہقہے ۔ من کی ترنگیں ۔ رنگ رلیاں وغیرہ۔
[2] ست تتّو معنی سچی حقیقت ۔ جوہرِ صدق ۔ ذاتِ مطلق ۔ الکھ نرنجن ۔

غالب اور بیدل

غالب کے بہت ابتدائی اشعار عام طور پر بے اعتنائی سے نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں۔ اور چونکہ ان کا شاعرانہ پایہ بلند نہیں ہے اس لئے غالب کے تمام نقادوں میں سے کسی نے بھی شاعر کے کلام کے اس حصّے کو تفصیل کے ساتھ معرضِ بحث میں لانا ضروری نہیں سمجھا۔ دراصل غالب کے ذہنی ارتقا کا مطالعہ کرنے والے کے لئے عہدِ طفلی کا کلام اساسی اہمیت رکھتا ہے۔ محض یہ حقیقت مختصر طور پر بیان کر دینا کہ "شروع شروع میں مرزا غالب نے بیدل کے انداز کی تقلید کی" غالب کی اولیں اور پرجوش شاعرانہ عقیدت کی شرح کا حق ادا نہیں کرتا۔ پروفیسر حمید احمد خاں صاحب نے اس موضوع پر ذیل میں بوضاحت بحث کی ہے۔ اُنہوں نے بتایا ہے کہ غالب نے دس سال کی عمر میں میؔر کے بجائے بیدل کو اپنا رُوحانی اُستاد کیوں اور کس طرح بنایا۔ بیدل کے انداز کی خصوصیات کیا ہیں اور یہ خصوصیات کس حد تک غالب کے ابتدائی کلام میں منعکس ہوئی ہیں۔ نیز معنوی طور پر غالب اور بیدل میں کیا اشتراک و امتیاز ہے۔ یہ بحث دو حصّوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ پہلے حصّے میں (جو اس مہینے شائع کیا جا رہا ہے) غالب کے عہدِ طفلی کے اشعار اور بیدل کے عام اندازِ کلام کے صوری عناصر کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ دوسرا حصّہ جو فروری کے "ہمایوں" میں شائع ہوگا، غالب و بیدل کے معنوی اتحاد و اختلاف کی تشریح کرے گا۔ ناظرین اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھیں کہ مقالۂ ذیل میں غالب کے کلام کا وہ نہایت ابتدائی حصّہ زیرِ بحث ہے جسے عام طور پر "مہملات" کا نام دیا جاتا ہے۔ سنِ بلوغ تک پہنچتے پہنچتے غالب نے بیدل کی تقلید ترک کر دی تھی اس لئے غالب کا پختہ کلام اس مقالے میں ایک حد تک خارج از بحث ہے۔"

حامد علی خاں

اورنگ زیب عالمگیر کا سالِ وفات جس طرح ہندوستان میں اسلام کی سیاسی طاقت کے زوال کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا اسی طرح فارسی زبان بھی مسلمانوں کی مسلّمہ ادبی زبان کی حیثیت سے دراصل عالمگیر کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی۔ عوام نے تو غالباً شاہ جہاں کے عہد ہی سے روزمرّہ کی بات چیت میں اُردو (یا اس زمانے کی اصطلاح کے مطابق "ہندی") کا استعمال شروع کر دیا تھا لیکن کم از کم ۱۷۰۷ء تک بادشاہ، اُمرا، دشرفا یقیناً فارسی ہی میں گفتگو کرتے تھے۔ اورنگ زیب کی وفات سے کچھ عرصہ بعد بادشاہ و اُمرا نے بلاتکلف اُردو میں گفتگو کرنے کی طرح ڈال دی۔ سب سے پہلے شاید محمد شاہ "رنگیلے" نے اس "غیر سرکاری" طریقے پر اُردو کی سرپرستی شروع کی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے پایۂ تخت اور اس کے نواح میں اُردو شاعری کا آغاز محمد شاہ کے عہد سے ہوا۔ چنانچہ ولؔی نے دکن سے آ کر چند ہی سال میں اپنے "ریختے" یعنی "ہندی" "غزل گوئی" سے دلی کو مسخر کر لیا۔

دل ولؔی کا لے لیا دلّی نے چھین — جا کہے کوئی محمد شاہ سوں

جب دربار میں اس نئی شاعری کی قدر افزائی ہوئی تو دلّی کے گلی کوچوں نے اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر اس کا خیر مقدم کیا۔ اورنگ زیب کے عہدِ حکومت کے پچاس سال بادشاہ کے زہد و تقشف کی وجہ سے غزل گوئی اور سخن سنجی کے لئے خاص طور پر ناسازگار رہے تھے۔ بعض روایتوں

سے ظاہر ہوتا ہے کہ تخت نشین ہونے سے قبل عالمگیر اچھے شعر سے لطف اندوز ہونا اپنے لئے باعثِ عار نہ سمجھتا تھا تاہم اُس وقت بھی شعر و شاعری سے اُس کے ذوقِ عمل اور جوشِ تقویٰ کی بیزاری اس حد تک معروف ہو چکی تھی کہ اُس کے مقربینِ بارگاہ اس کے سامنے اپنے شاعرانہ کمال کا اظہار اپنے لئے ذریعۂ عزت نہیں سمجھتے تھے۔ اُس کے ایّامِ شہزادگی کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ اثنائے شکار میں جب نواب عاقل خاں نے اپنا یہ شعر اُس کے سامنے پڑھا: ۔

عشق چہ آساں نمود، آہ چہ دشوار بود — ہجر چہ دُشوار بُود، یار چہ آساں گرفت!

اور عالمگیر نے اس شعر پر دیر تک وجد کرنے کے بعد پوچھا کہ کس کا شعر ہے؛ تو عاقل خاں نے جواب دیا: "ایک ایسے شخص کا جو بندگانِ حضور کے سامنے شاعر کے نام سے موسوم نہیں ہونا چاہتا۔" تقریباً نصف صدی بعد جب صاحب "مرآۃ الخیال" نے عالمگیر کے عہدِ سلطنت میں اپنا تذکرۂ شعراء مرتب کرنا شروع کیا تو دَورِ عالمگیری کے آغاز کی تصویر اِن دلچسپ الفاظ میں کھینچی: ۔

"اُس کے درّۂ عدل کی ہیبت سے حسینوں کا خالِ کافر کیش محرابِ ابرو میں مصروفِ نماز ہو گیا اور اس کے محکمۂ قضا کے دبدبے سے خوش جمالوں کے غمزۂ خوں ریز کو حجرۂ چشم میں چلّہ نشیں ہونا پڑا۔"

یہ چلّہ کشی پوری نصف صدی تک جاری رہی۔ آخر ۱۷۱۹ء میں اس پنجاہ سالہ سکوت و جمود کا ردِّ عمل شروع ہوا۔ "رنگیلے پیا" اورنگ زیب کی وفات کے بارہ سال بعد سریر آرائے سلطنت ہوئے اور اُنھوں نے گزشتہ نصف صدی کی قاعدہ شناسی اور اصول نوازیوں کا طلسم خوب دل کھول کر توڑا۔ عوام نے قدرۃً بے حد جوش و خروش سے وَلی کی شاعری کا خیر مقدم کیا۔ ساٹھ ستّر سال کی پابندیٔ نظم و ضبط کی وجہ سے ان کے جذبات اپنے اظہار کے لئے گھبرائے ہوئے تھے۔ وَلی ایک نہایت موزوں نفسیاتی موقع پر دلّی میں وارد ہوا اور اُس نے اُن کے بے تاب جذبات کے لئے ایک بے حد دلپذیر ذریعۂ اخراج مہیا کیا۔ نئی زبان کی شاعری جس سُرعت سے مقبول ہوئی اُس کی تہ میں یہی راز تھا اگرچہ اِس عہد کی فارسی شاعری کی روش بھی شاید ایک حد تک اس انقلاب کی ذمہ دار تھی۔ بہرحال ریختہ گوئی کی مقبولیت کی رفتار نہایت حیرت انگیز ثابت ہوئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اٹھارویں صدی کے وسط تک اُردو کی حیثیت بہ لحاظ ایک ادبی زبان کے قطعی طور پر مسلّم ہو گئی۔

وَلی اور اُس کے مقلدین ادبی حیثیت سے گویا اُردو زبان کی تخلیق کر رہے تھے۔ اس لئے قدرۃً ان کی توجہ زبان کے مانجھنے اور اُردو میں فارسی کے مقابلے کے اسالیبِ اظہار فراہم کرنے پر بہت زیادہ مبذول تھی۔ زبان و بیان کو زیادہ اہمیت دینے کی یہ روایت میرؔ و سوداؔ کے توسط سے اُنیسویں صدی تک قائم رہی اور اس کا منطقی نتیجہ ذَوقؔ کی شاعری کی صورت میں رُونما ہوا جس کی غزل میں حسن و صفائے بیان اور قصیدے میں شکوہِ الفاظ و قدرتِ کلام بجائے خود ایک قیمت رکھتے ہیں، خواہ ان کی تہ میں کتنا ہی کمزور خیال یا جذبہ کیوں نہ ہو۔ اس کے برعکس اٹھارویں صدی کے سب سے بڑے شاعر میرؔ کا کمالِ فن یہ ہے کہ اس کے کلام میں جذبے اور اظہار کا نہایت لطیف توازن قائم ہے اور اس کے بہتر اشعار میں یہ کبھی معلوم نہیں ہوتا کہ اس نے ان دونوں میں سے کسی ایک کو غیر متناسب اہمیت دی ہے۔ جب اُنیسویں صدی کا آغاز ہوا تو فنِ ریختہ کے کہنہ سال اُستاد میرؔ کے شاعرانہ کمال کے صدقے میں سادگی اور سلاست کے متعلق وَلی کی قائم کی ہوئی روایت اُردو

ادب کی دُنیا میں کامل طور پر تسلیم کی جا چکی تھی۔

اُردو شاعری کی اس نوخیز روایت کے ساتھ ساتھ ایک ادبی مسلک بھی موجود تھا جس کا اندازہ اُردو کی سلامت روی اور سلاست پسندی سے بُعدِ قطبین رکھتا تھا۔ یہ فارسی کے متاخرین شعراء کا مسلک تھا جس کے مطابق سخن آرائی میں تکلف آمیز نازک خیالی اور جدت طرازی معیارِ کمال سمجھی جاتی تھی۔ فارسی شاعری اب اپنے دورِ سادگی کو عرصہ ہوا' پیچھے چھوڑ چکی تھی اور گزشتہ صدی سے دراصل اپنے ضعف و زوال کی اُس منزل میں داخل ہو چکی تھی جسے مغربی فن کی اصطلاح میں " rococo " کہا جاتا ہے۔ اُردو میں اس کیفیت کو 'صنائع و بدائع' سے تعبیر کیا جائے تو شاید وہی مطلب ادا ہو سکے۔ وَلی کے فارسی گو معاصرین میں مرزا عبدالقادر بیدل اور ناصر علی سرہندی اس طرزِ شاعری کے سب سے بڑے اُستاد تھے

غالب کے متعلق سب سے پہلی بات جو یاد رکھنی چاہیئے یہ ہے کہ اُس کا سلسلۂ نسب براہِ راست فارسی گو شعرا سے ملتا ہے۔ وَلی اور میر کی نسل سے، کم از کم اپنے پہلے دَور میں، اُسے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اُس کے ابتدائی اشعار دیکھیئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُسے قطعاً یہ احساس نہیں تھا کہ میر کے نام کا بھی کوئی شخص ہو گزرا ہے۔ محمد شاہ کے عہد میں فارسی اور ہندوستانی ادب کے درمیان جو خلیج قائم کی گئی تھی اور جسے اسّی نوے سال کی شاعرانہ کاوشوں نے ناقابلِ عبور حد تک وسیع کر دیا تھا، غالب اپنے ظہور کے ساتھ ہی بلا تکلف اُسے پاٹنے کی فکر میں مصروف نظر آتا ہے۔ اورنگ زیب کی وفات کے ٹھیک ایک سو سال بعد ۱۸۰۷ء میں وہ ایک صدی کی اُلٹی زقند لگا کر وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں عہدِ اورنگ زیب کے حصۂ آخر کے شعراء کھڑے تھے۔ ریختہ گو شعراء نے فارسی سے کٹ کر جو الگ راہ نکالی تھی اُس پر چلنے کا خیال تک اُسے نہیں آتا سو وہ اُردو میں شعر لکھتا ہے مگر اُردو اور فارسی میں کوئی امتیاز نہیں کرتا۔ دراصل محمد شاہی دَور کے بعد پہلی مرتبہ اُردو کے ایک شاعر نے یہ کوشش کی کہ ریختے کی ایک صدی کو فراموش کر کے براہِ راست فارسی سے رشتہ جوڑنے کا ڈھنگ نکالے اور ریختہ گو شعرا کی روایات سے قطع نظر کر کے فارسی شعراء کے دوش بدوش کھڑا ہونے کی کوشش کرے۔ یہ ایک ایسی تحریک تھی جس کا بارور ہونا ممکن نہ تھا اور اس کا اقدام کوئی ناتجربہ کار اور بے حد پرجوش نوجوان ہی کر سکتا تھا۔ وہ شاعرانہ روایت جو ایک سو سال کی سخن پردازیوں کا ماحصل تھی، ایک طفلِ ناآزمودہ کار کی مدعیانہ للکار کو خاموشی سے نہیں سُن سکتی تھی، چنانچہ غالباً ۱۸۱۵ء[1] میں نپولین کی طرح غالب نے بھی اپنے اس واٹرلو کے معرکے میں فیصلہ کُن شکست کھائی اور اپنی شاعرانہ روش بڑی حد تک بدل ڈالی، لیکن اس شکست کے باوجود نوجوان شاعر کا سرِ غرور اُردو کے سامنے بالکل جُھک نہیں گیا۔ فارسی سے جو گہری رُوحانی مناسبت اُس کو تھی وہ اپنے اظہار کے لئے مضطرب رہی جس کے باعث وہ اور پانچ چھ برس تک مختلف اطراف و جوانب میں اپنے نقادوں سے برسرِ پیکار رہا۔ اِس مدت کے خاتمے پر (یعنی ۱۸۲۱ء کے قریب) روز روز کی اس چپقلش سے تنگ آ کر اُس نے اپنی عنانِ تخیل ریختہ گوئی کے میدان سے ایک حقارت آمیز انداز کے ساتھ بظاہر ہمیشہ کے لئے پھیر لی۔ یہ عزم آخر تک قائم نہ رہ سکا۔ تقریباً تیس سال بعد یعنی ۱۸۵۰ء میں دربارِ بہادر شاہ کے ساتھ تعلق قائم ہو جانے پر غالب نے دوبارہ اُردو میں شعر کہنا شروع کیا اور اس میں وہی تبدیل شدہ انداز جاری رکھا جو

---

[1] غالب کی شاعری کے پہلے اور دوسرے دَور کی تاریخوں کے تعین کے متعلق مجھے ڈاکٹر سید عبداللطیف اور شیخ محمد اکرام سے شدید اختلاف ہے مگر اس کی شرح جو بہت زیادہ تفصیل کی محتاج ہے یہیں کسی اور موقع کے لئے اُٹھا رکھتا ہوں۔

ابتدائی ۱۸۱۵ء کے قریب اختیار کیا تھا تاہم یہ تغیر اتنا انقلاب انگیز نہیں تھا، نہ ہو ہی سکتا تھا کہ دورِ اول کی باتیں ایک فراموش شدہ کہانی بن جاتیں۔ اُردو زبان کی روایات اب غالب کے نزدیک قابلِ احترام ضرور تھیں مگر فارسی سے غالب کے گہرے لگاؤ کا احساس ہمیشہ ان کے ساتھ شامل رہا۔ یہ اِسی کا نتیجہ ہے کہ بحیثیتِ مجموعی فارسی کی طرف غالب کی بازگشت رائگاں نہیں گئی۔ اٹھارویں صدی میں جس سُرعت کے ساتھ فارسی ہمارے احساس و تخیل کی سرزمین سے نابود ہو رہی تھی، اس کو روک دینا غالب ہی کے زبردست ہاتھ کا کام تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ولی، میر، ذوق اور داغ کا سلسلہ غالب کے ظہور سے برہم نہ ہوتا تو ہمارے عہد کا اُردو ادب اپنے موجودہ انداز سے بہت کچھ مختلف ہوتا۔

الغرض غالب کی پہلے دور کی اُردو شاعری کے مطالعے میں شروع ہی سے یہ قرار دے لینا چاہئے کہ ہم دراصل فارسی شاعری کی ایک خاص شکل کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ اس دور کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جن میں ہندی کا ایک بھی لفظ شامل نہیں ہوتا مثلاً ؎

اسدِ خستہ گرفتارِ دو عالم اوہام ۔۔۔ مشکل آساں کُن یک خلق! تغافل تا چند؟

لیکن جن اشعار میں ہندی کا کوئی لفظ اتفاق سے آ بھی جاتا ہے، اُن میں بہت سے ایسے ہیں جن میں فارسیت کی رُوح دراصل پہلی قسم کے اشعار سے بہت زیادہ حلول کیے ہوئے ہے۔ مثلاً مندرجۂ بالا شعر کو تو اُردو شاید قبول کرنے پر تیار ہو بھی جائے مگر ذیل کے مشہور شعر کو اُردو زبان کا نام دینا بہت بڑا استجاوز معلوم ہوتا ہے ؎

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا ۔۔۔ تماشائے بہ یک کف بُردنِ صد دل پسند آیا

یا یہ شعر دیکھیے ؎

آشیاں بندِ بہارِ عیش ہوں ہنگامِ قتل ۔۔۔ یاں پرِ پروازِ رنگِ رفتہ بالِ تیر ہے

صرف یہی نہیں کہ ان اشعار کے صوری عناصر کی تعمیر فارسی زبان نے کی ہے بلکہ جس طرزِ تخیل پر ان کی بنیاد قائم ہے وہ انہیں میر اور اُس کے مقلدین کے بجائے دورِ عالمگیری کے فارسی شعرا کی روایت سے براہِ راست وابستہ کر دیتا ہے۔ ان شعرا میں بیدل عظیم آبادی سب سے زیادہ ممتاز تھا چنانچہ مرزا غالب نے لڑکپن میں اسیر و شوکت کے علاوہ بیدل کے مطالعے اور تقلید پر خصوصیت سے زور دیا۔ اس کی سند کے طور پر خود غالب کا بیان مکاتیب میں موجود ہے اور تقریباً تمام نقادوں کو جن میں حالی اور شبلی جیسے مشاہیر بھی شامل ہیں، اس سے اتفاق ہے کہ ابتدائی دور میں غالب کے نزدیک بیدل کی خیال بندی اور نکتہ آفرینی شاعری کی معراجِ کمال تھی ؎

ہے خامہ فیضِ بیعتِ بیدل بہ کف اسد ۔۔۔ یک نیستاں قلمروِ اعجاز ہے مجھے

جہاں تک مجھے علم ہے، صرف مولانا غلام رسول مہر نے اپنی کتاب "غالب" میں اس حقیقت سے ایک حد تک اختلاف کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔ "وہ (یعنی مرزا غالب)، بیدل کی تقلید میں نازک اور بلند مضامین پیدا کرنا چاہتے تھے لیکن نہ دماغی قویٰ نے بلوغ حاصل کیا تھا، نہ اندازِ بیان پر پوری قدرت و دستگاہ حاصل ہوئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بیدل کے خاص الفاظ و تراکیب کو بہ کثرت استعمال کرتے تھے اور اسے اپنے ذہن میں بیدل کی پیروی سمجھتے تھے، جس طرح آج کل کے بعض فرمایہ اور

کور ذوق اصحاب نے اشعار میں فارسی اضافتوں کے مسرفانہ استعمال کو غالب کی پیروی سمجھ رکھا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

لڑکپن میں مرزا غالب کے تخیل اور قوتِ بیان کی ناپختگی بہر نوع مسلم ہے لیکن دورِ اول میں بیدل کے ساتھ ان کی مماثلت اتنی سطحی اور اتفاقی بھی نہیں ہے جتنی عبارت مافوق کے حصۂ آخر سے مترشح ہوتی ہے۔ میری رائے میں تخیل کے ایک بنیادی عنصر کا اشتراک اس امر کا باعث ہوا کہ شروع ہی میں (رہبر کے بجائے) بیدل کے کلام نے غالب کو اپنی طرف کھینچا۔ تحلیل و تجزیہ غالب کے تخیل کا ایک ایسا مستقل لازمہ ہے کہ بیدل کے خاص اسلوبِ بیان کی تقلید ترک کر دینے کے بعد بھی اسے ایک مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ اس کے علاوہ یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ جس حد تک شعر کی محض فنی کیفیتوں (مثلاً انتخاب و نشستِ الفاظ اور تشبیہ و استعارہ کی ساخت) کا تعلق ہے غالب کے ابتدائی اشعار اور بیدل کے کلام کے ایک بہت بڑے حصے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس مشابہت کی شرح میں یہاں کسی قدر تفصیل سے کرتا ہوں۔

دنیا میں شاید کسی قوم کا ادب ایسا نہیں جس کا آغاز نظم سے نہ ہوا ہو اور یہ نظم ابتداءً سادگیٔ خیال سے ممتاز نہ رہی ہو۔ وجہ یہ ہے کہ ابتدائی دور میں شاعر کو کسی جذبے یا خیال کے تجزیے سے سروکار نہیں ہوتا۔ وہ اس کے واضح اور نمایاں پہلو کو بحیثیت ایک غیر منقسم کُل کے دیکھتا ہے اور الفاظ میں اسی کی تعبیر کر دیتا ہے۔ ادب کے ارتقا کے ساتھ تخیل کی یہ ترکیبی[1] کیفیت گھٹنے لگ جاتی ہے۔ چنانچہ نثر پیدا ہو جاتی ہے جو تحلیل و تجزیہ کا مخصوص ذریعۂ اظہار ہے اور خود شعرا کی نگاہ بھی اشیا و واردات اور جذبات و خیالات کے تحلیلی پہلوؤں پر زیادہ اٹھتی ہے۔ بالفاظِ دیگر اس دور میں بدیہی حقائق کے بجائے نکات کے بیان پر زیادہ توجہ ہوتی ہے۔ سعدی و حافظ اور عرفی و غالب کی غزلیات میں ترکیبی اسلوبِ بیان کا عروج و زوال بڑی خوبی سے نظر کے سامنے آ جاتا ہے۔ مولانا حالی نے مقدمۂ دیوان میں سعدی، حافظ اور غالب کا ایک ایک شعر دیا ہے۔ تینوں شاعروں نے مصیبت و ابتلا کی تصویر ایک بحری تشبیہ کے ذریعے سے کھینچی ہے لیکن تینوں تحلیل و تجزیہ کے عنصر میں بتدریج اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں:

سعدی

از ورطۂ ما خبر ندارد آسودہ کہ بر کنارِ دریاست

حافظ

شب تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں حائل کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحل ہا

غالب

گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفت است ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز

فارسی شاعری کے ابتدائی دور میں تخیل کی ترکیبی ہیئت نہایت وضاحت کے ساتھ موجود ہے۔ مثلاً رودکی کا جو مشہور قصیدہ امیر

---

[1] "ترکیبی" کے بجائے شاید لفظ "بدیہی" کا استعمال بھی ممکن تھا مگر بدیہی میں جو شائبۂ استخفاف پایا جاتا ہے اس کو ترکیبی شاعری سے منسوب کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جس طرزِ بیان کو ہم سادہ یا بدیہی کہتے ہیں اس میں حقیقتاً ذہنی طور پر ترکیب کا عمل واقع ہوتا ہے لیکن یہ عمل غالباً وجدانی ہے ارادی نہیں۔

دمید دانہ و بالید و آشیاں گہ شد ۔ در انتظار ہما دام چیدنم بنگر!

بیدل کی تشبیہات وخیالات میں یہ تحلیلی انداز بے حد نمایاں ہے۔ مثلاً حیرت میں استفہام کا جو پہلو پایا جاتا ہے، اس کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ اپنے مخصوص طرزِ بیان میں آنکھ کو کان سے مشابہ قرار دیتا ہے ؎

حسرت کمین مژدۂ اصلیست حیرتم ۔ چشمم بہم نیامدہ گوشش فسانہ ایست

ایک نسبتاً صاف تشبیہ ہے ؎

کمش سر زپستی کہ آواز آب ۔ ترقی بہ قدرِ تنزل کند

اس تمام بحث سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ "ترکیبی" اور "تحلیلی" شاعری میں کس نوعیت کا فرق قائم ہے تخیّل کی یہ "تحلیلی" کیفیت اگرچہ تمدن کی ترقی الوازمِ معاشرت کی تدریجی نفاست وارتقا اور سرمایۂ علم وحکمت کے اضافے کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہے لیکن اس کے برعکس تہذیب وتمدن اور طرزِ بُود وماند کی "تحلیلی" نفاستوں کے ساتھ ہی لازماً "تحلیلی" شاعری کا فروغ نہیں ہوتا۔ اس طرزِ بیان کا ظہور تمدن کے ارتقا کے علاوہ ایک خاص شاعرانہ روایت کے ارتقا کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں عہدِ مغلیہ کا تمدن ایک طرف تو سترھویں صدی کے شعراء سے اس قسم کے اشعار لکھوا چکا تھا ؎

تاک را سیراب کن اے ابرِ نیساں در بہار ۔ قطرہ تا مے می تواند شد چرا گوہر شود؟ (دانش)

آنہا کہ بہ عقل از تو نشاں می طلبیدند ۔ پیراہنِ مہتاب نمودند کتاں را (فرجی)

از زباں صورت نہ بندد رازِ احوالِ درول ۔ حلِ عقد موئے معنی شانہ کے داند کہ چیست (سوزی)

دلِ غم دیدۂ دارم مپرس از گردِ کلفتہا ۔ صدا در کوہ چوں رگ ماندہ از سنگینیٔ آہش (ناصر علی)

شب عید از خیالِ ابروئت گر بر فلک بینم ۔ بداغم ناخنِ گردوں خلد چوں نیش عقربہا (شائق)

نہ شد آئینہ کیفیتِ ما ظاہر آرائی ۔ نہاں ماندیم چوں معنی بچندیں لفظ پیدائی

بہ غفلت ساختن دل تا وارہد ز غیرتِ امکاں ۔ چہامی سوخت ایں آئینہ گر می داشت بینائی (بیدل)

اور دوسری طرف اسی تمدن نے ریختہ گوئی کے آغاز میں ولی کی زبان سے کیفیتِ ذیل کے اشعار کہلوائے[1] ؎

تجھ لب کی صفت لعلِ بدخشاں سے کہوں گا ۔ جادو ہے ترے نین غزالاں سے کہوں گا

زخمی کیا ہے مجھ تری پلکوں کی انی نے ۔ یہ زخم ترا خنجر و بھالاں سے کہوں گا

---

[1] یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ بیدل کے دو اردو شعر جو بذریعہ میر ہم تک پہنچے ہیں اپنی گھلاوٹ اور اندازِ بیان کی صفائی کے لحاظ سے خود بیدل کے بجائے میر کے بہترین انداز کی یاد دلاتے ہیں۔ مضمون فلسفیانہ ہے اور بیدل کے مخصوص فلسفۂ "بے خودی" سے اسے بہت قریبی مشابہت ہے۔ پھر بھی بیدل کے فارسی انداز کی "ہمہ ارا پیچیدگیاں" یہاں بالکل نظر نہیں آتیں۔ "چمنستانِ شعراء" میں یہ دونوں شعر بحوالۂ میر یوں مندرج ہیں ؎ مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم ہیں + اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم ہیں
جب دل کی آستاں پر عشق آن کر پکارا + پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم ہیں

ریختے کا یہ "ترکیبی" اندازِ بیان انیسویں صدی کے آغاز تک قائم رہا جب ناگہاں غالب نے اپنے بازوئے ناآزمودہ کی پوری قوت سے اس کی بیخ و بنیاد پر وار کیا اور فارسی کے دَورِ آخر کی "تحلیلی" روایت کو ریختے کے دورِ اول کے ساتھ بہ جبر ملا دینا چاہا۔ حافظ کی طرح میر کے ترکیبی تخیل کے ساتھ بھی دورِ تحلیل کی سرحد آملی ہے لیکن بڑی حد تک وہ وَلی کی قائم کردہ روایت کا پابند ہے۔ میر کی واقعہ نگاری کا نہایت صاف نمونہ یہ ہے ؎

ابر اُٹھا تھا کعبے سے اور جھوم پڑا میخانے پر ‏ ‏ ‏ ‏ بادہ کشوں کا جھرمٹ ہے گا شیشے اور پیمانے پر

تشبیہ کا پاکیزہ ترین انداز یہ ہے ؎

کہا میں نے گُل کا ہے کتنا ثبات؟ ‏ ‏ ‏ ‏ کلی نے یہ سُن کر تبسم کیا!

اس کے خلاف غالب شروع سے آخر تک اپنے اُردو اشعار میں جا بجا اپنی "تحلیلی" مناسبتِ طبع کا ثبوت دیتا ہے ؎

از مہر تا بہ ذرّہ دل و دل ہے آئنہ ‏ ‏ ‏ ‏ طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئنہ

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے ‏ ‏ ‏ ‏ تکلف برطرف، تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا، ‏ ‏ ‏ ‏ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھیے کیا ہو ‏ ‏ ‏ ‏ ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے

ان چاروں شعروں میں غالب کی عمر کے چار مختلف منازل کے مطابق اس کے تحلیلی تخیل کی تمام مدریجات نمایاں ہیں۔ لڑکپن کی ناپختہ کارانہ بیتابیِ اظہار، عنفوانِ شباب کی رنگینیِ جذبات، انتہائے بلوغ کے زمانے کی پختگیِ خیال اور آخر میں بڑھاپے سے کچھ پہلے کی مشّاقانہ قدرتِ کلام کے ساتھ ساتھ تجزیہ و تحلیل کا انداز ہر جگہ قائم ہے لیکن جہاں بیدل کے تحلیلی طرزِ خیال کا موضوع فلسفہ و اخلاق کے مسائل ہیں وہاں غالب فلسفہ و اخلاق کے علاوہ نفسیاتی نکات کو بھی اپنی جستجو کے میدان میں لے آتا ہے بلکہ نفسیاتی تجزیے سے آگے بڑھ کر کہیں کہیں تحلیلِ نفسی کی سرحد تک جا پہنچتا ہے چنانچہ مندرجہ بالا چار شعروں میں سے تیسرا شعر اس طرزِ خیال کی ایک مثال ہے۔

لیکن نفسیاتی تجزیہ یا نفسی تحلیل بہت بعد کی باتیں ہیں۔ دَورِ اوّل کے کلام میں جب بیدل کی تقلیدِ غالب کے لئے سرمایۂ نازش تھی نفسیاتی تجزیے کا صرف ایک دُھندلا سا آغاز نظر آتا ہے۔ لڑکپن کے ان اشعار میں غالب کو زیادہ تر محض عینی (Concrete) واقعات کے تجزیے سے سروکار ہے۔ تحلیلِ جذبہ و خیال کی منزل تک پہنچنے کے لئے اُسے ابھی اور چند برس لینے ہیں۔ ابتدائی دَور کے تحلیلی واقعات کا انداز یہ ہے ؎ ‏ ‏ ‏ ‏ اسد جاں نذرِ الطافے کہ ہنگامِ ہم آغوشی ‏ ‏ ‏ ‏ زبانِ ہر سرِ مُو حالِ دل پرسیدنی جانے

یہاں شاعر ہم آغوشیِ محبوب کو محبوب کی وہ بڑی سے بڑی نوازش قرار دیتا ہے جس کے ذریعے سے محبوب کے بدن کا رُواں رُواں بزبانِ حال اُس کے دل کی کیفیت اس سے پوچھ رہا ہے۔ اسی طرح ایک اور شعر ہے ؎

اے خوشا وقتے! کہ ساقی یک خمستاں وا کرے ‏ ‏ ‏ ‏ تارِ و پودِ فرشِ محفل پنبۂ مینا کرے

مطلب یہ ہے کہ دورِ ساغر کی ایسی فراوانی ہو کہ ایک صراحیِ مے کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری کھلتی چلی جائے۔ نوبت یہاں تک

آئے کہ بادہ کشوں کے نیچے پنبۂ مینا کا فرش ہوجائے۔ ایک اور جگہ زمین میں دبے ہوئے بیج کا تعلق تحت الارض خزانۂ آب کے ساتھ بڑی موشگافیوں کے بعد ثابت کیا ہے۔ پاتال کا یہ پانی رِس رِس کر اُوپر کی مٹی تک پہنچا ہُوا ہے اور دوسری طرف بیج نے اپنے ننھے ننھے ریشے اس طرح نیچے کو پھیلا رکھے ہیں جس طرح کسی نے کنوئیں میں ڈول ڈال رکھا ہو ؎

بسکہ زیرِ خاک با آبِ طراوت راہ ہے　　　ریشے سے ہر تخم کا ڈول (ڈوُل) اندرونِ چاہ ہے

غالب کے تخیل کی یہی تحلیلی کیفیت ہے جس کی وجہ سے اُسے بیدل کے ساتھ ایک نسبتِ خداداد حاصل ہے۔ اُس کی شاعرانہ فطرت کے اسی عنصر نے میر اور اُس کے مسلک کے شعراء سے قطع نظر کرکے ابتداءً بیدل اور پھر ظہوری نظیری اور عرفی وغیرہ کی طرف رجوع کیا۔ دَور اوّل کی جن غزلیات میں غالب نے بیدل کے ساتھ ایضاً گا اظہارِ عقیدت کیا ہے ان میں سے ایک میں بصراحت یہ بتایا ہے کہ مجھے بیدل کی جدت طرازیاں یعنی تحلیلی نکتہ آفرینیاں خصوصیت کے ساتھ مرغوب ہیں ؎

مجھے رنگِ بہار ایجادیٔ بیدل پسند آیا　　　اسد ہر جا سخن نے طرحِ باغ تازہ ڈالی ہے

لیکن اس قسم کی "بہار ایجادیوں" کے لئے بھی ذوقِ سلیم نے ایک حد مقرر کر رکھی ہے جس سے باہر قدم رکھنا ناقابلِ معافی نہیں تو خطرناک ضرور ہے۔ اس حد کو عبور کرکے ہم "خیال بندی" کے میدان میں داخل ہوتے ہیں۔ یہاں شاعر واقعات اور جذبات کی تشریح کے علاوہ خیالی اور وہمی[1] چیزوں کے تجزیے سے بھی اپنے ذوقِ تحلیل کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ تجرید جو مابعد الطبیعیات کے بازار کا خاص سکہ ہے یہاں نہایت کثرت سے رائج ہے۔ بیدل کے یہ چند اشعار دیکھئے ؎

نمائشِ رنگ زلس بے حجاب می بافند　　　بروئے گل ز دریدن نقاب می بافند

چشم وا کردم بجنبش اما بہ آغوشِ شرار　　　غوطہ خوردم در دلِ خواب فراموشِ شرار

نہ غبار است کزیں دشت پر افشاں برخاست　　　نگہے بال تماشا زدو مژگاں برخاست

رنگِ طاقت سوخت اما وحشت آغازم ہنوز　　　چشم برخاکستر بال است پروازم ہنوز

شبنم رم طینتم، بیدل گرا فسردم چہ باک　　　می زند بر یک جہاں بے طاقتی نازم ہنوز

خیال بندی کے یہ تمام خصائص غالب کے دَور اوّل میں موجود ہیں مثلاً وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ محبوب کی رنگیں یاد سے میری حسرتِ فراق کی زینت ہے اور اس مضمون کو ادا کرنے میں واقعی اور خیالی چیزوں کو بلا تکلف ملا دیتا ہے ؎

کرتا ہے بہ یادِ بتِ رنگیں دلِ مایوس　　　رنگِ ز نظر رفتہ حنائے کفِ افسوس

---

[1] "خیالی" اور "وہمی" سے متخیلہ کی دو مختلف کیفیتیں متصور ہیں۔ "خیالی" چیزیں وہ ہیں جنکے شئی اگرچہ خارجی دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ لیکن محسوسات کی جمع و تفریق سے ہم ان کے تصور تک پہنچ سکتے ہیں جیسے خون کی بارش۔ ساکن آبشار وغیرہ۔ وہمی چیزیں بھی خارج میں موجود نہیں ہیں لیکن یہ کم و بیش انسان کے قوائے فکریہ کی تخلیق ہیں جیسے مہر گیا، عنقا وغیرہ۔ خیالی چیزیں مدرک بہ حواس اور وہمی چیزیں مدرک بہ عقل ہیں۔

اس کے ساتھ بیدل کا یہ شعر یاد آتا ہے: ؎

دریادِ عمر رفتہ رسے لے شاد میکنم　　　　رنگِ پریدۂ بہ خیال آشیانہ ایست

دراصل اس زمانے میں غالب کا کلام مضامینِ خیالی سے بھرا پڑا ہے اور تقریباً ہر شعر اسی طرزِ بیان کی ایک پیچیدہ گتھی ہے صرف چند اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں ؎

تماشا کردنی ہے انتظار آباد حیرانی　　　　نہیں غیر از نگہ جوں نرگستاں فرشِ محفلہا

ذوقِ راحت اگر احرامِ تپش ہو جوں شمع　　　　پائے خوابیدہ بہ دل جوئی شبگیر آوے

پرورشِ نالہ ہے وحشت پرواز سے　　　　ہے تر بالِ پری بیضۂ بلبل ہنوز

بہارِ حیرتِ نظارہ سخت جانی ہے　　　　حنائے پائے اجل خونِ کشتگاں تجھ سے

خیال بندی کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ ایک ہی خیال کے بیان میں متعدد تشبیہات اس طرح مربوط کر دی جائیں کہ بغیر کاوش کے مطلب حل نہ ہو۔ یہ شعر دیکھئے ؎

بیدل ز جوشِ آبلہ ام در رہِ طلب　　　　گوہر فروش شد صدفِ گوشِ نقشِ پا

اسی طرح غالب کہتا ہے ؎

ہوئی جس کو بہارِ فرصتِ ہستی سے آگاہی　　　　برنگِ لالہ جامِ بادہ بر محمل پسند آیا

اس شعر کے مصرعۂ ثانی میں پہلے لالے سے تشبیہ لی ہے اور پھر خود لالے کو ایک مسافر سے مشابہ قرار دے کر تشبیہ در تشبیہ پیدا کی ہے جو خیال بندی کا طغرائے امتیاز ہے۔

خیال بند شعرا صرف یہی نہیں کرتے کہ اپنے تخلیلی اندازِ بیان کی بنیاد وہمی و خیالی چیزوں کے تجزیے پر رکھیں۔ بارہا یہ تجزیہ محض کسی لفظی مناسبت پر مبنی ہوتا ہے۔ عہدِ اورنگ زیب میں خیال بندی منتہائے عروج پر تھی۔ شیر علی خاں لودھی نے اس زمانے میں خیال بند شعرا کا جو تذکرہ مرتب کیا اس میں خیال بندی کی تعریف یہ کی ہے۔" دو ایسے کلمات بالاشتراک لانا جن میں سے ایک حقیقی ہو اور ایک مجازی۔ دونوں سے (بہ لحاظِ حقیقت و مجاز) دو مفہوم مترشح ہوں اگرچہ دراصل مراد مجازی سے ہو۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس مجازی کلمے میں کوئی اصطلاح یا لطیفہ یا ضرب المثل ہو۔" خیال بندی کی اس تعریف کے بعد بطورِ تشریح بیدل کا یہ شعر دیکھئے:-

صافِ معنی کرد مستغنی ز دُردِ صورتم　　　　چوں بطِ مے باطنِ من عالمِ آبے ہی است

یہاں شعر سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے لفظ آب کے دو معنی لینے ضروری ہیں،" صفائی" اور" پانی"۔ غالب کا دورِ اوّل کا ایک شعر ہے ؎

آتشیں پا ہوں گدازِ وحشتِ زنداں نہ پوچھ　　　　موئے آتش دیدہ ہے ہر حلقہ یاں زنجیر کا

یہاں شاعر قید خانے کی وحشتِ تنہائی سے مضطرب ہُوا۔ مضطرب ہونے کے لئے دوسرا لفظ آتش زیر پا ہونا ہے۔ چنانچہ آتش زیرپا کی آتش کی مناسبت سے مصرع ثانی پیدا ہُوا:۔

بیدل کا ایک اور شعر ہے ؎

بو دسر مشقِ درسِ بیخودی باریک بینیہا　　　زموئے انگشتِ حیرانی بہ لب دارند چینیہا

چینی کے برتن میں جو بال آگیا ہے اس سے باریک بینی مراد لی ہے لیکن چونکہ بال آنا دوسرے لفظوں میں برتن کے ٹوٹنے کو کہتے ہیں اس لئے ٹوٹنے سے درسِ بیخودی کی تعبیر کی ہے۔ اس بیخودی کا مزید ثبوت یہ ہے کہ برتن میں جو بال آگیا ہے وہ اس کے لبوں پر انگشتِ حیرت کی مثال بن گیا ہے ؎

اسی انداز میں غالب کا ایک شعر ہے ؎

نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ　　　کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

یہاں سینے کو بالکنایہ مکان سے اور دل کو (یا سوراخ دہن کو) روزنِ در سے تشبیہ دی ہے جس میں سے ہوا (یعنی سانس) گزرتی ہے۔ پھر اسی روزنِ در کو زخم سے مماثل قرار دے کر زخم کو خطرناک ثابت کیا ہے اس لئے کہ اصُولِ طب کے مطابق جو زخم ہوا دینے لگے وہ مہلک ثابت ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ تیغِ نگاہ بے حد تیز ہے۔ ان خصوصیتوں کے علاوہ دونوں مصرعوں میں آب اور ہوا کا تقابل بھی ملحوظ رکھا ہے۔

جب ایک ایک شعر میں خیالات کی اس قدر بھرمار ہو تو مہمل گوئی کی منزل بہت قریب آجاتی ہے۔ تخیلی شاعری اور خیال بندی کا انتہائی کمال بلاغت ہے جس طرح ترکیبی شاعری کا انتہائی کمال فصاحت ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ بلاغت کلام کے وہی نمونے پسند طبع ہوتے ہیں جن میں فصاحتِ بیان کا پہلو بالکل چھوڑ نہ دیا گیا ہو۔ تخیلی شاعری جب اپنے کمالِ بلاغت سے گرتی ہے تو مہمل گوئی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ترکیبی شاعری انتہائی معراجِ فصاحت تک پہنچنے کے بعد اپنے دورِ زوال میں پھیکے اور بے مغز شعروں پر انحصار کر لیتی ہے۔ اورنگ زیب کے عہد میں فارسی کی تخیلی شاعری خیال بندی کی شکل اختیار کر لینے کے بعد بلاغتِ کلام کی اُس منطقی تدریج تک پہنچ گئی تھی جسے اصطلاحِ عام میں مہمل گوئی کہتے ہیں۔ چنانچہ صاحب "مرآۃ الخیال" لکھتا ہے:۔

"زمانۂ حال کے شعراء نے صنعتِ خیال بندی کو معراجِ کمال تک پہنچا دیا ہے جسے ہر شخص جانتا ہے۔ یہ مشہور نکتہ کہ اچھے شعر کے معنی نہیں ہوتے۔ خیال بند شعراء کے کلام میں صاف اور واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ (ص ۱۱۲)"

جب ادبی دَور کا تنقیدی طغرا یہ ہو کہ "شعرِ خوب معنی ندارد" اس میں بلاغت کی اس تنزل کردہ شکل (مہمل گوئی) کا فروغ پانا باعثِ تعجب نہیں۔ شاعری میں پرجوش منطقیانہ استدلال خیال بند شعرا کا بڑا کارنامہ ہے۔ بیدل اِس فن کا بہت بڑا اُستاد ہے ؎

گر تاملِ قفسِ بیضۂ طاؤس شود | در شبستانِ عدم نیز چراغانے ہست
نبضِ جہدم شررِ کاغذِ آتش زدہ است | یک مژہ راہ بعدِ چشم پریدن رفتم
نامِ ما نقشِ نگیں ہا بالِ پرواز ساست | ما ز خود رفتیم اگر پائے طلب در سنگ ماند

لیکن جب ناکافی توضیح بیان کے باعث ہمارا ذہن شاعر کی پُرپیچ دلیل آرائی کے تمام مدارج کا ساتھ نہیں دے سکتا تو شعر مہمل معلوم ہونے لگتا ہے، بیدل کے حسب ذیل دو شعروں کو بے معنی تو یقیناً نہیں کہنا چاہئے لیکن عام انسانی فہم کے لئے ان کے مطلب تک پہنچنا بہت دشوار ضرور ہے

دانہ مارا کہ بچیدیں خطِ ساغر ریشہ کرد | در گرو ارشبنم ما عالمے زنّار داشت
حیرت دمیدہ ام گل داغم بہانہ ایست | طاؤس جلوہ زار تو آئینہ خانہ ایست

یہی شانِ اہمال غالب کے ابتدائی کلام میں بہت زیادہ کثرت کے ساتھ موجود ہے ؎

خطِ نوخیز، نیلِ چشمِ زخمِ صافیٔ عارض | لیا آئینے نے حرزِ پرِ طوطی بچنگ آخر
آغوشِ گل ہے آئنہ رذرّہ ذرّہ خاک | عرضِ بہار جوہرِ پرواز ہے مجھے
بہ ذوقِ شوخیٔ اعضا تکلف بارِ بستر ہے | معافِ پیچ و تابِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے

لیکن اس قسم کی مہمل گوئی کے ساتھ بلاغت کی سرحدیں اس طرح مل جاتی ہیں کہ بعض دفعہ دونوں میں تفریق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بیدل ہمیں تخلیلی تخیل کی پیچیدگیوں کے شعبدے ہی نہیں دکھاتا، وہ بلاغتِ کلام کا بھی بہت بڑا استاد ہے اور وسیع مضامین کو صناعانہ چابکدستی سے دو مصرعوں میں ادا کر سکتا ہے ؎

دیدۂ انتظار را دامِ امید کردہ ام | اے قدمت بچشمِ من خانہ سفید کردہ ام
تنم ز بندِ لباسِ تکلف آزاد است | برہنگی بہ برم خلعتِ خدا داد است
مستِ عرفاں را شرابِ دیگرے درکار نیست | جز طوافِ خویش دورِ ساغرے درکار نیست

غالب کے ابتدائی دور میں اس قسم کی ماہرانہ بلاغت کی جستجو کرنا فضول ہے لیکن اگر غالب کے ایامِ پختگی کے محض اُردو کلام کو دیکھا جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ غالب نے فنِ بلاغت کو معراجِ کمال تک پہنچا دیا اور اس لحاظ سے وہ اُردو کے تمام قدیم و جدید شعرا کا سرتاج ہے۔ مثلاً غالب کا یہ بظاہر سیدھا سادھا شعر ملاحظہ ہو ؎

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی | بندگی میں مرا بھلا نہ ہُوا!

اِن چند الفاظ میں حسب ذیل نکات مرکوز ہیں:۔

(۱) خدا کی عبادت کرنے سے بندوں کا بھلا ہوتا ہے۔
(۲) نمرود کی پرستش باعثِ عذاب ہے۔

(۳) میں نے تمام عمر خدا کی عبادت میں بسر کر دی۔

(۴) اور ہمیشہ اُمید یہ رکھی کہ اس میں میرے لئے فلاح کی کوئی صُورت پیدا ہو گی۔

(۵) انجامِ کار مجھے مایوسی ہوئی۔

(۶) اور مَیں نے یہ نتیجہ نکالا کہ میں نے عمر بھر جس کی پرستش کی شاید وہ خُدا نہیں، نمرود کی ذات تھی کیونکہ نمرود کی پرستش ہی اس قدر لاحاصل ہو سکتی تھی۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی نکتہ طرازی کی توقع بارہ پندرہ برس کے کسی لڑکے سے نہیں کی جا سکتی۔ پھر بھی نسخۂ حمیدیہ کے بعض اشعار جو غالباً دورِ اوّل کے لکھے ہوئے ہیں یقیناً اس پائے کے ہیں کہ انہیں مہمل گوئی کا نام دینا ظلم معلوم ہوتا ہے ؎

خاک بازیٔ اُمید کارخانۂ طفلی　　یاس کو دو عالم سے لب بخندہ وا پایا

اسؔد کو بُت پرستی سے غرض درد آشنائی ہے　　نہاں ہیں نالۂ ناقوس میں در پردہ یا رب ہا

غنچہ تا شگفتنہا برگِ عافیت معلوم　　باوجودِ دل جمعی خوابِ گُل پریشاں ہے

اب خصوصیاتِ بیان میں صرف ایک چیز باقی ہے اور وہ خیال بندی کی مخصوص تشبیہ ہے۔ اسے انگریزی میں (Conceit) کہتے ہیں۔ اُردو میں اس قسم کی تشبیہات کے لئے کوئی خاص اصطلاح وضع نہیں ہوئی لیکن اگر انہیں بدائع (واحد = بدیعہ) کا نام دے دیا جائے تو شاید کچھ زیادہ غلط نہ ہو۔ عجیب اتفاق ہے کہ انگریزی ادب میں بھی خیال بندی کی شاعری (جسے وہاں Metaphysical Poetry کہتے ہیں) سترھویں ہی صدی کے قریب نمودار ہوئی۔ تقریباً نصف صدی کے فصلِ زمانی سے فارسی اور انگریزی ادب دونوں میں جلیل القدر خیال بند شعرا کا ظہور ہؤا۔ انگریزی شاعری میں جان ڈن (John Donne) کو وہی حیثیت حاصل ہے جو ہندوستان کی فارسی شاعری میں بیدل کو۔ مگر اس اتفاق سے بھی زیادہ عجیب اتفاق یہ ہے کہ دونوں ملکوں میں خیال بندی کا ظہور اُس وقت ہؤا جب تمام ملک میں ایک شدید مذہبی احساس کا دَور دَورہ تھا۔ شاید مذہب کے پیدا کئے ہوئے تخیلی شعور کو اس کیفیت سے کچھ تعلق ہو۔ بہر حال دونوں ملکوں میں خیال بند شعراء کا یہ قاعدہ تھا کہ اپنے استعارات و تشبیہات کی تمام جزئیات کو سرشتِ تخیل بناتے تھے۔ اسی طرز کی تشبیہ کو ہم نے یہاں بدیعہ کا نام دیا ہے۔ جب شاعر پیشِ نظر چیز کو کسی بظاہر غیر متعلق چیز سے مبالغہ آمیز یا بعید از قیاس تشبیہ دیتا ہے اور پھر اُس اصل چیز (یعنی مشبہ) کو نظر انداز کر کے مبالغہ آمیز یا بعید از قیاس تشبیہ ہی کو اصل موضوعِ کلام قرار دے لیتا ہے یا اس تشبیہ کا تجزیہ اس طریقے پر کرتا ہے کہ اُس کا خطاب تخیل کے بجائے انسانی فہم سے ہو جاتا ہے اُس وقت وہ بدیعہ نگاری کا مرتکب ہوتا ہے۔ بیدل کے یہ دو شعر مثال کے طور پر دیکھئے ؎

اشکِ شمعے بود یک عمر آبیاردانہ ام　　سوختن خرمن کند از حاصلِ پروانہ ام

خجلتِ سجدۂ خاکِ درا و کرد مرا　　آں قدر آب کہ سامانِ وضو گردیدم

دورِ اوّل میں غالب کی تشبیہ کا انداز بیدل کی بدلیعہ نگاری کا انداز ہے۔ یہ شعر دیکھئے ؎

رکھا غفلت نے دور افتادۂ ذوقِ فنا ورنہ　　　اشارت فہم کو ہر ناخنِ بریدہ ابرو تھا

ایک اور نسبتہً صاف شعر ہے ؎

عزلت گزینِ بزم ہیں واماندگانِ دید　　　مینائے مے ہے آبلہ پائے نگاہ کا

غالب کے ان فارسی اشعار میں بھی بیدل کی بدلیعہ نگاری کا اثر نمایاں ہے ؎

در ہجر طرب پیش کند تاب وتبم را　　　مہتاب کفِ مار سیاہست شبم را

محتشم زادۂ اطرافِ بساطِ عدمیم　　　گوہر از بیضۂ عنقاست بہ گنجینۂ ما

بدلیعہ نگاری کے ساتھ علوِّ خیال کا بہت گہرا اور قریبی تعلق ہے۔ علوِّ خیال سے عام طور پر یا تو یہ مراد ہوتی ہے کہ شاعر کے فکر کا موضوع زندگی کے بہت بڑے بڑے مسائل ہیں اور یا یہ کہ وہ اپنی تشبیہات سے دو ایسی چیزوں کو ہم ربط بنا دیتا ہے جن میں بظاہر عظیم الشّان فاصلہ حائل ہے مثلاً ناخن بریدہ کو اشارۂ ابرو سے تشبیہ دینا دو قطعاً بے تعلق چیزوں کو باہم منطبق کر دیتا ہے۔ در اصل شعر کا آدھا لطف تشبیہ میں ہے جس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ دو بظاہر بے تعلق چیزوں میں کسی گہرے اندرونی ربط کا انکشاف۔ شاعر اس انکشاف کے ساتھ خوشگوار استعجاب کا احساس جس حد تک شامل کر سکے گا اسی حد تک تشبیہ عالی یا مضمون بلند ہوگا۔ لیکن ایک خاص حد تک پہنچنے کے بعد اس قسم کے تحسین آمیز انکشاف کی گنجائش باقی نہیں رہتی بلکہ طبیعت یا تو بدمزہ ہو جاتی ہے یا شاعر کے تخیّل کی آوارگی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے اسی وجہ سے علوِّ خیال اور بدلیعہ نگاری میں بہت ہلکا سا پردہ حائل رہ جاتا ہے۔ چنانچہ بدائع طرازی کی انتہائی غیر متناسب صورتوں کے ساتھ انتہائی بلندیٔ خیال کے نمونے بارہا شریک ہو جاتے ہیں بیدل اور غالب کے بدائع میں مضحکہ خیزی کے بجائے طبیعت کی بدمزگی کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ میر کے کلام میں بھی بدلیعہ نگاری نے سر نکالا ہے لیکن اس کی یہ بلند پروازیاں دردِ سر کے بجائے ہمارے ہلکے سے تبسّم کا باعث ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس بیدل کے بدائع بہت پیچ در پیچ اور عسیر الفہم ہوتے ہیں مشکل معمّوں کی طرح ان کو حل کرتے ہوئے بھی سر میں درد ہونے لگتا ہے لیکن اتنا نہیں جتنا غالب کے دورِ اوّل کے اشعار کو سمجھنے میں کیونکہ ان میں بیدل کے بدائع کے ساتھ بچّوں اور نوعمر لڑکوں کا وہ روایتی شوق بھی منسلک ہو گیا ہے جس کی تشفی صرف پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں سے ہوتی ہے۔

شاعرانہ تخلیل کا آخری درجہ یہ ہے کہ تجریدات کو اشیائے حقیقی کے برابر اہمیت دے دی جائے۔ یہی بدلیعہ نگاری کی منزل ہے۔ جہاں کیفیات اشیا کو اشیا سے منفک کر کے بازیچۂ تجزیہ و تحلیل بنا لیا جاتا ہے۔ ترکیبی شاعر کا انتہائی تنزّل محض محاورہ بندی اور تحلیلی شاعر کا انتہائی تنزّل محض بدلیعہ نگاری ہے۔

حمید احمد خاں

دُعا

لگا آگ سینے میں سوزِ دروں سے — جواں رکھ مرے دل کو جوشِ جنوں سے

مری فطرتِ پاک و بیباک یارب — نہ آلودہ ہو حبِ دنیائے دوں سے

عطا کر عقابوں کی پرواز مجھکو — کہ ٹکراؤں اس گنبدِ نیلگوں سے

مجھے طاقتِ بالِ روح الامیں دے — کہ ہوں پار اس گنبدِ بے ستوں سے

جواں رکھ مری ہمتِ کوہ کن کو — ہیں نہریں مجھے "کاٹنی" "بیستوں" سے

سکوں مرگ ہے بہرِ فرزندِ آدم — مجھے رکھیو محفوظ مرگِ سکوں سے

سکھاتی ہے یہ رینگنا آدمی کو — بچانا مجھے دانشِ ذوفنوں سے

جسے پڑھ کے بے دین و بزدل ہوا انساں — بچا مجھ کو اس علم و فن کے فسوں سے

مرے دل کو رکھ نورِ ایماں سے روشن — رفاقت ملے عشق کے رہنموں سے

یہ ہستی ہے چہرہ حقیقت کا پردہ — مجھے کردے آگاہ رازِ دروں سے

خدایا ہو باغِ سخن باغِ جنت — کہ میں سینچتا ہوں اسے اپنے خوں سے

سخن سے مرے دے انہیں سرفرازی — جو رہتے ہیں اس بزم میں سرنگوں سے

رلاتی ہے خوں مجھکو ان کی تباہی — جگر پھٹ گیا ان کے حالِ زبوں سے

مئے زندگی بھر دے جامِ سخن میں — تمنا کے خمخانۂ لعل گوں سے

کہ ان تیرہ بختوں کو خورشید کر دوں
چمن زارِ ایمان و امید کر دوں

محمد اکبر منیر

توبہ

اگر شراب کو چھوڑوں بھی آج سے ناصح

چراغِ حسن کی لو پر مجھے جلا دینا
کسی نگاہ سے کچھ بجلیاں گرا دینا
مرو تم آتشِ رخسارِ سرخ میں جل کر
کروں جو بادہ کشی تو یہ بد دعا دینا
کسی حسین کے جادو فروش زانو پر
تھپک کے نیند قضا کی مجھے سلا دینا
گریں جو ساقیٔ مہ وش کے نرم ہونٹوں سے
انہیں حسین گلوں میں مجھے دبا دینا
مرے نصیب کی مشعل ہو گر کبھی روشن
تو آبِ خوشۂ انگور سے بجھا دینا

اگر شراب کو چھوڑوں بھی آج سے ناصح

الطاف مشہدی

گلچیں اور شاعر

ایک ہی سندر پھول ہے جس سے دونوں الفت کرتے ہیں
درشن کے میٹھے امرت سے نین کٹورے بھرتے ہیں

آہ پر اس پر بھی دونوں کا رستہ نیارا نیارا ہے
گلچیں کو تن اس کا اور شاعر کو درشن پیارا ہے

تاجور سامری لائل پوری

گلشنِ تصوّر

جنّت کا ایک منظر

جنّت میں ایک پہاڑی ندی کے کنارے
طوبیٰ کی ہری بھری شاخوں کے نیچے
ایک نازک مزاج حسینہ
بیٹھی رو رہی تھی
نہ جانے کیوں؟

فریاد

بچالے کوئی مجھے بچالے
وہ جس سے میں شادی کرنا نہیں چاہتی
وہ مہربان اپنے بے اندازہ احسانوں کا
جال پھیلا کر مجھے اسیر کر رہا ہے

اُلوؤں کی محفل

نصف شب کے قریب
جب چاند آسمان سے ذرا نیچے اُتر کر
چمک رہا تھا
کھنڈروں میں اپنے اپنے درخت پر بیٹھ کر
چند معتبر اُلّو عقلمند انسانوں کا مضحکہ اُڑا رہے تھے
وہ کہتے تھے کہ یہ بے وقوف انسان
جسے عقل کہتے ہیں وہ سراسر بے عقلی ہے
اور جسے بے عقلی کہتے ہیں وہ عین دانشمندی

کانے کے آنسو

میں نے اپنے نوکر کو دیکھا
جو باورچی خانے میں چھپ کر
ایک نوکرانی کے لئے
اپنی ایک ہی آنکھ سے رو رہا تھا

چمگادڑوں کی جنگ

رات کو دو چمگادڑیں کیکر کے درخت کی
سب سے اونچی ٹہنی پر بیٹھ کر
اپنے شوہر کی راہ دیکھ رہی تھیں
کہ ان کی لڑائی ہو گئی
ایک نے دوسری سے کہا
تو کیوں "اُن کا" راہ دیکھ رہی ہے
اپنا منہ تو دیکھ جو چاند کی طرح سیاہ ہے!
دوسری نے جواب دیا "چپ ری چپ، تیرا رنگ کب
کوّے کی طرح سفید ہے!"

مہدی علی خاں

کھڑکھڑاتا پتّہ

سرسراتی ہوئی آئی چمنستاں میں ہوا
آہ سوکھے ہوئے پتے تری غمناک صدا

بین کرنے لگیں مسرور ہوائیں افسوس
دم بخود ہوگئیں پرکیف فضائیں افسوس

فاختہ کے دلِ افسردہ میں اک ہوک اٹھی
پھول مرجھا گیا کمہلا گئی معصوم کلی

تیتری روتی ہوئی صحنِ گلستاں سے گئی
درد کا راگ سنانے لگی محزوں ندی

آہ سوکھے ہوئے پتّے تری غمناک صدا!

مہدی علی خاں

غزل

رحمت کو اُن کی جوش میں لانے کی دیر ہے
یعنی سرِ نیاز جھکانے کی دیر ہے

پینے کی دیر ہے، نہ پلانے کی دیر ہے
ساقی کے بس نگاہ اُٹھانے کی دیر ہے

پروانے آہی جائیں گے کھنچکر بہ جبرِ عشق
محفل میں صرف شمع جلانے کی دیر ہے

آنکھوں میں دم ہے، آخری ہچکی کا وقت ہے
او بے نیاز! بس ترے آنے کی دیر ہے

خود مضطرب ہیں بادہ و ساغر کی جھلکیاں
ساقی کی سمت ہاتھ بڑھانے کی دیر ہے

جامِ شراب، مست گھٹا، مطرب و بہار
سب آچکے ہیں آپ کے آنے کی دیر ہے

وہ بھی تڑپ نہ جائیں، تو اِس عاشقی پہ خاک
مجھ سے فقط نگاہ ملانے کی دیر ہے

اُن کے غرورِ حُسن کو رحم آہی جائے گا
لب تک حدیثِ شوق کے آنے کی دیر ہے

چلمن کی بندشوں سے وہ شاید نہ رُک سکے
ماؔہر کے صرف شعر سُنانے کی دیر ہے

ماہر القادری

یہ بھڑکتے ہوئے شعلے، یہ لپکتے ہوئے شعلے، یہ دھڑکتے ہوئے سینے
یہ لرزتے ہوئے سینے، یہ مچلتی ہوئی رُوحیں، یہ محبت کے دفینے
یہ چمکتی ہوئی آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسو، یہ ڈھلکتے ہوئے آنسو
یہ دمکتے ہوئے آنسو ہیں کہ حوروں کی انگوٹھی میں ہیں پارے کے نگینے
یہ لٹکتے ہوئے آنچل، یہ کھسکتے ہوئے دامن، یہ سرکتے ہوئے غرفل
کہ سمندر کے کنارے پہ ہواؤں سے تڑپتے ہوئے خاموش سفینے
یہ پریشاں سی نگاہیں، یہ ہراساں سی نگاہیں، یہ غم افشاں سی نگاہیں
یہ تعجب سا لبوں پر، یہ شکایت سی نظر میں، یہ جبینوں پہ پسینے
وہ بھڑکتی ہوئی نبضوں میں قیامت سی در آئی، وہ چمک سی ہوئی پیدا
وہ دمکتے ہوئے "فردوس" میں اک جست لگائی ہے خموشی سے کسی نے
وہ فرشتوں کی قطاریں بھی شعاعوں کے سہارے سے زمیں پر اُتر آئیں
وہ تھرکتے ہیں ستاروں سے پرے نور بھرے بحر میں روحوں کے سفینے

احمد ندیم قاسمی بی۔ اے

(تاج کمپنی کی حمائل شریف کو دیکھ کر)

کلامِ پاک! انصاف کا تقاضا ہے اور جی بھی یہی چاہتا ہے کہ جیسی اِس کلام کی رُوح خوبصورت ہے ویسا ہی اس کا جسم اور ویسی ہی اس جسم کی پوشاک بھی خوبصورت و خوش نُما ہو!

لیکن جس ہستی کا باطن خود خدا نے بنایا ہو انسان کے بس کی بات نہیں کہ اُس کے ظاہر کو اُسی قدر حسین و پاکیزہ بنا سکے۔ پھر بھی ہم خاک کے پُتلے آرزو کے بندے ہیں اور ہمارا جی چاہتا ہے کہ جس حسین نے ہمارا دل لیا ہے زندگی کی سب رعنائیاں اُس کے قدموں پر نثار کر دیں۔

یہ حمائل جو میرے سامنے ہے اس کا ہر صفحہ رنگوں کی ایک دنیا ہے اور ہر مسلمان جو استطاعت رکھتا ہے اُس کا اپنے ہی دل کی خوشی کے لئے فرض ہے کہ اس کتاب زندگی کے تاج ایڈیشن کو اپنی خلوت کا سامانِ آرائش بنا کر رکھے۔

کوئی صفحہ کھولو حسن کی طشتری میں حکمت کے موتی بکھرے ہوئے ہیں:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ——— ہم کو سیدھے رستے چلا

اَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ ——— (یہ) کیا (عقل کی بات ہے کہ) تم لوگوں کو نیکی کرنے کو کہتے ہو اور اپنے تئیں فراموش کئے دیتے ہو۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ——— اور خدا کے سب نام اچھے ہی اچھے ہیں تو اُس کو اُس کے ناموں سے پکارا کرو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ——— مومنو تم ایسی باتیں کیوں کہا کرتے ہو جو کیا نہیں کرتے۔

مُجلد، مُطلّا، مُنوّر! قسم اوّل کے صفحے کا ایک نمونہ تاج کمپنی لاہور سے مفت طلب کیجئے اور دیکھئے!

بشیر احمد

محفلِ ادب

اُردو رسائل کی مختصر تاریخ

ہندوستانی زبان کا سب سے پہلا ادبی رسالہ شرر کا دلگداز لکھنؤ ہے، جو ۱۸۸۷ء سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ سب سے پہلا مذہبی و اصلاحی رسالہ تہذیب الاخلاق سر سید احمد خاں ہے جو ۱۸۷۰ء سے ۱۸۹۵ یا ۹۶ء تک نکلا۔ سب سے پہلا علمی رسالہ مخزن الفوائد حیدر آباد دکن ہے جس کے اڈیٹر نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی تھے، یہ ۱۸۷۳ء میں نکلا تھا اور سب سے پہلا تحقیقی و تاریخی رسالہ حسن ہے، جو حیدر آباد میں ۱۸۸۸ء سے ۱۸۹۴ء تک جاری رہا، نواب عماد نواز جنگ حسن بن عبداللہ اس کے اڈیٹر تھے، اور ہر قسم کے علمی، ادبی، تاریخی اور اخلاقی مضامین کا سب سے پہلا مجموعہ علی گڑھ کا معارف ہے جس کے اڈیٹر وحید الدین سلیم اور نواب محمد اسمٰعیل خان تھے، یہ ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۱ء تک نکلتا رہا۔

پچھلی صدی کے یہی مایۂ ناز رسالے تھے، جو ملک کے مختلف گوشوں سے نکلے، لیکن نئی صدی اپنے ساتھ بہت سے نئے ساز و سامان لائی، نئی تعلیم کی پود اب بڑھ کر جوان ہو چکی تھی، چنانچہ سب سے پہلے ۱۹۰۱ء میں سر شیخ عبدالقادر کی اڈیٹری میں لاہور سے مخزن نکلا۔ آج کے ادھیڑ اور بوڑھے اُس زمانہ کے نوجوان تھے، سر اقبال، میر نیرنگ، چودھری خوشی محمد ناظر، اعجاز حسین، علمدار حسین، سید حسرت، مولانا شروانی، سید علی محمد شاد، وغیرہ مضمون نگار تھے، مجھے بھی یہ فخر حاصل ہے کہ میری عمر کا سب سے پہلا مضمون "وقت" اسی میں شائع ہوا تھا، یہ پہلا رسالہ ہے جس نے نئی تعلیم کے نوجوانوں کو ملکی ادب کے کام میں لگایا، اس کے بعد ۱۹۰۴ء میں سید حسرت موہانی نے علی گڑھ سے اُردوئے معلّٰی نکالا، جس میں ادبی اور سیاسی مضامین کی گنگا جمنی ہوتی تھی، اس زمانہ میں علی گڑھ منتھلی میگزین کو میر ولایت حسین ایڈٹ کرتے تھے، اور وہ کالج کے بجائے ملک کا رسالہ تھا، نئے نوجوان اس میں مشقِ سخن کرتے تھے، اس کے نو آموزوں میں میرا نام بھی داخل ہے، ۱۹۰۳ء میں دکن کے اُفق سے مولوی ظفر علی خاں کا دکن ریویو اور افسانہ طلوع ہوا۔ ۱۳۲۲ھ ۱۹۰۴ء میں لکھنؤ سے الندوہ نکلا، جو روشن خیال علماء کا آرگن تھا، مولانا شبلی اور مولانا حبیب الرحمٰن شروانی اس کے اڈیٹر تھے، ۱۹۰۳ء ہی میں زمانہ کا آغاز ہوا، جو منشی دیا نراین نگم کی اڈیٹری میں اب تک جاری ہے، منشی نوبت رائے نظر کا خدنگِ نظر بھی ۱۹۰۴ء کی یادگار ہے۔

اس کے بعد انڈین پریس الہ آباد سے ادیب ۱۹۱۰ء میں، لکھنؤ سے الناظر ۱۹۰۹ء میں، کرم آباد سے ظفر علی خاں کا پنجاب ریویو ۱۹۱۰ء میں، لکھنؤ سے پیارے لال شاکر میرٹھی کا العصر ۱۹۱۱ء میں، آگرہ سے دلگیر اکبر آبادی کا نقاد ۱۹۱۳ء میں، حیدر آباد سے ہوش بلگرامی کا ذخیرہ ۱۹۱۵ء میں، اعظم گڈھ سے معارف ۱۹۱۶ء میں، چکبست کا صبحِ اُمید لکھنؤ ۱۹۱۸ء میں نکلا، اور اس کے بعد ملک کے مختلف گوشوں سے جو کثرت سے رسالے نکلے ہیں، وہ آپ کے سامنے ہیں، اور جس کی وسعت پورے ملک کو محیط ہے، پنجاب میں ہمایوں، دہلی میں جامعہ، اور شاید یو پی میں صلائے عام بھی

ہماری زبان کے معیاری ماہوار رسالے ہیں۔

اُردو کا سب سے پہلا سہ ماہی رسالہ "اُردو" جو انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن کا آرگن ہے، ۱۹۲۱ء میں نکلا جو خالص ادبی رسالہ اور اپنی ادبی تنقید و تحقیق کے لئے مشہور ہے، دوسرا سہ ماہی اورینٹل کالج میگزین لاہور ۱۹۲۵ء سے نکل رہا ہے، جو مشرقی علوم و فنون و تاریخ پر محققانہ مضامین چھاپتا ہے، اور تیسرا سہ ماہی رسالہ ہندوستانی اکاڈیمی کا ہندستانی الہ آباد سے جو ۱۹۳۱ء سے جاری ہے اور ہندوستانی زبان و ادبیات کی خدمت گذار ہے۔

ہندوستان کے دوسرے صوبوں سے بھی ماہوار رسالے نکلتے رہے، اور بند ہوتے رہے، مثلاً کلکتہ سے لسان الصدق (۱۹۰۲ء مولینا ابوالکلام کی اڈیٹری میں) اور تنویر المشرق، اور ڈھاکہ سے جادو، جوناگڈھ سے زبان اور شہاب، پونا سے رفیق الطلبہ (اینگلو اُردو ہائی اسکول پونا)، مالیگاؤں ضلع ناسک صوبہ خاندیس سے بیداری۔

مدراس میں سفینہ اور بُشریٰ شہر مدراس سے، کوثر بنگلور سے، اور مصحف عمر آباد شمالی ارکاٹ سے ابھی انہیں سالوں میں نکلے اور بند ہوگئے، اب آمبور سے مینا نکلا ہے، اور مصحف عمر آباد سے دوبارہ نکلا ہے۔

سفیر سخن پشاور سے، میزان الاذکار، زبانِ ہند اور ارمغان کراچی سندھ سے، نخلستان ملتان سے، اور لالۂ صحرا بہاولپور سے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۶ء تک نکلے۔

ہندوستان سے باہر بھی کچھ رسالے اور اخبار اس زمانہ میں نکلے جن میں نوائے کیمبرج اور نوائے وطن امریکہ قابلِ ذکر ہیں۔

(سید سلیمان ندوی) "معارف"

شہزادہ میرزا مغل

(یہ مضمون خواجہ حسن نظامی دہلوی نے ۴ر نومبر ۱۹۳۷ء کی شام کو دلّی ریڈیو میں سُنایا)

ذرا جی لگا کر سُنئے مغل شہنشاہ شاہ جہاں کی بسائی دلّی میں ایک لال قلعہ ہے جو شاہ جہاں کا بنایا ہوا ہے۔ اس قلعہ کے جنوب میں ایک عجائب خانہ بھی ہے جہاں شہزادہ میرزا مغل کی قلمی تصویر دیوار پر لٹکی ہوئی ہے۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا مغل خوب موٹے تازے تھے۔ سینہ چوڑا تھا، کلّہ جبڑہ شیر کا سا تھا۔ خوب گنجان بھری ہوئی داڑھی تھی۔ مغلئی ٹوپی اوڑھتے تھے جس میں شہزادگی کے طرّے لگے رہتے تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں تھیں، گردن مضبوط اور لمبی تھی۔ غرض یہ کہ صورت دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ میرزا مغل کسی بڑی فوج کے سپہ سالار ہیں یا کسی ملک کے بادشاہ ہیں۔

میرزا مغل ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ خاندانِ تیمور کے آخری بادشاہ کے فرزند تھے مگر ولی عہدی ان کو حاصل نہ ہوئی تھی۔ حالانکہ اپنے سب بھائیوں میں بہت زیادہ لائق سمجھے جاتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس زمانہ میں ولیعہدی اُس کو ملتی تھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی ریزیڈنسی سے میل جول رکھتا تھا کیونکہ کمپنی مذکور کو بہادر شاہ کے دادا شاہ عالم بادشاہ نے بکسر کی لڑائی کے بعد ہندوستان کی وزارت دے دی تھی۔ اس لئے ولیعہدی کے مسئلہ میں کمپنی کا بڑا اختیار تھا۔

غدر ۱۸۵۷ء سے چند مہینے پہلے بہادر شاہ کے تیسرے ولی عہد میرزا فخرالدین فتح الملک کا ہیضہ سے انتقال ہو گیا۔ تو ولی عہدی کے جھگڑے میں پھر جان پڑی۔ ایک طرف مرزا قویاش کوشش کر رہے تھے، دوسری طرف بادشاہ اور ان کی محبوب ملکہ زینت محل اپنے چھوٹے اور لاڈلے بیٹے شہزادہ جواں بخت کے لئے سعی میں مصروف تھے شمس العلماء مولانا ذکاءاللہ صاحب کی تاریخ ہند سے معلوم ہوتا ہے کہ ریزیڈنسی دہلی نے مرزا قویاش سے ایک خفیہ اقرارنامہ اس مضمون کا لکھوالیا تھا کہ اگر ایسٹ انڈیا کمپنی مجھے بہادر شاہ بادشاہ کی ولیعہدی دے گی تو میں تخت نشین ہونے کے بعد اپنے آپ کو بادشاہ نہیں کہوں گا بلکہ شہزادہ کہوں گا اور لال قلعہ میں نہیں رہوں گا بلکہ درگاہ حضرت خواجہ قطب صاحب میں بہادر شاہ بادشاہ نے جو محل بنوایا ہے اس میں اپنے خاندان سمیت رہا کروں گا اور کمپنی سے ایک لاکھ روپے ماہوار جو وظیفہ بہادر شاہ کو ملتا ہے میں اس کے عوض صرف پچاس ہزار روپے ماہوار لیا کروں گا۔

اس عہدنامہ یا اقرارنامہ کی خبر چھپی نہ رہی اور بہادر شاہ اس سے بہت بگڑے اور اُنہوں نے ریزیڈنٹ کو کہلا بھیجا کہ اگر یہ خبر سچ ہے تو میں اس کی شکایت گورنر جنرل کو لکھوں گا کیونکہ جو عہدنامہ میرے ابا شاہ عالم سے ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہوا تھا اس کی شرائط میں ایسی کوئی شرط نہیں تھی کہ بادشاہ کی اطلاع کے بغیر ولی عہد سے اقرارنامہ لکھوایا جائے، کہا جاتا ہے کہ میرزا مغل کے دوستوں نے ان کو بھی ترغیب دی تھی کہ وہ بھی اپنے بھائی میرزا فخرو ولیعہد کے مرنے کے بعد ولی عہدی کے لئے کوشش کریں مگر اُنہوں نے انکار کیا اور اپنے باپ بہادر شاہ سے جا کر کہا کہ میرے بھائی میرزا قُویاش نے جس مضمون کا اقرارنامہ ریزیڈنسی کو دیا ہے وہ ہم سب بھائیوں کی مرضی کے خلاف ہے اور میں ولی عہدی نہیں چاہتا میرے دشمنوں نے غلط مشہور کیا ہے کہ میں بھی اپنے لئے کوشش کر رہا ہوں۔ بلکہ میں اپنے چھوٹے بھائی میرزا جواں بخت کی ولی عہدی قبول کرنے کو آمادہ ہوں جس سے بہادر شاہ بہت خوش ہوئے تھے میرزا مغل کی خوراک بہت اچھی تھی یعنی وہ اچھے کھانوں کے شوقین تھے، اُن کے دسترخوان پر چالیس قسم کے کھانے چُنے جاتے تھے۔ وہ ناشتہ میں ایک بکرے کی یخنی پیتے تھے اور دوپہر کے کھانے میں بھُنے ہوئے پانچ مرغ کھاتے تھے۔ دو سیر بادام کا حریرہ پیتے تھے۔ ایک دُنبہ کا پلاؤ اکیلے ختم کر دیتے تھے۔

میرزا مغل کو ورزش کا بہت شوق تھا۔ مگدر کی جوڑی کے ایک ہزار ہاتھ اُن کا روزمرہ کا معمول تھا وہ روزانہ ٹھنڈے پانی سے نہاتے تھے سردی کے موسم میں بھی گرم پانی استعمال نہ کرتے تھے۔ ان کو پنجہ کشی کا بہت شوق تھا۔ میر پنجہ کش دہلوی کے شاگرد تھے۔ بندوق کا نشانہ بھی خوب لگاتے تھے۔ وہ ہر نشہ سے بیزار تھے۔ اور ناچ رنگ کا شوق بھی اُن کو نہ تھا اور شاعری کے بھی مخالف تھے۔ میرزا غالب کو بُرا کہتے تھے کہ وہ شراب پیتے ہیں۔

اُن کی مجلس میں ہمیشہ ایسے لوگ جمع رہتے تھے جن کو مغلیہ خاندان کے زوال کا صدمہ تھا۔ کوئی پردیسی مرہٹہ آخر زمانہ میں اُن کا مصاحب بن گیا تھا جو ان کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف بھڑکاتا رہتا تھا۔

میرزا مغل اپنے خاندان کی عیاشی اور آرام طلبی کے بہت خلاف تھے اس لئے ہمیشہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز افسروں کے حالات پوچھا کرتے تھے کہ وہ کیونکر زندگی بسر کرتے ہیں۔ چنانچہ میرزا مغل نے بھی اپنے رہنے سہنے کے طریقہ کو باقاعدہ بنالیا تھا۔ نماز کے پابند تھے۔ عشاء کی نماز پڑھ کر جلدی سو جاتے تھے اور پچھلی رات کو جلدی بیدار ہو جاتے تھے۔ پہلے غسل کرتے تھے، پھر نماز پڑھتے تھے اور قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے، اور صبح کی نماز کے بعد ورزش کرتے تھے۔ پھر دو سیر بالائی اور ایک بکرے کی یخنی کا ناشتہ کر کے گھوڑے پر سوار ہو کر ہواخوری کو جاتے تھے اور نشانہ بازی کی مشق کرتے تھے، پھر گھر میں آکر خانگی کاموں کو دیکھتے تھے اصطبل کے گھوڑوں بیلوں اور اونٹوں کو چارہ دانہ اپنے سامنے ڈلواتے تھے اور شکاری چیتوں اور بازوں کی دیکھ بھال بھی کرتے تھے۔ غرض دن بھر ایک منٹ بھی ان

کا فضولیات میں ضائع نہ ہوتا تھا۔ میرزا مغل کی جسمانی قوت اور پاکیزہ زندگی کے سبب دلّی کے پاکباز ہندو مسلمان اور فوجی لوگ سب شہزادوں میں انہی کو پسند کرتے تھے اور ریزیڈنسی بھی میرزا مغل کی نقل و حرکت کو اپنی نظروں میں رکھتی تھی۔

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کی صبح کو جب میرٹھ سے انگریزی فوج باغی ہو کر دلّی میں آئی اور جبراً لال قلعہ میں گھس کر بہادر شاہ کو اپنا سرپرست بنا لیا تو بہادر شاہ نے اس فوج کا سپہ سالار میرزا مغل کو بنا دیا اور میرزا مغل نے اس خدمت کو خوشی خوشی قبول کر لیا اور اپنے بھائیوں میرزا ابوبکر اور میرزا خضر سلطان وغیرہ کو فوجی عہدے تقسیم کر دیئے۔

باغی فوج بہت خودسر تھی اور بہادر شاہ کی علانیہ توہین کرتی تھی اور کہتی تھی کہ جس کے سر پر ہم جوتی رکھ دیں گے وہی بادشاہ بن جائیگا مگر میرزا مغل نے ایک ہی ہفتہ کے اندر باغیوں کو ایسا دبا دیا کہ وہ سب میرزا مغل کے اشاروں پر کام کرنے لگے۔ اس معاملہ میں میرزا مغل کا مرہٹہ مصاحب بھی اُن کو بہت مدد دیتا تھا۔ وہ ریاست ناگپور کے خاندان سے تھا جس کی ریاست ایسٹ انڈیا کمپنی نے ضبط کر لی تھی اس لئے وہ انگریزوں کا بہت دشمن تھا اور وہ حکومت کے انتظام کو بھی خوب جانتا تھا۔ جب دلّی میں باغی فوج کا قبضہ ہو گیا تو باغیوں نے انگریزوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کرنا شروع کیا۔ وہ بڑی بےرحمی سے انگریزوں اور عیسائیوں اور انگریزی خیرخواہوں کو مارتے تھے۔ عورتوں اور بچّوں کو بھی زندہ نہ چھوڑتے تھے۔ چنانچہ ایک سو کے قریب انگریز عورت مرد اور بچے گرفتار ہو کر میرزا مغل کے پاس لائے گئے۔ مرہٹہ مصاحب نے مشورہ دیا کہ ان کو قتل کر دیا جائے مگر میرزا مغل نے ان قیدیوں کو بادشاہ کے پاس لال قلعہ میں بھیج دیا۔ اور بادشاہ نے ان کو ایک مکان میں نظربند کرا دیا۔ اور حکم دیا کہ شاہی باورچیخانہ سے ان کو کھانا ملا کرے۔ یہ قیدی بہت دن اس مکان میں نظربند رہے، مگر باغیوں نے میرزا مغل اور بادشاہ کو مجبور کرنا شروع کیا کہ ان کو قتل کرنا ضروری ہے۔ بادشاہ کے مشیرِ خاص حکیم احسن اللہ خاں اور میرزا فخرو ولیعہد مرحوم کے خسر میرزا الٰہی بخش اور ملکہ زینت محل نے بادشاہ کو اس ظلم سے روکا اور کہا کہ انگریز پنجاب کے سکھوں اور مسلمانوں کی مدد لے کر آنے والے ہیں اور یہ باغی اُن کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ آپ ان انگریزوں کی حفاظت کریں گے تو انگریز آپ کا احسان مانیں گے۔ اس لئے بہادر شاہ نے عرصہ تک ان انگریزوں کو قتل سے بچائے رکھا لیکن جب باغی فوج نے حکیم احسن اللہ خاں کا گھر لوٹ لیا اور بہادر شاہ سے مطالبہ کیا کہ ملکہ زینت محل کو ہمارے حوالہ کیا جائے کیونکہ وہ اپنے بیٹے جواں بخت کی ولیعہدی کی وجہ سے انگریزوں سے ملی ہوئی ہیں تو بہادر شاہ مجبور ہو گئے اور انہوں نے کہہ دیا کہ قیدیوں کے معاملہ میں تم جیسا مناسب جانو کرو۔ مگر خفیہ طور سے میرزا مغل کو لکھا کہ انگریز قیدیوں کو قتل نہ کرنا۔ بادشاہ نے پنسل سے یہ رقعہ لکھا تھا اور بسنت نامی ایک شاہی مصاحب یہ خط لایا تھا لیکن بسنت نے وہ رقعہ میرزا مغل کو نہ دیا اور مرہٹہ مصاحب کے اشارے سے زبانی کہہ دیا کہ حضور بادشاہ سلامت نے حکم دیا ہے کہ انگریز قیدیوں کو قتل کر دیا جائے۔

میرزا مغل نے یہ حکم سُنا تو مجبوراً دیوانِ خاص لال قلعہ کے سامنے ان قیدیوں کو لا کر کھڑا کیا اور بادشاہ سے آخری حکم منگایا۔ مگر بدقسمتی سے اس وقت بھی وہی بسنت پہرہ پر تھا جو جھوٹ موٹ محل کے اندر گیا اور کچھ دیر کے بعد واپس آیا اور کہا کہ جہاں پناہ نے حکم دیا ہے کہ سب قیدی قتل کر دیئے جائیں حالانکہ بہادر شاہ اس خیال میں تھے کہ میں میرزا مغل کو تحریری حکم بھیج چکا ہوں کہ قیدیوں کو قتل نہ کیا جائے۔ چنانچہ اپنے مقدمہ کے وقت جو غدر کے بعد لال قلعہ میں ہوا تھا بہادر شاہ نے خود بیان کیا تھا کہ میں نے قیدیوں کو بچانا چاہا تھا مگر بسنت نے غلط بیانی کر کے قتل کرا دیا۔ القصہ جب بسنت نے بادشاہ کا آخری حکم سنایا تو میرزا مغل نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور باغی فوج نے انگریزوں کو قتل کر دیا۔ جن میں عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی تھے۔

آخر جب انگریز پنجاب کے سکھوں اور مسلمانوں کی فوج لے کر دلی پر آئے اور شمالی پہاڑی پر مورچے لگائے تو میرزا مغل نے بھی کشمیری دروازہ پر مورچہ بندی کر کے مقابلہ شروع کیا۔ اسی اثنا میں بریلی کا ایک سالار باغی ہو کر دلی میں آیا جس کے افسر جنرل بخت خاں نامی تھے۔ جنرل بخت خاں وہابی عقاید رکھتے تھے اور بڑے عقلمند افسر تھے ان کے دلی میں آتے ہی بادشاہ نے ان کو لارڈ گورنر کا خطاب دے کر تمام فوجی اختیارات دے دیئے یہاں تک کہ میرزا مغل کو بھی بخت خاں کا ماتحت بنا دیا میرزا مغل کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور ان کے مصاحبوں خصوصاً مرہٹہ مصاحب نے ان کو بخت خاں کے خلاف بھڑکانا شروع کیا۔ منشی رجب علی نامی جگراؤں ضلع لودھیانہ کے ایک شخص انگریزی نوکر تھے اور بڑے توڑ جوڑ کے آدمی تھے انہوں نے اپنے خفیہ آدمیوں کے ذریعہ میرزا مغل کو بخت خاں سے جدا کرنے کی تدبیریں شروع کیں۔ یہاں تک کہ ۱۲ ستمبر ۱۸۵۷ء کو بخت خاں نے ایک آخری حملہ کا نقشہ بنایا۔ خود کشمیری دروازہ کے مورچہ کی طرف فوج لے کر گیا اور میرزا مغل کو اجمیری دروازہ کی طرف سے پہاڑی کی پشت پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا کہ سبزی منڈی کی طرف سے انگریزی فوج کی پشت پر جاؤ تاکہ ہم ان کو محاصرہ میں لے کر ختم کر دیں۔ مگر میرزا مغل سے کہا گیا کہ بخت خاں مغلوں کی حکومت ختم کر کے شیر شاہ افغان کی طرح افغان حکومت ہندوستان میں قائم کرنی چاہتا ہے۔ اس لئے اس نے آپ کو ایسے مورچہ پر بھیجا ہے جدھر جنرل نکلسن کی فوجی قوت کا زور ہے تاکہ آپ کا یہاں خاتمہ ہو جائے اور بخت خاں ملک کا مالک بن جائے۔ میرزا مغل نے اس بات کو نہ مانا اور وہ یلغار کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ جنرل نکلسن قتل ہو گئے لیکن یکایک میرزا مغل کو خبر دی گئی کہ بخت خاں بھاگ گیا اور انگریزوں کی ساری فوج آپ کی طرف آ رہی ہے اس لئے میرزا مغل اپنی فوج کے ساتھ ہمایوں کے مقبرہ کی طرف چلے گئے۔ ادھر بخت خاں کو خبر دی گئی کہ میرزا مغل بھاگ گئے اور جنرل ولسن پوری فوج کے ساتھ کشمیری دروازہ کی طرف آ رہے ہیں تو بخت خاں بھی پیچھے ہٹے اور جمنا کے کنارے کنارے فوج کو لے کر ہمایوں کے مقبرہ کے نیچے جا کر ٹھہر گئے کیونکہ بہادر شاہ بھی لال قلعہ سے ہمایوں کے مقبرہ میں چلے گئے تھے اور جنرل ولسن کشمیری دروازہ کے راستہ دلی میں داخل ہو گئے۔

۵ ستمبر کو بہادر شاہ جان کی امان کے وعدہ پر میجر ہڈسن کے ساتھ انگریزی قبضہ میں آ گئے مگر میرزا مغل نے اطاعت قبول نہ کی اور وہ ہمایوں کے مقبرہ میں ٹھہرے رہے۔ جنرل بخت خاں اپنی فوج لے کر کہیں چلا گیا اور آج تک معلوم نہ ہوا کہ وہ کہاں گیا۔ ۶ ستمبر کو میجر ہڈسن پھر مقبرہ ہمایوں میں گئے اور میرزا مغل کو چند شرائط کے ساتھ اپنی حراست میں لے لیا۔ میرزا خضر سلطان اور میرزا ابوبکر اور میرزا عبداللہ بھی ان کے ساتھ تھے۔ ان سب کو رتھوں میں سوار کیا گیا اور چاروں طرف انگریزی فوج کے سپاہی چلنے لگے۔ دہلی دروازہ کے قریب جہاں آج کل دلی کا جیل خانہ ہے اور سڑک کے شرق میں ایک پرانا دروازہ ہے جس کو خونی دروازہ کہا جاتا ہے میرزا مغل وغیرہ کو رتھوں سے اُتارا گیا اور کہا گیا کہ قیدیوں کو شمار کرنا ہے تاکہ جنرل ولسن کے سامنے پیش کیا جا سکے۔ میرزا مغل اور سب شہزادوں کو صف باندھ کر کھڑا کیا گیا اور اُن کی گنتی ہوئی پھر میجر ہڈسن نے فوج کو اشارہ کیا جس نے بندوقوں کی باڑھ چلائی جس سے سب شہزادے مر کر گر پڑے۔

مولانا ذکاء اللہ صاحب نے جو اس زمانہ میں موجود تھے اپنی تاریخ ہند میں لکھا ہے کہ جنرل ولسن نے میجر ہڈسن کو قتل کی اجازت نہ دی تھی مگر میجر ہڈسن کی عورتیں اور بچے لال قلعہ میں قتل ہوئے تھے اور ان کو میرزا مغل سے بدلہ لینے کا جوش تھا اس لئے اُنہوں نے اپنی رائے سے ان کو قتل کر دیا مگر مولانا ذکاء اللہ صاحب اس عام افواہ کی تصدیق نہیں کرتے کہ میجر ہڈسن نے میرزا مغل کے سینہ سے اُبلنے والے خون کا ایک چلو پیا اور کہا کہ اب میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ وہ لکھتے ہیں کہ میجر ہڈسن کو بیشک غصہ بہت تھا اور وہ میرزا مغل کو اپنے بچوں کا قاتل سمجھتے تھے مگر یہ افواہ درست نہیں ہے کہ اُنہوں نے میرزا مغل کا خون پیا۔ یہ افواہ درست ہے کہ میجر ہڈسن نے شہزادوں کے سر کاٹ کر بادشاہ کے سامنے پیش کئے اور کہا کہ لو یہ تحفہ قبول کرو۔ کیونکہ جنرل ولسن نے جب یہ خبر سُنی تو وہ میجر ہڈسن پر خفا ہوئے کہ اُنہوں نے میرے حکم کے بغیر شہزادوں کو

کیوں قتل کیا۔ تو میجر ہڈسن نے جواب دیا تھا کہ مجھے اندیشہ تھا کہ آپ ان کو رہا کر دیں گے حالانکہ وہ بہت بڑے مجرم تھے اور معاف کرنے کے قابل نہ تھے۔ زندہ رہتے تو بغاوت کی آگ پھر بھڑک اُٹھتی۔ غرض اس طرح میرزا مغل کی زندگی ختم ہو گئی اور کوئی نہیں جانتا کہ ان کی لاش کہاں دفن ہوئی لیکن ہندوستانی لوگ خونی دروازہ کو جہاں میرزا مغل قتل ہوئے تھے اس طرح دیکھنے آتے ہیں جس طرح ان کی قبر کو دیکھا جاتا اگر وہ کہیں موجود ہوتی۔

"منادی"

قومی ترانہ

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے — ہر رُت ہر اک موسم اس کا کیسا پیارا پیارا ہے
کیسا سُہانا کیسا سُندر پیارا دیش ہمارا ہے — دُکھ ہیں، سُکھ ہیں، ہر حالت میں بھارت دل کا سہارا ہے

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

سارے جگ کے پہاڑوں میں بے مثل پہاڑ ہمالہ ہے — پربت سب کے اونچا ہے یہ پربت سب سے نرالا ہے
بھارت کی رکھشا کرتا ہے بھارت کا رکھوالا ہے — لاکھوں چشمے بہتے ہیں اس میں لاکھوں ندیوں والا ہے

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

گنگا جی کی پیاری لہریں گیت سُناتی جاتی ہیں — صدیوں کی تہذیب ہماری یاد دلاتی جاتی ہیں
بھارت کے گلزاروں کو سرسبز بناتی جاتی ہیں — کھیتوں کو ہریالی دیتی پھول کھلاتی جاتی ہیں

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

ہرے بھرے ہیں کھیت ہمارے دُنیا کو اَن دیتے ہیں — چاندی سونے کی کانوں سے ہم جگ کو دھن دیتے ہیں
پریم کے پیارے پھول کی خوشبو گلشن گلشن دیتے ہیں — امن و اماں کی نعمت سب کو بھر بھر دامن دیتے ہیں

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

کرشن کی بنسی نے پھونکی ہے رُوح ہماری جانوں میں — گوتم کی آواز بسی ہے محلوں میں میدانوں میں
چشتی نے جو دی تھی مے وہ اب تک ہے پیمانوں میں — نانک کی تعلیم ابھی تک گُونج رہی ہے کانوں میں

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

مذہب کچھ ہو ہندی ہیں ہم سارے بھائی بھائی ہیں — ہندو ہیں یا مُسلم ہیں یا سِکھ ہیں یا عیسائی ہیں
پریم نے سب کو ایک کیا ہے پریم کے ہم شیدائی ہیں — بھارت نام کے عاشق ہم ہیں ہم بھارت کے سودائی ہیں

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

(حامد اللہ افسر میرٹھی)

"دین و دُنیا"

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ فروری ۱۹۳۸ء

تاریخ مشاعرہ } :- "مشاعرہ آل انڈیا نمائش لاہور"
از عامل ہوشیارپوری ۱۳۵۶ھ

تصویر:- ارکانِ مشاعرہ آل انڈیا نمائشِ پنجاب "لاہور"

شمار	مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ
۱	بزمِ "ہمایوں"	بشیر احمد	۱۲۴
۲	اُردو شعر کا ارتقائی مطالعہ	حامد علی خاں	۱۲۶
۳	لاہور میں ایک عدیم النظیر مشاعرہ	چودھری غلام حیدر خاں صاحب ناظمِ ادارۂ زمیندار لاہور ..	۱۳۰
۴	مناظمہ و مشاعرہ	.. ..	۱۳۲
۵	شرحِ تصویر	.. ..	۱۳۳
۶	انعامی نظمیں :-		
	(۱) مقصدِ حیات	محترمہ زیب عثمانیہ بیگم ایس بہاءالدین	۱۳۴
	(۲) مقصدِ حیات (مزاحیہ)	حاجی لق لق	۱۳۵
	(۳) انعامی غزل	بالمکند صاحب عرش ملسیانی	۱۳۷
۷	موضوعی نظمیں :-		
	(۱) مقصدِ حیات	آغا آفتاب اطہر قزلباش	۱۳۸
	(۲) مقصدِ حیات	حضرتِ الطاف مشہدی ..	۱۳۹
	(۳) خاتونِ ہند کا مقصدِ حیات	خواجہ معین الدین صاحب عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد (دکن)	۱۴۰
	(۴) ہمارا وطن	حضرتِ ساغر نظامی	۱۴۱
	(۵) اے کشورِ ہندوستان	حضرتِ روش صدیقی	۱۴۵
	(۶) ہندوستان کا قومی ترانہ	خان بہادر چودھری خوشی محمد صاحب ناظر سابق گورنر کشمیر ..	۱۴۷
	(۷) ہمارا وطن	پنڈت بالمکند صاحب عرش ملسیانی	۱۴۹
	(۸) ہمارا وطن	محترمہ سمن رُخ بانو بیگم آغاز صاحبہ	۱۵۰
	(۹) ہمارا وطن	سید فیضی صاحب جالندھری	۱۵۱
	(۱۰) ہمارا وطن	سید عنایت علی صاحب آغاز	۱۵۲
	(۱۱) دیہات کا ایک منظر	حضرتِ قدیر لکھنوی	۱۵۴
	(۱۲) دیہات کا ایک منظر	حضرتِ وقار انبالوی	۱۵۶
	(۱۳) دیہاتی لڑکی	جناب سید نظیر احمد صاحب ظفر	۱۵۷
۸	طرحی غزلیں :-		

قیمت ۸/

نمبر	عنوان	مصنف	صفحہ
	طرحِ اوّل :- غزلِ داغ		۱۵۹
	(۱) غزل	پروفیسر عبداللطیف صاحب تپش	۱۶۰
	(۲) غزل (مزاحیہ)	از حاجی لق لق	۱۶۱
	طرحِ دوم :- غزلِ اقبال		۱۶۲
	(۱) غزل	جناب پنڈت برجموہن صاحب کیفی دتاتریا دہلوی	۱۶۳
	(۲) غزل	حضرت سراج لکھنوی	۱۶۴
	(۳) غزل	مولانا تاجور نجیب آبادی	۱۶۵
	(۴) غزل	سردار اودے سنگھ صاحب شائق	۱۶۶
	(۵) غزل	ڈاکٹر محمد دین صاحب تاثیر	۱۶۷
	(۶) غزل	پرنسپل رام پرشاد صاحب ناشاد	۱۶۷
	(۷) غزل	جنابِ جوش ملسیانی	۱۶۸
	طرحِ سوم :- غزلِ جوش		۱۶۹
	(۱) غزل	خان اصغر حسین خاں نظیر	۱۷۰
	(۲) غزل	جناب پنڈت ولتہ پرشاد صاحب فدا	۱۷۱
۹	متفرق نظمیں :-		
	(۱) خرابات	حضرتِ جوش ملیح آبادی	۱۷۲
	(۲) جہانِ آزاد	حضرتِ ساغر نظامی	۱۷۴
	(۳) دوہے	خواجہ دل محمد صاحب	۱۷۶
	(۴) پردہ	حضرتِ احسان دانش	۱۷۷
	(۵) زبورِ حریت	حضرتِ روش صدیقی	۱۸۰
	(۶) صبحِ بہار	پروفیسر عابد علی صاحب	۱۸۲
	(۷) سرمایہ دار	حضرتِ حفیظ ہوشیارپوری	۱۸۳
	(۸) پیمانِ وفا	صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم	۱۸۴
	(۹) ہمہ گیریٔ عشق	حامد علی خاں	۱۸۵
	(۱۰) رقیب سے	پروفیسر فیض احمد صاحب	۱۸۶
	(۱۱) رُباعیات	بشیر احمد	۱۸۷
۱۰	متفرق غیر طرحی غزلیں :-		
	(۱) غزل	خان بہادر چودھری خوشی محمد صاحب ناظر سابق گورنر کشمیر	۱۸۸
	(۲) غزل	خان بہادر نواب احمد یار خاں دولتانہ	۱۸۹
	(۳) غزل	جناب دینا ناتھ صاحب مست کاشمیری صدر بزمِ اُردو جموں و کشمیر	۱۹۰
	(۴) غزل	جناب جلال الدین صاحب اکبر	۱۹۱
	(۵) غزل	محمد علی خاں صاحب اثر رامپوری	۱۹۲
	(۶) غزل	جناب بدر غازی پوری	۱۹۳

اطلاع :- "غالب اور بیدل" کا بقیہ حصہ آئندہ پرچے میں شائع ہوگا۔ "ہمایوں"

بزمِ ہمایوں

آل انڈیا نمائش کا مشاعرہ

لاہور کی نمائش کا آل انڈیا مشاعرہ جو زیرِ اہتمام انجمنِ اُردو پنجاب ۳۰ اور ۳۱ دسمبر ۱۹۳۷ء کو نمائش گاہ میں منعقد ہوا ملک میں اُردو کی بڑھتی ہوئی ہر دلعزیزی کا ایک کامیاب اور دل خوش کُن مظاہرہ تھا۔ مشاعرے کے شروع ہونے کے وقت بوندا باندی ہو رہی تھی، اس پر پنجاب کے بڑے دنوں کی سردی اور ستم ڈھا رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساری نمائش گاہ میں جہاں ہر روز ایک ایک لاکھ تماشائی ہوتے تھے ایک آدھ سینکڑہ آدمی بھی موجود نہ تھے، لیکن کارکنانِ انجمن کے تعجب کی انتہا نہ رہی جب دو گھنٹے کے اندر اندر بارش کے ہوتے ہوئے ایک ہزار سے زائد لوگ ہال میں جمع ہو گئے۔ شرح ٹکٹ تین روپے، ایک روپیہ اور آٹھ آنے تھی۔ ہال بھر گیا تو لوگ باہر برآمدوں میں سننے کی خاموش کوشش کرتے رہے۔ اس کے مقابلے میں اس کے بعد جب پنجابی اور ہندی کے دربار بلکہ کوی دربار منعقد ہوئے تو باوجود اس کے کہ موسم نہایت خوش گوار تھا، ٹکٹ ایک روپیہ اور آٹھ آنے اور چار آنے تک کے تھے مگر ہال کا دو تہائی حصہ خالی تھا اور جو ایک تہائی پُر تھا، اُس میں بھی زندگی کے ساتھ زندہ دلی اور گرمجوشی اور لُطف اندوزی کے بہت کم آثار پائے جاتے تھے۔ انجمن کی محنت ٹھکانے لگی، قومی زبان کی جادُو اثری سے بلا امتیازِ مذہب و ملّت لوگوں کو مسرُور دیکھ کر مشقّت کی یاد ادبی مسرّت سے بدل گئی۔ ہم دوسری زبانوں کو نیچا دکھانا نہیں چاہتے وہ بھی سب ہمارے ہی دیس کی پیاری بولیاں ہیں لیکن کیا یہ واقعہ نہیں کہ ہندو مسلم سکھ عیسائی سب کے سب جس زبان کی مجلسوں اور مشاعروں کی طرف خود بخود کھنچے چلے آتے ہیں وہ اُردو اور صرف اُردو ہے؟ یہ درست ہے کہ جس کا کھائیں اُس کا گائیں لیکن یہ اُس سے بھی بڑھ کر درست ہے کہ جس کی سمجھیں اُس کی سُنیں۔ شیرینی کو کون پسند نہیں کرتا؟ اُردو شاعری بھی وہ چشمۂ شیریں ہے کہ ہر مذہب و ملّت کے لوگ اس کے گرد آ کر خود بخود جمع ہو جاتے ہیں!

بعض لوگوں کو مشاعرے کے وجود سے شکایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آج کل کے عملی زمانے میں ایسی خرافات کی گنجائش نہیں۔ آج کل کے عملی زمانے کے لئے سائنس باعثِ افتخار ہے لیکن بے کس عورتوں اور ننھے بچوں پر بم گرانے والی بھی سائنس ہی ہے۔ ہر شے اگر اُس کا استعمال صحیح ہو صحیح ہے اور اگر اُس کا استعمال غلط ہو غلط ہے۔ یہی حالت مشاعروں کی ہے۔ یہ درست ہے کہ ہمارے اکثر مشاعروں میں اصلاح کی گنجائش ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم بجائے اُن میں اصلاح کرنے کے اُن سے یکسر مُنہ پھیر لیں۔ مشاعرے صحیح انسانی اور قومی زندگی کی تصویر بن سکتے ہیں۔ جب وہ ایسے بنیں اور ایسے ہوں تو اُردو مشاعرے بلاشبہ زندگی اور زندہ دلی کے جیتے جاگتے نمونے ہوتے ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم اُنہیں بُرا سمجھیں۔

آل انڈیا نمائش کے مشاعرے کی تین نشستیں تھیں ۔ ۳۰ر دسمبر کو پہلی نشست ½۱۰ بجے صبح سے ایک بجے تک تھی ۔ اس کے صدر دیوان بہادر راجہ نریندر ناتھ تھے ۔ دوسری نشست ۲ بجے سے ۶ بجے شام تک جاری رہی ۔ اور تیسری ۳۱ر دسمبر کو ½۲ بجے سے ½۶ بجے شام تک ۔ ان دونوں کی صدارت آنریبل سر عبدالقادر ممبر انڈیا کونسل نے فرمائی ۔ راجہ صاحب نے ایک دلچسپ افتتاحی تقریر کی جس میں انہوں نے مشاعروں کی تاریخ بیان کی اور کہا کہ مشاعرے خاص طور پر اردو زبان اور اردو شاعری کی پیداوار اور اس کا دلچسپ اور مفید نتیجہ ہیں ۔ سر عبدالقادر نے مشاعرے کے دوران میں جا بجا نہایت پُرلطف نکتے بیان کئے اور "مخزن" کا زمانہ یاد دلا دیا ۔

مفصلۂ ذیل شعرائے کرام نے اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ فرمایا :- الطاف (مشہدی)، عابد، تاجور (سامری)، ناشاد، تاجور (نجیب آبادی)، جوش ملسیانی، عرش ملسیانی، احسان بن دانش، روش صدیقی، اکبر، سراج (لکھنوی)، اُودے سنگھ شائق، بدر (غازی پوری)، خلیفہ عبدالحکیم، حیرت (وارثی)، حفیظ ہوشیارپوری، نصراللہ خاں عزیز، اثر رامپوری، حامد علی خاں، نواب احمد یار خاں دولتانہ، نشتر (جالندھری)، خواجہ دل محمد، کیفی (دہلوی)، خوشی محمد ناظر، وِدیا پرشاد فدا، تاثیر، فیض، تبسم، دینا ناتھ مست (صدر بزم اردو جموں و کشمیر)، تپش، بشیر احمد (سکرٹری مشاعرہ کمیٹی)، قدیر (لکھنوی)، ساغر میرٹھی اور جوش ملیح آبادی ۔

سابقہ اعلان کے مطابق جو سو سے زائد نظمیں اور غزلیں انعامی مقابلے میں شریک ہونے والے حضرات کی طرف سے موصول ہوئی تھیں اُن میں سے تین منتخب کی گئیں اور مشاعرے کی دوسری نشست میں پڑھی گئیں ۔

۳۱ر دسمبر کی صبح کا وقت شعرا اور بالخصوص بیرونِ پنجاب کے شعرا نے سیر و تفریح میں گزارا ۔ اسی روز دوپہر کو راقم نے اپنے مکان "المنظر" (۲۳-لارنس روڈ) میں سب شعرا کو مدعو کیا تھا ۔ تناولِ ماحضر کے بعد ایک پُرلطف "مشاعری" منعقد ہوئی اور پھر مکان کے باہر فوٹو اتارا گیا ۔ یکم جنوری کو سید امتیاز علی صاحب تاج نے شعرا کی اپنے ہاں چائے سے ضیافت کی ۔ غرض مشاعرے کی یہ پُرلطف صحبتیں تین روز جاری رہیں اور ان کی یاد مدتوں باقی رہے گی ۔

مشاعرے کی کامیابی کو دیکھ کر کئی دوستوں اور دوسرے صاحبوں نے لاہور میں ہر سال ایسے مشاعرے منعقد کرنے کی تجویز پیش کی اور اس میں ہر طرح کی امداد دینے کا وعدہ فرمایا ۔ اگر یہ دوست اپنے وعدے یاد رکھیں گے تو ان کی تجویز کو ضرور عملی جامہ پہنایا جائے گا ۔ ہماری ناچیز خدمات کے اعتراف کے طور پر ہمارے دوست جناب رحل ہوشیارپوری نے "تعریفی" تاریخوں کے پُل باندھ دیئے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں "واہ وا ! رسالہ ہمایوں کا مشاعرہ نمبر" (۱۳۵۶ھ) ساتھ ہی نمائش پر بھی نظرِ عنایت ڈالتے ہیں "نمائش فنون و مصنوعات پنجاب خوب ہوئی" (۱۹۳۷ء) اور چونکہ یہ نمائش تا حال جاری ہے اس لئے بے اختیار یہ بھی فرماتے ہیں کہ "اہا ! نمائش فنون و مصنوعات پنجاب خوب ہے" (۱۹۳۸ء) ۔ اس ضمن میں بہترین تاریخی تعریف اور توصیفی تاریخ وہ ہے جو فہرست مضامین کے اوپر درج کی گئی ہے اور ہمارے لئے وہی کافی ہے یعنی "مشاعرہ آل انڈیا نمائش لاہور" (۱۳۵۶ھ) ۔

بشیر احمد

جو حضرات مشاعرے کے اُس گروپ کی جو اس دفعہ ہمایوں میں شائع کیا گیا ہے کاپی خریدنا چاہیں وہ براہِ راست ایم اے رشید صاحب فوٹوگرافر گرینڈ ٹرنک روڈ نزد شالامار باغ لاہور سے طلب فرمائیں ۔ قیمت فی کاپی ایک روپیہ چار آنے (علاوہ محصول) ہے ۔ — مینیجر "ہمایوں"

لاہور میں ایک عدیم النّظیر مُشاعرہ

(از جناب چودھری غلام حیدر خاں صاحب ناظم ادارۂ "زمیندار" لاہور)

چودھری صاحب نے اپنا یہ تبصرہ جو ۹ جنوری ۱۹۳۶ء کے "زمیندار" میں شائع ہوا تھوڑے سے اضافے کے ساتھ مشاعرہ نمبر کے لئے عنایت فرمایا ہے۔ ایڈیٹر

آل انڈیا نمائش لاہور کے انجینئرنگ ہال میں اُردو کا جو مشاعرہ ۳۰ اور ۳۱ دسمبر ۱۹۳۵ء کو منعقد ہوا وہ پنجاب میں اس لحاظ سے بلاشبہ عدیم النظیر قرار دیا جا سکتا ہے کہ اس میں ہندوستان کے چوٹی کے اُردو شاعر موجود تھے جنہوں نے راجہ نریندر ناتھ صاحب اور آنریبل سر عبدالقادر کی صدارت میں حاضرین کے سامنے اپنا ایسا کلام پیش کیا جس کی یاد کا نقش لوحِ دل پر عرصۂ دراز تک قائم رہے گا۔

اس مشاعرہ کی روحِ رواں میاں بشیر احمد صاحب ایڈیٹر ہمایوں وسکرٹری انجمن اُردو پنجاب تھے جن کی "التماس" نے مشاعرہ کے ہال میں ایک "زندہ دلی" کا قطعی طور پر سدِباب کر دیا جس کا تختۂ مشق عام طور پر ان شاعروں کو بنایا جاتا ہے جن کا کلام ان سے خراجِ تحسین وصول کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ میاں صاحب ایسی "زندہ دلی" کو ہر پہلو سے معیوب خیال کرتے ہیں یہی وجہ تھی کہ "التماس" کی بدولت سامعین کو ہر قسم کے کلام سے لطف اندوز ہونے کا موقع مل گیا۔

لیکن علمی اور ادبی پہلو سے میاں صاحب کی زندہ دلی میں کلام نہیں ہو سکتا کیونکہ طبقۂ امراء سے تعلق رکھنے اور بظاہر زندگی کی راحتوں اور مسرتوں کے سرمایہ دار ہونے کے باوجود وہ اُردو کی تحریک کو نہ صرف زندہ رکھنے بلکہ اس کے نصب العین کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اپنا دماغ، وقت اور روپیہ خرچ کر رہے ہیں۔ یہی وہ زندہ دلی ہے جس کے عملی مظاہرہ کے بغیر کوئی قوم ترقی اور کامیابی کے اعلےٰ مقام تک نہیں پہنچ سکتی۔

سامعین میں ہندو مسلمان اور سکھ سبھی شامل تھے، مگر مسلمانوں کی تعداد نسبتہً زیادہ تھی۔ مُسلم خواتین بھی موجود تھیں۔ اگرچہ اردو اور ہندی کی بحث نے ایسی ناگوار صورت اختیار کر رکھی ہے کہ ہندوؤں کا قوم پرست تعلیم یافتہ طبقہ اُردو کو جو گذشتہ چار پانچ صدیوں سے دونوں قوموں کے لسانی معاشری اور تمدنی تعلقات کی ایک زندہ یادگار ہے صفحہ ہستی سے مٹانے پر تُلا ہوا ہے۔ لیکن اُردو کی جڑیں علم و ادب کی زمین میں اس قدر گہری اور دُور چلی گئی ہیں کہ اُن کا کاٹنا دشمنانِ اُردو کے لئے کوئی آسان کام نہیں۔ کاش اُردو کے دشمنوں کو اس امر کا احساس ہو کہ اُن کی اُردو دُشمنی وطنی مفاد کے لئے کس قدر تباہ کُن ثابت ہو رہی ہے۔ استخلاصِ وطن کے لئے ابنائے وطن کی ہم آہنگی ایک لازمی امر ہے۔ لیکن جب زبان ایک نہ ہو تو ہم آہنگی کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔

جن شعرائے کرام نے اپنے کلام سے حاضرین پر وجد اور سرور کی کیفیت طاری کر دی ان میں عرش ملسیانی، احسان بن دانش، روش صدیقی، ساغر میرٹھی، جوش ملیح آبادی، تاجور نجیب آبادی، حفیظ ہوشیارپوری، اثر رامپوری کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

محترمہ زیب عثمانیہ صاحبہ (لدھیانہ) کی نظم قابلِ انعام قرار دی گئی اور انجمن اُردو پنجاب نے موصوفہ کو سُنہری تمغہ عطا کیا۔ ایک مُسلم خاتون شاعرہ کی یہ کامیابی یقیناً قابلِ فخر ہے، اور میرا ایمان ہے کہ اگر حوّا کی بیٹیوں کو صحیح تعلیم دی جائے اور ان کی حوصلہ افزائی کی جائے تو وہ اپنے علم و عمل سے ملک و ملّت کی زندگی میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کر سکتی ہیں، کیا یہ انقلاب نہیں کہ انہیں خواتین میں ایک ایسی خاتون بھی موجود تھی جس نے ایروپلین میں ۱۹ ہزار فٹ کی بلندی تک اپنی پرواز سے پانچ دریاؤں کی سرزمین میں ریکارڈ قائم کر کے دُنیا کو دکھا دیا کہ شاعر کے طائرِ خیال کی طرح وہ بھی عالمِ بالا کی سیر کر سکتی ہے؟

دوسرا تمغہ کرنال شاپ لاہور کی طرف سے عرش ملسیانی صاحب کو اور تیسرا تمغہ منتظمینِ مشاعرہ کی طرف سے حاجی لق لق صاحب مدیرِ احسان کو دیا گیا۔ حاجی لق لق کی مزاحیہ نظم پر تینوں صاحبان نے بھی تھوڑی دیر کے لئے اپنی متانت کو خیرباد کہہ دی تھی، حاضرین کے مسلسل قہقہوں کی گونج نے ایک عجیب سماں پیدا کر دیا تھا۔

زمانہ کی رفتار کے ساتھ شاعری کا رنگ بھی بدل گیا ہے، اقوام و ملل کے عروج و زوال سے شاعری بھی لازمی طور پر اثر پذیر ہوتی ہے جب ہندوستان آزاد اور طاقتور [illegible] شاعری کا رنگ کچھ اور تھا [illegible] جب فرزندانِ ہند کی غلامی اور پستی کا دور شروع ہوا تو یہ رنگ بدل گیا۔ ذلّت و نکبت کے احساس نے اب ایسے شاعر پیدا کر دیئے ہیں جو رفعت و عظمت کے اعلیٰ مقام تک پہنچنے کے لئے لوگوں کے خیالات میں ایک زبردست انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں مثلاً جوش ملیح آبادی اس قسم کا شاعر ہے جسے

مرے معشوق کے دو ہی پتے ہیں — کمر پتلی، صُراحی دار گردن

کے مضمون سے کوئی دلچسپی نہیں، جو شیخ کو جسے اپنے زہد و اتقا پر ناز ہے ایسی شراب کا جام پیش کرتا ہے جس کی بدولت وہ خلافتِ ارضی کا مالک بن جائے۔
مشاعرہ میں جو کلام سنایا گیا ہے اس کی نسبت یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انقلابی شاعری ایک سٹیم رولر ہے جو ہمارے مستقبل کی شاہراہ کو تیار کر رہا ہے۔ شاعری کا مقصد بھی یہی ہے کہ ایک مُردہ قوم میں بیداری اور آزادی کا غیر فانی احساس پیدا کر دے۔

پنجاب کے بین الاقوامی اتحاد کا مسئلہ حل کرنے کے لئے بھی اُردو شاعری کا وجود نہایت ضروری ہے۔ اس سے زیادہ دلکش منظر اور کیا ہو سکتا تھا کہ مشاعرہ کی سٹیج پر مسلمان ہندو اور سکھ سامعین کی نگاہیں شاعر پر جمی ہوئی تھیں جس کے کلام نے ان کو مسحور کر رکھا تھا اُس وقت مُسلم اور غیر مُسلم شعراء ایک ہی خاندان یا برادری کے ارکان نظر آتے تھے جن کا مقصدِ حیات اُردو شاعری کو ہر پہلو سے فروغ دینا ہے۔ شاعری موسیقی ہے ایسی موسیقی جس کے پُر سوز نغموں کی بدولت سامعین حبِ وطن کی شمع کے پروانے بن جاتے ہیں جو بسا اوقات دیپک کے اس راگ پر جل مرتے ہیں۔ شاعر مسجد اور مندر کے ان جھگڑوں سے جنہوں نے ہندوستان کو جہنم بنا رکھا ہے بالاتر رہتا ہے، کیونکہ اسے اپنے محبوب کا جلوہ مندر میں بھی نظر آتا ہے اور مسجد میں بھی۔
انجمنِ اُردو پنجاب کے پُر جوش اور مخلص سکرٹری میاں بشیر احمد صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں جن کی توجہ اور سعی سے اُردو کی تحریک قابلِ اطمینان رفتار کے ساتھ منزلِ مقصود کی طرف جا رہی ہے اور یہی وطن کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

مناظمہ و مشاعرہ

اور

انعامی اعلان

ذیل میں مشاعرہ کے لئے نظموں کے موضوع اور غزلوں کی طرحیں درج کی جاتی ہیں

موضوعاتِ نظم

ہمارا وطن —— مقصدِ حیات —— دیہات کا ایک منظر

مصرع ہائے طرح

۱۔ پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے

۲۔ صد شکر کہ پھر زیست کا ساماں نظر آیا

۳۔ حالِ دل بھی سُنا کے دیکھ لیا

اِن کے متعلق انعامی مقابلہ بھی ہوُا۔ مندرجہ بالا موضوعات میں سے کسی موضوع پر بہترین نظم کے لئے "انجمنِ اُردو پنجاب" کی طرف سے ایک طلائی تمغہ پیش کیا گیا تھا، اور مصرعِ ہائے طرح میں سے کسی ایک پر بہترین غزل کیلئے "کرنال شاپ انار کلی لاہور" کی طرف سے بھی ایک طلائی تمغہ پیش کیا گیا تھا۔ کسی موضوع پر بہترین مزاحیہ نظم کے لئے بھی ایک طلائی تمغہ مقرر تھا۔ بہترین نظم یا غزل کے علاوہ انعامی نظموں یا غزلوں میں سے جو نظمیں یا غزلیں منتخب کی گئیں یا جو مقابلہ کے لئے مقررہ تاریخ کے بعد آئیں اُن میں سے چند منتخب نظمیں اور غزلیں "ہمایوں" کے اس نمبر میں درج کی جاتی ہیں۔ جو شعرائے کرام مقابلہ میں شریک نہ ہوئے اُن کی نظمیں اور غزلیں بھی انہیں صفحات میں شائع کی گئی ہیں۔

"ھمایوں"

پیچھے کھڑے ہوئے

۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷
نشتر جالندھری	سوہن لال ساحر	بالمکند عرش	بشن داس زار	جلال الدین اکبر	حفیظ ہوشیارپوری	فیض احمد

کھڑے ہوئے

۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲	۱۳	۱۴	۱۵	۱۶
لبھو رام جوش	اثر رامپوری	احسان دانش	حامد علی خاں	تاجور نجیب آبادی	بشیر احمد (سکرٹری مشاعرہ کمیٹی)	حیرت وارثی	تاثیر	غلام مصطفٰے تبسم

کرسیوں پر بیٹھے ہوئے

۱۷	۱۸	۱۹	۲۰	۲۱	۲۲	۲۳	۲۴	۲۵	۲۶
عبداللطیف تپش	خلیفہ عبدالحکیم	اودے سنگھ شایق	روش صدیقی	ساغر نظامی	سر عبدالقادر (صدر مشاعرہ)	جوش ملیح آبادی	بدر غازی پوری	سراج لکھنوی	قدیر لکھنوی

انعامی نظمیں

مقصدِ حیات

از محترمہ زیب عثمانیہ صاحبہ بیگم ایس بہاءالدین صاحب وقار

اس نظم پر شاعرہ کو انجمنِ اُردو پنجاب کا طلائی تمغہ پیش کیا گیا۔ "ھمایوں"

بھول کے بھی نہ درد کو دل سے کبھی جُدا سمجھ
شاہدِ دل نواز کی یہ بھی کوئی عطا سمجھ

امن کی آرزو نہ کر امن کی آرزو ہے موت
ہر نفسِ حیات کو درد میں مبتلا سمجھ

منزلِ ہست و بود میں تیرا مقام ہے بلند
مہر و مہ و نجوم کو اپنے نشانِ پا سمجھ

شاہرہِ حیات میں رہبر و راہزن نہ بن
اپنے سفر کا مُدّعا اس سے کہیں سوا سمجھ

تیرے حریمِ قلب کی خاک میں جب جمود ہو
فتنہ کوئی اُٹھا سمجھ حشر کوئی بپا سمجھ

تیری صفائے قلب کا دہر میں امتحان ہے
خود کو بشر سمجھ مگر قدسیوں سے سوا سمجھ

پردۂ چشم سے ترے اشک جھلک رہے ہیں زیبؔ
دامنِ کائنات کو موتیوں سے بھرا سمجھ!

مقصدِ حیات

حاجی لق لق کی مزاحیہ نظم جس پر آل انڈیا نمائش کے آل انڈیا مشاعرہ میں طلائی تمغہ پیش کیا گیا۔

زندگی کیا چیز ہے کس دیس کی سوغات ہے؟ آؤ ہم بتلائیں کیوں جیتے ہیں ہم کیا بات ہے
زندگی اپنی نمائش گاہِ مصنوعات ہے چار دن بجلی کے لمپ اور پھر اندھیری رات ہے

آئے ہیں دُنیا میں ہم کچھ کام کرنے کے لئے
کچھ خدا سے اور کچھ بیوی سے ڈرنے کے لئے

ہے جوانوں کے لئے سنیما میں جانا زندگی جیب میں پائی نہ ہو ٹائی لگانا زندگی
مہ وشوں سے باغ میں آنکھیں لڑانا زندگی غسلخانے میں اکیلے گنگنانا زندگی

عشق بازی اور موسیقی نہیں تو کچھ نہیں
اور کچھ کچھ مے سے دلچسپی نہیں تو کچھ نہیں

شعر کہنا بھی بنا جاتا ہے جزوِ زندگی نام چھپ جانا رسالے میں ہے حدِّ شاعری
نثر میں اشعار کہہ لینا ہے اِک صنعت نئی اور اگر یہ بھی نہیں خالی تخلّص ہی سہی

نام کے ساتھ ایک دو الفاظ کی دُم چاہیئے
شعر بے معنی سہی لیکن ترنم چاہیئے

عہدِ آزادی عروضی قید کا قائل نہیں اور اگر ہو بھی تو ایسے شعر کچھ مشکل نہیں
مرتعش جذباتِ قلبِ مرتسم ساحل نہیں نکہتِ عارض شمیمِ فطرتِ حاصل نہیں

سبزۂ شوریدہ سر آوارۂ الزام ہے
محملِ لیلیٰ سرودِ ارغنون و رجام ہے

زندگی کا ایک مقصد لیڈری کرنا بھی ہے چندہ کھا کر قوم کی اُلفت کا دم بھرنا بھی ہے

مُلک پر جاں دینا لفظی طور پر مرنا بھی ہے　　اس پہ "مُردہ باد" کے نعروں سے کچھ ڈرنا بھی ہے

گرم جلسوں میں رہے ہنگامۂ کون و فساد

کان میں آتے رہیں بس نعرہ ہائے "زندہ باد"

سامنے مسجد کے گانے پر بھی جھگڑا چاہیئے　　اور کبھی قومی ترانے پر بھی جھگڑا چاہیئے

ہو سکے تو ذبح خانے پر بھی جھگڑا چاہیئے　　اور کبھی کونسل میں جانے پر بھی جھگڑا چاہیئے

بن کے لیڈر سور رہے تو زندگی کس کام کی

امن قائم ہو گیا تو لیڈری کس کام کی

مقصدِ حجّام ہے عورت بنانا مرد سے　　مقصدِ عاشق ڈرانا بُت کو آہِ سرد سے

کام ہے پولیس کو آوارہ کوچہ گرد سے　　ڈاکٹر کو ایکس رے سے اور دلِ پُر درد سے

ہے یہ ایڈیٹر کا مقصد جنگ چھڑ جائے کہیں

یہ نہیں تو مسلم و ہندو ہی بھڑ جائے کہیں

کام بیکاروں کا ہے شام و سحر غم دیکھنا　　اہلِ دفتر کی طرف باچشمِ پُرنم دیکھنا

جلسہ میں قومی رضا کاروں کا اُودھم دیکھنا　　صبح دم اخبار میں "وانٹڈ" کا کالم دیکھنا

ان غریبوں کا کوئی مقصد بھی بر آتا نہیں

اب کہیں لکھا "ضرورت ہے" نظر آتا نہیں

زندگی کے اَور مقصد بھی ہیں انساں کے لئے　　کوئی ایواں کے لئے ہے کوئی زنداں کے لئے

منتظر ہے کوئی جنگِ وسِ وُ جاپاں کے لئے　　زندگی لق لق کی ہے اخبارِ "احساں" کے لئے

میرا خامہ رات اور دن وقفِ لقلقیات ہے

چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہے

WANTED ـلہ

انعامی غزل

(پنڈت بالمکند صاحب عرشؔ ملسیانی)

اس طرحی غزل پر کرنال شاپ انارکلی لاہور کی طرف سے طلائی تمغہ پیش کیا گیا۔ "ہمایوں"

زخمِ دل بھی دِکھا کے دیکھ لیا — بس تمہیں آزما کے دیکھ لیا

داغِ دل سے بھی روشنی نہ ملی — یہ دِیا بھی جلا کے دیکھ لیا

شکوے مٹتے ہیں کیونکر آپ سے آپ — سامنے اُنکے جا کے دیکھ لیا

مژدہ اَے حسرتِ دلِ پُر شوق — اُس نے پھر مسکرا کے دیکھ لیا

نہ گئی ان کی تمکنت نہ گئی، — بارہا سر جھکا کے دیکھ لیا

جو نہ دیکھا تھا آجتک ہم نے — دل کی باتوں میں آ کے دیکھ لیا

آبرو اَور بھی ہوئی پانی — اشکِ حسرت بہا کے دیکھ لیا

لُطف جو بیخودی میں تھا وہ کہاں — ہوش میں ہم نے آ کے دیکھ لیا

ترکِ اُلفت کے سُن لئے الزام — رازِ دل کو چھُپا کے دیکھ لیا

کوئی اپنا نہیں یہاں اَے عرشؔ
سب کو اپنا بنا کے دیکھ لیا

موضوعی نظمیں

”مقصدِ حیات“

مقصدِ حیات کے موضوع پر ذیل کی چند نظمیں خاص طور پر قابلِ تعریف ہیں :-

۱- مقصدِ حیات

(آغا آفتاب اطہر قزلباش)

پوچھتا کیا ہے مری ہستی کا مقصد ہم نشیں!
میری فطرت کی بلندی کو تُو پا سکتا نہیں

ظاہری عالم ہی تک تیری نظر محدود ہے
تو سمجھتا ہے مسرت، زیست کا مقصود ہے؟

مادّی اشیاء پہ ہے تیرے تخیّل کی اساس
کس طرح سمجھاؤں تجھ کو او حقیقت ناشناس

سطحِ پرحیوانیت کی مَیں اُتر سکتا نہیں
میں غلامی نفس کی برداشت کر سکتا نہیں

میرا مقصد تو ملائک سے بھی ہے اعلےٰ کہیں
پوچھ لے روزِ ازل سجدہ کیا تھا یا نہیں

میری ہمت لامکاں میں کرتی ہے جولانیاں
ہیں ستارے آسماں کے میری گردِ کارواں

میری منزل۔ منزلِ شمس و قمر سے دُور ہے
آسمانوں سے پرے، حدِ نظر سے دُور ہے

میرے مقصد کی بلندی کا بھلا کیا پُوچھنا
خود مری ہستی ہے موجب دہر کی تخلیق کا

ہوں ازل کے دن سے میں رازِ مشیّت کا امیں
نُورِ عرفاں سے ہے تابندہ مری لوحِ جبیں

جس 'امانت' سے زمین و آسماں کو تھا حذر
وہ امانت بڑھ کے لے لی میں نے اپنے دوش پر

مختصر یہ ہے نہیں تخلیق میں ثانی مرا
جلوہ‌واں ہوں مقصدِ ہستی ہے لافانی مرا

۲۔ مقصدِ حیات

(جناب الطاف مشہدی)

مرے خامہ میں ایسی قوتیں ہوں مضطرب یارب

جو ماؤں کو کریں مجبور یہ آواز دینے پر
مرے نورِ نظر! جامِ شہادت جلد خالی کر
عروسِ نَو کے دِل میں جو کریں یہ آرزو پیدا
مرے شوہر کا خوں کر دے خزاں میں رنگ و بُو پیدا
جو ہمشیرہ کو کر دیں یہ دُعا دینے پر آمادہ
مرا بھائی ہو دل پر برچھیاں لینے پر آمادہ
جوانوں کو کریں مجبور جو میداں میں آنے پر
جگر کی قاش کے خنجر سے باطل کو جھکانے پر
جو ہونٹوں کو اُبھاریں اس طرح تقریر کرنے پر
کہ تُل جائیں جواں عُریاں لبِ شمشیر کرنے پر
جو آنکھوں کو کریں خونیں مناظر کے لئے بیکل
جو چھاتی کو کریں نوکِ سناں کے واسطے پاگل
جو سینے کو عطا کر دیں وطن کی چاہ کی سوزش
جو شاعر کے تخیل میں بھریں اُس آہ کی سوزش
کہ جس سے قصرِ استبداد میں ہلچل سی پڑ جائے
مرے اُجڑے ہوئے ہندوستاں میں پھر بہار آئے

مرے خامہ میں ایسی قوتیں ہوں مضطرب یارب

۳۔ خاتونِ ہند کا مقصدِ حیات

(خواجہ معین الدین عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن)

فخرِ مشرق، نازنینِ ہند، اے جانِ وطن! پیکرِ ناموس و عزت، مظہرِ شانِ وطن

زندگانی تیری عالم کے لئے درسِ حیا ہر عمل تیرا سراپا شرحِ ابوابِ وفا

زینتِ بزمِ فلک ہے انجمِ رخشاں اگر محفلِ مشرق ہے تیرے حسن سے تابندہ تر

مرد پر گلتے ہیں جب تیرِ جفائے آسماں دل کے کاشانے پہ جب گرتی ہیں غم کی بجلیاں

ہاں ستم سہتا ہے جب گردونِ گرداں کے غریب ٹھوکریں کھاتا ہے جب سنگِ حوادث سے غریب

اک ادائے دلکشا سے محو ہو جاتے ہیں غم تیرے باعث سے ہیں گھر رشکِ گلستانِ ارم

شوقِ آرائش تجھے زیبا نہیں اے نازنیں غازۂ رنگِ تکلف تجھ پہ کچھ پھبتا نہیں

عفت و عصمت سے ہے توقیر عالم میں تری پاکبازی سے ہے تو دیوی 'حریمِ قدس' کی

قوم کی کایا پلٹ سکتی ہے تو اک آن میں کاش! پیچھے رہ نہ جاتی علم کے میدان میں

آج وہ اگلی اولوالعزمی تری نایاب ہے پھر زمانہ "چاند بی بی" کے لئے بیتاب ہے

خلق کی خدمت ہمیشہ چاہیئے تیرا شعار گتھیوں کو قوم کی سلجھا کے پھر گیسو سنوار

دیکھ! بھٹکا کر نہ لے جائے ہوائے روزگار

ہاں! سنبھل کر پاؤں رکھ ہے یہ رہِ مشکل گزار

ہمارا وطن

اِس موضوع پر ذیل کی نظموں نے مشاعرہ میں خراجِ تحسین حاصل کیا :-

۱۔ ترانۂ وطن

(حضرتِ ساغر نظامی)

اے وطن ، اے وطن ، اے وطن!

جانِ من ، جانِ من ، جانِ من!

(۱)

ذرّے ذرّے میں محفل سجا دینگے ہم — تیرے دیوار و در جگمگا دینگے ہم

تجھ کو ہستی کا گلشن بنا دینگے ہم — آسمانوں پہ تجھ کو بٹھا دینگے ہم

بن کے دشمن ترا جو اُٹھے گا یہاں

اُس کو تحت الثرےٰ میں گرا دینگے ہم

اور تحت الثرےٰ کو فنا کے سمندر میں غرقاب کر کے بہا دینگے ہم

اے وطن ۔۔۔۔۔ اے وطن!!

سُن لیں یہ اِنس و جان و زمین و زمن

اے وطن ، اے وطن ، اے وطن

جانِ من ، جانِ من ، جانِ من !

(۲)

سونے والوں کو اک دن جگا دینگے ہم — رسم و راہِ غلامی مِٹا دینگے ہم

بربریت کے ٹکڑے اُڑا دینگے ہم — آسمان و زمیں کو ہِلا دینگے ہم

کون کہتا ہے کمزور، بے بل ہے تُو

ہر طرف خوں کے دریا بہا دینگے ہم
جس طرف سے پکارے گا ہندوستاں اُس طرف ہی وفا کی صدا دینگے ہم

اے وطن ـــــــ اے وطن
سر سے باندھے ہوئے ہیں ترنگا کفن
اے وطن ، اے وطن، اے وطن!
جانِ من ، جانِ من ، جانِ من!

(۳)

تیری ہستی ہمالہ کی چوٹی بنی ماہ و خورشید کی اس پہ بندی لگی
روشنی شرق سے غرب تک ہوگئی سجدہ میں جُھک گئی عظمتِ زندگی
عظمتِ زندگی کی قسم ہے ہمیں
تیری عزت پہ سر تک کٹا دینگے ہم
وقت آنے دے اے ماں! ترے نام پر اپنی ہستی و مستی مٹا دینگے ہم

اے وطن ـــــــ اے وطن!
خون سے اپنے بھر دینگے گنگ و جمن
اے وطن ، اے وطن ، اے وطن!
جانِ من ، جانِ من ، جانِ من!

(۴)

مست و خوشبو ہواؤں سے شیتل ہے تُو مادھری ہے امنوہر ہے، کومل ہے تُو
پریم مدرا کی لبریز چھاگل ہے تُو سر پہ عالم کے رحمت کا بادل ہے تُو
آنکھ اُٹھا کے جو دیکھا کسی نے تجھے
چھاؤنی اپنی لاشوں سے چھا دینگے ہم
تیرے پاکیزہ پیکر کو روحوں کی باریک چادر کے نیچے چھپا دینگے ہم

اے وطن ——— اے وطن!
تجھ پہ قرباں زر و مال اور جان و تن
اے وطن ، اے وطن ، اے وطن!
جانِ من ، جانِ من ، جانِ من !

(۵)

تیری ندیاں رسیلی، مدُھر، نغمہ خواں — تیرے پربت تری عظمتوں کے نشاں
تیرے جنگل بھی ہنستے ہوئے گلستاں — تیرے گلشن بھی رشکِ بہارِ جناں
زندہ باد اے غریبوں کے ہندوستاں!
تیرا سکہ دلوں پر بٹھا دینگے ہم
جو بھی پوچھے گا جنت کا ہم سے پتہ راہِ کشمیر اُس کو بتا دینگے ہم

اے وطن ——— اے وطن !
تُو چمن در چمن ہے عدن در عدن
اَے وطن ، اَے وطن، اَے وطن!
جانِ من ، جانِ من ، جانِ من !

(۶)

گلشنِ عیش و آرام و راحت ہے تُو — بے کسی میں کنارِ محبت ہے تُو
بے بسوں اور غلاموں کی دولت ہے تُو — زندگی کے جہنم میں جنت ہے تُو
سینچ کر خونِ دل سے تری کیاریاں
اور بھی تجھکو جنت بنا دیں گے ہم
ہو وُہ گلچیں کہ صیاد، دونوں کے سر تیرے قدموں پہ اِک دن جھکا دینگے ہم

اے وطن ——— اے وطن
ہم ترے پھول ہیں تُو ہمارا چمن

اے وطن ، اے وطن ، اے وطن!

جانِ من ، جانِ من ، جانِ من!

(۷)

جس کا پانی ہے امرت وہ مخزن ہے تُو جس کے دانے ہیں بجلی وہ خرمن ہے تُو

جس کے کنکر ہیں ہیرے وہ معدن ہے تُو جس سے جنّت ہے دُنیا وہ گُلشن ہے تُو

دیویوں، دیوتاؤں کا مسکن ہے تُو

تجھ کو سجدوں سے کعبہ بنا دینگے ہم

تیری اُلفت نہیں سارے سنسار میں تیری عظمت کا ڈنکا بجا دیں گے ہم

اے وطن —— اے وطن

یہ پھبن ، یہ وقار اور یہ بانکپن

اے وطن ، اے وطن ، اے وطن!

جانِ من ، جانِ من ، جانِ من!

(۸)

یہ ستارے، یہ نکھرا ہُوا آسماں آسماں سے ہمالہ کی سرگوشیاں

ہے تری عظمتوں کا اٹل رازداں مستقل، معتبر، محتشم، جاوداں

اس کی چوٹی سے دُنیائے خونخوار کو

پھر پیامِ حیات و وفا دیں گے ہم

پھر محبت کا نغمہ سُنا دینگے ہم پھر زمانے کو جینا سکھا دینگے ہم

اے وطن —— اے وطن

زندگی پھر بھی لے گی ہماری شرن

اے وطن ! اے وطن!!! اے وطن!!!

جانِ من ، جانِ من ، جانِ من !

۲۔ اَے کشورِ ہندوستاں

(حضرت روشؔ صدیقی)

اُونچا رہے تیرا نشاں
اَے کشورِ ہندوستاں

اَے خُلد سے لائی ہوئی رنگیں بہاروں کے وطن
کوثر ہے جن میں موجزن اُن آبشاروں کے وطن
نازاں ہے جن پر ایشیا اُن کوہساروں کے وطن
بےکیف تیرے سامنے افسانۂ باغِ جناں
اَے کشورِ ہندوستاں
اُونچا رہے تیرا نشاں

تھا زندگی کے نُور سے معمُور کاشانہ ترا
اَے شمعِ تہذیبِ کُہن عالم تھا پروانہ ترا
خورشید و انجم کو ابھی ہے یاد افسانہ ترا
وُہ عہدِ زریں آج تک بھُولا نہیں ہے آسماں
اَے کشورِ ہندوستاں
اُونچا رہے تیرا نشاں

پھر شعلہ افشاں نغمے ہیں آتش زن مضراب ہیں
پھر ولولوں کی تیز موجیں عالمِ سیلاب ہیں
پھر نوجوانِ ہند کی ہر سانس میں بیتاب ہیں
بیداریوں کے قافلے آزادیوں کے کارواں
اَے کشورِ ہندوستاں
اُونچا رہے تیرا نشاں

ہے زیبِ دامانِ شفق خونِ شہیدانِ وطن
گہوارۂ خورشید ہے چاکِ گریبانِ وطن
پیغمبرِ صبحِ وطن! ہیں نوجوانانِ وطن

اُفتان و خیزاں بھاگتی جاتی ہیں سب تاریکیاں
اَے کشورِ ہندوستاں
اُونچا رہے تیرا نشاں

ہمدوش شیخ و برہمن اُٹھے ہیں تیری گود سے
پروانۂ شمعِ وطن اُٹھے ہیں تیری گود سے
فخرِ دلیرانِ زمن اُٹھے ہیں تیری گود سے
جن کا غبارِ کارواں ہے آج خضرِ کارواں
اے کشورِ ہندوستاں
اُونچا رہے تیرا نشاں

حبِ وطن کی لہر سے ہے بیگانۂ زنجیر پھر
ملنے لگی ہے ظلم و استبداد کی تعمیر پھر
آزادیوں کے خواب ہیں دامن کشِ تعبیر پھر
پھر انقلابِ دہر نے بدلا ہے اندازِ جہاں
اَے کشورِ ہندوستاں
اُونچا رہے تیرا نشاں

باطل کبھی تنویرِ حق کی تاب لا سکتا نہیں
شمعِ جلالِ حریت کوئی بجھا سکتا نہیں
کوئی بھی اب تجھ کو غلامستاں بنا سکتا نہیں
ہے ذرّے ذرّے کی رگوں میں خونِ آزادی رواں
اَے کشورِ ہندوستاں
اُونچا رہے تیرا نشاں

جنّت کو پھر تیری فضاؤں میں بسایا جائے گا
آزادئ افکار کا مژدہ سُنایا جائے گا
انسانیت کا تجھ کو گہوارہ بنایا جائے گا
وہ دن بہت نزدیک ہے از فضلِ ربِّ دو جہاں
اے کشورِ ہندوستاں
اُونچا رہے تیرا نشاں

۳- ہندوستان کا قومی ترانہ

(جناب خان بہادر چودھری خوشی محمد صاحب ناظر سابق گورنر کشمیر)

(۱)

ہائے میرا جان سے پیارا وطن
ہائے میری آنکھ کا تارا وطن

یہ مرا ہندوستاں جنت نشاں
یہ مرا فردوسِ نظارہ وطن

وہ ہمالے پرجمالِ آفتاب
صبح دم جلووں کا فوّارہ وطن

کوئلوں اور قمریوں کا نغمہ زار
سرو و سنبل کا چمن پیارا وطن

مشرقی تہذیب کا چشم و چراغ
ایشیا کا دِل جگر پارہ وطن

اولیاؤں اور اوتاروں کا گھر
عشق اور عرفاں کا گہوارہ وطن

کیسے کیسے اِس سے اُٹھے شُورہیر
کتنے میداں جیت کر ہارا وطن

اپنوں بیگانوں کا ٹھکرایا ہُوا
پھُوٹ کا اور لُوٹ کا مارا وطن

تنگدستی فاقہ مستی کا شکار
یہ مرا مفلس زمیندارہ وطن

چارہ گر جس کے غلاموں کے غلام
ولئے بیچاروں کا بےچارا وطن

(۲)

مسجد اور مندر میں ہی پیکار کیوں
یہ نزاعِ سبحہ و زنّار کیوں

ہم نوا ہمدم تھے ناقوس و اذاں
اِن میں اب چلنے لگی تلوار کیوں

اِن بُتوں کی بھی خُدائی تھی کبھی
بندگی سے یہ نہیں بیزار کیوں

اب جو کعبہ ہے کبھی بُت خانہ تھا
شیخ جی! عشقِ بتاں سے عار کیوں

اَے گورو کے لال! اے گیسو دراز
ہو یہ برہم گیسوئے خمدار کیوں

تُو بھی دُور اندیش وحدت کیش ہے
تیری مُسلم سے رہے تکرار کیوں

لیڈروں کا ہر طرف طوفان ہے — ابلہوں پر چھا گئے عیّار کیوں
یہ جلوسوں کے جنازے کس لئے — یہ تماشا بر سرِ بازار کیوں
قوم میں اَن بَن کی لعنت تا بکے — ملک پر یہ پھوٹ کی پھٹکار کیوں
کیوں غنی محتاج سے کھچتا رہے — دامنِ گل سے نہ لپٹے خار کیوں

(۳)

اب بُتوں سے لَو لگانا چاہیئے — اُن کی اُلفت آزمانا چاہیئے
عیدِ پنڈت کو منانا چاہیئے — شیخ کو ہولی کھلانا چاہیئے
اور یہ دونوں بگڑ بیٹھیں اگر — اُن کو گنگا میں ڈبانا چاہیئے
جن کی لَو سے بزم میں لگ جائے آگ — ایسی شمعوں کو بجھانا چاہیئے
مُدّتوں مُسلم یہاں مہماں رہا — اب تو اس کو گھر بسانا چاہیئے
گائے تو مالک ہے سب گھر بار کی — اُونٹ کو بھی کچھ ٹھکانا چاہیئے
اب تو بھارت دیس کے زیرِ عَلم — تُرکی و تازی کو آنا چاہیئے
گو بہت ہوں رستوں کے ہیر پھیر — سب کو اِک منزل پہ لانا چاہیئے
خود زباں سے بھی زباں مِل جائیگی — پہلے دِل سے دِل مِلانا چاہیئے
شعلہ زن ہے ہر طرف میشین گن، — اس سے بام و در بچانا چاہیئے
ہیں وطن کے سُورما یہ نوجواں — اُن کو اب میداں میں آنا چاہیئے
گلشنِ اُلفت میں یہ پھُولیں پھلیں — پریم رس اِن کو پلانا چاہیئے
ایک دِن بچھڑے ہوئے مِل جائینگے — قوم بننے کو زمانہ چاہیئے

ہم کو ناظر بزمِ قومی کے لئے
یہ ترا رنگیں ترانہ چاہیئے

۴۔ ہمارا وطن

(پنڈت بالمکند صاحب عرش ملسیانی)

۱۔ پھلوں سے لدے جس کے اشجار ہیں مہکتے ہوئے جس کے گلزار ہیں
نرالی ہے جس کے گلوں کی پھبن
ہمارا وطن ہے ہمارا وطن ــــــ ہمارا وطن سب سے پیارا وطن

۲۔ گلاب اور جوہی کی جس میں بہار سمن ہے جہاں ہر چمن کا سنگار
کھلے ہیں جہاں نرگس و نسترن
ہمارا وطن ہے ہمارا وطن ــــــ ہمارا وطن سب سے پیارا وطن

۳۔ ہے پورب سے پچھم نرالا جہاں ہے اُتر کا دولھا ہمالہ جہاں
کماری جہاں ہے عروس دکن
ہمارا وطن ہے ہمارا وطن ــــــ ہمارا وطن سب سے پیارا وطن

۴۔ کہیں گومتی، بیاس، گوداوری کہیں سندھ اور نربدا، تاپتی
کہیں جس میں بہتے ہیں گنگ جمن
ہمارا وطن ہے ہمارا وطن ــــــ ہمارا وطن سب سے پیارا وطن

۵۔ ہر اک پھل ہر اک پھول ہر رُت جہاں ہواؤں میں جس کی ہے عنبر نہاں
فضائیں ہیں جس کی چمن در چمن
ہمارا وطن ہے ہمارا وطن ــــــ ہمارا وطن سب سے پیارا وطن

۶۔ پپیہا پکارے جہاں پی کہاں عنادل سنائیں ترانے جہاں
ہے آموں پہ کوئل جہاں نغمہ زن
ہمارا وطن ہے ہمارا وطن ــــــ ہمارا وطن سب سے پیارا وطن

۷۔ اناج اور میووں کی کثرت جہاں ہے پانی میں بھی اِک حلاوت جہاں
بناتا ہے جو ہم کو شیریں سخن
ہمارا وطن ہے ہمارا وطن ــــــ ہمارا وطن سب سے پیارا وطن

۸۔ کیا جس کی مٹی نے پیدا ہمیں نہ کیوں فخر سے اُس کا ہم نام لیں
کہیں مِل کے سب شیخ اور برہمن
ہمارا وطن ہے ہمارا وطن ــــــ ہمارا وطن سب سے پیارا وطن۔

۵۔ ہمارا وطن

(محترمہ یمن رُخ بانو بیگم آغا صاحبہ)

اِن آنکھوں کا تارا ہمارا وطن ہے
دل و جاں سے پیارا ہمارا وطن ہے
جہاں کا سہارا ہمارا وطن ہے
ہمارا وطن ہے ہمارا وطن ہے

جو آیا یہیں اُس نے آسن جمایا
جو آیا وطن اِس کو اپنا بنایا
کِسی کو بھی در سے نہ جس نے پھرایا
ہمارا وطن ہے ہمارا وطن ہے

زراعت سے جس کی جہاں پیٹ پالے
تجارت سے ہر ملک دولت کما لے
محبت جہاں رنگ اپنا جما لے
ہمارا وطن ہے ہمارا وطن ہے

یہیں سے اُٹھے لے کے سب اپنا مسلک
کرشن اور گوتم، کبیر اور نانک
سُناتا ہے جو داستاں اُنکی اب تک
ہمارا وطن ہے ہمارا وطن ہے

جو ہر دورِ ماضی کو چمکا چُکا ہے
زمانے کو جو نفع پہنچا چُکا ہے
غُلامی سے جو تنگ آب آچُکا ہے
ہمارا وطن ہے ہمارا وطن ہے

۶- ہمارا وطن

(سید فیضی صاحب جالندھری)

ہر ذرہ ہے زمینِ وطن کا مہِ تمام — ہر ذرہ ہے زمینِ وطن کا فلک مقام
ہر ذرہ اس زمیں کا ہے جنت سے ہم کلام — اللہ رے وطن کی یہ صبح اور وطن کی شام

ہر سانس اس زمیں پہ بقائے دوام ہے
اس کے بہشت ہونے میں کس کو کلام ہے

کشمیر اس زمیں پہ ہے دُنیا میں انتخاب — پنجاب اور دکن کا نہیں دہر میں جواب
بنگال اور اودھ کا ہر اک ذرہ آفتاب — گنگ وجمن میں بہتا ہے شہد اور شیرِ ناب

اس کا ہمالہ میرے لئے رشکِ طُور ہے
ہر سنگ اس کا غیرتِ صد کوہِ نُور ہے

اس سرزمیں نے زورِ تکلم دیا مجھے — اس سرزمیں نے معجزۂ "قُم" دیا مجھے
اس سرزمیں نے سوزِ ترنم دیا مجھے — سینہ میں ولولوں کا تلاطم دیا مجھے

اس خاک نے کیا مجھے عالم میں سرفراز
دامن پہ اس کے کیوں نہ پڑھوں آج میں نماز

گوتم نے جس کی گود میں آ کر جنم لیا — نانک نے جس زمین پہ پیغامِ حق دیا
ایبک نے جس کی خاک پہ جامِ فنا پیا — بابر نے خیلِ فتح کو جس پر رواں کیا

ہر ذرہ جس کا میرے بزرگوں کی جان ہے
وہ سرزمینِ پاک یہ ہندوستان ہے

وابستہ اس کی آب وہوا سے ہے اپنا دم — ہونے نہ دیں گے اب اِسے ہم موردِ الم
ہندو ہو سکھ ہو یا ہو مسلمان مل کے ہم — کھاتے ہیں اَے وطن تری عزت کی اب قسم

اس تیری خاکِ پاک پہ سب خوں بہائینگے
جو مُنہ سے کہہ رہے ہیں تجھے کر دکھائینگے

۷۔ ہمارا وطن

(سید عنایت علی صاحب آغاز)

وہ نظر افروز فطرت آئینہ دار کمال — چشم مہر و ماہ میں وہ پیکر حسن و جمال
حسن رنگا رنگ میں وہ شاہکار ایشیا — تازہ تر تابندہ تر نقش بہار ایشیا
چاندنی راتوں کو شرماتے ہیں جسکے بام و در — جس کے ذرے مسکرائیں انجم شب تاب پر
فرد فرد اپنی جگہ مجموعۂ عہد شباب — حسن کا نادر صحیفہ عشق کی نادر کتاب
خود ہمالہ جس کی عظمت کا علمبردار ہو — کاروان اوج کا جو قافلہ سالار ہو
پہلوؤں میں جس کے کہساروں کی رنگیں وادیاں — وہ حسیں شہروں کا عالم وہ حسیں آبادیاں
سبزہ زاروں کی وہ شام اس پر شفق زاروں کا رنگ — جس کے گلزاروں میں ہے فطرت کے گلزاروں کا رنگ
جس کے بحر و بر پہ مستانہ گھٹا چھائی ہوئی — جس کے دشت و در کی فطرت جوش پر آئی ہوئی
ہر طرف دشت و چمن کی اک نرالی شان تھی — جو بھی رنگینی تھی خود رنگینیوں کی جان تھی
جل رہے تھے محفلوں میں جس کی ویدوں کے چراغ — ہوں اجاگر جن سے بھارت کے سپوتوں کے دماغ
وہ کرشن اور اس کی بنسی کی صدائیں چار سو — گیان کی گیتا کہ ہو ہر آتما کو آرزو
خاکدان ہند سے گوتم اٹھا نانک اٹھا — صاحب عرفاں تھا اک اک فرد اپنے وقت کا
ہند کی اس خاک سے کیا کیا رشی پیدا ہوئے — کیسے کیسے بھیم و ارجن سے جری پیدا ہوئے
کیا کہیں اس عہد زریں کی حقیقت کیا کہیں — دہر میں مانی ہوئی تھی اپنی عظمت کیا کہیں
ہند کی راہوں میں اوروں کے قدم آئے نہ تھے — ہاں ابھی اہل عرب اہل عجم آئے نہ تھے
تک رہی تھیں دور سے اغیار کی نظریں اسے — چاہتے تھے سب یہی تسخیر ہم کر لیں اسے
اک گھٹا وسط ایشیا سے جو اٹھی اور آ گئی — چھا گئی ہر سمت سے اس سرزمیں پر چھا گئی
وہ ہوا بدلی تغیر کارفرما ہو گیا — اور ہی رنگ اس بہشت رنگ و بو کا ہو گیا
کوروؤں سے پانڈوؤں کی جنگ کے وہ سلسلے — خود غرض آپس میں ہی دست و گریباں ہو گئے
بھائی اپنے دوسرے بھائی کا دشمن ہو گیا — باپ کے رستے میں بیٹا خود ہی رہزن ہو گیا

انفرادی صورتیں گھر بار کھو کر رہ گئیں / اجتماعی قوتیں تقسیم ہو کر رہ گئیں

عام خانہ جنگیوں نے حشر برپا کر دیا / ابتریٔ ہند کا ساماں مہیا کر دیا

ہند کے اس روزِ بد کو تک رہی تھی شامِ ہند —— آخر اپنا رنگ لائی قسمتِ ناکامِ ہند

رخ کیا اس کی طرف اک ایک کشورگیر نے / لے لیا نرغہ میں اپنے یک قلم تسخیر نے

رنگ لائے جنگ جو بھی صاحبِ تسخیر بھی / بھیس میں سوداگروں کے آئے ماہی گیر بھی

بڑھ گئیں کچھ اس قدر غیروں کی چیرہ دستیاں / ہو گیا تاراج یہ جنت نشاں ہندوستاں

کام اپنا ایسے عالم میں سیاست کر گئی / روحِ استبداد رگ رگ میں سرایت کر گئی

پہلے قانونی شکنجوں میں کیا بے دست و پا / پھر حکومت کو بہانہ تھا قیامِ امن کا

اس طرح آزادیٔ ہندوستاں رخصت ہوئی —— یوں غلام آزاد ہو کر اور ہی صورت ہوئی

ہند نے پستی سے پھر اپنے لئے ڈھونڈا عروج / عہدِ حق میں آئیں نے پھر اس کو دیا اپنا عروج

آ کے اسلامی سلاطیں نے اسے چمکا دیا / اس کا تعمیری نشاں افلاک تک پہنچا دیا

یادگارِ عہد ہیں ان کے نقوشِ پائدار / ہند کی تاریخ جن سے ہے ابھی تک زرنگار

رفتہ رفتہ عارفانِ حق کے آئے کچھ گروہ / کی ریاضت پر ریاضت درمیانِ دشت و کوہ

دکھ میں جب ہر آتما تسکین کی طالب ہوئی / مادیت پر یہاں روحانیت غالب ہوئی

ہر نظر پر خواجہ و اقطاب کے جوہر کھلے / ہند میں اسلام کی تعلیم کے دفتر کھلے

اللہ اللہ ہند روحانی تصرف کا مقام / تھا جو دار الحرب پہلے اب بنا دار السلام

اس طرح گوتم کی تعلیمات زندہ ہو گئیں / یوں کرشن اور اس کی گیتا کی صدائیں گونج اٹھیں

مل گئی تہذیبِ ہند اسلام کی تہذیب سے / کی ترقی دونوں تہذیبوں نے اس تقریب سے

پھر کئی تہذیبیں آئیں اور اسے پرچا لیا —— اپنے اپنے طور پر ہر ایک نے اپنا لیا

ہندو و مسلم وطن ہے گر غلامی کا شکار / ملک کی ہم دو بڑی قومیں ہیں اس کی ذمہ دار

دونوں قوموں کے لئے یکساں ہے تحریکِ وطن / ہیں دو قالب ایک جاں دونوں ہیں نزدیکِ وطن

جو سوال آزادیٔ کامل کا ہے اس وقت پیش / آؤ ہم تم ہند کی خاطر بنیں اخلاص کیش

ہم مسلمانوں کو بھی سو جاں سے پیارا ہے وطن —— ہند والو ہند صدیوں سے ہمارا ہے وطن

۸۔ وطن

(حضرتِ قدیر لکھنوی)

وہ وقت اب کہاں کہ گُل و سبزہ زار دیکھ
موجِ نسیم و دامنِ ابرِ بہار دیکھ

چشمِ سیہ میں منظرِ کیف و خمار دیکھ
کھو جا کسی کی یاد میں اور انتظار دیکھ

اَے بے نیازِ حُسنِ چمن ہوشیار ہو
مِٹنے کو ہے بہارِ وطن ہوشیار ہو

تیری فضا اُداس، ترا بوستاں اُداس
تیری زمیں اُداس، ترا آسماں اُداس

تیری شفق اُداس، تری کہکشاں اُداس
نغمہ ترا اُداس ہے، تیری فغاں اُداس

حسرت برس رہی ہے وطن کی بہار پر
کیا اوس پڑ گئی چمنِ روزگار پر

گلشن میں تیرے آگ لگی ہے، ہوا کو دیکھ
مُرجھا کے پھُول رہ گئے رنگِ وفا کو دیکھ

رگ رگ سے رُوح کھنچ گئی، زورِ قضا کو دیکھ
بیڑا قریبِ غرق ہے۔ اب نا خدا کو دیکھ

ڈوبی ہوئی ہیں زہر میں گھڑیاں شباب کی
آتی ہے ہر طرف سے صدا انقلاب کی

اے مستِ شوق و سرخوشِ کیفِ شراب چونک
تا چند اب رہے گا یونہی محوِ خواب چونک

بے کیف سا ہے اب ترا عہدِ شباب چونک
گھیرے ہوئے ہے دیکھ تجھے انقلاب چونک

اہلِ وطن کے دیکھ کلیجے فگار ہیں

مدہوش! گل نہیں ترے دامن میں خار ہیں

اِس دَورِ ارتقا میں جگہ تُو نہ پا سکا ‏ اُجڑے ہوئے وطن کا نہ نقشہ بنا سکا

گردش نصیب میں تھی ، نہ مرکز پہ آ سکا ‏ افسوس تُو نہ اپنا تمدن بڑھا سکا

خالی ہُوا دماغ نہ سودائے خام سے

فرقہ پرست دیکھ ہے بدتر غلام سے

صنعت سے تجھ کو کام، نہ حرفت سے واسطہ ‏ حُسنِ سلوک سے نہ محبت سے واسطہ

کچھ مقصدِ حیات، نہ فطرت سے واسطہ ‏ ہے بھی اگر۔ تو شومئ قسمت سے واسطہ

قسمت سے لَو لگائے ہُوئے سو رہا ہے تُو

ہنستی ہے کائنات۔ مگر رو رہا ہے تُو

اپنی نظر میں اپنے وطن کو نہ خار کر ‏ اپنے چمن کی سَیر نہ بیگانہ وار کر

کچھ تو علاجِ دردِ دلِ بے قرار کر ‏ دَورِ خزاں ہے۔ ماتمِ فصلِ بہار کر

وہ ساز و برگِ عیش وہ ساماں نہیں رہا

اب کیا کرے گا چاک۔ گریباں نہیں رہا

آئینہ لے کے دیکھ تو کیا تیرا حال ہے ‏ حالت بیانِ درد ہے صُورت سوال ہے

بربادیوں کا اپنی ۔ تجھے بھی ملال ہے! ‏ کچھ مادرِ وطن کا بھی۔ تجھ کو خیال ہے

کمزوریوں پہ اپنی نہ تیری نظر گئی

کیوں۔ آج تیری غیرتِ قومی کدھر گئی؟

دیہات کا ایک منظر

اس موضوع پر ذیل کی نظمیں قابلِ ذکر ہیں :-   ھمایوں

۱۔ دیہات کا ایک منظر

(حضرتِ وقار انبالوی)

ڈھاک کے پھول، آم کے پھل، چھاؤں ٹھنڈی نیم کی | رشک کھائے بادشاہت جن پہ ہفت اقلیم کی

رُوح کا سامانِ عشرت کیا رسیلے گیت ہیں | گاؤں کی بستی کے باسی ہر کسی کے میت ہیں

نیند سے مخمور دلکش چاندنی راتوں کا رنگ | "پی کہاں" کے سوز سے پُرسوز برساتوں کا رنگ

لے کے چوپایوں کے گلّے خانۂ دہقان سے | پھرتے ہیں چرواہے کس پیغمبرانہ شان سے

کھیت میں خود دار مزدور اور جفا کش محنتی | جن کا مسلک ہے عمل اور جن کا مشرب سادگی

جن کے ویرانوں کی زرخیزی سے دولت شرمسار | جن کے غم خانوں کی خاموشی پہ ہنگامے نثار

پاسدارِ عصمتِ مریم ہیں کنواری لڑکیاں | ناشناسِ رنگِ بیش و کم ہیں کنواری لڑکیاں

ناچتے ہیں گیت جن کے محنتوں کے ساز پر | چکیوں کی منضبط اور دل رُبا آواز پر

اِک طرف ساون میں ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار | اِک طرف اُن کے سُریلے مست گیتوں کی بہار

گرمیوں کی دوپہر میں باہمی دل جوئیاں

سردیوں کی لمبی راتوں میں فسانہ گوئیاں

۲۔ دیہاتی لڑکی

(جناب نذیر احمد صاحب ظفر)

اے نُورِ حسنِ فطرت، اے سادگی کی دیوی
اے پھول کی جوانی اے چاندنی کی دیوی
آباد تجھ سے صحرا
تو شمعِ آرزو ہے ———— تصویرِ رنگ و بُو ہے
ترشی ہوئی ادا ہے فطرت کے بانکپن کی
یا ہے بہارِ خنداں دیہات کے چمن کی

بجلی کا آئینہ ہے تیرا شباب کافر
کلیوں کی نکہتوں سے آباد تیرا پیکر
پُر نور تجھ سے جنگل
تُو جلوۂ حقیقت ———— تُو نغمۂ مسرّت
"دُنیا" تری یقیناً جنّت سے کم نہیں ہے
یہ وہ جگہ ہے جس میں آباد غم نہیں ہے

نغمے ترے نشاط اور تسکین کی نشانی
ہر لَے سے تیری پیدا پیغامِ شادمانی
ذرّے بھی جھومتے ہیں
تُو ہے فدائے نغمہ ———— یا ہے خدائے نغمہ
جس وقت تیری تانیں صحرا میں گونجتی ہیں
فردوس کی ہوائیں مُنہ تیرا چُومتی ہیں

گیتوں میں تیرے پنہاں کھیتوں کی زندگی ہے
آواز تیری گویا فطرت کی بانسری ہے
طائر ہیں تیرے ہمدم
مونس تری چنبیلی ———— ندّی تری سہیلی
صحرا کی وادیاں بھی تجھ سے ہوئی ہیں روشن
ہے تیری ہر ادا سے پیدا بہارِ گلشن

گاگر اُٹھائے جب تو پنگھٹ سے آرہی ہو ہلکے سُروں میں کوئی گانا بھی گا رہی ہو
اُس وقت کوئی دیکھے
تیرا شباب رنگیں —— یا ماہتاب رنگیں
جیسے ابھی چمن میں تازہ کلی کھلی ہے
جیسے ابھی کنول کو دوشیزگی ملی ہے
جب تُو نہا رہی ہو تالاب کے کنارے گیسو کھلے ہوئے ہوں جھڑتے ہوں اُن سے تارے
اُس وقت کا نظارہ
اِک کیفِ سرمدی ہے —— مستی بھی جھومتی ہے
وہ بعدِ غسل تیرا سردی سے کپکپانا
ہمجولیوں کا تیری وہ پھر تجھے ستانا
صحنِ چمن میں جب تُو کچھ پھول چُن رہی ہو رنگین داستانیں کلیوں کی سُن رہی ہو
اور گنگنا رہی ہو
ہے دیدنی نظر —— رنگین و کیف پرور
جیسے بہار تجھ میں تبدیل ہو رہی ہے
رنگین مستیوں میں تجھ کو ڈبو رہی ہے
اے نوبہارِ صحرا اے لالہ زارِ صحرا ہے جنبشِ نظر میں تیری قرارِ صحرا
اے کاش میرے دل کو
تو سرفراز کرتی —— پامالِ ناز کرتی
لاریب تُو ہی تنہا دیہات کی ہے رانی
اے کاش مجھ کو حاصل ہو تیری پاسبانی

طرحی غزلیں

طرحِ اوّل

حالِ دل بھی سُنا کے دیکھ لیا[1]

یہ مصرعِ طرح داغ دہلوی کی مندرجۂ ذیل غزل سے لیا گیا ہے:-

جذبِ دل آزما کے دیکھ لیا — اُس نے کچھ مسکرا کے دیکھ لیا

اُن کے گھر داغ جا کے دیکھ لیا — دل کے کہنے میں آکے دیکھ لیا

لوگ کہتے تھے چُپ لگی ہے تجھے — حالِ دل بھی سُنا کے دیکھ لیا

جاؤ بھی کیا کرو گے مہرووفا — بارہا آزما کے دیکھ لیا

حُسن کمیاب نغمہ ہے نایاب — شہر در شہر جا کے دیکھ لیا

جنسِ دل ہے یہ وہ نہیں سودا — ہر جگہ سے منگا کے دیکھ لیا

وہ اثر جس کو دِل ترستا تھا — آگے آگے دُعا کے دیکھ لیا

اِدھر آئینہ ہے اُدھر دل ہے — جس کو چاہا اُٹھا کے دیکھ لیا

نہ لیا اُس نے خط شرارت سے — نامہ بر کو بُلا کے دیکھ لیا

اب خریدار ہی نہیں کوئی — مول اپنا بڑھا کے دیکھ لیا

قابلِ آشیاں کوئی نہ مِلا — تنکا تنکا اُٹھا کے دیکھ لیا

داغ نے خوب عاشقی کا مزا
جل کے دیکھا جلا کے دیکھ لیا

[1] اس سلسلے میں جناب عرش کی انعامی غزل صفحۂ اوّل میں درج ہو چکی ہے۔ "ہمایوں"

۱۔ غزل

(پروفیسر عبداللطیف صاحب تپشؔ)

قصۂ غم سُنا کے دیکھ لیا
وہ چلے مسکرا کے دیکھ لیا

ایک دھوکا تھا پردۂ غفلت
ہم نے یہ بھی اُٹھا کے دیکھ لیا

ہو گئی زندگی وبال مجھے
تُم کو دِل سے بُھلا کے دیکھ لیا

جو تماشا کبھی نہ دیکھا تھا
اُن سے آنکھیں لڑا کے دیکھ لیا

کچھ نہ تھا جُز فریبِ رنگِ نمود
نقشِ ہستی مٹا کے دیکھ لیا

داغ تھی انتہائے دلسوزی
شمع سے لو لگا کے دیکھ لیا

یہ بھی تو وقت پر نہیں آتی
موت کو بھی بُلا کے دیکھ لیا

حشر بزمِ خیال کا میری
خواب میں تُم نے آ کے دیکھ لیا

جو تماشا تھا طور پر ہم نے
آگ گھر میں لگا کے دیکھ لیا

تلخیٔ غم نہ ایک دن بدلی
بارہا زہر کھا کے دیکھ لیا

نہیں کُھلتا نصیب کا عقدہ
ہاتھ پاؤں ہلا کے دیکھ لیا

اِن حسینوں کا اعتبار تپشؔ
آزما آزما کے دیکھ لیا

۲۔ غزل

(مزاحیہ)

(از حاجی لق لق)

پارٹی میں بُلا کے دیکھ لیا — یار کو آزما کے دیکھ لیا

کوئی سُنتا نہیں فغانِ غریب — ریڈیو پر بھی گا کے دیکھ لیا

ہے نہ فائر پروف جذبۂ عشق — آپ نے دِل جلا کے دیکھ لیا

نہیں ملتا ہمارے دِل کا سُراغ — ایکس رے بھی کرا کے دیکھ لیا

مَوت بھی ہم سے بھاگتی ہے دُور — کار کے نیچے آ کے دیکھ لیا

اُن کا فوٹو ہے زینتِ دیوار — چاہا جب سر اُٹھا کے دیکھ لیا

میرے دل کی لگی نہیں بُجھتی — برف میں دِل لگا کے دیکھ لیا

یہ جراثیمِ عشق مر نہ سکے — ہم نے ٹیکا کرا کے دیکھ لیا

تُجھ سی صُورت نظر نہیں آتی — سینما میں بھی جا کے دیکھ لیا

اِس جہاں میں وفا کہاں لق لق

خوب ٹھونک اور بجا کے دیکھ لیا

طرحِ دوم

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دِل نہ بن جائے

یہ مصرعِ طرح اقبالؔ کی مندرجۂ ذیل غزل سے لیا گیا ہے:۔

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

نہ کر دیں مجھ کو مجبورِ نوا فردوس میں حوریں
مرا سوزِ دروں پھر گرمیِ محفل نہ بن جائے

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو
کھٹک سی ہے جو سینے میں غمِ منزل نہ بن جائے

بنایا عِشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو
یہ میری خود نگہداری مرا ساحل نہ بن جائے

کہیں اُس عالمِ بے رنگ و بُو میں بھی طلب میری
وہی افسانۂ دنبالۂ محمل نہ بن جائے

عرُوجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

۱ - غزل

(جناب پنڈت برجموہن صاحب کیفی صدر انجمن اُردو پنجاب)

فراہم ہو کے خونِ آرزو پھر دِل نہ بن جائے
یہ اُجڑی پُرسکوں بستی بھری محفل نہ بن جائے

وہ جلوہ ہو عیاں دیر و حرم کیا ذرّے ذرّے میں
جو تیری ذات ہی اِک پردۂ حائل نہ بن جائے

جماعت کی مسلّم قابلیّت ہو تو کیونکر ہو
ہر اِک فرد اس کا جب تک جوہرِ قابل نہ بن جائے

وطن کی ساکھ ہو تم نوجوانو! کب یہ ممکن ہے
کہ فخرِ حال و ماضی شانِ مستقبل نہ بن جائے

ہجومِ یاس و ناکامی میں گر ہمت رہے قایم
تو پھر کوشش تمہاری سعیٔ لاحاصل نہ بن جائے

کبھی بحرِ محبت سے نہ بیڑا پار ہو اُس کا
فرازِ موجِ طوفاں ہی جسے ساحل نہ بن جائے

جو از خود رفتہ راہِ عشق میں ہیں ہو نہیں سکتا
کہ منزل اُن کے حق میں دُوریٔ منزل نہ بن جائے

پریشانی سے تنگ آیا ہوں پھر بھی دم بخود ہوں میں
کہ ہم آہنگ سوزِ دل کا سازِ دِل نہ بن جائے

مریضِ غم کے جینے کی دُعا احباب کرتے ہیں
جسے آساں سمجھا ہوں وہی مشکل نہ بن جائے

قیامت ہو نکیرین آ کے حالِ دل اگر پوچھیں
کہیں شہرِ خموشاں ماتمی محفل نہ بن جائے

تمہیں ہو رازدارِ عشق بس اب چُپ رہو کیفی
فسانہ اِک جہاں کا وارداتِ دل نہ بن جائے

۲۔ غزل

(حضرت سراج لکھنوی)

یہ مشکل اور بھی اے ضبطِ غم مشکل نہ بن جائے
سمٹ کر دل کی آہوں کا دھؤاں پھر دل نہ بن جائے

مِلا کر خاک میں چُنتے ہو کیوں اب مُنتشر ذرّے
تمہارا ہاتھ لگنے سے کہیں پھر دل نہ بن جائے

ہمارا اعتبارِ عشق بھی کچھ وزن رکھتا ہے
جسے قاتل کہیں ہم اور وہ قاتل نہ بن جائے

مِرے ذوقِ نظر کا جائزہ لے اپنے کوچے میں
یہاں کا ذرہ ذرہ تو سہی جو دل نہ بن جائے

تصوّر وہم سے بدتر حدیثِ عشق بے معنی
نفس کا سلسلہ جب تک پیامِ دل نہ بن جائے

ابھی ہے خیر مجھ سے چھین لو ذوقِ نظر میرا
یہ حسرت پرورش پا کر کسی قابل نہ بن جائے

جو پیکر میں نہ ہو تبدیل وہ احساسِ غم کیا ہے
تجھے راحت کہاں یہ درد جب تک دل نہ بن جائے

فضاؤں میں یہاں کی زندگانی سی برستی ہے
ترے کُوچے کا ہر ذرہ تڑپ کر دِل نہ بن جائے

جسے تُم کم حقیقت جان کر پامال کرتے ہو
یہی ذرّہ کہیں کروٹ بدل کر دِل نہ بن جائے

سراج اکثر مَیں بڑھ جاتا ہوں آگے پھر پلٹتا ہوں
کوئی ایسا بھی محوِ حسرتِ منزل نہ بن جائے

۳۔ غزل

(مولانا تاجور نجیب آبادی)

جہازِ زندگی کا موت ہی ساحل نہ بن جائے
کہیں یہ پہلی منزل آخری منزل نہ بن جائے

محبّت میں زیاں کاری مُرادِ دل نہ بن جائے
یہ لاحاصل ہی عمرِ عشق کا حاصل نہ بن جائے

مرے دل کی تڑپ پر ہنسنے والے تُو نہیں ڈرتا
ترے پہلو میں یہ فولاد پارہ دل نہ بن جائے

وہ رازِ عشق جس کو میں نے دل سے بھی چھپایا تھا
خدارا اے جنوں افسانۂ محفل نہ بن جائے

مجھی پر پڑ رہی ہے ساری محفل میں نظر اُن کی
یہ دلداری حسابِ دوستاں دردِ دل نہ بن جائے

دلِ ایذا طلب بھی ہو نہ جائے ہمزباں اُن کا
کہیں میری شکایت شکوۂ باطل نہ بن جائے

نہ دیکھو میری مشتِ خاک کو غمگیں نگاہوں سے
کہیں یہ زندہ ہو کر جلوہ زارِ دل نہ بن جائے

کہیں رُسوا نہ ہو یہ شانِ استغنا محبّت کی،
مری حالت تمہارے رحم کے قابل نہ بن جائے

یہ متوالی نظر، یہ بادۂ بے جام، ارے توبہ
کسی پر بے بنی اے ساقیٔ محفل نہ بن جائے

ترے انوار سے ہے نبضِ ہستی میں تڑپ پیدا
کہیں سارا نظامِ کائنات اک دل نہ بن جائے

کروں گا عمر بھر طے راہ بے منزل محبت کی
اگر وہ آستاں اس راہ کی منزل نہ بن جائے

۴۔ غزل

(سردار اُودے سنگھ صاحب شائق)

یہ میری ضبط کوشی سعیٔ لاحاصل نہ بن جائے
نظر اس انجمن میں داستانِ دل نہ بن جائے

نہ ہو انجام بھی آغازِ محرومی کا محرومی
کہیں فریاد ہی فریاد کا حاصل نہ بن جائے

یہ تشکیلِ جنوں تا حدِّ تکمیلِ جنوں پہنچے
کہیں اس راہ میں ہر نقشِ پا منزل نہ بن جائے

ابھی اس سے محبّت میں بہت کچھ کام لینے ہیں
یہ بے تابی کہیں بڑھ کر سکونِ دل نہ بن جائے

مری آنکھوں پہ چھائی ہے ترے جلووں کی تابانی
کہیں میری نظر میرے لئے قاتل نہ بن جائے

نشیمن پھُونک دے لیکن نشیمن پھُونکنے والے
جنوں پختہ نہ ہو جائے، جنوں کامل نہ بن جائے

سُناتے رہتے ہو تُم دوست کو شائق کلام اپنا
مذاقِ دوست اِک دن ہم مذاقِ دل نہ بن جائے

۵۔ غزل

(پرنسپل محمد دین تاثیر)

غمِ عالم سمٹ کر یا الٰہی دل نہ بن جائے
یہ مشکل جو پُرانی ہے نئی مشکل نہ بن جائے

یہ تارے گردِ راہِ کارواں معلوم ہوتے ہیں
یہ منزل تھی مگر اب رہبرِ منزل نہ بن جائے

اُٹھا کر پھینک دیں جانے کہاں طوفان کی لہریں
کہیں گرداب ہی میرے لئے ساحل نہ بن جائے

وہی بیتابیاں اس کی، وہی بیباکیاں اس کی
یہ اب تک جو مرا دل تھا یہ تیرا دل نہ بن جائے

سمجھ جائے اگر تُو بن کہے، میں چُپ رہوں لیکن
مجھے ڈر ہے مری مشکل تری مشکل نہ بن جائے

۶۔ غزل

(پرنسپل رام پرشاد ناشاد)

حجابِ جلوۂ لیلیٰ جنونِ دل نہ بن جائے
نگاہِ شوق یا رب پردۂ محمل نہ بن جائے

نہ وا ہو اے مری چشمِ تمنّا دید کی خاطر
کہیں شوقِ نظارہ سنگِ راہِ دل نہ بن جائے

نہ جل جائے کہیں آہِ تپاں سے خرمنِ ہستی
شرارہ برق کا دُودِ چراغِ دل نہ بن جائے

جو بن مانگے ملے تو پی نہ ہو منتِ کشِ ساقی
یہ تیرا ساغرِ گُل کاسۂ سائل نہ بن جائے

نہالِ غم کو تو اشکوں سے اپنے سینچتا کیوں ہے
یہی کشتِ دلِ ناکام کا حاصل نہ بن جائے

سنبھل کر وادیِ اُلفت میں اے ناشاد تم چلنا
کہیں پہلا قدم ہی آخری منزل نہ بن جائے

۷۔ غزل

(جنابِ جوشؔ ملسیانی)

جفا سہ سہ کے میرا دل تمہارا دل نہ بن جائے
مجھے ڈر ہے یہ مُشکل اِک نئی مُشکل نہ بن جائے

سکونِ یاس میں راحت تو حاصل ہو گئی مجھ کو
مگر ڈر ہے کہ یہ بڑھ کر جمودِ دل نہ بن جائے

وہ آنکھیں بھی تو حاصل کر جو اُس کو دیکھ سکتی ہوں
یہ مشکل سہل ہو کر دُوسری مشکل نہ بن جائے

وہ حسرت کیا جو آنکھوں سے نہ ٹپکے اشک بن بن کر
وہ ارماں کیا جو آخر اضطرابِ دل نہ بن جائے

بہت مُشتاق ہے تو امتحانِ سخت جانی کا
ترے دم پر کہیں اے خنجرِ قاتل نہ بن جائے

ہوائے ترکِ رنگ و بُو میں یہ بھی سوچ اے واعظ
چمن زارِ جہاں اُجڑی ہوئی محفل نہ بن جائے

معاف اے شوقِ دل کب تک کروں یہ برق رفتاری
مجھے ڈر ہے یہ منزل آخری منزل نہ بن جائے

طرحِ سوم

صد شکر کہ پھر زیست کا ساماں نظر آیا

یہ مصرع جوشؔ کی مندرجۂ ذیل غزل سے لیا گیا ہے:۔

صد شکر کہ پھر زیست کا ساماں نظر آیا
پھر در پہ کوئی فتنۂ دوراں نظر آیا

پھر رطلِ گراں مست ہُوا نکہتِ مے سے
پھر ذوقِ طرب سلسلہ جُنباں نظر آیا

پھر کاکلِ ژولیدہ سے جھلکا رُخِ رنگیں
پھر ابر کے سائے میں گلستاں نظر آیا

اشکوں کی جھڑی بند نہ ہوتی تھی کسی طرح
صد شکر ترا گوشۂ داماں نظر آیا

لو کاکلِ شب رنگ کھُلی، کھُل گئیں آنکھیں
اُڑتا ہُوا رنگِ شبِ ہجراں نظر آیا

بشّاش ہو جمعیتِ خاطر کی تمنّا!
لے، سلسلۂ زُلفِ پریشاں نظر آیا

اب تک نہ خبر تھی مجھے اُجڑے ہوئے گھر کی
تُم آئے تو گھر بے سروساماں نظر آیا

انگڑائیاں لیتا کوئی اے جوشؔ دمِ صبح
خورشید سے پھر دست و گریباں نظر آیا

۱۔ غزل

(خان اصغر حسین خاں نظیرؔ)

ظاہر نظر آیا کبھی پنہاں نظر آیا
وہ جلوہ بہرحال درخشاں نظر آیا

رگ رگ میں محبّت کی تپش دوڑ گئی جب
ہر ذرّہ مرے جسم کا تاباں نظر آیا

دریائے محبّت سے مجھے پار اُترنا
مشکل نظر آیا کبھی آساں نظر آیا

اِک شہرِ غم و یاس ہر اِک گام پہ دیکھا
ہر ذرّے کے پہلو میں بیاباں نظر آیا

ہر قطرۂ شبنم تھا چھلکتا ہُوا ساغر
ہر پھول کے دامن میں گلستاں نظر آیا

دل شاد ہُوا پیرِ خرابات سے مِل کر
اِس شہر میں بھی شکر ہے انساں نظر آیا

چاہا تھا کہ دکھلائیے نیرنگِ طبیعت
پر تنگ ہمیں عالمِ امکاں نظر آیا

سَو بار گئے دیکھنے ہم دَیر و حرم کو
کافر کوئی دیکھا نہ مسلماں نظر آیا

اُٹھا کبھی پردہ جو مرے داغِ جگر کا
خورشید چراغِ تہِ داماں نظر آیا

پھر شمعِ سکندر ہے نظیرؔ انجمن آرا
پنجاب میں پھر جلوۂ یوناں نظر آیا

۲۔ غزل

(جناب پنڈت دتستہ پرشاد صاحب فدا)

رونق میں وہ جتنا بھی نمایاں نظر آیا
اتنا ہی جنوں مجھ میں فراواں نظر آیا

دوڑائی نظر دیدۂ عبرت نے جدھر بھی
ہر خندۂ گل خار بداماں نظر آیا

پروانے نے سمجھا تھا جسے نورِ حقیقت
اے وائے وہی موت کا ساماں نظر آیا

زلفوں کے تصوّر میں وہ اُلجھا تو مرا دل
زلفوں کی طرح خود بھی پریشاں نظر آیا

دیکھی جو برہمن نے مرے خواب کی تعبیر
گردش میں اُسے گنبدِ گرداں نظر آیا

بھٹکایا سرابوں نے فدؔا راہِ وفا میں
نزدیک جو آئے تو بیاباں نظر آیا

متفرق نظمیں

یہ وہ منتخب نظمیں ہیں جو طرحی غزلوں اور "موضوعی" نظموں کے علاوہ آل انڈیا مشاعرہ میں پڑھی گئیں۔ "ہمایوں"

خرابات

(حضرتِ جوش ملیح آبادی)

یہ خرابات ہے، تقوے کا نہیں نام یہاں
عینِ طاعت ہے تماشائے لبِ بام یہاں

رقص کرتی ہے زمیں، رات کی رنگینی میں
وجد کرتا ہے فلک، صبح کے ہنگام یہاں

میکدے میں نہ ہو اے شیخِ حرم نکتہ فروش
کہ ازل سے نہیں گنجائشِ اوہام یہاں

اثرِ تربیتِ پیرِ مغاں کے قرباں
خارج از بحث ہے اندیشۂ آلام یہاں

شکرِ باری کہ علی الرغم فقیہ خود بیں
حکمِ ایزد ہے کہ گردش میں رہے جام یہاں

میکدے کا ہے مشیت کے اشاروں پہ مدار
جام در دست ہیں خود شرع کے احکام یہاں

طوطیٔ قدس ہے اک رشتہ بپا صیدِ زبوں
طائرِ سدرہ ہے اک مرغِ تہِ دام یہاں

سایۂ زلف سے ہے زینتِ دوشِ رنداں
ظلمتِ کفر سے ہے رونقِ اسلام یہاں

اثرِ بے بصری ہے، طلبِ جاہ و نمود ہدفِ مسخرگی ہے ہوسِ نام یہاں

گوشِ رندانِ قدح خوار ہے اور لعلِ نگار لبِ جبریل نہیں درخورِ پیغام یہاں

کسی سورت میں بھی باقی نہیں جائے تاویل کسی آیت میں بھی ممکن نہیں ابہام یہاں

شعلۂ عشق ہے اس راہ میں چڑھتی ہوئی دھوپ مشعلِ عقل ہے خورشیدِ لبِ بام یہاں

منزلیں، راہ میں تبدیل ہوا کرتی ہیں رُو بہ آغاز ہی رہتا ہے ہر انجام یہاں

قیمتِ بادہ میں جو خرقہ کہ ہوتا ہے گرو اُس پہ قربان ہیں سو جامۂ احرام یہاں

خوفِ عقبیٰ کی اُداسی کے عوض، چہروں پر کھیلتا ہے اثرِ بادۂ گلفام یہاں

اک توہم ہے، رہ و رسمِ شمارِ مہ و سال اک تمسخر ہے، نظامِ سحر و شام یہاں

ذرّے ذرّے پہ ہے اتنا ابدیت کا جلال وقت رہتا ہے سدا لرزہ بر اندام یہاں

گردِ رندانِ سیہ مست، بصد عشوہ و ناز حلقہ باندھے ہوئے رہتے ہیں گل اندام یہاں

خوابِ صد سالہ کے مانند ہے اے محرمِ راز وقفۂ یک نفس و لغزشِ یک گام یہاں

لب ہلاتے ہی جو دُنیا کو ہلا دیتے ہیں چند ایسے بھی نکل آئیں گے خدام یہاں

شُکر ہے جوشؔ کے اوراد و وظائف کے عوض

لب پہ ہے زمزمۂ حافظ و خیّام یہاں

جہانِ آزاد

(حضرت ساغر نظامی)

مرے خیال میں ہے وہ دیارِ آزادی | ہے ذرّہ ذرّہ جہاں اِک نگارِ آزادی
چمن جہاں کے نویدِ بہارِ آزادی | قفس جہاں کے ہیں سرمایہ دارِ آزادی
نہ پردہ ہے نہ کہیں پردہ دارِ آزادی | حقیقتیں ہیں جہاں جلوہ بارِ آزادی
وہ شہرِ انس و وفا، وہ دیارِ آزادی | جہاں فقیر بھی ہے شہریارِ آزادی
جہاں کا بندۂ ادنیٰ ہے رشکِ صد معبود | جہاں غلام ہیں پروردگارِ آزادی
نفس نفس ہے جہاں موجِ لالہ و نسریں | روش روش ہے جہاں لالہ زارِ آزادی
جہاں ہے موجۂ خونِ شہید کوثرِ شوق، | ہے موج موج جہاں آبشارِ آزادی
نگاہِ مستیٔ دہقاں میں ڈھل کے گرتی ہے | وہ برق، نام ہے جس کا شرارِ آزادی
دلِ غریب میں کھنچتی ہے، کھنچ کے ڈھلتی ہے | وہ مے سرور ہے جس کا بہارِ آزادی

جہاں مقدرِ مزدور ہے تبسّمِ گُل — جہاں ہے قسمتِ دہقاں بہارِ آزادی
شعاعِ ماہ کی زنجیر ٹوٹتی ہے جہاں — جہاں کی خاک ہے آئینہ دارِ آزادی
جہاں ہے بازیٔ طفلاں جہاد کا جذبہ — جہاں ہے کھیل تمنّائے کارِ آزادی
جہاں کے طوق و سلاسل ہیں رشکِ زیورِ گُل — جہاں کی قید ہے حُسنِ بہارِ آزادی
لہو ہے مانی و بہزاد جس کے آدم کا — شہید جس کے ہیں نقش و نگارِ آزادی
ہمالہ جس کی بلندی کی اوّلیں چوٹی — نشیب جس کا سرِ کوہسارِ آزادی
جہاں کی ریت ہے طوفاں سراب ہے سیلاب — جہاں کی خاک ہے برق و شرارِ آزادی
جہاں نگاہ ہے شاہیں، جہاں خیال عقاب — جہاں ہے طائرِ فطرت شکارِ آزادی
جہاں خیال ہے آزاد، فکر بے پروا — جہاں ہے دینِ مروّج شعارِ آزادی
جہاں ہیں کفر پہ پابند اور نہ ایماں پر — وہ کارگاہِ وفا، وُہ دیارِ آزادی

تخیّلات حقیقت خطاب ہو جائیں
الٰہی ذرّے مرے آفتاب ہو جائیں

دوہے

(جناب خواجہ دل محمد صاحب)

۱۔ آنکھیں موند جہان سے پی سے پریم لگا
رات ہے کھڑکی بند کر گھر میں دِیا جلا

۲۔ اب کی اب کے ساتھ ہے جب کی جب کے ساتھ
جس کی رب کے ساتھ ہے اُس کی سب کے ساتھ

۳۔ میرا میرا سب کہیں تیرا کہے نہ کوئے
میرا سب کچھ ہو گیا تُو گر میرا ہوئے

۴۔ اٹا پڑا ہے راستہ گرے پات اور پھُول
جھلکے تارا دُور سے۔ راہ نہ جاؤں بھُول

۵۔ تنکا سا اِک نہر پر لہر بہاتی جائے
تَن کا دھوکا ہو مجھے من سے نکلے ہائے

۶۔ جھلمل جھلمل کر رہے تارے سجی برات
کِس دُولھا کے منتظر بیٹھے ساری رات

۷۔ بچہ دیکھے عکس کو کھیلے اس کے ساتھ
پیار کرے جُھنجھلائے بھی آئے نہ لیکن ہاتھ

۸۔ اُٹھ اُٹھ پلکیں دیکھتیں نینوں سیج بچھا
جلوے تیرے آ گئے آپ بھی پیتم آ

۹۔ پنڈت پتری کھول کر بین میکھ مت دیکھ
جو پیتم کے ہاتھ نے لکھے وہی شبھ لیکھ

پردہ

(حضرت احسانِ دانش)

یاد ہے دہلی کی وہ اک غم فشاں ضوریز شام — نور و ظلمت کر رہے تھے مِل کے شب کا اہتمام
تیرگی کے روبرو تنویر تھی محوِ نیاز — راستوں میں تار کے کھمبوں کے سائے تھے دراز
تھا فضاؤں میں معلّق کارخانوں کا دھؤاں — جا رہے تھے گھر کو مزدوروں کے دھندلے کارواں
ہو چکا تھا سُرخ رومغرب، شفق تھی لالہ کار — چل رہی تھی نرم قدموں سے ہوائے برفبار
رہرووں کے غُل سے تھا قلبِ فضا زیر و زبر — لاریوں سے خم ہوئی جاتی تھی سڑکوں کی کمر

———

سیر کرنے کے لئے میں اور مجید[1] الدین خاں — شہر کی جانب سے سوئے رائے سینا تھے رواں
بحث تھی آپس میں لیکن قلب تھے دونوں کے صاف — وہ تو تھے پردے کے حامی میں تھا پردے کے خلاف
کہہ رہا تھا میں "تغیّر" ہے فروغِ کائنات — اس کی ہر کروٹ سے پاتا ہے نمو رنگِ حیات
بحر و بر میں جنبشِ نبضِ ہوا سے انقلاب — صحنِ گلشن میں عنادل کی نوا سے انقلاب
راہبر بدلے نظامِ کارواں بدلا کئے — آئے دن رنگِ زمین و آسماں بدلا کئے

———

لیکن اب تک ہے مسلمانوں میں پردے کا رواج — اِن کے فرسودہ تمدّن کا نہیں بدلا مزاج

---

[1] نواب مجید الدین خاں صاحب میرے مخلص اور بے تکلف دوست ہیں۔ میں دہلی کے سفر میں آپ ہی کے پاس مقیم تھا۔ اور یہ نظم انہیں کے ایک فقرے کی رہینِ منت ہے۔ احسانِ دانش

یہ پُرانی رسمِ روپوشی نہیں بدلی گئی
بیخودوں سے خود فراموشی نہیں بدلی گئی

ہموطن اقوام کی جو عورتیں ہیں بے نقاب
کیا گہن میں آگیا عظمت کا ان کی آفتاب
ان کا کیا ایماں نہیں عزت نہیں عصمت نہیں؟
شرم آنکھوں میں نہیں یا قلب میں غیرت نہیں؟
کیا اُنہیں اللہ نے بخشا نہیں رنگ و جمال؟
کیا اثر رکھتا نہیں ان کا فسونِ خدّ و خال؟
کیا کوئی فطرت میں ان کی دل نشیں پہلو نہیں؟
لوحِ اعضا میں نہیں، گفتار میں جادو نہیں؟
کیا نہیں اُن کے دلوں میں عظمتِ اُلفت کے راز؟
کیا نہیں ان کے تنفس میں شمیمِ دلنواز؟

فرق کچھ اس کے سوا ان میں نہیں ہے زینہار
ہم تمدن کے پیادے، وہ تمدن کے سوار

پیچھے پیچھے ایک عورت مضمحل رفتار سے
آ رہی تھی غالباً سودا لئے بازار سے
وہ عفیفہ سُن کے میری گفتگو گویا ہوئی
بے حمیت! تیری مردانہ حمیت کیا ہوئی؟
آہ شاید اے حریمِ راز سے نا آشنا
تو ہے آوازِ شکستِ ساز سے نا آشنا

شان و شوکت کو بڑھانے کے لئے پردہ نہیں
رنگ و روغن کو چھپانے کے لئے پردہ نہیں

اس کا پردہ ہے کہ ہم گردابِ ناداری میں ہیں — زندگی سے تنگ ہیں، مٹنے کی تیاری میں ہیں
اس کا پردہ ہے کہ چہرے ہیں الم کے اشتہار — رُوح پُر اندوہ، دل بریاں، کلیجے داغدار
اس کا پردہ ہے کہ جینا موت سے دشوار ہے — سانس کا ڈورا نہیں چلتی ہوئی تلوار ہے
اس کا پردہ ہے کہ سینے درد سے معمور ہیں — اشکبار آنکھیں ہماری قلب کے ناسور ہیں
اس کا پردہ ہے کہ ہم اپنی نظر پر بار ہیں — پپڑیاں ہونٹوں پہ مرجھائے ہوئے رُخسار ہیں
اس کا پردہ ہے کہ دل کا حال پریشانی پہ ہے — نکتہ چیں غیرت ہماری خستہ سامانی پہ ہے
اس کا پردہ ہے کہ سر پر چادریں ہیں تار تار — پیرہن میں جا بجا پیوند ہیں اور بے شمار
اس کا پردہ ہے سراسر غم کی تصویریں ہیں ہم — ہند کے خوابِ چمن بندی کی تعبیریں ہیں ہم
گفتگو سے پیشتر کچھ غور ہونا چاہئے — ہم پہ جو ہنستے ہیں پہلے اُن کو رونا چاہئے
بے نقابی میں اُٹھ نہیں سکتیں زمانے کے لئے — دلِ معیّن ہے خدا کو مُنہ دکھانے کے لئے
تیری کج بحثی ہماری بے بسی پر چوٹ ہے — آہ یہ پردہ نہیں ہے مفلسی کی اوٹ ہے

سُن کے اُس کی گفتگو احسان میں تھرّا گیا — آنکھ بھر آئی ندامت سے پسینہ آگیا
ملتِ مُسلم کی بدحالی کا قائل ہوگیا — دِل کے پردے جل اُٹھے راز آشنا دل ہوگیا

رسمِ پردہ مسلمہ کی بے بسی کا ہے حجاب
پردہ داری ہے یہ ناداری کے چہرے پر نقاب

زبورِ حریت

(جناب روش صدیقی)

ظلم و بیداد کی بنیاد کو ڈھانے کے لئے!
ایک ذرہ بھی نہیں مہرِ درخشاں کا غلام!

بجلیاں قصرِ غلامی پہ گرانے کے لئے!
ایک تنکا بھی نہیں رنگِ گلستاں کا غلام!

نقشِ تزویرِ تمدن کو مٹانے کے لئے!
ایک لمحہ بھی نہیں گردشِ دوراں کا غلام!

کشورِ ہند کو آزاد بنانے کے لئے!
کوئی انسان ہو پھر کیوں کسی انساں کا غلام!

شمعِ بیداریٔ مشرق کو فروزاں کر دیں
دہر کو جنتِ آزادیٔ انساں کر دیں

خاک خود بیں ہو تو ہو جوہرِ قابل پیدا
جس غلامی کو رہا خنجر و پیکاں پہ غرور،

دل ہو آزاد، تو ہو مرگِ سلاسل پیدا
جس غلامی کو رہا ہیبتِ سلطاں پہ غرور،

صف شکن چاہیے جہاں ہو وہیں منزل پیدا
جس غلامی کو رہا حیلۂ شیطاں پہ غرور،

جوشِ طوفاں ہی سے ہو جاتے ہیں ساحل پیدا
جس غلامی کو رہا دودِ نخِ زنداں پہ غرور،

دلِ ہر قطرہ کو آمادۂ طوفاں کر دیں
اُس غلامی ہی کو اب داخلِ زنداں کر دیں

جس تمدّن میں مساوات کے انوار نہیں
جس تمدن میں کہیں جلوۂ ایثار نہیں
جس تمدن کا نگہباں دلِ بیدار نہیں
جس تمدّن میں غریبوں کے لئے پیار نہیں
اُس تمدن کے ہر ایوان کو ویراں کر دیں

عزمِ بیباک ہے جس کا، وہی فرزانہ ہے!
جو ہے ذی ہوش، وہی مرشدِ میخانہ ہے!
جس کے دل میں ہے حرارت، وہی پروانہ ہے!
امتیازِ شہ و مزدور، اک افسانہ ہے!
اس فسانے کو بھی اب خوابِ پریشاں کر دیں

شکمِ آسودہ ہوں غارت گر و رہزن، افسوس!
رہیں محروم مگر صاحبِ خرمن، افسوس!
اہلِ گلشن تو ہوں دُور از درِ گلشن، افسوس!
اور گلچیں ہو سزاوارِ نشیمن، افسوس!
آؤ! گلچیں ہی کو بیرونِ گلستاں کر دیں

عِلم، جز عالمِ احساسِ وفا کچھ بھی نہیں،
عشق، جز خدمتِ مخلوقِ خدا کچھ بھی نہیں،
جز اخوت، کسی ملت کی بنا، کچھ بھی نہیں،
حریت، اُلفتِ یزداں کے سوا، کچھ بھی نہیں،
دہر کو نازکشِ اُلفتِ یزداں کر دیں

صبحِ بہار

(جناب پروفیسر عابد علی صاحب)

صد شکر کہ پیدا ہؤا دامانِ اُفق سے
مشرق کی طرف صبح کا ہنستا ہؤا تارا

فطرت نے لیا ہاتھ میں انوار کا نیزہ
اہر یمنِ ظلمات کے سینے میں اُتارا

افلاک کے ہودج سے عروسِ قمر اُتری
خورشیدِ جہاں تاب ہؤا انجمن آرا

وہ رنگِ تماشا کہ تماشا متحیر
وہ روح تجلی کہ دلِ برق دوپارا

ہر سمت در و بام سے چھٹتے ہوئے بادل
ہر سمت در و بام پر چڑھتا ہؤا پارا

اے مطرب خوش لہجہ یہی راگ یہی لے
اس وقت نہ بربط سے اُٹھا ہاتھ خدارا

اے ساقیِ نوخیز یہی جام یہی مے
اس وقت نہیں اور کوئی بات گوارا

سرمایہ دار

(حضرت حفیظ ہوشیار پوری)

بادۂ گلرنگ سے لبریز ہیں جن کے سبُو
جن کے پیمانوں میں رقصاں ہے غریبوں کا لہُو
جن کے فانوسوں میں ہیں مزدُور کے سینے کے داغ
آندھیوں میں جل رہے ہیں جن کی نخوت کے چراغ
جن کے باعث مفلسوں پر عرصۂ ہستی ہے تنگ
جن کے چہروں پہ ہے مظلوموں کے خُوں سے آب ورنگ
مُدعائے زندگی جن کا ہے سودائے نمود
بے نواؤں کو پیامِ مرگ ہے جن کا وجُود
جو ہر اِک مفلس سے ملتے ہیں بصد کبر وغرور
نشۂ دولت سے ہے جن کے دماغوں میں فتوُر
جن کی رگ رگ زر کی زنجیروں میں ہے جکڑی ہوئی
زعمِ باطل سے ہیں جن کی گردنیں اکڑی ہوئی
تیرہ ہے جن کے گناہوں سے ضمیرِ کائنات
ڈھونڈتے ہیں ظُلمتِ عصیاں میں جو آبِ حیات
جن کی توندیں ہیں محبت اور شرافت کے مزار
جن کو پیدا کر کے شرمندہ ہے خود پروردگار
تجھ کو اور مرعُوب کردے اِن درندوں کا شکوہ؛
اُٹھ بغاوت کے لئے اے فاقہ مستوں کے گروہ!

پیمانِ وفا

(ایک شوہر کے نام جو سفر پر جا رہا ہے)

(ترجمہ از صوفی غلام مصطفٰے صاحب تبسم)

کیا فقط اِک بوسۂ لب ہی وفا کا نام ہے
کیا ہمارے عہدِ اُلفت کا یہی انجام ہے

یاد کر اپنے دلِ مضطر کے پیمانِ وفا
مَیں تجھے جانے نہ دُوں گی اَے مری جانِ وفا

دیکھ ہے چاروں طرف کالی گھٹا چھائی ہوئی
ہے زمیں کے ذرّے ذرّے پر بہار آئی ہوئی

اور فضاؤں میں اُمنڈ آیا ہے طُوفانِ سرُور
مَیں تجھے جانے نہ دُوں گی اے مری جانِ سرُور!

ماہِ عالمتاب نے مدہوش دیکھا ہے ہمیں
چاندنی راتوں نے ہم آغوش دیکھا ہے ہمیں

چشمِ انجم میں ابھی رقصاں ہیں وہ سامانِ عیش
مَیں تجھے جانے نہ دوں گی اَے مرے بُستانِ عیش

باغ میں ہوگا ہمارا صحنِ بُستاں مُنتظر
طائرانِ خوشنوا، گُلہائے خنداں مُنتظر

رہ ہماری دیکھتے ہوں گے جوانانِ بہار
مَیں تجھے جانے نہ دُوں گی اَے مری جانِ بہار!

موسمِ گُل ہے، ہوا ہوتی ہے گلریزِ طرب
محفلیں ہوں گی جہاں والوں کی لبریزِ طرب

راگ سے معمُور ہو جائے گا ہر سازِ حیات
مَیں تجھے جانے نہ دُوں گی اے مرے رازِ حیات!

عزمِ رخصت سے ترے بیتاب ہو جاتی ہوں مَیں
شعلہ بن جاتی ہوں میں، سیماب ہو جاتی ہوں مَیں

دیکھ پہلُو میں اُچھلتا ہے دلِ مُضطر مرا
میں تجھے جانے نہ دُوں گی، اے مرے صبر آزما!

دیکھ خلوت کو اور ان عشرت کے سامانوں کو دیکھ
میری آنکھوں میں مرے افسردہ ارمانوں کو دیکھ

رحم کر اپنی مجسّم حسرتِ ناکام پر
مَیں تجھے جانے نہ دُوں گی اَے مرے ذوقِ نظر!

جا رہا ہے تُو چھُڑا کر ہاتھ، آنکھیں پھیر کر
ڈالتا جا اِس دلِ بیتاب پر بھی اِک نظر

جس کی خلوت سے نکل سکتا نہیں تُو زینہار
مَیں تجھے جانے نہ دُوں گی اَے مرے صبر و قرار

(رابرٹ برجز)

ہمہ گیریٔ عشق

(حامد علی خاں)

تم مجھ سے کہاں بھاگ کے جاؤ گے بتاؤ
چھایا ہوں میں ہر سمت جدھر آنکھ اُٹھاؤ

میں چشمِ ازل، چشمِ ابد، چشمِ بقا ہوں
بوجِ نگہ کاہکشاں بن کے اُٹھا ہوں

ہے بوسۂ مہتاب سے تاباں رُخِ ہستی
آفاق کے چہرے پہ ہے چھائی ہوئی مستی

میں دیدۂ انجم سے تمہیں جھانک رہا ہوں
وہ نور کا طوفاں ہوں جدھر جاؤ بپا ہوں

نکہت ہے مرے سانس کی ہر موجِ صبا میں
اک کیف سا پیدا ہے دلِ ارض و سما میں

میں تابِ رخِ حسن ہوں میں روحِ وفا ہوں
میں عارضِ گُل نغمۂ بلبل میں بسا ہوں

ہے برق مرے خندۂ وحشی کی نشانی
ہے رعد مرے نالۂ غمگیں کی کہانی

میں سازِ فلک سازِ زمیں سازِ زماں ہوں
میں محرمِ جاں پردہ درِ رازِ جہاں ہوں

ہر ذرہ مری آنکھ ہے کیا مجھ سے چھپو گے
چھپتے ہو عبث مجھ سے کہاں چھپ کے رہو گے

میں ربطِ عناصر ہوں میں شیرازۂ جاں ہوں
میں عشق ہوں میں خونِ رگِ کون و مکاں ہوں

رقیب سے

(پروفیسر فیض احمد صاحب)

آکہ وابستہ ہیں اُس حسن کی یادیں تجھ سے — جس نے اِس دل کو پری خانہ بنا رکھا تھا
جس کی اُلفت میں بھُلا رکھی تھی دُنیا ہم نے — دہر کو دہر کا افسانہ بنا رکھا تھا

آشنا ہیں ترے قدموں سے وہ راہیں جن پر — اُس کی مدہوش جوانی نے عنایت کی ہے
کارواں گزرے ہیں جن سے اُسی رعنائی کے — جس کی ان آنکھوں نے بے سُود عبادت کی ہے

تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبوب ہوائیں، جن میں — اُس کے ملبُوس کی افسُردہ مہک باقی ہے
تجھ پہ بھی برسا ہے اُس بام سے مہتاب کا نُور — جس میں بیتی ہوئی راتوں کی کسک باقی ہے

تُو نے دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رُخسار، وہ ہونٹ — زندگی جن کے تصوّر میں لُٹا دی ہم نے
تجھ پہ اُٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں — تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے

مشترک ہم پہ ہیں احسان غمِ اُلفت کے — اتنے اِحسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں
ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا پایا ہے — جُز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی — حسرت و یاس کے دُکھ درد کے معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا — سرد آہوں کے رُخِ زرد کے معنی سیکھے

جب کہیں بیٹھ کے روتے ہیں وہ بیکس جن کے — اشک آنکھوں میں بلکتے ہوئے سو جاتے ہیں
ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب — بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں

جب کبھی بِکتا ہے بازار میں مزدُور کا گوشت — شاہراہوں پہ غریبوں کا لہُو بہتا ہے
یا کوئی توند کا بڑھتا ہُوا سیلاب لئے — فاقہ مستوں کو ڈبونے کے لئے کہتا ہے

آگ سی سینے میں رہ رہ کے اُبلتی ہے نہ پُوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

رُباعیات

(بشیر احمد)

تو اِک حرفِ خزانہ ہے زبانوں کے لئے
تو اِک سانحہ کافی ہے فسانوں کے لئے
تری بات سے پیدا ہیں ہزاروں باتیں
بس ہے اِک تیرا لاکھ زمانوں کے لئے

ہم اُس کے ہیں تیشہ میں ہمارا ہے ہنر
فن یہ ہے ہمیں جان سے پیارا ہے ہنر
چھائی ہیں بلا کی ظلمتیں گو اس پہ
اس پہ بھی ہمیں آنکھ کا تارا ہے ہنر

کچھ کام ہیں ایسے کہ پشیماں ہوں میں
کچھ کام ہیں ایسے بھی کہ نازاں ہوں میں
اب ناز کروں اپنی پشیمانی پر
یا ناز پہ پھر اپنے پشیماں ہوں میں

ساز اپنا جو یوں بجا رہے ہیں تارے
لے حق کی کوئی سنا رہے ہیں تارے
کچھ آ تو رہے سارے گا ما پا دھا نی سے
کیا راگ ہے یہ جو گا رہے ہیں تارے

متفرق غیر طرحی غزلیں

جو آل انڈیا مشاعرے میں پڑھی گئیں

غزل

(بیادگار آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین مرحوم)

از خان بہادر چودھری خوشی محمد صاحب ناظر سابق گورنر کشمیر

جو ہمنوا مرے ہم داستاں رہے۔ نہ رہے
حدیثِ عشق کے جو قصہ خواں رہے۔ نہ رہے

وہ عہدِ گل کے جو مرغانِ نغمہ خواں نہ رہے
اب اس چمن میں مرا آشیاں رہے۔ نہ رہے

کبھی یہ کہتے تھے ہم بھی کہ ساقیا مے لا!
یہ بزمِ یار۔ یہ دل۔ یہ سماں رہے۔ نہ رہے

نہ جان کا ہے بھروسا نہ اعتبارِ جہاں
یہ جاں رہے نہ رہے۔ یہ جہاں رہے۔ نہ رہے

جہاں سے رُوحِ ہمایوں جو کر گئی پرواز
ہما کی دہر میں اب داستاں رہے۔ نہ رہے

قیامِ عیش کا ناظر کچھ اعتبار نہیں
سرائے میں کوئی دن میہماں رہے۔ نہ رہے

غزل

(خان بہادر نواب احمد یار خاں دولتانہ)

عقل اسے نہ پا سکی منزلِ مہر و ماہ میں
عشق نے جا کے رکھ دیا آئینہ جلوہ گاہ میں

روئے شہود سے ذرا پردۂ غیب دے اُٹھا
روزِ ازل سے آج تک خلق ہے اشتباہ میں

طائرِ سدرہ آشیاں قیدِ قفس سے کیا بچے
انجمِ چرخ دانہ ہوں جب مری دام گاہ میں

کس کو مرا پتہ چلے گر خطِ کہکشاں نہ ہو
راہ نمائے کارواں گرد و غبارِ راہ میں

مجھ سے نہاں ہو کچھ تو میں اس کی تلاش بھی کروں
یہ بھی جہاں نگاہ میں وہ بھی جہاں نگاہ میں

تیرے لحاظ سے نہیں چارۂ درد ناگوار
ورنہ یہ حوصلہ کہاں اس دلِ درد خواہ میں

فرقِ بلند و پست سے چشم کو آشنا نہ کر
تا نہ پڑے خلل ترے زاویۂ نگاہ میں

بحر میں قطرہ جس طرح بے خبرِ مآل ہو
مَیں ہوں اسی طرح ترے جلوۂ بے پناہ میں

گر تجھے اشتیاق ہے اپنے سوادِ دل میں دیکھ
شمعِ ازل کی روشنی مہر میں ہے نہ ماہ میں

رحمتِ حق کا مستحق ہے وہی سادہ دل جسے
پُرسشِ روزِ حشر کا خوف نہ ہو گناہ میں

سنگِ درِ حرم بنے احمدِ تیز گام کیوں
کعبہ بھی اک مقام ہے "بیتِ صنم" کی راہ میں

غزل

(جنابِ دینا ناتھ صاحب مستؔ کاشمیری صدر بزمِ اُردو جموں و کشمیر)

مجھ کو کریگی اُن سے کیا گردشِ آسماں الگ
دُور نظر سے ہوں تو ہوں دل سے ہیں وہ کہاں الگ

حُسن کا ہے بیاں الگ عشق کا ہے بیاں الگ
جور کی داستاں الگ درد کی داستاں الگ

کتنی جنونِ عشق میں کی ہیں قبول ذِلتیں
منّتِ پاسباں الگ سجدۂ آستاں الگ

گرد و غبارِ راہ بھی دُودِ فغاں میں کھو گیا
دیکھ کے میرا کارواں ہو گیا کارواں الگ

حُسن کا رازِ عشق ہے عشق کا راز حُسن ہے
پھر بھی ہے رازداں سہی کیوں ہائے وہ رازداں الگ

محشرِ جوشِ عشق میں بات نہ دل کی کہہ سکا
مَیں رہا گُم سکوت میں وُہ رہے بدگماں الگ

آہ میں اُن کا نقش ہے اشک میں اُن کا عکس ہے
اُن کے سوا بھی ہے بندھا حُسن کا اِک سماں الگ

تُجھ کو سمجھ سمجھ کے بھی کچھ نہ سمجھ سکا کوئی
دونوں جہاں میں تُو عیاں پھر بھی ترا جہاں الگ

دہر کا رنگ دیکھ کر دہر سے دِل اُداس ہے
کیجیے اِس جہاں کو کیا ڈھونڈیئے اِک جہاں الگ

کوئی سما سکے گا کیا دیر و حرم کی قید میں
ٹھہرے جو لامکاں کوئی کس لیے ہو مکاں الگ

مستؔ جُھکائے سر کو کیا دَیر و حرم کے سامنے
بندۂ لامکاں ہے وُہ رکھتا ہے آستاں الگ

غزل

(جناب جلال الدین صاحب اکبر)

خاموش ہیں لب اور آنکھوں سے آنسو ہیں کہ پیہم بہتے ہیں
ہم سامنے اُن کے بیٹھے ہیں اور قصۂ فرقت کہتے ہیں

اب حسن و عشق میں فرق نہیں اب دونوں کی اِک حالت ہے
میں اُن کو دیکھتا رہتا ہوں وہ مجھ کو دیکھتے رہتے ہیں

اُن کی وہ حیا وہ خاموشی اپنی وہ محبت کی نظریں
وُہ سُننے کو سب کچھ سُنتے ہیں ہم کہنے کو سب کچھ کہتے ہیں

اِس شوق فراواں کی یارب آخر کوئی حد بھی ہے کہ نہیں
انکار کریں وُہ یا وعدہ ہم راستہ دیکھتے رہتے ہیں

ہمدرد نہیں، ہمراز نہیں، کِس سے کہیئے، کیونکر کہیئے
جو دل پہ گزرتی رہتی ہے جو جان پہ صدمے سہتے ہیں

آ دیکھ کہ ظالم فرقت میں کیا حال مرا بے حال ہوُا
آہوں سے شرارے جھڑتے ہیں آنکھوں سے دریا بہتے ہیں

اکبرؔ شاید دل کھو بیٹھے وہ جلسے وُہ احباب نہیں
تنہا خاموش سے پھرتے ہیں ہر وقت اُداس سے رہتے ہیں

غزل

(جناب محمد علی خاں صاحب آثر رامپوری)

ہائے دل یادِ خدا بھول گیا
قبلہ کو قبلہ نما بھول گیا

بن کے سائل بھی نہ نکلا کچھ کام
در پہ پہنچا تو صدا بھول گیا

لذتِ کاوشِ نازک کو نہ پوچھ
درد اُٹھا تو دوا بھول گیا

جب تری موہنی صورت دیکھی
سارے شکوے بخدا بھول گیا

میٹھی میٹھی تری باتیں سُن کر
تلخیٔ جور و جفا بھول گیا

ایک دیوانہ کی باتوں پہ نہ جا
کیا خبر کیا کہا۔ کیا بھول گیا

ہائے اِک بات رہی جاتی ہے
کچھ ابھی کہنے کو تھا بھول گیا

ہو گئیں سینکڑوں عدوں کی وفا
اُس نے جب ہنس کے کہا بھول گیا

سہو سے ہو گیا سجدہ مقبول
در پہ جب سر کو رکھا، بھول گیا

یاد رکھنے کی ہے یاد اُس کی آثر
اور جو بھول گیا۔ بھول گیا

غزل

(جناب بدرؔ غازی پوری)

صبر کے آداب سے واقف نہیں ہے دل ابھی
راہِ تسلیم و رضا کی دُور ہے منزل ابھی

ختم تھوڑی ہو گی میری داستانِ دل ابھی
آپ کو دُنیا کہے گی مدتوں قاتل ابھی

بے نیازی میں تری بھرنا ہے رنگِ التفات
آہ چھیڑوں یا نہ چھیڑوں داستانِ دل ابھی

اس گلی میں ذرّے چُننے سے مجھے فرصت کہاں
میں مرتب کر رہا ہوں داستانِ دل ابھی

مَیں ہوں اور میرا ہجومِ شوق میرے ساتھ ساتھ
ایک عالم لے کے جانا ہے کئی منزل ابھی

جب بھی آ جائے بُری ساعت نہیں لگتی ہے دیر
ایک کشتی آ کے ڈوبی ہے لبِ ساحل ابھی

کھینچ لائی وقت سے پہلے ہی بیتابیٔ شوق
بر سرِ منزل ہوں پھر بھی دُور ہے منزل ابھی

کوئی گستاخی ہوئی سرزد نگاہِ شوق سے
اُٹھتے اُٹھتے گر گیا پھر پردۂ محمل ابھی

جزر و مد طوفانِ برق و باد، گرداب و حباب
اس غضب کی بھیڑ میں گُم ہو گیا ساحل ابھی

آج ہر آئینہ پیدا ہے قیامت کی چمک
داستانِ طُور دُہرائیں گے داغِ دل ابھی

آس دکھلاتی ہے اپنا جلوۂ رنگیں مجھے
نامرادی کہہ رہی ہے دُور ہے منزل ابھی

چشمِ تر، نوکِ مژہ، راہِ وفا، دامانِ دوست
ایک ایک آنسو کو جانا ہے کئی منزل ابھی

ہمتِ دل چاہیئے اے بدرؔ راہِ عشق میں
دیکھیئے دو گام چل کر آتی ہے منزل ابھی

فہرستِ مضامین

ہمایوں بابت ماہِ مارچ ۱۹۳۸ء

تصاویر :- ٹیکسلا کے تین منظر

شمار	مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ
۱	خیالات	بشیر احمد	۱۹۵
۲	جہاں نما		۱۹۶
۳	رُباعیات	حضرتِ آذر جالندھری	۱۹۸
۴	جل ترنگ	جنابِ جلال ملیح آبادی	۱۹۹
۵	اقبال	بشیر احمد	۲۰۱
۶	بسنت (نظم)	حضرتِ جوشؔ ملسیانی	۲۱۴
۷	شیریں کا سبق	"فلک پیما"	۲۱۵
۸	اعجازِ بہار (نظم)	جنابِ تاجور سامری	۲۱۸
۹	ہونے دے بدنام (نظم)	جناب منظور احمد صاحب بی۔اے	۲۱۹
۱۰	آج کل کا لاہور	پروفیسر حمید احمد خاں صاحب ایم۔اے	۲۲۰
۱۱	غزل	حضرتِ سیفی ٹونگانوی	۲۲۶
۱۲	اُردو حروفِ تہجی کی ایک نئی ترتیب	مسٹر اوم پرکاش ایم۔اے	۲۲۷
۱۳	کیلاش کنول (تراجم از پیامِ مشرق)	حضرتِ مقبول احمد پوری	۲۳۳
۱۴	ٹیکسلا	جنابِ رفیع الزمان خاں صاحب جالندھری	۲۳۵
۱۵	قطع تعلق (نظم)	جناب مرزا یاور علی صاحب	۲۴۱
۱۶	غالب اور بیدل	پروفیسر حمید احمد خاں صاحب ایم۔اے	۲۴۲
۱۷	اُردو (نظم)	جناب منوہر لال صاحب ہادی	۲۵۲
۱۸	محبت گرم گرم آنسو، محبت سرد سرد آہیں!	"ابنِ مریم"	۲۵۳
۱۹	تماشا (گیت)	جناب احمد ندیم صاحب قاسمی بی۔اے	۲۵۴
۲۰	نوائے شاعر (نظم)	جناب ابراہیم صاحب ہوشؔ کلکتوی	۲۵۵
۲۱	جب کمبل ہٹا۔۔۔!	"ہما"	۲۵۶
۲۲	التجا (نظم)	حضرتِ امین حزیں سیالکوٹی	۲۶۲
۲۳	محفلِ ادب		۲۶۳
۲۴	مطبوعات		۲۶۶

چندہ سالانہ صہ۔ ششماہی سے (مع محصول) قیمت فی پرچہ ۸؍

خیالات

برسوں میں خیالات لکھتا رہا !

پھر میں نے خیال کیا کہ خیالوں کو خیرباد کہوں کہ شاید اسی طرح عملوں کی طرف رجوع ہو !

اب پھر مدت کے بعد آج میں نے اپنے خیال کے گھوڑے کو تازیانہ لگایا ہے — نہیں معلوم یہ محض خیال ہے یا کوئی عمل ؛

خدا سے !

"تُو نے کیوں مجھے اس ملک میں پیدا کیا ؛ اے میرے خدا ! جہاں گانے اور باجے اور تعزیے پر لڑائی ہوتی ہے۔
جہاں مرد عورت پر ظلم کرتا ہے —— جہاں بچے بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں —— جہاں مزدور بھُوکوں مرتے ہیں —— جہاں توہمات کا نام مذہب ہے "

خُدا کا جواب

"اچھا ! اور تُو نے مجھے اس ملک میں کیوں پیدا کیا ؛
مجھے تو اس سے وہ ملک اچھے جہاں وہ مجھے مانتے نہیں لیکن جانتے ہیں !
دلیری —— خوبصورتی —— مصروفیت ——

میں پیرس میں کسی خوش منظر چوراہے پر کھڑا ہوتا ہوں کہ لاہور کی کسی تنگ گلی میں ایک اوباش کسی بیوہ پر آوازہ کستا ہے وہ ڈر کر مجھے پکارتی ہے، میں وہاں سے بھاگا آتا ہوں۔
اُف ! تُو نے کیوں مجھے اس ملک میں ؛ ؛ ؛"

دُنیا وہی ہے لیکن میں وہ نہیں !
دُنیا ابھی تک حسین ہے لیکن میں اب عشق سے خالی ہوں ؛
نہیں دُنیا وہی نہیں کچھ اور ہے اور حُسن و عشق کے سوا اس میں اور بھی بہت کچھ ہے۔
پھر تُو وہ نہ سہی اور عشق سے بھی خالی ہو لیکن دل و رُوح میں پھر اپنا آپ ڈال دے اور کچھ اور بن جا جو تُو پہلے کبھی نہ تھا !

بشیر احمد

جہاں نما

پُرانی روایات سے نئی دنیا کی تخلیق

"دَوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تُو!"

مغرب کی بہ نسبت ہندوستان میں نئی تہذیب کی خودکشی کی تیز رفتار کو روکنے کا زیادہ امکان ہے۔ ہندوستان میں ابھی تک غیر مادی قدر کے احترام کا گہرا جذبہ موجود ہے۔ الیف۔ جی پیرس نے اپنے ایک مضمون میں جو "بیسویں صدی" میں شائع ہوا ہے "یوگ" کی اہمیت پر بحث کی ہے۔ "یوگ" سے اُس کی مراد وہ اصول یا طریقہ ہے جس سے انسان اپنے من کی دُنیا پر اختیار حاصل کر سکتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"اگر ہم اس بھید کو پالیں کہ "اصلِ حیات" واحد اور غیر منقسم ہے اور "انانیت" ہمارے اپنے محدود ذہن کی تخلیق ہے تو کیا اس کے بعد ہم زندگی کے اُس نظام کو جائز قرار دے سکتے ہیں اور برداشت کر سکتے ہیں جس کی وجہ سے بنی نوعِ انسان کا تین چوتھائی حصّہ باقی ایک چوتھائی کے بوجھ کے نیچے کراہ رہا ہے؛ کیا اس کے بعد ہم کسی قسم کی غُلامی اور ظلم کو گوارا کر سکتے ہیں؛ یہ ٹھیک ہے کہ ظلم کرنے والوں اور غلام بنانے والوں سے نجات حاصل کرنا ہمارے بس کی بات نہیں لیکن ہم انہیں ان انسانیت سوز کاموں سے روکنے کی کوشش کر سکتے ہیں کیا یہ کام آرام کُرسی پر بیٹھے بٹھائے ہو سکتا ہے؛

ہمیں اس بات کا احساس نہیں کہ دُنیا کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کرنا، سیاسی اور معاشی انقلابات پیدا کرنا یا تعلیم دینا ہم سب کا فرض ہے۔ وہ لوگ بھی جن کا کام صرف دیکھ بھال ہے ایک "قسم کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ناممکن نہیں کہ بیٹھ کر سوچنے والے بھی اپنا فرض پُورا کر رہے ہیں۔ ایک آرٹ جسے مغرب نے فراموش کر کے بہت نقصان اُٹھایا ہے اور جس کی اہمیت مغرب کی پیروی کی وجہ سے مشرق میں بھی خطرے میں ہے سوچ بچار کی عادت ہے اور اگر یہ عادت مقصود بالذات نہ ہو بلکہ کسی اور مقصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہو اور وہ مقصد "انا" کے دھوکے سے نجات حاصل کرنا ہو تو یہ بیک وقت ایک اعلےٰ درجے کا آرٹ اور سائنس بن جاتی ہے"۔

"وہ شاعر جس نے لکھا تھا کہ مشرق لشکروں اور فوجوں کی گرج کے درمیان اپنے خیالات کی دُنیا میں گُم تھا اگر اس وقت زندہ ہوتا اور مسٹر ہرڈ کی کتاب پڑھتا تو یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا کہ انہی لشکروں کی گرج اور اُن کے سائنٹیفک تباہی لانے والے ہتھیاروں کے مشاہدے سے جدید سائنس کا ایک مغربی مصنف کس طرح تہذیبِ مغرب کے انجام کی پیش گوئی کرتا ہے۔ اور اگر وہ سُنتا کہ اس مصنف اور

اس کے اکثر معاصرین کو یقین ہے کہ تہذیب کو بچانے کا واحد ذریعہ اُنہی باتوں کی تلاش ہے جن کی جستجو میں مشرق ایسے نازک وقت میں اپنے خیالات کی دُنیا میں گم تھا جب مغرب فاتحانہ انداز میں آگے بڑھ رہا تھا تو اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہتی۔"

مضمون کے آخری الفاظ یہ ہیں:۔

"ہندوستان کو ان باتوں کی تلاش میں خاص سہولتیں حاصل ہیں۔ اُس اُصول کی روایات جس نے ہندوستانی تہذیب کو اپنی ہمعصر سامری اور مصری تہذیبوں کے فنا ہو جانے کے بعد بھی عرصہ دراز تک زندہ رکھا آج بھی اس ملک میں پائی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ اسی قسم کے کم از کم تین اہم اصولوں کی روایات یہاں موجود ہیں اور وہ یہ ہیں:۔ (۱) بدھ مت کا نفسیاتی نظام، (۲) یوگ (۳) تصوف، چونکہ ان کا تعلق عام طور پر مذہب اور مذہبی نظاموں سے ہے اس لئے زیادہ تر یہ اُن لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں جو مادی حقائق کی دُنیا سے پناہ ڈھونڈھتے ہیں۔ جو لوگ ان مادی حقائق کا مقابلہ کر کے دُنیا میں انقلاب لانا چاہتے ہیں وہ انہیں اپنے لئے باعث ننگ سمجھتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں نے ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے یہ اُصول دُوسرے قسم کے لوگوں کے لئے مفید ترین ہے کیونکہ اگر صحیح طور پر غور کیا جائے تو اس کا اثر اُن باتوں کے بالکل منافی ہے جو انسان کو موجودہ طرزِ زندگی کے عملی مسائل سے رُوگردان کرتی ہیں۔ یہ اُس قدامت پسند مذہبی نظام کا بالکل اُلٹ ہے جسے مارکس ایک نشہ آور چیز سے مشابہ کرتا ہے۔ یہ رُوح، دل اور جسم کو از سرِ نو زندگی اور صحت دیتا ہے۔ بنی نوع انسان میں اپنے مستقبل کے متعلق خود اعتمادی کے جذبات پیدا کرتا ہے اور اخوت اور آزادی کا پیغام لاتا ہے اور یقین دلاتا ہے کہ "قوتِ حیات" جس وقت چاہے اور جس طرح چاہے اپنی قدرت کے مکمل اظہار کے لئے اپنے آپ کو نئی سے نئی شکلوں میں اور بڑے سے بڑے پیمانوں پر ظاہر کر سکتی ہے۔ یہ حقیقت کہ ہمیشہ سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے اس بات کی کافی دلیل ہے کہ آئندہ بھی ایسا ہوتا رہے گا اور ناکامیوں اور خامیوں کے باوجود زندگی کی یہ رَو نُوبنُو قوت کے ساتھ جاری رہے گی۔"

جل ترنگ

جل ترنگ
بج رہا ہے جل ترنگ
شام کی رنگینیوں میں بج رہا ہے جل ترنگ
گومتی پر کشتیوں میں ہیں تانِ شوخ و شنگ
بے دریغ و بے درنگ
جل ترنگ
بج رہا ہے جل ترنگ
شام کی رنگینیوں میں بج رہا ہے جل ترنگ
جل ترنگ
بج رہا ہے جل ترنگ
ساحلوں پر پھول سے برسا رہی ہے چاندنی
نقرئی لہروں میں غوطے کھا رہی ہے چاندنی
آج ہے ہر شے پہ رنگ
جل ترنگ
بج رہا ہے جل ترنگ
شام کی رنگینیوں میں بج رہا ہے جل ترنگ
جل ترنگ
بج رہا ہے جل ترنگ
ساز و نغمہ، ساغر و مے، کیف و رُومان و بہار
الحذر جوشِ جوانی، الاماں آغوشِ یار

دل ہُوا جاتا ہے تنگ
جل ترنگ
بج رہا ہے جل ترنگ
شام کی رنگینیوں میں بج رہا ہے جل ترنگ
جل ترنگ
بج رہا ہے جل ترنگ
جا رہی ہیں کشتیاں پانی پہ لہراتی ہوئی
ڈگمگاتی، جھُومتی، مڑتی ہُوئی گاتی ہُوئی
دل میں ہے تازہ اُمنگ
جل ترنگ
بج رہا ہے جل ترنگ
شام کی رنگینیوں میں بج رہا ہے جل ترنگ
جل ترنگ
بج رہا ہے جل ترنگ
بچھ رہا ہے نیلگوں موجوں میں یوں تاروں کا جال
بہ رہے ہیں کہکشاں پر ہم یہ ہوتا ہے خیال
ہو رہی ہے عقل دنگ
جل ترنگ
بج رہا ہے جل ترنگ
شام کی رنگینیوں میں بج رہا ہے جل ترنگ
جل ترنگ
بج رہا ہے جل ترنگ

جلال ملیح آبادی

ب

اس مضمون کا ابتدائی حصہ "یوم اقبال" کی تقریب پر ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا ریڈیو کے لاہور سٹیشن سے براڈکاسٹ کیا گیا۔

یہ لاہور ہے، لاہور جہاں اُردو کا شہرہ آفاق شاعر اقبال رہتا ہے۔ جہاں میں بول رہا ہوں وہاں سے بمشکل ایک میل کے فاصلے پر وہ شخص اپنے پلنگ پر لیٹا ہؤا ہے جس پر آج ایک دُنیا کی نظریں جمی ہیں۔ وہ پلنگ پر لیٹا یا بیٹھا ہؤا ہے وہ عام طور پر اپنے گھر کے اندر ہی رہتا ہے صحت کی کمزوری نے اُسے اس خانہ نشینی پر مجبور کر دیا ہے لیکن یہ نہ سمجھئے کہ وہاں وہ تنہا ہے۔ لوگ جب موقع پاتے ہیں وقتاً فوقتاً اُس کے گرد جمع ہوجاتے ہیں اور اُسے ان کی ملاقات سے عار نہیں کیونکہ وہ حقیقت میں ایک بڑا انسان ہے جو عموماً اپنے کسی چھوٹے سے چھوٹے ہم جنس سے بھی ملنے سے انکار نہیں کرتا، وہ ایک آزاد خیال شخص ہے جس پر حکومت کے زور یا دولت کی شیخی کا ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔ اُس کے لئے بڑے چھوٹے سب برابر ہیں کیونکہ وہ ایک بڑا اور سچّا انسان ہے!

اقبال کی صحت اور جسم کمزور ہو لیکن اُس کے دل و دماغ ابھی خوب مضبوط ہیں اور جب وہ باتیں کر رہا ہو، زندگی کے مسائل پر اپنا نقطۂ نظر بیان کر رہا ہو، موجودہ حالات پر تبصرہ کر رہا ہو یا مغربی حکمت یا سیاست کی بعض تازہ ترین کتابوں پر تنقید کر رہا ہو تو اس کی وسیع نظری اور جوش اور انہماک اور معلومات کو دیکھ کر اس بات کا گمان بھی نہیں گزرتا کہ اُس پُرزور شخصیت کی جسمانی صحت کسی طرح کمزور ہے۔

اس عظیم الشان انسان کی صحبت یا اُس سے ملاقات ایک ایسی نعمت جس سے صرف بڑے اور سمجھدار آدمی ہی نہیں بلکہ معمولی آدمی بھی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اور اُٹھاتے ہیں۔ کئی دفعہ شہر کے بعض آدمی حاضر ہوتے ہیں اور صرف یہ سعادت حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ اپنے قومی شاعر کی جینٹلمنٹ کے لئے مٹی چاپی کریں۔ خوش قسمتی سے قومی شاعر باوجودیکہ وہ ایک بنگلے میں رہتا ہے سرمایہ داروں یا امیروں کا سا مزاج نہیں رکھتا کہ صرف صاحبِ حیثیت آدمیوں سے ملنا گوارا کرے۔ اس لحاظ سے موجودہ زمانے کا یہ شاعر موجودہ اور گزرے ہوئے وقتوں کے علم و اخلاق کا آئینہ ہے۔

اقبال کی عمر اس وقت ۶۱ سال ہے۔ وہ ۱۸۷۶ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے۔ وہاں ایف۔ اے کا امتحان پاس کر کے اُنھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے پاس کیا اور وہیں فلسفے کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر کئے گئے۔ اسی زمانے میں ان کی شاعری بھی چمکنے لگی۔ اسی زمانے کا وہ مشہور شعر ہے جسے سُن کر مرزا ارشد نے اس نوجوان کے حقیقی شاعر ہونے کا اعلان کیا تھا ؎

قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے ... موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے

اُردو کے نقطۂ نظر سے اقبال کی شاعری کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا جسے مخزن کا دور کہا جاسکتا ہے ۱۹۰۱ء

سے ۱۹۰۵ء تک تھا۔ اس زمانے میں اُنہوں نے اِدھر شیخ عبدالقادر صاحب کے مشہور رسالے مخزن میں لکھنا شروع کیا اور اُدھر انجمن حمایت اسلام لاہور میں اپنی دردناک نظمیں سنانی شروع کیں۔ حب الوطنی کی نظمیں بھی اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ دوسرا انگلستان کا دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک تھا جب وہ یورپ میں تعلیم کی غرض سے مقیم رہے۔ اس دور میں مغربی تہذیب سے اُن کی مٹھ بھیڑ ہوئی جس سے اُن کے کلام پر خاصا اثر ہوا اور وہ مغربی تمدّن کے ایک زبردست نقاد بن گئے۔ تیسرا دور ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۳ء تک تھا جب وہ اپنی قومی و اسلامی نظموں سے قوم کے ایک سرگرم رہنما بن گئے۔ شکوہ، جوابِ شکوہ، شمع اور شاعر، خضرِ راہ، طلوعِ اسلام یہ سب اسی عہد کی نظمیں ہیں۔ لیکن اِسی دور میں اقبال فارسی کی طرف کھینچتے چلے گئے۔ ۱۹۱۵ء میں اُنہوں نے "اسرارِ خودی" شائع کی۔ اس کے بعد پے در پے "رموزِ بیخودی" اور "پیامِ مشرق" شائع ہوئیں۔ چوتھا دور ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۵ء تک تھا جب ایک طویل عرصے کے لئے اُنہوں نے اُردو سے مُنہ پھیر لیا۔ "زبورِ عجم"، "جاویدنامہ"، "مسافر" اور اسلام پر انگریزی میں چھ لیکچر اس زمانہ میں لکھے گئے۔ ۱۹۳۵ء سے پھر اُردو کی باری آئی اور پہلے "بالِ جبریل" اور پھر "ضربِ کلیم" شائع ہوئی۔

اقبال محض ایک شاعر نہیں وہ ایک زبردست قومی رہنما ہے، وہ ایک مخلص قومی پیغامبر ہے وہ ایک فلسفی شاعر ہے وہ صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ ہندوستان بھر کے لئے اور ساری نوعِ انسان کے لئے ایک پیغام لے کر آیا ہے۔ ایک دفعہ نہیں کئی بار میں نے ۱۹۳۵ء سے پہلے اُن سے شکایت کے طور پر عرض کی کہ آپ نے اُردو کو چھوڑ دیا ہے اور اُردو کا آپ پر خاص حق تھا اور ہے۔ فارسی والے فارسی میں لکھیں، اُردو کو اُردو والوں کی ضرورت ہے اور بہت سخت ضرورت۔ وہ یہ سُن کر مسکرا دیتے تھے۔ بہت اصرار پر اُنہوں نے کہا تو یہ کہا کہ اوّل تو میری اُردو بھی فارسی نما ہوتی ہے، دوسرے شاعر مصلحتوں کو مدِّنظر نہیں رکھتا، اُسے تو ایک پیغام دینا ہے جس زبان میں بھی موزوں ہو جائے اور جہاں تک بھی پہنچ سکے!

اقبال کا فلسفہ جدوجہد کا فلسفہ ہے۔ زندگی انفرادی چیز ہے، خدا سب سے عظیم الشان فرد ہے، کائنات ایک عجیب و غریب کارنامہ ہے وہ مکمل نہیں اُس کا کام برابر جاری رہتا ہے اور ہر فرد اس میں اپنے انوکھے پن کے ساتھ حصّہ لیتا ہے۔ اقبال کے نزدیک انسان کا نصب العین یہ ہے کہ وہ اپنی خودی کو فروغ دے، اُسے چمکائے اُسے بڑھائے اور اُسے جماعت اور نوعِ انسان کی خدمت میں صرف کرے۔ زندگی ایک تحریک ہے اپنے میں سب کچھ جذب کرنے والی اور عشق اس تحریک کا سب سے زبردست جذبہ ہے۔ زندگی ہمیشہ آگے کو بڑھتی ہے:

چلنے والے نکل گئے ہیں جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

زندگی آزادی کے لئے ایک مسلسل کوشش ہے اور صحیح زندگی صرف وہی ہے جو بے جھجک ہو کر خطروں میں سے ہو کر گزرے اور اور زیادہ زندہ و تابندہ ہو جائے:

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

اقبال کے کلام پر ایک سرسری سی نظر ڈالو تو جا بجا مناظرِ قدرت، حبِّ وطن، رموزِ فطرت، موجودہ تمدّن اور قومی عروج و زوال کی بولتی چالتی تصویریں نظر آئیں گی۔ حسن و خوبی کے نظارے، جدوجہد کے نعرے، عشق و ایمان کے شعلے جا بجا پرجلوے ہیں!

سب سے پہلے مجموعے بانگِ درا کا آغاز یوں ہوتا ہے: ؎

اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں — چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں — تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں

ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لئے
تو تجلّی ہے سراپا چشمِ بینا کے لئے

گویا اپنے ملک کی محبت کو معرفت کا درجہ دے دیا ہے!

"پرندے کی فریاد" بچوں کے لئے ہے، ہم میں سے اکثر نے اسے سکول میں پڑھا ہے: ؎

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ

لیکن جیسی بچوں کے لئے ہے ویسی ہی بڑوں کے لئے بھی ہے، صرف اُن کے لئے اس کے معنی کچھ ہیں اور ان کے لئے کچھ اور یہی ایک بڑے شاعر کی خوبی ہے کہ ایسی بات کہے جو سب کے لئے موزوں اور سب کی دل پسند ہو۔ ایسی ہی نظم "ایک آرزو" ہے: ؎

دنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یارب! — کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری — دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں — چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ — پانی بھی موج بن کر اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہو

یہ اور اور اشعار جو یہاں درج کئے جاتے ہیں اس قدر عام ہو چکے ہیں کہ اُن کا دُہرانا لا حاصل معلوم ہوگا لیکن یہی ہمارے شاعر کی عظمت ہے کہ باوجودیکہ وہ ایک فلسفی شاعر ہے۔ اُس کے ہزاروں شعر لوگوں کی زبان پر چڑھ چکے ہیں اور بعضوں کی زندگی کا جزو بن چکے ہیں۔

وطن کے درد سے شاعر کا دل معمور ہے: ؎

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے

اور وہ بے اختیار کہتا ہے: ؎

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو — کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو — تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

قوم و وطن کی بیماری کے لئے شاعر کے پاس علاج بھی ہے: ؎

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے　　گیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

ترانۂ ہندی کو کون نہیں جانتا؟ اُسے کون نہیں سمجھتا، اُسے کون نہیں گنگناتا اور گاتا؟: ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

بلاشبہ یہی اس وقت ہندوستان کا قومی ترانہ ہے!

عشق و معرفت اور عقل و دل پر کیسے کیسے موتی بکھیرے ہیں: ؎

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں　　وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں
محبت کے لئے دل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا　　یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے　　نظارے کی ہوس ہے تو لیلیٰ بھی چھوڑ دے
سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے　　او بے خبر جزا کی تمنّا بھی چھوڑ دے
اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل　　لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اقبال مسلسل کوشش اور مسلسل زندگی اور مسلسل تغیّر کا قائل ہے: ؎

زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے
سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں　　ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

میرے والدِ محترم جسٹس شاہ دین ہمایوں (مرحوم) سے جن سے اقبال کو خاص تعلق تھا خطاب کرتے ہوئے اُن کی وفات کے بعد لکھتے ہیں: ؎ اے ہمایوں زندگی تیری سراپا سوز تھی　　تیری چنگاری چراغِ انجمن افروز تھی

اس نظم کا آخری شعر ہے کہ ؎

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی　　ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

مغرب کی تہذیب پر کیا کھری کھری باتیں کہی ہیں ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے　　کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہی زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی　　جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

اس کے مقابل میں شاعر کا نصب العین ترکِ دُنیا نہیں بلکہ ؎

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اُس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

وطنیت اور مغرب پرستی کی غلامانہ روش سے بیزار ہو کر اقبال ایک زیادہ ہمہ گیر معاشرت کی طرف متوجہ ہوتا ہے جس میں صحیح آزادی اور مساوات اور محبت اور عدل و ہمدردی کے عناصر ہوں اور یہ محض ایسے افراد کے ایثار اور کوششوں سے وجود میں آسکتی ہے جو اپنی خودی سے بخوبی آگاہ ہوں :-

غلامی میں نہ کام آتی ہیں تقدیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

اشتراکیت کی جھلکیاں بھی نظر آنے لگتی ہیں: "ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو" اور "قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے"

بالِ جبریل میں شاعر مصر و حجاز اور پارس و شام یعنی ہر قسم کی قیدِ مقام سے بہت بلند پرواز کرنے لگتا ہے۔ اس زمین پر رہنے والے کی آواز سے آسمان بھی گونج اُٹھتے ہیں :-

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں

اسلامی نصب العین سامنے ہے :-

خودی کا سرِّ نہاں لا الٰہ الّا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الّا اللہ

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الّا اللہ

لیکن اس میں بھی آزادی کا رنگ صاف جھلکتا ہے :-

یہ دَور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الّا اللہ

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زنّاری
نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الّا اللہ

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الّا اللہ

اسلامی نصب العین ضرور سامنے ہے لیکن اقبال کے لئے مسلمان وہ نہیں جیسا کہ آج کل کا مسلمان ہے بلکہ وہ جیسا کہ مسلمان کو ہونا چاہئے کیا اس تعریف کے تحت میں بعض غیر مسلم بھی شامل نہ ہونا چاہیں گے :-

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے!
یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں

طلوع ہے صفتِ آفتاب اُس کا غروب
یگانہ اور مثالِ زمانہ گوناگوں

کہا جاتا ہے کہ ضربِ کلیم میں شاعری نہیں محض وہی فلسفہ سا ہے دُہرایا ہوا۔ اُوپر کے ساتوں شعر اسی دیوان سے ہیں۔ ان سے

زیادہ زندگی بخش شعر اَور کون سے ہوں گے ؟

غرض اسلامی نصب العین ضرور سامنے ہے لیکن یہ امر غور کرنے کے قابل ہے کہ اس نصب العین کی تلاش میں اقبال اس قدر بلند ہو گیا ہے کہ وہ مسلم و غیر مسلم سب کے لئے زندگی کا ایک فلسفی رہنما بن چکا ہے۔ مثال کے طور پر بالِ جبریل اور ضربِ کلیم سے کچھ اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

خدا سے گلہ ہوتا ہے :۔

اگر کج رَو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا؟

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟

فلک کی گردش اور زمانے کا انداز اب نرالا ہے اَور ہونا چاہیئے : ؎

دگرگوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی
دلِ ہر ذرّہ میں غوغائے رستاخیز ہے ساقی

پرُانے ہیں یہ ستارے فلک بھی فرسودہ
جہاں وہ چاہیئے مجھ کو کہ ہو ابھی نوخیز

حدیثِ بے خبراں ہے "تو با زمانہ بساز"
زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

یعنی زمانہ اگر راست نہیں تو اُسے راست بنانا انسان کا کام ہے۔ انسان کی حیرت انگیز قوت و ہمت کا حاجا نعرہ بلند کیا ہے ؎

چیتے کا جگر چاہیئے شاہیں کا تجسس

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہرِ یک دانہ
آزادی و یک رنگی اے ہمتِ مردانہ

دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے
پھر اس میں عجب کیا کہ تُو بے باک نہیں ہے

کب تک رہے محکومیٔ انجم میں مری خاک
یا میں نہیں یا گردشِ افلاک نہیں ہے

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اَور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اَور نہیں

ہر اِک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اَور نہیں

سب سے بڑھ کر یہ کہ ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خُدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے۔

کیا یہ آج کل کے ایک عام مسلمان کی سی محدود و کمزور مسلمانی ہے؛ نہیں یہ وہ زندگی پیدا کرنے والا رگوں میں خون دوڑانے والا ہمہ گیر بلند نظر مذہب ہے جس کے آگے شاید انتہا پسند اشتراکی بھی فخر کے ساتھ اپنا سر جھکا دیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اقبال کو محض ایک فرقے کا شاعر کہنا پرلے درجے کی غلطی ہے وہ نوعِ انسان کا پیغام بر اور نوعِ انسان کا بے بدل شاعر ہے۔

پنجاب کے دہقان سے یوں خطاب کرتا ہے کہ ؎

بتا کیا تری زندگی کا ہے راز؟ — ہزاروں برس سے ہے تو خاک باز!
اسی خاک میں دب گئی تیری آگ — سحر کی اذاں ہو گئی اب تو جاگ!

لیکن خدا کے حضور جاتا ہے اور شکایت کرتا ہے تو فرشتے بھی نئے انداز میں گیت گاتے ہیں اور اس شکایت کی حمایت کرتے ہیں۔ اُدھر خدا کہ اسی حسنِ طلب کا منتظر تھا فرشتوں کے نام اب اپنا انقلابی فرمان جاری کرتا ہے کہ :؎

اُٹھو مری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے — کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ — جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہیں روزی — اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے — میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

یہ سب اس لئے کہ اقبال جمود و سکون و سکوت کا قائل نہیں مُسلسل تغیّر کا علمبردار ہے :؎

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا — یہی ہے اِک حرفِ محرمانہ!

ضربِ کلیم کا سرنامہ ہے ؎

نہیں مقام کی خوگر طبیعتِ آزاد — ہوائے سیر مثالِ نسیم پیدا کر
ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے — خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

یعنی اب ہر انسان کو کلیم بننا اور کلیم بن کر دکھا دینا ہے :؎

دلِ مُردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ

یہ مُردنی کیوں چھائی ہوئی ہے اس لئے کہ ؎

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس

اس زنداں سے نکلنا ہے لیکن اپنے آپ کو بھول نہیں جانا کہ خود آگاہی ہی انسانیت کی ضامن ہے۔ اپنے چہیتے بیٹے جاوید سے خطاب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ؎

شاخِ گل پہ چہک ولیکن — کر اپنی خودی میں آشیانہ

رسمی مسلمانی درکار نہیں :۔ "دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں!"

اقبال کے نزدیک صرف جرأت اور طلب اور ہمت ہی صحیح زندگی کی رہنما ہے؛ ؎

جرأت ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے   اے مردِ خدا ملکِ خدا تنگ نہیں ہے

ہے آبِ حیات اسی جہاں میں   شرط اس کے لئے ہے تشنہ کامی

وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے   جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا

اقبال کا فلسفہ ہے کہ انسان اپنے سیاہ وسفید کا مالک ہے، وہ فنا کو بقا میں تبدیل کر سکتا ہے، وہ زمانے کی رَو کو جدھر چاہے موڑ سکتا ہے اور اس سے زیادہ کسی انسان نے کیا کہا ہوگا کہ ؎

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے   یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ!

ارادہ نہ تھا کہ اقبال کے فارسی کلام پر کچھ لکھا جائے۔ راقم نے مدتوں کوشش بھی کی کہ اس سے روگردانی کی جائے لیکن سر ذوالفقار علی خاں کے مختصر انگریزی تبصرے "مشرق سے ایک آواز" کے سرورق پر مرقومہ بالا شعر پڑھ کر نہ رہا گیا اور "اسرارِ خودی" کو پہلے فارسی اور پھر انگریزی میں بھی پڑھا اور بعد میں دوسری فارسی مثنویوں سے بھی فیض یاب ہوا۔ "من صدائے شاعرِ فردا استم" کی کہانی اور پھر فارسی کی زبانی! سچ یہ ہے کہ زبان کے جھگڑے کو بالکل بھول گیا اور زندگی سے دوچار ہوا۔

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی ست   ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی ست

خویشتن را چوں خودی بیدار کرد   آشکارا عالمِ پندار کرد

سوزِ پیہم قسمتِ پروانہ ہا   شمع عذرِ محنتِ پروانہ ہا

خامۂ او نقشِ صد امروز بست   تا بیارد صبحِ فردائے بدست

شعلہ ہائے او صد ابراہیم سوخت   تا چراغِ یک محمدؐ بر فروخت

خیزد انگیزد پرد تابد رمد   سوزد افروزد کشد میرد دمد

نقطۂ نورے کہ نامِ او خودی ست   زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی ست

از محبت می شود پائندہ تر   زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر

در جہاں ہم صلح و ہم پیکارِ عشق   آبِ حیواں تیغِ جوہر دارِ عشق

از نگاہِ عشق خارا شق شود   عشقِ حق آخر سراپا حق شود

خاک گشتن مذہبِ پروانگی ست
خاک را اب شو کہ ایں مردانگی ست

از گلِ خود آدمے تعمیر کُن
آدمے را عالمے تعمیر کُن

در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات
لذّتِ تخلیق قانونِ حیات

مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار
با مزاجِ اُو بسازد روزگار

گر نسازد با مزاجِ اُو جہاں
می شود جنگ آزما با آسماں

بَر کند بنیادِ موجودات را
می دہد ترکیبِ نَو ذرّات را

گردشِ ایّام را برہم زند
چرخِ نیلی فام را برہم زند

آزماید صاحبِ قلبِ سلیم
زورِ خود را از مہماتِ عظیم

لیکن زندگی اضداد کا مرکب ہے۔ "خودی" کا زور دکھا کر شاعر "بےخودی" کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ "شمع و شاعر" میں وہ برسوں پہلے کہہ چُکا ہے کہ ؎

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اب "رموزِ بیخودی" میں ربطِ فرد و ملّت کے معنی بیان کرتا ہے: ؎

فرد را ربطِ جماعت رحمت است
جوہرِ اُو را کمال از ملّت است

تا توانی با جماعت یار باش
رونقِ ہنگامۂ احرار باش

فرد می گیرد ز ملّت احترام
ملّت از افراد می یابد نظام

فرد تا اندر جماعت گُم شود
قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

اُن اسباب کا ذکر کرتا ہے جن سے افراد اور قومیں تباہ ہوئیں: ؎

مرگ را ساماں ز قطعِ آرزو ست
زندگانی محکم از لَا تَقْنَطُوا ست

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر
از نبی تعلیمِ لَا تَحْزَنْ بگیر

گر خدا داری ز غم آزاد شو
از خیالِ بیش و کم آزاد شو

نظامِ ملّت کے لئے آئین کی ضرورت ہے: ؎

ملّتے را رفت چوں آئیں ز دست
مثلِ خاک اجزائے اُو از ہم شکست

برگِ گل شد چوں ز آئیں بستہ شد
گل ز آئیں بستہ شد گلدستہ شد

نغمہ از ضبطِ صدا پیداستے　　ضبط چوں رفت از صدا غوغاستے

اور جمعیت حقیقی صرف کسی نصب العین سے ممکن ہے ؎

مدعا گردد اگر مہمیزِ ما　　ہمچو صرصر می رود شبدیزِ ما

اور وہ مدعا یہ ہے کہ ؎

تا نہ خیزد بانگِ حق از عالمے　　گر مسلمانی نیاسائی دمے

لیکن اس مسلمانی کے صحیح معنی یہ ہیں کہ ؎

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو　　اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

مشرق کے لئے اُس کا "پیام" تجدید حیات ہے لیکن عشق و محبت کے ساتھ: ؎

بیا اے عشق اے رمزِ دلِ ما　　بیا اے کشتِ ما اے حاصلِ ما

کہن گشتند ایں خاکی نہاداں　　دگر آدم بنا کُن از دلِ ما

جو نقاد اس بات کے شاکی ہیں کہ اقبال کے کلام میں نغمے کی کمی ہے وہ "پیامِ مشرق" پر ایک نظر ڈالیں: ۔

چہ خوش ست زندگی را ہمہ سوز و ساز کردن　　دلِ کوہ و دشت و صحرا بہ دمے گداز کردن

ز قفس درے کشادن بہ فضائے گلستانے　　رہِ آسماں نوردن بہ ستارہ راز کردن

فصلِ بہار کی آمد دیکھو ؎

(۱)

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابرِ بہار

مستِ ترنم ہزار

طوطی و درّاج و سار

بر طرفِ جوئبار

کشتِ گُل و لالہ زار

چشم تماشا بیار

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابرِ بہار

(۲)

خیز کہ در باغ و راغ قافلۂ گُل رسید

بادِ بہاراں وزید
مرغ نوا آفرید
لالہ گریباں درید
حسن گل تازہ چید
عشق غم نو خرید
خیز کہ در باغ و راغ قافلۂ گل رسید

کشمیر جنت نظیر کی تصویر یوں کھینچی ہے:

رخت بہ کاشمر کشا کوہ و تل و دمن نگر | سبزہ جہاں جہاں ببیں لالہ چمن چمن نگر
بادِ بہار موج موج مرغ بہار فوج فوج | صلصل و سار زوج زوج بر سرِ نارون نگر

ستاروں کا گیت کس قدر دلکش ہے

ہستیٔ ما نظامِ ما | مستیٔ ما خرامِ ما | گردشِ بے مقامِ ما | زندگیٔ دوامِ ما
دورِ فلک بکامِ ما می نگریم و می رویم

گرمیٔ کارزارہا | خامیٔ پختہ کارہا | تاج و سریر و دارہا | خواریٔ شہریارہا
بازیٔ روزگارہا می نگریم و می رویم

خواجہ ز سروری گزشت | بندہ ز چاکری گزشت | زاری و قیصری گزشت | دورِ سکندری گزشت
شیوۂ بت گری گزشت می نگریم و می رویم

بیشِ تو نزدِ ما کمے | سالِ تو نزدِ ما دمے | اے بکنارِ تو یمے | ساختۂ بہ شبنمے
ما بہ تلاشِ عالمے می نگریم و می رویم

"زبور عجم" میں شاعر بیداری کا پیام دیتا ہے

اے غنچۂ خوابیدہ چو نرگس نگراں خیز | کاشانۂ ما رفت بہ تاراجِ غماں خیز
از نالۂ مرغِ چمن از بانگِ اذاں خیز | از گرمیٔ ہنگامۂ آتش نفساں خیز
از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز۔

فریاد ز افرنگ و دل آویزیٔ افرنگ — فریاد ز شیرینی و پرویزیٔ افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ — معمارِ حرم! باز بہ تعمیرِ حرم خیز
از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز

اور پھر انقلاب کا نعرہ بلند کرتا ہے :

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب — از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب!
انقلاب اے انقلاب!
من درونِ شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام — آں چناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب
انقلاب!
انقلاب اے انقلاب!

جاوید نامہ میں ہمارا شاعر عالمِ فلکی کی سیر کرتا ہے اور رُوحوں سے قمر اور عطارد اور زہرہ اور مریخ اور مُشتری اور زحل میں اور "آنسوئے افلاک" میں ملاقات کرتا ہے۔

کتاب کا دیباچہ یہ ہے :

خیالِ من بہ تماشائے آسماں بُود است — بدوشِ ماہ و بہ آغوشِ کہکشاں بُود است
گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمنِ ماست — کہ ہر ستارہ جہان است یا جہاں بُود است

زُحل کی منحوس فضا میں شاعر رُوحِ ہندوستان کو نالہ و فریاد کرتے سُنتا ہے :

شمعِ جاں افسرد در فانوسِ ہند — ہندیاں بیگانہ از ناموسِ ہند
مردکِ نامحرم از اسرارِ خویش — زخمۂ خود کم زند بر تارِ خویش
بر زمانِ رفتہ می بندد نظر — ز آتشِ افسردہ می سوزد جگر

اور اُس سے کہتا ہے کہ

بگذر از فقرے کہ عریانی دہد — اے خنک فقرے کہ سلطانی دہد

الحذر از جبر و ہم از خوئے صبر ‏ ‏ جابر و مجبور را زہر است جبر

ایں بہ صبرِ پیہمے خوگر شود ‏ ‏ آں بہ جبرِ پیہمے خوگر شود

ہر دو را ذوقِ ستم گردد فزوں

وردِ من یَا لَیْتَ قَوْمِی یَعْلَمُوْن

آخری فارسی نظم "مسافر" (مطبوعہ ۱۹۳۴ء) سیاحتِ چند روزہ افغانستان کا ثمر ہے۔ اقوامِ سرحد سے خطاب کرتے ہوئے شاعر پھر اپنے سازِ خودی کو چھیڑتا ہے:-

چیست دیں؟ دریافتن اسرارِ خویش

زندگی مرگ است بے دیدارِ خویش

آخری دیوان ضربِ کلیم کی آخری غزل کا مطلع ہے:-

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی ‏ ‏ یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی

اور آخری شعر یعنی اقبال کا تازہ ترین کلام یہ ہے:-

صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے حریف اُس کا ‏ ‏ تلوار ہے تیزی میں صہبائے مسلمانی!

بشیر احمد

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو

اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

م اقبال

بسنت

پھر نسیم جا بجا فرشِ گُل بچھا گئی — پھر بہار پھول کو تخت پر بٹھا گئی
پھر نویدِ زندگی سب کو گُدگُدا گئی — پھر ادائے دلبری معجزہ دِکھا گئی
پھر بسنت کی ہوا ہر چمن میں آگئی

پھر ہُوا ہے خیمہ زن کاروانِ رنگ و بُو — پھر کلی کے لب پہ ہے داستانِ رنگ و بُو
پھر زمینِ باغ ہے آسمانِ رنگ و بُو — پھر ہے نخلِ طور پر آشیانِ رنگ و بُو
پھر بسنت کی ہوا ہر چمن میں آگئی

پھر مرے کریم نے گنجِ زر لُٹا دیا — پھر چمن کے فرش کو عرش پر بٹھا دیا
پھر جہانِ آرزو دِل رُبا بنا دیا — پھر حریمِ ناز کو آئینہ دِکھا دیا
پھر بسنت کی ہوا ہر چمن میں آگئی

پھر سرُور کی گھٹا چھا گئی ہے چار سُو — پھر فضائے دہر میں دلکشی ہے چار سُو
پھر صدائے وَاشْرَبُوا گونجتی ہے چار سُو — پھر طرب ہے جا بجا پھر خوشی ہے چار سُو
پھر بسنت کی ہوا ہر چمن میں آگئی

پھر خمارِ زندگی کیف میں بدل گیا — پھر سرُورِ بیخودی جھومتا نکل گیا
پھر فسونِ فصلِ گل میکشوں پہ چل گیا — پھر عقیق دیکھئے بوتلوں میں ڈھل گیا
پھر بسنت کی ہوا ہر چمن میں آگئی

جوشؔ ملسیانی

شیریں کا سبق

شیریں۔ ماسٹر صاحب! میرے ایک نوجوان دوست کا یہ خط آیا ہے۔ پڑھئے اور مجھے مشورہ دیجئے۔

(ماسٹر خط پڑھتا ہے)

شیریں! تمہارے لئے کبھی کچھ نہ کر سکا۔ میرے پاس دن نہیں ہیں صرف نیند سے خالی چند راتیں ہیں وہ تمہاری نذر ہیں۔۔۔۔

(ماسٹر خط پڑھنا چھوڑ دیتا ہے)

ماسٹر۔ تمہارا نام شیریں تو نہیں اس نے تمہیں یہ نام کیسے دیا؟

شیریں۔ ایک دن یونہی کسی چاء پارٹی میں یہ نوجوان بھیڑ میں سے کھسکتا ہُوا میرے پاس آ نکلا، تعارف ہُوا نہ تھا میں کچھ ہچکچا سی رہی تھی کہ یہ نوجوان بالکل بے تکلفی سے پوچھنے لگا "آپ کا نام شیریں ہے نا؟" مجھ سے کچھ جواب بن نہ پڑا اور یہ حضرت بغیر جواب کا انتظار کئے کہنے لگے "شیریں! یہاں بھیڑ میں دبکے رہنے سے باغ میں پھرنا بہتر ہے۔" میں پھر بھی چپ تھی کہ اتنے میں کسی لیڈی نے تعارف کی رسم ادا کر دی۔ اس دن سے وہ مجھے شیریں ہی کہتا ہے شیریں ہی لکھتا ہے مگر آپ باقی خط تو پڑھئے۔

ماسٹر۔ میں اس قسم کے لغو خط نہیں پڑھتا۔ سبق شروع کرو۔

شیریں۔ جی بہت اچھا۔ یہ اس کتاب میں کیا لکھا ہے کہ اپنے آپ کو جانو۔ اپنے آپ کے انجان کون ہے؟

ماسٹر۔ کتاب کا مطلب یہ ہے کہ دِل کی نقاب ہٹاؤ۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ زبان کھولنے سے دِل کا گھونگٹ بھی کھُل جاتا ہے، یہ غلط ہے۔ عام طور پر جتنی زبان کھُلتی ہے دل اتنا ہی زیادہ اور چھُپتا ہے۔

شیریں۔ وہ پُرانے زمانے کے دل ہوں گے۔ آج کل تو ہم لوگ دل میں کوئی بات رکھتے نہیں۔

ماسٹر۔ افسوس ہے کہ تم میں سوچنے کا مادہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔

شیریں۔ مگر سوچنے سے کیا فائدہ؛ جو بات ہوئی وہ صاف صاف کہہ دی۔ جو سمجھ میں نہ آئے اس کے لئے انسان کیوں مغز ماری کرے۔ خواہ مخواہ کیوں زندگی کو مداری کا کھیل بنایا جائے کہ ایک بکس کے اندر دوسرا اور دوسرے کے اندر تیسرا۔ دل میں پیار آیا پیار کر لیا، نفرت ہوئی نفرت کا اظہار کر دیا۔

ماسٹر۔ میں تمہارے ابا سے کہہ دُوں گا کہ مجھ سے یہ لڑکی کچھ نہیں سیکھتی۔

شیریں۔ شوق سے کہہ دیجئے۔ آخر آپ سکھاتے کیا ہیں؛ یہی نا کہ اگلے لوگ یہ کرتے تھے اور یوں رہتے تھے! کرتے

ہونگے مگر مجھے اس جھنجھٹ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ جوان کے جی میں آیا وہ کر گئے جو ہمارے جی میں آئے گا ہم کریں گے۔ نہ انہوں نے ہم سے پوچھا نہ ہم اُن سے پوچھیں۔

ماسٹر۔ گویا تمہارے خیال میں علم ایک فضول چیز ہے۔ جب تمہارا یہ خیال ہے تو میں تمہارا اخلاقیات کا علم کیا سکھاؤں؟

شیریں۔ جس طرح کا علم آپ علم بیان فرماتے ہیں وہ تو فضول ہی نظر آتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ مجھے اس خط کا اخلاقی جواب لکھنا آجائے۔ آپ فرماتے ہیں کہ دل کو بے نقاب کرو۔

ماسٹر۔ تمہارا دل کیا جواب لکھنے کو کہتا ہے؟

شیریں۔ اگر آپ سے نہ پوچھا ہوتا تو میں صاف لکھ دیتی کہ مجھے ایسی فضول باتیں نہیں آتیں۔ پوری نیند سوتی ہوں۔ تم ورزش کرو یا علاج کراؤ۔ ہاں اور یہ بھی لکھ دیتی کہ سنیما کم جایا کرو۔

ماسٹر۔ تم میرے لئے بالکل معما ہو۔ میں تمہیں کوئی مشورہ نہ دوں گا۔ پڑھنا ہے تو پڑھو نہیں تو بیہودہ وقت مت ضائع کرو۔

شیریں۔ پڑھنا تو میں چاہتی ہوں مگر ایسا پڑھنا جو میرے جاگتے کے خوابوں کی آرزوؤں میں کامیاب ہونے میں مدد دے۔ نہ ایسا پڑھنا کہ مجھے ابھی سے بڑھیا بنا دے۔

ماسٹر۔ تمہیں زندگی کا کچھ بھی علم نہیں۔

شیریں۔ اچھا نہ سہی مگر آپ ہی زندگی کی تعریف فرما دیجئے۔

ماسٹر۔ زندگی کی تعریف تو بہت مشکل ہے۔ یوں سمجھ لو کہ تم زندہ ہو اور یہ پیتل کی میز زندہ نہیں۔

شیریں۔ اس سے اچھی تعریف تو میں کر دوں۔

ماسٹر۔ کرو تو جانوں۔

شیریں۔ سنئے۔ زندگی شوخی کا وہ نشہ ہے جو پتلی سبز شاخ سے سُرخ گلاب کا پھول نکالتا ہے۔

ماسٹر۔ اچھی تعریف ہے کہاں سے سیکھی۔

شیریں۔ سیکھنے سے تو خاک نہیں آتا۔ خود بخود دل سے ابھی پیدا ہو گئی۔

ماسٹر۔ کیا ان حضرت کے علاوہ اور بھی تمہارے نوجوان دوست ہیں۔

شیریں۔ کئی ہیں مگر اس نوجوان میں یہ خصوصیت ہے کہ بڑے مزہ سے جھڑک دیتا ہے۔

ماسٹر۔ مثلاً

شیریں۔ مثلاً وہی سوال جو آپ نے کیا تھا ان سے بھی کیا کہ اس کا کیا مطلب ہے کہ اپنے آپ کو جانو؛ چھوٹتے ہی بولا کہ "اپنے

آپ کو جانو کہ تم اُلو ہو اور اُلو ہی رہو گی "۔

ماسٹر۔ اس جواب سے تمہیں غصہ نہ آیا ؟

شیریں۔ غصہ کی کیا بات تھی ! (کچھ تامل کے بعد) اوہو۔ اب میں سمجھی۔ جن لوگوں کی اخلاقی تعلیم آپ مجھے سکھا رہے ہیں انہیں غصہ بہت آتا تھا۔ کوئی ذرا کچھ کہہ دے تو پشتوں تک قبائل میں عداوتیں قیامت ڈھاتی تھیں۔

ہاں اور اب میں سمجھی کہ تبھی آپ کی اخلاقی تعلیم میں سوچ کر بات کرنے پر اس قدر زور رہے۔ ہم آجکل کے نوجوان اس قدر صاف دل ہیں کہ کوئی سوچ کر بات کرے تب بھی ہمیں غصہ نہیں آتا۔ یہ سمجھ کر کہ بات کرنے کا شعور نہیں درگزر کر دیتے ہیں۔ ناولوں میں البتہ دغاشعار لوگ بہت سوچ سمجھ کر بات کرتے ہیں اور جس انسان کو جرم کرنا ہو اسے واقعی سوچ کر ہی قدم دھرنا چاہئے مگر ہم جیسوں کو جن کو غصہ نہ ہو کینہ نہ ہو سوچنے سے کیا غرض، ہم تو خوش رہنے خوش رکھنے کے لئے ہیں۔

ماسٹر۔ کیا واقعی آج کل کی نوخیز ہستیوں میں غصہ کم ہے۔

شیریں۔ جی ہاں، کم کیا، ہے ہی نہیں۔ ہم لوگ تو ہنستے مسکراتے رہتے ہیں۔ کبھی کسی کو غصہ ہوتے دیکھا ہی نہیں۔

ماسٹر۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو واقعی کمال کی ترقی ہے لیکن یہ تو بتاؤ کہ اگر تمہارے ابا کو پتہ چل جائے کہ تمہیں اس قسم کے خط آتے ہیں تو پھر۔

شیریں۔ (ہنس کر) ماسٹر صاحب آپ عجیب نقطۂ خیال کے مالک ہیں۔

ماسٹر۔ کیوں ؟

شیریں۔ کیا ابا نے شباب میں اس قسم کے خط نہ لکھے ہوں گے ؛ اچھے خاصے فیشن ایبل ہیں۔ کیا تعجب ہے کہ اب بھی لکھتے ہوں۔ خدانخواستہ بوڑھے نہیں ہو گئے۔

ماسٹر۔ (طیش میں آکر) لاحول ولا قوۃ۔ تم بہت سخت زبان دراز ہو۔

شیریں۔ ماسٹر صاحب۔ ترشروئی کی کیا بات ہے۔ مہربانی کر کے مجھے آرام سے سمجھائیے۔ آپ تو اخلاقیات کے معلم ہیں۔

ماسٹر۔ آرام سے تمہیں کیا سمجھاؤں کہ تمہیں اتنا بھی علم نہیں کہ آج سے پچاس برس پہلے تو یہ خیال بھی ناممکن تھا کہ کسی شریف زادی کو محبت کا خط لکھا جائے۔

شیریں۔ تو کیا اس زمانے کے لوگ صرف بدذاتوں سے ہی محبت کرتے تھے۔ بڑے مزہ میں تھے اس زمانے کے بدذات اور بڑے بدمعاش تھے اس زمانے کے شریف۔

ماسٹر۔ تم ہر بات کو غلط طور پر پلٹ لیتی ہو۔

شیریں۔ میری غلطی ہو تو معاف کر دیجئے مگر کیا یہ واقعی صحیح ہے کہ میرے ابا کو کبھی پیار کا خط لکھنے کا موقع نہ ملا تھا۔
ماسٹر۔ بیس سال تو ان کی شادی کو ہو چکے۔ چالیس سال کی ان کی عمر ہے۔ مجھے تو یقین نہیں آتا کہ اُنہوں نے اس قسم کی کج اخلاقی کی ہو۔
شیریں۔ (زیر لب انگریزی میں) Poor dear! I must love him more than ever.
ماسٹر۔ (نہ سمجھ کر) کیا کہا؛
شیریں۔ کچھ نہیں۔ ہم لوگوں کی دُہری ذمہ داری ہے۔ وہ مسرتیں جو ہمارے بزرگ کھو چکے زندہ کریں اور وہ غصّہ اور جھوٹ کی عادتیں جو زندہ ہیں انہیں دفن کریں۔

"فلک پیما"

اعجازِ بہار

بہشتوں سے چلی اِک ساحرہ مسحور کرنے کو
طلسمِ یاس کو بزمِ جہاں سے دُور کرنے کو

ادا و ناز سے مستانی دُھن میں جھومتی گاتی
سُہانی مسکراہٹ سے خوشی کے پھول برساتی

عجب انداز سے دکھلاتی اعجازِ مسیحائی
زمیں پر آسمانوں سے وہ مستِ ناز اُتر آئی

حیاتِ نَو عطا کی خشک و پژمردہ زمینوں کو
سجایا سبزہ و گُل سے پہاڑوں کی جبینوں کو

گلستانِ جہاں کو رشکِ جنّت کر دیا یکسر
فضا کو اور ہوا کو بوئے گُل سے بھر دیا یکسر

اُتارے تاج برفانی سروں سے کوہساروں نے
ترانے چھیڑے ہیں مدھم سُروں سے ودباروں نے

عیاں ہر چارسُو سے فیضِ اعجازِ بہاری ہے
کہ گلبانگِ عنادل نغمۂ سازِ بہاری ہے

تاجور سامری

ہونے دے بدنام

شیش محل میں رقصاں ہے وہ دیکھو اِک گلفام
وہ جس کے ہر زمِ تبسّم سے خنداں ہے جام
مینا کی قلقل میں سنتا ہوں اُس کا پیغام
اب کیا فکرِ فردا مجھ کو اور غمِ انجام
ہوتا ہوں بدنام۔ تو اچھا۔ ہونے دے بدنام

بجلی بن کر کیف کی دیوی۔ میخانوں میں رقصاں
مستانی۔ الھڑ دوشیزہ بستانوں میں رقصاں
جلتی پھرتی آگ کے شعلے۔ پیمانوں میں رقصاں
ساقی بھی ہے۔ اور ساون کی بھیگی بھیگی شام
ہوتا ہوں بدنام۔ تو اچھا۔ ہونے دے بدنام

میخانے کی چوکھٹ ہی پر ہو اِک خون پسینا
دُرد ملے۔ یا باقی ساقی! جو مِل جائے پینا
میخانے میں مرنا ساقی۔ میخانے میں جینا
میخواروں کے زمرہ میں تو لکھ لے میرا نام
ہوتا ہوں بدنام۔ تو اچھا۔ ہونے دے بدنام

تو ساقی۔ تو جام۔ صراحی۔ تُو مے اور میخانہ
تیرا پیکر کیف کی دُنیا اور آنکھیں مستانہ
جس میں مدھرا پریم کی جھومے وہ ہنستا پیمانہ
میں پیاسا ہوں۔ اس مدرا سے بھر دے میرا جام
ہوتا ہوں بدنام۔ تو اچھا۔ ہونے دے بدنام

منظور

آجکل کا لاہور

ذیل میں پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کی وہ تقریر درج ہے جو اُنھوں نے ۲۴ جنوری کی شام کو لاہور ریڈیو سٹیشن سے نشر کی۔

الف لیلہ میں جو سوتے جاگتے کا قصہ ہے وہ اکثر لوگوں نے سُنا ہوگا۔ اگر لاہور کا کوئی باشندہ آج سے اسی نوے برس پہلے سکھوں کے عہدِ حکومت میں گہری نیند سو جاتا اور اس کی آنکھ اس ۱۹۳۸ء میں آکر کُھلتی تو اُسے بار بار آنکھیں ملنے پر بھی اپنی بیداری کا یقین نہ ہوتا۔ چھ سو چالیس ایکڑ زمین کی جس بستی میں وہ سویا تھا وہ اس کے آنکھ کھولتے کھولتے پُرانی کہانیوں کے بھُوتوں کی طرح اِس قدر پھَیل چکی ہے کہ دس بیس نہیں، چالیس پچاس مربع میل پر چھا گئی ہے۔ شہر کے اردگرد جو میدان اور کھیت تھے وہ غائب ہیں اور ان کے بجائے صاف سُتھری سڑکوں کا ایک جال بچھا ہُوا ہے۔ مزنگ کا پُرانا قصبہ کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ وہ اب شہر کا ایک محلّہ ہے۔ نواب محمد قاسم خاں کا مقبرہ جہاں کبھی اکھاڑے جمتے تھے اور جہاں شہر کے من چلے دو تین میل باہر آکر کسرت کرنے کے لئے جمع ہوتے تھے، اب لاہور کے حاکم کا محل ہے اور لوگ اسے "لاٹ صاحب کی کوٹھی" کہتے ہیں۔ غرضکہ ہمارے سونے والے کو آنکھ کھولتے ہی ایک نئی زمین اور نیا آسمان نظر آتا کیونکہ ہوا میں بھی اب اُس کے اپنے ہی بھائی بند کوّوں اور چیلوں کی طرح اُڑتے پھرتے ہیں۔ البتہ شہر کے اندرونی حِصّے میں جا کر اُس کی کچھ ڈھارس بندھتی۔ جو پیچ دار اور تنگ گلیاں وہ چھوڑ گیا تھا۔ وہ ابھی اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ ان میں سے بعض کی تنگی کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ یہ انسان کے گزرنے کے لئے نہیں، اُس کے پھنس جانے کے لئے بنائی گئی ہیں۔ اِن گلیوں میں پھیری یا خوانچے والا آتا ہے تو عورتیں اور بچے سودا خریدنے کے لئے مکانوں کی اوپر کی کھڑکیوں میں سے چھینکے لٹکاتے ہیں۔ پاپڑ اور پُوری، چنا اور ریوڑی، ہر چیز اسی ذریعے سے اوپر پہنچتی ہے۔

ہمارا لمبی نیند سونے والا ایک اور چیز کو بھی دیکھ کر خوش ہوگا وہ یہ کہ مغلوں کی شاندار اور خوبصورت عمارتیں اور مسجدیں بڑی حد تک اُسی طرح کھڑی ہیں جس طرح سونے سے پہلے اُس نے اُنہیں دیکھا تھا۔ شہر کا کوئی حِصّہ ایسا نہیں جہاں قریب ہی کہیں مغلیہ عہد کی کوئی مسجد یا باغ یا مقبرہ یا کوئی اور یادگار نہ ہو۔ سچ پوچھئے تو لاہور کی رونق اور خوبصورتی کو پہلے پہل مغلوں ہی نے چار چاند لگائے، ورنہ اکبر کے زمانے سے پہلے لاہور کی حیثیت چند بکھرے ہوئے دیہات سے زیادہ نہ تھی۔ مثلاً چودھویں صدی کے وسط میں جب مشہور سیّاح ابن بطوطہ ہندوستان آیا تو اس نے لاہور کو اس قابل بھی نہ سمجھا کہ سیر کے لئے اِدھر سے گزرتا جائے۔ اسی طرح ڈیڑھ سو سال بعد شہنشاہ بابر نے اپنی "تزک" لکھی تو اس نے لاہور کا ذکر تک نہیں کیا۔ حالانکہ سمرقند، کابل اور دِلّی کی تعریف کرتے اُس کا قلم نہیں تھکتا۔ اکبر

کی تخت نشینی کے بعد جو ایک صدی گزری اُس میں لاہور کی شہرت مشرق سے لے کر مغرب تک پھیل گئی۔ ذرا غور کیجئے کہ ایک تو وہ دن تھے جب ابن بطوطہ نے تمام ہندوستان کی سیر و سیاحت کے باوجود لاہور کو اپنی آمد کا شرف نہ بخشا، اور ایک وہ دن بھی آیا کہ انگلستان کے مشہور شاعر ملٹن نے اورنگ زیب کے زمانے میں جب اپنی مشہور نظم (Paradise Lost) لکھی تو اُس میں ایک مقام جہاں میکائیل اور آدم باغ فردوس کی ایک بلند پہاڑی سے زمین کے پھیلتے ہوئے میدانوں پر نظر ڈالتے ہیں، وہاں شاعر کی نگاہ لاہور کو آگرے کے پہلو بہ پہلو مغلیہ شان و شوکت کا نمونہ قرار دیتی ہے۔

یہ اکبر اور اُس کے تین جانشینوں ہی کی توجہ کا نتیجہ ہے کہ زمانہ حال کا لاہور قدرتی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے:۔ مغلیہ لاہور اور انگریزی لاہور۔ مغلیہ لاہور وہ ہے جو سرکلر روڈ کے اندر آباد ہے اگرچہ اُس کے آثار عمارتوں، مقبروں اور باغات کی شکل میں شہر کے گرد کئی کئی میل تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اکبر نے اس کے چاروں طرف اینٹوں کی ایک پختہ دیوار تعمیر کرائی تھی۔ جو تقریباً پندرہ فٹ بلند اور تین میل کے قریب لمبی تھی۔ اس دیوار کے شکستہ آثار شہر کے شمالی حصے میں اب بھی نظر آتے ہیں۔ شہر پناہ سے باہر شہر کے گرد ایک خندق تھی جو بعد میں بھروا دی گئی ہے۔ اس خندق کی جگہ پر، شہر کے تقریباً چاروں طرف خوشنما اور شاداب باغ لگا دیئے گئے ہیں شہر کا صرف وہ گوشہ جو قلعہ کی جانب ہے۔ سبزے کے تختوں اور سایہ دار درختوں کے حاشیے سے خالی ہے۔

سکھوں کے زمانے کے بعد گزشتہ صدی کے وسط میں جب لاہور پر انگریزی عملداری قائم ہوئی تو لاہور کے بازاروں کی عجیب حالت تھی۔ کوئی محکمۂ صفائی مقرر نہ تھا۔ کوچوں اور بازاروں میں کوڑیاں اور مَیلے کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ محلوں میں جا بجا مردہ کتوں اور بلیوں کی لاشیں پڑی سڑتی تھیں۔ اور برسات میں بارانِ رحمت کے ریلوں کا بہاؤ ہی غلاظت کے اس انبار کی صفائی کرتا تھا بازاروں کی نالیاں بیچ میں تھیں جن کی وجہ سے بہت کیچڑ رہتی تھی۔ اُمرا جب اپنے گھوڑوں ہاتھیوں پر سوار ہو کر نکلتے اور ان جانوروں کے سُم بازار کی موریوں میں پڑتے تو اتنی چھینٹیں اُڑتی تھیں کہ بارہا راہگیروں کے کپڑے لت پت ہو جاتے۔ ۱۸۵۰ء میں انگریزوں نے شہر کی اصلاح پر توجہ شروع کی۔ بازاروں کی درمیانی موریاں موقوف ہوئیں اور ماہی پشت فرش باندھے گئے۔ تقریباً تیس برس بعد جب واٹر ورکس کا انتظام ہوا تو بازاروں سے اینٹوں کے فرش اُکھڑوا دیئے گئے اور کنکر کوٹ کر نئی سڑکیں تیار ہوئیں۔

انگریزی قبضے کے بعد شہر لاہور نے جنوب کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ سب سے پہلی توسیع فوجی ضروریات کے لئے ہوئی۔ انارکلی کے مقام پر انگریزی فوج کی چھاؤنی تیار ہونے لگی۔ یہ میاں میر کا نقش اوّل تھا۔ بارکیں اور کوٹھیاں تعمیر ہوئیں اور ایک پختہ بازار تیار ہوا۔ جسے صدر بازار کہتے تھے۔ یہ ہمارا موجودہ انارکلی بازار ہے۔ جلد ہی انگریزوں نے دیکھا کہ انارکلی کا میدان فوج کی ضروریات کے لئے کافی نہیں ہے۔ چنانچہ چھاؤنی میاں میر میں منتقل ہوئی اور فوجی بارکیں سرکاری دفتروں اور محکموں کے کام آنے لگیں۔ انہیں میں سے ایک چھوٹی سی بارک ۱۸۵۳ء میں لاہور کے پاگل خانے کے طور پر استعمال ہونے لگی۔ اب ٹھیک اسی پاگل خانے کے موقع پر پنجاب کا یونیورسٹی ہال اور یونیورسٹی کا کیمیائی تجربہ خانہ ہے۔ گورنمنٹ کالج کا افتتاح آج سے تقریباً ۷۵ برس قبل ہیرا منڈی میں ہوا۔ جب اجہ

دھیان سنگھ کی حویلی سے کالج کی عمارت کا کام لیا گیا۔ چودہ پندرہ برس بعد یہ کالج اپنی موجودہ خوبصورت عمارت میں منتقل ہو گیا۔ انگریزی دَور کے آغاز کے بعد انارکلی کے علاقے میں وزیر خاں کی بارہ دری جس کے ساتھ ایک باغ بھی شامل تھا، مختلف طریقوں پر استعمال ہوتی رہی۔ آخر میں اس نے کچھ عرصے تک انارکلی کے یورپین باشندوں کے لئے بُک کلب کا کام دیا۔ آج کل ہم اسے پنجاب پبلک لائبریری کہتے ہیں۔

اب لاہور کی ٹھنڈی سڑک کی داستان بھی سُن لیجئے۔ ۱۸۵۱ء میں یہ تجویز ہوئی کہ انارکلی سے میانمیر تک ایک سیدھی سڑک تیار کی جائے۔ شروع شروع میں اس سڑک کے دونوں طرف وہ شاندار اور خوبصورت عمارتیں نہ تھیں جن پر نیا لاہور آج کل فخر کرتا ہے۔ اس سڑک کے آس پاس اُس وقت زیادہ تر بنجر میدان تھے۔ جس میدان میں اب ہائی کورٹ کی عمارت اور اُس کے دلکشا مینارے نظر آتے ہیں اُس کے قریب صرف ایک عمارت یعنی شاہ چراغ کی مسجد تھی اس سے آگے سڑک کے دونوں طرف اچھے خاصے فاصلے تک کھیت ہی کھیت نظر آتے تھے۔ یہی سڑک بعد میں مال روڈ کے نام سے مشہور ہوئی۔ لیکن اُس وقت یہ لارنس روڈ کہلاتی تھی۔ اُس زمانے میں اصلی مال روڈ موجودہ لوئر مال تھی۔ اِسی کے قرب و جوار میں لاہور کی یورپین سوسائٹی اپنے ہنگامے گرم رکھتی تھی اور گول باغ میں اسی طرح بینڈ بجتا تھا جس طرح اب لارنس گارڈن میں بجتا ہے۔

غرض اس طریقے پر آہستہ آہستہ مغلیہ لاہور کے ساتھ انگریزی لاہور کا پیوند لگتا گیا۔ شہر کے مشرق میں ریلوے سٹیشن قائم ہوا اور ریلوے کی بستی کئی میل میں پھیل گئی۔ جنوب میں سول سٹیشن کی رونق اور وسعت میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ یورپین آبادی لارنس گارڈن کو عبور کر کے نہر کے کنارے تک پہنچ گئی جہاں انگریزوں اور خوش حال ہندوستانیوں کے رہنے کی کوٹھیاں اپنی دلکشی اور نفاست کے لئے اپنی نظیر آپ ہیں۔ فنِ تعمیر کے لحاظ سے انگریزی عہد کی عمارتوں میں بہت سی عمارات قابلِ دید ہیں میکلوڈ روڈ اور بالخصوص ٹھنڈی سڑک پر ان عمارتوں کی کثرت ہے اور ان میں سال بسال اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اچھی مثالوں کے طور پر بڑا کیتھولک گرجا یا اورینٹل بلڈنگ دیکھئے۔ اسی طرح لکشمی مینشنز کا ماتھا یا چیئرنگ کراس کے تھانے کی محراب لاہور میں اپنی قسم کی نئی چیزیں ہیں۔

یہ تو یورپین لاہور کے پھیلاؤ کی کیفیت تھی۔ لیکن لاہور کا ہندوستانی حصّہ بھی اس معاملے میں پیچھے نہیں رہا بلکہ بہت زیادہ سرگرم ثابت ہوا ہے۔ پچاس برس پہلے لاہور کی آبادی لاکھ ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ اب ساڑھے چار لاکھ کو پہنچ گئی ہے اور ابھی اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ اضافہ محض شرحِ پیدائش کی زیادتی کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ باہر کے لوگ اس کثرت سے آ کر لاہور میں آباد ہوئے ہیں کہ اُن کی آبادی کا تناسب تقریباً ساڑھے چار سَو فی مربع میل تک پہنچ گیا ہے۔ اندرونِ شہر کی آبادی اس قدر گنجان ہے کہ وہاں ایک ایکڑ زمین تقریباً سوا دو سَو اشخاص کے حصّے میں آ رہی ہے۔ اِن حالات میں شہر کا اپنی قدیم حدود سے باہر پھیلنے لگنا بالکل قدرتی تھا۔ پچاس ساٹھ برس پہلے اکبری دروازے کے باہر کوئی آبادی نہ تھی۔ اب بہت سے آباد محلّے اور گلیاں سٹیشن تک پھیل گئی ہیں۔ ریلوے سٹیشن سے لُہاری دروازے کو اسلامیہ کالج کے پاس سے جو سڑک جاتی ہے اور جسے اب عام طور

پر برینڈرتھ روڈ کہا جاتا ہے۔ اُس کی یہ حالت تھی کہ رات کے وقت کوئی اکّا دُکا اُس پر سے گزرنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ اُس وقت نہ کالج تھا نہ سڑک کے دونوں طرف عمارتیں۔ کیلے کے گھنے درختوں کی قطاریں دونوں طرف کھڑی تھیں۔ اور یہ سڑک کیلوں والی سڑک کہلاتی تھی۔ رفتہ رفتہ شہر کے مضافات گنجان محلوں میں تبدیل ہونے لگے۔ جہاں خالی میدان تھے وہاں کرشن نگر اور محمد نگر، رام گلی اور اسلام گلی میں چلتی پھرتی زندگی کے جلوے نظر آنے لگے۔ اب لاہور کی آبادی شمال میں فاروق گنج مصری شاہ اور فیض باغ سے بہت آگے نکل گئی ہے۔ مغرب اور جنوب میں اس کا قدم قصور پورے اور کرشن نگر سے آگے بڑھتا نظر آتا ہے جو لوگ لاہور کی تنگی فضا کی تاب نہ لاسکے۔ اُنھوں نے لاہور سے سات میل جنوب کی طرف ایک چھوٹے سے صاف سُتھرے شہر کی بنیاد ڈال دی جسے ماڈل ٹاؤن کہتے ہیں۔ ماڈل ٹاؤن کے خوبصورت نکھرتے ہوئے بنگلوں نے اسے لاہور کے قابلِ دید مقامات میں شامل کردیا ہے۔ بعد میں لاہور اور ماڈل ٹاؤن کے درمیان مسلم ٹاؤن اور گارڈن ٹاؤن کی تعمیر ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے لاہور کی آبادی کا سلسلہ برابر ماڈل ٹاؤن تک چلا جاتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اِن تمام تبدیلیوں کا لاہور کی زندگی سے کیا تعلق ہے۔ لاہور کی زندگی کے سب سے نمایاں پہلو اس کی سیاسی و تعلیمی اور علمی و ادبی سرگرمیاں ہیں۔ لاہور سے کم از کم اُردو کے اتنے اخبارات و رسائل شائع ہورہے ہیں جتنے ہندوستان کے اور کسی شہر سے نہیں ہوتے۔ ایڈیٹروں کی وہ بہتات ہے کہ بعض دفعہ امنِ عامہ خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ شہر کے بے شمار مدرسوں سے قطع نظر کالجوں کی تعداد چھبیس ہے۔ جو کالج شاعری سکھاتے، دین دھرم کا پرچار کرتے یا موسیقی کے سُر الاپتے ہیں وہ اِن چھبیس کالجوں کے علاوہ ہیں۔ اسی سلسلہ میں چند اور اعداد و شمار سنئے:۔

ہسپتال ــــــ پندرہ

بنک ــــــ اکتیس

بیمہ کمپنیاں ــــــ تنتیس

چھاپہ خانے ــــــ اُنتیس

مختلف سوسائٹیاں اور سبھائیں وغیرہ ساٹھ کے قریب (مگر کالجوں کی بے شمار سوسائٹیاں اِس گنتی میں شامل نہیں ہیں)۔ چودہ ہوٹل (یہ صرف بڑے بڑے ہوٹلوں کا ذکر ہے ورنہ چھوٹے ہوٹل، قہوہ خانے اور بالخصوص تنور جو لاہور کی آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کا پیٹ بھرتے ہیں اُن کا کوئی شمار ہی نہیں ہے۔)

آج سے پچیس تیس سال پہلے لاہور میں ایک بھی مستقل سینما ہاؤس نہیں تھا۔ اب سولہ سینما موجود ہیں جو بڑی حد تک لاہور کے کالجوں کے سر پر چل رہے ہیں۔ تفریح کی اور بھی کوئی نہ کوئی شکل لاہور میں ہر وقت موجود رہتی ہے۔ مثلاً گذشتہ دنوں میں منٹو پارک میں آل انڈیا نمائش جاری رہی۔ نمائش نہ بھی ہو تب بھی منٹو پارک طرح طرح کے ہنگاموں سے خالی نہیں رہتا۔ یہاں یا پریڈ کے میدان میں کبھی تو میڈیکو

کے جوڑ ہوتے ہیں، کبھی دیکھئے تو مُرغ اور تیتر اور بٹیریں چلی آتی ہیں تاکہ اپنی جوانمردی کے جوہر دکھائیں۔ کنکوے بازی کے جھگڑے الگ لگتے ہیں اور زندہ دِلانِ لاہور یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ ان کے نعرے اور جیکارے محض سیاسی لیڈروں کے اعزاز تک محدود نہیں ہوتے لاہور کے اس حِصّے کی چہل پہل کے دو مرکز اور بھی ہیں، حمام اور اکھاڑے۔ یہاں ہر معزز آدمی خلیفہ، اُستاد یا پہلوان کہلاتا ہے۔ صبح صبح کسی حمام میں چلے جائیے یا شام کو کسی اکھاڑے میں۔ لاہور کے اندرونی محلّوں اور دشوار گزار کوچوں کی مقامی سیاسیات پر بڑے بڑے جگادری خلیفے اور توندل پہلوان اُستادانہ تبصرہ کرتے نظر آئیں گے۔

یہ اُس لاہور کی تصویر کا ایک پہلو ہے جو شہر کے تیرہ دروازوں کے اندر واقع ہے۔ ان دروازوں میں سے دو کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ شاہ عالمی دروازہ جو اورنگزیب کے بیٹے شاہ عالم کے نام سے موسُوم ہے ہندوؤں کی معاشرت کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ موچی دروازہ جو دراصل نہ تو دروازہ ہے اور نہ کسی موچی سے نسبت رکھتا ہے شہر کے مسلمانوں کی زندگی کے مرقّعے دکھاتا ہے۔ شاہ عالمی دروازے میں داخل ہوتے ہی ہم ہلدی اور سونٹھ اور مہندی، قسم قسم کی بوؤں اور خوشبوؤں سے دوچار ہوتے ہیں۔ لوگوں میں ایک خاص کاروباری سلیقہ اور ضابطہ نظر آتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ بھیڑ بھاڑ کے باوجود متانت کی فضا طاری ہے۔ موچی دروازے کی بوئیں اور خوشبوئیں اِتنی چٹپٹی نہیں ہیں جتنی شاہ عالمی دروازے کی۔ تاہم جلد ہی انسان کو کھَولتے ہوئے گھی اور مٹھاس کی آمیزش کا خوشگوار احساس ہو جاتا ہے، متانت کے بجائے زندہ دلی اور قہقہے اور چہچہے زیادہ نظر آتے ہیں۔ لوگ محض گفتگو کے لطف کے لئے تنوروں اور دُکانوں کے پاس کھڑے زندگی کی نعمت کی قدر کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

کشمیری بازار یا لوہاری دروازے کے اندر کی سیر کیجئے تو بہت سے کتب فروشوں کی دُکانیں نظر آئیں گی۔ اِن میں سے بعض بہت مشہور ہیں اور بعض کم مشہور مگر سب خاموشی سے اپنا اپنا کام کئے جاتے ہیں۔ علمی اور مفید کتابیں، ادبی اور دلچسپ کتابیں، فنّی اور کارآمد کتابیں کثرت سے شائع ہوتی ہیں۔ کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی کتاب کئی کئی رُوپ بدل کر لوگوں کے سامنے آتی ہے۔ مثلاً ایک شخص نے "صابون سازی" یا "شادی نامہ" شائع کیا تو ایک دوسرے شخص نے اسی مضمون میں ہیر پھیر کر کے ایک نئی تالیف "مکمل شادی نامے" کے نام سے پیش کر دی۔ تیسرے شخص نے اسی چیز میں کچھ ادل بدل کیا اور "جدید مکمل شادی نامے" سے دُنیا کی آنکھوں کو چکا چوند کر دیا۔ مصنفوں کا تو لاہور میں کوئی شمار ہی نہیں ہے۔ اگر ہر شخص کے ماتھے پر اُس کا پیشہ لکھا ہؤا ہو تو ہر گلی کے موڑ پر آپ کو ایک آدھ بھولا بھٹکا مصنف ضرور نظر آ جائے۔ لاہور میں بے شمار ادبی انجمنیں ہیں۔ اِن میں سے اکثر ایسے ہی بزرگوں کے سہارے چل رہی ہیں۔ انہیں پر کیا موقوف ہے۔ لاہور میں ہر پیشے اور وضع و قماش کے لوگ بس رہے ہیں۔ جوہری اور گداگر، فلسفی اور دیوانے، انجنیئر اور نقب زن، شاعر اور ماہر، واعظ اور شرابی، لیڈر اور چور، پروفیسر اور طالب علم بڑی کثرت سے ملتے ہیں۔

آج کل کا لاہور جو کچھ کرتا ہے دل لگا کر کرتا ہے۔ میلوں ٹھیلوں پر طبیعت آجاتی ہے تو بسنت اور چراغاں، دسہرے اور دیوالی سے

فضا کو اس قدر جگمگا دیتا ہے جیسے دنیا کی تمام رنگینی اور خوش طبعی اسی کے حصے میں آئی ہے۔ لیڈروں کے جلوس اور جلسے اس دھوم دھام سے برپا کرتا ہے کہ سیاسی سرگرمیوں کے سوا اسے کوئی اور کام معلوم ہی نہیں ہوتا۔ شعروادب اور فلسفہ وحکمت کے میدان میں قدم رکھتا ہے تو بغداد و یونان کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ یہ تمام انقلاب گذشتہ تیس چالیس برس کی پیداوار ہے۔ اس عرصہ میں زندگی کا کوئی شعبہ اس انقلاب سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ ایک سڑکوں کی آمد و رفت ہی کو دیکھئے۔ اس صدی کے آغاز میں نہ بسیں تھیں نہ موٹر کاروں کی یہ کثرت۔ ٹانگے البتہ چلتے تھے مگر ان سے کہیں زیادہ بہوکارٹ یا ٹمٹم کا رواج تھا۔ لاہور میں پختہ عمر کے لوگوں کو وہ زمانہ ابھی یاد ہے جب بائیسکل کا رواج نیا نیا ہوا تھا۔ لوگ بائیسکل کو بڑے شوق اور تعجب سے دیکھا کرتے اور بائیسکل کے سوار کو بہت معزز سمجھتے تھے۔ اب وہ زمانے لد گئے ہیں اور بائیسکل سوار کی وہ پرانی عظمت لوگوں کے دلوں میں نہیں رہی۔ ہر ٹانگے والا اور پولیس کا سپاہی اگر چاہے تو بائیسکل والے کو "او سیکل!" کہہ کر پکار سکتا ہے جس کا نہایت ناقص اور بے رنگ اردو ترجمہ "ابے او سائیکل والے" ہوگا۔ تیس چالیس برس میں زمانہ اس قدر بدلا ہے کہ اب بھنگی اور سقے اور گھوسی کبھی کبھی جھاڑو یا مشک بغل میں دبائے یا گھاس کی گٹھڑی سر پر رکھے سڑک پر دو چرخی گھماتے اور ہوا میں فرّاٹے بھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ غرض ادنٰے سے لے کر اعلٰے تک تمام طبقے لاہور کی زندگی کی رونق اور چہل پہل کے ساتھ کوئی نہ کوئی تعلق رکھتے ہیں۔ اہلِ پنجاب کو بجا طور پر "زندہ دلانِ پنجاب" کا نام دیا گیا ہے مگر پنجاب کا دل لاہور ہے اور جو صدا اس دل سے نکلتی ہے اُس کو سارا ہندوستان سنتا ہے ؂

حمید احمد خاں

داغ - اقبال - جوش

تھی زبانِ داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے　　　لیعنی یہ لیلیٰ وہاں بے پردہ یاں محمل میں ہے

(اقبال)

اپنی کوشش سے نہیں ہے، جو فلک سیر اقبال　　　اُس کو اُوپر لئے جاتا ہے زمیں سے کوئی

(سجاد حیدر)

جو بیاں کرتا ہے حالِ دلِ مرا　　　اِس زمانے میں فقط اِک جوش ہے

(دلگیر اکبرآبادی)

غزل

خشک ہوئے جب آنکھ سے آنسو آہوں نے دل تھام لیا
حیف ہے اِس جینے پر اپنے ہم نے بھی کیا کام لیا
قسمت کتنی سیدھی ہے کیوں رشک نہ آئے حسینوں پر
گاہک بن کر نکلے لیکن جس کو لیا بے دام لیا
چلتے چلتے چونک پڑے ہم شوق تمنّا کیا کہئے
کل جو کسی نے جاتے جاتے راہ میں تیرا نام لیا
اور کوئی دل ڈھونڈا ہوتا اس دل میں کیا رکھا ہے
کیسی ہلکی چیز پہ تم نے چوری کا الزام لیا
صبر نہیں آرام نہیں پھر پہلی سی بے چینی ہے
دل نے شاید آج کسی حسرت کا دامن تھام لیا
آج تمہارے تیرِ نظر پر جان ہی دے دی بسمل نے
ناز کرو اس بخت پہ اپنے قتل کیا انعام لیا
در در دیکھا گھر گھر جھانکا بادِ صبا کے ساتھ پھرے
جب تک تیرا بھید نہ پایا ہم نے کب آرام لیا
ہم کو اُس کے لطف وکرم سے قاصد کی حاجت نہ ہوئی
آنکھوں نے پیغام سنایا آنکھوں نے پیغام لیا
اِس میں گرفت ہی کیا ہے سیفی اپنی اپنی مرضی سے
تم نے خوشی پر ہاتھ بڑھایا ہم نے غمِ ایام لیا

سیفی نوگانوی

اُردو حروفِ تہجّی کی ایک نئی ترتیب

{یہ مقالہ انجمن اُردو پنجاب کے اُس جلسے میں پڑھا گیا جو ۲۵ نومبر ۱۹۳۷ء کو زیر صدارت سید امتیاز علی تاج وائی ایم سی اے لاہور کے بورڈ روم میں منعقد ہوا۔}

چھوٹے چھوٹے بچوں کو اُردو پڑھانے اور لکھانے کے شوق کی وجہ سے مجھے محکمۂ تعلیم پنجاب اور دیگر مقامات کے منظور شدہ قاعدوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ چنانچہ میں سبق کو غور سے دیکھتا۔ اُس میں سے غیر ضروری الفاظ کو کاٹ چھانٹ کر نئے الفاظ بھر دیتا۔ اس کے علاوہ حروف کا ربط سکھلانے کے لئے مجھے ابجد کو تختیوں میں بانٹنا پڑا۔ جہاں اسباق کی ترتیب ہی غلط ہوتی وہاں بہت دقت پیش آتی جو قاعدے "ڈائرکٹ میتھڈ" پر چلتے ہیں اُن میں تو کسی نظام کو سوچنے کی تکلیف ہی نہیں کی گئی۔ حروف کے ربط کا کوئی طریقہ ہی نہیں سکھایا گیا۔ اس کے بجائے بچّوں کے حافظے پر ناگوار بوجھ ڈال دیا گیا ہے۔ چونکہ اُردو میں ایک حرف مثلاً "ب" باقی حرفوں سے ملتے وقت بہت سی مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔ اس لئے آسانی اسی میں ہو سکتی ہے کہ "ب" اور "ب" کی طرح جڑنے والے دیگر الفاظ کی تختی کا دوسرے حروف کے ساتھ ربط علیحدہ علیحدہ سبقوں میں سکھایا جائے۔ بالخصوص اُردو سیکھنے کے لئے صرف یہی طریقہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ پس تین باتیں قابلِ غور ہیں:-

۱- ابجد کی ترتیب ایسی ہو کہ حروف کا جوڑ یا ربط سمجھنے میں آسانی ہو۔

۲- اسباق اِس ترکیب سے لکھے جائیں کہ ربط سمجھنے میں آسانی رہے۔

اس لئے مندرجہ ذیل ترتیب ٹھیک ثابت ہو گی:-

(ا) زبر زیر پیش کو پوری طرح ذہن نشین کرایا جائے۔

(ب) بعد میں ایسے الفاظ جن میں جوڑ نہ ہو مثلاً دم۔ دل۔ رک وغیرہ۔ اس کے بعد ط ظ کے جوڑ۔ کیونکہ یہ حروف پورے پورے استعمال میں آتے ہیں ان کے سرے نہیں مثلاً طِب۔

(د) س ش ص ض وغیرہ جن کے سرے ذرا آسان ہیں۔

(ر) پھر ب پ ت ٹ ث ن کے سرے جن کی مختلف شکلیں بنتی ہیں مختلف سبقوں میں سکھائی جائیں۔

(گ) ایسے الفاظ جن کی جوڑتے ہوئے شکل بدل جاتی ہے۔ مثلاً د، ر، ع۔

(پ) پھر لمبی آوازیں۔ اور پھر ساکن اور تشدید اور نونِ غنّہ وغیرہ۔

۲۔ لفظوں کا چناؤ ایسا ہو جس میں جوڑ آسان ہوں۔ مہمل الفاظ استعمال کرنے کی بالکل ضرورت نہیں۔ سادہ جوڑ والے فارسی الفاظ کا کوئی حرج نہیں۔ بچے لفظ سگ کو بآسانی بول اور پڑھ سکتے ہیں "تٹ تٹ تٹ" کو نہیں۔ دوسرے پرندوں اور جانوروں کے نام، بچوں کے نام، گھر کی چیزیں وغیرہ۔ مطلب یہ کہ ذخیرہ بہت ہو تاکہ لڑکا یاد نہ کر سکے اور نہ یاد کرنے کی کوشش کرے۔ وہ اُس اصول کو سمجھے جس اصول سے وہ حروف آپس میں ملے ہیں۔ ساتھ ہی اُستاد کے لئے بھی الفاظ کا ایک ذخیرہ مہیا کرنا چاہیئے جو ہدایات میں دیا ہوا ہو۔ ہدایات کافی ہونی چاہئیں کیونکہ ہمارے پرائمری کے اُستاد اکثر اتنا شوق نہیں رکھتے کہ وہ خود نئے نئے طریقے سوچیں۔ مشقوں میں خوب نظمیں وغیرہ ہونی چاہئیں کیونکہ بچوں کی زندگی ایک مجسم راگ ہوتی ہے اور وہ راگ کو بہت پسند کرتے ہیں۔

لیکن اس وقت میں مؤخر الذکر دونوں باتوں کو چھوڑ کر صرف اُردو الف، بے، تے کی ترتیب اور ربط کے متعلق کچھ کہوں گا۔

ہم مختلف زبانوں کے حروفِ تہجی کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ جُدا جُدا حروف کو پڑھانے کے لئے خاص خاص طریق آسانی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ حروف بالکل بے ترتیب نہیں بلکہ کچھ توجہ اور بعض حالتوں میں نہایت غور کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ آسانی کے لئے میں انگریزی زبان کو لیتا ہوں۔ اگر آپ ذرا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس کو بولتے ہوئے ہم ایک آہنگ پر چلتے ہیں، اے، بی، سی، ڈی، ای، الیف، جی، ایچ وغیرہ وغیرہ۔ اگر ہم تین تین یا پانچ پانچ الفاظ کو اکٹھے پڑھیں تو وہ Rhythm گم ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ تین تین کا جوڑ بنا کر اس میں Rhythm پیدا کیا جا سکتا ہے۔ جیسے اے بی سی۔ ڈی ای بی۔ یا اے بی سی۔ کے ڈی ای وغیرہ وغیرہ۔ لیکن چونکہ دو دو حروف کے جوڑ میں آسانی رہتی ہے اور ساتھ ہی چار چار کے جوڑ بھی خواہ مخواہ بن جاتے ہیں اس لئے دو دو حروف کے جوڑوں کو ہی عموماً مناسبت دی جاتی ہے۔ اُردو کی ابجد کو لیجئے۔ اس میں بھی اُسی Rhythm کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کا اثر ہم سب پر ظاہر ہے۔ بچے آسانی سے ابجد کو حفظ کر سکتے ہیں۔

دوسری بات جو ہمیں اے بی سی پر غور کرنے سے نظر آتی ہے، وہ ہے حروف کی بناوٹ۔ اے اور ڈی، سی اور ای آئی او جے، ایم اور این، پی اور کیو، وی اور ڈبلیو، وائی اور زیڈ کا نزدیک نزدیک ہونا ان کی بناوٹ کو جلدی سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ اسی طرح ب پ ت ٹ ث، ج چ ح خ، د ڈ ذ وغیرہ کا نزدیک ہونا تو اُردو کی ابجد کو بآسانی یاد کرنے میں بہت ہی مدد دیتا ہے۔

اب سنسکرت یا ہندی زبان پر غور فرمایئے۔ وہاں بھی کوئی نظام سوچنے کی کوشش کی گئی ہے اور وہ نظام اپنے نقطۂ نگاہ سے مکمل ہے۔ پہلے حروفِ علت، پھر گلے میں بولے جانے والے الفاظ۔ پھر (۱) گلے میں (۲) تالو میں (۳) تالو سے آگے (۴) دانتوں سے (۵) ہونٹوں سے، آخر میں Semi Vowel۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اُردو زبان میں جس طریق پر ابجد کو قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس میں کون کون سی تبدیلی واقع ہو سکتی ہے۔ جس سے اُس طریق میں تبدیلی واقع نہ ہو، یا کوئی ایسا طریقہ سوچا جائے جو کہ ایک نظام کے مکمل طور پر ماتحت ہو۔ اُردو ابجد کی موجودہ

ترتیب عربی و فارسی ابجد سے لی گئی ہے۔ اور چونکہ اُردو زبان کو بہت سی زبانوں کے زیور پہننے کا حق ملنا تھا اس لئے اس میں خالص ہندی حروف کا اضافہ کر دیا گیا مثلاً ٹ، ڈ، ڑ وغیرہ وغیرہ۔ ساتھ ہی ایک ہی آواز کے اُن حروف کو برقرار رکھا گیا جو کہ فارسی کی زینت تھے مثلاً ث ص س اور ذ ز ض ظ وغیرہ۔ یہ جانتے ہوئے کہ اُردو حروف کی بناوٹ ابتدا ترتیب اور ربط فارسی اور عربی ابجد سے لیا گیا ہے یہ لازم ہے کہ اسی حالت میں اِس میں ضروری تبدیلیاں کی جائیں۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ اس کی ترتیب ہندی حروف کی ترتیب کے مطابق نہیں ہو سکتی کیونکہ ہندی میں अ آواز ایک ہی نشان سے وابستہ ہے اُردو میں अ آواز کو شروع میں بتائی ہوئی تین جدا جدا آوازوں کی مدد لی جاتی ہے۔ अ، ए، ऐ۔

اگر اسے ہندی کی طرح अ پڑھا جائے اور 'بے' کو बे اور 'پ' کو पे تو 'ث' 'س' 'ص' وغیرہ میں تفریق کرنا از حد مشکل ہو جائے گا اور چھوٹے بچے کے لئے ابجد کو سمجھنا بہت ہی مشکل ہو جائے گا۔ اور جن اصحاب نے ایسا کرنے کی کوشش کی ہے، اُردو زبان کے پڑھنے میں رُکاوٹ ڈالی ہے۔

پس اُردو حروف کی نئی اور آسان اور باقاعدہ ترتیب کے لئے مندرجہ ذیل باتوں کا خاص خیال رکھنا چاہئے :۔

(۱) اُردو زبان کے حروف کی ترتیب و ربط عربی و فارسی کے ڈھنگ پر ہے۔

(۲) حروف کو پڑھتے وقت اُن میں ایک Rhythm برقرار رکھا جائے۔

(۳) حروف کو مختلف گروہوں میں تقسیم کرتے وقت ان کی بناوٹ کا خاص خیال رکھا جائے اور ایک بناوٹ کے الفاظ نزدیک نزدیک واقع ہوں۔

قدیم نظام کو بدلنے کی کوشش کیوں نہیں کی گئی اُس کی وجہ اُوپر بیان کی ہوئی تینوں وجوہات کا مجموعہ ہے۔ جس Rhythm (آہنگ) سے لڑکوں اور اُستادوں کے کان آشنا ہو چکے ہیں اُس راگ کو ہٹا کر ایک نیا راگ پیش کرنا اگر غریب نہیں تو تکلیف دہ ضرور ہے۔ بناوٹ کے لحاظ سے اُردو حروف میں کوئی خاص تبدیلی پیدا نہیں کی جا سکتی۔ البتہ معمولی معمولی تبدیلیاں ضرور ہو سکتی ہیں جن کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔ چونکہ اُردو کا لکھنا ایک قسم کا Short-hand ہے جس میں دیگر زبانوں کی طرح پُورے پُورے حروف استعمال نہیں کئے جاتے بلکہ اُن کی علامتیں یا صرف ایک ایک حصہ ہی دِکھایا جاتا ہے اور وہ جز وبھی جُدا جُدا حالات میں جُدا جُدا اشکال اختیار کر لیتے ہیں اس لئے حروف کا ربط اُردو زبان کے لکھنے میں سب سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ تبدیلی کی ضرورت صرف حروف کے ربط کی طرف غور کرنے سے ہی پیدا ہوتی ہے اور میں یہ کہوں گا کہ اِس بات کی طرف ماہرینِ تعلیم نے بہت کم توجہ دی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ موجودہ حالت میں اُنہیں حروف کے ربط سمجھنے میں کوئی نمایاں دقت پیش نہیں آتی۔

پیشتر اس کے کہ میں نئی ترتیب پیش کروں، اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ قدیم صُوری رسم الخط کی ابتدا کیسے ہوئی اور

اس کے ذریعے حروفِ تہجی کس طرح ظہور میں آئے کیونکہ اس سے ثابت ہوگا کہ حروف فرضی علامات ہیں جنہیں ہم جب چاہیں بدل سکتے ہیں:

الف عبرانی ( ) 7 ، عربی معنی بیل عبرانی

ب بیت معنی گھر۔

ج جمل (اُونٹ)

ح ے عربی قبیلہ

د 4 یونانی Δ، عربی د، مصری تصویر ہاتھ، عبرانی دالت دروازہ

ر مصری رُو معنے منہ 9 کلدانی نے 7

س مصری عبرانی سن معنی نیلوفر مصری

ک عبرانی ہتھیلی عربی ک

ل یورپی زبانوں میں عبرانی عربی مل عبرانی لمد معنی آنکس۔

م عبرانی م بانی۔

ن عبرانی نون مچھلی نئی شکل ن ن

و ؤد مچھلی پکڑنے کا آنکڑہ

ہ ہت جنگل۔

ی عبرانی انگشت عبرانی ید معنی ہاتھ

ان حروف کی بناوٹوں سے ظاہر ہے کہ ایک چیز کی شکل سے ہم اُس کے سادہ نشان کی طرف دوڑتے چلے آئے ہیں اور موجودہ شکلوں میں بھی ضرورت کے مطابق تبدیلیاں کرنے کا حق حاصل ہے۔

اگر آپ صرف 'نون' کو غور سے دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ صرف ب پ ت ٹ ث کے بالکل مشابہ ہے۔ اگر یہ 'ں' اس شکل سے 'ں' یہ شکل اختیار کرلیتا تو لکھنے اور سمجھنے میں کوئی دِقت پیش نہ آتی۔ نون کی موجودہ شکل اِس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ دائرہ کا ایک مرکز ہوتا ہے اور مرکز کے بغیر دائرہ خوبصورت نہیں لگتا۔ جس طرح ایک قوم یا جماعت ایک باہمی نصب العین کے بغیر اچھی نہیں لگتی۔ لیکن ن کی یہ شکل ں صحیح طور پر موزوں قرار دی جاسکتی ہے۔ پس یہ ثابت ہوا کہ نون اُس بستی کا رہنے والا ہے جس میں ب پ وغیرہ رہتے ہیں اور ہماری غلطی سے ہی اِس کو اتنی دیر ملک بدر رکھا گیا ہے۔ اور ہمارے راج میں اسے وطن کو لوٹ آنے کی اجازت ملی

لے انگریزی Heart

جانی چاہئے۔

اسی طرح 'ی'، 'ے' بھی ایسے حروف ہیں جو نشانی کے طور پر دو نقاط سے ہی ظاہر کئے جاتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ صحیح آواز کے طور پر اُردو میں بہت کم استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ حروف علت ہیں۔ تاہم اُن کی اصلی جگہ اُن کی علامت کے لحاظ سے ب پ کے ساتھ ہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور بات بھی آپ کے غور کے لئے پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ وُہ ہے اِن کو بولنے کا طریق۔ بجائے چھوٹی یے بڑی یے کہنے کے اگر یِی اور یے پڑھایا جائے تو مجھے اس بات میں آسانی نظر آتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ فارسی کی سی بات اس میں نہ رہے گی لیکن فارسی کی طرز تو اب بھی اس میں نہیں پائی جاتی۔ وہاں اس کی آواز علامت زبر اور زیر پر منحصر ہے، یے چاہے بڑی لکھی جائے چاہے چھوٹی Rhythm (آہنگ) کو قائم کرنے کے لئے ایک اور حرف درکار ہے۔ وہ بھی مِل جاتا ہے گو وہ عین ب پ ت وغیرہ کے خاندان کا نہیں ہے۔ اگر آپ صرف ہ کو دیکھیں تو معلوم ہو جائے گا کہ اس کی کئی صورتیں بنتی ہیں۔ اور یہ اُردو کے مشکل ترین حروف میں سے ہے۔ اس کی مختلف اشکال ہیں۔ ہ ہر ہ ہ ہ اور ھ، تاہم ا، ب . . . . ث ن ی ل ک گ د ڈ ذ، ر ڑ ز ژ کے ساتھ ملتے وقت اس کی وہی صورت رہتی ہے جو ب پ وغیرہ کی۔ اس لئے اسے بھی وہیں جگہ دی جاسکتی ہے بہرحال یہ جگہ اُس کی پُرانی بے معنی جگہ سے زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے ا، ب، پ کو ایسے پڑھا جائے[1] . . . . . .

آگے چلئے۔ ج چ ح خ کے ساتھ کوئی حرف بھی ملے تو وہ (کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اسی طرح م کے ساتھ ملتے ہوئے بھی حروف کی وہی حالت ہوتی ہے۔ پس م کو ج چ ح خ کے نزدیک رکھنے میں زیادہ آسانی ہوتی ہے۔ لیکن یہ پانچ حروف ہو جاتے ہیں اور Rhythm (آہنگ) میں فرق آجاتا ہے اور دیگر حروف میں سے کوئی حرف بھی اِس فہرست کا نہیں اس لئے ایک اور حرف ڈھونڈنا پڑے گا۔ وہ حرف میں آگے چل کر بتاؤں گا۔

اس کے بعد د ڈ ذ آتے ہیں۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ اس جگہ بچوں کی راگ کی دلدادہ رُوح کے کچلے جانے کی آہ کو سُنا ہی نہیں گیا۔ یہاں تین حروف ہونے کی وجہ سے جو سکتہ پڑتا ہے اُس کی جگہ پُر کرنے کے لئے وہ معصوم آہ بھر لیتے ہیں۔ یہ ہم سب پر ظاہر ہے کہ د ڈ ذ کے بعد اگر کوئی بھی حرف لکھا جائے تو وہ نئے سرے سے شروع ہوگا اور ان کے ساتھ نہیں ملے گا اور 'و' بھی عین ویسا ہی حرف ہے اور شکل میں بھی مشابہت رکھتا ہے اس لئے یہ وہاں رہ کر بہت خوش ہوگا اور اسے پڑھنے والے بچے بھی۔

اب 'ر ڑ ز ژ' اور 'د ڈ ذ' پر غور کرنے سے پتہ چلے گا کہ ان سے پہلے کوئی حرف اگر ان کے ساتھ ملایا جائے تو ان کی شکل بدل جاتی ہے۔ اسی طرح ع اور غ کی شکل میں بھی تبدیلی واقع ہو جاتی ہے اس لئے د ڈ ذ ر ڑ ز ژ کے بعد در حقیقت ع غ کا ہے نہ کہ س ش کا۔ اس کے بعد ط ظ کے لکھے جانے کا حق ہے کیونکہ یہ حروف جڑتے وقت پُورے کے پُورے استعمال میں آتے ہیں ان کے سرے نہیں۔ اس کے بعد س ش، ص ض، ف ق، ک گ کی باری آتی ہے۔ اب ل بیچارہ اکیلا رہ گیا ہے، اس کا کوئی ساتھی نہیں،

---

[1] ت، ث، ٹ کو ا، ب، ت، پ، ث، ٹ پڑھایا جائے۔

لیکن اس میں ایک میم چھپا ہؤا ہے اس لئے میم کے پاس رہتا ہؤا یہ سہانا لگے گا اور اسے بولنے میں آسانی ہو گی۔ باقی رہا "ء"۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ ء آدھا الف ہے جس طرح آ تین الف کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ بذاتِ خود حرف نہیں بلکہ ایک علامت ہے۔ اس بنا پر اِسے اب اپ سے نکالا بھی جا سکتا ہے یا مدّ کو اب پ میں داخل بھی کیا جا سکتا ہے اور وزن قائم رکیا جا سکتا ہے۔

چند اور تبدیلیاں بھی میرے دماغ میں ہیں مثلاً اب، پ، ت کی جگہ اب ت پ ث ٹ ن ی ے ہ پڑھا جائے تو زیادہ اچھا ہو گا۔ ایک تو ہ کا جھگڑا نکل جائے گا اور اسے بے تک تختی علیحدہ ہو جائے گی دوسرے نقاط کی ترتیب کچھ بہتر ہو جائے گی۔ و د ذ ڈ پڑھنا بھی د ڈ ذ و سے بہتر ہے کیونکہ و علیحدہ رہ جاتا ہے اور شکل بدلنے والے حروف کی تختی علیحدہ ہو جاتی ہے۔ ع غ کو م ل کے بعد رکھا جائے تو وزن اچھا ہو جاتا ہے۔ پھر 'د' کا جھگڑا درمیان میں آ جاتا ہے۔ اس لئے ساری تختی کو ہی اور جگہ دینی چاہئیے پس اب پ کا آخری سانچہ میری نظروں میں اوپر بیان کئے گئے اصُولوں کے مطابق .... یہ ہونا چاہئیے۔

موجودہ ترتیب

ا

ب پ ت ٹ ث

ج چ ح خ

د ڈ ذ

ر ڑ ز ژ

س ش

ص ض

ط ظ

ع غ

ف ق

ک گ

ل م ن

و ہ ء

ی ے

نئی ترتیب

ا

ب ت پ ث ٹ

ن ی ے ہ

ط ظ

و د ذ ڈ

ر ز ژ ڑ

ع غ ل م

ج چ ح خ

س ش ص ض

ف ق ک گ

اوم پرکاش ایم۔ اے

کیلاش کنول

تراجم از "پیامِ مشرق" — حسبِ اجازت علامۂ اقبال

(۲۴)

رہے در سینۂ انجم کشائی
ولے از خویشتن ناآشنائی
یکے برخود کشا چوں دانہ چشمے
کہ از زیرِ زمیں نخلے برآئی

(ترجمہ)

تارے کے جسم سے راہ نکالی
اپنے سروپ پہ آنکھ نہ ڈالی
بھومی سے بیج نے پیڑ اُگایا
کیوں نہ وہ بیج سی آنکھ کھلالی

(۲۵)

سحر در شاخسارِ بوستانے
چہ خوش می گفت مرغِ نغمہ خوانے
برآور ہر چہ اندر سینہ داری
سرودے، نالۂ، آہے، فغانے!

(ترجمہ)

صبح کو پیڑ پہ ایک چمن میں
ہوک بھرے تھی یہ کویل تن میں
ہر دے میں جو کچھ ہو لا باہر
راگ کہ بین ہو تیرے من میں!

(بین بمعنی آہ)

(۲۱)

شنیدم در عدم پروانہ می گفت
دمے از زندگی تاب و تبم بخش
پریشاں کن سحر خاکسترم را
ولیکن سوز و سازِ یک شبم بخش

(ترجمہ)

سنا کہے تھا پتنگ عدم میں
دم بھر کو جیون کی تپن دے
چاہے اُڑا دے راکھ سویرے
رین تو آگ سے بھر تن من دے!

(۲۳)

بہ کویش رہ سپاری اے دل اے دل
مرا تنہا گذاری اے دل اے دل
دما دم آرزو ہا آفرینی،
مگر کارے نداری اے دل اے دل!

(ترجمہ)

راہ اُسی کی لگا آہ اے دل
چھوڑ کے مجھکو چلا آہ اے دل
آس پہ آس اُبھاری مَن میں
کام نہ اور تھا کیا آہ اے دل

---

(۲۸)

ترا از خویشتن بیگانہ سازد
من آں آبے طربناکے ندارم
ببازارم مجو دیگر متاعے
چو گُل جز سینۂ چاکے ندارم

(ترجمہ)

تجھ کو جو آپ سے آپ بھلا دے
پاس رکھوں نہ وہ مَن موجی[1] رس
میری دُکان میں اور نہیں کچھ
پھول سے ٹوک[2] ہیں دِل کے اور بس!

لہ مَن موجی ۔ طرنگ ۔ لہر ۔ رَس ۔ ترنگ سے بھرا ہوا
ٹہ بے دردی سے، بے حسی سے

---

(۲۹)

زیاں بینی ز سیرِ بوستانم
اگر جانت شہیدِ جستجو نیست
نمایم آنچہ ہست اندر رگِ گُل
بہارِ من طلسمِ رنگ و بُو نیست

(ترجمہ)

میرے چمن میں نہ پائے تو آنند
کھوج نہیں جو ترے جیون میں
بھید بتاؤں میں پھول کی رَگ کا
رنگ کو لاؤں نہ باس کو من میں!

---

(۲۶)

تُرا یک نکتۂ سربستہ گویم
اگر درسِ حیات از من بگیری
بمیری گر بہ تن جانے نداری
وگر جانے بہ تن داری نمیری

(ترجمہ)

تُجھ کو بتاؤں میں ایک چھپا گُر
جیون پاٹھ[1] جو تو پڑھ جائے
جان[2] بنا تن ہو تو مرے تو
تن میں ہو جان تو موت نہ آئے

لہ جنم ۔ درس * ٹہ پران ۔ جان ۔ روح
مرنا، فنا ہو جانا

مقبول احمد پوری

"گذشتہ موسم بہار میں مجھے سرحد کے آزاد قبائل میں جانے کا اتفاق ہؤا۔ میرے ہمراہ افضل صاحب جالندھری، محمد نصراللہ خاں صاحب اور محمد سبطین شاہ صاحب تھے۔ راستہ میں ہم ٹیکسلا دیکھنے کے لئے ٹھہرے۔ ذیل میں ٹیکسلا کے تاریخی حالات درج کیے جاتے ہیں۔ اگر قارئین کرام نے پسند کیا تو آزاد قبائل کے حالات بھی جو نہایت دلچسپ ہیں پیش کروں گا۔

میں محمد سبطین شاہ صاحب قبلہ کا نہایت ممنون ہوں جن کی وجہ سے میں اُس جگہ پہنچا جہاں شاید بہت کم ہندوستانی بھائیوں کو جانے کا اتفاق ہؤا ہوگا"

رفیع جالندھری

ہندوستان میں محکمہ آثارِ قدیمہ کا سب سے بڑا کام ٹیکسلا کے محلِ وقوع کا پتہ چلانا ہے۔ دُنیا کی تاریخ میں یہ شاید اپنی قسم کا پہلا اور لاثانی واقعہ ہے کہ ٹیکسلا کا سا مشہور اور عظیم شہر صفحۂ ہستی سے تقریباً تیرہ سو سال کے لئے اس طرح ناپید ہو جائے کہ اُس کا ذکر بھی لوگوں کی زبانوں پر نہ رہے حتےٰ کہ مقامی حکایات اور اساطیر تک اُس کے ذکر سے قطعی اجنبیت کا اظہار کریں۔ تعجب ہے کہ ایسا عظیم شہر اور اس قدر جلد فراموش کر دیا جائے لیکن یہ ایک امرِ واقعی ہے کہ ۵۰۰ء سے (جب ٹیکسلا کو ہُن قوم نے نذرِ آتش کر کے تباہ کر دیا) گذشتہ ستّر سالوں تک اس شہر کا نام بھی ذہنِ انسانی سے محو ہو گیا تھا۔ ٹیکسلا کی عظمت اور اس کی شہرت سے مندرجہ بالا سطور کا اذعان مشکل ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ کئی سو سال تک ٹیکسلا کا نام تاریخی کتب یا سفرناموں کے علاوہ کہیں نظر نہ آتا تھا۔ زمانہ نے اس کا نشان اس طرح مٹایا کہ ان چند سو سالوں کے دَوران میں اس کے نقوش تک کا پتہ چلانا بھی ناممکن تھا۔ زمانہ نے شاید ٹیکسلا کو تہذیبِ انسانی پر ایک بدنُما دھبّا خیال کیا جو اسے اس طرح روئے زمین سے مٹا دیا۔ لیکن حقیقتہً ٹیکسلا انسانیت پر کوئی بدنُما دھبّا نہ تھا۔ برعکس اس کے اس شہر کی تمدنی، سیاسی اور معاشرتی ترقی رہتی دُنیا تک مثال بنی رہے گی۔ اس کی مدنیت پر آج بھی ہندوستان نازاں ہے اور ہندوستانی اس پر جس قدر بھی فخر و مباہات کا اظہار کریں زیبا ہے۔

۱۸۶۳ء میں جنرل کننگھم نے قطعی طور پر ٹیکسلا کی جائے وقوع کو شناخت کر لیا۔ قدیم اربابِ سیَر کی کتب اور سفرناموں سے اُسے ٹیکسلا کی موجودہ جگہ دریافت کرنے میں بے حد مدد ملی۔ پاکینی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ٹیکسلا حسن ابدال کے مقام پر شاہ ڈھیری سے آٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے لیکن اُس کا یہ خیال غلط ہے۔ فاہیان اپنے سفرنامہ میں اسے ٹو۔ چا۔ شی۔ لو یعنی ٹیکش سیلا کہتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہ شہر گندھارا سے سات روز کی مسافت پر واقع ہے۔ چینی زبان میں اس کے معنی "سر بُریدہ" کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مہاتما بدھ جب بُدھستوا تھے تو بودھی حاصل کرنے کے لئے اُنہوں نے اپنا سر کسی شخص کو دے دیا تھا۔ اس لئے
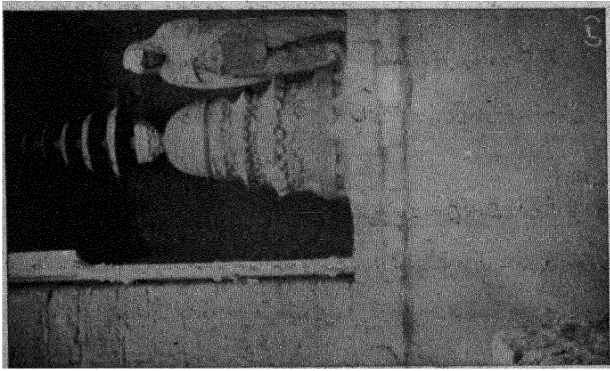
ٹیکسلا کے آثار
(۱) سرکپ کا ایک منظر (۲) جولیاں کی خانقاہ کا ایک حصہ (۳) مرادو کے موڑے کا بارہ فٹ بلند سٹوپا
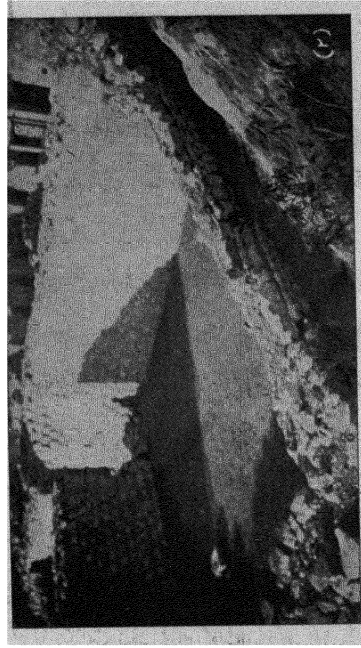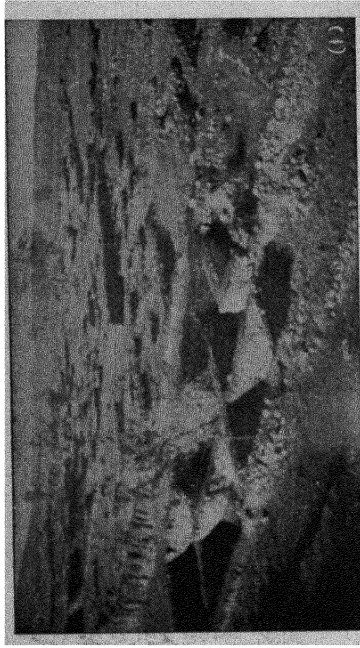
اس جگہ کا نام ٹیکشا سیلا پڑگیا۔ لیکن جیمز لیگی (James Legge) کے خیال میں ٹیکشا سیلا جس کا ذکر فاہیان کے سفرنامہ میں آتا ہے دریائے سندھ کی مغربی جانب واقع تھا اور غلطی سے ٹیکسلا شمار کیا جانے لگا۔ اسے ٹیکسا شر الکھنا چاہئے۔ اور چینی تلفظ بھی اس کی اجازت دیتا ہے علاوہ ان کے ہیون سانگ اور سنگ یُن کی کتب سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے۔ سر جان مارشل لکھتا ہے:۔

"ٹکا سیلا یا ٹخا سیلا سنسکرت کے لفظ ٹکشا سیلا سے ماخوذ ہے جس کے معنی "سنگِ تراشیدہ کا شہر" ہے۔ ٹیکسلا کا ذکر سنسکرت لٹریچر میں بھی پایا جاتا ہے"۔ پانینی (Panini) بھی ٹیکشا سیلا کا ذکر کرتا ہے۔ یہ لفظ رامائن اور مہابھارت میں بھی کئی دفعہ آتا ہے۔ بدھوں اور جینیوں کی کتب میں بھی یہ لفظ آتا ہے۔ اس شہر کے محلِ وقوع کا اندازہ تو پیشتر ہی ایسے ذرائع سے لگایا جا چکا تھا لیکن کچھ عرصہ بعد ایک پرانے اور منہدم ستوپا کے کتبے سے جنرل کننگھم کا خیال پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اس کتبے سے یہ بات مکمل طور پر ثابت ہوگئی کہ محولہ بالا ستوپا ٹیکسلا میں پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا لہٰذا یہیں کھدائی شروع کر دی گئی۔

کھدائی کا کام گذشتہ صدی کے اواخر میں ہی شروع کر دیا گیا تھا لیکن فی الحقیقت کھدائی ۱۹۱۲ء میں شروع ہوئی۔ اس سال سر جان مارشل نے ستوپاؤں، خانقاہوں اور مکمل شہروں کو اُن کے مدفن سے نکالا اور بیس سال کی مسلسل محنت و مشقت کے بعد ٹیکسلا کی دیرینہ عظمت کے نشانات ہماری آنکھوں کے سامنے ظاہر کر دیئے۔ آج سیاحوں کے لئے ٹیکسلا پومپی سے زیادہ کشش رکھتا ہے یہاں کا موجودہ عجائب گھر ہندوستان کی گذشتہ عظمت اور زمانۂ قدیم کی معاشرت و مدنیت کا جامع ہے، یہاں سنگ تراشی کے نمونے، قدیمی سکہ جات، زیورات اور دیگر ایسی ہی چیزیں نہایت قابلِ دید ہیں۔

ٹیکسلا کے عروج و زوال کی داستان کا اندازہ انہی اشیاء سے لگایا جاتا ہے بلکہ کسی حد تک تو یہی کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تاریخ کی بنا (۵۰۰ ق۔م سے ۵۰۰ء تک) انہی برآمد شدہ اشیاء پر قائم ہے۔ پُرانے یونانی اور چینی سیاحوں کی کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ ۵۰۰ ق۔م میں ٹیکسلا اپنی ایک شاندار یونیورسٹی کی وجہ سے خاص شہرت رکھتا تھا۔ ٹیکسلا ایک نہایت سرسبز و شاداب وادی میں واقع ہے جہاں پانی کی بہتات ہے۔ اور یہ بیرونی حملہ آوروں کی مدافعت کے لئے نہایت مناسب جگہ ہے۔ ٹیکسلا اس شاہراہ پر واقع ہے جو زمانۂ قدیم میں وسط ایشیا سے اندرونِ ہند کو جاتی تھی۔ اس لئے یہ تجارتی شہر تھا۔ اب اس پُرانی شاہراہ کی جگہ گرانڈ ٹرنک روڈ اور نارتھ ویسٹرن ریلوے نے لے لی ہے۔

۵۰۰ ق۔م سے ۵۰۰ء تک یعنی ایک ہزار سال کے دَوران میں ٹیکسلا یکے بعد دیگرے تقریباً سات اقوام کے زیر نگیں رہا۔ سب سے پہلے ایرانیوں نے اپنی حکومت یہاں قائم کی جن میں سے دارا وغیرہ مشہور بادشاہ ہوئے۔ اسی دوران میں (۵۶۳-۴۸۳ ق۔م) مہاتما بُدھ پیدا ہوئے اور وفات پائی۔ بعد ازاں یونانی آئے۔ سکندرِ اعظم کے زمانہ میں پنجاب کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا اور ٹیکسلا صرف اُس تھوڑے سے حصّے کا دارالخلافہ تھا، جو دریائے سندھ اور جہلم کے درمیان واقع ہے۔ اس لئے اس

زمانہ میں فوجی نقطۂ نظر سے اس کی وہ حیثیت نہ تھی جو آج کل راولپنڈی یا دیگر چھاؤنیوں کی ہے ۔ لہٰذا سکندرِ اعظم نے خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر راجہ امبھی سے ٹیکسلا حاصل کر لیا ۔ اس کے بعد پورس سے لڑائی ہوئی لیکن چند سال کے عرصے میں ہی چندر گپت نے یونانیوں کو نکال باہر کیا اور موریا خاندان کی بنا ڈالی ۔ اسی خاندان میں اشوک اعظم یا پیادسی (حبیبِ خدا) پیدا ہؤا ۔ اس کے بعد شمال سے باخترین آئے جنہوں نے تقریباً ایک صدی تک حکومت کی اور شمالی ہند کے فنون پر اپنے گہرے اثرات چھوڑ گئے ۔ اُن کے بعد پارتھین اور کشان قوم کا دَور دَورہ ہؤا ۔ اُنہوں نے ٹیکسلا کے علاوہ پنجاب اور سندھ کے وہ علاقے بھی فتح کر لئے جو باخترین کے ماتحت تھے ۔ ۱۲۵ء میں کشان خاندان کا سب سے مشہور بادشاہ کنشک تخت نشین ہؤا جس کی سلطنت وسط ایشیا سے بنگال تک پھیلی ہوئی تھی آخر کار یہ وسیع سلطنت بھی زوال پذیر ہوئی اور ہُن قوم نے ہندوستان کو تاخت و تاراج کرنا شروع کیا ۔ اس قبیلہ کے لوگ ابتداً وسطِ ایشیا کے پہاڑوں میں خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے تھے اور بہت خونخوار اور وحشی تھے ۔ اس حملہ کے بعد ٹیکسلا اپنی گذشتہ عظمت پھر دوبارہ کبھی حاصل نہ کر سکا ۔ ساتویں صدی عیسوی میں جب ہیون سانگ ہندوستان میں آیا تو اُس نے تمام ستوپاؤں اور خانقاہوں کو برباد شدہ حالت میں پایا ۔ وہ لکھتا ہے " چونکہ شاہی خاندان معدوم ہو چکا ہے اس لئے اُمرا، طاقت سے برسرِ اقتدار آ گئے ہیں ۔ کچھ عرصہ سے یہ علاقہ کشمیر کا باجگذار ہو گیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تمام خانقاہیں غیر آباد پڑی ہیں اور پجاری بہت کم نظر آتے ہیں " اس سے آگے ٹیکسلا کی بابت تاریخ بالکل خاموش ہے ۔ آہستہ آہستہ خاک نے اس سرزمین کو چشمِ انسان سے بالکل پوشیدہ کر دیا ۔ اور کوئی ایک عمارت بھی ایسی نہ چھوڑی جس سے شہر کا کچھ نشان مل سکتا ۔ حتیٰ کہ ٹیکسلا کا نام بھی حضرتِ انسان نے اپنے ذہن میں محفوظ رکھنا گوارا نہ کیا ۔

ٹیکسلا کے کھنڈر راولپنڈی سے تقریباً بیس میل شمالاً واقع ہیں ۔ اس وادی کو دریائے ہرو اور اُس کے معاون سیراب کرتے ہیں اور گرد و نواح کی پہاڑیاں اس جلالِ گذشتہ اور عظمتِ دیرینہ کی حفاظت میں سینہ سپر ہیں ۔ زمانۂ قدیم میں جب وسطِ ایشیا اور ہندوستان کے درمیان تجارت عروج پر تھی تو تمام قافلے اسی وادی سے گزرتے تھے ۔ اس بیان سے اس شہر کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔

اس وادی میں تین مختلف شہروں کے کھنڈر تمیز کئے جا سکتے ہیں ۔ یہ سب ایک دوسرے سے تقریباً ساڑھے تین میل کے فاصلے پر واقع ہیں ۔ ان شہروں کے علاوہ بے شمار ستوپے اور خانقاہیں زمین سے کھود کر نکالی گئی ہیں ۔ متذکرہ بالا شہروں میں سب سے قدیم شہر میوزیم اور سرائے کالا ریلوے سٹیشن سے قریب ہی واقع ہے ۔ یہ شہر یونانیوں سے بھی کئی صدی قبل آباد تھا ۔ دوسری صدی قبلِ مسیح میں یونانیوں نے اس سے چند میل کے فاصلے پر سرکپ کو دار الخلافہ بنایا ۔ کھدائی سے اس شہر کے تمام معابد، سڑکیں، بازار، دوکانیں، اور مکانات صاف نظر آنے لگے ہیں ۔ سرکپ کی بیرونی فصیل بھی دکھائی دیتی ہے ۔ یہاں کے سنگتراشی کے نمونے نہایت اعلےٰ اور دلکش ہیں ۔ اس شہر کی ایک ایک دیوار کھودی جا چکی ہے ۔ دیواریں چھوٹے چھوٹے پتھروں سے بنائی گئی ہیں ۔ کہیں کہیں اُن میں بڑی

سلیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ یہ دیواریں ماہرینِ فنِ تعمیرات کے لئے خاص دلچسپی کا باعث ہیں۔ قیاس ہے کہ جب یہ شہر آباد ہوں گے تو ان دیواروں پر چُونا اور پلستر کیا ہؤا ہو گا۔

ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی تحقیقات کے مطابق ان عمارات کی بالائی تہیں کشان خاندان کے عہد کی یادگار ہیں۔ ان سے زیریں تہ پارتھین قوم سے متعلق ہے اور اصل زمین تک پہنچنے سے پیشتر دو اور تہیں نظر آتی ہیں جو یونانی حملوں کی یاد دلاتی ہیں۔ سرکپ کے مکانات سے جیساکہ خیال کیا جاسکتا ہے سکہ جات، ظروف، جواہرات، کھلونے، کُرسیاں اور ہزارہا دیگر اشیاء برآمد ہوئی ہیں۔ یونانی طرز کا چاندی کا ایک چمچہ بھی دریافت ہؤا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی نمونے کے چمچے پومپی سے بھی ملے ہیں۔ زمانۂ قدیم کے جو برتن زمین کے اندر سے یہاں دستیاب ہوئے ہیں اُن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ باوجود اس قدر طویل امتدادِ زمانہ کے ان کے رنگ و روغن کی آب و تاب وہی باقی ہے سرکپ کے درمیان سے ایک بڑی شاہراہ گزرتی ہے جو شہر کو دو حصّوں میں منقسم کر دیتی ہے۔

اس سلسلے کا تیسرا شہر سرسکھ ہے جو سرکپ سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ شہر کنشک کے زمانہ میں (۱۲۵ء) آباد کیا گیا تھا۔ چونکہ یہاں کی زرخیز زمین ابھی تک مقامی زمینداروں کی مقبوضہ خیال کی جاتی ہے اس لئے یہاں کھدائی کا کام اعلےٰ پیمانہ پر شروع نہیں کیا جاسکا۔

اس ایک ہزار سال کے دَوران میں یہاں بُدھ مت ہی رائج تھا اس لئے اسی مذہب کی یادگاریں اس وادی میں مدفون ہیں تمام خانقاہیں، ستوپے اور پگوڈے اسی مذہب کی یاد دلاتے ہیں۔

جنڈیال کے کھنڈروں سے ایک بڑا امندر کھودا گیا ہے۔ بدل پور اور لال چک کے مقامات پر خانقاہیں مدفون تھیں جو اب نکالی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں جولیاں اور مرادو کے موڑے کی کھُدائی سے نہایت زبردست انکشافات ہوئے ہیں اور یہاں سے نہایت مفید اور لاثانی یادگاریں برآمد ہوئی ہیں۔ یہ خانقاہیں قدرے بہتر حالت میں ہیں اس لئے ان کی عظمت کا اندازہ لگانے کے لئے حافظے یا تصوّر سے زیادہ کام نہیں لینا پڑتا۔ ان کا تقدس اور ظاہری شان و شوکت اب بھی ویسی ہی ہے جیسی اُس زمانہ میں تھی۔ دیواروں پر پچی کاری کی گئی ہے۔ یہاں لکڑی کا منقش کام اور بُدھ کے ہزارہا مجسّمے قابلِ دید ہیں۔ اس جگہ سے سنگتراشی کے نہایت اعلےٰ نمونے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان سب سے یونانی اثرات نمایاں ہیں۔ مرادو کے موڑے میں ایک بارہ فیٹ بلند ستوپا ہے جو ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ یہ ستوپا نقش و نگار سے مزیّن ہے اور اس پر مہاتما بُدھ مختلف حالتوں میں دکھائے گئے ہیں۔

اس وادی کے تمام ستوپاؤں میں سے دھرم راجیکا ستوپا نہایت مشہور ہے۔ یہ حضرت مسیحؑ کے زمانے میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس بڑے ستوپا کے اِرد گرد کئی چھوٹے ستوپے ہیں جن میں بے شمار مقدس آثار مدفون ہیں۔ عموماً ستوپے میں سے ایک چھوٹی سی ڈبیا برآمد ہوتی ہے جس میں سے چند ہڈیاں اور بیش قیمت جواہرات نکلتے ہیں۔ دھرم راجیکا سے ایک ظرف دستیاب ہؤا تھا جس میں سے

ایک کتبہ اور چھوٹی سی طلائی ڈبیہ برآمد ہوئی۔ اس ڈبیہ میں چند ہڈیاں تھیں اور کتبے سے جو خروشتی رسم الخط میں تحریر تھا۔ اس راز کا انکشاف ہوا کہ وہ ہڈیاں مہاتما گوتم بُدھ کی یادگار تھیں۔ یہ ہڈیاں برما کے بُدھوں کو تحفتہً پیش کر دی گئیں۔ اب یہ مانڈے کی ایک پہاڑی کی چوٹی پر پگوڈے کے اندر محفوظ ہیں۔ اسی جگہ شیشے کی مانند شفاف اینٹیں بھی مدفون تھیں۔ یہ سیاہ، سفید اور زرد رنگ کی تھیں۔

میرا مضمون تشنۂ تکمیل رہے گا اگر یہاں ٹیکسلا کی رسوم اور مذہب و مدنیت کا اجمالاً کچھ ذکر نہ کیا گیا۔ یونانی سیاح جب پہلے پہل یہاں وارد ہوئے تو اُنہیں یہاں کی کئی رسمیں عجیب معلوم ہوئیں جنہیں اُنھوں نے نہایت دلچسپ انداز میں تحریر کیا ہے۔ پہلی چیز جو اُنہیں عجیب معلوم ہوئی ستی کی رسم تھی۔ سٹرابو (Strabo) لکھتا ہے "میں نے بعض ایسی کہانیاں سُنی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ کی عورتیں اپنے خاوندوں کی موت پر زندہ چتا میں جل کر راکھ ہو جاتی ہیں۔ حیرت کا مقام تو یہ ہے کہ وہ ایسا کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتیں اور نہ رنج و ملال کا اظہار ہی کرتی ہیں"۔ سٹرابو کے علاوہ ارسطوبولس (Aristobolus) اور دیگر یونانی سیاح بھی ایسا ہی کچھ بیان کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض بیانات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ٹیکسلا کے لوگ مُردوں کو باہر پھینک دیتے تھے تاکہ اُنہیں گدھ یا دیگر شکاری جانور کھا جائیں۔ اگر ان رسوم کو بنظرِ تعمق دیکھا جائے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ٹیکسلا کی تہذیب و مدنیت مجموعہ تھی مختلف ممالک کی رسوم کا۔ اس میں بابلی، ایرانی اور تبتی رسوم کا عنصر قدرے غالب نظر آتا ہے۔ اگر ایک طرف مُردوں کو گدھوں کے آگے پھینکنے کی رسم پارسیوں یا تبتیوں سے لی گئی تھی تو رسمِ ستی کا ماخذ سیتھین قوم معلوم ہوتی ہے۔ سکندرِ اعظم کے زمانہ میں پنجاب کو کئی اقوام نے اپنا وطن بنا رکھا تھا۔ اگرچہ اُس وقت برہمنی مت یہاں اپنے قدم جما چکا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی آتش پرست بھی آباد تھے۔ چنانچہ اُن کا ایک بڑا معبد سرکپ کے شمالی دروازہ سے چند سو گز کے فاصلہ پر دریافت کیا گیا ہے۔ آتش پرستوں کے علاوہ دُوسرے مذاہب بھی ترقی پر تھے۔ اس سے یہ نتیجہ بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ٹیکسلا کی تہذیب و مدنیت اُس وقت اپنے پورے عروج پر تھی۔ اس جگہ ایک اعلےٰ اور متموّل قوم کے تمام فنون و رسوم رائج تھے۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ چوتھی صدی قبل مسیح میں ہندوستانی معاشرت اور تہذیب و تمدن کس قدر دیرینہ روایات کے حامل تھے۔

"جاتکاؤں"[1] کی شہادت سے یہ بات پایۂ یقین کو پہنچ چکی ہے کہ ٹیکسلا ہندوؤں کا علمی مخزن تھا۔ یہاں ملک کے گوشہ گوشہ سے لوگ ویدوں اور پورانوں کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے تھے۔ دستورِ زمانہ کے مطابق شاہزادے اور متموّل برہمنوں کے لڑکے سولہ سال کی عمر میں تکمیلِ تعلیم کے خیال سے ٹیکسلا بھیجے جاتے تھے۔ یہ یونیورسٹی خصوصاً طب کی تعلیم کے لئے مشہور تھی۔ اور یہاں بڑے بڑے لائق اور تجربہ کار اُستاد مقرر تھے۔

---

[1] وہ کہانیاں جو بُدھ کی پیدائش سے متعلق ہیں جاتکائیں کہلاتی ہیں۔ رفیع

آج کل محکمہ آثارِ قدیمہ کے اربابِ بست وکشاد کی توجہ سے ان تمام چیزوں کے چند نقوش نظر آسکتے ہیں جن سے ٹیکسلا کی عظمتِ گذشتہ کا قدرے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ شہر ایک نہایت قدیمی تہذیب کا مدفن ہے۔

وہ بھی کیا دن ہونگے جب یہ وادی اپنے مکینوں سے آباد ہوگی اور یہاں کی ہر چیز، تجارت، تمدن اور ریاست اپنے پورے عروج پر ہوگی۔ جو چیزیں دستبردِ زمانہ سے اب تک محفوظ ہیں ان سے اس زمانہ کے فنِ تعمیر کی ترقی اور یہاں کی تہذیب کا پورا پورا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

رفیع الزّمان خاں جالندھری

اس مضمون کی طیاری میں مندرجہ ذیل کتب سے مدد لی گئی ہے:۔

1. Fa Hien —— A Record of Budhist Kingdoms
   Translated by James Legge.
2. Hiuen Thsang —— Budhist Records of the Western World.
   Translated by Samual Beal.
3. Rapson, E. J. —— Ancient India.
4. Oxford History of India, by Smith, V. S.
5. A Guide to Taxila, by Sir John Marshell.
6. Archaeological Survey of India, Report (1914-15)
   by Sir John Marshell.

گزروں ہوں جس خرابے پہ کہتے ہیں واں کے لوگ
ہے کوئی دن کی بات یہ گھر تھا وہ باغ تھا

دردؔ

قطع تعلّق

اچھا تجھے منظور یہی ہے تو چلی جا
اور جب تجھے جانا ہے بالآخر تو ابھی جا

لیکن مجھے واپس مرا آرام دیئے جا
اور جیب و گریباں کا مرے چاک سیئے جا

تجھ بن یہ بُجھا رہتا ہے اس درجہ کہ توبہ
جا دِل کو مگر خُوگرِ تنہائی کیئے جا

ایسا نہ ہو رہ جائے تری یاد مرے پاس
جاتی ہے تو جا پر اسے ہمراہ لیئے جا

گو خود تو پڑا کشمکسِ ہجر کے پالے
جا کرتا ہوں تجھ کو مگر اللہ کے حوالے

مرزا یاور علی

غالب اور بیدل

(بہ سلسلۂ اشاعتِ جنوری)

غالب نے محض اپنی نظم کا اندازِ بیان ہی بیدل سے مستعار نہیں لیا بلکہ معنوی طور پر بھی وہ ایک نمایاں حد تک بیدل سے متاثر ہؤا ہے۔ اس معنوی مناسبت کی ایک دلیل وہ بہت سے مخصوص الفاظ اور ترکیبیں ہیں جو بیدل اور دَورِ اوّل کے غالب میں مشترک ہیں۔ بیدل کے ان الفاظ و اصطلاحات کو غالب کسی کورذوق اور فرومایہ نقال کی طرح بے سمجھے بوجھے استعمال نہیں کرتا بلکہ جن فلسفیانہ تصورات پر یہ الفاظ دلالت کرتے ہیں، اُن کے تمام پہلوؤں سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا ہے اور اُنہیں اپنی شخصیت کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً جوہر اور عرض کے باہمی تعلق کی بہت سی ممکن صورتیں اس کے ذہن میں پیدا ہوتی ہیں اور ان صُورتوں کو وہ اس طرح بار بار قیدِ شعر میں لانا چاہتا ہے جس طرح کوئی بچہ چکنی مٹّی کو رہ رہ کر ایک نئی شکل دیتا ہے۔ ان مخصوص ترکیبوں میں سے بعض کو تو خود بیدل ہی نے وضع کیا ہے اور بعض اگرچہ نئی نہیں ہیں مگر بیدل نے کثرتِ استعمال سے انہیں ایک خاص مفہوم دے دیا ہے۔ غالب کو ابتدائی دَور میں یہ الفاظ و تراکیب بہت مرغوب ہیں اور ان کے استعمال کے ساتھ ساتھ بیدل کے خیالات کا اثر تقریباً ہر جگہ شامل ہے۔ ان میں سے صرف چند کا ذکر یہاں کافی ہوگا۔

جوہر۔ عرض۔ تامّل (بمعنی مطالعۂ باطن)۔ پرافشاں، بیضۂ طاؤس، بالِ طپیدن، کاغذِ آتش زدہ، دامِ خیال، غبارِ شیشۂ ساعت، یک الف کم اور یک الف بیش وغیرہ۔ اسی طرح خوں شدہ دل اور غنچے کی تشبیہ غالب نے بکثرت استعمال کی ہے مثلاً ؎

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دِل خوں کیا ہؤا دیکھا، گُم کیا ہؤا پایا

اس کا ماخذ بیدل کے اس قسم کے اشعار ہیں ؎

غنچہ گردیدیم گلشن در گریباں زتگلیم عشرتِ سربستہ از دِل ہائے خونیں بودہ است

(ہم نے غنچہ بن کر باغ کی بہار خود اپنے گریبان میں دیکھ لی؛ عشرتِ پنہاں کا مزہ کچھ خوں شدہ دل ہی میں آتا ہے)

غالب کا وہ شعر جس میں اس نے دل کو ایک ٹپکتے ہوئے قطرۂ خوں سے مشابہ قرار دیا ہے بہت مشہور ہے۔ اس کا سُراغ بھی بیدل کے ایک مقطع تک پہنچتا ہے۔

زاحوالِ دلِ غم دیدۂ بیدل چہ می پرسی کہ ہست ایں قطرۂ چوں غنچہ محروم از چکیدنہا

بیدل کے غم زدہ دل کا حال کیا پوچھتے ہو۔ یہ ایک ایسا قطرہ ہے جو غنچے کی طرح ٹپکنے سے محروم ہے)

اگرچہ تشبیہ کا تعلق دراصل نظم کے صوری عنصر سے ہے لیکن مندرجہ بالا تشبیہات کے استعمال میں معنوی اشتراک کی جھلک صاف نظر آتی ہے اس سے قطع نظر ہمیں کئی ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں دونوں شاعروں نے ایک ہی مضمون ادا کیا ہے مثلاً بیدل کے ان دو شعروں پر غور کیجئے ؎

دلِ آسودۂ ما شورِ امکاں در قفس دارد گہر دزدیدہ است ایں جا عنانِ موجِ دریا را

(ہمارے پُرسکوں دل میں تمام کائنات کے ہنگامے بند ہیں یہاں موتی نے موجِ دریا کی باگ اپنی طرف پھیر لی ہے)

اضطرابِ موج آخر محوِ گوہر می شود درکمین ما دلِ بے مدعا اُفتادہ است

(دریا کا اضطراب آخر کار گوہر میں محو ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہماری ہنگامہ خیزیوں کی تاک میں بھی دلِ بے مدعا پڑا ہے)

ان دونوں شعروں کے ساتھ غالب کے حسب ذیل شعر کا تعلق بالکل واضح ہے ؎

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا گہر میں محو ہؤا اضطراب دریا کا

اسی طرح بیدل ایک اور جگہ کہتا ہے ؎

تنگنائے بیضہ بیدل گوشۂ آرام بود شد پریشاں مُرغِ ما تا بال و پر آوردہ است

غالب نے اسی مضمون میں پر کشائی کی زیادہ وسعت پیدا کی ہے ؎

بیضہ آسا ننگِ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس از سرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے

یہاں صرف چند اور مثالوں کی طرف اشارہ کرنا کافی ہوگا ؎

بیدل:۔ چوں غبارِ شیشۂ ساعت تسلی دشمنم ازمزاجِ خاکِ ما ہم بردہ اند آرام را

(مجھے اطمینان و سکون سے اتنا ہی بیر ہے جتنا بالو جنتر کی ریت کو میری مٹی کے خمیر ہی میں سے آرام نکال لیا گیا ہے)

غالب:۔ نہ بھولا اضطرابِ دم شماری انتظار اپنا کہ آخر شیشۂ ساعت کے کام آیا غبار اپنا

بیدل:۔ صدائے کہ پیچیدہ بر سازِ ہستی چہ دارد بجز نالہ زنجیر خانہ!

(تو ایک صدا ہے جو زندگی کے ساز سے پیدا ہوئی زنجیر خانے میں نالے کے سوا ہو بھی کیا سکتا ہے!)

غالب:۔ بہ نالہ حاصلِ دل بستگی فراہم کر متاعِ خانۂ زنجیر جز صدا معلوم!

بیدل:۔ رمزِ فرصت بہ کفِ من بہ توحیراں بودم آنقدر دست نہ دارم کہ تواں سُود بہم

غالب:۔ فرصتِ آئینہ صد رنگِ خود آرائی ہے روز و شب یک کفِ افسوسِ تماشائی ہے

بیدل:۔ ہر چند دستگاہ بود پیش، حرص بیش از موجِ بحر تشنہ لبی می کشد زباں

(جب تمام اسباب میسر ہوں تو حرص اور بڑھ جاتی ہے سمندر کی موج سے دراصل تشنہ لبی زبان پھیلاتی ہے)

غالبؔ:۔ ہوا وصال سے شوقِ دلِ حریص زیادہ لبِ قدح پہ کفِ بادہ جوشِ تشنہ لبی ہے

جس حد تک غالب کے اپنے ارادے کو تعلق تھا، اُس نے سنِ بلوغ کو پہنچنے سے کچھ پہلے بیدل کی تقلید ترک کر دی۔ اگرچہ اندازِ بیان برسوں کی مشقِ سخن اور طبیعت کے تخیلی میلان کی وجہ سے جس روش پر پڑ چکا تھا، اس سے علیحدہ ہونا ابھی اور چند سال تک عملاً غالب کے لئے ناممکن تھا۔ لیکن جب وہ زمانہ آیا کہ مرزا بیدل اور خیال بند شعرا کی روایت سے قطع نظر کر کے غالب نے اپنے ذاتی اجتہاد کی بنا پر اُردو میں ایک نیا (مگر کسی قدر ملتا جلتا) اسلوبِ بیان پیدا کر لیا، اُس وقت بھی اس نے اپنی اوّلین شاعرانہ عقیدت کو بالکل خواب فراموش نہیں بنا دیا اب فارسی میں غالب خود پایۂ اُستادی کو پہنچ چکا تھا اور بیدل کی فارسی گوئی کے متعلق گاہ بہ گاہ کوئی حقارت آمیز اشارہ کرنے میں اسے باک نہیں تھا۔ تاہم اس کے عہدِ طفلی کے شاعر کی روح کبھی کبھی اس کے خیال کی دُنیا میں پھر داخل ہوتی تھی۔ بڑھاپے میں مرزا ہرگوپال تفتہ کو ایک خط لکھا ہے جس میں یہ عبارت نظر آتی ہے؛ ایک چرخ ہے جو چلا جاتا ہے۔ جو ہونا ہے وہ ہوا جاتا ہے۔ اختیار ہو تو کچھ کیا جائے ...... مرزا عبدالقادر بیدل خوب کہتا ہے ؎ رغبتِ جاہ چہ و نفرتِ اسباب کدام۔ زیں ہوسہا بگذر یا نگذر، می گذرد"

پہلے دَور سے آگے بڑھ کر بھی غالب کے کلام میں بار بار یہ شہادت ملتی ہے کہ ابھی بیدل کی آواز اُس کے دل و دماغ میں گونج رہی ہے۔ مثال کے طور پر بیدل کا یہ شعر دیکھئے ؎

تا بہ کے بے مدعا چوں شمع باید رفتنت جادۂ خود را نسازی محو در منزل چرا؟

(تو کب تک شمع کی طرح بے مدعا راہ پیما رہے گا؛ کیوں نہیں اپنے راستے کو منزل میں محو کر دیتا)

ظاہر ہے کہ یہ غالب کے اس شعر کا نقشِ اوّل ہے ؎

رنجِ رہ کیوں کھینچئے؟ واماندگی کا عشق ہے! اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

بیدل کا شعر ہے ؎

نیست بیدل غیر از اظہارِ عدم اندر جہاں تا خموشی پردہ از رُخ برفگند آواز بود

(بیدل! دُنیا میں عدم کے ظہور کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے جب خاموشی چہرے سے نقاب اُلٹتی ہے تو آواز ہو جاتی ہے)

غالب کہتا ہے ؎

نشو و نما ہے اصل سے غالب فروع کو خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے

بیدل کا ایک اور شعر ہے ؎

نفی خود می کنم اثبات بروں می آید تا کجا رنگِ تواں باخت بہارست اینجا

اس کے مقابل میں غالب کا شعر اتنا بلند نہیں ہے مگر یہ ظاہر ہے کہ کسی پیچ در پیچ طریقے پر بیدل کا اثر اس کے دماغ میں کام کر رہا تھا ؎

نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا — دی ہے جائے دہن اُس کو دمِ ایجاد نہیں

غالب کے دورِ پختگی کا ایک اور بہت مشہور شعر ہے جو صاف طور پر بیدل کے ایک شعر کا ترجمہ ہے۔ بیدل کہتا ہے ؎

بہ ہستیٔ تو اُمید است نیستی ما را — کہ گفتہ اند اگر ہیچ نیست اللہ است

(تیرے ہونے سے ہمیں نیستی پر بھی اُمید ہے۔ — کیونکہ کہتے ہیں کہ اگر کچھ نہ ہو تب بھی خدا ضرور ہو)

غالب کے ترجمے میں منطقیانہ استواری کی شان زیادہ نمایاں ہے۔ بیدل کی نظر آئندہ امکانات کی دُنیا پر بھی ہے۔ اس کے برعکس غالب نے بالکل قدرتی طور پر آغازِ کار کا جائزہ لیا ہے۔ یہاں خیال بند شاعر کا لبریزِ جذبات استدلال اپنی پوری شاعرانہ کیفیتوں کے ساتھ جلوہ گر ہے ؎

۸) نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا — ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا!

دراصل لڑکپن ہی میں جو چیز غالب کو سب سے زیادہ باعثِ کشش معلوم ہوئی، وہ بیدل کے فلسفیانہ مضامین تھے۔ تحلیلی اندازِ طبیعت کا منطقی نتیجہ فلسفہ دانی ہے۔ بیدل اور غالب دونوں کی طبیعت میں تحلیل و تجزیہ کا مادہ اس شدت سے موجود ہے کہ بیدل کا کلام تو تمام تر فلسفیانہ خیالات سے بھرا ہوا ہے اور غالب کی شاعری میں بھی فلسفے کو ایک امتیازی مرتبہ حاصل ہے۔ بیدل کی مابعد الطبیعی دلچسپی نے غالب کو شروع ہی میں بتا دیا کہ یہاں ایک ہم آہنگ روح موجود ہے چنانچہ دورِ اول میں جو اغلاق اور پیچیدگی نظر آتی ہے اُس کی ایک وجہ وہ فلسفیانہ باریک بینیاں ہیں جو بیدل کے مضامین کی تقلید میں ناگزیر ثابت ہوئیں۔ ارسطو کہتا ہے کہ فلسفے کا آغاز استعجاب و تجسس سے ہوتا ہے۔ غالب کے فطری فلسفیانہ میلان کا ثبوت اس سے زیادہ کوئی نہیں ہو سکتا کہ لڑکپن ہی میں بھی فلسفیانہ تجسس کا عنصر اُس کے کلام میں بڑی وضاحت کے ساتھ نمودار ہو چکا تھا۔ وہ کائناتی سوال جنہوں نے اُس کے ذہن کو ہمیشہ بے چین رکھا اور جن کے لئے شعرائے اُردو کی صف میں اُسے ایک ممتاز رتبہ حاصل ہے تقلیدِ بیدل کے دَور میں بھی اس کے لئے خاص اہمیت حاصل کر چکے تھے۔ اگر بیدل یہ پوچھتا کہ ؎

کو مقامے کہ تواں مرکزِ ہستی فہمید — از زمیں تا فلک آغوش کشیدست عدم

(وہ مقام کون سا ہے جسے مرکزِ ہستی قرار دیا جا سکے؟ — زمین سے آسمان تک تو عدم کا آغوش پھیلا ہوا ہے)

تو غالب بھی پکار اُٹھتا تھا کہ ؎

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب! — ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

بہت سے فلسفیانہ تصورات ایسے ہیں جنہیں غالب واضح طور پر بیدل سے اخذ کرتا ہے مثلاً زندگی کے لئے پابندیٔ نظام کی ضرورت کا تصور۔ بیدل کہتا ہے ؎

قطرہ ہا در ضبطِ موج آئینہ دار گوہر اند — تا شود روشن کہ سعیٔ خامشی بیہودہ نیست
(قطرے موج سے وابستہ ہو کر موتی بن جاتے ہیں۔ — یہ اس کا ثبوت ہے کہ خاموشی محض ایک سعیٔ نامشکور نہیں ہے)

غالب نے اسی خیال کو بہتر پیرائے میں ادا کیا ہے ؎

بہ رہنِ ضبط ہے آئینہ بندیٔ گوہر — وگرنہ بحر میں ہر قطرہ چشمِ پُرنم ہے!

بیدل اور غالب کے دو دو اور شعر جن میں فلسفیانہ مضمون کی مناسبت موجود ہے یہاں درج کئے جاتے ہیں: ؎

بیدل: در تکلم از ندامت ہیچ کس آسودہ نیست — جنبشِ لب یک قلم جز دست بر ہم سودہ نیست
(بات کرنے میں کوئی شخص ندامت سے محفوظ نہیں رہتا — جنبشِ لب کو یہی سمجھو کہ (حسرت سے) ایک ہاتھ کو دوسرے پر مل رہے ہو)

غالب: زبسکہ مشقِ تماشا جنوں علامت ہے — کشاد و بستِ مژہ سیلیٔ ندامت ہے

بیدل: قطرۂ ما تا کجا سامانِ خود داری کند — بحر ہم از موج این جا می شمارد دام ہا
(ہمارا قطرہ کب تک اپنے نفس کو بچاتا رہے — یہاں تو سمندر (اپنی موج میں بھی دام چھپائے ہوئے ہے)

غالب: دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ — دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

ایک بڑی حد تک اسی فلسفیانہ رمز شناسی کی بدولت غالب اور بیدل دونوں اپنے آپ کو عوام سے برتر سمجھتے تھے۔ غالب کی روشِ عام سے علیحدگی بہت مشہور ہے مگر بیدل کو بھی اس معاملے میں اپنی ذات پر کچھ کم اعتماد نہ تھا۔ ایک مرتبہ نواب شکراللہ خاں کی مجلس میں مرزا بیدل اور شیخ ناصر علی دونوں جمع تھے۔ بیدل کے اس مطلع کا ذکر آ گیا ؎[1]

نشد آئینۂ کیفیتِ ما ظاہر آرائی — نہاں ماندیم چوں معنی بچندیں لفظ پیدائی
(آرائشِ ظاہری نے ہماری اندرونی کیفیت کو کبھی آشکار نہ کیا — اتنے لفظوں کے ہوتے ہوئے بھی ہم معنی کی طرح پنہاں رہے)

ناصر علی نے کہا کہ دوسرا مصرع خلافِ دستور معلوم ہوتا ہے کیونکہ معنی لفظ کے تابع ہے، لفظ جب بھی ظاہر ہوتا ہے معنی خود بخود ظاہر ہو جاتا ہے۔ بیدل نے ایک حقارت آمیز تبسم کے ساتھ جو جواب اپنے نامور معاصر کو دیا وہ کسی ایسے ہی دماغ سے نکل سکتا تھا جو فلسفیانہ خیالات سے منجھا ہؤا ہو اور جسے اپنی فوقیت کا پورا احساس ہو۔ اس نے ناصر علی سے مخاطب ہو کر کہا: "وہ معنی جسے آپ تابعِ لفظ قرار دیتے ہیں اس کی اصلیت بھی ایک لفظ سے زیادہ نہیں۔ جو چیز حقیقت میں معنی کہلاتی ہے وہ کسی لفظ میں نہیں سما سکتی۔ مثلاً انسان کی ماہیت اُن شرحوں اور تفصیلوں کے باوجود جو کتابوں میں درج ہیں، بالکل نہیں کھُل سکی۔" بیچارے شیخ ناصر علی یہ جواب سُن کر خاموش ہو گئے۔

بیدل عوام کا شاعر نہیں ہے۔ عجب نہیں کہ عوام کی روش سے علیحدگی کی خواہش نے بیدل کی طرف غالب کے میلان کو مزید تقویت

[1] مرآۃ الخیال صفحہ ۲۹۶

پہنچائی ہو۔ بہرحال اس خاص معاملے میں غالب اور بیدل کی طبیعت کا اشتراک بالکل روشن ہے۔ دونوں کے دل میں کسی نہ کسی وجہ سے عوام کے متعلق حقارت کا شدید احساس موجود ہے۔ بیدل کہتا ہے ؎

زابنائے جہاں بیہودہ دردِ سر مکش بیدل — اگر بارے نداری التفافت چیست باخرہا؟

(بیدل! تم دُنیا والوں کے ساتھ کیوں بےکار سر کھپاتے ہو؟ تمہارے پاس کوئی بوجھ تو ہے نہیں ، پھر گدھوں سے یہ کام؟)

اسی طرح غالب ایک فارسی رباعی میں تمام دُنیا کے جاہلوں کو گدھے قرار دیتا ہے اور ان کے مختلف طبقوں کے درمیان صرف اتنا فرق کرتا ہے جتنا خرِ عیسیٰؑ اور خرِ دجال میں ہے۔

بیدل اور غالب کے متعلق ایک اور بنیادی حقیقت ایسی ہے جس کو پیشِ نظر رکھ کر دونوں کے باہمی تعلق کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ دونوں کی فطرت میں وہ خاص روحانی کیفیت بدرجۂ اتم موجود ہے جسے غالب کہیں وارستگی اور کہیں خود بینی، آزادی یا آزادہ روی کہتا ہے۔ یہ کیفیت دوسرے لفظوں میں اپنی روح کے عزم وہمت اور شخصی غرور وطاقت کا وہ احساس ہے جو مصائبِ حیات کو خاطر میں نہیں لاتا، جو اسبابِ ظاہری سے مرعوب یا مغلوب ہو جانے میں اپنی توہین سمجھتا ہے اور ناکامیوں کو ایک "رئیسانہ" شان سے نظر انداز کرنے یا حقارت سے ٹھکرانے کی کوشش کرتا ہے۔ مرزا غالب کے لئے (برعکس مرزا بیدل کے) خاندان ونسب کا غرور بھی اس احساس کی پشت پر موجود تھا۔ بیدل کی صورت میں اس احساس کو اُس کے فلسفۂ خودی اور جذبۂ حرکت وعمل سے بہت گہرا تعلق ہے۔ بیدل کی شاعری میں (دوسرے مضمونوں کے ناپید ہونے کی وجہ سے) یہ مضمون اس قدر نمایاں ہے کہ میں اُس کے کلام میں سے صرف دو تین مثالیں دینے پر اکتفا کروں گا۔

بہ شوخی آمد از بے دست گاہی احتیاجِ من — درازی کرد دست آخر ز کوتہ آستینی ہا

(بے وسیلہ ہونے کی وجہ سے آخر میری غربت ہی شوخی میں آگئی ، گویا میں نے اپنی کوتاہ آستینی کی وجہ سے دراز دستی کی)

مقامِ وصل نایاب است ، راہِ سعی ناپیدا — چہ می گردیم یارب گر نہ بودے نارسیدنہا

(یہیں منزلِ محبوب نہیں ملتی اور سعی وہمت کا راستہ گم ہے؛ خدایا! اگر نارسائی بھی نہ ہوتی تو ہم غریبوں کا کیا حشر ہوتا)

اس پر غالب کا ایک شعر یاد آتا ہے جسے بعض حضرات اُس کی "قنوطیت" کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں لیکن جس میں دراصل یہی احساسِ وارستگی غالب کے دماغی پس منظر کے طور پر صاف نظر آتا ہے ؎

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دُور — رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم!

بیدل کا ایک اور شعر ہے ؎ واماندگی زعافیتم بے نیاز کرد — بال آں قدر شکست کہ از آشیاں گزشت

(مصیبتوں نے مجھے عیش وآرام سے بے پروا کر دیا۔ میرے پر اس قدر ٹوٹے کہ آشیاں کو باہر جا پڑے)

غالب کے ایک مشہور شعر میں کچھ اسی قسم کا خیال ظاہر کیا گیا ہے :۔

رنج سے خوگر ہُوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

یہ شعر غالب کے آخری دورِ شاعری سے ماخوذ ہے۔ لیکن پہلے اور دُوسرے دَور میں بھی اس طرزِ احساس کی کچھ کمی نہیں۔ مثلاً پہلے دَور کا یہ شعر دیکھئے ؎

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

اسی طرح دوسرے دَور کے ایک شعر میں کہا ہے :؎

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں جی خوش ہُوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

اگر ایک طویل نظم میں یہ دیکھنا ہو کہ انتہائی درد و کرب کے احساس کے ساتھ ساتھ غالب کی یہ وارستگی و آزادگی کیا کیا مختلف اور متعدد شکلیں اختیار کرتی ہے تو غالب کا وہ فارسی ترکیب بند پڑھنا چاہیئے جو اس نے دہلی کی انگریزی عدالت سے سزائے قید پانے کے دو ڈھائی مہینے بعد غالباً ستمبر ۱۸۴۷ء میں جیل خانے کی دیواروں کے اندر بیٹھ کر لکھا۔ یہاں عزیمت و وارستگی کا احساس بھی ہے، اور ظرافت کی وہ شان بھی، جس کی کوئی جھلک بیدؔل کے کلام میں نظر نہیں آتی۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے رئیسِ شہر اور شریف النسب ہونے کا احساس غالب کے لئے بیک وقت سرمایۂ قوت اور سرمایۂ عذاب ہے۔ مگر یہ نظم اپنے متنوع نفسیاتی پہلوؤں کے لحاظ سے بہت پیچیدہ ہے جن کے تفصیلی تجزیے کا یہ موقع نہیں۔

جن کیفیات کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، ان کے علاوہ ایک اور شخصی جوہر ایسا ہے جو بیدؔل اور غالبؔ دونوں کی فطرت کے خمیر میں داخل ہے۔ یہ استغنا کا جوہر ہے جو غالب کے اس قسم کے اشعار میں کارفرما ہے ؎

نہ ستائش کی تمنّا، نہ صِلے کی پروا گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

دردِ منت کشِ دوا نہ ہُوا میں نہ اچھا ہُوا، بُرا نہ ہُوا

اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ غالبؔ کو بیدؔل کی طرف جو کشش ہوئی اُس میں طبیعت کے اس رنگ کو خاص دخل تھا۔ بیدؔل اپنے استغنا کے لئے بہت زیادہ مشہور ہے کیونکہ اس کی زندگی شروع سے آخر تک عملاً اسی استغنا کا مرقع تھی۔ وہ خود بڑی دھوم دھام سے کہتا ہے ؎

آخر ز فقر بر سرِ دُنیا زدیم پا خلقے بہ جاہ تکیہ زد و ما زدیم پا

(آخر دُنیا کو ہم نے اپنے پائے فقر سے ٹھکرا دیا۔ لوگوں نے جاہ و حشمت کا سہارا ڈھونڈا اور ہم نے اسے پاؤں سے ٹھوکر مار دی۔)

بعض لوگ جو غالب کی آخر عمر کی قصیدہ خوانیوں کو غیر متناسب اہمیت دینے کے خوگر ہیں، یہ سمجھنے میں دقت محسوس کرتے ہیں کہ

بیدل جیسے قناعت شعار اور مستغنی المزاج انسان کے ساتھ اسے کیا نسبت ہوسکتی ہے۔ اس طرزِ خیال کے لوگوں کو یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ بیدل عہدِ اورنگ زیب کا شاعر ہے، جب ہندوستان ابھی "گولڈن انڈیا" کہلاتا تھا۔ بہادر شاہ کا ہندوستان بڑی حد تک مفلس ہندوستان تھا۔ حال ہی میں "مکاتیبِ غالب" کا جو نسخہ رام پور سے شائع ہؤا ہے اس کے مندرجہ خطوط میں سے بعض غالب کے بڑھاپے کی مالی پریشانیوں پر دردناک انداز میں روشنی ڈالتے ہیں۔ غالب کا افلاس اور بڑھاپا انتہائی تکلیف تک پہنچ گیا ہے اور اُسے پچاس روپے کی حقیر رقموں کے لئے نواب صاحب رام پور کو جس عجز و ابرام کے ساتھ خط لکھنے پڑتے ہیں وہ بے حد عبرت انگیز ہے۔ اس کے مقابلے میں بیدل کا ماحول دولت و ثروت سے مالامال تھا، تمام بڑے بڑے اُمرا اس کے دروازے پر آنا اور اس کی خدمت میں تحائف پیش کرنا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ مجموعۂ رام پور کے بعض مکاتیب پر غور کیجئے اور اس کے ساتھ محمد حسین آزاد کی زبان سے بیدل کی زندگی کا یہ واقعہ سنئے:-

ایک کابلی سوداگر انار ہندوستان میں بیچنے کو لایا۔ اتفاقاً سب انار اس کے گل گئے۔ حیران ہوکر چند انار جو باقی تھے بطریقِ نذر مرزا (بیدل) کے پاس لایا اور عرضِ حال کیا۔ مرزا نے ایک شعر اسے لکھ دیا اور نواب لطف اللہ خاں کے پاس بھیج دیا۔ وہ شعر یہ ہے ؎

خندہ دارد چرخ ہم بر ہرزہ گردی ہائے من | بخیۂ کفشم اگر دنداں نماشد عیب نیست

نواب اسے حسنِ طلب سمجھے کہ شاید مرزا کی جوتی ٹوٹ گئی ہے اور نہایت غنیمت سمجھے۔ اسی وقت ایک لاکھ روپیہ بھیج دیا۔ مرزا نے کُل روپیہ اُسی کابلی کو دے دیا۔

جس شخص کے حالات یہ ہوں اُس کی زندگی کی بنیاد اگر استغنا پر قائم رہی تو کیا تعجب ہے!

یہ سچ ہے کہ عزّ و جاہ کی جو طلب غالب میں نظر آتی ہے وہ بیدل میں مفقود ہے اور اس بنا پر دونوں کی سیرت میں یقیناً ایک امتیاز قائم ہے۔ اس فرق کی بنیاد یہ ہے کہ غالب کو دُنیا کی لذتیں لذیذ معلوم ہوتی ہیں۔ وہ زندگی کی نعمتوں اور مسرتوں کا حریص ہے اور بڑی بڑی حد تک ان سے لطف اُٹھانا چاہتا ہے، اُس کے پاس استغنا تو ہے مگر قناعت نہیں ہے۔ اس کے برعکس بیدل کے لئے لذائذِ دنیوی سرے سے کوئی کشش ہی نہیں رکھتے۔ چنانچہ خود کہتا ہے ؎

کافرم گر مخمل و سنجاب می باید مرا | سایۂ بیدے کفیلِ خواب می باید مرا

(مخمل اور سنجاب کی حرص کس کافر کو ہے۔ | میرے آرام کے لئے تو بید کے درخت کا سایہ کافی ہے)

ایک اور شعر میں اس سے بھی زیادہ خوبی کے ساتھ یہی مضمون ادا کیا ہے ؎

دنیا اگر دہند نہ جُنبم ز جائے خویش | من بستہ ام حنائے قناعت بہ پائے خویش

(مجھے اگر دولتِ دنیا بھی دیں تب بھی اپنی جگہ سے نہ ہلوں | میں نے پاؤں میں قناعت کی مہندی لگا رکھی ہے)

غالب کچھ اپنے حالات اور کچھ اپنی اُفتادِ طبیعت کی وجہ سے قناعت کی اس بلندی تک کبھی نہ پہنچا۔ لیکن ساتھ ہی بیدل کا جنونِ استغنا اتنا سخت بھی نہیں ہے جتنا بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے۔ اُس کے رقعات کو دیکھئے تو اندازہ ہوگا کہ دوستوں کے تحائف و ہدایا کے معاملے میں وہ کچھ ایسا بے نیاز نہیں تھا۔ اس کے علاوہ نظام الملک آصف جاہ اوّل کی استادی قبول کرنا بھی استغنا کی خاص دلیل نہیں ہے باقاعدہ مدح گوئی اس نے اگرچہ نہیں کی لیکن اُسے امراء کی خوشنودی حاصل کرنے سے عار نہیں تھا۔ امیر الامراء سید حسین علی خاں کی تعریف میں اُس کے دو شعر میر غلام علی آزاد بلگرامی کے تذکرۂ شعراء میں موجود ہیں۔ بیدل ایک نئی دَور کا شاعر ہے اس لئے اپنے ممدوح کے لئے "نشۂ پیمانۂ قدرت" کی خوبصورت ترکیب استعمال کرتا ہے۔ وہ دو شعر یہ ہیں۔

اے نشۂ پیمانۂ قدرت! بچہ کاری　　ہمتی اثری یا سپئے تاراجِ خماری
مے در قدحی، گل بہ سری، جام بہ دستی　　رنگِ چمنی، موجِ گلی، جوشِ بہاری!

غالب کو اس قسم کے قدر دان نہ مل سکے جیسے خوبیِ قسمت سے بیدل کو میسر آئے۔ بیدل دائیں ہاتھ سے لے کر بائیں ہاتھ سے دے سکتا تھا۔ غالب کو اس قسم کی فیاضانہ داد و دہش کی حسرت ہی رہی ؎

نہ بخشندہ شاہے کہ بارم دہد　　بہر بار زر پیل بارم دہد
کہ چوں پیل زانجا برانگیزمے　　زرش برگدایاں فرو ریزمے

لیکن قسمت کی ان تمام کوتاہیوں اور ایک ملکے سے فرقِ سیرت کے باوجود یہ یاد رکھنا چاہئے کہ بیدل اور غالب استغنا کے معاملے میں بحیثیتِ مجموعی متحد تھے۔ اگر بیدل نے شاہزادہ محمد اعظم کی ملازمت کو ایک اصول کی خاطر ٹھکرا دیا تو غالب نے بھی حکومتِ ہند کے چیف سکرٹری مسٹر ٹامسن کی پیشکش کو اپنی آن پر قربان کر دیا اور جب کعبۂ حکومت کا دروازہ اُس کے لئے وا نہ ہوا تو وہ اُلٹے پاؤں واپس چلا آیا۔ جو لوگ مکاتیبِ رام پور سے غالب کی طبیعت کا اندازہ کرنا چاہیں وہ اُس واقعے کو بھی نظر انداز نہ کریں۔ جو کلکتے جاتے ہوئے اُسے لکھنؤ میں نائب السلطنت اودھ کی ملاقات کے سلسلے میں پیش آیا۔ نائب السلطنت آمادۂ لطف و کرم تھا مگر آدابِ ملاقات کے سلسلے میں جو شرطیں اس نے لگائیں انہیں غالب کی خودداری قبول نہ کر سکی چنانچہ مسٹر ٹامسن کی طرح اُسے بھی غالب کی ملاقات کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔

غالب میں استغنا کا یہ جوہر تقلیدِ بیدل کے دَور ہی میں واضح ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس عہد کا ایک شعر ہے ؎

وہ بے دماغِ منتِ اقبال ہوں کہ میں　　وحشت بہ داغِ سایۂ بالِ ہما کروں

اسی زمانے کے قریب کا ایک اور شعر ہے ؎

دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم　　اے خانماں خراب نہ احساں اُٹھائیے

تشریحاتِ بالا سے شاید یہ خیال پیدا ہو گیا ہو کہ دورِ اوّل میں غالب محض بیدل کی صدائے بازگشت ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ خیال درست نہیں ہے۔ غالب نے بیدل کے اندازِ بیان کی کامل تقلید تو ضرور کی ہے لیکن اپنی جامع الصفات شخصیت کو بیدل کی زیادہ طوفانی مگر کم ظرف شخصیت میں بالکل ضم نہیں کر دیا۔ اس زمانے میں وہ ایسے مضامین بھی لکھ جاتا ہے جو بیدل کی زبان سے کبھی ادا نہیں ہو سکتے تھے، مثلاً دورِ اوّل کی ایک غزل ہے جس میں بیدل سے صاف طور پر اظہارِ عقیدت کیا ہے :؎

آہنگ اسد میں نہیں جز نغمۂ بیدل — عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

لیکن اسی غزل کے ایک شعر میں بڑے زور سے ایک ایسی آزاد خیالی کی بات بھی کہہ دی ہے جس کا متحمل بیدل کا اسلامی فلسفہ کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ شعر یہ ہے :۔

کس بات پہ مغرور ہے اے عجزِ تمنّا! — سامانِ دُعا وحشت و تاثیرِ دعا ہیچ!

یہ اختلافات تقلیدِ بیدل ترک کر دینے کے بعد اور نمایاں ہو گئے ہیں۔ مثلاً بہشت پر اگرچہ غالب اور بیدل دونوں کو اعتراض ہے مگر دونوں کی صورتوں میں وجوہِ اعتراض مختلف ہیں۔ بیدل کو اقبال کی طرح بہشت میں بھی آرزوؤں کی گرمی اور انسانی زندگی کے ہنگاموں کی تلاش ہے۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

گویند بہشت است و ہمہ راحتِ جاوید — جائے کہ بداغے نہ طپد دل چہ مقام است

(کہتے ہیں کہ بہشت میں راحتِ جاودانی کا سامان ہے — گروہ بھی کیا جگہ ہوئی جہاں دل میں داغِ آرزو کی تپش پیدا نہ ہو)

طالبِ صحبتِ معنی نظراں باید بود — خاک در صحنِ بہشتے کہ نہ دارد آدم!

(اہلِ معرفت کی صحبت تلاش کرنی چاہئے — ایسی بہشت پر خاک پڑے جس میں آدمی نہ ہو)

بہشت پر غالب کے اعتراض کے وجوہ بہت سے ہیں مگر سب بیدل سے مختلف۔ اس موضوع پر غالب کے اُردو شعروں سے تقریباً ہر شخص واقف ہے۔ میں اس موقع پر اُس کے صرف ایک فارسی شعر کا حوالہ دوں گا۔ بیدل بہشت سے اس لئے گھبراتا ہے کہ وہاں راحت ہی راحت ہے۔ غالب کو یہ شکایت ہے کہ جنت کی راحتیں اُس معیار پر پوری نہیں اُترتیں جن کا تقاضا انسان کے آلامِ حیات کی تکلیفیں کرتی ہیں ؎

جنّت نکند چارۂ افسردگیٔ دل — تعمیر بہ اندازۂ ویرانیٔ ما نیست!

یہیں سے بیدل اور غالب کی فطرت کا ایک اہم فرق شروع ہو جاتا ہے۔ غالب میں ایک نرمیٔ جذبات، ایک ذکاوتِ حس، ایک لطافت ایسی ہے جو بیدل میں قطعی طور پر مفقود ہے۔ زندگی بیدل کے لئے حرکت، عمل اور پیہم تگ و دو ہے۔ سکون و راحت کو اس کی دُنیا میں کوئی جگہ نہیں ملتی ؎

فالِ رحمت مزن کز پی کفِ خاک — ہر چہ آسودہ تر افسردہ تر است
سرِ ہوائے اقامت درین چمن مفراز — بہ ہوش باش کہ تیغِ گزشتنی تیز است

غالب اس لطفِ خرام اور ذوقِ رفتار سے آشنا ہے مگر سکون و راحت کی لذتوں سے بھی یکسر بیگانہ نہیں ہے۔ راقم الحروف کو اس مسئلے پر ایک دفعہ علامہ اقبال سے گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ علامہ ممدوح نے فرمایا کہ "غالب اور بیدل کی صوفیانہ شاعری میں بہت فرق ہے۔ بیدل کے تصوف میں حرکت ہے مگر غالب کا تصوف مائل بہ سکون ہے۔ بیدل میں یہ حرکی عنصر اس قدر نمایاں ہے کہ اس کا معشوق بھی صاحبِ خرام ہے"۔

یہ ذوقِ سکون خصوصیت کے ساتھ اس وقت واضح ہوا جب غالب نے بیدل کی تقلید بالکل ترک کر دی، ورنہ غالب کے دورِ اوّل میں اس قسم کے اشعار کی کچھ کمی نہیں سے

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا — حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

بیدل کے انداز سے روگرداں ہو کر غالب کی ذہنیت میں جو تبدیلیاں ہوئیں وہ ایک الگ بحث کا موضوع ہیں جن کے لئے کسی اور صحبت میں گنجائش نکالی جائے گی۔

حمید احمد خاں

اُردو

اَے زبانِ مادرِ ہندوستاں اُردو زباں — اے کہ تیری مدح میں ہندی ہیں سب رطب اللساں
تُو ہی ہندی، ہندوی، ہندوستانی بھی تُو ہی — مُسلم و ہنُدو کی وحدت کا ہے تُو واحد نشاں
اِتحاد و ربط کی تصویر ہیں تیرے حروف — تیرا ابجد ہے محبت کی سراپا داستاں
اِشتراک و جذبۂ قومی سے ہے تیرا وجود — تُو ہی گنجِ مشترک ہے تُو ہی ہے قومی زباں
تجھ میں ہی قومی ترانے گانے جانے چاہئیں — اے حُدی خواں تو ہو اور قوم و وطن کا کارواں
تجھ سے غداری ہے غداریٔ وطن اور قوم سے — جو ترا دشمن ہے وہ ہے دُشمنِ ہندوستاں
تیرا جادہ اِس قدر کا ہل برائے ارتقا! — آسمانِ نیلگوں پر جیسے کوئی کہکشاں
تیری خدمت، فرض ہر ہندی کا ہونا چاہئے — تیری سیوا سے بنے جنت نشاں ہندوستاں

یا خُدا توفیق دے ہادیؔ کو اپنے لُطف سے
خدمتِ اُردو میں ہو بیگانۂ سُود و زیاں

منوہر لال ہادیؔ
(دفتر میونسپل کمیٹی نئی دہلی)

محبّت گرم گرم آنسو، محبّت سرد سرد آہیں!

امّی کی موت کا کتنا غم ہے۔ اس محبت پر تو کئی سال گزر گئے تھے۔ اُن خوشیوں کو کیا کہوں جو بس اپنی جھلک دکھلا کے محروم کر گئیں! زندگی کی اندھیری اور کٹھن وادی میں روشنی کی ایک شعاع نظر آئی۔ وہ شعاع غیر محدود تاریکیوں میں جذب ہوئی جاتی ہے جیسے سورج دھیرے دھیرے مشرق سے اُبھر کر مشرق میں ڈوب جائے!

بچپن زندگی کی ساری دلآویزیوں کی آمیزش سے اپنی جوانی کے خواب کی تعمیر کرتا ہے۔ محبت اپنی ایک ادا سے، جوانی ہی نہیں زندگی کی طویل، پُراسرار، اور شاید کبھی ختم نہ ہونے والی راہ کو غم کی سیاہ گھٹاؤں سے بسا دیتی ہے!

میں نے اپنی منگیتر کو بادلوں میں چھپ کے نکلنے والے چاند کی طرح دیکھا ہے۔ اُس کا دراز قد، اُس کے چہرے کی سُرخی، اُس کے لانبے اور کالے بال! پہلے پہل میں نے عورت میں کشش محسوس کی، تو ایک موہوم سی تصویر اپنے خیال میں بنالی۔ اوروں کے لئے ہر عورت، عورت تھی۔ میرے لئے اُس تصویر میں کچھ ایسا جادو بھرا تھا کہ دن رات اُسی کا تصور رہتا۔ رُوح پر دام پھینکے گئے اُس کو سامنے لے آیا۔ ہوس پرستی کی دعوت تھی۔ خیال کی عظمت اور رنگینی میں نے قربان نہ ہونے دی۔ زبیدہ میرے خواب کی تعبیر تھی۔ اب میں نے جانا زندگی کسے کہتے ہیں جیسے پھول بننے سے پہلے کلی مُرجھا گئی ہو، اور اُس کی پتی پتی بکھرنے کو ہو! میری زبیدہ، نوبہار میں موت کے مُنہ میں کھنچی ہوئی جا رہی ہے! میری زندگی کی شمع گُل ہونے کو ہے۔ یہ تازہ، ہری بھری شاخ کوئی دن میں سُوکھ کے رہ جائے گی۔ کائنات آخری سانس لے رہی ہے۔

نہ خدا ہے، نہ میں ہوں، نہ یہ کائنات!

ہمارے دل ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ تو کیوں مجھے اُس کے پاس جانے نہیں دیا جاتا؟ اُسے یقین تو ہو، اور تسکین بھی، کہ اُس کا منگیتر، اُس کے جسم کی تازگی پر نہیں، اُس پر فدا ہے۔ روئی کے سرہانے پر سر رکھ کر نہیں، وہ میری آغوش میں جان دے! ہماری محبوب چیزیں جو ہم سے چھن چکی ہوں اُن کے غم سے اُن کی یاد آئے، تو غم سے کس طرح محبت نہ کریں؟ اُس کے لئے میری زندگی ایک غم ہوگی۔ اُس کی ایک نگاہ، شاید آخری نگاہ، جو میری محبت سے متاثر ہو کر میری طرف اُٹھے!

وہ کہتے ہیں کسی اور سے بیاہ کر لوں۔ گویا عورت ایک مادّی کھلونا ہے۔ جیسے دل کی دُنیا میں رانی بنے بغیر وہ رہ سکتی ہے! اور زبیدہ —— یہ سُن کر وہ جیتے جی قبر میں نہ پہنچ جائے گی!

جیسے برسات کی تاریکیوں میں زہرہ کے طلوع سے ہلکی ہلکی ضَو دمکتی ہو، زبیدہ کا سراپا میری زندگی کی کالی رات میں ایک نورانی تارا ہے جس کی دھیمی دھیمی خنک روشنی سکون و مستی کے ہزار جام لئے میری رُوح بن جائے!

"ابنِ مریم"

تماشا

(ایک گیت)

دُنیا ایک تماشا

بس

دُنیا ایک تماشا

پھُول کھِلے کھِل کر مُسکائے اُڑتا گاتا بھونرا آئے

نازک کلیوں میں سو جائے

پائے من کی آشا

بس

دُنیا ایک تماشا

گرم ہوا کے جھونکے آئیں پھُول گریں۔ گِر گِر مُرجھائیں

بھونرے کے بھی پر جل جائیں

نکلے اُس کا لاشا

بس

دُنیا ایک تماشا

کیوں کرتے ہو عیش پرستی رنگ بدلتی ہے یہ بستی

آج بلندی اور کل پستی

تولا پل میں ماشا

بس

دُنیا ایک تماشا

احمد ندیم قاسمی بی۔ اے

نوائے شاعر

نفس کے ساز کا ہر تار گو شکستہ ہے
ہنوز نغمۂ دلدوز اس سے پیدا ہے

وہ نغمہ جس سے زمانے میں حشر برپا ہے
وہ نغمہ جس پہ عنادِل کو رشک آتا ہے

وہ نغمہ جس میں ہے مضمر حیاتِ نَو کا پیام
وہ نغمہ مردہ دلوں کے لئے جو عیسےٰ ہے

وہ نغمہ جس میں ہے صہبائے تُند کی تیزی
جو مثلِ برق ہر اک رگ میں دوڑ جاتا ہے

وہ نغمہ جس سے تموج ہے قلبِ ساحل میں
وہ نغمہ جوش در آغوش جس سے دریا ہے

وہ نغمہ جس سے قدم تیز تیز اُٹھتے ہیں
وہ نغمہ جس کی ہر اِک تان ہمت افزا ہے

وہ نغمہ ہوتی ہے تخلیق آرزو جس سے
جو نغمہ روح کو اور دِل کو گُدگُداتا ہے

وہ نغمہ حُسن کو جو آشنائے ناز کرے
وہ نغمہ عشق میں جس سے نیاز پیدا ہے

سُنا رہا ہے پیام اپنا شاعرِ دانا
سُنو، کہ تم کو بھی اس گلستاں میں جینا ہے

چمن میں تم کو ضرورت ہے چار تنکوں کی
تمہیں بھی اپنا یہاں آشیاں بنانا ہے

نہاں ہے جوہرِ مقصد عمل کے معدن میں
عمل کرو جو گُہر کی تمہیں تمنا ہے

تمہیں بھی ہوش کبھی آئے گا کہ نہیں
خبر بھی ہے کہ زمانے کی اب روش کیا ہے

[illegible]

التجا

(۱)

چیز ایسی ہی کوئی رندوں کے پیمانے میں ہو!
جس سے سرشارِ یقیں ہو جو بھی میخانے میں ہو!

عشق کی ہنگامہ آرائی ہے حسنِ شوخ سے
یادِ لیلیٰ کارفرما اپنے دیوانے میں ہو

(۲)

بے نیازِ بیکسی بیگانۂ حرماں بنیں!
ہم سراپا اِک تمنائے جنوں ساماں بنیں!

دیکھتے ہی بھانپ لیں تقدیر کی اُفتاد کو
روشناسِ جوہرِ آئینۂ امکاں بنیں!

(۳)

بیخودی ایسی کہ جو ہو مطلعِ مہرِ شعور!
توڑ ڈالے اِک نظر میں جو طلسماتِ ظہور!

سرمۂ تسخیر وہ ہو چشمِ بینا کے لئے!
جو حقیقت میں ہو نفیِ غیب اثباتِ حضور!

(۴)

تشنہ کاموں کو مئے پندار پینے کو ملے!
ہم تہی جاموں کو آخر کچھ تو جینے کو ملے

خلعتِ نَو کے الٰہی ہم بھی ہیں اُمیدوار!
آج تک تو چاک ہی کمبخت سینے کو ملے

امینِ حزین سیالکوٹی

محفلِ ادب

ایک شہزادہ کی شہنشاہیت سے نفرت

(مشہور مدبر بلیتھو کے خیالات)

موجودہ دَور میں نہ صرف عوام بلکہ بادشاہ اور شہزادے بھی شہنشاہیت کو ایک لعنت سمجھتے ہیں۔ شہنشاہیت کے خلاف یورپ کی رائے عامہ کس قدر بیدار ہو چکی ہے اس کا اندازہ مسٹر بلیتھو کے مندرجۂ ذیل خیالات سے ہو سکتا ہے جو آپ نے شہنشاہ ایڈورڈ کی تخت سے دستبرداری کے سلسلہ میں شائع کئے ہیں۔ جس میں آپ نے صاف الفاظ میں یہ ظاہر کیا ہے کہ شاہ ایڈورڈ کی دست برداری کا واحد سبب یہ تھا کہ وہ جمہوری خیالات رکھتے تھے۔ مسٹر بلیتھو کے خیالات ملاحظہ ہوں:۔

سنہ ۱۹۱۹ء میں جب برطانیہ عظمٰی کی سلطنت کے ولیعہد میدانِ جنگ سے واپس آئے تو وہ قدیم نظمِ زندگی کے خلاف باغی بن چکے تھے۔ اُس وقت کسی کو یہ تغیر محسوس نہیں ہوا اس لئے کہ قدامت کے خلاف نوجوانوں کی اس قسم کی بغاوت اس زمانہ میں ایک بالکل عام بات تھی۔ ہزارہا نوجوان میدانِ جنگ سے ایک ہی ذہنیت لے کر واپس آئے تھے۔ اُنہوں نے زندگی کے واقعات کی انتہا درجہ تیز رفتار اور موت کی سرعت کو دیکھا تھا اب وہ اس کے لئے تیار نہ تھے کہ کسی دفتر یا کارخانہ میں خاموشی کے ساتھ کام کر سکیں۔

جنگ کے بعد لوگوں کو یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ ہزارہا گھروں کے اندر یہ بغاوت جاری ہے مگر اس کی کسی کو خبر نہ تھی کہ خود ولیعہدِ سلطنت بھی ان باغیوں میں شامل ہو گئے ہیں۔ مگر ایسا کیوں نہ ہوتا آخر وہ بھی اور نوجوانوں کی طرح ایک نوجوان تھے۔ اپنے گھر پر وہ اپنے والدین کی سخت نگرانی میں رہے۔ کالجوں اور مدارس میں ان کی سیرت کے ہر پہلو کی نگرانی کی جاتی تھی اور اس طرح نوجوان شہزادہ قدیم خیالات کی زنجیروں میں بندھا ہوا پرورش پاتا رہا۔ لیکن جنگِ عظیم شروع ہوئی اور اس نے اِن زنجیروں کو توڑ ڈالا۔ فرانس میں شہزادہ کے اندر ایک نئی زندگی کے آثار پیدا ہوئے اور ان کے خیالات میں ایک عجیب آزادی نے جنم لیا۔ مسٹر بلیتھو لکھتے ہیں کہ جنگ نے قدیم اور جدید نسلوں کے درمیان ایک وسیع خلیج پیدا کر دی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ بادشاہ اور اُن کے ولیعہد کے درمیان بھی خیالات اور سیرت کی ایک خلیج پیدا ہو گئی۔ جنگ سے واپس آ کر شہزادہ نے ایک نیا راستہ اختیار کیا۔ جو دربارِ شاہی کی قدیم روایات سے بہت بعید تھا۔ شاہی درباروں کے قدیم طریقوں سے شہزادہ نے بھاگنا شروع کیا اور قدیم رسم و رواج اور قدیم صحبتوں سے وہ اُکتانے لگے۔ اپنے دادا کی طرح شہزادہ نے اپنی صحبت کو خاص خاص دوستوں تک محدود کر لیا اور انہی میں اُن کو تفریح اور خوشی حاصل ہونے لگی۔

رفتہ رفتہ قدیم سوسائٹی نے شاہزادہ کی اس جدت کو ناپسند کرنا شروع کیا۔ ولیعہد بڑے بڑے رؤسا کے گھروں میں مہمان ہو کر قدامت پسند جماعتوں کے ممتاز افراد سے ملنا پسند نہ کرتے تھے اور اُن کے مزاج میں جس قدر آزادی بڑھتی گئی وہ اپنی عادت میں بھی سخت ہوتے گئے۔ چنانچہ وہ اکثر رسمی صحبتوں سے روگرداں ہونے لگے۔

حقیقت یہ تھی کہ جنگ نے شہزادہ کی زندگی کے معیار کو بدل دیا تھا اور اُنھوں نے اپنی زندگی کا معیار ایسا قائم کر لیا تھا جس سے قدیم اور رسم و رواج کے پابند افرادِ قوم کو تکلیف ہوتی تھی مگر یہ معیارِ زندگی وہی تھا جو اس زمانہ کے تمام نوجوانوں کا تھا جس طرح شاہزادہ کے جنگ سے تھکے ہوئے بہت سے ہمعصر محسوس کرتے تھے اسی طرح شاہزادہ کے اندر بھی ایک ایسا احساس پیدا ہو گیا کہ وہ قدیم رسم و رواج سے گھبرانے لگے۔ درباریوں کے مشوروں کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اور ان کو یقین ہو گیا کہ یہ پُرانے زمانے کے لوگ ہی دُنیا کے مصائب کا باعث ہوتے ہیں۔

شہزادہ کے دل میں محبت اور دوستی کے جذبات جن لوگوں کے لئے پیدا ہوئے وہ یا تو جنگ سے واپس آئے ہوئے بے روزگار سپاہی تھے یا فلاکت زدہ غربا۔ یا نو آبادیوں کے بے فکرے جن سے شاہزادہ کو اپنی سیاحتوں میں بارہا ملنے کا موقع ملا تھا۔

رفتہ رفتہ شاہزادہ کے جمہوری رجحانات ساری دُنیا کو معلوم ہونے لگے۔ ذرا ذرا سی باتوں پر نظریں پہنچنے لگیں۔ یہاں تک کہ لوگوں نے اس فرق کو سمجھ لیا کہ ایڈورڈ ہفتم ہمیشہ اپنی رعایا کو رعایا کے نام سے یاد کرتے تھے اور شاہ جارج نے اپنی رعایا کو "میری قوم" کے نام سے یاد کیا۔ اور شاہ ایڈورڈ نے تخت نشین ہو کر ان کو ہم جنس انسانوں کے نام سے موسوم کیا اور شاہی زاویۂ نظر کا یہ تدریجی فرق ساری دُنیا نے محسوس کیا۔

شاہزادہ کی طبیعت میں سب سے بڑا انقلاب ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوا جب وہ ایک دفعہ خیراتی باورچی خانوں کا معائنہ کرنے گئے اور وہاں اُنھوں نے ہزارہا بھوکوں کو کھاتے دیکھا۔ اُنھوں نے اپنی عمر میں پہلی دفعہ انسانوں کی اس مصیبت کا اندازہ کیا جو جنگ کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ وہ بغور ان بھوکوں کی حالت کو دیکھتے رہے اور اس کے بعد اُنھوں نے بے روزگاروں کی حالت کو سُدھارنے کے لئے اپنے اوقات وقف کر دیے۔ تقریریں کرتے تھے۔ خیراتی کاموں میں حصہ لیتے تھے اور اُن وزراء سے الزامی جرح کرتے تھے جن کو وہ قدامت پسند سمجھ کر ناپسند کیا کرتے تھے اسی کے ساتھ ساتھ اب وہ شاہی درباروں کے رسم و رواج اور قدیم روایات سے گھبرانے لگے۔ بلکہ کہا تو یہ جاتا ہے کہ جب وہ جنوبی افریقہ سے واپس آئے تو اُنھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر ان کو ذاتی طور پر آزادی نہ دی جائے گی تو وہ ولیعہدی سے دست بردار ہو جائیں گے اور کسی نو آبادی میں جا کر سکونت اختیار کر لیں گے۔

مگر قدامت کی قوی طاقتیں ان کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھیں حتّٰے کہ گھوڑے پر سوار ہونے اور شکار کھیلنے کی ممانعت کر دی گئی۔ ہوائی جہازوں میں تنہا سفر کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔ ایک دفعہ تو اُنھوں نے صرف اس ممانعت کے خلاف احتجاج کرنے

کے لئے تنہا سفر کیا۔ مگر اب وہ سلطنت کے وزراء کو خصوصاً آرچ بشپ کو اپنی آزادی کا دشمن سمجھنے لگے اور یہ سمجھنے لگے کہ یہ ایک سازش ہے تاکہ ان کی آزادی کو محدود کیا جائے۔ اُن کی فطرت میں ضد پیدا ہوگئی اور وہ یہ کوشش کرنے لگے کہ ان (بوڑھوں) کو ہر معاملہ میں شکست دی جائے۔ ان کی تقریروں میں تلخی پیدا ہوگئی۔ کان کنوں کی بدحالی کے متعلق حکومت کی بے پروائی پر اُنہوں نے صاف صاف تنقید شروع کردی۔ وہ ایک دفعہ برطانیہ کے سب سے بڑے جہاز 'کوئن میری' کا معائنہ کرنے گئے اور حکومت کے اراکین کو یہ کہہ کر سخت صدمہ پہنچایا کہ اس عظیم الشان جہاز کی تیار کرنے والی دُنیا کا توازن اُن غربا کی گندہ آبادیوں سے کیونکر قائم رکھا جائے جو ابھی ہم دیکھ کر آئے ہیں۔

ان حالات میں وہ تنہائی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ اور جب اُنہوں نے تختِ سلطنت پر قدم رکھا تو وہ بہت بے یار و مددگار تھے۔ مسٹر بلیتھو لکھتے ہیں کہ ان کو ایسے وقت تاج و تخت حاصل ہوا جبکہ ملک سویا ہوا تھا۔ اگر وہ کسی جنگ یا کسی نازک سیاسی زمانہ میں تخت نشین ہوتے تو وہ ان توہمات سے اپنے کو آزاد کرلیتے جو ان کو گھیرے ہوئے تھے مگر وہ ایسے زمانہ میں برسرِ اقتدار آئے جبکہ وُہ پرانے اور نسبتہً تھکے ہوئے لوگوں سے گھرے ہوئے تھے۔ ان کا وزیرِ اعظم ایسا شخص تھا جو صرف احتیاط اور بے عملی چاہتا تھا۔ اور آرچ بشپ ان کے مخالف سمجھے جاتے تھے۔

اس زمانہ سے کچھ پہلے مسز سمپسن سے شاہزادہ کی دوستی شروع ہوئی تھی۔ پس جس وقت وہ تخت نشین ہوئے اُسی وقت سے قدامت پسند حلقوں میں سر ہلائے جانے لگے اور مُنہ بنائے جانے لگے۔ جب اُنہوں نے اپنے محل کے قدیم ملازمین کو الگ کرکے نئے ملازم رکھنے شروع کئے تو لوگوں نے اور بھی زیادہ اعتراض کیا۔ غرض یہ کہ ان کی حالت قابلِ رحم ہوگئی۔ ہر طرف سے وہ ایسی فضا میں گھرے ہوئے تھے جو ان کی دماغی فضا کے خلاف تھی۔

جب ان کی شادی کا سوال پیدا ہوا تو پھر اُنہوں نے سمجھا کہ ان کی شخصی آزادی پر حملہ کیا جارہا ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے ضد شروع کی اور اس ضد میں غلطیاں کرتے چلے گئے اور باوجودیکہ یہ معاملہ بہت ہی خفیف اور ذاتی تھا اور ضد بہت سخت تھی مگر کوئی شخص ان کے ارادوں کی دیانت کو مشتبہ نہیں سمجھتا درحقیقت تخت و تاج سے ان کی دست کشی جاننے والوں کے لئے کوئی عجیب بات نہ تھی۔ مسز سمپسن کا نام آنے سے پہلے ہی لوگ سمجھتے تھے کہ ایک دن ان کو دست بردار ہونا پڑے گا۔ اس لئے کہ وہ اپنے منصب کی پابندیوں کو گوارا نہ کریں گے۔

آئندہ کیا ہوگا خدا ہی کو معلوم ہے۔ مگر مسٹر بلیتھو کا خیال یہ ہے کہ ڈیوک آف ونڈسر ایک ایسے ویرانہ میں چلے گئے ہیں جہاں وہ کبھی نہ سمجھ سکیں گے کہ تنہائی کے سوا بھی کوئی اور صورت زندگی بسر کرنے کی ہوسکتی ہے۔ اس لئے کہ ان کی مصروف طبیعت اور زندگی کے معاملات سے ان کی دلچسپیاں اور بحیثیت ایک شاہزادہ کے ان کی تربیت شادی اور محبت کے محدود دائرے کے لئے کبھی موزوں ثابت نہ ہوگی۔

"دین و دُنیا"

مطبوعات

پریم ترنگ (ترانۂ اُلفت) "پریم ترنگ" جس کے مصنف لالہ کانشی رام صاحب چاؤلہ سپرنٹنڈنٹ دفتر ڈپٹی کمشنر ہوشیارپور ہیں، مختلف مذاہب کے وسیع اور گہرے مطالعہ کا نچوڑ ہے۔ ہندوستان میں آئے دن کی خانہ جنگیوں کو ختم کرنے کے لئے اس کی اشاعت بہت مفید ثابت ہوگی کیونکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو محبت، یگانگت اور رواداری کا سبق سکھایا جائے۔ اُردو اور فارسی کے پاکیزہ اشعار اور رہنمایانِ عالم کے قیمتی اقوال سے مصنف نے کتاب کے ادبی معیار کو بھی قائم رکھا ہے۔ قیمت مجلد عہ غیر مجلد عہ مصنف سے براہِ راست طلب کی جا سکتی ہے۔

تصویر کشمیر ۔ یہ حضرت حفیظؔ جالندھری کی تازہ نظم ہے جس میں اُنہوں نے کشمیر کے ماضی و حال پر ایک نگاہ ڈالی ہے۔ جا بجا موسیقی اور منظر کشی کے بہت اچھے نمونے پیش کئے ہیں۔ نظم پڑھنے کے قابل ہے۔ نمونے کے لئے ذیل کے شعر ملاحظہ فرمائیے:۔

تُو نے دیکھا اے تصوّر کیا ہے اب پھولوں کا رنگ ۔۔۔ آبشاروں کا یہ نغمہ نہر کا یہ جل ترنگ

ڈل کے اندر نقرئی لہروں کی پریاں محوِ جنگ ۔۔۔ چاند تاروں کو زمیں پر لوٹ جانے کی اُمنگ

بے خودی طاری ہے عالم ہے عجب تاثیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

تقریب سر راس مسعود مرحوم و مغفور نے نہایت محبت سے لکھی ہے۔ آخر میں فرہنگ بھی شامل ہے قیمت ۸ر پتہ:۔ اُردو اکیڈیمی بیرون لوہاری دروازہ لاہور۔

ایڈورڈز کالج میگزین (حصۂ اُردو):۔ ایڈورڈز کالج پشاور کے میگزین بابت ماہ اکتوبر ۳۷ء کا حصۂ اُردو ہمارے پیش نظر ہے نظم و نثر کے مضامین بتا رہے ہیں کہ ان کے لکھنے والے طلبہ ہونہار ادیب اور شاعر ثابت ہوں گے۔

مطائبات :۔ مولانا چراغ حسن حسرت کو فکاہی مضامین لکھنے کا عدیم النظیر سلیقہ حاصل ہے۔ اُن کی زبان نہایت صاف سلیس اور شستہ ہوتی ہے یہ اُن کے مضامین کا پہلا مجموعہ ہے جو اُردو اکیڈیمی بیرون لوہاری دروازہ لاہور نے شائع کیا ہے۔ مضامین بہت دلچسپ ہیں۔ قیمت عہ

صحیفۂ چین :۔ یہ کنفیوشس کی کتاب شوکنگ کا اُردو ترجمہ ہے جو سید اسد علی انوری فرید آبادی نے نہایت قابلیت سے کیا ہے۔ کتاب کے ساتھ مختصر تاریخ چین اور حالاتِ کنفیوشس شامل ہیں۔ مکتبۂ جامعۂ ملیہ دہلی نے یہ کتاب نہایت حسنِ اہتمام کے ساتھ مجلد شائع کی ہے۔ قیمت عہ ؂

فہرستِ مضامین

ہمایوں بابت ماہ اپریل ۱۹۳۸ء

تصویر:- ہم آہنگ نغمے

شمار	مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ
۱	"بزمِ ہمایوں"	بشیر احمد	۲۶۸
۲	جہاں نما	حامد علی خاں	۲۷۰
۳	توحید وجودی (نظم)	جناب مولانا سید احمد حسین صاحب امجد حیدرآبادی	۲۷۴
۴	منشی پریم چند کی کہانیوں میں کردار نگاری	پروفیسر اظہر علی صاحب فاروقی	۲۷۵
۵	اظہارِ عشق (نظم)	حضرتِ الطاف مشہدی	۲۸۴
۶	برہا	"میراجی"	۲۸۵
۷	چوپٹ راجہ (ڈراما)	"رحمٰن مُذنب"	۲۸۶
۸	جھوٹ (نظم)	جناب سعید احمد صاحب اعجاز	۲۹۴
۹	انقلاب "	حضرتِ عدم	۲۹۵
۱۰	فلسفہ اور اُس کے نقاد	جناب مرزا محبوب بیگ صاحب	۲۹۶
۱۱	غزل	حضرتِ فانی بدایونی	۳۰۶
۱۲	"	جناب سید علی منظور صاحب حیدرآبادی	۳۰۷
۱۳	خزاں کی آمد (افسانہ)	جناب نکہ عتیق اللہ خاں صاحب بی۔اے۔ ایل ایل بی	۳۰۸
۱۴	گلشنِ تصوّر	جناب راجہ مہدی علی خاں صاحب	۳۱۶
۱۵	کسی کی کہانی (افسانہ)	جناب پروفیسر سید فیاض محمود صاحب گیلانی ایم۔اے	۳۱۸
۱۶	مزدور خدا کے حضور میں (نظم)	جناب محترمہ زیب عثمانیہ صاحبہ	۳۲۷
۱۷	اقبال (نظم)	حضرتِ حفیظ ہوشیارپوری ایم۔اے	۳۲۸
۱۸	خیالاتِ پریشاں	جناب غلام یٰسین صاحب لدھیانوی	۳۲۹
۱۹	جوگیا گیت	حضرتِ مقبول احمد پوری	۳۳۰
۲۰	پیر گوگا	حامد علی خاں	۳۳۱
۲۱	محفلِ ادب		۳۳۷
۲۲	مطبوعات		۳۳۹

چندہ سالانہ صہ ششماہی سے مع محصول قیمت فی پرچہ ۸ر

بزمِ ہمایوں

"ہمایوں" کے ایک خریدار ــــ نہیں یہ ادبا ورفیشن کے خلاف ہے ــــ لکھو "معاون" بلکہ "سرپرست"! کتنی مشکل ہے! ہے تو یہ ایک سودا ہی، ادبی سودا سہی، لیکن نہیں ہمارے غایت درجہ حسّاس ادب کا تقاضا ہے کہ ادب میں بازاری زبان استعمال نہ ہونی چاہئے، خریدار بازار میں ہوتا ہے اس لئے "خریدار" بازاری لفظ ٹھہرا ــــ اس سے بہتر ہے "معاون"۔ کیسا معاون؛ دریائے سندھ کے معاونوں کی طرح کا معاون جو دُور سے بصد ناز آکر جذب ہو جائے؛ نہیں بلکہ وہ جو پانچ روپے دے کر دُور ہی سے صاحب سلام کے اور سو سو شکایتیں زبان پر لائے۔ لیکن اُردو ہندی جھگڑے کے اس عہد میں ہمیں مصلحتہً اس جنس کی اتنی خوشامد منظور ہے کہ ہم "معاون" چھوڑ اسے "سرپرست" کہنے پر بھی مجبور ہیں ــــ

غرضکہ قصۂ کوتاہ آمدم برسرِ مطلب ہمایوں کے یہ ایک "سرپرست" جو مدیر کے دوست بھی ہیں ــــ ادب کے سلسلے میں دوستی کا ذکر آتا ہے تو کیسے کیسے واقعات یاد آجاتے ہیں۔ کبھی کوئی غیر ادب پسند دوست ملتا ہے اور ہمیں دیکھ کر ہمایوں کا لفظ اُس کے ذہن میں گدگدی کرتا ہے تو محض ہمیں خوش کرنے کے لئے بلکہ ہم پر احسان کرنے کے لئے کہتا ہے کہ بھئی وہ تمہارا ہمایوں تو مدتوں سے دیکھا ہی نہیں، اب ادھر ہم لیں تو ایک ایسے "بے ادب" کے منہ سے ہمایوں کا ذکر سُن کر خوش ہو جاتے ہیں کہ شُکر ہے یہ بھی اُردو سے تعلق پیدا کیا چاہتے ہیں لیکن اُدھر جب یہ خیال آتا ہے کہ محض ایک بے پیسے والے سرپرست ہیں تو ہمایوں کے بجٹ کا تصور کر کے طبیعت میں انقباض سا پیدا ہو جاتا ہے سوناچار ایک بے معنی سی مسکراہٹ حضرت کی نذر کر دیتے ہیں اور پھر دونوں خوش خوش کسی اور بات کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔ اس کے برعکس بعض ادیب دوست اور بھی زیادہ بوجھل ثابت ہوتے ہیں۔ ادیب تو خیر وہ جیسے ہوتے ہیں ہوتے ہی ہیں لیکن نیم دوستی کے بھروسے پر وہ ہمایوں میں مضمون شائع کرانا ہمارا خوش گوار فرض اور اپنا الٰہی حق سمجھتے ہیں۔ ہم اُن سے خندہ پیشانی سے ملتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک مضمون کا مطالبہ ہے۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے اُن کے خط پر خط آنے شروع ہو جاتے ہیں، ایک میں مضمون کا وعدہ، دوسرے میں مضمون، تیسرے میں نظم چوتھے میں ترجمہ ہوتا ہے اور پانچویں میں جواب نہ آنے کا گلہ جائنٹ ایڈیٹر کی شکایت اور یہ اطلاع ہوتی ہے کہ جس جس پرچے میں اُن کے ارشادات شائع ہوں وہ ٹھیک اس پتے پر روانہ کر دیئے جائیں۔ دستخط کے بعد ایک ایزلوی تحریر مندرج ہوتی ہے کہ افسوس ہے کہ فی الحال آٹھ دس روز تک انہیں اور مضمون لکھنے کی بالکل فرصت نہیں۔ یہ تو محض ایک قسم کے ادیب دوست ہیں دوسری قسمیں گنوانے کی یہاں گنجائش نہیں۔ اور بے دوست ادیبوں کا کبھی پھر ذکر کیا جائے گا، جن میں ایک

رہے گی ۔غرض عورتوں کے لئے مناصب عامّہ کے حامی اُن کی گزشتہ ترقی کو پیش نظر رکھ کر مطمئن ہو سکتے ہیں اور مخالفین اپنے دل کی تسلی یوں کر سکتے ہیں کہ عورتوں کی صرف ایک نہایت قلیل تعداد ہی عہدے قبول کرنے کی آزادی سے فائدہ اُٹھائے گی اور اکثریت فطرتاً خانہ داری کے کاموں کو ترجیح دے گی ۔

باتونیوں کے لئے خوش خبری

نائیس کے ایک قابل ڈاکٹر نے جو پھیپھڑے کے امراض کا ماہر ہے، یہ بتایا ہے کہ باتیں کرنا بہترین تفریح ہے بہت سی انسانی بیماریاں پھیپھڑوں کی خرابی سے پیدا ہوتی ہیں اور زیادہ باتیں کرنے سے پھیپھڑوں کو بہت تقویت پہنچتی ہے ۔ عورتیں چونکہ عموماً زیادہ باتونی ہوتی ہیں، اس لئے مردوں کے مقابلہ میں اُن کی صحت بہتر رہتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ دُنیا میں رنڈوے مردوں کے مقابلہ میں بیوہ عورتیں بہت زیادہ ہیں ۔

ہندوستان کے گیت

مسٹر ہری بہادر نے ہندوستان کے گیتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس ملک کی شاعری میں دماغی نہیں بلکہ روحانی بالیدگی کے جوہر ہیں ۔ یہاں کے گیت عموماً خدا سے مل جانے کی عرفانی آرزو پر مشتمل ہوتے ہیں اور اُن کا مقصد حیات میں ایک عارضی سا ہیجان پیدا کرنا نہیں ہوتا ۔ ہندوستانی شاعر اس دُنیا کی چیزوں کی طرف سے عجیب و غریب طور پر آنکھیں بند کر لیتا ہے اور اپنی پوری توجہ روحانی دُنیا کی طرف منعطف کر لیتا ہے ۔

ہندُستان کی شاعری کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ طربیہ ہے کسی گیت کا ہیرو ابتداءً خواہ کتنے مصائب میں گرفتار ہو بالآخر اس کا انجام اچھا ہوتا ہے، اسکی وجہ یہ ہے کہ ہندوستانی شعراء کو خدا کے وجود کا پورا یقین ہوتا ہے، اُن کا اعتقاد یہ ہے کہ خدا راست کردار آدمی کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑتا ۔ اس لئے ہمیشہ صداقت کی فتح ہوتی ہے ۔ ہندُستان میں المیہ نظمیں تقریباً معدوم ہیں ۔ ہندوستانی شاعری کی ایک اور خصوصیت تشبیہ و تمثیل کے ذریعہ سے اخلاقی اصلاح کا کام ہے، ہمارے شاعر مزاحیہ گیتوں میں بھی عموماً کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق دیتے ہیں ۔ ہندُستانی گیتوں کی ایک اور خصوصیت استھائی ہے مغربی نقاد عقلی دلائل کی بنیاد پر استھائی کے مخالف ہیں، وہ کہتے ہیں ایک نظم میں بار بار کسی مصرع کا دُہرانا فضول ہوتا ہے اور آدمی اس سے اُکتا جاتا ہے لیکن ہندُستان کی شاعری زیادہ تر خدا کی محبت کے نغموں پر مشتمل ہے اور دوسرے تمام جذبات کا درجہ اس کے بعد ہے ۔ عاشق کے کانوں کو محبت کا دُہرایا ہوا نغمہ بھی ہر بار نیا معلوم ہوتا ہے ۔ خود مغرب میں بعض غیر فانی عشقیہ گیت محض اپنی استھائی کی وجہ سے شیریں معلوم ہوتے ہیں ۔ یہ ظاہر ہے کہ ہمارے لئے کوئی بات جس قدر محبوب ہو ۔ اسی قدر ہم اُسے بار بار سننا چاہتے ہیں اور اُس سے اکتاتے نہیں پاتے ۔

حامد علی خاں

توحیدِ وجودی

کہیں سر ہوں میں اور کسی جا قدم ہوں
کہیں ہوں حدوث اور کسی جا قدم ہوں

کہیں چشمِ فتّاں کی تصویر ہوں میں
کہیں مدِّ ابرو کی شمشیر ہوں میں

کہیں جلوۂ ماہِ رخسار ہوں میں
کہیں خال بن کر نمودار ہوں میں

کہیں صورتِ لب، کسی جا ذقن ہوں
کسی جا دہن ہوں، کسی جا سخن ہوں

کہیں شکلِ دل ہوں، کسی جا زباں ہوں
کہیں پوست ہوں اور کہیں استخواں ہوں

کہیں شان ہوں میں کہیں آن ہوں میں
کہیں جسم ہوں، اور کہیں جان ہوں میں

کسی جا تخیّل، کسی جا بیاں ہوں
کسی جا عیاں ہوں کسی جا نہاں ہوں

وجود ایک ہے، اور تعیّن ہزاروں
مری ایک ہستی کے ہیں گُن ہزاروں
ہے مرآۃِ مطلق کا جوہر تعیّن
ہُویّت کا ہے خاص مظہر تعیّن
ہے توحید اصلی، دوئی اعتباری
بنے نورِ واحد سے نوری و ناری
بمن منکشف گشت ایں نکتہ ناگاہ
ز الحمد للہ ——— الحمد للہ[1]

امجد حسین امجد

[1] چونکہ تمام تعینات ایک ہی ذاتِ مطلق کے شیون ہیں اس لئے ہر تعریف کی مستحق وہی ایک ذاتِ مطلق ہے۔ (الحمد للہ رب العالمین)

منشی پریم چند کی کہانیوں میں کردار نگاری

کہانیوں کے لئے پلاٹ، اس کی ترتیب اور تحریک کو جتنی اہمیت دی گئی ہے، اس سے کہیں زیادہ ضروری اور اہم خود افسانوی کردار ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ کہانی کا پلاٹ اس لئے دلکش اور مرغوب بن جاتا ہے کہ اس کو ہم انسانی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو سے حاصل کرتے ہیں اور اس کو حقیقت کا جامہ پہنانے کے لئے ہمیں کرداروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ پس صاف ظاہر ہے کہ افسانہ نگار کے کمال کا مظاہرہ جہاں اور بیسیوں جگہ کیا جاسکتا ہے وہاں کردار نگاری سے خصوصاً کہیں زیادہ زور کے ساتھ اس کے کمال کی جھلک رونما ہوتی ہے اور فنی حیثیت سے افسانہ نگار کے لئے یہ کام اگر سب سے زیادہ دشوار نہیں تو کم از کم ایک بیحد دشوار کام ضرور ہے۔

کہانیوں میں کردار نگاری کی اہمیت کا اندازہ جیمز لن کے اس بیان سے کیا جاسکتا ہے جو انہوں نے افسانہ کی فنی تعریف کرتے وقت ایک جگہ پیش کیا ہے۔

"افسانہ کسی ایک کردار کی زندگی کے سب سے اہم موقع کو ڈرامائی صورت میں مختصر طور پر پیش کرنے کا نام ہے۔"

افسانہ کی اس تعریف سے کرداروں کی اہمیت صاف ظاہر ہے اور فن افسانہ نگاری میں کردار نگاری کا جو مرتبہ ہونا چاہئے وہ بھی عیاں ہے۔

کردار نگاری کے معنی یہ ہیں کہ کہانی کے لوگوں میں کچھ ایسی خاص عادتیں اور خصلتیں پیدا کر دی جائیں کہ اُن کی ہستی دوسرے لوگوں سے پہچانی جا سکے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ کہانی یا ناول کے کردار اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب افسانہ نگار کے مدِ نظر کوئی خاص مقصد ہو اور وہ اس مقصد کو واقعات کے ذریعہ سے پیش کرنے کے لئے افراد افسانہ میں خاص خصائل اس طرح پیدا کر دیتا ہے کہ اس کا مقصد بحسن وخوبی پورا ہو جائے۔ چنانچہ جب وہ یہ دکھانا چاہتا ہے کہ حریص اور لالچی پنڈتوں کو کھانے سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں ہے اور یہ جذبۂ شوق ان پر اس درجہ غالب ہے کہ انہیں اپنی عزت اور آبرو کی بھی پرواہ نہیں رہتی تو کہانی لکھنے والا بعض خاص واقعات کو ایک شخص کے سوانح حیات سے وابستہ کر دیتا ہے اور اس طرح اُن کو زندہ اور مجسم صورت میں پیش کرتا ہے۔ پنڈت موٹے رام شاستری کا کیریکٹر ملاحظہ فرمایئے جس سے اس بیان کی تصدیق ہو جائے گی۔

غرضکہ کردار نگاری کا مقصد یہ ہے کہ اشخاصِ قصہ کی طبیعت، عادات اور ان کے خصائل میں ایسی امتیازی خصوصیات پیدا کر دی جائیں، جن سے وہ چلتے پھرتے اور جیتے جاگتے انسان معلوم ہوں اور ان کی سیرت پر اصلیت کا دھوکا ہو جائے۔

لہ دعوت - از خاک پروانہ - پریم چند ۱۲

منشی پریم چند نے اپنی کہانیوں میں صدہا کیرکٹر پیش کئے ہیں اور سچ پوچھئے تو بنی نوع انسان کے افراد میں سے کون سا ایسا فرد ہے جس کا کیرکٹر ان کی کہانیوں میں موجود نہیں ہے۔ ہم یہاں صرف دو ایک مثالیں بیان بالا کی تائید میں انہیں کے افسانوں سے پیش کرتے ہیں۔ کیرکٹر ملاحظہ فرمایئے اور انصاف کیجئے کہ پڑھنے والا ان کو پڑھ کر کس قدر مغالطے میں پڑ جائے گا اور ان کے کیرکٹر پر نہ صرف اصلیت کا دھوکا ہوگا بلکہ من وعن سچے معلوم ہوں گے۔ ہندو گھرانے کی ایک بوڑھی ساس کا کیرکٹر ملاحظہ ہو۔ وقت وہ ہے جب کہ ایک ٹھاکر صاحب گرہن اشنان کی طیاری کر رہے ہیں اور ٹھکرائن بھی ان کے ہمراہ جانے والی ہیں۔ بہوئیں زادِ سفر کی طیاری میں مشغول ہیں۔ ساس پرانے خیال کی سیدھی سادی بھگتن ہے۔ اس کا خیال ہے کہ بہوؤں پر نئی روشنی کا اثر غالب آ رہا ہے یا وہ جوان ہیں اور جوانی دیوانی ہے۔ شاید وہ گرہن کے موقع پر مذہبی فرائض ادا نہ کر سکیں یا اُن کے ادا کرنے میں تساہل کریں ساس اپنا فرض اس طرح ادا کرتی ہے :-

" بوڑھی ٹھکرائن بچوں کو پھسلاتی تھیں اور بیچ بیچ بہوؤں کو سمجھاتی جاتی تھیں۔ دیکھو خبردار! جب تک اُگرہ[2] نہ ہو جائے گھر سے باہر نہ نکلنا، ہنسیا، چھری، کلہاڑی انہیں ہاتھ سے مت چھونا۔ سمجھائے دیتی ہوں ماننا چاہے نہ ماننا۔ تمہیں میری بات کی کیا پروا ہے منہ میں پانی کی بوند نہ پڑے۔ نارائن کے گھر بپت پڑی ہے، جو سادھو بھکاری دروازے پر آ جائے اسے پھیرنا مت "[3]

ایک اہیر[4] کا کیرکٹر ملاحظہ فرمایئے :-

" گوپال ذات کا اہیر تھا۔ نہ پڑھا نہ لکھا۔ بالکل اکھڑ۔ دماغ روشن ہی نہیں ہوا تھا تو شمع جسم کیوں گھُلتی۔ پورے چھ فیٹ کا قد۔ گٹھا ہوا بدن "

خیر یہ باتیں تو ایسی ہیں جن کو ہر کس و ناکس جانتا ہے اور ہر کہانی لکھنے والا کر سکتا ہے۔ مگر منشی جی کی کردار نگاری کے کمال کا مظاہرہ ان چند الفاظ سے ہوگا جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے اور جو بغیر اعلےٰ مشاہدہ کے ناممکن ہے۔ آگے چل کر وہ اس گوپال کے کیرکٹر کی تکمیل اس طرح کرتے ہیں :-

" للکار کر گاتا تو سننے والے میل بھر پر بیٹھے ہوئے اس کی تانوں کا مزہ لیتے۔ گانے بجانے کا عاشق۔ ہولی کے دنوں میں مہینہ بھر تک گاتا۔ ساون میں ملار اور بھجن تو روزمرہ کا شغل تھا۔ نڈر ایسا کہ بھوت اور پشاچ[4] کے وجود پر اسے عالمانہ شکوک تھے لیکن جس طرح شیر اور پلنگ بھی سُرخ شعلوں سے ڈرتے ہیں اسی طرح سُرخ صافے سے اس کی رُوح لرزاں ہو جاتی تھی "

پیاگ، ایک کنجڑی بھنگڑی کا کیرکٹر جس خوبی سے منشی جی نے مزار آتشیں[5] میں پیش کیا ہے کیا اس کو پڑھ کر کہانی پر سچائی اور حقیقت کا گمان نہیں ہو جاتا۔ ہم طوالت کے خیال سے پورا کیرکٹر لکھنا نہیں چاہتے مگر صرف وہ حصہ نقل کر دیتے ہیں جو عام افسانہ نگاروں

---

[1] صرف ایک آواز۔ پریم پچیسی حصہ دوم۔ [2] گرہن کا ختم ہو جانا۔ [3] اندھیر۔ پریم پچیسی۔ [4] پریت، بھوت۔ [5] خاک پروانہ۔

کے لئے اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے اور یہی وہ جگہ ہے جہاں تک ان کا تخیل نہیں پہنچ سکتا۔

پیاگ گانجے کا دم لگا کر کھیت کی طرف جا رہا ہے اور اس حالت میں جو بھجن اس کے دماغ میں چکّر لگا رہا ہے ملاحظہ ہو:۔

"ٹھگنی کیوں نینا جھمکا وے ــــ کدو کاٹ مردنگ بنائے

ٹیسو کاٹ مجیرا ، ناچے بالم کھیرا . . . . "

اتنا لکھنے کے بعد ہم کردار نگاری کی فنی لطافتوں اور کردار نگار کے فرائض سے مختصر طور پر بحث کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی دکھلائیں گے کہ منشی پریم چند ان فرائض سے کہاں تک عہدہ برا ہوئے جو ایک کہانی لکھنے والے کے لئے ضروری ہیں۔

کردار نگاری کی اتنی ماہیت سمجھ لینے کے بعد ہمارے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم مختلف قسم کی ادبیات میں کردار نگاری کو ایک دوسرے سے امتیاز کر سکیں کیونکہ کردار نگاری اپنے وسیع مفہوم میں نہ صرف کہانی بلکہ ادب کے دیگر شعبوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً تاریخ، نظم، ڈراما، ناول وغیرہ۔ اور انہیں پر کیا منحصر ہے۔ تمام پلاٹ دار ادبی کارناموں میں اس سے کچھ نہ کچھ مدد ضرور لی جاتی ہے۔ اس لئے ہمارے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم ڈرامائی کردار نگاری اور ناولی کردار نگاری میں فرق کر سکیں اور ساتھ ہی ساتھ افسانوی کردار نگاری کی ممتاز حیثیت کو جان سکیں۔

ڈرامائی کردار نگاری اور ناولی کردار نگاری میں یہ فرق ہے کہ ڈراما میں کسی کردار کے ترکیبی عناصر نہایت شرح و بسط کے ساتھ نہیں بیان کئے جا سکتے اور ناول میں یہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ مختصر افسانوں یا کہانیوں میں کسی کردار کی سب سے نمایاں خصوصیت لے کر اُسے مختلف حالتوں میں بیان کرنا افسانہ نگاری کا بہتر اور پسندیدہ طریقہ ہے کہانی لکھنے والے کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ تھوڑے وقت میں ناول کی طرح اپنے پیش کئے ہوئے کرداروں کی پوری زندگی دکھا سکے۔ اس لئے کہانی لکھنے والا اپنے کرداروں کو مختلف طریقوں سے پیش کرتا ہے اور اپنے کردار کے جس پہلو کو زیادہ نمایاں کرنا چاہتا ہے اس میں ڈرامائی اثرات کی مدد سے پڑھنے والے کو زیادہ سے زیادہ متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ مختلف طریقے یہ ہیں:۔

(۱) بیانی (Narration) یہ طریقہ بہت عام ہے اور بے حد مقبول۔ سچ پوچھئے تو یہ طریقہ ہے بھی نہایت عمدہ کہ افسانہ نگار سب سے پہلے اپنے افسانوی کردار کو ایسے الفاظ میں اپنے پڑھنے والے کے سامنے پیش کر دے کہ اس کے بعد وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے اسے اس طرح بیان کرے کہ پڑھنے والا اس کو دلچسپ خیال کرے۔ منشی پریم چند کی کہانیوں میں اس قسم کی صدہا اور بہت عمدہ عمدہ مثالیں موجود ہیں مثلاً ممتا، بڑے گھر کی بیٹی، عالم بے عمل، آہ بے کس، صرف ایک آواز، بانکا زمیندار، کرموں کا پھل، سناؤن، مزار آتشیں، فکر دُنیا، خودی، تالیف، کپتان، وغیرہ۔ ہم یہاں اُن کی ایک کہانی کپتان[۲] کے ہیرو جگت سنگھ کو پیش کرتے ہیں جس کا تعارف انہوں نے کہانی کے شروع میں اس طرح کرایا ہے:۔

---

[۱] خاک پروانہ صفحہ ۴۴ مطبوعہ نگار شین پریس لکھنؤ۔ [۲] خاک پروانہ۔

"جگت سنگھ کو کتابوں سے نفرت تھی، وہ سیلانی آوارہ گرد، گھمکڑ نوجوان تھا۔ کبھی امرود کے باغوں کی طرف نکل جاتا اور باغبان کے ساتھ شوق سے گالیاں کھاتا، کبھی دریا کی سیر کرتا اور ملاحوں کی کشتیوں میں بیٹھ کر اس پار نکل جاتا۔ گالیوں میں مزا آتا تھا۔ اسے بینڈ باجا بہت پسند تھا۔ بینڈ کا کوئی دن ناغہ نہ کرتا، آوارگی اور سرقہ دونوں ہمزاد ہیں اور سرقہ سے گاڑھا رشتہ ہے۔ جگت سنگھ کو جب موقع ملتا گھر سے روپیہ اُڑا لے جاتا، نقد نہ ملے تو برتن نکال لے جانے میں اسے دریغ نہ تھا۔ گھر میں جتنی شیشیاں اور بوتلیں تھیں سب اُس نے صاف کر دیں۔ پُرانے وقتوں کی کتنی ہی چیزیں اس کے یہاں پڑی تھیں جگت نے ایک ایک کر کے ان کا خاتمہ کر دیا۔ اس فن میں ایسا شاطر اور ہوشیار تھا کہ اس کی جدت اور مشکل پسندی پر حیرت ہوتی تھی۔ ایک بار وہ باہر ہی باہر اپنے دو منزلہ مکان کی چھت پر چڑھ گیا اور اوپر ہی سے ایک پیتل کی تھالی لے کر اُتر آیا۔ گھر والوں کو خبر تک نہ ہوئی۔ اس کے باپ بٹا کر بھگت سنگھ اپنے محلّے کے ڈاک خانے کے منشی تھے۔ جگت سنگھ قوی الجثہ ہونے پر بھی چپکے سے مار کھالیا کرتا تھا، لیکن مار پیٹ، تنبیہ، فہمائش کا اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ جونہی گھر میں قدم رکھتا چاروں طرف سے کاؤں کاؤں مچ جاتی۔ ماں دُور دُور کر کے دوڑتی، دو بہنیں گالیاں دینے لگتیں۔ بیچارہ اُلٹے پاؤں بھاگتا۔ کبھی کبھی وہ دو دو تین تین دن بھوکا رہ جاتا۔ گھر والے اس کی صُورت سے جلتے تھے۔ آوارہ گردی نے اسے تکلیفوں کا خوگر بنا دیا تھا۔ جہاں نیند آجاتی وہیں پڑا رہتا۔ جو کچھ مل جاتا وہی کھالیتا۔"

اتنی تفصیل کے بعد کہانی شروع ہوتی ہے۔ مگر یہ بیانی تفصیل غیر ضروری نہیں، بلکہ نہایت اہم، کیونکہ کہانی لکھنے والے نے جو کچھ کہا ہے اس سے آنے والے واقعات پر کافی روشنی پڑتی ہے اور پڑھنے والوں کے دلوں میں ایک اضطراری کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ دیکھیں ایسے لڑکے کا کیا انجام ہوگا۔ اس قسم کے تفصیلی بیانات میں اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ جو کچھ کہا جائے اس کا تعلق براہِ راست کہانی کے پلاٹ اور اس کے نتیجے سے ہو۔

ان باتوں کو مدِنظر رکھ کر اگر ہم "کپتان" کا جائزہ لیں تو اس کا تعلق پلاٹ سے صاف ظاہر ہے کہ ایسے لڑکے کا حشر کیا ہوگا؛ اور ایک نہ ایک دن وطن کو خیرباد کہنا اس کا لازمی نتیجہ ہوگا چنانچہ جگت سنگھ اپنے باپ کی جیب سے ایک انشیورڈ اُڑا لیتا ہے اور بمبئی کی راہ پکڑتا ہے۔ ڈاک خانہ کے منشی پر جو واقعات پیش آئے ہوں گے وہ بھی اس تفصیل سے آسانی سے اخذ کئے جاسکتے ہیں۔ یعنی محکمہ کی طرف سے غبن کا چارج لگنا، چنانچہ چارج لگتا ہے اور سزا ہو جاتی ہے۔ اب رہا نتیجہ اور انجام کا سوال اور اس کا اس تفصیل سے تعلق۔ اس کے لئے یہ بات سمجھ لینا چاہئے کہ منشی پریم چند ٹریجڈی کو زیادہ ہولناک نہیں بنانا چاہتے اور اس لئے اپنے افسانوی کردار کو کسی نہ کسی طریقہ سے اس سخت حالت سے نجات دلانے کی کوشش کرتے ہیں، چنانچہ یہاں بھی یہی ہوا؛ جگت سنگھ فوج میں ملازم ہوگیا اور سات آٹھ سال کے عرصہ میں وہ کپتان ہوگیا۔ باپ کی سزا کا خاتمہ ہوگیا اور اس کو رہائی کا حکم ملا۔ وہ ایک شش و پنج میں تھا کہ جائے تو کہاں جائے کہ بیٹا یعنی کپتان جگت سنگھ جس کی شوخی اور شرارت اب سنجیدگی سے بدل چکی تھی، باپ کو لینے آتا ہے اور کہانی کا خاتمہ طربیہ پر ہوتا ہے

منشی پریم چند نے جگت سنگھ کا کیرکٹر پیش کرنے کے بعد اس کو فوج کا کپتان بنایا، جو بالکل فطری ہے اس کو کسی کالج کا پروفیسر یا ڈاک خانہ کا بابو نہیں بنایا۔ کیونکہ ایسے لوگوں کے لئے ایسے ہی محکمے موزوں ہوا کرتے ہیں۔

اسی طرح بڑے گھر کی بیٹی، عالم بے عمل، آہ بیکس، صرف ایک آواز، کرموں کا پھل، بانکا زمیندار، مناؤن، مرہم وغیرہ میں منشی پریم چند نے تفصیلی بیانات کی مدد سے کیرکٹر پیش کئے ہیں اور نہایت خوبی کے ساتھ۔

(۲) مکالمہ (Dialogue) اس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ بعض اوقات کسی شخص کے طرز گفتگو، اس کے حرکات و سکنات اور آواز کے اُتار چڑھاؤ سے بھی ہمیں کیرکٹر کا اندازہ ہوتا ہے چنانچہ کہانی لکھنے والے بھی اپنے کرداروں کے کیرکٹر پیش کرنے میں مکالمہ اور حرکات و سکنات سے بہت زیادہ مدد لیتے ہیں۔ مکالمہ کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ حقیقی اور اصلی معلوم ہو یعنی کہانی لکھنے والے نے اپنے کرداروں سے جو کچھ کہلوایا ہے وہ ہو بہو وہی ہو جو اُن موقعوں پر اصلی زندگی میں لوگ کہا کرتے ہیں۔ افسانوی گفتگو اپنے کردار کی فطرت کے بالکل مطابق ہونی چاہئے۔ تاکہ اس کی زبان سے ادا کردہ الفاظ اجنبی نہ معلوم ہوں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں ایک انفرادی شان پائی جائے۔ اب ذرا منشی پریم چند کی کہانیوں میں ان کے مکالموں کو دیکھئے اور ان کے کمال کی داد دیجئے۔ واقعہ یہ ہے کہ جو بات جس افسانوی کردار کے مُنہ سے نکلتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود کھڑا بول رہا ہے خصوصاً وہ افراد جن کا تعلق دیہات سے ہے۔ مزارِ آتشیں[1] میں پیاگ اور اس کی بیوی کا ایک مکالمہ ملاحظہ فرمایئے اور ان کے کردار اخذ کیجئے:۔

پیاگ۔ لا کچھ پیسے مجھے دے دے دم لگا آؤں۔

رُکمنی نے مُنہ پھیر کر کہا۔ دم لگانے کا شوق ہے تو کام کیوں نہیں کرتے۔ کیا آج کل کوئی بابا نہیں ہیں؟

پیاگ۔ بھلا چاہتی ہے تو پیسے دے دے۔ نہیں اس طرح تنگ کرے گی تو ایک دن میں نکل جاؤں گا تب روئے گی۔

رُکمنی۔ روئے میری بلا۔ تم نکل جاؤ گے تو میں بھوکوں نہ مر جاؤں گی۔ اب بھی چھاتی پھاڑ کر کماتی ہوں۔ تب بھی چھاتی پھاڑ کر کماؤں گی۔

پیاگ۔ تو یہی پھٹیلا ہے۔

. . . .

پنڈت موٹے رام شاستری[2] کا کیرکٹر مکالمہ کے ذریعہ اس طرح پیش کیا گیا ہے:۔

موٹے رام۔ اجگر کرے نہ چاکری پنچھی کرے نہ کام۔ داس ملوکا کہہ گئے کہ سب کے داتا رام۔

سونا نے مسکرا کر کہا۔ کیا کوئی میٹھی تازی خبر ہے کیا؟"

موٹے رام نے پینترا بدل کر کہا۔ "ایسا تاک کر کہ چاروں شانے چت۔ سارے گھر کا نیوتہ ہے سارے گھر کا! وہ بڑھ بڑھ کے

---

[1] خاک پروانہ [2] فیصلہ [3] دعوت از خاک پروانہ

ہاتھ ماروں گا کہ دیکھنے والے دنگ رہ جائیں۔"

سونا نے کہا۔" کہیں پہلے کی طرح اب بھی دغا نہ ہو۔ پکّا بوڑھا کر لیا ہے نا؟"

موٹے رام نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا۔" ایسا شگن مُنہ سے نہ نکالو۔ بڑے جپ تپ کے بعد یہ شبھ دن آیا ہے۔ جو طیاریاں کرنی ہیں کر لو!"

. . . .

بچوں کے مکالموں میں بڑے بڑے ماہرِ فن بہک جاتے ہیں، مگر منشی جی نے جو نمونہ بچوں کی گفتگو کا پیش کیا ہے وہ خود اپنی نظیر ہے:۔

شیاما[1] نے پوچھا۔" کے بچّے ہیں بھیّا؟"

کیشو۔"تین انڈے ہیں، ابھی بچّے نہیں نکلے۔"

شیاما۔"ذرا ہمیں دکھا دو بھیّا کتنے بڑے ہیں"؟

کیشو۔" دکھا دوں گا۔ پہلے ذرا چیتھڑے لے آ۔ نیچے بچھا دوں۔ بچارے انڈے تنکوں پر پڑے ہیں۔

(شیاما دوڑ کر کپڑے لے آتی ہے۔)

شیاما۔" ہم کو بھی دکھا دو بھیّا"

کیشو۔ پہلے ذرا ٹوکری تو دے دے اوپر سایہ کر دوں۔

شیاما نے ٹوکری لا کر دے دی اور بولی۔" اب تم اُتر آؤ میں بھی دیکھوں۔"

کیشو نے کہا۔" جا دانہ اور پانی کی پیالی لے آ۔"

بڑے بھائی کا چھوٹی بہن سے اس طرح بار بار کام لینا اور اس غریب کا اس لالچ میں دوڑ دوڑ کر کام کرنا کہ بھیا ہمیں بچے دکھا دینگے کس قدر فطری اور حقیقی ہے۔ پھر ان کی بات چیت۔ اگر ایکٹ کی جائے تو مجسّم حقیقت نظر آتی ہے۔

ان مکالموں سے صاف ظاہر ہے کہ بیانات اور مکالموں کے علاوہ کہانیوں کے افراد کی خصوصیات اور ان کے کیرکٹر نمایاں کرنے کے لئے ایک کہانی لکھنے والا عمل یا ایکشن سے بھی مدد لیتا ہے۔

اسی طرح بعض اوقات تحریکات اور کشمکش کے ذریعہ سے بھی کیرکٹر پیش کئے جاتے ہیں۔ منشی جی نے اپنی ایک کہانی نغمۂ روح[2] میں رانی منورما اور مانجھی کے کیرکٹر اسی طور پر پیش کئے ہیں۔

---

[1] نادان دوست از خاک پروانہ۔ [2] خاک پروانہ ۱۲

کبھی کبھی افسانہ نگار کو شخصی کیرکٹر کی بجائے کسی جماعت، قوم یا فرقہ وغیرہ کا کیرکٹر پیش کرنا ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں افسانہ نگار کی نظر افراد کی بجائے جماعت پر ہوتی ہے اور وہ اس کو فردِ واحد تصوّر کر کے اس کا کیرکٹر پیش کرتا ہے۔ اس قسم کی کردار نگاری کا نمونہ منشی پریم چند کی ایک کہانی تالیف[1] میں ملتا ہے جس میں انہوں نے مسلمانوں کی تبلیغی انجمنوں اور ہندو سبھاؤں کے امتیازی خصوصیات اجتماعی حیثیت سے پیش کئے ہیں۔ مگر ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے اس میں زیادہ غور اور مشاہدہ کو دخل نہیں دیا ورنہ وہ اس سے زیادہ مکمل ہو جاتے۔

کردار نگاری کے ترکیبی عناصر میں حسب ذیل باتیں شامل ہیں:-

(۱) مکالمہ جس کے متعلق ابھی لکھا جا چکا ہے۔ (۲) اشخاص قصّہ کے نام۔ اعلیٰ درجہ کے افسانہ نگار اپنے افسانوں میں کوئی چیز ایسی نہیں رکھتے جس سے کوئی نہ کوئی غرض وابستہ نہ ہو۔ چنانچہ نام بھی کرداروں کی مخصوص انفرادی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں، اور بعض اوقات یہی نام افرادِ قصہ کے کیرکٹر بتلاتے ہیں۔ قدیم افسانہ نگاروں کے افسانوں میں یہ خصوصیت بھی پائی جاتی ہے چنانچہ انوارِ سہیلی میں فرخ فال، خجستہ رائے وغیرہ اسی قسم کے اسم با مسمّیٰ نام ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم کے اکثر افرادِ قصہ اسی نوعیت کے ہیں۔ نصوح، ظاہر دار بیگ، حمیدہ، صالحہ، سلیم، کلیم، مبتلا وغیرہ۔ منشی پریم چند نے بھی اس خصوصیّت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے اور ان کی کہانیوں میں اسی قسم کے نام پائے جاتے ہیں جن سے ان کے اخلاق و کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ رپودمن[2] سنگھ، ہری داس، ارجن سنگھ، سائیں دیّال، دیا[3] شنکر، گرجا، شان[4] سنگھ، دوجی کیلاش وغیرہ اسی نوعیت کے نام ہیں جو بالکل اسم با مسمّیٰ ہونے کے علاوہ اپنی اپنی جگہ نہایت موزوں اور مناسب ہیں۔

(۳) کرداروں کی ظاہری شکل و صورت کا بیان واضح طور پر پیش کرنا بھی کردار نگاری کا ایک بہت بڑا جُز ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تفصیلات کی بھرمار کر دی جائے۔ اپنے کردار کی اس مادی یا جسمانی خوبی کا ذکر کرنا چاہئے جس سے کہانی کی تحریک کو خاص تعلق ہو۔ حسن کا تفصیلی ذکر بھی زیادہ اچھا نہیں۔ منشی پریم چند نے اس اصول کو مدِ نظر رکھ کر کس خوبی سے مُنّی[5] کی شکل و شباہت پیش کی ہے:

"لڑکی کی صُورت بہت پیاری تھی جو اُسے دیکھتا موہ جاتا۔"

صرف ایک لفظ سے مُنّی کے حسن کا جو نقشہ پڑھنے والے کی آنکھوں میں پھر جائے گا وہ شاید کسی طویل جملے سے ناممکن ہے یا مثلاً رانی سارندھا میں انرده[6] سنگھ کی شکل و صورت کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:-

"اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک لمبے قد کا سجیلا جوان اندر داخل ہؤا"

یہاں "لمبے قد کا سجیلا جوان" جیسا فقرہ وہ کام دیتا ہے جس کی افسانے کے لئے ضرورت تھی یا اسی طرح انہوں نے اپنی ایک کہانی

---

[1] خاکِ پروانہ۔ [2] دشمن کو مسخر کرنے والا۔ از "بانکا زمیندار" نیم چیپی۔ [3] کرموں کا پھل [4] مناؤن [5] مرہم۔ [6] خودی از خاکِ پروانہ۔

مترجم میں شان سنگھ اور گیان سنگھ کا حلیہ اس طرح بیان کیا ہے :۔

" دونوں بھائی قوی ہیکل اور غضب کے جفاکش تھے "

اور ان کی بہن دوجی کی شکل و شباہت کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ صرف اتنا ہے :۔

" نہایت نازک اندام، سر پر گھڑا رکھ کر چلتی تو کمر بل کھاتی "

اس میں "سر پر . . . . " بظاہر غیر ضروری معلوم ہوتا ہے لیکن در اصل یہاں دکھانا یہ مقصود ہے کہ باوجود نزاکت مفلسی کے باعث اس کو یہ کام کرنا پڑتا تھا اور اس کا اثر یہ ہوتا تھا۔

(۴) لباس اور اس کی اہمیت۔ آدمی کے لباس سے بھی اس کی اخلاقی حالت کا پتہ لگتا ہے۔ صاف ستھرے لباس سے پہننے والے کی نفاست مزاج ظاہر ہوتی ہے۔ مرد کے لئے رنگین اور گوٹے پٹھے کا استعمال اس کی دوسری حالت کو ظاہر کرتا ہے عورتوں میں سبک اور نفیس زیورات کا استعمال ان کے مہذب ہونے اور جدید روشنی کی دلدادگی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کردار نگاری میں لباس سے بہت مدد ملتی ہے۔ یہاں آغا حیدر صاحب دہلوی کے ایک مضمون[۲] کا اقتباس دینا بے جا نہ ہوگا جس سے کردار نگاری میں لباس اور ظاہری شکل و صورت کی اہمیت کا صحیح طور پر اندازہ ہوگا۔

" اب جلسہ کی روح رواں سروجنی کی بابت سنو۔ ٹھمکا ٹھمکا بوٹا سا قد۔ گول گول گدرایا ہوا ڈیل۔ کھلتی چمپئی رنگت . . . . خوب گہری گہری کالی کالی جٹی بھویں۔ جبٹ کے اوپر چھوٹا سا کسم کا ٹیکا۔ بڑی بڑی نرگسی آنکھیں کچھ جھکی جھکی سی۔ بالوں میں کالی کنگھیاں لگائی گئی تھیں، جن میں ہیرے کی طرح چمکتے ہوئے سفید نگ جڑے تھے جو مہین بنارسی ساڑھی کے اندر سے پٹ بیجنیوں کی طرح جھم جھم کر رہے تھے . . . . سانچے میں ڈھلی باہیں اور اچھی گول گول نازک کلائیاں جن میں بھینی بھینی چمکتے ہوئے زبرجدی رنگ کی جاپانی ریشمی چوڑیاں۔ بیچ بیچ میں نیم کے پھول کے ممبئی کی جلا دار اشرفی کے سونے والی چوڑیاں . . . . گلے میں ست لڑے کی وضع کی کنٹھی تھی جس میں جگنو کی جگہ یاقوت کی جڑائی کا چاند۔ اور پکھراج کی جڑائی کا تارا سا لگا ہوا تھا۔ کانوں میں ہیرے کے چھوٹے چھوٹے بندے تھے، جو بجلی کی روشنی میں حرکت کے ساتھ پڑے جھم جھم کرتے تھے . . . . . . "

جناب آغا صاحب موصوف کا ایک دوسرا رنگ ملاحظہ ہو :۔

" چلانے والی ایک بی بی کوئی تیس تیس برس کی، پھنسا ہوا سفید آڑا پاجامہ نیچا نیچا مہین آب رواں کا سفید کرتا پہنے جس میں کٹاؤ کا کام اور گلشن کی بیل ٹکی ہوئی، دوپٹہ کچھ کندھے پر پڑا کچھ فرش پر جھاڑو دے رہا تھا۔ پیازی رنگ کا تھا۔ تین چار دن کے بدلے ہوئے کپڑے تھے۔ ہاتھوں میں کالی کریالی نخیں اور گھنڈی کے منہ کے کڑے۔ گلے میں بادامی دانے کی چمپا کلی، کانوں میں ایک ایک ہیرا کاٹ کی بالی . . . . . . "

---

[۱] بھیڑوں کی جنگ بیتی از علی گڑھ منتھلی جلد ۲ سنہ ۱۹۱۹ء - [۲] از جیا ڈوں پیاڈوں

کیا پڑھنے والے ان بیانات میں لباس اور وضع قطع کی مدد سے دونوں کے کیرکٹر کا کچھ اندازہ نہیں کر سکتے۔ ہماری رائے ناقص میں تو ایک ادنیٰ تامل سے ان کا کیرکٹر معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ افرادِ قصہ کو سمجھنے میں لباس کو کہاں تک دخل ہے۔

منشی پریم چند نے جہاں اس سے کام لیا ہے کسی دوسرے سے پیچھے نہیں رہے اور جو کچھ دکھلایا ہے نہایت موزوں اور مناسب طور پر۔ انہوں نے جو لباس افرادِ قصہ کے لئے پیش کیا ہے اس کا نمونہ ملاحظہ فرمایئے:۔

"گاڑھے کی ڈھیلی مرزئی، گھٹنوں تک چڑھی ہوئی دھوتی۔ سر پر ایک گرانبار اُلجھا ہُوا صافہ۔ کندھے پر چنوٹی اور تمباکو کا وزنی بٹوا . . . ."

امرت میں عائشہ کا حلیہ اس طرح بیان کیا ہے:۔

"سانولا رنگ تھا۔ چہرہ ایک متین ملاحت سے منور تھا۔ بڑی بڑی نرگسی آنکھوں سے اخلاقی تہذیب کی روشنی جھلکتی تھی۔ قد میانہ سے کچھ کم۔ اعضا سُبک . . . ."

یہی وہ چیزیں ہیں جن سے کہانی لکھنے والا اپنے افرادِ قصہ کے لئے مواد فراہم کرتا ہے۔ اور ان میں مشاہدہ کی بہت سخت ضرورت ہے۔ اچھے افسانہ نگار ہمیشہ اپنے گرد و پیش کے واقعات سے متاثر ہو کر اپنے لئے مواد فراہم کر لیتے ہیں۔ وہ جن لوگوں سے ملتے جلتے ہیں یا جو لوگ ان کے گرد و پیش نظر آتے ہیں، ان کی ہر حرکت کا مطالعہ بغور کرتے ہیں، ان کی باتوں کو توجہ سے سنتے ہیں۔ اگر کوئی چیز ایسی مل جاتی ہے جسے وہ دلچسپ سمجھتے ہیں تو فوراً اسے اپنے افسانے کے لئے رکھ لیتے ہیں۔

اس کے علاوہ افسانہ نگار کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اشخاصِ قصہ کے غیر اختیاری افعال اور حرکات کو بھی مدِ نظر رکھے مثلاً رونے ہنسنے، بیہوش ہونے، غصہ کرنے وغیرہ سے بھی افرادِ قصہ کے کیرکٹر پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ حرکات کس موقع پر کیسی ہونی چاہئیں اس کا جائزہ لینا افسانہ نگار کا فرض ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ قلبی کیفیتوں کے اظہار کے یہ ذرائع گفتگو سے زیادہ واضح اور مؤثر ہونے کے علاوہ عین فطری ہوتے ہیں۔

منشی پریم چند نے اپنی کہانیوں میں جا بجا اس قسم کے غیر اختیاری افعال سے کیرکٹر نگاری میں مدد لی ہے اور نہایت خوش اسلوبی سے نباہا ہے، مگر ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم نے جو لطف پیدا کیا ہے وہ منشی جی کے وہاں نہیں۔

اظہر علی فاروقی

اظہارِ عشق

میں آج کل اپنے گاؤں ضلع سرگودھا میں مقیم ہوں۔ گاؤں کے سادہ تمدن نے میرے دل و دماغ پر جو اثرات چھوڑے ہیں اُن کو ناظرین ہمایوں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

الطاف

اس طرح جرأت کروں گا عشق کے اظہار کی

کھیت کو جب جائے گی تُو چھاچھ لیکر دُھوپ میں
مُسکراؤں گا جوانی بن کے تیرے رُوپ میں

بانسری کی لَے میں تُو ہو جائیگی گم جس گھڑی
مَیں تری آنکھوں میں بن جاؤنگا ساون کی جھڑی

رات کو چھیڑیگی جب چرخے کا تُو رنگیں ستار
مَیں ترے نغموں میں بن جاؤں گا ہلکا سا خمار

صبحدم جب گائیگی چکّی پہ تُو میکے کا راگ
مَیں ترے سینے میں بن جاؤنگا امیدوں کی آگ

تُو نہائے گی جو چھُپ کر کیکروں کی باڑ میں
بُلبلے کی شکل بن کر میں رہوں گا تاڑ میں

رات کے ہنگام سو جائے گی جب تُو کھاٹ پر
خواب میں بن کر کوئی چھیڑونگا تجھ کو گھاٹ پر

جب کبھی تُو جائے گی گرمی میں گیہوں کُوٹنے
بجلیاں بن بن کے گالوں سے لگوں گا لُوٹنے

دِن ڈھلے جب لے کے چارہ آئیگی تو گاؤں میں
بن کے سبزہ لیٹ جاؤں گا میں تیرے پاؤں میں

دودھ دُہنے کی صدا پر جب لگے گی جھُومنے
بن کے گیسُو سرخ گالوں کو بڑھوں گا چُومنے

جب برستی رات میں گائے گی تُو میٹھے ملار
میں تری آنکھوں میں بن جاؤں گا ہلکی سی پھوار

اس طرح جرأت کروں گا عشق کے اظہار کی

الطاف مشہدی

برہا

سیمابی اور عنابی چیتے ہیں اندھیری راتوں کے
جیسے منتر ہوں جنگل کے جادوگر کی باتوں کے
یا ساون کی کالی گھٹاؤں کی تیکھی برساتوں کے

دل پر چھانے والے نغمے، بیہوشی لانے والے!

ایسی راتیں: چندا گھونگٹ کاڑھے چُپکے سوئے ہیں،
اور گنتی کے چند ستارے نیندیں کھوئے کھوئے ہیں،
پیڑ اور پتّے، ٹہنی ٹہنی تاریکی میں دھوئے ہیں،

دِل کو ڈرانے والے سائے، دِل کو دہلانے والے!

سائے — کالے کالے سائے رینگ رینگ کر چلتے ہیں،
اور ان کالے سایوں سے بھُوتوں کے جھُنڈ اُبلتے ہیں،
دل میں اندھے، بے بس، بے پایاں جذبات مچلتے ہیں،

گیت بنانے والے، نغمے چاہت کے گانے والے!

میراجی

چوپٹ راجہ

ہندوستان کا ایک قدیم روایتی قصہ ڈرامے کی شکل میں

افرادِ تمثیل

گرو	بھگوان کے بھگت
چیلا	گروجی کا ناخلف اور پیٹو پیروکار
حلوائی	اندھی نگری کا دکاندار
بڑھیا	جس کا بچہ دب کر مر گیا
معمار	جس نے دیوار بنائی
بھٹے والا	جس نے مسالہ دیا
چوپٹ راجہ	اندھی نگری کا حکمران
منتری	چوپٹ راجہ کا مشیرِ کار
فالتو لوگ	گاہک، بھکاری، رعیت، چوبدار، خدام وغیرہ

پہلا منظر

(گرو اور اُن کا چیلا اُس بستی سے چل کر اندھی نگری میں داخل ہوتے ہیں، جہاں وہ تپ کیا کرتے تھے۔)

چیلا۔ کیوں گروجی! چوپٹ راجہ کی اندھی نگری یہی ہے؟

گرو۔ ہاں بیٹا۔ چوپٹ راجہ کی اندھی نگری یہی ہے۔ یہاں ہمیشہ سے اندھیر ہوتا چلا آرہا ہے اور اسی لئے اس کا نام اندھی نگری پڑ گیا ہے۔ اجنبی اور نئے آدمی کے لئے معاملہ بڑا کٹھن ہوتا ہے۔ بعض دفعہ تو بپتا کے چکر میں ایسا پھنس جاتا ہے کہ شنوائی تک نہیں ہوتی۔

چیلا۔ واہ گروجی! یہ آپ نے کیا کہا؟ آپ کے ہوتے کسی کی مجال ہے کہ میرا بال بیکا کر سکے؟ آپ کے کرم سے

سب میری دل سے عزت کریں گے اور تھوڑے دنوں کے اندر اندر میرے نام کا ڈھول یوں پٹنے لگے گا کہ دُور دُور تک چرچا ہوگا۔ سب لوگ میرے پاؤں دھو دھو کر پئیں گے۔

گرو۔ مجھے تو ایسی آس نہیں بلکہ کھٹکا ہے کہ کہیں تو اینچ پینچ میں نہ آجائے اور پھر جان پر بن جانے کی نوبت نہ پہنچے۔

چیلا۔ اجی واہ گروجی! کبھی یوں بھی ہو سکتا ہے۔ آپ تو بات بات پر جی چھوڑ دینے کے عادی ہو گئے ہیں اور ساتھ ہی مجھے بھی پھسڈی بنا رہے ہیں۔ بھلا یونہی بیٹھے بٹھائے بلاوجہ میں اینچ پینچ میں آسکتا ہوں؟ اگر کوئی مجھے اس میں لانے کی کوشش کرے تو وہیں کچومر نکال دوں۔

گرو۔ تُو تو نرا کاٹ کا اُلو ہے۔ نہ سمجھتا ہے نہ سوچتا ہے، ذرا خیال تو کر کہ اتنی دُور سے چل کر آنے کی کونسی بےواری پڑی تھی؟

چیلا۔ واہ گروجی! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ بھلا بےواری ہی کوئی نہیں تھی، دھیان دیجئے کہ ایک تو اس نگری کے باسی دھرم کو بھول بھال بھٹکتے پھر رہے ہیں اور دوسرے پرماتما کے کرم سے ٹکے سیر بھاجی اور ٹکے سیر کھاجا بکتا ہے۔ کھانے پینے والے آدمی کے لئے مزے ہیں اور خوب گہرے ہیں۔

گرو۔ بس رہنے دے۔ اتنی سی بات پر اتنا دُن۔

چیلا۔ واہ گروجی! کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ اتنی بڑی بات اور آپ اسے اتنی سی بنا رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ آپ کے لئے اتنی سی ہو لیکن میرے لئے تو بہت بڑی ہے۔

گرو۔ پھر وہی ڈھاک کے تین پات۔ مجھے نظر آرہا ہے کہ یہ نگری تجھے راس نہیں آئے گی اور تیرے ساتھ وہ معاملہ ہوگا کہ دمڑی کی گڑیا، ٹکا سر منڈائی۔

چیلا۔ واہ گروجی! آپ نے تو غضب ڈھا دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ دھرم پجاری ٹھیرے اور میں پیٹ پجاری۔ دیکھیئے دونوں میں کتنا فرق ہے زمین آسمان سے بھی زیادہ۔

گرو۔ تیری اچھیا۔ تُو تو ہٹا ہٹ دھرم ہے۔ ہمیشہ اپنی بات کی پچ کیا کرتا ہے۔ جو جی میں آئے کر! ہم تجھے روک ٹوک سکتے نہیں۔ پھر بھی پھونک پھونک کر قدم رکھنا اور خوب چوکس ہو کر رہنا۔

چیلا۔ ہاں مہاراج! یہ تو مجھے کرنا ہی پڑے گا۔ ایسا نہ کیا تو جگہ جگہ نقصان اُٹھانا پڑے گا۔

گرو۔ بس ٹھیک ہے۔ دُکھ درد کا وقت آپڑے تو بھگوان کا نام لے کر ہماری طرف دھیان لگا لینا اور پندرہ بیس بار ہمارے نام کی مالا جپ لینا پھر سب کشٹ دُور ہو جائیں گے۔ اب تو بیشک جدھر جی چاہے چل پھر کیونکہ ہم نے تجھے جہاں کہا تھا وہاں پہنچا دیا ہے اب ہم واپس جاتے ہیں۔

چیلا۔ ابھی سے کیا؟ نہیں مہاراج۔ دو چار دن تو ٹھیریئے یہاں کا حلوا بڑا مزیدار ہوتا ہے اور پھر ٹکے سیر بکتا ہے۔ آپ دو چار سیر چکھ جایئے۔ یاد تو رہے گا۔

گرو۔ بس بیٹا! بھگوان تجھی کو دیں۔ ہمیں اس کا لوبھ نہیں۔ پربھو تیرا کلیان کریں۔ ہمیں واپس اپنی بستی میں جا کر چلہ کاٹنا ہے۔ لے ہم چلتے ہیں۔

(آنًا فانًا گروجی غائب ہو جاتے ہیں)

چیلا۔ اوہ، گرو جی غائب بھی ہو گئے۔ چلو پنڈ چھٹا۔ اب خوب آرام اور عیش کے دن بسر کروں گا۔ نہ کوئی فکر نہ کوئی دکھ۔ رات دن مزے ہی مزے ہوں گے۔ سکھ میں زندگی کٹے گی۔ اتنا حلوا کھاؤں گا کہ تھوڑے ہی دن میں یہ ہڈیاں چھپ جائینگی۔ اور ان پر اتنا ماس چڑھے گا کہ پورا بھینسا بن جاؤں گا۔

دوسرا منظر

(سامنے حلوائی کی بہت بڑی دکان ہے جس پر گاہکوں کی خوب بھیڑ لگ رہی ہے۔ چیلا بھی ادھر ہی کا رُخ کرتا ہے)

حلوائی۔ اے لونڈے! یہ پکڑ آدھ پاؤ حلوا اور لو جی تم اپنا تین پاؤ کا دونا۔

بھکاری۔ بابا کچھ ہمیں بھی بھگوان کے نام پر دو۔

حلوائی۔ چلو چلو آگے بڑھو۔ اپنا رستہ لو۔ ہاں سادھو جی آپ کو کیا دوں۔

چیلا۔ دینا کیا ہے جو بیچتے ہو وہی دو۔ اور ہاتھی یا بیل تھوڑی دے سکتے ہو۔ یہ لو ایک دھیلا۔ کھرا کھوٹا ابھی سے دیکھ لو پھر نہ کہنا۔

حلوائی۔ اس کا حلوا پون پاؤ ملے گا۔

چیلا۔ وہ کس حساب سے؟ پاؤ بھر دو۔

حلوائی۔ دیکھئے نا آپ کے دھیلے میں چھید ہے۔

چیلا۔ چھید سے کیا ہوتا ہے؟ کوئی بھس تھوڑی بل جاتا ہے، مال سے تو کھرا ہے۔

حلوائی۔ واہ کھرا کیسے ہوا؟

چیلا۔ اچھا تو لاؤ دھیلا واپس کر دو۔ میں اگلی دکان پر جاتا ہوں۔

حلوائی۔ اچھا آدھ چھٹانک اور لے لو۔

چیلا۔ پورا ایک پاؤ دینا ہے تو دو۔ ورنہ سادھو کو خراب نہ کرو۔

حلوائی۔ اچھا مہاراج پورا پاؤ بھر لیجئے! تاؤ میں نہ آیئے۔

چیلا۔ واہ تاؤ میں کیسے نہ آؤں تم نے بات جو ایسی ہی کی۔

(حلوائی ترازو میں باٹ چڑھا کر حلوا تولتا ہے)

چیلا۔ ڈنڈی کیوں مارتے ہو؟ کیا کم دو گے،

حلوائی۔ نہیں مہاراج! نہ میں ڈنڈی مارتا ہوں، نہ کم دیتا ہوں آپ تو ناحق بے وار ہو رہے ہیں۔

چیلا۔ اچھا تو پھر بیچ بیچ میں سے گرم گرم تو دو گھی بھی آنے دو۔

حلوائی۔ گھبرایئے نہیں۔ سب کچھ آجاتا ہے۔ یہ لیجئے۔

(تولنے کے بعد سادھو کے ہاتھ میں دونا پکڑا دیتا ہے)

چیلا۔ ارے رے رے! یہ اس میں مکھی کیسی؟

حلوائی۔ یونہی آگئی ہوگی۔ نکال پھینکئے اسے باہر؛

چیلا۔ پھر اس کا بھی حصہ دو۔ یہ بھی تول میں آئی ہے۔

حلوائی۔ یہ لیجئے اس کا بھی حصہ۔

(حلوائی تھوڑا سا حلوا ڈال دیتا ہے)

چیلا۔ بس بس۔

(حلوا لے کر سادھو ایک طرف چلا جاتا ہے۔ چھوٹا سا پتھر دیکھ کر اس پر بیٹھ جاتا ہے اور حلوا کھانے لگ جاتا ہے۔ حلوا گرم ہونے کے باعث زبان جل جاتی ہے۔)

چیلا ۔ او او او ! جبہ جل گئی ۔ جبہ جل گئی ۔ لیکن مزا آگیا ۔ واہ گروجی ! خوب جگہ پہنچا گئے ۔ دن رات آنند سے حلوا کھایا کروں گا اور آپ کے گن گایا کروں گا لیکن کتنے دُکھ کی بات ہے کہ میں تو اس وقت چٹخارے لے لے کر حلوا کھا رہا ہوں اور آپ کسی برگد کی کھوہ میں بیٹھے تپ کر رہے ہوں گے (آدھے کے قریب حلوا ختم ہو چکا ہے) اب اسی طرح کھاتے کھاتے بستی کو جی بھر کر دیکھنے نکل چلیں تو ٹھیک ہے ۔ ذرا یہاں کے باسیوں کے طور طریقے اور چوپٹ راجہ کے رنگ ڈھنگ دیکھیں ۔ آخر پتہ تو چلے کہ یہ بستی اندھی نگری کے نام سے کیوں مشہور ہے ۔

(سادھو وہاں سے اُٹھ کر چلا جاتا ہے ۔)

تیسرا منظر

(اندھی نگری کے قلب کا وہ حصّہ جہاں کے مکان نہایت خستہ ہیں، اتفاق سے ایک مکان کی دیوار گرنے کو ہے کسی کا بچہ اسی دیوار کے نیچے آکر کھیلنے لگ جاتا ہے سادھو حلوا کھاتا کھاتا ادھر آنکلتا ہے ۔)

چیلا ۔ (دیوار گرتی دیکھ کر) ارے ارے دیوار گری ۔ اوہ اوہ کسی کا بچہ دبا ۔ ہائے ہائے ۔ بھاگو رے لوگو ! نہیں تو بچہ اگلی دُنیا میں جا کر دم لے گا ۔ جلدی آؤ رے کوئی ہو تو کتنے بیرحم ہو تم ۔ مرتی ہوئی جان کو نہیں بچا سکتے ۔

(کوئی مرد ادھر آنکلتا ہے)

مرد ۔ تمہیں بچا لو نہ جو کھڑے مُنہ تک رہے ہو اور دوسروں کو بے رحم اور نہ جانے کیا کیا بنا رہے ہو ۔

چیلا ۔ اے واہ، آنکھوں پر پٹی باندھ کر پھر رہے ہو ۔ دیکھ بھی نہیں سکتے کہ میرے ہاتھ رُکے ہوئے ہیں ۔ ایک ہاتھ میں حلوا ہے اور دوسرے سے حلوا کھا رہا ہوں ۔ اگر کہیں تمہاری طرح میرے ہاتھ خالی ہوتے تو بچے کو دیوار کے نیچے ہی نہ آنے دیتا ۔

(لوگ آتے ہیں اور بچے کو نکالتے ہیں ۔ سادھو بھی وہاں آجاتا ہے)

چیلا ۔ اُف ، بیچارہ مر کر ہی رہا ۔

مرد ۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ۔ تم اگر تھوڑی دیر کے لئے مُنہ بند کر لیتے تو بچہ کبھی نہ مرتا ۔

چیلا ۔ اے واہ ۔ آنے میں تم لوگوں نے دیر کی اور اُلٹا مجھ سے اُلجھ رہے ہیں ۔ اگر میں آوازیں نہ دیتا اور چلّا چلّا کر نہ پکارتا تو تم کیسے آتے اور بچے کو بچاتے ۔ یہیں پڑا پڑا گل سڑ جاتا ۔

(اتنے میں بچے کی ماں آجاتی ہے)

ماں ۔ ہائے رے میرا بچہ ، میرے دل کا ٹکڑا ، میرا پیارا میرا تارا مجھ سے چھن گیا ۔

چیلا ۔ بڑھیا یوں بین نہ کر ۔ اس سے کچھ نہیں بنے گا ۔ کال کی چکی اسی طرح گھوما کرتی ہے ۔ اس کی ہتھی ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے ۔

ماں ۔ مگر سادھو جی ! میری تو زندگی کا یہی ایک سہارا تھا جس سے میں آس لگائے بیٹھی تھی ۔ اب میرے لئے جینا بیکار ہے

مرد۔ نہیں بڑھیا یوں دل نہ توڑ بلکہ حوصلہ کر! شاید بھگوان اس کا بدلہ تجھے کسی اور طرح دے دیں۔ یا اگلے جنم میں تجھے عوض دیں۔ دیکھ منتری جی ادھر آ رہے ہیں، ان سے فریاد کر!

(منتری جی آ پہنچتے ہیں)

ماں۔ منتری جی! میں بڑھیا عورت اس نامراد بڑھاپے میں آ کر لٹ گئی۔ میرا ایک ہی بچہ تھا وہ دیوار تلے آ کر دب گیا۔

منتری۔ تو پھر بھگوان سے کہہ جس نے یوں کیا، ہم نے تھوڑی دیوار گرائی ہے کہ تیرا بچہ دب گیا ہو۔

ماں۔ مہاراج اب تو آپ ہی میرے لئے بھگوان ہیں۔ کرنا چاہیں تو سب کچھ کر سکتے ہیں۔

منتری۔ اچھا تو کل آ جانا۔ اس سامنے کے پنڈال میں مہاراج کا دربار لگوا دیں گے۔ تو اپنی فریاد ان سے کہہ دینا۔

ماں۔ اچھا مہاراج۔

(منتری جی آگے بڑھ جاتے ہیں۔ بڑھیا بچے کی نعش کو اُٹھا کر روتی پیٹتی گھر چل دیتی ہے۔ سادھو حلوا کھاتا کھاتا بستی کی سیر کرنے لگ جاتا ہے۔ لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔)

چوتھا منظر

(آج صبح ہوتے ہی ایک وسیع میدان میں چوپٹ راجہ کا دربار لگ گیا ہے۔ زریں تخت بچھ گیا ہے۔ مہاراج اس پر متمکن ہیں۔ خادم چنور کر رہا ہے۔ دائیں جانب منتری اور بائیں جانب دیگر امراء ایستادہ ہیں۔ اردلی، سپاہی اور محافظ دست بستہ سرنگوں کھڑے ہیں۔ میدان کے بیچوں بیچ پھانسی گاڑ دی گئی ہے۔

لوگ ہر چہار طرف سے ہجوم کر رہے ہیں۔ چیلا بھی تازہ تازہ حلوے کا دونا پکڑے آ جاتا ہے۔)

چیلا۔ کیوں بھئی یہ ٹھٹ کیوں لگ رہا ہے۔ کوئی میلہ ہے یا کسی نٹ کا تماشا جو تمام لوگ ٹوٹ رہے ہیں۔

آدمی۔ میلہ یا تماشا ایسا ہوتا ہے۔

چیلا۔ اور کیا اس کے سر سینگ ہوتے ہیں۔

آدمی۔ سادھو مہاراج! یہ دربار لگا ہے۔ کل جو تمہارے سامنے بڑھیا کا بچہ دیوار تلے دب کر مر گیا ہے اُس کا فیصلہ ہو گا۔

چیلا۔ اے واہ، ایک دو دن کا 'ایکا' مرا ہے اور اس کے بعد اتنا دُن مچ رہا ہے کہ جیسے آفت ہی تو آ گئی ہو۔

آدمی۔ آفت، آفت نہیں تو اور کیا؛ دیکھنا، تمہارے سامنے سامنے ہی کتنے لوگوں کو سامنے لگی ہوئی پھانسی پر چڑھا دیا جاتا ہے۔

چیلا۔ واہ، یہ کیوں؛ بچہ مرا اپنی موت، بھلا پھانسی کس بات کی؛ نہ کسی نے اسے جان بوجھ کر ہلاک کیا اور نہ کسی نے اسے مارنے کی کوشش کی۔

آدمی۔ بس دیکھتے ہی رہئے کیا ہوتا ہے۔

چیلا۔ پھر تو خوب موقع ہاتھ آیا۔ آج تو مزے لے کر اسی تماشے کو دیکھتے ہیں کہ کس طرح فیصلہ کیا جاتا ہے اور کس کس آدمی کو پھانسی چڑھایا جاتا ہے لیکن بھئی یہ تو بتاؤ، یہ

سامنے سنگھاسن پر کون بیٹھا ہے؟

آدمی ۔ یہ اس نگری کے بدھیمان راجہ ہیں۔

چیلا ۔ بدھیمان، واہ یہ بھی خوب کہی۔ ان کی تو اُونٹ کی طرح کوئی کل سیدھی ہی نہیں، یہ بدھیمان کدھر سے ہیں؟

آدمی ۔ بس جی، چھوڑو اس بات کو۔ نقیب ڈھول پیٹنے لگا ہے۔ خاموش ہو کر سب کچھ دیکھتے جاؤ۔

(ڈھول پٹتا ہے۔ بڑھیا دست بستہ سامنے حاضر ہو جاتی ہے)

راجہ ۔ بڑھیا! تیرا بچہ کیونکر مرا؟

بڑھیا ۔ مہاراج دیوار تلے آکر۔

راجہ ۔ پھر قصور کس کا ہوا؟

بڑھیا ۔ مہاراج دیوار بنانے والے کا جس نے بے پروائی سے کچی دیوار کھڑی کر دی۔

راجہ ۔ ٹھیک ہے۔ کہاں ہے دیوار بنانے والا۔ دیکھو پنڈال میں!

چوبدار ۔ مہاراج وہ کھڑا ہے گھنے بڑ کی جڑ میں۔

راجہ ۔ وہ جس کے ہاتھ میں تیشہ اور کرنی ہے۔

چوبدار ۔ جی مہاراج۔

راجہ ۔ بلاؤ اُسے، فوراً سامنے آئے۔

(دیوار بنانے والے کو حاضر کر دیا جاتا ہے۔)

چوبدار ۔ حاضر ہے مہاراج!

راجہ ۔ کیوں بے تُو نے دیوار کچی کیوں بنائی؟ تجھے پھانسی لگنے سے کونسا عذر بچا سکتا ہے؟ جلدی بول!

معمار ۔ مہاراج میرا اس میں قصور ہی کوئی نہیں۔ سارا قصور تو بھٹے والے کا ہے جس نے مجھے کچا اور ردی مسالہ دیا۔

راجہ ۔ اچھا تو پھر بھٹے والے کا پتہ دے یا اسے لا کر سامنے حاضر کر نہیں تو اس کے عوض تجھ کو پھانسی لٹکا دیں گے اور اسے تب پھانسی دیں گے جب وہ مل جائے گا۔

معمار ۔ مہاراج، بھٹے والا تو وہ سامنے ہے۔ دیکھئے اُونچے سے ٹیلے پر ایک پتھر کے ڈھیر پر بیٹھا ہے۔

راجہ ۔ اچھا تو چوبدار تم اسے حاضر کرو تاکہ ہم اسے پھانسی پر لٹکائیں! بغیر کسی کو پھانسی دیئے خالی پھانسی کو نہیں اُکھاڑیں گے۔

(چوبدار تھوڑی ہی دیر میں بھٹے والے کو حاضر کر دیتا ہے)

چوبدار ۔ بھٹے والا حاضر ہے مہاراج!

راجہ ۔ کیوں بے تجھے ہم نے اس لئے بھٹا بنانے دیا تھا کہ تو لوگوں کو کچا مسالہ دے جس سے کچی دیواریں بنیں اور بچے ان کے تلے دب کر مر جائیں۔

بھٹے والا ۔ نہیں مہاراج! یہ بات نہیں ہے۔

راجہ ۔ پھر کیا بات ہے؟

بھٹے والا ۔ قصور سارا اس بڑھیا کا ہے۔

راجہ ۔ بڑھیا کا؟

بھٹے والا ۔ جی مہاراج۔

راجہ ۔ وہ کیسے؟

بھٹے والا ۔ وہ ایسے کہ اگر وہ بچے کی حفاظت کرتی تو نہ بچہ مرتا نہ مہاراج کو دربار لگانے کی بپتا اُٹھانی پڑتی اور نہ مہاراج کے آرام میں خلل پڑتا۔

راجہ ۔ شاباش، شاباش! خوب کہی۔ اس بھٹے والے کو گلے

تنخواہ دینا شروع کردو اور یہ آج سے ہمارے منتریوں میں
شمار ہوگا۔ اس نے ہمیں بڑے پتے کی بات بتائی۔ اصلی
شکار تو اب پکڑا ہے۔ ہم ناحق دماغ کو پریشان کر رہے
تھے۔ بس اب بڑھیا! تجھے پھانسی پر لٹکایا جائے گا۔

بڑھیا۔ مہاراج!

راجہ۔ مہاراج وہراج کچھ نہیں، جلاد اس بڑھیا کو پھانسی
پر لٹکا دو۔

(ایک آدمی سامنے آتا ہے اور ہاتھ جوڑ کر کورنش بجا لاتا ہے)

آدمی۔ مہاراج اگر سچ پوچھیں تو قصور اس بڑھیا کا نہیں ہے۔

راجہ۔ بڑھیا کا نہیں ہے تو پھر اور کس کا ہے؟

آدمی۔ قصور اس حلوا کھانے والے سادھو کا ہے جس نے
بچے کو نیچے آتا دیکھ کر جھٹ سے لے بچا نہ لیا۔

راجہ۔ یہ بھی ٹھیک بات ہے۔ لیکن سادھو کہاں ہے اس
کا پتہ دو نہیں تو اس کے عوض تمہیں پھانسی چڑھنا ہوگا۔

آدمی۔ مہاراج! سادھو وہ ۔ ۔ ۔ ۔ اس طرف بائیں کھونٹ
پر کھڑا ہے۔

راجہ۔ چوبدار! بس پھر اسی کو پکڑ لاؤ!

(چوبدار سادھو کو لے آتا ہے۔)

چیلا۔ اے واہ مہاراج، مجھے آپ کیوں پھانسی پر لٹکایا
چاہتے ہیں؟

راجہ۔ چپ رہو جی! ہم اُکتا چکے ہیں اور اب کسی کا عذر
سننے کو تیار نہیں۔ دن ڈوبنے کو آیا اور اب تک پھانسی
پر ایک بھی نہیں چڑھا۔

چیلا۔ لیکن مجھے اپنا قصور معلوم ہونا چاہئے!

راجہ۔ ہمارا نہ تو اب دماغ کام کرتا ہے اور نہ اب ہم قصور وصور
بتاتے ہیں۔ تم یہ سمجھ لو کہ موت تمہارے لئے یقینی ہے
اور کوئی طاقت تمہیں اس کے پنجے سے چھڑا نہیں سکتی
شور مچانے کی بجائے بھگوان کی طرف دھیان دو اور
اپنے کئے ہوئے پاپ بخشوا لو۔

چیلا۔ یونہی ہے تو میری دو آرزوئیں ہیں۔

راجہ۔ وہ کیا؟

چیلا۔ وہ یہ کہ اوّل تو حلوا کھا لینے دیجئے اور دوسرے اپنے
گرو کو یاد کر لینے دیجئے۔

راجہ۔ ہاں تمہاری دونوں باتیں ہم منظور کرتے ہیں۔

(چیلا جلدی جلدی حلوا کھا لیتا ہے)

چیلا۔ چلو حلوا تو کھا لیا اب گرو جی سے نمٹ لوں۔

(آنکھیں بند کر کے گرو کی طرف دھیان دیتا ہے)

اے گرو جی! میں نے بُرا کیا جو آپ کی بات نہیں مانی،
میری نادانی اور ہٹیلے پن نے مجھے موت کے منہ میں ڈالا
اب اس بھری دُنیا میں آپ کے سوا اور کون ہے جو
مجھے پڑی ہوئی بپتا کے ہاتھوں سے چھڑائے۔ آپ
جھپ سے آیئے اور مجھے مصیبت سے نکالئے۔

(گرو جی کا ظہور)

گرو۔ کیا ہوا ہے بیٹا؟

چیلا۔ گرو جی ہوا کچھ نہیں، یہ لوگ بلا وجہ مجھے پھانسی دے
رہے ہیں۔

گرو۔ تجھے تو ہم نے کہا تھا کہ یہاں ایسا ہی کچھ ہوتا ہے۔

چیلا۔ یہ تو ٹھیک ہے گروجی! پر اس وقت کچھ جتن کیجئے۔

گرو۔ اچھا تو لا پھانسی کا پھندا ہمارے حوالے کر!

چیلا۔ نہیں مہاراج! اگر یہی بات ہے تو پھر میں ہی ٹھیک ہوں۔

گرو۔ ہٹ نہ کر۔ پھندا میرے حوالے کر۔

چیلا۔ اوں ہوں، آپ پھانسی چڑھ گئے تو میں آپ کے بغیر کیسے جی سکوں گا۔ مہاراج پھانسی میں ہی چڑھوں گا۔

راجہ۔ یہ جھگڑا کیسا ہے؟

چوبدار۔ مہاراج جھگڑا یہ ہے کہ ایک کہتا ہے کہ میں پھانسی چڑھوں گا اور دُوسرا کہتا ہے میں چڑھوں گا۔

راجہ۔ کیوں سادھو کیا بات ہے؟

چیلا۔ مہاراج بات صرف سورگ کی ہے۔

راجہ۔ سورگ کی، وہ کیسے؟

چیلا۔ وہ ایسے کہ آج کے دن جو کوئی بھی پھانسی لگے گا، وہ سیدھا سورگ میں پہنچے گا اور بھگوان اسے درشن دیں گے۔

راجہ۔ اچھا یہ بات ہے؟

چیلا۔ ہاں مہاراج یہ بات ہے۔

راجہ۔ اچھا تو لاؤ پھانسی مجھے چڑھنے دو۔

منتری۔ مہاراج یہ آپ کیا کرنے لگے۔

راجہ۔ منتری، تم دُنیا کے لوگ اس میں دخل مت دو۔

چوبدار۔ مہاراج یہ کیا!

راجہ۔ چُپ رہو!

(راجہ تخت سے اُتر کر پھانسی کا پھندا گلے میں ڈال لیتا ہے)

آوازیں۔ مہاراج! مہاراج!! مہاراج!!!

(ایک ہی جھٹکے میں راجہ کا دم نکل جاتا ہے)

پانچواں منظر

(نگری کے ایک طرف)

چیلا۔ بس گروجی، آپ کی کرپا سے سارا پاپ کٹ گیا۔

گرو۔ اچھا اب ہم چلتے ہیں۔

چیلا۔ اچھا گروجی! (گُروجی غائب ہو جاتے ہیں) گئے۔ اررررر یہ بھی بوجھ ہلکا ہؤا۔ ذرا دھوتی میں سے حلوا تو کھول لوں، کہیں ٹھنڈا نہ ہو گیا ہو۔ نہیں نہیں گرم ہے، آہا مزا آ گیا۔

(ایک بڑ کے درخت کی چھاؤں میں بیٹھتا ہے اور گانے لگ جاتا ہے)

جھوٹا سب سنسار
پیارے
رین بسیرا یہ دُنیا ہے دم بھر میں دم پار
کھانا ہے تو کچھ کھا پی لے باقی دن دو چار
پیارے
جھوٹا سب سنسار

(پردہ گرتا ہے)

رحمٰن مُذنب

جھوٹ

موت کے بعد آئیگی
اور بھی اِک زندگی
جاودانی زندگی!
غیر فانی زندگی!
اِک بہارِ بے خزاں
اِک نشاطِ بے کراں
لذّتیں، کیفیتیں!
راحتیں ہی راحتیں!
کتنا دلکش ہے یہ جھوٹ!

سعید احمد اعجاز

انقلاب

تو مائلِ جفا نہیں، کیا انقلاب ہے
میں قائلِ وفا نہیں، کیا انقلاب ہے

میں التفات خواہ نہیں کتنا ظلم ہے
تُو صبر آزما نہیں، کیا انقلاب ہے

تسلیم کر رہا ہوں کہ ننگِ وفا ہُوں میں
تُو میرا ہمنوا نہیں، کیا انقلاب ہے

ہوں دست کش میں تیری محبت سے بے دریغ
اور تجھ کو کچھ گلا نہیں، کیا انقلاب ہے

میں ہوں مُصر کہ ظلم کی تجدید چاہیے
تجھ کو مگر روا نہیں، کیا انقلاب ہے

تُو کر رہا ہے میری محبت کا احترام
اور مجھکو اعتنا نہیں، کیا انقلاب ہے

وہ بدگمانیاں، وہ تغافل، وہ بے رُخی
وہ شیوۂ جفا نہیں، کیا انقلاب ہے

اب کیوں نہیں تسلسلِ وعدہ کا اہتمام
کیوں شوقِ التوا نہیں کیا انقلاب ہے

غم اتنا بڑھ گیا ہے کہ مِٹتا نہیں عدم
اب مَے بھی غم رُبا نہیں، کیا انقلاب ہے

عدم

فلسفہ اور اُس کے نقّاد

سماج کی ترقی کا راز یہ ہے کہ بعض افراد انسانی اوسط سے ہمیشہ مختلف و ممتاز ہوتے ہیں۔ اب ان کا یہ اختلاف یا امتیاز چونکہ بیشتر نہایت جاذبِ توجہ یا مفید ہوتا ہے اس لئے ان کے قبائل انہیں اپنا قائد بنا لیتے ہیں اور وہ یوں نئے نئے نصب العین قائم کرنے لگتے اور محسُود یا محبوبِ خلائق بن جاتے ہیں۔

ایسے ہی لوگوں میں ان محدود افراد کا بھی شمار ہے جو نظریوں کے غیر معمولی دلدادہ ہوتے ہیں اور جن سے کوئی انسانی نسل خالی نہیں ہوتی۔ یہ لوگ ایسے معاملات میں حیران اور پریشان ہوتے ہیں جن میں دوسروں کو کوئی حیرانی اور پریشانی محسوس نہیں ہوتی، ان کا تخیل توجیہات ایجاد کرتا، اور انہیں باہم ملاتا رہتا ہے۔ وہ اپنے زمانہ کے جُملہ علوم پر کافی عبور رکھتے ہیں، آیندہ کی باتیں بتلاتے ہیں، تنبیہیں کرتے ہیں اور عقلاء کہلاتے ہیں، انہی کی کارگزاری کا نتیجہ فلسفہ ہے جو اشتقاق اور مادہ کے لحاظ سے "دانائی کی محبت" کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ ان سے وہ اشخاص بھی دلی رغبت اور عقیدت رکھتے ہیں جو نہ انکی باتوں کو سمجھتے ہیں اور نہ ان کے حقائق پر یقین لاتے ہیں۔

اس طرح فلسفہ ایک نسلی ورثہ اور علوم کا ایک نہایت زبردست مجموعہ ہے۔ ایسی صُورت میں اس سے کیمیا اور فلکیات جیسی مخصوص حکمتوں کو جُدا کر دینا کوئی معنی نہیں رکھتا مگر عام طور پر چونکہ مخصوص حکمتوں کو فلسفہ سے علیحدہ کر دیا گیا ہے اس لئے میں یہاں یہی بتلاؤں گا کہ ایسا کیوں کیا گیا۔ مخصوص حکمتوں کو فلسفہ سے نکال دینے کے بعد باقی جو چیز بچ رہتی ہے اس کو فلسفہ نے ہی شخص تعبیر کرسکتا ہے جسکی اغراض نہایت وسیع ہوں۔

مخصوص حکمتوں کو جب فلسفہ سے خارج کر دیا گیا تو اس کی وسعت میں خاصہ فرق پیدا ہو گیا۔ اب وہ عبارت ہو کر رہ گیا صرف کُلی تصورات سے۔ کائنات کی ابتدا کیسے ہوئی؛ اس کا منتہا کیا ہے؛ انسانی علم کی شرطیں کیا ہیں؛ عمل کے عام سے عام قواعد کونسے ہیں؛ دیوتاؤں، انسانوں، حیوانوں اور پتھروں میں کون عناصر مشترک ہیں؛ اور توجیہ کے وہ اصول کونسے ہیں جو جملہ چیزوں کی تہ میں مستور ہیں؛ یہ وہ مسائل ہیں جو عام طور پر اعلے درجہ کے فلسفیانہ مسائل خیال کئے جاتے ہیں۔ اور فلسفی وہ ہے جو ان کے متعلق بہت کچھ کہتا اور کہہ سکتا ہے۔ متداول درسی کتابوں میں فلسفہ کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ "اشیاء کا اشیاء کی انتہائی علتوں کے ذریعے ایک ممکن الحصول علم ہے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فلسفہ کا مقصد کائنات کی توجیہ ہے، اس کی جزئیات کا بیان نہیں۔ ایسی صُورت میں کسی خیال کے فلسفیانہ ہونے کے لئے تین باتیں ضروری ہیں:-

(۱) ایک یہ کہ وہ بہت زیادہ وسیع ہو۔

(۲) دوسری یہ کہ وہ اور خیالات سے زیادہ ربط رکھے۔ اور

(۳) تیسری یہ کہ اپنی صفائی میں وہ ایسے اصول پیش کر سکے جو قریبی یا وسطانی نہیں بلکہ انتہائی اور ہمہ گیر ہوں۔

اس اعتبار سے دُنیا کا ہر ایک ہمہ رس نظریہ فلسفہ ہے خواہ وہ مبہم ہی کیوں نہ ہو۔ یوں فلسفہ تصورِ کائنات ہے یعنی زندگی کی ایک عقلی حیثیت۔ پروفیسر ڈیوے کہتا ہے کہ فلسفہ سے عقل اور ارادہ کی مجموعی تربیت کا اظہار نہیں ہوتا کیونکہ اس تربیت کے حدود بہ خوبی متعین ہو سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف وہ ان دونوں کے ایک خاص انداز، ایک خاص مقصد اور ایک خاص مزاج کی چغلی کھاتا ہے۔ پروفیسر موصوف نے اپنے اس قول میں جملہ حقیقی فلسفوں کی ترکیب کو جس بلیغ پیرایہ میں بیان کیا ہے وہ اظہر کالشمس ہے[1]۔

کوئی تعلیم اُس وقت تک اعلیٰ کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس میں دو امُور کا خاص اہتمام نہ ہو۔ ایک تو انسانی فکر کے جملہ مختلف مگر اہم شئوں کے پورے علم کا اور دوسرے ان شئوں کی موافق دلیلوں کے کامل وقوف کا۔ تعلیم یوں تو خشک ادعائی طریقوں پر بھی ہو سکتی ہے اور فلسفیانہ طریقہ پر بھی۔ لیکن ان میں جو فرق ہے وہ کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جس شخص نے کسی فنی مدرسہ میں تعلیم پائی ہو وہ اس میں شک نہیں کہ بعض امُور کو مشینی انداز میں انجام دینے کی بہترین صلاحیت اپنے میں رکھ سکتا ہے۔ لیکن وہ ذہنی مجد و شرف جو صرف اعلیٰ تربیت و تہذیب ہی کا لازمہ ہے کبھی اس میں پایا نہ جائے گا سو وہ نرا بدصورت رہے گا شائستہ کبھی نہیں ہوگا۔ پھر عقلی اعتبار سے بھی اپنے مخصوص موضوع کی لکیر کا فقیر ہوگا۔ معانی سے سروکار نہ رکھے گا، الفاظ پر جان چھڑکے گا۔ جو کچھ ایک مرتبہ دیکھ لیا اس سے اختلاف کے امکان کا قائل نہ ہوگا، تخیّل سے معذور، اخلاقی ماحول سے عاری، اور ذہنی تدبر سے عاجز اور قاصر رہے گا۔

فلاطون اور ارسطو کے قول کے بموجب فلسفہ چونکہ حیرت سے شروع ہوتا ہے اس لئے وہ ہر چیز کو اس کی حقیقت سے مختلف خیال کر سکتا ہے، وہ مانوس کو نامانوس اور نامانوس کو مانوس سمجھ سکتا ہے، وہ بہت سی باتیں اختیار کر سکتا اور پھر انہیں تج سکتا ہے۔ اس کے سر میں ایک ایسا سودا سمایا ہوا ہے جو اسے کبھی نچلا نہیں بیٹھنے دیتا۔ بلکہ ہر موضوع پر چھا جانے کے لئے یکساں اُکساتا رہتا ہے، وہ ہمیں اپنی پیدائشی ادّعائی نیند سے جگاتا اور ہمارے پختہ تعصبات کو پاش پاش کر دیتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے وہ انسانی ترقی کی اُن چار مختلف قسموں کے باہمی تصادم کا نتیجہ ہے جنہیں ہم سائنس، شاعری، مذہب اور منطق کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں۔ اس نے سخت کوشش اور محنت طلب استدلال کے ذریعہ ایسے نتائج کی بے حد چھان بین کی ہے جو جذباتی لحاظ سے قابلِ قدر اور سُود مند ہوں۔ انہی تمام باتوں کے پیشِ نظر اس سے کچھ نہ کچھ مَس رکھنا اور اس کے اثر و نفوذ کو سمجھنا ادب اور حکمیات دونوں کے متعلّمین کے لئے کافی مفید ہے، اپنی شاعری کے ذریعہ وہ ادبی ذوق رکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے لیکن اس کی منطق انہیں پختہ کار بناتی اور ان کی نزاکت اور سادگی دُور کر دیتی ہے۔ اپنی منطق کے ذریعہ وہ ماہرانِ حکمیات کی توجّہ کو جذب کرتا ہے لیکن اپنے دوسرے پہلوؤں سے

[1] فلسفہ اور نفسیات کی لغت مرتبہ بالڈون میں فلسفہ کا مقالہ ملاحظہ فرمائیے۔ مصنف

ان میں ملائمت پیدا کرتا اور انہیں اصطلاحات کی خشکی اور گرانباری سے بچالیتا ہے۔ لہٰذا ادب اور سائنس دونوں کے طلبہ کو چاہئے کہ وہ فلسفہ سے ایک زندہ جوش، ایک نئی قوت، اور ایک خوش نما پس منظر حاصل کریں۔ رچرڈ اسٹون نے ایک دفعہ ایک گڈریے سے پوچھا تھا "اماں تجھ میں کچھ فلسفہ بھی ہے ؟" اور یہ سوال ایسا ہے جو ہم میں سے ہر ایک کو دوسرے سے ہمیشہ پوچھتے رہنا چاہئے جس انسان میں کچھ فلسفہ نہیں وہ سخت منحوس اور بڑا بے فیض شخص ہے۔

باوجود ان تمام فائدوں کے جن کو میں نے سطور بالا میں گنایا ہے فلسفہ کے باقاعدہ دشمن بھی بہت سے ہیں۔ لیکن ان کی تعداد کسی زمانہ میں اتنی زیادہ نہ تھی جتنی کہ آج کل ہے۔ اس کی کچھ ذمہ داری تو سائنس کی معین فتوحات اور فلسفیانہ نتائج کی صریح غیر محدودیت پر عاید ہوتی ہے اور بقیہ انسان کے ذہن کی اس پیدائشی ناہمواری پر جو مصطلحات اور تجریدیات کا مضحکہ اُڑانے میں ایک شیطانی لطف محسوس کرتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فلسفہ بہت سوں کے نزدیک صرف مدرسیت کی اصطلاحی بدلی اور جدلیات کے مترادف ہے۔ اشیا کی ماہیت اور علتوں کے متعلق فلسفی کے خیالات چونکہ ہمیشہ مبہم اور غیر یقینی ہوا کرتے ہیں اس لئے اُسے ایک ایسے اندھے آدمی سے تشبیہ دی گئی ہے جو ایک تاریک کمرہ میں اس سیاہ بلی کی تلاش کر رہا ہے جو وہاں موجود نہیں اور اس کے پیشہ کی نسبت کہا گیا ہے کہ وہ مسلسل بھٹکنے اور کسی نتیجہ پر نہ پہنچنے کا فن ہے۔

اس قسم کی دشمنی صرف ایک حد تک درست ہو سکتی ہے چنانچہ میں ذیل میں ان چند اعتراضوں کے جواب دینے کی کوشش کروں گا جو فی زمانا رائج اور عام ہیں۔ ان کو میں سلسلہ سے یکے بعد دیگرے پیش اور رد کروں گا کیونکہ ان کے رفع کرنے میں بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہماری رسائی اپنے موضوع کے قلب کی گہرائیوں تک بآسانی ہو سکتی ہے۔

پہلا اعتراض :-

حکمتیں مستقل اور مسلسل ترقی کرتی ہیں اور ان کے استعمال سے بے نظیر فایدے حاصل ہوتے ہیں لیکن فلسفہ نہ تو کوئی ترقی کرتا ہے اور نہ اس کے استعمال سے عملی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

اس کا جواب :-

یہ اعتراض ناانصافی پر مبنی ہے کیونکہ مخصوص حکمتیں فلسفہ ہی کے درخت کی مختلف شاخیں ہیں۔ جب سوالوں کے جواب صحت کے ساتھ یعنی بالکل نپے تُلے انداز میں ادا ہونے لگے تو ان جوابوں کو حکمی کہا گیا اس طرح جس کو ہمارے زمانہ میں لوگ فلسفہ کہتے ہیں وہ ان سوالوں کا تلچھٹ اور مجموعہ ہے جو ابھی قطعی جواب کے شرمندہ نہیں ہوئے۔ نفسیات اور حیاتیات کی حکمتوں نے ابھی ابھی مادرِ فلسفہ کی آغوش سے علیحدگی اختیار کی ہے اور اپنے استقلال کا جشن منایا ہے۔ ایک جامع اور مانع فلسفہ میں ہمیشہ مخصوص حکمتوں کی تفصیلی جزئیات بہ تمام و کمال موجود نہیں ہو سکتیں کیونکہ وہ ان پر اپنا اتنا وقت صرف نہیں کر سکتا جتنا کہ کوئی مخصوص حکمت کر سکتی ہے۔

اس جگہ اگر ہم فلسفہ کے ارتقاء پر ایک سرسری نظر ڈال لیں تو فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ ہر خطۂ زمین کے ابتدائی فلاسفہ جامع العلوم عقلاء تھے وہ عام طور پر "محبانِ دانش" کہلاتے تھے۔ ان میں سے بعض پر مذہبی یا اخلاقی رنگ بے حد غالب تھا اور بعض اس سے بالکل کورے تھے۔ وہ نہایت عدل پرور تھے۔ ان میں تجسس اور کھوج کا مادہ حاضر عملی ضروریات کی حد سے بہت بڑھا ہوا تھا۔ ان کے سامنے مخصوص مسائل نہ تھے بلکہ وہ خود مسائل پیدا اور پیش کر رہے تھے، اس قسم کی بزرگ، محترم اور دانشمند ہستیاں یوں تو چین، ایران، مصر اور ہندوستان میں بکثرت ہو گزری ہیں لیکن جن عقلاء نے مغربی قوت فکر کو حال حال تک، اپنا بندۂ بے دام بنا رکھا وہ سب یونان کی پاک اور مردم خیز سرزمین کے سپوت تھے، ابتدائی یونانی فلسفہ کی عمر تقریباً ڈھائی ہزار سال ہے یعنی یہ دُور ۶۰۰ ق۔م سے ۳۵۰ ق۔م تک قائم رہا طالیس، ہرقلیطوس، فیثاغورث، برمانیدس، انیکساغورث، انباذقلس اور دیمقراطیس اسی عہد کی پیداوار ہیں۔ یہ سب کے سب ریاضیات، الہیات، سیاسیات، فلکیات، اور طبیعیات کے ماہر تھے گویا ان کے زمانہ کا پورا علم ان کا خانہ زاد غلام تھا۔ فلاطون اور ارسطو نے انہی کی روایات کو زندہ اور برقرار رکھا۔ اور قرونِ وسطیٰ کے فلسفیوں نے تو ان روایات کے انطباق اور اطلاق کے دائرہ کی توسیع کے سوا اور کچھ کام ہی نہیں کیا۔ اگر ہم اکویناس کی "الہیاتِ عامہ" کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اس میں ہر چیز کے متعلق سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ خدا سے لے کر مادہ تک کوئی چیز ایسی چھوٹنے نہیں پائی جس پر اظہارِ خیال نہ کیا گیا ہو۔ فرشتے، انسان اور شیطان سبھی کچھ اس لپیٹ میں آگئے علاوہ اس کے ہر چیز کے ساتھ دوسری چیز کے تعلقات پر، معلوم کے ساتھ عالم کے تعلقات پر، مخلوقات کے ساتھ خالق کے تعلقات پر، صور کے ساتھ جواہر کے تعلقات پر، جسم کے ساتھ ذہن کے تعلقات پر اور نجات کے ساتھ گناہ کے تعلقات پر بھی کافی سرمغزنی کی گئی ہے، غرضکہ اس کتاب میں فرائض اور اخلاق کے نظام کی الہیات کی اور نفسیات کی جملہ جزئیات بہ تمام وکمال بیان کر دی گئی ہیں طبیعیات اور منطق سے البتہ زیادہ اعتنا نہیں کیا گیا۔ بلکہ صرف ان کے کُلّی اصُول قائم کر دیئے گئے ہیں، اس کتاب کے مطالعہ کا قاری پر یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ اس کے مصنف کو مافوق الانسانی عقل کا مالک سمجھنے لگتا ہے لیکن اکویناس نے واقعات یا مفروضہ واقعات سے بحث کرنے کا جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ آج کل کے رائج اسلوب سے بے حد مختلف ہے۔ اس نے ہر چیز کو یا تو مقررہ عقلی اصُولوں سے ثابت اور مستنبط کیا ہے یا پھر کتب مقدس سے مثال کے طور پر اجسام کے خواص اور تغیرات کو لیجیے جن کی توجیہ اس نے ارسطو کی تقلید میں مادہ اور صُورت کے ذریعہ کی ہے۔ مادہ ذی کمیت، تعین پذیر اور انفعالی عنصر تھا اور صُورت ذی کیفیت، تعین بخش اور فعلی۔ ہر فعلیت کی ایک غایت تھی اور اشیاء ایک دوسرے پر اسی وقت عمل کر سکتی تھیں جب کہ وہ ایک دوسرے سے متصل ہوتی تھیں۔ اشیاء کی انواع کی تعداد معین تھی اور ان کے اختلافات مستقل تھے وغیرہ وغیرہ۔[1]

---

[1] جے۔ ریکابی کی تصنیف "مابعد الطبیعیات عامہ" (مطبوعہ لانگ مینز گرین اینڈ کو) میں قدیس ٹامس اکویناس کے فلسفۂ فطرت کی عام پسند تلخیص پیش کی گئی ہے ٹامس جے ہارپر کی کتاب "مدرسیت کی مابعد الطبیعیات" (مطبوعہ میکملن) میں بہت زیادہ تفصیلات مذکور ہیں۔ (مصنف)

سترھویں صدی کی ابتدا کے ساتھ ہی لوگوں میں مدرسیت کی مخالفت کا رجحان عام ہوگیا۔ وہ اس کے دقیق حضوری اسالیب سے اکتا گئے۔ سُولویز کے رسالے بھی مخالفت کی اس آگ کو بجھا نہیں سکے۔ ڈی کارٹ کے نئے فلسفہ نے اگرچہ مدرسی تعلیمات کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکا اور یورپ کے علمی مطلع پر حیرت انگیز سرعت رفتار کے ساتھ چھا گیا۔ لیکن اس میں پھر بھی ہمہ گیری کی وہی پچھلی روح کام کر رہی ہے، ڈی کارٹ کو ہم اس زمانہ میں ایک ایسا ماہر مابعد الطبیعیات جانتے ہیں جس نے من اندلشیم پس من ہستم کہہ کر ذہن اور مادہ کے متضاد جواہر میں فرق کیا اور خدا کی ہستی کا ایک نیا ثبوت بہم پہنچایا لیکن اس کے ہم عصر اس کی نسبت وہی رائے رکھتے تھے جو آج کل ہم ہربرٹ اسپنسر کی نسبت رکھتے ہیں یعنی وہ ایک ایسا شخص سمجھا جاتا تھا جو کائناتی ارتقار کا قائل تھا اور جس نے مادہ کو پھر سے مادہ و حرکت میں تقسیم کر کے اور تصادم کے قوانین سے کام لے کر افلاک کی گردش کی، خون کے دوران کی، جسم اور ذہن کے ارتباط کی، روح کے نفوذ کی، اور نور کے انحراف کی توجیہہ باحسن الوجوہ کر دی۔

ڈی کارٹ نے ۱۶۵۰ء میں وفات پائی اور لاک کی کتاب فہم انسانی ۱۶۹۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کی اشاعت سے فلسفہ کی تاریخ کا ایک بالکل نیا باب کھلا، یہ باب علمیات کا تھا جس پر غور کرنے سے فلسفہ تنقیدی بنتا گیا۔ ہر چند کہ لائب نز جیسے آفاقی عاقل کا دبستاں ہمہ گیری کی روایت کا پورا پورا حامل تھا اور وُولف نے طبیعی اور اخلاقی مباحث پر متعدد رسالے تصنیف اور شائع کئے تھے لیکن یہ موضوعی رُجحان پھر بھی ترقی پاتا رہا۔ لاک نے اپنا سجادہ ہیوم کے حوالہ کیا جس نے اپنی تشکیک سے کانٹ کو اذعانی نیند سے جگایا۔ کانٹ کے زمانہ سے فلسفہ کا لفظ طبیعی نظریوں سے زیادہ عقلی اور اخلاقی قیاس آرائیوں پر دلالت کرنے لگا چنانچہ حال حال تک فلسفہ کو "ذہنی یا اخلاقی فلسفہ" یا صرف "انسانی ذہن کا فلسفہ" کہا جاتا تھا تاکہ اس میں اور فلسفۂ فطرت یا طبیعیات میں امتیاز قائم رہے۔

لیکن قدیم روایت بہتر بھی ہے اور مکمل بھی۔ جس دُنیا میں ہم رہتے سہتے ہیں اس کی خصوصیات کا جاننا اتنا ہی اہم ہے جتنا یہ جاننا اہم ہے کہ وہ ممکن کیسے ہے؟ اس کے باوجود کانٹ کے بیشتر متاخرین کا خیال تھا کہ مؤخر الذکر علم ہی صحیح معنوں میں فلسفیانہ علم ہے۔ عام انسان اس سوال کو کہ "فطرت کیسی ہے؟" اتنا ہی دلچسپ سمجھتے ہیں جتنا کانٹ کے اس سوال کو کہ "فطرت ممکن کیسے ہے؟" لہٰذا فلسفہ اگر انسانی التفات سے محروم نہیں ہونا چاہتا تو یہ ضروری ہے کہ وہ موضوعیت کی بیڑیوں کو اُتار پھینکے اور خارجی دُنیا کی طرف متوجہ ہو۔ کیونکہ معروضیت کی طرف لوگوں کا میلان بڑھ رہا ہے[1]۔

فلسفہ کے حقیقی معنی انسانی سوچ کے ہیں، یہ سوچ عموماً کلیات سے تعلق رکھتا ہے جزئیات سے نہیں۔ لیکن اس کا تعلق خواہ کلیات سے ہو یا جزئیات سے انسان کے سوچنے کے اسالیب ہمیشہ یکساں رہے ہیں، وہ ہمیشہ مشاہدہ کرتا ہے، امتیاز کو بروئے کار لاتا ہے، تعمیم سے کام لیتا ہے، تبویب کا عمل انجام دیتا ہے، علل کا متلاشی رہتا ہے، مماثلتوں کا پتہ لگاتا ہے اور انتزاعات ترتیب

---

[1] پاسن نے "مقدمۂ فلسفہ" میں اس زاویۂ نظر کی بہترین ترجمانی کی ہے ملاحظہ ہوں صفحہ ۱۹ تا ۴۴۔ مصنف

دیتا ہے لیکن فلسفہ کو اگر سائنس سے مختلف خیال کیا جائے تو پھر اس کا کوئی خاص اسلوب نہیں رہتا۔ ہمارا فکر ابتدا سے موجودہ صورت میں نہیں ہے اس نے تا ایں دم کئی پلٹے کھائے ہیں جن میں سے دو نہایت اہم ہیں۔ ایک یہ کہ اپنے یقینیات کے اظہار میں وہ پس وپیش کرنے لگا اور دوسرا یہ کہ ان کی تصدیق اور توثیق کے کھوج کا عادی ہو گیا۔[1]

اس جگہ اگر ایک سرسری نظر فکر کے ارتقاء پر ڈال لی جائے تو مناسب ہوگا کیونکہ اس سے ہمیں یہ پتہ بہ آسانی چل جائے گا کہ ہمارا فکر کن خطوں سے ہوتا ہوا موجودہ حالت کو پہنچا ہے۔

آگست کومت ایک فرانسیسی فلسفی ہے، اس نے ایک فلسفہ ایجابی فلسفہ[2] کے نام سے مرتب اور پیش کیا ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ انسانی فکر یکے بعد دیگرے تین مرحلوں سے گزرا ہے گزرتا ہے۔ پہلا مرحلہ الہیات کا ہے دُوسرا مابعد الطبیعیات کا اور تیسرا حکمیات کا۔ الہیاتی مرحلہ میں وہ مظاہر کی توجیہ بھوت پریت کے ذریعہ کرتا ہے کیونکہ وہی اس کے نزدیک ان مظاہر کے مسبّب ہیں۔ مابعد الطبیعیاتی مرحلہ میں وہ مظاہر کے ذاتی خواص کو مجرد تصوّرات کی صُورت میں تبدیل کرتا اور یہ مانتا ہے کہ وہ مظاہر کی توجیہ کئے دیتے ہیں اور حکمیاتی یا ایجابی مرحلہ میں وہ مظاہر کو سائنٹیفک طور پر یعنی سیدھے سادے انداز میں بیان کرتا ہے، یوں گردش سیارگاں کا الہیاتی نظریہ یہ ہوگا کہ سیارے ارواح عاملہ ہیں اور انسانی قسمت کا دروبست ان کے اختیار میں ہے مابعد الطبیعیاتی نظریہ یہ ہوگا کہ ان میں کشش ہے اور ایجابی نظریہ یہ کہ وہ کُلیۃً مرتعشات کے تابع ہیں۔

کومت کا بیان نہایت نپا تلا ہے۔ چنانچہ انسانیات کا مطالعہ شہادت دیتا ہے کہ انسان نے ابتدا میں الہیات اور مابعد الطبیعیات کو بے طرح گڈمڈ کر دیا ہے۔ معمولی چیزوں کے لئے اس کے نزدیک کسی توجیہ کی ضرورت نہ تھی انوکھی چیزیں مثلاً موت، مرض اور مصیبت البتہ ایسی تھیں جنہیں توجیہ طلب سمجھا جاتا تھا۔ اشیاء کی پُراسرار قوت ان کے اثر کی ذمّہ دار تھی جو چیز جتنی زیادہ خوفناک ہوتی تھی، اتنی ہی یہ پراسرار قوت اس میں زیادہ پائی جاتی تھی۔ ہر بڑی چیز میں یہ "منا"[3] موجود ہوتا تھا۔ لہٰذا انتہائی قدیم زمانہ میں جو چیز فلسفہ تھی وہ اب "ہم احساسی سحر" کہلاتی ہے۔ یعنی اگر آپ کسی چیز پر اثر ڈالنا چاہتے تو یہ لازمی تھا کہ آپ کوئی ایسی چیز حاصل کرتے جو اس کے ساتھ رہ چکی ہے یا پھر اس کے مشابہ ہے۔ اس طرح اگر آپ اپنے دشمن کا پُتلا بناتے یا اس کے کچھ بال یا ناخن یا ایسی چیزیں حاصل کر سکتے یا اس کا نام ہی کسی پرچہ کاغذ پر لکھتے اور اس کو جلاتے یا اور طرح کی تکلیف دیتے تو آپ اپنے دشمن کو نقصان پہنچا سکتے تھے گویا

---

[1] جی۔ ایچ۔ لیوس کی کتاب "ارسطو" کا باب چہارم دیکھئے۔ مصنف

[2] فلسفۂ ایجابی۔ چھ جلدوں میں۔ مطبوعہ پیرس۔ ۱۸۳۰ - ۱۸۴۲۔ مصنف

[3] آسٹریشیائی زبانوں کے گھرانے میں ایک زبان پولی نیشیائی ہے، منا اسی پولی نیشیائی زبان کا ایک لفظ ہے۔ جزائر پولی نیشیا کے قدیم باشندوں کا عام اعتقاد یہ تھا کہ سرداران قبیلوں اور شاہیر وقت میں ایک پُراسرار قوت پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں یہ قوت بے جان چیزوں اور جانداروں سے بھی منسوب کی جاتی تھی۔ مترجم

قائم مقام کو نقصان پہنچانا اصل کو نقصان پہنچانا تھا۔ اسی طرح اگر آپ بارش چاہتے تو زمین پر چھڑکاؤ کرتے اگر ہوا چاہتے تو سیٹی بجاتے وغیر ذالک اگر آپ کی یہ خواہش ہوتی کہ آپ کے باغ میں اردیاں خاطر خواہ پیدا ہوں تو یہ ضروری تھا کہ آپ ایک ایسا پتھر باغ میں نصب کرتے جو اروی کے مماثل ہوتا۔ اگر آپ یرقان کا علاج کرنا چاہتے تو مریض کو ہلدی استعمال کرانی پڑتی جو اشیاء کو پیلے رنگ میں رنگ دیتی ہے یا اگر درد سر کا علاج مقصود ہوتا تو آپ کو خشخاش کا نسخہ تجویز کرنا پڑتا کیونکہ اس کے ڈوڈے سر کے مشابہ ہوتے ہیں غرضکہ علامتیت کا یہ نظریہ طب کی شروعات میں بے حد رائج تھا اور اسی پر وہ جملہ علوم و فنون متفرع ہیں جن میں سائنس اور سحر بے طرح گھلے ملے ہوئے ہیں۔ ہم احساسی کے نظریہ کا وجود ہمارے زمانہ میں بھی ہے۔ علمی فلسفہ کے ایک موجودہ مذہب کو یہ دعویٰ ہے کہ افکار اشیاء ہیں یعنی یہ کہ جو چیز آپ چاہتے ہیں اس کے خیال کو اگر آپ تقویت دیں اور ہر موقع و محل پر اس خیال کا اظہار کرتے رہیں تو اس سے ہوگا یہ کہ اس کے مماثل خیالات کہیں اور سے اس کی مدد کو آئیں گے اور آپ کی خواہش پوری ہو جائے گی، واضح رہے کہ یہ مذہب مجموعی حیثیت سے ایک نفیس مذہب ہے[1]۔

اس کے بعد غور و فکر کے نسبتہً ایجابی طریقے رواج پاتے گئے مظاہر کے مشترک عناصر کی چنائی اور چھانٹ شروع ہوئی اور ان سے تعمیمات مرتب کی گئیں لیکن پہلے پہل ان عناصر کو زیادہ ڈرامائی بننا پڑا۔ اشیاء یا تو گرم ہوتی تھیں یا سرد یا خشک یا تر حرکت دو طرح کی تھی طبعی اور غیر طبعی۔ افلاک دائروں میں گردش کرتے تھے کیونکہ دوری حرکت اکمل حرکت تھی۔ بیرم کی توجیہہ میں اس کے بڑے بازو کی حرکت کو بنائے استدلال بنایا گیا[2]۔ سورج سرما میں جنوب کی طرف اس لئے سرک جاتا تھا کہ سردی سے محفوظ رہے۔ قیمتی اور خوبصورت چیزوں میں خاص خواص ودیعت تھے۔ مور کا گوشت سڑاند قبول نہ کرتا تھا اگر مقناطیس کے قریب اعلے درجہ کا الماس لایا جاتا تو وہ اپنے سینہ سے چمٹائے ہوئے لوہے کو فوراً دور کر دیتا تھا۔ وقس علی ہذا۔

یہ خیالات آج ہمیں بے سروپا معلوم ہوتے ہیں لیکن سوچئے کہ اگر ہمارے علم دوست اجداد ہماری رہنمائی کے لئے کوئی نشان کوئی نقش پا کوئی لکیر نہ چھوڑ جاتے تو ہمارا کیا حال ہوتا؟ سترھویں صدی کے آغاز تک انسان نے اپج کی نہ لی۔ پرانی لکیر ہی کو پیٹا کیا۔ ہم میں سے چند ہی کو یہ معلوم ہوگا کہ سائنس کتنی کم عمر ہے، آج سے تقریباً چار سو سال پہلے کوپرنیکس کا سیارہ وی نظریہ کسی کے شان

---

[1] اگر کوئی صاحب اس موضوع پر تفصیلی معلومات حاصل کرنا چاہیں تو انہیں چاہئے کہ پرینٹس ملفورڈ وغیرہ سے رجوع کریں۔

قدیم ہم احساسی سحر کے بارے میں ذیل کی کتابوں کا مطالعہ فائدہ بخش ثابت ہوگا:۔ (۱) نفسیات کے واقعی اور افسانوی اجزا۔ انہے جیسٹرو خصوصیت سے باب تمثیل کی سفارش کی جاتی ہے۔ (۲) تاریخ مذہب کا مقدمہ مصنفہ ایف۔ بی۔ جیونز خاص کر باب چہارم قابل مطالعہ ہے۔ (۳) شاخ زریں۔ مصنفہ جے۔ جی۔ فریزر۔ (۴) بابِ مذہب از آر۔ آر۔ میریٹ۔ اور (۵) اے۔ بی۔ لووجائے کا مضمون رسالہ The Monist میں جلد ۱۶ ص ۳۵۷۔

[2] استقرائی علوم کی تاریخ از وہیول ن۔ا۔ک۔ا۔ا۔

(مصنف)

گمان میں نہ تھا۔ خون کے دوران کا، ہوا کے وزن کا، حرارت کے ایصال کا اور حرکت کے قوانین کا کسی کو علم نہ تھا، معمولی پمپ توجیہ کی دسترس سے باہر تھا، گھڑیوں کا کوئی وجود نہ تھا، تپش پیما عنقا تھے، تجاذبِ عامہ سے کوئی واقف نہ تھا، دُنیا کی عمر پانچ ہزار سال تھی سیاروں پر ارواح کا تصرف تھا اور مہوسی، جادوگری اور نجوم ہر ایک کے معتقدات میں داخل تھے۔ جدید سائنس کی ابتداء ۔۔۔ اسکے بعد ہوئی ہے اور کپلر، گیلی لی او، ڈی کارٹ، ٹاریچیلی، پکل، ہاروے، نیوٹن، ہوئی گنس اور بوائل اس کے بانی مبانی ہیں۔

استخلاص کے یہ داعی حقیقی معنوں میں فلسفی تھے یعنی سنساری عقلا، چنانچہ گیلی لی او کہتا ہے کہ اس نے جتنے برس فلسفہ پر صرف کئے اتنے مہینے ریاضیات پر نہیں کئے، ڈی کارٹ تو مسلمہ سنساری فلسفی تھا۔ لیکن جدید خیالات نے حقیقت کے بعض خاص شعبوں کو اتنی ترقی دی کہ وہ تفصیلات سے بہت زیادہ گراں بار ہو گئے، اتنے زیادہ گراں بار ہو گئے کہ سنساری ذہن ان کا احاطہ نہ کر سکے۔ اس طرح میکانیات، فلکیات اور طبیعیات کی حکمتیں فلسفہ سے جُدا ہوئیں۔ ان ہمہ گیر فلسفیوں نے جن کے نام میں نے اُوپر گنائے ہیں فلسفہ کے ریاضیاتی پہلوؤں پر بہت زیادہ زور دیا ہے کیونکہ یہ پہلو سودمند بہت تھے چنانچہ انہی کی بدولت گیلی لی او، پکل، بوائل، نیوٹن، اور ڈی کارٹ نے وہ عظیم الشان انکشافات انجام دیئے جنہوں نے ان کا نام ہمیشہ کے لئے امر کر دیا، بار پیما کی بلندی کے ساتھ ارتفاع کی مناسبت (پکل) فاصلہ کے ساتھ اسراع کی مناسبت (نیوٹن) دباؤ کے ساتھ ہوا کی دبازت کی مناسبت (بوائل) اور منحرف شعاع کے جیب التمام کے ساتھ اس کے جیب کی مناسبت (ڈی کارٹ) یہ سب فلسفہ کے ریاضیاتی پہلو کی پیداوار ہیں۔ فطرت سے بحث کرنے کے اس نئے طریقہ میں عوامل یا ہم احساسی کے خیالات کو کوئی دخل نہ تھا۔ یہ طریقہ متلازم تغیرات کا طریقہ تھا اور اس کے استعمال سے علم کی قسمیں دو ہو گئیں (۱) سائنس (۲) عام فلسفہ۔ سائنس میں نپے تلے اور معین قوانین رواج پانے لگے اور فلسفہ نے انہیں قبول نہیں کیا۔ اس واقعہ نے وہ ذہنیت پیدا کی جو آج ایجابی کہلاتی ہے اور جس کا نعرہ ہے "فلسفہ مردہ باد!" اس ذہنیت کے لوگ کہتے ہیں کہ "ہمیں ضرورت صرف قابلِ پیمائش واقعات یعنی مظاہر کی ہے، ذہن کی تعبیرات اور توجیہات درکار نہیں" اور یہ اعتراض انہی کا ہے کہ "فلسفہ نے کوئی ترقی نہیں کی"۔

مگر جب فلسفہ کا ہر وہ سوال جس کا ایک جواب مُعیّن ہو جاتا ہے فلسفہ نہیں رہتا بلکہ سائنس یعنی کوئی ایک "یات" بن جاتا ہو تو ظاہر ہے کہ صرف وہی مسئلے فلسفہ کہلائیں گے جن کا ابھی کوئی قطعی جواب تجویز نہیں کیا گیا اور ہو ہی رہا ہے، اس طرح فلسفہ کا اطلاق اب ایسے سوالوں کے مجموعہ پر ہونے لگا ہے جن کے معین جوابات معرضِ وجود میں نہیں آئے۔ اب اگر ان سوالوں میں سے بعض کی عمر دو ہزار سال کی ہے اور وہ ابھی قطعی جوابوں کے منت کش نہیں ہوئے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ کبھی قطعی جوابوں کے منت کش ہونگے ہی نہیں۔ دو ہزار سال کا عرصہ ہماری فانی عمروں کے لحاظ سے معلوم بہت بڑا ہوتا ہے مگر ہے وہ اصل میں ایک لمحۂ مختصر کیونکہ انسان کی عقل آرائی کی عمر اس کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔ گذشتہ تین صدیوں کی غیر معمولی ترقی کا دار صرف ریاضیات کے استعمال میں

مضمر ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ فلسفہ بھی میکانی یا ریاضیاتی ہو جائے حقیقت مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے اور اسے مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتے رہنا چاہئے لیکن اگر ہم یہ چاہیں کہ ہر چیز کو ریاضیات کی عینک سے دیکھیں تو اس کا مطلب یا تو یہ ہوگا کہ ہم ریاضیاتی حکمتوں کے سوا کسی اور چیز کو دیکھنا ہی پسند نہیں کرتے یا پھر یہ کہ حقیقت کی جائز آزادی پر بے جا قیود عاید کر رہے ہیں ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی فعل منصفانہ نہیں ۔ روحانی سوالوں کو حل کرنے کے اچوک فلسفیانہ طریقے بھی رفتہ رفتہ دریافت ہو جائیں گے ہمیں مستقبل سے مایوس نہیں ہونا چاہئے ۔

بعض لحاظ سے سائنس نے فلسفہ کے مقابلہ میں بہت کم ترقی کی ہے، اگر ارسطو اور ڈی کارٹ کو پھر سے دنیا میں آنے کی اجازت کسی نہ کسی طرح مل جائے تو سائنس کے عام ترین تصورات ان کے لئے نئے اور حیرت انگیز نہیں ہونگے ۔ وہ عناصر سے اشیاء کی ترکیب کے خیال سے موجودات کے ارتقاء کے تصور سے بقائے توانائی کے اصل الاصول سے اور ہمہ گیر جبریت کے مسئلہ سے ناآشنا نہیں ہوں گے، البتہ خردبینیں، برقی روشنی، ٹیلیفون (دور گو)، ہوائی جہاز، لاسلکی، زہریلی گیس، آہنی قلعے، ریڈیو، ٹیلی وژن (دور نظری)، اور حکمتوں کی ذیلی جزئیات ان کے لئے ہیبت ناک چیزیں ہوں گی اس کے برعکس اگر وہ مابعد الطبیعیات کی جدید کتابوں کا یا ہمارے فلسفیانہ لکچر روم کا معاینہ کریں تو ہر چیز ان کے لئے عجیب عجیب ہوگی ۔ ہمارے زمانہ کا تصوری یا انتقادی انداز ان کے لئے بالکل انوکھا ہوگا۔ اور اس کا احاطہ کرنے کے لئے انہیں ایک زمانہ درکار ہوگا[1] ۔

دوسرا اعتراض :-

فلسفہ حکیمی ہے ۔ وہ صرف عقل کے ذریعہ مہمات امور کا فیصلہ کرنا چاہتا ہے، حالانکہ حقایق کے حصول کا سب سے زیادہ مؤثر طریقہ یہ ہے کہ تجربہ کو "خضر راہ" بنایا جائے، سائنس نے اسی طرح ترقی کی ہے، وہ واقعات کو اکٹھا کرتی ہے ۔ انہیں ابواب میں تقسیم کرتی ہے اور ان کی تعلیل انجام دیتی ہے ۔ فلسفہ اس طرح عمل نہیں کرتا اور گردِ کارواں کی طرح سدا منزل مقصود سے دُور رہتا ہے ۔

اس کا جواب :-

یہ اعتراض تاریخی حیثیت سے وزنی ہے کیونکہ بیشتر فلاسفہ نے فلسفہ کے ایسے نظامات مرتب کئے ہیں، جو کامل اور حضوری ہیں جنہیں بے خطا ہونے کا دعوےٰ ہے ۔ اور جن کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قبول یا رد بھی کئے جائیں پورے کے پورے کئے جائیں ۔ برعکس ان کے حکمتوں کا حال یہ ہے کہ وہ افتراضات استعمال کرتی ہیں ۔ مشاہدہ و اختبار کے ذریعہ ہمیشہ ان کی تصدیق اور توثیق چاہتی ہیں، اور غیر محدود طور پر ان کی صحت اور ترمیم کے لئے تیار رہتی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل کے زمانہ میں تحکیم پرستوں کی کوئی نہیں سُنتا ۔ ان کے لئے اپنے

---

[1] جیمز وارڈ نے رسالہ مائنڈ (ج ۵، شمارہ ۵۸) میں "ارتقائے فلسفہ" کے عنوان سے جو نفیس مضمون حوالۂ قلم کیا ہے وہ اس ضمن میں ہر آئینہ لایق لحاظ ہے کیوں کہ اس بارے میں اس نے مجھ سے بہت کچھ زیادہ کہا ہے اور حق یہ ہے کہ خوب کہا ہے۔ (مصنّف)

نظاموں کی قطعیت کا دعویٰ کرنا اور تعلیم یافتہ طبقہ میں قبولِ عام پانا سخت دشوار ہوگیا ہے افتراض اور تصدیق سائنس کی خاص چیزیں ہیں۔ اور ان چیزوں نے علمی طبقوں کی نگاہوں میں ایک خاص اعتبار پیدا کر لیا ہے۔

مگر فلسفہ اور سائنس کے بنیادی فرق کو نظر انداز کر دینا پھر بھی ایک بڑی جرأت ہوگی۔ کیونکہ فلسفی معاملاتِ دنیوی پر ایک وسیع انداز میں نظر کرتا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اسے ہر اسلوب کے استعمال کی آزادی حاصل ہو۔ فلسفہ کو حکمتوں کی حکمت اسی لئے کہا جاتا ہے۔ پھر بھی فلسفہ اگر تحکیمیت کو چھوڑ دینے پر بھی زندہ رہ سکتا ہے تو اسے لازم ہے کہ وہ افتراضی بننے کی کوشش کرے۔

تیسرا اعتراض :۔

فلسفہ کو زندگی سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ زندگی کی ضرورتوں سے نہیں بلکہ بار دتجریدات سے سروکار رکھتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دُنیا ہر دم بدلتے رہنے والی، تکلیف دہ، اور پیچیدہ ہے لیکن بلا استثناء ہر فلسفی یہی کہتا ہے کہ وہ عمدہ، بسیط، اور کامل ہے۔ سو والتیر اور شوپن ہاور نے فلاسفہ کا جو مذاق اُڑایا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ ایک لاعلاج رجائیت کے مریض ہیں، شوپن ہاور کی کامیابی اور ہر دلعزیزی کا راز صرف یہ ہے کہ اس نے اپنے نفس اور دوسروں کے نفوس کو دھوکا نہیں دیا۔ اور زندگی کی بپتاؤں اور برائیوں کو چھپایا نہیں۔

اس کا جواب :۔

یہ اعتراض بھی تاریخی حیثیت سے کافی وزنی ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا یہ کیوں فرض کر لیا گیا کہ فلسفہ آئندہ بھی حقیقت یا زندگی سے ایسی ہی چھوت برتے گا، وہ جیسے جیسے ترقی کرتا جائے گا ویسے ویسے اس کے طور طریق بدلتے جائیں گے۔ موجودہ مُردہ تجریدات کے بعد یقیناً زندہ تعبیرات کا دور آئے گا کیونکہ زمانہ بہترین معالج ہے۔ وہ ایسے اسباب اور اسالیب خود مہیا کر دے گا جن کی زندہ تعبیرات کی تعمیر میں ضرورت ہوگی لہٰذا فلسفیوں کو آخر میں زندگی کی تلخیوں سے ویسا ہی قرب حاصل ہو جائے گا جیسا قرب کہ واقعیت پسند ناول نگاروں کو حاصل ہے۔

خاتمہ :۔

ابتداء میں فلسفہ کا لفظ کائنات کے مکمل علم کا مفہوم ادا کرتا تھا اور وہ آج بھی اسپنسر کی زبان میں "وحدت یافتہ علم کا نظام" بن سکتا ہے۔ ضرورت صرف مختلف حکمتوں کے نتائج میں مطابقت پیدا کرنے کی ہے اور یہ کچھ مشکل نہیں۔ لیکن آج کل فلسفہ سے مابعد الطبیعیات یعنی علم اور وجود کی حکمت مراد لی جاتی ہے، جو حکمتوں سے بیّن تناقض رکھتی ہے لہٰذا پہلا مفہوم ہی کچھ زیادہ عمدہ اور دل لگتا ہے۔ کیونکہ وہ سائنس، مابعد الطبیعیات، اور مذہب تینوں کو ملا سکتا ہے اور ایک زیادہ شاندار تصویرِ دُنیا کی پیش کر سکتا ہے۔

لیکن اس مفہوم کی طرف رجوع کرنے کا فی الحال کوئی رُجحان یا امکان نہیں۔

(ترجمہ بہ تصرف) مرزا محبوب بیگ

غزل

پھر ذوقِ تماشا کو مرہونِ اثر فرما
فرصت ہو تو دل پر بھی پھر قصدِ نظر فرما

جب جان فدا کر لوں تو عشق کو رسوا کر
جب میری خبر آئے تو شرحِ خبر فرما

یہ تیری خموشی بھی گو عینِ تکلم ہے
مشتاقِ تکلّم سے کچھ پھر بھی مگر فرما

فرمانِ سحر تیرا ہر شام پہ جاری ہے
یا رب شبِ غم کو بھی تاکیدِ سحر فرما

فانؔی نے تجھے چاہا تو بندہ نوازی کر
فانؔی نے خطا کی ہے تو قطعِ نظر فرما

فانؔی بدایونی

مزدور خدا کے حضور میں

جب یہ بندہ اپنے رب کے پاس جا کر روئے گا
حاملانِ عرشِ اعظم کو رُلا کر روئے گا
جب یہ اہلِ خانہ کے فاقے جتا کر روئے گا
جب یہ اپنی داستانِ غم سُنا کر روئے گا
اپنا خالی پیٹ مولا کو دِکھا کر روئے گا
انتہائے درد و غم سے بلبلا کر روئے گا
نوعِ انسانی کی پامالی سُنا کر روئے گا
ابنِ آدم کی ستم رانی بتا کر روئے گا
اُن کی دولت کی فراوانی جتا کر روئے گا
اپنی محرومی کے افسانے سنا کر روئے گا
جب یہ اپنی نیم عُریانی دکھا کر روئے گا
جب اسے داور کلیجے سے لگا کر روئے گا

چیخ اُٹھے گا آسماں کا ذرّہ ذرّہ۔ انقلاب

انقلاب اے ساکنانِ بزمِ دُنیا انقلاب

زیب عثمانیہ لدھیانوی (گولڈ میڈلسٹ انجمن اردو پنجاب)

اقبال

ذیل کی نظم ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو "یوم اقبال" کی تقریب پر پڑھی گئی۔

ترے اعجاز سے اے واقفِ اسرار و رموز!
عقل کی بزم میں ہے عشق کی روشن قندیل

عشق افراد کو پیغامِ حیاتِ جاوید!
عشق سے وحدتِ اقوام و ملل کی تشکیل!

تری کشتی کو ہے وہ قلزمِ زخار پسند!
جس کی موجیں ہیں فرات و جمن و دجلہ و نیل!

نوعِ انساں ہے تری قوم، وطن تیرا جہاں!
کارواں دہر ہے، نغمے ترے آوازِ رحیل!

پاشکستہ کو تری صوتِ خودی بانگِ درا!
راہ گم کردہ کو مشعل ترے افکارِ جمیل!

دلِ پُرسوز ترا جنسِ محبت کا امیں!
چشمِ نمناک تری دولتِ عرفاں کی کفیل!

نگہِ پاک تری آئینۂ حسنِ یقیں!
حرفِ بیباک ترا ہمتِ عالی کی دلیل!

جس کی بُرش ہیں نہاں ہے اثرِ ضربِ کلیم!
ترے قبضے میں خودی کی ہے وہ شمشیرِ اصیل!

کر دیا فاش زمانے پہ وہ رازِ ہستی
جس سے ہوتی ہے عیاں فکرِ بشر کی تکمیل

"ترا اندازِ سخن شانۂ زلفِ الہام
تری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل!" (غالب)

حفیظ ہوشیارپوری

خیالاتِ پریشاں

حکمت یہ نہیں کہ ہم زندگی کو دیکھیں بلکہ یہ کہ ہم زندگی کو پرکھ لیں۔

اکثر لوگوں کی دوستی اتنی گہری نہیں ہوتی جتنی اُن کی نفرت سخت ہوتی ہے۔

آؤ آؤ ہم پیچھے رہ گئے۔ کیا تم گھنٹہ بجنے کی آواز نہیں سُنتے؛

وقت چھین لیتا ہے بہت سی ایسی چیزیں جو کبھی خوشیاں تھیں اور انہیں تبدیل کر دیتا ہے مصیبتوں میں۔

میں سمجھتا ہوں کہ صنعت کی لاکھوں ایکڑ کھیتی کو جوت کر پامال کر دیا جاتا ہے جب کہیں جا کر بہار کے نقش و نگار کی ابتدا ہوتی ہے۔

کسی بڑے کام کو سرانجام دینے کے لئے انسان کو نہایت محنتی ہونے کے ساتھ ہی کبھی کبھی بیکار بھی رہنا چاہیے۔

ازدواجی زندگی میں لَے کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی جتنی کہ ہم آہنگی کی۔

دانائی انسان کے پاس خود چلی آتی ہے خواہ وہ اس کی خواہش کرے یا نہ کرے۔

میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ خوف نے میری صحیح رہنمائی کی ہو میں نے سینکڑوں بار اس کی مطابعت کی مگر انجام کار تاسف ہی ہونا پڑا۔

ہم انہیں تو معاف کر سکتے ہیں جن سے ہم اُکتا گئے ہوں، مگر ہم اُنہیں ہرگز معاف نہیں کر سکتے جو ہم سے اُکتا گئے۔

(فرسٹ ایئر) غلام یٰسین (لائلپوریانہ)

جوگیا گیت

چنتا[1] من سے گئی، نیند نین سے سُدھ لو رے شیام منوہر پیارے

کوک کوئل کی بھالے مارے

گگن[2] بیچ جس کال[3] پکارے

آئے برہا کے بادر کارے

گیدھ گریں جس پنکھ پسارے

چنتا من سے گئی، نیند نین سے سُدھ لو رے شیام منوہر پیارے

برہ اگن کے بھاؤ ہیں نیارے

نین بہاوے جل کے دھارے

جیون جل ہلکورے مارے

اب تو کال ہی پار اُتارے

چنتا من سے گئی، نیند نین سے سُدھ لو رے شیام منوہر پیارے

رات کٹی گن گن کے تارے

سپنے میں دیکھا چندر سکارے[4]

بھگت[5] یہ نوکھی بات بچارے

اب جاگیں گے بھاگ تمہارے

چنتا من سے گئی نیند نین سے سُدھ لو رے شیام منوہر پیارے

سید مقبول حسین احمد پوری

[1] چنتا معنی سکون، چین۔

[2] گگن معنی آسمان

[3] کال معنی موت

[4] سکارے معنی صبح کے وقت

[5] بھگت معنی پرہیزگار

پیر گوگا[1]

ہندوستان میں عام لوگوں کی زبان پر جو پرانے قصے کہانیاں جاری ہیں اُن میں گوگا پیر کی داستان کو بڑی اہمیت حاصل ہے پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے حصوں کے خانہ بدوش قبیلوں کے لوگ گوگا کی کتھا جاننے والے شخص کو بہت قابلِ احترام سمجھتے ہیں خاکروبوں کو بالخصوص گوگا سے بہت وابستگی ہے اور ہندوستان بھر کے مہتر اسے اپنا سب سے بڑا پیر اور دیوتا مانتے ہیں۔ بھادوں کے دنوں میں جب گوگا کا عرس ہوتا ہے مہتر گروہ در گروہ ہو کر اس کی کتھا گاتے اور گوگا چوہان کے نام کے نعرے لگاتے پھرتے ہیں۔ چرکیں نے مہتروں کی اسی عقیدت کو مدِّ نظر رکھ کر کہا ہے ؎

چلیں گے دیکھنے جس وقت گوگا پیر کا میلا — بنے گا مہتروں کا لوٹ کر اتختِ رواں اپنا

لیکن گوگا کا حلقۂ ارادت مہتروں اور سپیروں اور دیگر خانہ بدوش قبائل ہی تک محدود نہیں بعض مسلمان اور ہندو بھی اس کے عقیدتمندوں میں شامل ہیں۔

جیسا کہ مہتروں کے نعرے سے معلوم ہوتا ہے گوگا راجپوتوں کی چوہان قوم سے تھا، یہ سانپوں کے علم کا زبردست ماہر گزرا ہے اور اسے سانپ کے کاٹے کے عجیب و غریب علاج معلوم تھے۔ گوگا محمود غزنوی کے زمانے سے بہت پہلے وادریڑہ تحصیل راج گڑھ علاقہ بیکانیر میں پیدا ہوا اور نوجوانی میں اپنے باپ سے لڑ کر نوہر کے پرگنے میں چلا آیا مرنے کے بعد وہیں اُس کا مزار بنا۔ اُسے گوگا پیر کے علاوہ راجہ گوگا، گوگا چوہان، ظاہر پیر اور گوگا کراماتی بھی کہتے ہیں۔

عوام کا عقیدہ ہے کہ گوگا سانپوں کا راجہ ہے اور وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ کوئی سانپ اس کے حکم کے بغیر کسی کو کاٹ نہیں سکتا۔ گوگا کے مرید اُس کے نام پر بکرے کی قربانی دیتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ یوں آدمی سانپ کے اثر سے دائمی طور پر محفوظ ہو جاتا ہے اگر کسی شخص کو سانپ ڈس جائے تو سپیرے ایک دھاگے پر گوگا کا نام پڑھ کر زخم کی جگہ باندھ دیتے ہیں۔ پنجاب میں دھاگے پر اس قسم کے منتر پڑھے جاتے ہیں:

زمیں تے گکھ ۔ سپّاں ٹھُویاں گُگّے دی نتھ

مطلب غالباً یہ ہے کہ سانپ اور بچھو گوگا کے حکم کے بغیر کوئی حرکت نہیں کر سکتے۔ اُس کے سامنے اُن کی حقیقت زمین پر گرے ہوئے تنکوں سے زیادہ نہیں۔

---

[1] یہ مضمون ۱۲ر مارچ ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا ریڈیو سٹیشن لاہور سے نشر کیا گیا اور حسب اجازت جناب سٹیشن ڈائرکٹر صاحب لاہور "ہمایوں" میں شائع ہوا۔

گوگا کے مریدوں کا خیال ہے کہ وہ اولاد اور مال و دولت میں بھی برکت دے سکتا ہے۔ اس غرض سے جمعرات یا جمعہ کے دن گوگا کے نام کی نیاز دلوائی جاتی ہے۔ نیاز میں کھیر، ملیدہ، دودھ، ناریل، پیاز یا پنکھا بھی دیا جا سکتا ہے۔ بعض جنم جلے پہوتے اولاد حاصل کرنے کے لئے گوگا کے مزار پر جا کر بھی چڑھاوا چڑھاتے ہیں۔ عوام کا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص گوگا پیر کی نیاز ملان کر نہ دلوائے تو اس کی اولاد بھی مر جاتی ہے اور کاروبار بھی تباہ ہو جاتا ہے۔

گوگا کی پیدائش کے متعلق دو مختلف اور عجیب و غریب روایتیں مشہور ہیں۔ پہلی روایت سنیئے:۔

کہتے ہیں بیکانیر میں کوئی راجہ جیور گزرا ہے۔ اس کی دو رانیاں تھیں۔ ایک کا نام باچھل تھا اور دوسری کا نام کاچھل۔ اتفاق سے دونوں بانجھ تھیں۔ باچھل نے بڑی عبادت کے بعد خدا سے اولاد کے لئے دعا مانگی۔ اس کی دعا سے گرو گورکھ ناتھ وہاں آ کر نوکھی باغ میں اترے۔ یہ باغ سوکھ کر ویران ہو چکا تھا لیکن گرو کے قدموں کی برکت سے دیکھتے دیکھتے ہرا ہو گیا۔ باچھل بارہ برس تک گرو کی سیوا کرتی رہی۔ تیرھویں برس گرو گورکھ ناتھ جانے لگے تو باچھل کی سوت کاچھل کو کسی طرح خبر ہو گئی۔ کاچھل یہ چال چلی کہ باچھل سے اس کے سیوا کے کپڑے مانگ کر خود گرو کی خدمت میں جا پہنچی اور ان کے چیلے کانیپا کی زبانی کہلایا کہ مجھے آپ کی سیوا میں کھڑے کھڑے دیمک لگ گئی۔ اب آپ جا رہے ہیں۔ جیسے آپ نے اجڑا باغ ہرا کر دیا اسی طرح میری گود بھی ہری کر دیجئے۔ گرو نے کاچھل کو باچھل سمجھ کر چیلے کو حکم دیا کہ اسے کچھ دے دے۔ کانیپا نے اسے جَو کے دو دانے دیتے ہوئے کہا جا تیرے دو جڑواں بیٹے پیدا ہوں گے۔ کاچھل اس فریب سے اپنا مطلب نکال کر باچھل کے پاس آئی اور کپڑے دے کر بولی، تو نے اتنا عرصہ جوگیوں کی سیوا کی، وہ آج چلے بھی گئے۔ تجھے کیا ملا۔ باچھل یہ سنتے ہی اپنے کپڑے پہن کر گرو کی تلاش میں نکلی، بارہ کوس کے فاصلے پر جا کر اس نے گرو کو جا لیا اور کہا مہاراج مجھے کیا دے چلے۔ گرو نے بگڑ کر فرمایا، دور ہو کمبخت! ہم تجھے ابھی دے کر تو آئے ہیں۔ باچھل بولی مہاراج! مجھے تو کچھ نہیں ملا، میری سوت کاچھل دھوکے سے کچھ لے گئی ہو گی۔ کتابوں میں عوام کے کسی نے اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے ؎

جس ٹھگنی نے موئے ٹھگا اوہی ٹھگ لائی تو سے   بارہ برس سیوا کری گرو جی کیا دے چلے موٹے

گرو نے ماتھے پر بل ڈال کر کانیپا سے پوچھا "یہ کیا معاملہ ہے"۔ چیلے نے کہا "رانی سچ کہتی ہے"۔ یہ سن کر گرو نے باچھل کو گوگل کی ایک گولی دی اور کہا جا تیرے گوگا پیدا ہو گا، وہ کاچھل کے جڑواں بیٹوں کو ہلاک کرے گا اور چاروں کھونٹ اس کی پیری مانی جائے گی

اب گوگا کی پیدائش کے متعلق دوسری روایت بھی سنئے جو پنجاب میں زیادہ عام ہے۔ کہتے ہیں سانپوں کا سب سے پہلا گرو تنھتر ویدیہ تھا۔ اس کے سوا لاکھ چیلے تھے۔ اس کو یہ کرامات حاصل تھی کہ گردن کے سوا اس کے جسم پر کسی جگہ سانپ کے زہر کا اثر نہ ہو سکتا تھا۔ اس گرو نے سانپوں کو چن چن کر مارنا شروع کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ سانپوں کی صرف تین ذاتیں باقی رہ گئیں:۔

(۱) کوہ مار۔

(۲) تلیر۔

(۳) بھسرا۔

اب ان تین ذاتوں کو فکر ہوئی کہ تنہتر وید نے ہماری تمام نسلوں کو فنا کر دیا ہے اس کا بھی کچھ علاج ہونا چاہئے۔ سب سے پہلے کوہ مار نے بدلہ لینے کا فیصلہ کیا اور ایک دن جب تنہتر اپنے چیلوں کے ساتھ کہیں جا رہا تھا کوہ مار سونے کی چھڑی بن کر اس کے راستے میں لیٹ گیا۔ جب تنہتر کی نظر اس سنہری چھڑی پر پڑی تو اس نے چیلوں سے کہا اسے کوئی ہاتھ نہ لگائے، یہ ایک آفت ہے۔ ایک چیلے نے جو سب سے پیچھے تھا دل میں کہا گرو جی تو بادشاہ آدمی ہیں۔ یہ چیز چھوڑ دینے کی نہیں چنانچہ یہ چیلا سونے کی چھڑی اُٹھا کر گرو کے پیچھے دوڑا اور ہانپتے ہوئے بولا مہاراج اسے کیوں چھوڑے جاتے ہیں مگر تنہتر کی پشت کے قریب پہنچتے ہی چھڑی دفعتاً ایک پھنپھناتے ہوئے سانپ میں تبدیل ہو گئی اور اس نے اُچک کر تنہتر کی گردن پر ڈس لیا۔

جب تنہتر وید کی موت کا وقت قریب ہوا تو اس نے اپنے چیلوں کو جمع کر کے کہا کہ مرنے کے بعد میرے بدن کی بوٹی بوٹی کرنا اور اسے پکا کر کھا لینا۔ اس کے کھانے سے میرے بجائے سوا لاکھ تنہتر وید پیدا ہو جائیں گے۔ چیلوں نے تنہتر کے مرنے کے بعد اس کے حکم کی تعمیل کی اور اس کی لاش کی بوٹی بوٹی کر کے اسے ہنڈیوں میں پکانا شروع کیا۔ سانپوں کو خبر ہوئی تو اُنہوں نے ایک جگہ جمع ہو کر کہا، یہ تو بڑی خرابی ہوئی۔ صرف ایک تنہتر ہی چین سے نہیں بیٹھنے دیتا تھا اگر سوا لاکھ تنہتر پیدا ہو گیا تو قیامت ہو گی۔ بچاؤ کا کوئی ڈھنگ نکالنا چاہئے۔ اس پر تلیر سانپ بولا یہ کام تم میرے سپرد کر دو۔ اب میری باری ہے۔ چنانچہ تلیر نے ایک سو سال کے بڈھے پروہت کا روپ دھارا۔ ایک ہاتھ میں پوتھی ایک میں عصا، ہانپتا کانپتا چیلوں کے جھنڈ میں جا گھسا اور صدا لگائی کہ ہے کوئی جو بھگوان کے نام پر کچھ دے وسے۔ چیلوں نے کہا آج ہم دان نہیں دیں گے۔ گرو کا حکم ہے۔ اس پر پروہت نے گھوم کر اپنی پوتھی کھولی اور کچھ پڑھنے لگا۔ چیلے یہ دیکھ کر مرعوب ہو گئے اور کہنے لگے یہ پروہت تو بڑا انترجامی معلوم ہوتا ہے۔ ایک چیلے نے آگے بڑھ کر ادب سے کہا آپ نے جو کچھ دیکھا ہے اگر سچ سچ بتا دیجئے تو خیرات مل جائے گی۔ پروہت نے بھویں چڑھا کر جواب دیا۔ اچھا تو سنو۔ پہلے تمہارے گرو کو سانپ نے سونے کی چھڑی بن کر ڈسا اور وہ مر گیا۔ اب یہ جو کچھ تم پکا رہے ہو زہر ہے زہر! کھاتے ہی مر جاؤ گے۔ اپنی خیر چاہتے ہو تو ہنڈیاں اُٹھا کر دریا میں اُلٹ دو۔ بس بابا ہمیں بھکشا نہیں چاہئے۔ ہم رمتے ہیں۔

یہ کہہ کر پروہت تو یہ جا وہ جا آنکھوں سے اوجھل ہو گیا اور تنہتر کے چیلے لگے ہنڈیاں اُٹھا اُٹھا کر دریا میں ڈالنے۔ اتفاق سے ایک ہنڈیا تیرتی ہوئی راجہ جیور کے محل کے نیچے پہنچی اور ایک لونڈی کے ہاتھ لگی۔ وہ اسے اُٹھا کر راجہ جیور کی رانی واچلاں (یعنی باچھل) کے پاس لے گئی۔ تنہتر کا گوشت خدا کی قدرت سے اس وقت تک گرم تھا، باچھل نے اسے اُنگلی سے چھوا تو اُنگلی جل گئی۔ اس پر اضطراباً

اس نے اپنی انگلی مُنہ میں ڈال کر چوس لی، رانی بانجھ تھی لیکن شور رہا گئی اُنگلی چوسنے کا نتیجہ یہ ہؤا کہ وہ گربھ ونتی ہوگئی اور گوگا اس کی کوکھ میں پڑگیا

یہ دونوں روایتیں تو گوگا کے ماں کی کوکھ میں پڑنے کے متعلق ہیں۔ اب اس سے آگے کا حال سنئیے۔

انہیں دنوں راجہ جیور رانی باچھل سے سخت بدگمان ہوگیا۔ اس کی سوتن کاچھل نے بھی موقع پاکر راجہ کے کان بھرنے شروع کئے انجام یہ ہؤا کہ باچھل کو اُسی حالت میں دیس نکالا دیا گیا۔

رانی دو بیلوں کی ایک بہلی میں بیٹھ کر اپنے بھائی باسک دیو کے ملک کی طرف روانہ ہوئی جو سانپوں کا بادشاہ تھا۔ اُسی رات باسک نے خواب میں دیکھا کہ کسی نے اُسے تخت سے اُٹھا کر دے مارا ہے۔ چنانچہ اُس نے اپنی راجدھانی کے بڑے بڑے سانپوں کو بُلا کر یہ خواب سنایا اور تعبیر پوچھی۔ سانپوں نے باسک کو تہتروید کی ساری داستان سُنا کر کہا کہ اب یہ نیا فتنہ بن کر ادھر آرہا ہے۔ اس پر باسک نے تمام سانپوں کو جمع کیا اور کہا جو گوگا کو مار دے گا اُس کو آدھا راج دے دوں گا۔ یہ سُن کر سانپوں کی تیسری ذات یعنی بھسرا ناگ نے بیڑا اُٹھایا۔ یہ بالشتی سانپ بن کر روانہ ہؤا۔ باچھل ابھی راستے ہی میں تھی کہ بھسرا اس کی بہلی کے پاس جا پہنچا۔ پہلے اس نے دونوں بیلوں برہنی اور سوہنی کو ڈسا، پھر گرڈھ والے کو کاٹا۔ اس کے بعد گوگا کا خاتمہ کرنے کے لئے سوتی ہوئی باچھل کے مُنہ میں گھسنے کو تھا کہ گوگا نے پیٹ سے ہاتھ نکالا اور بھسرا کا پھن داب کر سارا زہر نچوڑ لیا۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ بھسرا کیچوا بن گیا۔ پھر گوگا نے خواب میں ماں سے کہا تو کس نیند سوتی ہے۔ اُٹھ دیکھ بیلوں کو کیا ہؤا اور گرڈھ والا کس حال میں ہے۔ باچھل چونک کر اُٹھی تو دیکھا کہ بیل اور گرڈھ والا سب مرے پڑے ہیں۔ بے کسی کے عالم میں بے چاری گھبرا کر رونے لگی کہ اب بھائی کے پاس کس طرح پہنچوں گی۔ اتنے میں گوگا نے اسے کوکھ میں سے آواز دی "گوگا کے نام کی بھینٹ مان اور اپنے موباف کا دھاگا بیلوں اور گرڈھ والے کے پاؤں میں باندھ۔ یہ سب زندہ ہوجائیں گے۔" باچھل نے ایسا ہی کیا اور وہ سب زندہ ہوکر باسک دیو کے ملک میں جا پہنچے۔ یہاں باسک نے پہلے ہی سے ایک تہ خانے میں سانپ بچھو وغیرہ چھوڑ کر باچھل کے لئے کچے سُوت کا پلنگ بچھوا دیا تھا تاکہ وہ مرجائے اور گوگا پیدا نہ ہو۔ مگر وہ پلنگ خالص سونے کا بن گیا اور سانپ بچھو سبھی مرگئے۔

بارہ برس تک باچھل بھائی کے ہاں رہی لیکن گوگا پیدا نہ ہؤا۔ آخر ایک دن گوگا نے خواب میں ماں سے کہا "تو کس خیال میں ہے میں یہاں پیدا ہوکر ننھیال (یعنی نانا کے گھر کا جنا ہؤا) نہیں کہلانا چاہتا جس طرح ہوسکے میرے باپ کے دیس کو چل۔

باچھل بولی، مہاراج مجھے وہاں گھسنے ہی کب دیں گے۔ ایسی تدبیر کر کہ وہ خود یہاں آکر مجھے لے جائیں۔

گوگا نے جس طرح خواب میں باسک کو تخت سے اُٹھا کر دے مارا تھا ویسا ہی سلوک جیور سے بھی کیا اور کہا کہ میری ماں کو لے کر آ۔ راجہ جیور اس واقعہ سے بہت ڈرا اور جا کر رانی باچھل کو لے آیا۔ یہاں پہنچنے کے بعد گوگا پیدا ہؤا۔

جوان ہونے پر گوگا بڑا جری اور بہادر نکلا اُسے سیر و شکار اور جنگلوں میں پھرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ کئی لڑائیاں بھی لڑا لیکن کاچھل کے جڑواں بیٹوں ارجن اور سرجن سے اس کی لڑائی بڑی معرکے کی ہوئی۔ اس کا قصہ یوں ہے کہ گوگا اپنے نیلے گھوڑے پر سوار کئی دن سے شکار کے لئے دور دراز جنگلوں کی طرف نکل گیا تھا۔ اتفاق سے انہیں دنوں اس کا باپ مرگیا اور ارجن سرجن باچھل کے پاس آکر راج پاٹ کا حصہ مانگنے لگے۔ گوگا کو غیب سے خبر ہوگئی کہ کوئی راج مانگ رہا ہے چنانچہ کتھا پڑھنے والوں کے الفاظ میں اس نے اپنے نیلے گھوڑے سے کہا:۔

چل رے نیلے اُلٹے چلیں اُلٹی موڑیں باگ
بھُم کے بانٹے ہو رہے ماتا بکس رہی گھر بار

گوگا گھر پہنچا تو باچھل نے کہا۔ ارجن سرجن کو کچھ دے دو۔ لیکن گوگا نے کہا، یہ راج کے لایق نہیں، ہم ان کو کچھ نہیں دے سکتے۔ اس پر ارجن اور سرجن سخت برہم ہوئے اور سازشیں کرنے لگے۔ انہیں دنوں گوگا قریب کے ایک راجہ کی حسین بیٹی سریل کے رشتے کا خواستگار ہوا۔ کاچھل کے جڑواں بیٹے بھی اسی لڑکی کے خواہشمند تھے۔ لیکن لڑکی کے باپ نے گوگا کو پسند کیا اور سریل کی شادی گوگا سے ہوگئی۔ اب ارجن اور سرجن اور بھی غضب ناک ہوئے اور پوری طرح جنگ پر آمادہ ہوگئے۔

اُن دنوں دلی کا راجہ بڑا طاقت ور تھا۔ ارجن سرجن نے اسے بھڑکایا کہ گوگا عنقریب تم سے دلی چھیننے والا ہے۔ راجہ یہ سن کر جھلا گیا اور ساری دلی کو لے کر گوگا پر ٹوٹ پڑا۔ ارجن سرجن نے اپنے توڑ جوڑ سے گوگا کے باپ کی فوج کو بھی ورغلا لیا۔ چنانچہ ساری فوج اُس سے پھر گئی اور گوگا کے صرف چار ساتھی رہ گئے۔

(۱) گھوڑے کا سائیس بھجو چمار۔

(۲) نرسنگھ برہمن

(۳) گوگا کا بھانجا بالا

(۴) اور اُس کا چچیرا بھائی فتح سنگھ۔

اس لڑائی میں گوگا کی طاقت عجیب و غریب طریقے سے ظاہر ہوئی۔ دشمن کی آدھی فوج تو اکیلے بالا ہی نے فنا کردی لیکن کچھ دیر بعد پانسا پلٹا اور گوگا کے چاروں ساتھی یکے بعد دیگرے موت کے گھاٹ اُتر گئے۔ اب اکیلا گوگا بارہ دن تک دشمن کی بقیہ فوج کا مقابلہ کرتا رہا لیکن تیرھویں دن لڑتے لڑتے جب اُس نے دم لینا چاہا تو اُس کو پناہ دینے کے لئے زمین اُس کے اشارے سے یکلخت پھٹ گئی اور وہ پانچوں ہتھیاروں سمیت اس میں غائب ہوگیا۔

دوسرے دن گوگا پھر بڑی طاقت کے ساتھ ظاہر ہوا۔ اب پھر اس نے تنہا دشمن کی ایک جرار فوج پر حملہ کیا اور صفوں پر

صفیں اُلٹنے لگا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ میدان اُسی کے ہاتھ رہا اور دشمن فنا ہو گئے۔

گوگا کو ظاہر پیر اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ غائب ہو کر دوبارہ ظاہر ہُوا تھا۔ اُس کے بھگتوں کا عقیدہ ہے کہ غیر فانی گوگا جب چاہے دوبارہ ظاہر ہو سکتا ہے۔ جس جگہ وہ زمین میں سما گیا تھا کہتے ہیں وہاں محمود غزنوی کے زمانے میں بعض کرامتیں ظاہر ہوئی تھیں مثلاً گائیں وہاں آکر خود بخود دودھ کی دھاریں مار جاتی تھیں۔ یہ دیکھ کر اس جگہ ایک مزار بنا دیا گیا جو اب بھی تو ہر میں موجود ہے۔ یہ چھوٹی سی عمارت گنبد کی صورت میں ہے۔ ہر سال بھادوں کی نویں کو یہاں بڑا عظیم الشان میلا ہوتا ہے اور لوگ اس میں شامل ہونے کے لئے دُور دُور سے آتے ہیں۔ اس موقع پر یہاں ایک منڈی بھی لگتی ہے جس میں ناگور، مارواڑ اور بیکانیر کے بیل و اونٹ وغیرہ کثرت سے فروخت کے لئے آتے ہیں۔

مزار پر ہر عقیدت مند سوا پانچ روپے یا ایک بکرے کا چڑھاوا چڑھاتا ہے۔ قبر کے پجاری چاہل کہلاتے ہیں جو برائے نام مسلمان ہیں۔ چڑھاووں کا نصف حصّہ مسلمان چاہل اور نصف حصّہ ہندو برہمن لیتے ہیں۔

گوگا کی بیسیوں کرامتیں مشہور ہیں مثلاً اس کے مزار پر جو کثیر التعداد سانپ رہتے ہیں، اُن کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کسی کو نہیں کاٹ سکتے۔ گوگا کے بھگت مالا کی طرح انہیں گلے میں لٹکا لیتے ہیں۔

ایک اور کرامات یہ بیان کی جاتی ہے کہ انگریزوں نے گوگا کے مزار تک ریل پہنچانے کی کوشش کی لیکن لاکھ جتن کے باوجود بھی گاڑی بال برابر اُس طرف نہ سرک سکی کیونکہ گوگا کو یہ منظور نہیں کہ اُس کے بھگت گاڑی میں سوار ہو کر اُس کے پاس آئیں۔

میں نے ایک مہتر سے گوگا کا حال پوچھتے ہوئے کہا معلوم نہیں گوگا کی چھپی ہوئی کتھا بھی کہیں سے مل سکتی ہے یا نہیں۔ مہتر نے گھبرا کر کانوں کو ہاتھ لگائے اور کہا ہرے رام! حضور گوگا کی کوئی بات تو چھاپے میں آہی نہیں سکتی۔ آپ کہتے ہیں ہم اس کی کتھا ریڈیو باجے پر گائیں گے مگر میں ڈرتا ہوں کہ کہیں آپ اسے کتاب میں نہ چھاپ دیں۔ پھر وہ کھانس کر بولا۔ اگر میری بتائی ہوئی کوئی بات کتاب میں آگئی تو میرے سب بچے مر جائیں گے اور حضور پر بھی آفت آئے گی۔

حامد علی خاں

*

محفلِ ادب

سرشکِ تبسّم

اُٹھا ساغر کہ انساں کشتۂ آلام ہے ساقی
یہ ربط ہے یہ مے آگے خدا کا نام ہے ساقی

نہ جانے نوعِ انساں کیوں اجل سے خوف کھاتی ہے
اجل کہتے ہیں جس کو زحمتِ یک گام ہے ساقی

حقیقت کیا سمجھ میں آسکے اشیائے عالم کی
فقط اک شکل ہے ساقی، فقط اک نام ہے ساقی

سنائیں سازِ حکمت کے ترانے کس توقع پر
کہ اب تک نوعِ انساں بندۂ اوہام ہے ساقی

صداقت آج بھی پوشیدہ ہے اولادِ آدم سے
دروغِ مصلحت آمیز اب بھی عام ہے ساقی

اُدھر یہ قول، ہم نے شرح کر دی ہے حقائق کی
ادھر اب تک وہی ابہام کا ابہام ہے ساقی

اُدھر تکمیلِ دیں، کا ہو چکا ہے دعویٔ محکم
اِدھر ایماں تھا جیسا خام اب تک خام ہے ساقی

اُدھر شدت کے ساتھ اعلان ہے "اتمامِ نعمت" کا
اِدھر ہر سانس اب تک زہر کا اک جام ہے ساقی

کہا جاتا ہے مجھ سے زندگی انعامِ قدرت ہے
سزا کیا ہوگی اُس کی جس کا یہ انعام ہے ساقی

شکایت کیا کسی خوں ریز چنگیز و ہلاکو کی
خود اپنا دل ہی جب خوں ریز و خوں آشام ہے ساقی

عمل کا رشتہ ہے جب بستۂ ماحول و وراثت میں
تو پھر کیوں آدمیت موردِ الزام ہے ساقی

جسے کہتے ہیں عرفِ عام میں تخلیقِ انسانی
یہ کس آغاز کی سعیٔ زبوں انجام ہے ساقی

وہاں بخشا گیا ہے میرے دل کو ذوقِ آزادی
جہاں موجِ ہوا تک مرغِ زیرِ دام ہے ساقی

تبسم اک بڑی دولت ہے، میں بھی اس کا قائل ہوں
مگر یہ آنسوؤں کا ایک شیریں نام ہے ساقی

جسے اربابِ مشرب بادۂ توحید کہتے ہیں
وہ آبِ صاف بھی افشردۂ اصنام ہے ساقی

خروشِ گریہ ہی حائل نہیں غمہائے پنہاں کا
یہاں تو ساز کے پردے میں بھی کہرام ہے ساقی

لڑکپن ضد میں روتا تھا، جوانی دل میں روتی ہے
نہ جب آرام تھا ساقی، نہ اب آرام ہے ساقی

تمنائیں جگاتی ہیں تو ناکامی سلاتی ہے
نہ اپنی صبح ہے ساقی، نہ اپنی شام ہے ساقی

بڑی دریادلی کے ساتھ ہر خوں ریز طاقت کو | مشیت کی طرف سے اِذنِ قتلِ عام ہے ساقی
یہ کس کی مُہرِ ہیبت ثبت ہے گیتی کے سینے پر | کہ ہر ذرّہ ازل سے لرزہ براندام ہے ساقی
ادب کر اس خراباتی کا جس کو جوشؔ کہتے ہیں
کہ وہ اپنی صدی کا حافظ و خیام ہے ساقی

جوشؔ ملیح آبادی۔ "کلیم"

شفاء الملک حکیم فقیر محمد مرحوم کی پھبتیاں

پھبتی تشبیہ کی ہی ایک قسم ہے۔ تشبیہ میں یہ ضروری ہے کہ مشبّہ ادنیٰ ہو اور مشبہ بہ اعلیٰ۔ لیکن پھبتی کا حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ یعنی اعلیٰ کو ادنیٰ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ یوں تو شاید ہم اور آپ بھی غور کریں تو اچھی اچھی بہت سی پھبتیاں سوچ لیں۔ لیکن وقت پر اچھی پھبتی بڑی مشکل سے سُوجھتی ہے اور حکیم صاحب کا تو یہ حال تھا کہ وقت پر ایسی برجستہ پھبتی دماغ سے اُتار لیتے تھے کہ جو سنتا تھا حیران رہ جاتا تھا۔

ایک دن آغا حشر اور حکیم صاحب آم کھا رہے تھے، آغا آم کھاتے جاتے تھے اور اپنی عادت کے مطابق کہتے جاتے تھے کہ بمبئی حکیم بمبئی کے الفانسو کا جواب نہیں۔ لکھنؤ کا سفیدہ اس کے آگے کیا مال ہے، حکیم صاحب نے کہا، جی ہاں۔ لیکن ہم تو بنارس کے لنگڑے پر لٹو ہیں۔ آغا پھڑک گئے۔ بات یہ تھی کہ آغا مرحوم بنارس کے رہنے والے تھے، اور ایک ٹانگ سے لنگڑے، اس لئے "بنارس کے لنگڑے" کی پھبتی ان پر ایسی بیٹھی جیسے انگشتری میں نگینہ بیٹھتا ہے۔

حکیم صاحب ایک مرتبہ کسی مریض کو دیکھنے گئے۔ ایک کالا بھجنگ معمّر آدمی جو صاحبِ خانہ کا قریبی رشتہ دار تھا، مریض کی پٹی سے لگا پنڈلی کھجلا رہا تھا۔ حکیم صاحب کو یہ بات بہت ناگوار گزری لیکن کچھ کہہ نہ سکے۔ جب مریض کو دیکھ کر چلنے لگے تو اس شخص کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔ یہ صاحبزادے کس درجہ میں پڑھتے ہیں، صاحبِ خانہ نے کہا حکیم صاحب۔ انہیں آپ نے صاحبزادہ کیسے کہہ دیا، ان کی عمر تو پچپن سال کے لگ بھگ ہوگی۔ حکیم صاحب نے کہا، اچھا۔ یہ سلیٹ پر کچھ لکھ رہے تھے۔ اس لئے میں یہ سوال کر بیٹھا۔

میں جن دنوں تہذیبِ نسواں میں نیا نیا گیا تھا، ایک مرتبہ حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کہنے لگے کوئی نئی خبر سناؤ میں نے آج کا اخبار نہیں دیکھا۔ میں نے کہا صاحب میں خود کئی کئی دن اخبار نہیں دیکھتا۔ ہنس کے فرمایا۔ جی ہاں ع

عشق کا حال بیسوا جانیں | ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

چراغ حسن حسرت

"شیرازہ"

مطبوعات

اسلامی طِب ۔ (از معین الدین صاحب رہبر فاروقی) ۔ سلاطینِ اسلامیہ نے فنِ طب کی جو خدمات انجام دیں اور اُن کے زمانے میں اس فن نے جو ترقی کی یہ کتاب اس کی مختصر لیکن دلچسپ اور جامع تاریخ ہے ۔ واقعات کی ترتیب بہت دلآویز ہے اور بعض جگہ تاریخ میں افسانے کا لطف محسوس ہوتا ہے ۔ قابل مؤلف نے مسلمان سلاطین و اطبا ، کے علمی و فنی کارناموں کے علاوہ اس کتاب میں یونانی ، سریانی ، عربی ، فارسی اور ہندی زبانوں کی نادر طبی کتابوں کے متعلق اُردو میں نہایت مفید معلومات جمع کر دی ہیں ۔ اس کے علاوہ اس میں ایسی طبی کتابوں کا ذکر کیا ہے جن کے ذریعے سے اُردو کی لسانی تحقیقات بھی ہو سکتی ہے ۔ یہ کتاب مطالعہ کے قابل ہے قیمت عہ مجلد عہ (علاوہ محصول) مؤلف سے حسب ذیل پتے سے طلب فرمایئے :- سن برج ہاؤس ۔ عابد بلڈنگ ۔ مصطفےٰ بازار ۔ حیدر آباد (دکن) ۔

۱ ۔ **اچھے گیت**
۲ ۔ **تب تم اچھی بچی ہو**
} یہ دونوں کتابیں میاں عبدالمجید بھٹی ایڈیٹر "ہونہار" لاہور نے لکھی ہیں ۔ اچھے گیت میں بچوں کے لئے ۲۰ نہایت سبق آموز گیت درج ہیں ۔ دوسری کتاب میں چھوٹی بچیوں کے لئے ایک لمبی سبق آموز نظم شائع کی گئی ہے ۔ گیتوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میاں صاحب کو بچوں کے لئے گیت لکھنے میں کمال حاصل ہے ۔ اُردو میں بچوں کے لئے اس سے اچھے گیت ہماری نظر سے نہیں گزرے ۔ زبان سادہ ، سلیس ، دلکش اور موضوع کے لئے ہر طرح موزوں ہے کہیں کہیں تسامحات ہیں جن سے ان کتابوں کو پاک ہونا چاہئے مثلاً اچھے گیت کے صفحہ ۲۸ پر ایک مصرع یوں درج ہے ع "اور خود غرض بنا دیتا ہے" ہماری رائے میں یہ کتابیں تمام چھوٹے بچوں اور بچیوں کے ہاتھ میں ہونی چاہئیں ۔ یہ کتابیں اس قابل ہیں کہ محکمۂ تعلیم ان کی سرپرستی کرے قیمت علی الترتیب ۴ر اور ۲ر ۔ حضرتِ مصنف سے طلب کیجئے ۔

شہریت ۔ یہ کتاب بریوٹ میجر جے وِلاٹ ۔ ایم سی ۔ ایم اے کی تالیف ہے ۔ جسے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس بمبئی نے شائع کیا ہے یہ کتاب رومن حروف میں چھپی ہے ، اور جو لوگ اُردو کو رومن حروف میں لکھا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں اُن کے لئے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے کتاب ہندوستانی شہری کے حقوق و فرائض سے متعلق ہے ۔ زبان بہت شستہ اور قابلِ تعریف ہے ۔ شہریت میں قابل مؤلف نے ہندوستانی شہریوں اور دیہاتیوں کے لئے نہایت مفید اور کارآمد معلومات جمع کر دی ہیں قیمت صرف ایک روپیہ ہے ۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس بمبئی سے طلب کیجئے ۔

"**Since Our Fall**" یہ کتاب مسٹر عبداللہ انور بیگ ایم ۔ اے ، ایل ایل بی ، نے انگریزی زبان میں لکھی ہے ۔ فاضل مؤلف نے اس میں اسلام کے عروج و زوال کے اسباب پر غور کرتے ہوئے اسلامی ہند کی گذشتہ و موجودہ تاریخ پر ایک غائر نظر ڈالی ہے ۔ اسی سلسلے میں

"پین اسلامزم" کی تحریک کے متعلق بھی اظہار خیال کیا ہے اور مسلمانوں کی کوتاہیوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیئے۔
کتاب پُر از معلومات اور قابلِ مطالعہ ہے۔ قیمت مجلّد ہے۔ اُردو اکیڈیمی بیرون لوہاری دروازہ لاہور سے طلب فرمائیے۔

جامِ طہور - یہ جناب خواجہ عبدالسمیع صاحب پال اثر صہبائی کی رُباعیات وقطعات کا مجموعہ ہے جسے تاج کمپنی لاہور نے نہایت نفیس کتابت وطباعت اور خوبصورت جلد کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ابتدا میں حضرتِ اثر صہبائی نے خود بیس صفحوں کا دیباچہ لکھا ہے، جو نہایت دلچسپ ہے اور اُن کی شاعری کے مطالعہ کے لئے نہایت مفید معلومات سے پُر ہے۔ ایسا دیباچہ شاعر کے علاوہ دوسرا کوئی شخص شاید ہی لکھ سکتا۔ اثر صہبائی پنجاب کے موجودہ نوجوان شعرا میں نمایاں اور ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ وہ خیام، حافظ، اقبال اور ٹیگور وغیرہ سے خلص طور پر متاثر ہوئے ہیں۔ چنانچہ ان شعراء کی تعلیمات کے نہایت روشن نقوش اُن کے کلام میں جابجا ملتے ہیں۔ اثر صہبائی فلسفہ اور شاعری کو نہایت خوش اسلوبی سے سمو دیتے ہیں۔ ناظرینِ "ہمایوں" اُن کے دل آویز طرزِ خیال سے اچھی طرح واقف ہیں اس لئے نمونۂ کلام کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اُمید ہے کہ اچھے کلام کے شائقین اس مجموعے کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ قیمت مجلّد عہ۔ تاج کمپنی لاہور سے طلب کیجئے۔

سراجِ سخن - مرتبہ عبدالقادر سروری اُستادِ اُردو جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد دکن)۔ یہ کتاب سلسلۂ "انتخاباتِ شعرائے دکن" کی چوتھی جلد ہے۔
جس میں سید شاہ سراج الدین (۱۱۲۷ھ - ۱۱۲۸ھ) اورنگ آبادی کے کلام کا انتخاب دیا گیا ہے۔
شروع میں "دکن کی اُردو شاعری" کے عنوان سے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا مقدمہ ہے جس میں دکن کی اُردو شاعری کو مختلف ادوار میں تقسیم کر کے ہر دور کی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس تقسیم کی رُو سے سراج چوتھے دَور کا شاعر ہے۔
مرتب نے اپنے مقدمے میں سراج کے حالاتِ زندگی اور اُن کی شاعری کی خصوصیات مختصر طور پر بیان کی ہیں۔ اس کے بعد سراج کے نمونۂ تحریر کا عکس دیا گیا ہے۔ انتخابِ کلام میں غزلیات، رباعیات، مستزاد، مثنوی سب کچھ شامل ہے
اہلِ دکن کی یہ کوشش قابلِ قدر وستائش ہے کہ وہ موجودہ زمانے کو اپنے قدیم شعراء سے رُوشناس کرا رہے ہیں۔ قیمت ۱۲ امر مصنف سے طلب کیجئے۔

پریت افسانے - یہ سردار گوربخش سنگھ صاحب ایڈیٹر "پریت لڑی" لاہور کے افسانوں کا مجموعہ ہے جو نفیس کتابت وطباعت کے ساتھ مجلّد شائع ہوا ہے۔ حجم ۲۲۷ صفحات ہے۔ سرسری مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سردار صاحب کو سادہ اور سلیس زبان لکھنے پر پوری قدرت حاصل ہے۔ انہیں باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر مذہب و ملت کے ہندوستانی اُردو زبان کو اپنے خیالات کے اظہار کا بہترین وسیلہ بنا سکتے ہیں۔ جناب مؤلف ہر قسم کی حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔ نفیس مجلّد کتاب کی قیمت ۱۴ر ہے۔ مندرجہ بالا پتے سے منگوا لیجئے۔

جلد (۳۳) نمبر (۵)

فہرست مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ مئی ۱۹۳۸ء

تصویر:- علامۂ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۱	بزمِ ہمایوں	بشیر احمد	۳۴۲
۲	اقبال (نظم)	حامد علی خاں	۳۴۴
۳	علامۂ اقبال کے ہاں ایک شام	پروفیسر حمید احمد خاں صاحب ایم۔اے	۳۴۶
۴	جہاں نما	حامد علی خاں	۳۵۳
۵	بالوجی (افسانہ)	جناب محمد صادق صاحب قریشی بی۔اے	۳۵۷
۶	اظہارِ الفت (نظم)	جناب راجہ امین الرحمٰن خاں صاحب	۳۶۴
۷	انجام (نظم)	جناب نظر نقوی احسانی	۳۶۵
۸	غزل	حضرتِ شادؔ عارفی	۳۶۶
۹	بدصورتی	جناب کرشن چندر صاحب ایم۔اے	۳۶۷
۱۰	دسمبر کی ایک رات (نظم)	صاحبزادہ احمد ندیم صاحب قاسمی بی۔اے	۳۷۰
۱۱	احسن الکلام (غزل)	حضرتِ احسن مارہروی	۳۷۱
۱۲	نگار خانۂ چین	جناب مہدی علی خاں صاحب	۳۷۲
۱۳	خونِ پاک (نظم)	پروفیسر محمد اکبر صاحب منیر ایم۔اے	۳۷۵
۱۴	محبوب کی قبر پر	حضرتِ عروج بدایونی	۳۷۷
۱۵	محبت کی نیرنگیاں (انتخابِ اشعار)	حضرتِ حفیظ ہوشیارپوری ایم۔اے	۳۷۸
۱۶	کرشمہ (ڈراما)	جناب محمد یحییٰ صاحب صدیقی	۳۷۹
۱۷	کیلاش کنول (تراجم از پیامِ مشرق)	حضرتِ مقبول احمدپوری	۳۸۸
۱۸	ایک عید کے دن (افسانہ)	مولانا احسن عزیز صاحب جاوید	۳۹۰
۱۹	قرار و سکون (نظم)	جناب خواجہ عبدالسمیع صاحب پال اثر صہبائی ایم۔اے، ایل ایل بی	۳۹۶
۲۰	چنڈول (نظم)	پرنسپل رام پرشاد صاحب ناشاد ایم۔اے (آکسن)	۳۹۸
۲۱	اقبال کی منظر نگاری	جناب جگن ناتھ صاحب آزاد بی۔اے	۳۹۹
۲۲	محفلِ ادب		۴۰۶
۲۳	مطبوعات		۴۱۳

چندہ سالانہ صہ ششماہی سے مع محصول ۔۔۔ قیمت فی پرچہ ۸ر

بزمِ ہمایوں

اُن لوگوں کے لئے جنہیں ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی ملاقات کا شرف حاصل تھا اُن کی وفات پر اُن کی شاعری کو یاد کرنا اُس پر تبصرہ کرنا، اُن کے شہرۂ آفاق اشعار کا دُہرانا اور گنگنانا کم از کم تھوڑے عرصے کے لئے نہایت دشوار بلکہ دلخراش ہے کیونکہ ڈاکٹر صاحب اپنی شاعری سے الگ ایک زبردست نہیں نہیں ایک محبوب شخصیت کے مالک تھے۔

میں فخر سے محسوس کرتا ہوں کہ میرا شمار بھی اُن ہزاروں افراد میں تھا جنہیں اُن سے گاہے گاہے طُول طویل گفتگو کا موقع ملا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ "شرف" اور "موقع" کا ذکر ایک ایسے شخص کے متعلق کرنا جس کے دروازے ہر وقت ہر کہ ومہ کے لئے کھلے رہتے تھے لغو ہے اور یہ "فخر" کا احساس بھی شاید ایک گناہ کے برابر ہے۔

پھر بھی جی یہی چاہتا ہے کہ فی الحال اُس شاعرِ بے بدل کا ذکر نہ کروں جس کے اشعار سے ایک دُنیا کے دِل گرما گئے بلکہ اُس نگاہ کو یاد کروں جو دل میں اُتر جاتی تھی اُس شیریں آواز کو یاد کروں جو دل میں گھر کر لیتی تھی۔ اور اُس ہمیشہ کے لئے چھپ جانے والے چہرے کو گردن جھکا کر دل کے آئینے میں دیکھوں اور بار بار دیکھوں۔ اور میری طرح یہاں ہزاروں اور ہیں جن کی یہی کیفیت ہے اور مجھ سے بھی زیادہ دردبھری اُن کی داستان ہوگی جنہوں نے پچھلے چند سالوں میں اپنے قومی شاعر کی مٹھی چاپی کی۔ "یومِ اقبال" والے شفیع صاحب کے ہاتھوں کو پوچھو جنہوں نے اُن کے جسمِ نزار و نزار کی لمبی راتوں میں گھنٹوں مالش کی۔ بادشاہی مسجد میں رات کی تاریکی میں قبر میں اُتارتے وقت بیسیوں ہاتھ تھے جو کانپے، سینکڑوں آنکھیں تھیں جن میں آنسو ڈبڈبا آئے اور یہ اس لئے نہیں کہ اِک "یقیں محکم عمل پیہم" کہنے والا خاموش ہو چکا تھا بلکہ اِس لئے اِسی لئے کہ ایک "محبت فاتح عالم" کا امانت دار جو ؎

پُرسوز [illegible] باز و نکو بین و کم آزار   آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند

تھا ہمیشہ کے لئے ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

میرا ڈاکٹر صاحب سے جو تعلق تھا اُس سے سینکڑوں اَوروں کا ذاتی تعلق بہت زیادہ گہرا ہوگا پھر نہیں معلوم مجھے کیوں محسوس ہوتا ہے کہ میرا تعلق ضرور ایک خاص تعلق تھا۔ اتنا ضرور ہے کہ والدِ مرحوم سے ایک دِلی تعلق کی بنا پر مجھ پر اُن کی خاص نظرِ عنایت تھی۔ افسوس میں نے اس سے بہت کم فائدہ اُٹھایا۔ حضرتِ ہمایوں کی وفات کے برسوں بعد تک میں محض کبھی کبھی اُن سے ملا لیکن ایک "بالِ جبریل" چھپنے کے بعد اور پھر مسلم لیگ کے لکھنؤ کے اجلاس کے بعد میں خوش قسمتی سے اکثر اُن کے پاس جانے

لگا یہ محسوس کر کے کہ ہمارے عین درمیان ہم سے اس قدر قریب دُنیا کی ایک عظیم الشان ہستی موجود ہے اور ہم کم بخت اُس کی نادر صحبت سے ذرا فیض نہیں اُٹھاتے۔ مسلمانوں نے اپنے قومی شاعر کی بڑی قدر کی گو گزشتہ سرمائیوں میں میں نے بعض دفعہ اُن کے پاس جا کر اُن کی تنہائی اور بیکسی کو شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ اُن کی آواز میں باوجود ہمت و استقلال کے اب اتنی محبت اور رقّت کے جذبات بھرے رہتے تھے کہ اُنہیں یاد کر کے اُن کی طرف اپنی کوتاہیوں پر شرم سی آنے لگتی ہے۔ سچ ہے انسان کی قدر مرنے کے بعد ہی آتی ہے!

کس قدر قانع اور حوصلہ مند طبیعت پائی تھی ؎

تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں　　نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایتِ زمانہ

اور بے نیاز: ؎

درویشِ خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی　　گھر میرا نہ دلّی نہ صفاہاں نہ سمرقند

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق　　نے ابلہِ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش　　میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند

اور پھر وہی: ؎

پُرسوز و نظر باز و نکو بین و کم آزار　　آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند

ذرا اپنے ہی بعض اور لیڈروں کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھئے، کس طرح گمنامی اور ترکِ دُنیا کے ذریعے سے بھی اپنا پروپیگنڈا کرتے ہیں لیکن مرحوم کو یہی خوشی تھی کہ ؎

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری　　وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے؛

اس کے ساتھ ہی اُنہیں اپنے حیات بخش پیغام کی اہمیت کا احساس تھا، اپنے مزار کے لئے یہ کتبہ چھوڑ گئے ہیں: ؎

چو رختِ خویش بر بستم ازیں خاک　　ہمہ گفتند با ما آشنا بُود

ولیکن کس ندانست ایں مسافر　　چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بُود

اور اپنی رحلت سے چند منٹ پیشتر یہ شعر پڑھ رہے تھے ؎

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید　　نسیمے از حجاز آید کہ ناید

سر آمد روزگارِ ایں فقیرے　　دگر دانائے راز آید کہ ناید

جنابِ حفیظ ہوشیارپوری نے اُن کی یہ تاریخیں کہی ہیں:- "ڈاکٹر سر محمد اقبال بُرد" ۱۳۵۷ھ "پیغمبرِ دینِ خودی" ۱۹۳۸ء

بشیر احمد

شہیدِ مِلّت حضرتِ اقبال علیہ الرحمۃ

تاجدارِ اقلیمِ سخن کی بارگاہ میں ایک گدائے بے نوا کا خراجِ عقیدت

جنہیں رفعت سے آنکھیں بھی مِلانے کا نہ تھا یارا اُنہیں پھر لے اُڑی یہ کس کی تخئیلِ سپہر آرا؟
گرے میراثِ آبا کھو کے یوں ہم خاکِ حسرت پر کہ تھا دُنیا کی آنکھوں کیلئے عبرت یہ نظارا

"کبھی اے نوجوانِ مُسلم تدبر بھی کیا تُو نے" ترے دل کو بنایا قلبِ مُسلم کس نے دوبارا؟
گداؤں کو جہانبانی سکھانے کیلئے کس نے خزانہ حکمتِ گم گشتہ کا پھر پا لیا سارا؟

ہوئے افراد پھر احیائے مِلّت کیلئے قرباں حق آگاہی تجھے بخشی خود آگاہی نے دوبارا
در آیا پھر فسونِ عشق یغمائے دل و جاں کو ہوس کے قافلے کو لے کے بھاگا نفسِ امّارا
نقیبِ آفتابِ تازہ و تابندہ تر آیا کہ اُبھرا ہے اُفق سے پھر ترا ڈوبا ہوا تارا

فلک سے جا ملا پھر طاقِ قصرِ ملّتِ بیضا
ترا اقبال ہے اور سطوتِ کبریٰ کا نقارا

بنایا اپنے دل کو گنجِ اسرارِ بقا جس نے
اور اُس کو اُمّتِ مرحوم کی تقدیر پر وارا

سرورِ سینۂ ملّت، فروغِ دیدۂ دنیا،
خدائے پاک کا پیارا، نبیؐ کی آنکھ کا تارا

نواسازِ خودی! تیری نوا کی گونج اُٹھی ہی تھی
کہ ٹھکرانے لگے پھر بے نوا تاجِ سرِ دارا

ترے "ذوقِ یقیں" نے کارفرمائے جہاں پائے
وہی دل دیدۂ نکبت نے پایا جن کو ناکارا

ریاضِ ہند کو تُو نے لہو رو رو کے سینچا ہے
ادا تُو نے کیا ملّت کی تقصیروں کا کفارا

گیا ہر باغِ ملّت میں شمیمِ جاں فزا لے کر
ترا جوشِ اخوت اور صبا کا خیلِ آوارا

ترے سوزِ محبت کی فسوں سازی نے پگھلائے
وہ بے حس دل کہ تھے قرنوں سے ننگِ سینۂ خارا

حامد علی خاں

۱؎ یہ نظم جو ۱۹۳۲ء میں لکھی گئی تھی "یومِ اقبال" کی گزشتہ تقریب پر مجلسِ عام میں پڑھی گئی۔

علاّمۂ اقبال کے ہاں ایک شام

گذشتہ ماہِ رمضان کی ایک سُہانی شام کو جب ہوا کے جھونکے گلابی جاڑے کی تازگی اور کیفیت سے بس رہے تھے ہم علامۂ اقبال سے ملنے کے لئے روانہ ہوئے، میرے ساتھ میرے شعبۂ انگریزی کے رفیق پروفیسر عبدالواحد اور صدرِ شعبۂ فلسفہ ڈاکٹر سعید اللہ تھے۔ خزاں کا آغاز تھا مگر موسم میں وہ جولانی تھی جو لاہور کا فرحت بخش آسمان بھی صرف کبھی کبھی زمین والوں کو عطا کرتا ہے، ساڑھے چار بج چکے تھے۔ سُورج کے غرُوب ہونے میں ابھی کچھ عرصہ باقی تھا۔ فضا اُجلی اور نکھری ہوئی تھی مگر مغرب کی طرف ابر کی چند قرمزی اور نارنجی دھاریاں اُفق پر ایک لہریا سا بنا رہی تھیں۔ ہم ایمپرس روڈ سے ہوتے ہوئے اُس چھوٹی سی سڑک پر چل رہے تھے۔ جو ریلوے کے بڑے دفتر کے جنوبی رُخ کے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔ وہ سرا ابھر آیا جہاں یہ سڑک میورروڈ سے ملتی ہے۔ اور ساتھ ہی ہم نے اُس مختصر سے سفید مکان پر نظر ڈالی جہاں دَورِ حاضر میں حقیقت کا سب سے بڑا ترجمان اپنی خاموش مگر ہنگامہ خیز زندگی بسر کر رہا ہے[1]۔ سڑک کے ساتھ صحن کی چھوٹی سی دیوار اور اُس کے پیچھے یوکلپٹس کے چار پودے جو ابھی اپنے پورے قدوقامت کو نہیں پہنچے، پھر سبزے کا ایک مختصر سا تختہ جس کے ساتھ ساتھ ہوتے ہوئے ہم مکان کی ڈیوڑھی کے پاس جا کر رُک گئے۔ اِس ڈیوڑھی کی تین محرابیں اپنے ہشت پہلو ستونوں پر سڑک سے صاف نظر آتی ہیں۔ ڈیوڑھی کے ساتھ ہی مکان کا برآمدہ ہے جس کے سفید پِل پائے طبیعت کو رُعب و وقار کے بجائے حسن و لطافت کا اثر زیادہ دیتے ہیں۔ ہمارا پُرانا دوست علی بخش[2] ہمیں دیکھ کر صحن کے ایک بغلی حجرے میں سے نکلا۔ اس نے جا کر علامۂ اقبال کو ہماری آمد کی اطلاع دی اور پھر فوراً واپس آ کر ہمیں اندر آنے کی دعوت دی ۔

برآمدے سے گزرتے ہی ہم ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ اِس کمرے کا سامانِ آرائش بہت سادہ اور تکلف و تصنع سے پاک تھا۔ رواق پر شاعرِ مشرق کی ایک تصویر، دو تین فٹ اونچی، فوراً نظر کے سامنے آ گئی۔ اِسی کمرے سے ملحق بائیں ہاتھ کو علامۂ اقبال کی خواب گاہ ہے۔ اس خواب گاہ کی ایک کھڑکی برآمدے کی طرف کھُلتی ہے۔ جس کے ساتھ ملا ہُوا علامۂ ممدوح کا بستر بچھا رہتا ہے۔ اب ایک عرصہ ہو گیا تھا کہ ہم جب آتے تھے۔ علامۂ اقبال کو اِسی بستر پر کبھی کبھی بیٹھے ہوئے مگر زیادہ تر لیٹے ہوئے پاتے تھے۔ لیکن مجھے وہ دِن بھی یاد ہیں کہ میکلوڈ روڈ کے قیام کے دنوں میں حضرتِ علامہ اپنے خرمنِ فیض کے خوشہ چینوں کو کسی اَور رنگ میں صلائے عام دیتے تھے۔ میں سڑک سے مڑتا تھا تو کوٹھی کے صحن میں داخل

[1] یہ مضمون اس سے تقریباً دو مہینے قبل لکھا گیا تھا۔ [2] علامۂ مغفور کا قدیم وفادار ملازم ۔

ہوتے ہی، اور بعد کے دنوں میں اُس لمبی روش پر چند ہی قدم چل کر جو مکان تک پہنچاتی تھی۔ ہمیشہ برآمدے کے ایک مخصوص گوشے میں ڈاکٹر صاحب ایک آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے دُور سے نظر آجاتے تھے۔ برآمدے تک پہنچتے پہنچتے علی بخش پہلے سے جمی ہوئی محفل میں حسب ضرورت ایک یا دو کرسیوں کا اضافہ کر دیتا تھا۔

آج ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی ہم کسی قدر ٹھٹکے۔ ایک یورپین خاتون ڈاکٹر صاحب کے بستر کے برابر کرسی پر بیٹھی تھیں اور ڈاکٹر صاحب کی چھوٹی بچی کو گود میں لیے ہوئے تھیں۔ ہم کو دیکھتے ہی وہ اٹھیں اور مقابل کا پردہ اُٹھا کر مکان کے اندر چلی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب بستر پر لیٹے ہوئے تھے اُنہوں نے تکیے کے سہارے لیٹے لیٹے ہمارے سلام کا جواب دیا۔ ہم تینوں بستر کے برابر کرسیوں پر بیٹھنے ہی کو تھے کہ ڈاکٹر صاحب ہم سے مخاطب ہوئے:۔

"کون صاحب ہیں؟"

یہ سوال سُن کر میرے دل کو ایک دھکا سا لگا۔ مجھے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں گاہ بگاہ حاضر ہوتے اب سات آٹھ برس ہو گئے تھے۔ اور ڈاکٹر صاحب ہمیشہ شفقت وعنایت سے پیش آتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا سوال میری سمجھ میں نہ آیا۔ اس لئے اپنے استعجاب کو چھپاتے ہوئے میں نے جواب دیا "جی میں ہوں حمید احمد خاں، سعید اللہ اور عبدالواحد" اور یہ کہہ کر ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سب سے پہلے ہم نے ڈاکٹر صاحب کے مزاج کی کیفیت پوچھی۔ اس کے بعد تھوڑی دیر تک سکوت رہا۔ جس کو ڈاکٹر صاحب نے معمول کے مطابق اپنی اُس لمبی اُستادانہ "ہُوں" سے توڑا، جس میں بالعموم گفتگو کے لاتعداد امکانات مضمر ہوتے ہیں۔ میں نے اُس تپائی پر نظر ڈالی جو بستر کے ساتھ ہی لگی ہوئی تھی پانچ سات کتابیں اس کے اُوپر تھیں اور دو ایک نیچے فرش پر پڑی تھیں۔ میں نے ایک اُچٹتی ہوئی نظر ان کتابوں پر ڈالی اور تھوڑے سے وقفے کے بعد پوچھا:۔

"ڈاکٹر صاحب! آج کل پڑھنے پر زیادہ توجہ ہے یا کبھی کبھی آپ کچھ لکھتے بھی ہیں۔"

"پڑھنا کیسا! کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ اگر کچھ دیکھ سکوں تو پڑھوں۔"

"نظر نہیں آتا؟" ڈاکٹر صاحب کے یہ الفاظ میں نے بے حد حیرت و استعجاب کے لہجہ میں دُہرائے۔

"ہاں! جب آپ لوگ میرے کمرے میں داخل ہوئے ہیں تو میں آپ کو نہیں دیکھ سکا۔ اب تھوڑی دیر گزرنے پر آپ کی صورتیں کسی قدر دُھندلی نظر آرہی ہیں۔ کہتے ہیں کہ (Senile Cataract) (موتیا بند) اُتر آیا ہے

سعید اللہ۔ ان گرمی کی چھٹیوں سے پہلے آپ نے ذکر کیا تھا کہ Senile Cataract اُتر آنے کا خطرہ ہے،

مگر یہ خیال نہیں تھا کہ اس قدر جلد اُتر آئے گا۔

ڈاکٹر صاحب ۔جی ہاں ۔ عام طور پر لوگوں کو دیر سے اُترتا ہے ۔ مجھے ذرا پہلے اُتر آیا ہے ۔ میرے والدِ مرحوم کو جو سَو سال سے کچھ زیادہ زندہ رہے اسّی برس کی عمر میں اُترا تھا ۔

مَیں ۔ اس کے علاج کی کوئی صورت تو آپ کر رہے ہوں گے ؛

ڈاکٹر صاحب ۔ اب اس کا آپریشن ہوگا ۔ لیکن جب تک یہ پک نہ جائے آپریشن نہیں ہو سکتا ۔ پکنے میں اسے پانچ مہینے لگ جائیں ، پانچ سال لگ جائیں کچھ کہا نہیں جا سکتا ۔ بہرحال لکھنا پڑھنا بالکل موقوف ہے کیونکہ میری داہنی آنکھ تو شروع ہی سے بیکار تھی ۔

"شروع ہی سے بیکار تھی"! اب حیرت کے ساتھ اس فقرے میں ہمارا تأسّف و اضطراب بھی شامل تھا ۔

"جی ہاں ، دو سال کی عمر میں میری یہ آنکھ ضائع ہو گئی تھی ۔ مجھے اپنے ہوش میں مطلق یاد نہیں کہ یہ آنکھ کبھی ٹھیک تھی بھی یا نہیں ۔ ڈاکٹر نے خیال ظاہر کیا تھا کہ داہنی آنکھ سے خون لیا گیا ہے ۔ جس کی وجہ سے بینائی زائل ہو گئی ۔ میری والدہ کا بیان ہے کہ دو سال کی عمر میں جونکیں لگوائی گئی تھیں ۔ تاہم مَیں نے اس آنکھ کی کمی کبھی محسوس نہیں کی ۔ ایک آنکھ سے دن کو تارے دیکھ لیا کرتا تھا (اس کے بعد ایک ایسے تبسم کے ساتھ جو گویا تاریکی کی قوتوں کے خلاف پیغمبرِ اُمید کا نعرۂ خاموش تھا) اب اگرچہ مَیں پڑھتا نہیں ہوں مگر پڑھنے کے بجائے سوچتا ہوں ۔ جس میں وہی لُطف ہے جو پڑھنے میں (پھر ذرا سرگرمی کے ساتھ تکیے سے سر اُٹھا کر) عجیب بات یہ ہے کہ جب سے بصارت گئی ہے میرا حافظہ بہتر ہو گیا ہے ۔"

اس کے بعد اِدھر اُدھر کی کچھ اور باتیں ہوئیں ۔ اُس یورپین خاتون کا ذکر ہوا جو تھوڑی دیر پہلے ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں ہمیں نظر آئی تھیں ۔ معلوم ہوا کہ یہ ڈاکٹر صاحب کے بچوں کی گورنس ہیں ۔ اور علی گڑھ کے کسی پروفیسر کی سفارش پر ڈاکٹر صاحب نے انہیں ملازم رکھا ہے ۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا "بیچاری اپنے حالات کی وجہ سے مصیبت میں تھی اور ہے بڑی شریف عورت ۔ بہت اچھی منتظم ہے ۔ بچوں کی تعلیم کے علاوہ اس نے گھر کا بہت سا اور کام کاج بھی سنبھال لیا ہے ۔ ذرا فرصت ملتی ہے ، تو مکان کے جھاڑنے پونچھنے میں لگ جاتی ہے ، یا باورچی خانے میں جا کر ہاتھ بٹاتی ہے ۔ میرا باورچی خانے کا خرچ اب ایک تہائی کم ہو گیا ہے ۔ کبھی مجھے انگریزی میں خط لکھنا ہوتا ہے تو اسی کو لکھوا دیتا ہوں ۔ اُردو خط جاوید لکھ دیتا ہے ——— ہاں اس سلسلہ میں ایک بڑا لطیفہ ہُوا ۔ میری لڑکی مُنیرہ اپنی گورنس کے ساتھ سیر کے لئے کسی طرح نہیں جانا چاہتی تھی ۔ بہت دفعہ کہا مگر اُسے گورنس کے ساتھ سڑک پر نکلنا بالکل منظور نہیں تھا ۔ آخر کئی دن بعد یہ راز کُھلا جب مُنیرہ نے کہا " لوگ مجھے کہیں گے میم کی بیٹی ہے"!

انہیں باتوں میں سوا پانچ بج گئے۔ علی بخش نے آکر مہر صاحب اور سالک صاحب کے آنے کی اطلاع دی۔ دونوں صاحب تھوڑی دیر میں اندر داخل ہوئے۔ اور ہمارے قریب ہی دو کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ان دنوں تھوڑا ہی عرصہ پہلے آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک اہم اجلاس لکھنؤ میں ہوا تھا اور پنجاب کی یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ کے باہمی میثاق کے چرچے تھے مدیرانِ 'انقلاب' کے آتے ہی گفتگو کا رُخ سیاسیات کی طرف پھر گیا . . . . . .

اس اثنا میں افطار کا وقت قریب آگیا۔ ڈاکٹر صاحب نے گھنٹی بجا کر اپنے ملازم رحما کو طلب کیا اور اس سے کہا کہ افطار کے لئے سنگترے، کھجوریں، کچھ نمکین اور میٹھی چیزیں جو کچھ ہو سکے سب لے آئے۔

سالک صاحب۔ 'تو ایہ سب کچھ منگوانے کی کیا ضرورت ہے۔ کھجوریں کافی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب۔ (ایک ایسی شوخی سے جس میں طفلانہ معصومیت کا انداز جھلکتا تھا) سب کچھ کہہ کر ذرا رعب تو جما دیں کچھ نہ کچھ تو لائے گا۔

"رحما" نے ڈاکٹر صاحب کی ہدایات کی لفظ بہ لفظ پابندی ضروری نہ سمجھی اور قریب قریب سالک صاحب کی خواہش کی پاسداری پر قناعت کی۔

ان سیاسی مباحث کے بعد خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اسے توڑا اور کہا "ڈاکٹر صاحب گرمی کی چھٹیوں سے پہلے ہم حاضر ہوئے تھے تو آپ نے غالب اور بیدل کے متعلق فرمایا تھا کہ آپ کی رائے میں غالب نے بیدل کو سمجھا ہی نہیں۔ آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ بیدل کا تصوف *Dynamic* (حرکی) ہے اور غالب کا *Static* (سکونی)۔

ڈاکٹر صاحب *Inclined to Static* (مائل بہ سکوں)

میں۔ جی ہاں۔ اس سے آپ کا کیا مطلب تھا؟

ڈاکٹر صاحب۔ بیدل کے کلام میں خصوصیت کے ساتھ حرکت پر زور ہے۔ یہاں تک کہ اُس کا معشوق بھی صاحب خرام ہے اس کے برعکس غالب کو زیادہ تر اطمینان و سکون سے اُلفت ہے۔ بیدل نے ایک شعر لکھا ہے جس میں "خرام می کاشت"[1] کی ترکیب استعمال کی ہے گویا سکون کو بھی بہ شکل حرکت دیکھا ہے۔ مثالیں اس وقت یاد نہیں ہیں۔ لیکن اگر آپ بیدل کا کلام پڑھیں تو بہت سے اشعار ہاتھ آجائیں گے۔ میں جن دنوں انار کلی میں رہتا تھا میں نے بیدل کے کلام کا انتخاب کیا تھا۔ وہ اب میرے کاغذوں میں کہیں اِدھر اُدھر مل گیا ہے۔ نقشبندی سلسلے اور حضرت مجدد الف ثانی سے بیدل کی عقیدت کی

---

[1] ڈاکٹر صاحب نے جس شعر کی طرف اشارہ کیا وہ یہ ہے :- ہر گہ دو قدم خرام می کاشت :- از انگشتم عصا بہ کف داشت

بنیادی بھی یہی ہے نقشبندی مسلک حرکت اور رجائیت پر مبنی ہے۔ (Dynamic and Optimistic) مگر چشتی مسلک میں قنوطیت اور سکون کی جھلک نظر آتی ہے (Pessimistic and Static) اسی وجہ سے چشتیہ سلسلے کا حلقۂ ارادت زیادہ تر ہندوستان تک محدود ہے مگر ہندوستان سے باہر افغانستان، بخارا، ترکی وغیرہ میں نقشبندی مسلک کا زور ہے۔ دراصل زندگی کے جس جس شعبے میں تقلید کا عنصر نمایاں ہے۔ اس میں حرکت مفقود ہوتی جاتی ہے۔ تصوف تقلید پر مبنی ہے۔ سیاسیات، فلسفہ، شاعری، یہ بھی تقلید پر مبنی ہیں۔ لیکن نقشبندی سلسلے کے شعرا مثلاً ناصر علی سرہندی کو دیکھئے۔ ناصر علی کی شاعری تقلیدی نہیں ہے۔ اسی لئے حرکت والی قوموں میں وہ زیادہ ہر دلعزیز ہے۔ ہندوستان میں ناصر علی کی کچھ زیادہ قدر نہیں ہے۔ لیکن افغانستان اور بخارا کے اطراف میں لوگ اس کی بہت زیادہ عزت کرتے ہیں بیدل کو بھی افغانستان کے لوگ بہت مانتے ہیں۔

مَیں۔ اس کے کلام کے حرکی عنصر کی وجہ سے؟

ڈاکٹر صاحب۔ (مسکراتے ہوئے) میرا خیال ہے کہ بیدل کے کلام کو سمجھنے میں انہیں مشکل پیش آتی ہے اس لئے

سعید اللہ۔ اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جو غالب نے شروع شروع میں بیدل کی طرح مشکل گوئی کی؟ کیا یہ صرف اس دعوے کے لئے کہ مَیں بھی مشکل لکھ سکتا ہوں؟

اس موقع پر مہر صاحب نے سالک صاحب کی طرف دیکھا اور دونوں صاحبوں نے بہ اتفاق ڈاکٹر صاحب سے رخصت کی اجازت چاہی۔ چنانچہ قبل اس کے کہ ڈاکٹر صاحب سعید اللہ کے سوال کا جواب دیں کہ "ہاں جوانی میں انسان طبعاً مشکل پسند ہوتا ہے" دونوں حضرات ڈاکٹر صاحب کی خواب گاہ سے نکل کر ڈرائنگ رُوم تک جا پہنچے تھے۔ ان کی رفت وبرخاست کی وجہ سے گفتگو میں قدرتاً ایک اور وقفہ آیا۔ اس کے بعد سعید اللہ نے کہا "آج کل ہندوستان کے نیشنل[1] انتھم کے متعلق بڑی بحث ہو رہی ہے۔ آپ کی اس مسئلے کے متعلق کیا رائے ہے؟"

ڈاکٹر صاحب:۔ "نیشنل انتھم" تو اُس صورت میں ہو کہ کوئی "نیشن[2]" ہو۔ جب سرے سے "نیشن" ہی کا کوئی وجود نہیں ہے۔ تو "نیشنل انتھم" کہاں ہو سکتا ہے۔ میری تو یہ رائے ہے کہ ہندوستان کو کسی "نیشنل انتھم" کی ضرورت ہی نہیں ہے۔"

سعید اللہ۔ "بندے ماترم" پر بڑا اعتراض یہ ہے کہ ایک تو یہ بنگالی ہے۔ دُوسرے اس کے آہنگ میں گرمی نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب۔ (ذرا گرمی سے) آپ ہندوؤں کی شاعری میں گرمی ڈھونڈتے ہیں! ہندو شاعری کے تمام دفتر

[1] قومی ترانہ [2] قوم

دیکھ ڈالیئے۔ کہیں گرمی نظر نہیں آئے گی۔ ہندو کو ہر جگہ شانتی کی تلاش ہے۔ ہندوؤں کی ادبی پیداوار میں بہر نہج دیکھ اس کی صرف ایک استثنا ہے۔ رامائن، اور وہ بھی بعض بعض حصّوں میں۔

عبدالواحد :۔ مگر ہندوستان کی موسیقی تو خاصی ہیجان انگیز ہے۔ قوالی میں یہی موسیقی کافی گرمی پیدا کر دیتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب ۔ میں اسے مصنوعی گرمی کہتا ہوں جس طرح کسی قسم کے نشے سے کوئی شخص طبیعت میں ہیجان پیدا کر لے۔

عبدالواحد ۔ کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ وجد و حال کی کیفیت مصنوعی ہے ؟ مثلاً ہمارے ہاں سیالکوٹ میں نوشا ہیوں کا میلہ ہوتا ہے ۔ وہاں قوالی سے بعض لوگ یک دم حال میں آجاتے ہیں۔ کیا وہ آپ کے نزدیک محض دکھاوا ہے ؟

ڈاکٹر صاحب :۔ ان لوگوں نے وجد و حال کو ایک *Mores* (دستور) بنا لیا ہے۔ یہ کیفیت ان پر واقعی طاری ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ اپنے جوشِ جذبات کو اس طرح فرو کر لیتے ہیں، تو پھر ان میں باقی کچھ نہیں رہتا اور وہ جذبہ دوبارہ طاری نہیں ہوتا۔ دراصل مسلمان جب عرب سے نکلے اور انہیں باہر کی قوموں سے سابقہ پڑا تو صوفیہ نے ان قوموں کی طبعی نسائیت کا لحاظ کرتے ہوئے قوالی اور موسیقی کو اپنے نظام میں شامل کر لیا۔ نسائیت سے مراد فالتو جذبات ہیں ۔ ایران اور ہندوستان میں فالتو جذبات کی کثرت ہے ۔ اور حال انہیں فالتو جذبات کے اخراج کا ایک ذریعہ ہے۔ صوفیوں کے سلسلوں میں قوالی کو جو دخل ہے وہ صرف اسی وجہ سے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی موسیقی کا کوئی وجود ہے ہی نہیں۔ اس وقت تمام اسلامی ممالک میں اپنا اپنا مقامی فنِ موسیقی رائج ہے، مسلمان جہاں جہاں پہنچے وہیں کی موسیقی اُنھوں نے قبول کر لی۔ اور کوئی اسلامی موسیقی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ یہ واقعہ ہے کہ فنِ تعمیر کے سوا فنونِ لطیفہ میں سے کسی میں بھی اسلامی رُوح نہیں آئی۔ اسلامی تعمیرات میں جو کیفیت نظر آتی ہے وہ مجھے اور کہیں نظر نہیں آئی۔ البتہ پچھلی مرتبہ یورپ سے واپسی پر مصر جانے کا اتفاق پیش آیا۔ اور وہاں قدیم فرعونوں کے مقابر دیکھنے کا موقع مِلا۔ ان قبروں کے ساتھ مدفون بادشاہوں کے بُت بھی تھے۔ جن میں قوت اور ہیبت کی ایک ایسی شان تھی۔ جس سے میں بہت متأثر ہؤا۔ قوت کا یہی احساس حضرت عمرؓ کی مسجد اور دلّی کی مسجد قوۃ الاسلام بھی پیدا کرتی ہے۔ بہت عرصہ ہؤا جب میں نے مسجد قوۃ الاسلام کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ مگر جو اثر میری طبیعت پر اس وقت ہؤا وہ مجھے اب تک یاد ہے، شام کی سیاہی پھیل رہی تھی۔ اور مغرب کا وقت قریب تھا۔ میرا جی چاہا کہ مسجد میں داخل ہو کر نماز ادا کروں۔ لیکن مسجد کی قوت و جلال نے مجھے اس درجہ مرعوب کر دیا کہ مجھے اپنا یہ فعل ایک جسارت سے کم معلوم نہ ہوتا تھا۔ مسجد کا وقار مجھ پر اس طرح چھا گیا کہ میرے دل میں صرف یہ احساس تھا

کہ میں اس مسجد میں نماز پڑھنے کے قابل نہیں ہوں۔

اُندلس کی بعض عمارتوں میں بھی اسلامی فن تعمیر کی اس خاص کیفیت کی جھلک نظر آتی ہے لیکن جوں جوں قومی زندگی کے قوائے شل ہوتے گئے، تعمیرات کے اسلامی انداز میں ضعف آتا گیا۔ وہاں کی تین عمارتوں میں مجھے ایک خاص فرق نظر آیا۔ قصر زہرا دیووں کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔ مسجد قرطبہ مہذب دیووں کا مگر الحمرا محض مہذب انسانوں کا!"

پھر ایک تبسم کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

"میں الحمرا کے ایوانوں میں جا بجا گھومتا پھرا، مگر جدھر نظر اٹھتی تھی دیوار پر "ھُوَ الْغَالِبُ" لکھا ہوا نظر آتا تھا۔ میں نے دل میں کہا، یہاں تو ہر طرف خدا ہی خدا غالب ہے۔ کہیں انسان غالب نظر آئے تو بات بھی ہو۔"

اس کے بعد پھر تھوڑی دیر تک ہندوستان کی اسلامی عمارات کا ذکر ہوتا رہا۔ تاج محل کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:۔

"مسجد قوۃ الاسلام کی کیفیت اس میں نظر نہیں آتی۔ بعد کی عمارتوں کی طرح اس میں بھی قوت کے عنصر کو ضعف آگیا ہے، اور در اصل یہی قوت کا عنصر ہے جو حسن کے لئے توازن قائم کرتا ہے۔"

سعید اللہ۔ دلی کی جامع مسجد کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

ڈاکٹر صاحب۔ وہ تو ایک بیگم ہے!

ہم اس فقرے پر ہنسے اور ڈاکٹر صاحب بھی ہمارے ساتھ شریک ہو گئے۔ اس منزل پر اسلامی تعمیرات کے متعلق یہ دلکشا بحث ختم ہوئی۔ اب شام کے ساڑھے سات بج چکے تھے، اور تین گھنٹے کی اس مسلسل نشست کو طول دینا کچھ ایسا مناسب بھی نہیں تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو اُن "مشورہ طلب" نگاہوں سے دیکھا جنہیں ہم نے معمولاً ڈاکٹر صاحب سے اجازت لینے کا پیش خیمہ قرار دے رکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے حسب معمول ہم سے کہا "اچھا! چلتے ہیں آپ؟" اور اس کے بعد ہم رخصت ہوئے۔

حمید احمد خاں

"تاریخ علامہ"

۱۳۵۷ھ

رخت بربست از جہاں اقبالِ ما	آں امینِ سوزِ مشتاقی نماند
ما تہی پیمانہ واماندیم حیف!	آں قدح بشکست و آں ساقی نماند
در مسافر "گفت خود سالِ وفات	"صدق و اخلاص و صفا باقی نماند"

۱۳۵۷ھ

حفیظ ہوشیارپوری

کے علامہ مرحوم کی اکر مثنوی

جہاں نما

اُردو اور اتحادِ ہندو مُسلم

اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کی اُس ناچاقی کے اسباب پر غور کیا جائے جو اس مُلک کی ذلّت اور غلامی کا موجب بنی ہوئی ہے تو اس کا سب سے بڑا سبب یہی نظر آتا ہے کہ گزشتہ ایک ہزار سال کے قرب کے باوجود بھی یہ دونوں قومیں ایک دوسری کو سمجھ نہیں سکیں اور ایک قوم دوسری کے جذبات و محسوسات اور خیالات و عقاید سے اتنی ہی بیگانہ ہے جتنی سمندر پار کی کوئی قوم۔

مُغلوں کے دورِ حکومت میں یہ دونوں قومیں ایک دوسری سے کسی قدر قریب آگئی تھیں اور نتیجۃً ایک مشترک کلچر بھی پیدا ہُوا تھا جس کا ذریعۂ اظہار اُردو زبان تھی۔ خیال یہ تھا کہ آئندہ چل کر اُردو زبان اتحادِ ہندو مُسلم کا سنگم قرار پائے گی لیکن عیار دشمنوں کی پرکاری اور نادان دوستوں کی سادگی آجکل اُسی زبان کو جو اس مُلک میں بسنے والی اِن دو عظیم الشان قوموں کو ایک دوسری سے قریب ترلا رہی تھی صفحۂ ہستی سے مٹا دینے پر تُلی ہوئی ہے۔

حال ہی میں سر تیج بہادر سپرو نے جماعتی فسادات کا تذکرہ کرتے ہوئے کیا خوب کہا ہے کہ ہندوستانی اگر دل سے چاہتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان متحد ہو جائیں تو اُنہیں چاہئے کہ وہ اُردو زبان کو ملکی زبان بنائیں، اِس کی اصلاح و ترقی کی کوشش کریں اور بلا تمیزِ مذہب و ملّت اسے ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلا دیں۔

سر تیج بہادر سپرو نے اسی سلسلے میں یہ حقیقت بھی بیان کی کہ "اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی زبان ہے دونوں قوموں نے مِل کر اسے پیدا کیا اور اب دونوں کا فرض ہے کہ اسے ترقی دیں اور پھیلائیں۔ آخر میں سر سپرو نے فرمایا کہ "اُردو زبان محض اس لئے وجود میں آئی تھی کہ اس کے ذریعے سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کیا جا سکے۔ اب یہ کس قدر رنج کا مقام ہے کہ خود یہی ذریعۂ اتحاد بنائے نفاق بنا ہُوا ہے اور اتحاد و ترقی کی کوششوں کے بجائے اس مُلک کے گوشے گوشے میں ع

یا بحث ہے اُردو ہندی کی یا قربانی یا جھٹکا ہے

مغلوں کے عہد میں ہندوستان کی خوشحالی

فرانسیسی سیاح برنیر نے اورنگ زیب کے عہدِ حکومت میں ہندوستان کی سیاحت کی۔ اُس نے ہندوستان میں جو خوشحالی

اور فراغ بالی کا مشاہدہ کیا اس کا اندازہ ذیل کی چند سطور سے ہو سکتا ہے جو اس نے سرزمینِ بنگالہ کی زرخیزی اور دولت مندی کا تذکرہ کرتے ہوئے سپردِ قلم کی ہیں :-

"تاریخ کے ہر دَور میں یہ خیال عام رہا ہے کہ مصر دُنیا کا سب سے زیادہ زرخیز خطہ ہے اور آج کل کے مستفین بھی یہی کہتے ہیں کہ دُنیا کا کوئی دوسرا خطہ قدرت کے انعامات سے مصر کی طرح مالامال نہیں۔ لیکن بنگال کی سلطنت کی سیاحت کے سلسلے میں دو دفعہ جو معلومات مجھے حاصل ہوئی ہیں اُن کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے میں بلا تامل یہ کہہ سکتا ہوں کہ دُنیا میں زرخیزی کے لحاظ سے جو مرتبہ مصر کو دیا گیا ہے اس کا اصلی حقدار بنگال ہے۔ یہاں چاول اس کثرت سے پیدا ہوتے ہیں کہ اندرونی ضروریات کو پورا کرنے کے بعد ان سے نہ صرف ہمسایہ خطوں کی بلکہ دُور دُور کے علاقوں کی طلب پوری کی جاتی ہے۔ شکر بھی یہاں اس کثرت سے پیدا ہوتی ہے کہ اس سے نہ صرف گولکنڈہ اور کرناٹک کی سلطنتوں کی ضروریات پوری ہوتی ہیں (کیونکہ ان کے ہاں خود بہت کم شکر پیدا ہوتی ہے) بلکہ بنگال کی شکر ہی عرب، عراق اور بندر عباسی کے راستے سے ایران کو بھی بھیجی جاتی ہے۔ بنگال مٹھائی کے لئے بھی خاص طور پر مشہور ہے۔ مُلکی ضروریات کے مطابق گیہوں کی کاشت بھی کی جاتی ہے اور اس سے ارزاں بسکٹ بھی بنا کر فروخت کیے جاتے ہیں۔ عوام کی عام خوراک مختلف قسم کی سبزی، چاول اور مکھن ہے اور ان چیزوں کی قیمت بالکل بے حقیقت ہے۔ ایک روپے میں بیس یا اس سے بھی زیادہ مُرغیاں مِل جاتی ہیں۔ ہر قسم کی تازہ اور خشک مچھلی کی بھی اتنی ہی افراط ہے۔ مختصر یہ کہ بنگال میں ہر قسم کی ضروریاتِ زندگی نہایت کثرت سے موجود ہیں۔ میں نے اور کسی ملک میں ہر چیز کی اتنی بہتات نہیں دیکھی۔ قیمتی پیداوار میں شکر کے علاوہ ریشم اور کپاس کی وہ کثرت ہے کہ بنگال کو ہم نہ صرف تمام ہندوستان یا سلطنتِ مغلیہ کی ضروریات کا کفیل قرار دے سکتے ہیں بلکہ یورپ کی ضروریات کا کفیل بھی کہہ سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا کہ کس کثرت سے بنگال کا ریشمی یا سوتی، سفید یا رنگین موٹا یا باریک کپڑا لاہور اور کابل تک تمام سلطنتِ مغلیہ میں بھیجا جاتا ہے اور اس کے علاوہ کتنی بڑی مقدار میں اس کی برآمد غیر ممالک کے لئے بھی کی جاتی ہے۔ بنگال کی اسی زرخیزی کو مدِ نظر رکھ کر پرتگالی، ولندیز اور انگریز کہا کرتے ہیں کہ "بنگال میں داخل ہونے کے لئے سینکڑوں دروازے ہیں لیکن باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔"

ابراہام لنکن

۱۸۴۲ء کے نوروز کی تقریب پر سپرنگ فیلڈ (امریکا) میں مسز ایڈورڈز کے گھر میں بہت گہما گہمی اور چہل پہل نظر آتی تھی اُس شام مسز ایڈورڈز کی بہن میری ٹاڈ کی شادی ہونے والی تھی جس کی خوشی میں رات کی ضیافت اور اس کے بعد رقص کی محفل کا اہتمام

۱؎ قومی ترانہ ۲؎ قوم

بھی ہو رہا تھا۔

دُلہن تیار ہو چکی اور مہمانوں کی آمد کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا لیکن اب تک دُولہا کہیں نظر نہ آتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد لوگ دُولہا کی تلاش میں نکل گئے کیونکہ وہ غائب تھا۔

اپنی اس توہین اور ذلت سے متاثر ہو کر میری ناؤ جا کر اپنی خوابگاہ کے دروازے بند کر کے بیٹھ گئی۔ مہمان چہ میگوئیاں کرتے ہوئے واپس چلے گئے۔ کھانے کو کسی نے ہاتھ بھی نہ لگایا اور رقص کا کمرہ بھائیں بھائیں کرنے لگا۔ یکے بعد دیگرے گھر کے کمروں کے چراغ بجھنے لگے اور گھر والے اپنی اپنی خوابگاہوں میں چلے گئے۔

دُولہا کہاں تھا؟ وہ رات کے وقت ایک جنگل میں پھر رہا تھا۔ اس کے دل میں دو مختلف جذبات کے درمیان ایک زبردست جنگ ہو رہی تھی، زندہ سے پاس عہد اور مُردہ سے پاس وفا کے متصادم جذبات اسے کسی طرح چین نہ لینے دیتے تھے۔

وہ ایک لڑکی کے غمناک تصور میں ڈوبا ہوا تھا — سیاہ چشم اور چنچل میری ناؤ نہیں بلکہ ایک غریب سرائے دار کی نوخیز، شیریں حرکات لڑکی این رٹلیج۔ یہ نیلی آنکھوں اور سُرخی مائل بھورے بالوں والی ایک دُبلی پتلی خوبصورت لڑکی تھی، لوگ کہا کرتے تھے اس کا دِل فرشتوں کی طرح معصوم اور پاکیزہ ہے۔

پریشان حال نوجوان دل میں کہہ رہا تھا، اب این واقعی فرشتوں میں شامل ہو چکی ہے۔ مرنے کے وقت این نے اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ مرنے سے چند ہی دن پہلے این نے اُس پر اپنی محبت کا راز افشا کیا تھا۔ نوجوان کا سر جھک گیا۔ تاریکی میں بتیس سال کا یہ جوان آہستہ آہستہ اپنے بوجھل پاؤں گھسیٹ رہا تھا۔ وہ دِل میں کہہ رہا تھا" میں بھی کتنا احمق ہوں، جاہ پرستی نے مجھے گمراہی کے جال میں پھنسا لیا ہے۔

وہ ایک وکیل اور حکومت کی مجلس وضع قوانین کا رُکن تھا لیکن اس کے پاس نہ دولت تھی، نہ خاندانی اعزاز، وہ امریکا کے بہت ادنیٰ طبقے سے اُٹھا تھا اور بیچارے نے نہایت محنت و مشقت سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے والدین کا تعلق سوسائٹی کے اس طبقے سے تھا جسے امریکا کے حبشی غلام بھی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

اسے اب تک اپنی ماں لوسی ہینکس یاد تھی، اگرچہ جب اس کا انتقال ہوا اس کی عمر دس سال سے زیادہ نہ تھی۔ یہ عورت ورجینیا کے ایک زمیندار کی غیر قانونی بیٹی تھی۔ اس کو مذہب سے بہت لگاؤ تھا اور ہر وقت گہرے خیالات میں ڈوبی رہتی تھی۔ بیٹے کو بھی ماں کی سی طبیعت ورثہ میں ملی چنانچہ ایک زمانے میں اس نے یہ الفاظ کہے تھے "میری ماں پر خدا کی رحمتیں نازل ہوں، میں جو کچھ بنا یا آئندہ بنوں گا اس کے لئے میں اپنی ماں کا ممنونِ احسان ہوں۔"

وہ اس قدر غریب تھے کہ جس چوبی جھونپڑی میں رہتے تھے اس میں دیا بھی نہ جلا سکتے تھے۔ اِن کے ہاں صرف ایک

کتاب تھی یعنی انجیلِ مقدس - یہ لڑکا جسے آیندہ چل کر وکیل بننا تھا، چولہے کے سامنے لیٹ جاتا اور اس کی لو میں ایک لکڑی کے تختہ پر کوئلے سے لکھنا سیکھتا -

جب یہ ذرا بڑا ہوا تو بہت طاقتور نکلا - ایک مدت تک درخت کاٹتا اور لکڑی کے جنگلے بنا کر اپنا پیٹ پالتا رہا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ طرح طرح کی سختیاں جھیل کر اپنی تعلیم کا بھی انتظام کرتا رہا - آخر اس تمام محنت و مشقت کا نتیجہ کامیابی کی صورت میں ظاہر ہوا -

مگر آج یہ صورت تھی کہ وہ اس عورت کی رسوائی کا موجب بنا ہوا تھا جو اس کی شادی کی درخواست منظور کر چکی تھی - وہ دل میں کہہ رہا تھا "کاش میں شادی کی درخواست نہ کرتا یا کاش وہ اسے منظور نہ کرتی" اصل میں دونوں جاہ پرست تھے - محنت کش وکیل نے معاشرہ میں بلند حیثیت حاصل کرنے کے خیال سے اس عالی نژاد حسینہ کے سامنے شادی کی تجویز پیش کی اور دوراندیش لڑکی یہ بھانپ چکی تھی کہ اس نوجوان کے سینے میں وہ چنگاری دبی ہے جسے ہوا دے کر میں اپنے نام کو شہرت و عظمت کے آسمان کا درخشندہ ستارہ بنا سکتی ہوں -

لیکن اس وقت جنگل میں یہ نوجوان خودکشی کا ارادہ کر رہا تھا -

دوسرے دن دوستوں نے اس کو ڈھونڈ پایا اور اسے ساتھ لے کر گھر پہنچے - اس کے بعد کئی دن تک اس کی کڑی نگرانی کی گئی کہ یہ کہیں خودکشی نہ کر لے -

آخر نوجوان دوبارہ اپنے کاروبار میں لگ گیا اور ایک خیرخواہ خاتون کی کوشش کے طفیل میری ٹاڈ سے اس کی مصالحت ہو گئی اور پھر یہ دونوں دولہا دلہن بھی بن گئے -

دولہا کے دل میں مسرت کی کوئی رمق نہ تھی لیکن وہ احساسِ فرض کے خیال سے مجبور تھا - ایک چھوٹے لڑکے نے اسے شادی کا لباس پہنے ہوئے دیکھ کر سوال کیا "آپ کہاں جا رہے ہیں؟" اس نے جواب دیا "شاید جہنم کو جا رہا ہوں"

آخر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے شادی کے رجسٹر پر دستخط کئے ——— ایبراہام لنکن -

میری ٹاڈ کو وہ مرتبہ حاصل ہوا جس کا اس کی جاہ پسندی نے بھی خواب تک نہ دیکھا تھا - وہ ملک کی سب سے بڑی خاتون کی حیثیت سے "وائٹ ہاؤس" میں رہی لیکن لنکن اس کی کوششوں سے نہیں بلکہ اپنی ذاتی قابلیت سے "صدر جمہوریہ امریکا" کے مرتبہ تک پہنچا -

لنکن نے ایک نہایت نازک دور میں صدارت کا منصب حاصل کیا - امریکا کی خانہ جنگی کے دوران میں اس نے شمالی علاقے کی قیادت کی اور یونین کو بچا لیا - اس نے غلاموں کو آزاد کیا اور کامیاب ہو جانے کے بعد وہ ایک قاتل کی گولی سے ہلاک ہو گیا -

آج اپنے کارناموں کی وجہ سے اس کا شمار دنیا کی چند بڑی بڑی شخصیتوں میں کیا جاتا ہے -

حامد علی خاں

انجام

لو میں بیان کرتا ہوں تفصیلِ آرزو

جب میں جوان تھا مری دُنیا جوان تھی
دل تھا پھنسا ہُوا کسی دامِ نگاہ میں

جب حُسن و عشق پر تھا مرا انحصارِ زیست
ارمان پل رہے تھے کسی جلوہ گاہ میں

ایمان و کُفر سے مرا دِل بے نیاز تھا
اور تھا میں سربسجدہ محبّت کی راہ میں

خاکِ درِ حبیب میں تھی اس قدر کشش
ملتی نہ تھی یہ بات کسی بارگاہ میں

تھی مجھ کو آرزو کہ یہ دُنیا بنے بہشت
بس جائے حُسنِ ساقیِ مہوش نگاہ میں

ہونے نہ دی زمانے نے تکمیلِ آرزو

فطرس نقوی احسانی

غزل

بیٹھے تھے اُن کی یاد میں کل بیخبر سے ہم
وہ آئے اور کہا پلٹ آئے سفر سے ہم

کیسے چھپائیں دل کی لگی سارے گھر سے ہم
کب تک چرائیں آنکھ تمہاری نظر سے ہم

تذلیلِ شانِ ضبط سہی، یہ محال ہے
گزریں نہ صبح و شام تری رہگذر سے ہم

کافر نگاہیوں کا سبب حُسنِ دلفریب
اس "مبتلا" کو کیوں نہ سمجھ لیں "خبر" سے ہم

کعبہ کا طوف فرض، مگر اس کا کیا علاج
کچھ عہد کر چکے ہیں کسی سنگِ در سے ہم

انجامِ اعتمادِ وفا کچھ نہ پُوچھئے
کرتے ہیں مشورہ دلِ نامعتبر سے ہم

چھائی ہے حسرتوں کی گھٹا اُس مقام پر
پیتے تھے جامِ عشق جہاں اُس نظر سے ہم

یارائے ضبطِ دردِ جدائی نہیں رہا
اے حُسن ہوشیار! نکلتے ہیں گھر سے ہم

اوراقِ سادہ ہوتے ہیں لمحاتِ عمر شاد
رنگتے ہیں ان کو سُرخیٔ خونِ جگر سے ہم

شاد عارفی

بدصُورتی

اسے میری بدذوقی سمجھئے یا عامیانہ روش سے بچ کر چلنے کی عادت، بہرصورت یہ ایک حقیقت ہے کہ میں بدصورتی کو ہمیشہ خوبصورتی پر ترجیح دیتا ہوں، خوبصورت چیزیں دیکھ کر میں ہمیشہ اپنے دل میں یہ سوچتا ہوں کہ خوبصورتی تو ایک عارضی شے ہے شفق کی طرح جلد مٹ جانے والی، توس قزح کی طرح گم ہو جانے والی، لیکن وہ چیز جو ہمیشہ قائم رہتی ہے، وہ جس پر ہمارے حسیات بھروسا کر سکتے ہیں جس کے متعلق کوئی قطعی رائے قایم کی جا سکتی ہے۔ وہ صرف ایک چیز ہے، اور وہ ہے بدصورتی اور اس دُنیا میں تو ہر شے چاہے اُس کی ابتدائی صورت کتنی ہی روشن اور دلپذیر کیوں نہ ہو اپنے انجام کو پہنچ کر بالضرور بدصُورت بن جاتی ہے، پھول مرجھا جاتے ہیں، عورتیں بوڑھی ہو جاتی ہیں شفق رات کے اندھیرے میں تبدیل ہو جاتی ہے ___ لیکن بدصُورتی ہمیشہ قایم رہتی ہے، شروع سے لے کر آخر تک۔ تو پھر کیوں اُن چیزوں کی طرف توجہ دی جائے، جو عارضی ہیں، وقتی اور ناپائدار، اور بشر اپنے دل کو اُن چیزوں کی طرف کیوں نہ مائل کرے جن کی حیثیت ابدی و دوامی ہے، جو کبھی بدل نہیں سکتیں، جن کی ہیئت میں کبھی انقلاب نہیں آسکتا، جو قدرت کے قانون کی طرح اٹل ہیں۔

بدصورتی کے متعلق میرے خیالات کسی صوفیانہ لغزش کا نتیجہ نہیں، ان کی اساس خالصۃً فلسفیانہ ہے، اسے مذہب، آرٹ اور اس قسم کی دیگر باتوں سے کوئی تعلق نہیں، خوبصورتی کے متعلق آپ دیکھیں گے کہ یہ ایک اعتباری اصطلاح ہے جس کے متعلق کبھی کوئی قطعی رائے نہیں دی جا سکتی، یہ کہنا تو بہت مشکل ہے کہ فلاں چیز حسین ہے، لیکن کسی بدصُورت چیز کے متعلق ہر وقت اور ہر لمحہ نہایت وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ بدصورت ہے۔ اور یہی بدصُورتی کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ علاوہ ازیں بدصورتی زندگی اور کائنات کا جزوِ لاینفک ہے، اس کے بغیر خوبصورتی ایک لمحہ نہیں جی سکتی۔ حُسن کی بنیادیں بدصُورتی پر استوار ہوتی ہیں، اور اس لحاظ سے بدصُورتی بھی ایک طرح کا حُسن ہی ہے۔ آئن سٹائین کے اضافی نظریہ سے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے، اور شاید اسی نظریہ کے ماتحت ہمیشہ دُنیا میں سکھ کے ساتھ دُکھ، پھول کے ساتھ کانٹے اور خوبصورت عورتوں کے ساتھ بدصُورت مرد رہتے ہیں۔

رُوحانی نقطۂ نظر سے بھی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ دُنیا میں اصلی حُسن صرف بدصُورتی میں ہے۔ مثال کے طور پر آپ دُنیا کے بڑے بڑے آدمیوں کی صُورتوں کی طرف توجہ کیجئے، آپ دیکھیں گے کہ صرف بدصورت آدمی ہی دنیا کے "بڑے آدمی" بنتے ہیں۔ بچارے خوبصورت آدمی تو عام طور پر فوج میں سپاہی بھرتی ہوتے ہیں اور بدصُورت آدمی اُن پر

حکومت کرتے ہیں، دُور کیوں جایئے ہندوستان کے گیارہ صوبوں کی اسمبلیوں کے ممبروں کی صورتیں ملاحظہ کیجئے، سوائے چند مستثنیات کے باقی سب وہ ہیں جنہیں دیکھ کر بے اختیار خدا کی قدرت یاد آتی ہے، میں یہ بات نہایت سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں، کیونکہ میرا اعتقاد ہے کہ بڑائی صرف بدصورت آدمیوں کی قسمت میں لکھی ہوتی ہے، چنانچہ اس بیسویں صدی میں جب مردوں اور عورتوں کو حسین بنانے کے لئے سینکڑوں طریقے برتے جارہے ہیں، میں یہ دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہوں کہ دُنیا کے بڑے بڑے رہنما بڑے بڑے امیر، فوج کے جرنیل، ادیب، فلسفی، سائنسدان بے حد بدصورت واقع ہوئے ہیں۔

× × × × × × ×

دراصل مجھے بدصورتی سے ایک گونہ عشق سا ہوگیا ہے، لوگ تو خوبصورت عورتوں پر مرتے ہیں، میں بدصورت عورتوں کو دیکھ دیکھ کر جیتا ہوں، اور جب کبھی میرے گھر میں میرے بیاہ کے متعلق کچھ بات چیت شروع ہوتی ہے تو میں کچھ گھبرا سا جاتا ہوں اور اکثر نوجوانوں کی طرح جو ان موقعوں پر لڑکی کیسی ہے؛ خوبصورت ہے نا؛ رنگ کیسا ہے؛ قد و قامت؛ اور اس قسم کے سوالوں کا تانتا باندھ دیا کرتے ہیں، میں بھی 'اول جلول' بکنے لگ جاتا ہوں، مثلاً

"لڑکی بدصورت ہے نا؟"

"ہاں"

لیکن محض "ہاں" سے میری تسلی نہیں ہوتی، چنانچہ میں پھر سوال کرتا ہوں

"کیا اُس کی جلد بالکل سیاہ ہے، سیاہ جیسے اماوس کی رات

"ہاں، ہاں، اطمینان رکھو"

"اور دانت؟"

"میلے اور سُرخ! شاید پان بہت کھاتی ہیں"

"بہت خوب، . . . . اچھا! . . . . مگر یہ تو بتاؤ کہ اس کی آنکھیں کیسی ہیں؟"

"آنکھیں؟ آنکھیں تو ذرا بڑی بڑی سی ہیں، چہرے پر بھلی معلوم ہوتی ہیں اور بال بھی تو گھنگر یالے ہیں . . ."

"چچ . . . چ . . . چ . . . میں ہاتھ ملتے ہوئے کہتا ہوں، "یہ تو بہت بُری بات ہے"۔

اور اس طرح یہ ناطہ ٹوٹ جاتا ہے۔

اسی طرح کئی ناطے آئے، مگر ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نقص موجود تھا، کسی کا رنگ کھلتا ہوا تھا، تو کسی کی ناک ستواں، کسی کی کمر پتلی تھی، تو کوئی سرو قد، غنچۂ اُمید کھلا پر نہ کھلا۔ اور گو اب میری عمر تیس سے کچھ اُوپر ہے اگر پھر بھی پُر اُمید

ہوں اور ایک ایسی عورت کی تلاش میں ہوں جو کامل بدصورت ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک بار ! ۔ ۔ ۔ ۔ منٹو پارک لاہور کی نمائش میں ایک ایسی عورت دیکھی تھی جس کے متعلق میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ "وہ ہے میرے خوابوں کی محبوبہ"۔ لیکن افسوس کہ وہ بھی کسی کی بیاہتا نکلی !

× × × × × × × × ×

بدصورتی کے خلاف اگر کوئی دلیل دی جاسکتی ہے تو وہ ہے شاعروں کی شاعری، شاعر لوگ شعر کہتے ہیں تو صرف حسین چیزوں کی تعریف میں۔ حسین عورتیں، حسین پھول، حسین وادیاں، بس یہی ان کے موضوع ہیں۔ کیا کبھی کسی شاعر نے مگرمچھ کی شان میں بھی طبع آزمائی کی؟ کسی بدصورت عورت کو دیکھ کر کبھی کسی شاعر کے شاعرانہ جذبات کو تحریک ہوئی؟ اگر نہیں تو بس پھر بدصورتی ایک بیکار شئے ہے"۔ کچھ اس قسم کے دلائل بدصورتی کے خلاف شاعر مزاج لوگوں کی طرف سے دیئے جاتے ہیں، لیکن ان دلایل پر زیادہ غور و فکر کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ شاعر لوگوں سے تو یہ توقع ہی نہیں کی جاسکتی کہ وہ کبھی سطحی اور جذباتی حرکتوں سے بے نیاز ہو کر اس اہم سوال کے حسن و قبح پر غور کرسکیں، اس کے علاوہ وہ تو محض خوبصورتی کے گن گانے کے سبب کما کھاتے ہیں، اگر آج لوگ بدصورتی کی اہمیت کو سمجھ جائیں تو یہی شاعر لوگ جو آج بلبلوں اور گلاب کے پھولوں پر جان چھڑکتے ہیں کل کوے اور بھنگ کی کونپلوں پر طبع آزمائی کرنا شروع کردیں، ضرورت یہ ہے کہ پہلے آپ لوگوں کی ذہنیت میں تھوڑی سی تبدیلی واقع ہو لیکن میں اس پر بھی شاعروں کا اعتبار نہیں کروں گا۔ کیونکہ شعر کہنا بذاتِ خود ایک خوبصورتی ہے، اور خوبصورتی کا اعتبار کیا؟ خود شاعروں نے اپنے لاکھوں شعروں میں حسن کی بیوفائی اور خوبصورتی کی بے ثباتی کا رونا رویا ہے، پھر یہ لوگ کس طرح بدصورتی کے خلاف کچھ کہنے کی جرأت کرسکتے ہیں۔

× × × × × × ×

خوبصورتی فساد کی جڑ ہے، پتھر اور دھات کے زمانے سے لے کر آج تک خوبصورتی دنیا کے امن کو تباہ و برباد کرتی چلی آئی ہے خوبصورت چیزوں کے حصول کے لئے لوگوں نے اپنی جانیں گنوادیں، تہذیبیں مٹ گئیں، اور قومیں فنا ہوگئیں، لیکن ہم ہیں کہ اسی جنوں خیز وارفتگی سے پرانے راستے پر لڑھکے جارہے ہیں، خوبصورتی، خوبصورتی، خوبصورتی، اس دیوانگی کے جوش میں ہم نہیں سوچتے کہ امنِ عالم کیوں خطرہ میں ہے؟ وہ کیا چیز ہے جو اقوامِ عالم میں اتحاد نہیں ہونے دیتی؟ لوگ کیوں لڑتے ہیں؟ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر ذرا غور و فکر سے کام لیا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں بنائے نزاع محض خوبصورتی ہے، لوگ لڑتے ہیں خوبصورت چیزوں کے لئے، خوبصورت خیالوں کے لئے، خوبصورت عورتوں کے لئے، خوبصورت خطوں کے لئے، خوبصورت ملکوں کے لئے، اگر لوگ آج بدصورتی کی اہمیت کو سمجھ جائیں، تو امن قائم ہوسکتا ہے، گذشتہ دس بارہ ہزار سال کی انسانی زندگی میں خوبصورتی نے ہم پر جو قیامتیں ڈھائی ہیں تاریخ کے اوراق اس پر گواہ ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے، کہ ہم لوگ خوبصورتی کے مضر خواص سے واقف ہو جائیں، اور خوبصورت چیزوں کے لئے لڑنا جھگڑنا چھوڑ دیں۔ یہ فضول باتیں ہیں، آخر ہماری انسانی زندگی کی اساس خوبصورتی پر نہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی بدصورت قسم کی باتوں ہی پر ہے۔

کرشن چندر

دسمبر کی ایک رات

سوئی سوئی گھاس پر شبنم کا افسردہ لحاف
کھوئے کھوئے دشت پر محزون دھندلکوں کا غلاف

پھیکے پھیکے آسماں پر بکھری بکھری بدلیاں
جیسے لاٹھی کے سہارے رینگتے ہیں ناتواں

سر جھکائے اونگھتے ہیں دُور برگد کے درخت
یا معلق ہیں فضائے تیرہ میں دیووں کے تخت

پست قد پودوں میں ہلکی سرسراہٹ کی صدا
مانگتا ہے خواب میں جیسے کوئی مفلس دُعا

اوڑھ کر کہرے کی چادر سو رہے ہیں کوہسار
جیسے دن بھر کی کمائی کو گنیں سرمایہ دار

نیند کا جادُو اندھیرے گاؤں پر چھایا ہُوا
ہر جگہ مغموم - ہر نظّارہ گھبرایا ہُوا

سو رہے ہیں گرم ایوانوں میں شاہانِ جہاں
ڈھیلے ڈھالے جسم - انبارِ حریر و پرنیاں

اپنے حجروں میں ہیں واعظ پاؤں پھیلائے ہوئے
رٹ رہے ہیں خواب میں الفاظ دُہرائے ہوئے

گرم فرغل کو لپیٹے سو گئے ہیں پہرہ دار
میکدوں کی چھاؤں میں لیٹے ہوئے ہیں میگسار

مست ہیں اپنے گھروں میں شاعرانِ ذی وقار
جن کے باطن سرد اور تاریک - ظاہر تابدار

اپنے آسن پر ہی پنڈت جی کی گردن جھک گئی
بے تحاشا دوڑتی مالا اچانک رُک گئی

ہاں مگر بستی میں اک بیوہ ابھی بیدار ہے
درد کی شدت سے آنکھیں بھینچنا دشوار ہے

ذبح کرتا ہے اُسے دن رات بے غیرت سماج
غور کر - اے وہ کہ تیرے سر پہ ہے مذہب کا تاج

احمد ندیم قاسمی (بی اے)

احسن الکلام

دُنیائے عیش و غم کا مساوی حساب ہے
تصویرِ خواب وہ ہے، یہ تعبیرِ خواب ہے

پوچھو نہ مجھ سے کیوں تری حالت خراب ہے
سوچو! تمھارے پاس ہی اس کا جواب ہے

لطفِ حیات و عیش ہے جب تک شباب ہے
پھر زندگی نہیں ہے وبال و عذاب ہے

برباد ہیں، تباہ ہیں، آشفتہ حال ہیں
تم پر مٹے ہوؤں کی یہ مٹی خراب ہے

دُنیا کے حق میں ایک تری گردشِ نگاہ
اے عشوہ گر محرّکِ صد انقلاب ہے

دل توڑیئے کہ عہدِ وفا کیجیے شکست
ہر کام آپ کے لئے کارِ ثواب ہے

کچھ غم نہیں مجھے تری چشمِ عتاب کا
تو سامنے ہے، ذوقِ نظر کامیاب ہے

مایوس کر رہے ہیں وہ بے عرضِ مدّعا
گویا وہاں سوال سے پہلے جواب ہے

دُنیا ہے اِک نمائشِ خواب آفریں مگر
جو دیکھتے ہیں جاگتے ہیں وہ یہ خواب ہے

تلوار ہو کھچی ہوئی جیسے، اسی طرح
وہ حسن بے پناہ ہے، جو بے حجاب ہے

اللہ رے حُسنِ سادہ کی رنگینیٔ مذاق
گلکاریوں سے تختۂ گلشن، نقاب ہے

غمّاز، رازِ عشق کا ان کے سوا ہے کون
یا چشمِ تر ہے یا دلِ پُر اضطراب ہے

احسن کے دل کو خوب چُنا اپنے واسطے
یہ حُسنِ انتخاب ترا لاجواب ہے

احسن مارہروی

نگار خانۂ چین

موسم گرما کا آغاز

بانس کے درختوں کا سایہ گھنا ہو رہا ہے
پرندوں نے سہ پہر کی فضا کو گیتوں سے بھر دیا ہے
بہار آلوچے کے درختوں سے بے وفائی کر رہی ہے
آدمی تھک چکا ہے، کیونکہ طویل دن ختم نہیں ہوتا

(چو۔شو۔چین) ۹۰۰ء

وہ کہاں ہے؟

مَیں، ندّی کے کنارے
پہاڑ پر چڑھ رہا ہوں — بالکل تنہا
چاند کی شعاعیں لہروں پر رقصاں ہیں
پچھلے سال بھی میں یہی نظارہ دیکھ رہا تھا
لیکن اس وقت میرے ساتھ
وہ بھی تھی
ہر چیز اُسی طرح موجود ہے
لیکن دل کو جس کی تلاش ہے
وہ یہاں موجود نہیں

(چاؤ۔چیا) ۹۰۰ء

نگاہِ کرم

حسین لڑکیاں برآمدوں میں چہلیں کرتی پھرتی ہیں
ان کے گیتوں کی آواز بس چنگ ورباب کے نغموں سے کھیلتی ہوئی یہاں آرہی ہیں

ذرا ادھر تو آؤ اور بتاؤ کہ جس حسینہ پر آج کسی کی نگاہِ کرم پڑی ہے
اُس کی پلکیں کیا دوسری لڑکیوں سے زیادہ شوخ اور دراز ہیں ؟

(رہسیا فونگ) سنہ ۹۰۰ء

سبکدوشی کے بعد

اس مغرور اور صاف دل سابق وزیرِ اعظم کو
کسی سے دشمنی نہیں
اب وہ مغربی جھیل کے کنارے
بانس کے دروازوں والے مکان میں رہتا ہے
اسے اپنی پیشانی سرد کرنے کے لئے
کسی پنکھے کی ضرورت نہیں
کیونکہ جنوبی سرد ہوائیں
اسے چومتی رہتی ہیں
اور اس کی سرکاری ٹوپی
ساحل پر پڑی نہایت سُستی سے
مرغابیوں کی طرف دیکھتی رہتی ہے

(لی ۔ چیا ۔ یو) سنہ ۹۰۰ ۔ ۸۰۰ء

ایک قسم

اُنہوں نے قسم کھائی کہ ہُنوں[1] کو تباہ کر دینا چاہیئے
اگر ضرورت پیش آئی تو ہم سب اپنی جانیں قربان کر دیں گے . . . . . .
اور اب پانچ ہزار سال ان کے لاشوں کو ہڑپ کر چکے ہیں
اُن کی ہڈیاں دریا کے کنارے اِدھر اُدھر
بکھری پڑی ہیں

---

[1] ایک تُند خُو قوم

لیکن یہاں سے بہت دُور بسنے والے حسینوں کو
ان کی صُورتیں اب تک صاف دکھائی دیتی ہیں

(چین۔تاؤ) (۹۰۰-۱۰۰۰ء)

موقع

جام تمہارے ہاتھ میں ہے
گریز پا وقت کو بھاگنے سے روک لو
آخر تم ہی بتاؤ کہ زندگی میں
کتنی مرتبہ چاند سر پر آتا ہے

(نامعلوم)

ایک حقیقت

چاند کی شعاع نے
دریا کے بستر کو منوّر کر رکھا ہے
پانی کی رَو خواہ کس قدر تیز ہو
شعاع کو اپنے ساتھ نہیں بہا لے جاسکتی
بادل ہمارے سر پر اُڑے جا رہے ہیں
پہاڑ کی چوٹی ان سے کہیں زیادہ اُونچی ہے
لیکن اُنہیں آگے جانے سے نہیں روک سکتی

(الو۔چو۔چیہ) (۱۸۰۰ء)

مہدی علی خاں

خونِ پاک

ہے نورِ ایزدی کی جھلک خونِ گرم و پاک
انساں کے دل کو رکھتا ہے جو پاک و تابناک
بنتی ہے اس سے غیرتِ خورشید مشتِ خاک
شیطاں کی فوج ہوتی ہے اس تیغ سے ہلاک
پیکارِ زندگی میں یہی تیغِ تیز ہے
ہر ضرب جس کی شعلہ فشاں برق ریز ہے

ہے جوئے خونِ پاک کرن آفتاب کی
مستی ہیں اس کی لہریں ہیں موجیں شراب کی
اس میں تڑپ ہے نغمۂ تارِ رباب کی
رنگینیاں اسی سے ہیں بزمِ شباب کی
ظلماتِ غم میں خانۂ دل کا چراغ ہے
اس کی بہارِ حسن سے جی باغ باغ ہے

خوں سے دلوں میں چہرِ تمنا ہے لعل گوں
خوں سے فسوں ہے حسن کا اور عشق کا جنوں
امواجِ خوں سے بجتا ہے ہمت کا ارغنوں
افواجِ خوں کے سامنے افلاک ہیں زبوں
جس کی رگوں میں خوں ہے شرافت اسی کی ہے

دولت اسی کی اور حکومت اسی کی ہے

یہ سُرخ سُرخ چیز جسے کہتے ہیں لہُو　　عشقِ غیورِ پاک کی ہے اس سے آبرُو
سینوں میں اس سے اُٹھتا ہے طوفانِ آرزُو　　اس آب سے حمیّت و غیرت ہیں باوضُو

پلتی ہے حُبِّ دین و وطن اس کی گود میں
کھلتا ہے زندگی کا چمن اس کی گود میں

قوموں کی آبرُو ہیں جوانانِ پاکباز　　پُر نغمہ سوزِ حق سے ہیں جن کے دلوں کے ساز
جرأت میں جو ہیں جُرّہ و شاہین و شاہباز　　جن کی نگہ سے ہوتا ہے آہن کا دل گداز

جو خونِ شعلہ ریز سے مثلِ بہار ہیں
پاکیزگی میں خنجرِ بُرّاں کی دھار ہیں

میری رگوں میں خونِ شجاعت ہے موجزن　　میرے لہو میں عشقِ صداقت ہے موجزن
میرے بدن میں شوقِ شہادت ہے موجزن　　میرے سخن میں نُورِ محبّت ہے موجزن

روشن مرا سخن ہے مرے خونِ پاک سے
نکلا ہے آفتاب دلِ تابناک سے

محمد اکبر منیر

محبوب کی قبر پر

میں خاموش تھی مگر میرا دل، سیماب بر آتش، اپنی سرتڑپ میں برقِ جہندہ کو دعوتِ مقابلہ دے رہا تھا، میں بے حس و حرکت تھی مگر آنکھیں ـــــ وہ آنکھیں جن میں متعدد طوفان سمٹ کر آ گئے تھے متجسس اور متلاشی نظر آتی تھیں۔

میں کہاں تھی؟ ـــ اُس مقام پر جہاں میرا خدائے جذبات، میرا سرتاج، میرا پیارا شوہر عمیق قبر میں محوِ خواب تھا۔

مَیں نے یاسمن کی بیل کو ہٹایا، اُن تنیوں کو ہشیار کیا جو میرے محبوب کی قبر کو بوسہ دے کر میرے جذبۂ رقابت میں تلاطم برپا کر رہی تھیں، مگر خدا جانے کیوں میں نے اُن کو انتہائے شوق میں چُوم لیا۔

میں وہاں تنہا نہ تھی، میں اُن کے ساتھ تھی جن کو میں جان سے زیادہ عزیز تھی، جو دُنیا میں میرے وجود کا موجب تھے ـــــ مگر کیا وہ میرے رنج سے باخبر تھے؟ کیا وہ اُن جذبات و احساسات کا اندازہ کر سکتے تھے جن کے نرغے میں اُس وقت میں تھی؟ نہیں! ہرگز نہیں!!

اُس وقت اُن کی شفقتِ پدری میرے دِل پر نیزو نشتر کا کام کر رہی تھی۔ اُن کی موجودگی میری مظاہرہ میں آنے والی بیتابیوں کے لئے ایک حجابِ مستقل بن گئی تھی۔ میرا دِل اس تودۂ خاک کے نظارہ سے جس میں میرا پیارا ہمیشہ کی نیند سو رہا تھا درد و الم سے پھٹا جا رہا تھا۔ میں خوشی کے ایّام اُس کے ساتھ گزار چکی تھی۔ میں اس کے ساتھ گرجا کو گئی، جہاں ہم سلسلۂ ازدواج میں جکڑ دیئے گئے۔ میں اس کے ساتھ دریا کے ساحل پر گلگشت سے لطف اندوز ہونے گئی اور محظوظ ہوئی لیکن ـــــ اب جبکہ وہ داعئ اجل کو لبیک کہہ گیا، ایک دائمی داغ مفارقت دے گیا، میری نظروں سے نہاں ہو گیا، اس کا جسدِ لطیف قبر کی خوراک ہو گیا ـــــ زمانہ یہ برداشت نہیں کرتا اور مجھے اجازت نہیں دیتا کہ اُس کی گور پر چند آنسو بہاؤں، اُس کو بوسہ دوں، قبر شق ہو میں سما جاؤں اور اس کی ابدی رفاقت حاصل کر لوں . . . . . . "

"آؤ"

یہ لفظ والدِ ماجد کی زبان سے نکل کر ٹھیک اُس وقت سماعت سوز ہوا جب کہ میں عالمِ خیال میں کھو گئی تھی اور میرا پیارا شوہر اپنے ہاتھ میں ایک گلاب کا پھول لئے ہوئے میری جانب بڑھ رہا تھا۔ دفعتہً اُس نے مجھ کو مخاطب کر کے خدا جانے کیا کہا میں سن نہ سکی، منتظر تھی کہ پھر سُنوں کہ یہ آواز کانوں میں آئی۔

"بس ختم کرو۔ آؤ"

یہ حکم اور پھر رنگین احساسات کے موقع پر ایک تیرِ بے پناہ تھا جو دل کی گہرائیوں میں اُتر گیا، ایک بلائے جبر و استبداد تھی جو قضائے مبرم کی طرح مجھ پر نازل ہوئی۔

میں نے اپنے بہتے ہوئے آنسو پُونچھے۔ تڑپتے ہوئے دل کو سنبھالا۔ دو گلاب کے پھول جو میرے پاس تھے بسُرعت تمام قبر پر چڑھائے۔ ہوا چلی۔ بادِ تُند کے ایک بیرحم جھونکے نے دونوں پھولوں کو میری موجودگی ہی میں برباد کر دیا ـــــ آہ!

(ترجمہ از انگریزی)

عروج بدایونی

محبّت کی نیرنگیاں

(ایک قافیے میں)

غمِ حرماں اُڑا لایا ہے مجھ کو اُس بلندی پر
جہاں سے حُسن کی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی!

(ذوقی)

نمودِ جلوۂ بے رنگ سے ہوش اس قدر گم ہیں
کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی!

(اصغر گونڈوی)

نہ تُو بدلا نہ میں بدلا، مگر یہ کیا قیامت ہے،
کہ اب مجھ سے تری صورت بھی پہچانی نہیں جاتی!

(حامد علی خاں)

محبّت نے اثر کو اس قدر بےحال کر ڈالا
کہ بیچارے کی اب تو شکل پہچانی نہیں جاتی!

(اثر صہبائی)

ترے جلوے بسے ہیں اسقدر میری نگاہوں میں
کہ اب صورت کسی کی مجھ سے پہچانی نہیں جاتی!

(حفیظ ہوشیارپوری)

حفیظ ہوشیارپوری

کرشمہ

افرادِ ڈراما

الطاف حسین ——— پرانی طرز کے ایک پنجاہ سالہ بزرگ

حمیدہ خاتون ——— ان کی بیوی عمر ۴۵ سال

لطیف احمد ——— ان کا لڑکا عمر ۲۵ سال

احمد حسین ——— ایک پنشن یافتہ فوجی سپاہی، عمر ۶۰ سال

رفیق احمد ——— لطیف کے کارخانہ کا ایک ملازم

ملازم ———

زمانۂ حال

پہلا منظر

(انگریزی طرز کے مطابق سجا ہؤا ایک کمرہ۔ حمیدہ خاتون الطاف حسین اور لطیف بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ الطاف حسین ململ کا ایک کرتہ، غرارہ دار پائجامہ پہنے ہوئے ہیں۔ سر کے بال بکھرے ہوئے ہیں۔ عینک پیشانی پر لگی ہوئی ہے۔ لطیف ریشمی قمیص اور سفید پتلون پہنے ہوئے ہے۔)

الطاف حسین ۔ (پسینہ پونچھتے ہوئے) اُف کس بلا کی گرمی ہے (کچھ وقفہ کے بعد) احمد حسین اب تک نہیں آئے۔

لطیف ۔ آتے ہوں گے۔ راستہ میں کوئی مل گیا ہوگا۔ رک گئے ہوں گے۔ (باہر دستک کی آواز) لیجئے آ گئے۔

(الطاف حسین جا کر دروازہ کھولتے ہیں۔ احمد حسین فوجی لباس پہنے داخل ہوتے ہیں۔ ان کا بایاں ہاتھ مونڈھے کے پاس سے کٹا ہؤا ہے۔ . . . اُن کے بیٹھنے کے بعد)

حمیدہ خاتون ۔ اتنی گرمی میں، اور یہ لباس۔ تمہیں گرمی نہیں لگتی۔

احمد حسین ۔ یہ بھی کوئی گرمی ہے، جو شخص افریقہ میں رہ چکا ہو، وہ اتنی معمولی گرمی کی پروا نہیں کرتا۔

حمیدہ خاتون ۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔

احمد حسین (لطیف سے) تمہارا کام کیسا چل رہا ہے۔ تم لوگ بھی جادوگروں سے کم نہیں ہو۔ جہاں تم نے کہا "روشنی ہو جائے" ساری دنیا منور ہو گئی۔ بے جان مشین سے کہا "چل" اور وہ چلنے لگی . . . . مجھے بھی جادو کا تھوڑا سا تجربہ ہے۔

لطیف۔ وہی آپ کا بنگالی جادو۔ سب فریب۔ دھوکا۔

احمد حسین۔ تم اسے فریب کہتے ہو۔ صاحبزادے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔

لطیف۔ ٹوکری کا تماشا میں نے بھی دیکھا، اور یہ بھی جانتا ہوں کہ کیسے کیا جاتا ہے۔ کوئی زیادہ وقیع بات بیان کیجیے۔

احمد حسین۔ اس کے تماشے کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟

لطیف۔ (مسکراتا رہتا ہے اور کوئی جواب نہیں دیتا)

احمد حسین۔ تم کو میری باتوں کا یقین نہیں آ رہا ہے۔ ہاں میاں زمانہ ہی ایسا آ لگا ہے کہ لوگ خود اپنے وجود سے انکار کرنے لگے ہیں۔

الطاف حسین۔ احمد حسین اس میں بگڑنے کی کیا بات ہے؟ تم آج کل کے نوجوانوں کی ذہنیت سے واقف ہوتے ہوئے بھی ایسی باتوں کا اثر لیتے ہو...... خوب یاد آیا۔ تم ایک روز کسی بُت کا ذکر کر رہے تھے، وہ بات تو ادھوری ہی رہ گئی۔

احمد حسین۔ اب اس قصّہ کو جانے بھی دیجیے۔ (اپنے آپ سے) جب کبھی مجھے اس کا خیال آتا ہے میں سب کچھ بھول جاتا ہوں۔

الطاف حسین۔ تم نے کہا تھا کہ تم ہر وقت اسے ساتھ رکھتے ہو۔

احمد حسین (جو کچھ سوچ رہے ہیں۔ الطاف حسین کی طرف توجہ کئے بغیر بےخیالی سے) ہاں

حمیدہ خاتون۔ اس بُت میں ایسی کیا خاص بات ہے۔

لطیف۔ کیا وہ اس وقت بھی آپ کے پاس ہے۔

احمد حسین۔ ہاں ہے تو مگر تم دیکھ کر کیا کرو گے۔ اوّل تو تمہیں یقین نہ آئے گا۔ دُوسرے وہ کوئی ایسی دیکھنے کی چیز بھی نہیں ہے۔ (جیب میں ٹٹولتے ہوئے) ایک معمولی قسم کے بچوں کے کھلونے جیسا بُت ہے۔ (جیب سے ایک بدوضع سیاہ رنگ کا چھوٹا سا بُت نکال کر بتاتے ہوئے) یہ دیکھو۔

الطاف حسین۔ اس میں کیا خاص بات ہے۔

احمد حسین۔ اس میں جادو کا اثر ہے۔

الطاف حسین۔ لاحول ولا قوۃ۔ (بت احمد حسین کو دے دیتا ہے)

احمد حسین۔ (بُت کو ہتھیلی پر رکھ کر اسے گھُورتے ہوئے اپنے آپ سے) ایک بڈھا فقیر، بڑا ہی مقدّس آدمی۔ برسوں ایک ہی حالت میں بیٹھا رہنے والا۔ خدا سے لَو لگائے ہوئے۔ وہ بتانا چاہتا تھا کہ لوگ قسمت کے غلام ہیں، تدبیر تقدیر کو بدل نہیں سکتی۔ اور اگر کوئی اس کی کوشش کرے تو تباہ ہو جائے۔ اس نے اس بُت کو بنا کر اس میں یہ اثر پیدا کیا کہ تین آدمی (تینوں کو باری باری دیکھتے ہوئے) تینوں میں سے ہر ایک تین چیزیں اس بُت سے مانگ سکتے ہیں۔

(سوائے حمیدہ خاتون کے باقی سب کھوکھلی ہنسی ہنستے ہیں)

حمیدہ خاتون۔ شش!

احمد حسین (اور زیادہ سنجیدگی سے) جو کچھ وہ مانگیں گے اُن

کو مل جائے گا مگر بعد میں انہیں اپنے سوال پر افسوس ہوگا۔

الطاف حسین ۔ لیکن وہ چیزیں ان کو ملیں گی کیسے ؟

احمد حسین ۔ یہ اس نے نہیں بتایا۔

الطاف حسین ۔ تم نے اس کو نہیں آزمایا ؟

احمد حسین ۔ (سنجیدگی سے) میں آزما چکا ہوں۔

لطیف ۔ کیا تم نے جو کچھ مانگا وہ تم کو مل گیا۔

احمد حسین ۔ ہاں۔

الطاف حسین ۔ کیا کسی اور نے بھی اسے آزمایا ہے۔

احمد حسین ۔ ہاں، اس کے پہلے مالک نے بھی تین چیزیں مانگیں (کچھ کھویا سا جاتا ہے) اور آخری چیز جو اس نے مانگی وہ موت تھی۔ (سب کے جسم پر کپکپی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے) اس کے بعد یہ میرے ہاتھ لگا۔

لطیف ۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایسی تین چیزیں مانگی جائیں جو بغیر مانگے بھی ملیں گی۔

احمد حسین ۔ (سر ہلاتے ہوئے) آہ، نادان بچہ۔

الطاف حسین ۔ خانصاحب اب تو یہ بت تمہارے لئے بیکار ہے، پھر اسے اپنے پاس کیوں رکھ چھوڑا ہے ؟

احمد حسین ۔ میرا ارادہ تھا کہ اسے فروخت کر دوں مگر اب میرا خیال بدل گیا ہے۔

حمیدہ خاتون ۔ اگر تم اور تین چیزیں مانگ سکتے تو۔ . . .

احمد حسین ۔ (بت کو بدستور ہتھیلی پر رکھے ہوئے) نہ جانے کیا ہوتا، نہ جانے کیا ہوتا (یکایک غصہ سے بت کو زمین پر پٹکتے ہوئے) نہیں، ہرگز نہیں، کبھی نہیں۔

الطاف حسین ۔ (بت کو زمین سے اٹھاتے ہوئے) یہ تم کیا کر رہے ہو ؟

احمد حسین ۔ (بت الطاف حسین سے لینے کی کوشش کرتے ہوئے) اسے توڑ دو، کچل دو، جلا دو۔ اس بت کو تباہ کر دو۔

الطاف حسین ۔ جلانے یا توڑنے پھوڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسے میں اپنے پاس رکھوں گا۔

احمد حسین ۔ ایسی غلطی نہ کرنا۔ تم اس کے اثرات سے واقف نہیں ہو۔ دیکھو میرا کہا مانو، ورنہ پھر اگر کوئی بات ہوئی تو . . . . . .

الطاف حسین ۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں بھی دیکھونگا کہ کیا ہوتا ہے۔ کیوں لطیف تمہارا کیا خیال ہے ؟

لطیف ۔ (ہنستے ہوئے) اگر آپ کی یہی خوشی ہے تو رکھ لیجیے۔ یہ ایک لغو سی چیز ہے۔

الطاف حسین ۔ (بت کو دیکھتے ہوئے) لغو سی چیز ہاں، حیرت ہے . . . . . میں چاہتا ہوں کہ . . . . .

احمد حسین ۔ (الطاف حسین کے آخری الفاظ کا غلط مفہوم سمجھتے ہوئے) ذرا سوچو تو کہ تم کیا کر رہے ہو . . . . اس کا یہ طریقہ نہیں ہے۔

الطاف حسین ۔ پھر کونسا طریقہ ہے ؟

احمد حسین ۔ دیکھو الطاف میں پھر ایک بار تمہیں متنبہ کرتا ہوں۔ یقین مانو کہ اس میں سراسر نقصان ہے۔ (الطاف حسین کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر وہ سمجھتا

ہے کہ انہیں کوئی پروا نہیں ہے) اس بُت کو اپنے سیدھے
ہاتھ میں لو اور جو کچھ مانگنا ہو زور سے مانگو۔

حمیدہ خاتون۔ یہ الف لیلہ کے مضمون سے کم نہیں ہے
. . . . . اچھا میرے لئے چار ہاتھ مانگو۔

الطاف حسین۔ میں چاہتا ہوں کہ . . . . . .

احمد حسین۔ ٹھہرو۔ اگر تم کو مانگنا ہی ہے تو کوئی ایسی چیز
مانگو جس سے تمہیں نفع بھی ہو۔ ان بیہودگیوں سے
فائدہ . . . . . اچھا، اجازت دو۔ میں اب
رُخصت ہوتا ہوں۔

(الطاف حسین بُت کو میز پر رکھ دیتے ہیں)

لطیف۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ کارخانہ جانا ہے
ایک منٹ ٹھہر جائیے۔

احمد حسین۔ نہیں میں نہیں ٹھہر سکتا۔ میرے حواس ٹھکانے
نہیں ہیں۔ مجھے تازہ ہوا کی ضرورت ہے (جاتے ہوئے
مڑ کر) میں پھر ایک بار کہتا ہوں کہ اسے توڑ دو، یا
کہیں دُور پھینک دو۔

(خدا حافظ کہے بغیر چلے جاتے ہیں۔ ان کے
جانے کے بعد الطاف حسین بُت کو اُٹھا کر اسے
گھورتے ہوئے)

الطاف حسین۔ ہم اسے پھینک ہی نہ دیں۔

لطیف۔ (ہنستے ہوئے) کیوں؟ اس کے طفیل تو ہم دولتمند
اور خوشحال ہو جائیں گے . . . . شہنشاہ ہونے
کی خواہش کیجئے ابا جان۔ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔

الطاف حسین۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا مانگوں (بُت
کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے) ایسا معلوم ہوتا ہے گویا مجھے
سب کچھ مل گیا ہے۔

لطیف۔ ابا جان، آپ اپنے قرض کے بارے میں ہمیشہ
فکرمند رہا کرتے ہیں۔ اتنا روپیہ مانگئے کہ قرض ادا
ہو جائے۔

الطاف حسین۔ ہاں یہ ٹھیک ہے (بُت کو سیدھے ہاتھ
میں لے کر) میں دس ہزار روپیہ چاہتا ہوں۔

(الفاظ ادا ہونے نہیں پاتے کہ ان کے مُنہ سے
ایک چیخ نکل جاتی ہے۔ اور بت ہاتھ سے گر پڑتا ہے)

لطیف۔
حمیدہ خاتون } کیا ہُوا؟

الطاف حسین۔ (پھٹی ہوئی آنکھوں سے بُت کو دیکھتے
ہوئے) بُت نے حرکت کی۔ جونہی الفاظ میری زبان
سے نکلے مجھے ایسا معلوم ہُوا گویا وہ نکل جانا چاہتا ہے۔

لطیف۔ (بُت کو اُٹھاتے ہوئے) یہ کیسے ممکن ہے ابّا
جان (ہنستے ہوئے) یہ تو مٹی کی ایک بیجان مُورت
ہے (اسے میز پر رکھ کر چاروں طرف دیکھتے ہوئے)
روپیہ ابھی آیا نہیں، اور میں شرط باندھ سکتا ہوں کہ
کبھی نہ آئے گا۔

الطاف حسین (مطمئن ہو کر) شکر ہے کہ کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

لطیف۔ (ہنس کر) اچھا اب میں بھی جاتا ہوں۔ ابھی
مجھے بہت کام کرنا ہے۔

حمیدہ ۔ صبح ذرا جلدی آنا۔

لطیف ۔ آٹھ بجے تک آجاؤں گا۔ لیکن میرا انتظار نہ کیجئے گا

(الطاف حسین سے) اباجان فکر نہ کیجئے۔ شاید صبح تک

روپیہ آجائے۔

الطاف حسین ۔ (لطیف کو گھورتے ہوئے) مگر لطیف اس میں

حرکت ضرور ہوئی۔

(لطیف ہنستا ہوا چلا جاتا ہے ۔ الطاف حسین بُت کو گھورتے

رہتے ہیں۔ یکایک اُن کے چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے

ان کو کوئی خوفناک چیز دکھائی دیتی ہے ۔ ان کے مُنہ سے

چیخ نکل جاتی ہے۔)

حمیدہ خاتون (ان کی طرف متوجہ ہو کر) کیا ہُوا؟

الطاف حسین (ڈر پر قابو پا کر) کچھ نہیں کچھ نہیں ۔۔۔ ہیں ۔۔۔

ہیں ۔۔۔ میں ۔۔۔ مجھے کمرہ میں عجیب و غریب شکلیں

دکھائی دے رہی ہیں۔

حمیدہ خاتون ۔ آؤ اندر چلیں ۔

(چلے جاتے ہیں)

(پردہ گرتا ہے)

دوسرا منظر

(وہی کمرہ جو پہلے منظر میں دکھایا گیا ہے ۔ حمیدہ خاتون اور

الطاف حسین بیٹھے ہیں۔ الطاف حسین اخبار پڑھ رہے ہیں۔

حمیدہ خاتون کچھ سی رہی ہیں۔)

الطاف حسین ۔ کیا اچھی صبح ہے ۔

حمیدہ خاتون ۔ ہاں بے حد سُہانی

الطاف حسین ۔ کیا بات ہے لطیف ابھی نہیں آیا۔

حمیدہ خاتون ۔ (گھڑی دیکھتے ہوئے) کوئی کام ہوگا۔ اس

لئے دیر ہو گئی ہوگی (بُت کو میز پر رکھ کر) رات احمد حسین

بھی کیا جھوٹ سچ اُڑا گئے۔

الطاف حسین ۔ اُنھوں نے آج تک کوئی بات سچ بھی کہی ہے

میں سمجھتا ہوں سب بڈھے سپاہی ایسے ہی ہوتے ہیں۔

حمیدہ خاتون ۔ ایک بیجان مٹی کی مورت کسی کا سوال کیسے

پورا کر سکتی ہے ۔

الطاف حسین ۔ میں خود بھی تمام رات یہی سوچتا رہا ۔ مگر کچھ

سمجھ میں نہ آیا۔

حمیدہ خاتون ۔ کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ ممکن ہے اُنھوں

نے سچ کہا ہو۔

الطاف حسین ۔ ہاں ہو سکتا ہے ۔ دُنیا میں آئے دن ایسی

باتیں ہوتی رہتی ہیں جن کو باور نہیں کیا جا سکتا ۔

(ملازم داخل ہوتا ہے ۔ دونوں اُچھل پڑتے ہیں۔)

ملازم ۔ حضور ایک صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

الطاف حسین ۔ بیگم تم ذرا اندر ہو جاؤ تو میں ان کو یہیں بُلا

لوں (حمیدہ خاتون اندر چلی جاتی ہیں) ان کو بھیج دے

(ملازم جاتا ہے ۔ رفیق احمد داخل ہوتا ہے ۔)

رفیق احمد ۔ آداب عرض ہے۔

الطاف حسین تسلیم ۔ آیئے تشریف لایئے ۔۔۔ یہاں

تشریف رکھیئے۔

رفیق احمد۔ شکریہ (کچھ رُکتے ہوئے) میں ایک خاص کام سے حاضر ہؤا ہوں۔

الطاف حسین۔ فرمایئے۔ فرمایئے۔

رفیق احمد۔ (رُک رُک کر) میں اس لئے حاضر ہؤا ہوں۔ اس لئے حاضر ہؤا ہوں کہ . . . . کہ لطیف صاحب . . .

الطاف حسین۔ کیا آپ کو لطیف سے کچھ کام ہے۔ تشریف رکھیئے وہ آتا ہی ہوگا۔

رفیق احمد۔ جی نہیں . . . . میں دراصل . . . . مجھے ان سے کام نہیں ہے . . . . . مجھے آپ سے . . . . . میں انہی کے کارخانے سے آرہا ہوں۔

الطاف حسین۔ وہ خود کیوں نہیں آیا۔ کیا اس نے کوئی پیغام بھیجا ہے؟

رفیق احمد۔ جی نہیں۔ بلکہ . . . . بلکہ . . . .

الطاف حسین۔ (یہ محسوس کرکے کہ کوئی خاص بات ضرور ہے) کوئی حادثہ تو نہیں ہوگیا ہے؟

رفیق احمد۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں آپ سے مل کر . . . .

الطاف حسین۔ آپ کوئی بری خبر تو نہیں لائے ہیں۔

رفیق احمد۔ مجھے افسوس ہے . . . . . مجھے آپ سے بڑی ہمدردی ہے۔

الطاف حسین۔ کیا لطیف کو کچھ ضرر پہنچا ہے؟

رفیق احمد۔ بہت سخت

الطاف حسین۔ کیا اس کو کسی قسم کی تکلیف ہے؟

رفیق احمد۔ جی بالکل نہیں۔

الطاف حسین۔ کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ . . . .

رفیق احمد۔ وہ اپنے ساتھیوں کو ایک واقعہ سنا رہے تھے۔ جو شاید رات میں یہاں پیش آیا تھا۔ انہوں نے کوئی خیال نہیں کیا۔ اور . . . .

الطاف حسین۔ کیا ہؤا اس کے بعد کیا ہؤا۔

رفیق احمد۔ وہ مشین پر گر پڑے۔ (اندر سے ایک چیخ کی آواز آتی ہے۔ الطاف حسین اپنا سر جھکا لیتے ہیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔) کمپنی نے مجھے اس لئے بھیجا ہے کہ اس کی جانب سے اس عظیم ترین سانحہ پر آپ کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کروں۔

الطاف حسین۔ (جن کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے قطعاً عاری ہے، خلا میں دیکھتے ہوئے) عظیم ترین سانحہ، ہاں عظیم ترین سانحہ۔ میرا بچہ . . . . . . اکلوتا بچہ . . . . . میری ضعیفی کا سہارا . . . . . عظیم ترین سانحہ۔

رفیق احمد۔ (میز پر ایک لفافہ رکھتے ہوئے) مسٹر لطیف کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کمپنی نے آپ کی خدمت میں دس ہزار روپیہ کی حقیر رقم کا یہ چک پیش کیا ہے۔

(رفیق احمد چلا جاتا ہے۔ الطاف حسین کے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھ جاتے ہیں۔ پھر وہ ایک اندھے کی طرح ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر بیہوش ہو کر گر پڑتے ہیں۔)

(پردہ گرتا ہے)

تیسرا منظر

(وہی کمرہ جو پہلے منظر میں بتایا گیا ہے۔ الطاف حسین صوفے پر بیٹھے اونگھ رہے ہیں۔ کمرہ میں ہر طرف بے ترتیبی ہے۔ کرسیوں پر گرد جمی ہوئی ہے۔ حمیدہ خاتون کھڑکی کے پاس کھڑی باہر دیکھ رہی ہیں۔)

الطاف حسین۔ (چونک کر ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے) بیگم بیگم۔

حمیدہ خاتون۔ کیا ہے؟

الطاف حسین۔ تم کہاں ہو؟

حمیدہ خاتون۔ کھڑکی کے پاس۔

الطاف حسین۔ کیا کر رہی ہو؟

حمیدہ خاتون۔ اس سامنے والی سڑک سے آگے بڑھنے کے بعد وہ قبرستان ہے جہاں ہم نے اپنے لال کو سپردِ خاک کیا۔

الطاف حسین۔ ہاں، مگر اب اس سے فائدہ بیگم۔ یہاں آجاؤ۔ اس ہوا سے تمہیں نقصان پہنچ جائے گا

حمیدہ خاتون۔ جس جگہ وہ آرام کر رہا ہے، وہاں اس سے زیادہ تُند ہوا چل رہی ہے۔

الطاف حسین۔ وہ ہمیشہ کے لئے ہم سے بچھڑ گیا۔

حمیدہ خاتون۔ ہماری ساری اُمیدیں اپنے ساتھ لیتا گیا۔

الطاف حسین۔ ہماری ساری آرزوؤں کا خون کر گیا۔

حمیدہ خاتون۔ اور ہماری ساری ...... (چیخ کر) ادھر دیکھو (وہ بھاگ کر اُن کے پاس آتی ہیں۔)

الطاف حسین۔ بیگم بیگم۔ کیا معاملہ ہے۔

حمیدہ خاتون۔ (انتہائی بے تابی سے) بُت۔ وہ بُت۔

الطاف حسین۔ (حیران ہو کر) کہاں۔ وہ کہاں ہے۔ آ ہے کیا ہوا؟

حمیدہ خاتون۔ تم نے اسے پھینکا تو نہیں۔ مجھے اس کی ضرورت ہے۔

الطاف حسین۔ اُس روز کے بعد میں نے اسے نہیں دیکھا۔

حمیدہ خاتون۔ اسے تلاش کرو۔

الطاف حسین۔ (اُٹھ کر ادھر اُدھر تلاش کرتے ہیں۔ ایک صوفے کے نیچے سے) یہاں ہے، یہاں ہے۔ مگر تم اسے کیا کرو گی۔

(بُت انہیں دے دیتے ہیں)

حمیدہ خاتون۔ مجھے پہلے سے اس کا خیال کیوں نہیں آیا۔

الطاف حسین۔ کس کا؟

حمیدہ خاتون۔ باقی دو چیزوں کا۔

الطاف حسین۔ (خوفزدہ ہو کر) کیا؟

حمیدہ خاتون۔ ہم نے اب تک صرف ایک چیز مانگی ہے۔

الطاف حسین۔ کیا وہ کافی نہیں ہے۔

حمیدہ خاتون۔ نہیں۔ ہم ایک چیز اور مانگیں گے (بت ان کی طرف بڑھاتے ہوئے) اسے لو اور کہو

الطاف حسین۔ (اس سے دُور ہٹتے ہوئے) کیا کہوں؟

حمیدہ خاتون۔ کہو کہ ہمارا بچہ زندہ ہو جائے۔

الطاف حسین۔ یا اللہ۔ بیگم تم دیوانی ہو گئی ہو۔

حمیدہ خاتون ۔ کہو۔ کہو (انتہائی افسردگی سے) میرا بچہ، میرا لال
الطاف حسین ۔ تمہیں اس کا بالکل احساس نہیں ہے کہ تم کیا
کہہ رہی ہو؟
حمیدہ خاتون ۔ ہماری پہلی خواہش پوری ہوگئی، دوسری
کیوں نہ ہوگی ۔
الطاف حسین ۔ اسے مرے ہوئے دس دن ہوگئے بیگم،
تم اسے کیسے دیکھ سکو گی؟
حمیدہ خاتون ۔ مجھے اس کی پروا نہیں ہے ۔ جس حالت
میں بھی ہو، وہ واپس آجائے ۔ یہی کافی ہے ۔
الطاف حسین ۔ (بت سے ڈر کر دور ہوتے ہوئے) میں اسے
چھونا نہیں چاہتا ۔
حمیدہ خاتون (بت انہیں دیتے ہوئے) لو ۔ اور کہو جو کچھ
میں نے کہا ہے ۔
الطاف حسین ۔ (کانپتے ہوئے) بیگم!
حمیدہ خاتون ۔ (غصہ سے) کہو!
الطاف حسین ۔ (حمیدہ خاتون کے غصہ سے مجبور ہو کر مگر
کانپتے ہوئے) میں چاہتا ہوں کہ میرا بچہ زندہ ہو جائے ۔
(ایک چیخ کے ساتھ بت کو گرا دیتے ہیں۔ حمیدہ خاتون
کھڑکی کے پاس جاتی ہیں۔)
حمیدہ خاتون ۔ (کچھ وقفہ کے بعد ناامیدی سے) کچھ بھی
نہیں ہے ۔
الطاف حسین ۔ شکر ہے خدائے پاک تیرا شکر ہے ۔
حمیدہ خاتون ۔ کچھ بھی نہیں ہے ۔ ساری سڑک سنسان پڑی
ہوئی ہے (کھڑکی کے پاس سے لوٹ آتی ہیں) اب ہماری
زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں ۔ ہم محض اس کی خاطر زندہ تھے
ہمارے گھر کا چراغ گل ہوگیا (کرسی پر گر پڑتی ہیں) ہر لمحہ
جو گزرتا ہے ہزاروں سال کا معلوم ہوتا ہے ۔
الطاف حسین ۔ یہ تو عمر بھر کا رونا ہے بیگم ۔ آؤ اندر چلیں،
کچھ دیر آرام کر لو ۔
حمیدہ خاتون ۔ میری قسمت میں اب آرام کہاں ۔
(دروازہ پر کھٹ کی ایک ہلکی سی آواز ہوتی ہے)
حمیدہ خاتون ۔ (اچھل کر) یہ کیا ہے؟
الطاف حسین ۔ ہوا کی وجہ سے دروازہ ہل رہا ہے ۔
(دروازہ پر پھر کھٹ کی آواز ہوتی ہے ۔ مگر پہلے کی نسبت
ذرا زور سے ۔ حمیدہ خاتون دروازہ کی طرف جانا چاہتی ہیں)
الطاف حسین (حمیدہ خاتون کو پکڑ کر) ٹھہرو۔ تم کیا کرنے والی ہو۔
حمیدہ خاتون ۔ (چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے) میرا
بچہ، میرا لال، میرا لطیف آگیا ۔ مجھے چھوڑ دو۔ جانے
دو۔ میں بالکل بھول گئی تھی کہ قبرستان یہاں سے ایک
میل پر ہے ۔ مجھے چھوڑ دو تاکہ میں دروازہ کھول دوں۔
(کھٹ کھٹ کی آواز بدستور تھوڑے تھوڑے وقفہ سے
جاری رہتی ہے ۔ جو ہر بار پہلے سے زیادہ زور سے
ہوتی ہے ۔)
الطاف حسین ۔ (ان کو بدستور پکڑے ہوئے) خدا کے لئے
حمیدہ خاتون (چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے) مجھے
جانے دو ۔

الطاف حسین۔ دروازہ نہ کھولو۔ (انہیں کھینچ کر دوسری طرف لے جاتے ہیں۔)

حمیدہ خاتون۔ مجھے جانے دو۔

الطاف حسین۔ ذرا سوچو کہ تمہیں وہاں کیا دکھائی دیگا۔

حمیدہ خاتون۔ (چھڑاتے ہوئے) کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں اپنے بچہ سے ڈر جاؤں گی (دروازے کی طرف بھاگتے ہوئے) میں آرہی ہوں میرے لال میں آرہی ہوں۔

الطاف حسین۔ ایسا نہ کرو۔

(حمیدہ خاتون ان کی باتوں کی پرواہ نہ کرکے دروازہ کے قریب جاکر اسے کھولنے کی کوشش کرتی ہیں۔)

الطاف حسین۔ (یکایک) بُت۔ وہ بُت کہاں گیا (گھٹنوں کے بل جُھک کر ڈھونڈتے ہیں)

حمیدہ خاتون۔ زنجیر بہت سخت ہے۔ میں اسے نہیں کھول سکتی۔ آؤ میری مدد کرو۔

(کھٹ کھٹ کی آواز بدستور آرہی ہے اور بہت زیادہ زور سے۔)

الطاف حسین۔ (ٹٹولتے ہوئے) بُت۔ بُت۔ ابھی ایک چیز اور باقی ہے۔

حمیدہ خاتون۔ کیا تم سنتے نہیں۔ تمہارا بچہ دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔

الطاف حسین۔ لاحول ولا قوۃ۔ نہ جانے کدھر چلا گیا۔

حمیدہ خاتون۔ آؤ، آؤ۔ کیا تم اپنے بچے کو اپنے گھر میں نہ آنے دو گے؟

(آواز میں شدت پیدا ہوگئی ہے۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے کوئی اپنے جسم سے دروازہ دھکیل رہا ہے)

حمیدہ خاتون۔ میرے بچے۔ میرے لال ٹھہرو۔ میں دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ بس ایک منٹ اور۔

الطاف حسین۔ استغفراللہ۔ استغفراللہ (بُت مل جاتا ہے وہ ایک گہری سانس لیتے ہیں، اس کے بعد کھڑے ہو کر بُت کو سیدھے ہاتھ میں لئے ہوئے) میں چاہتا ہوں کہ وہ مر جائے۔ مر جائے اور جنت کی لذتوں سے لُطف اندوز ہو۔

(آواز بند ہو جاتی ہے۔ دروازہ کُھل جاتا ہے۔ چاندنی دروازہ میں سے اندر آتی ہے۔ اس کے سوا وہاں کچھ نہیں ہے۔ تھوڑی دیر سکوت۔ حمیدہ خاتون بیہوش ہو کر گر پڑتی ہیں الطاف حسین دونوں گھٹنوں پر جھک کر دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا دیتے ہیں۔)

(پردہ گرتا ہے)

محمد یحییٰ صدیقی

کیلاش کنول

تراجم از پیامِ مشرق — حسبِ اجازتِ علامۂ اقبال

(۳۱) — ترجمہ

زمرغانِ چمن ناآشنایم	سنگ چمن والوں کے نہ جاؤں
بشاخِ آشیاں تنہا سرایم	کُنج[1] میں بیٹھ اکیلا گاؤں
اگر نازک دلی از من کراں گیر	من ہے ترا سُکمار[2] تو ہٹ جا
کہ خونم می تراود از نوایم	اپنا لہو بھی سُروں میں ملاؤں

(۳۲) — ترجمہ

جہاں یارب چہ خوش ہنگامہ دارد	خُوب یہ مُلّڑ داتا[3] جگ میں
ہمہ را مستِ یک پیمانہ کردی	مست ہیں ایک ہی چُلّو سے سب
نگہ را با نگہ آمیز دادی	آنکھ تو آنکھ سے مل جاتی ہے
دل از دل جاں ز جاں بیگانہ کردی	جان کو جان سے میل نہ مطلب

[1] ہندی میں کُنج درختوں یا اُن کی پتیوں کی گُپھا کو کہتے ہیں۔ فارسی میں کُنج کونے کو کہتے ہیں۔ [2] سُکمار۔ معنی نازک۔ [3] داتا معنی خدا

صدف ہے اپنی حیات اور گہر ہے حُسنِ عمل
مصافِ زیست میں تیغ و سپر ہے حُسنِ عمل

یہی عمل ہے کلیدِ خزینۂ عرفاں
اسی عمل سے رواں ہے سفینۂ عرفاں

یہی ہے مردِ مجاہد کی منزلِ مقصود
یہی مقام ہے جس کو کہا گیا محمود

فضائے رُوح میں تیری ہو نُورِ حق کا ظہور
ظہورِ حق سے ہوں باطل کی ظلمتیں کافور

صفائے قلب میں ہے راحت و سکون و قرار
اس آئینہ میں ہیں حُسنِ ازل کے نقش و نگار

وہ حُسن جس کا تماشا ہے جنتِ جاوید
وہ حُسن جس کی تمنّا ہے لذتِ جاوید

وہ حسن کیفیتِ جاوداں ہے جس کا وصال
وہ حُسن میکدۂ رُوح و جاں ہے جس کا وِصال

تلاشِ حق میں اگر عمر ہو بسر تیری
جمالِ حق کی ہو جویا اگر نظر تیری

اگر نہ دامنِ حق تیرے ہاتھ سے چھُوٹے
اگر نہ یورشِ باطل سے دِل ترا ٹُوٹے

تو مِل ہی جائے گا تجھ کو سکوں کبھی نہ کبھی
بدل ہی جائے گا حالِ زبوں کبھی نہ کبھی

اثر صہبائی

چنڈول

اے مرے چنڈول کیا ننھی سی تیری جان ہے
طائرانِ دہر سے تیری نرالی شان ہے

گرچہ مشتِ پر ہے لیکن محرمِ عرشِ بریں
تو نے پایا ہے جہاں میں مسکنِ بالاتریں

تو زمیں پر سے اُڑا بامِ فلک پر چڑھ گیا
دیکھتے ہی دیکھتے اس سے بھی آگے بڑھ گیا

ہیں تعجب خیز تیری معرکہ آرائیاں
عقل کو حیران کرتی ہیں فلک پیمائیاں

آسماں والوں کو بھی اُڑنے پہ تیرے ناز ہے
تیرے پنکھوں میں غضب کی طاقتِ پرواز ہے

ہوش اُڑتے ہیں فرشتوں کے تری پرواز سے
اور ہیں اہلِ جہاں حیراں ترے انداز سے

تو اُڑا اور آسماں کا ایک تارا ہو گیا
دیکھنے والوں کی آنکھوں کا اشارا ہو گیا

چاند تارا بن گیا اور آسماں میں جا چھپا
اُڑتے اُڑتے جاتے جاتے کہکشاں میں جا چھپا

تو جہاں کی محفلوں سے کس لئے اُکتا گیا
اہلِ دُنیا سے ترا دل کس لئے گھبرا گیا

اپنی شاخِ آشیاں تک کس لئے آتا نہیں
دُور رہ کر تو وطن سے آہ گھبراتا نہیں

ڈھونڈنے جاتا ہے کس کو عرشِ بالا پر بتا
گم ہُوا ہے کون وہ جس کا لگاتا ہے پتا

کیا زمیں والوں میں کوئی قدرداں تیرا نہیں
کیا ترے رہنے کے قابل آشیاں تیرا نہیں

دیکھ اپنی ذات کو ناشاد کی ہستی کو دیکھ
آسمانوں کی بلندی سے مری پستی کو دیکھ

رمیشور ناشاد

اقبال کی منظر نگاری

(ذیل کا مقالہ یوم اقبال کی تقریب پر اُس جلسہ میں پڑھا گیا جو ۱۶ر جنوری ۱۹۳۸ء کو ڈی۔اے۔وی کالج راولپنڈی کے ہال میں آنریبل شیخ سر عبدالقادر ممبر انڈیا کونسل لندن کی صدارت میں منعقد ہوا۔)

جگن ناتھ آزاد۔ بی اے (سیکرٹری انجمن اُردو راولپنڈی)

ہمارے ملک کی تاریخ ادب میں یہ پہلی مثال ہے کہ کسی شاعر کی یادگار اُس کی زندگی میں اس قدر اہتمام کے ساتھ ملک کے طول وعرض میں منائی گئی ہو۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کو اُن کی سالگرہ پر آج ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے اُدبا، شعراء اور اصحاب ذوق ہدیۂ مبارکباد پیش کر رہے ہیں۔ اور یہ اس شکرگزاری کا اظہار ہے جو ہم سب پر اُن کی گراں قدر خدمت گزاری کے لئے لازم آتی ہے۔ دَورِ حاضر میں اُن کے سحر انگیز کلام نے اہلِ وطن کے جذبۂ عمل کو بیدار کرنے میں جو حصّہ لیا ہے، اُس کے لئے علامۂ اقبال کا جس قدر شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔

اقبال کا کلام صُوری اور معنوی خصوصیات کے لحاظ سے ایک بحرِ بے پایاں ہے۔ جس کی وسعت اور عمق کا اندازہ کرنا آسان نہیں ہے۔ میں اس شاعرِ عالم کے کلامِ بلاغت نظام کی صرف ایک خصوصیت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا یعنی مجھے ”اقبال کی منظر نگاری“ کے متعلق کچھ کہنا ہے۔ اگرچہ اس ایک خصوصیت کا مکمل بیان بھی میرے لئے چھوٹا مُنہ اور بڑی بات ہے لیکن کارفرمایانِ بزم کے ارشاد کی تعمیل میں وہ تاثرات جو مطالعۂ کلامِ اقبال کے دَوران میں میرے دِل نے قبول کئے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

اُردو کی موجودہ اصلاح یافتہ شاعری جس کی داغ بیل حالی اور آزاد نے ڈالی تھی اقبال کے میدانِ عمل میں آنے سے پہلے مروّج اور مقبول ہو چکی تھی اس شاعری کا جزوِ اعظم منظر نگاری تھا، ان کے ہمعصروں اور مقلدوں نے منظر نگاری میں خوب رنگ آمیزیاں کیں بعض شعراء نے اسی صنعتِ شاعری کو اپنا خاص مضمون بنا لیا۔ بعض نے مُلکی اور ملّی مضامین میں تاثیر پیدا کرنے کے لئے منظر نگاری کو ذریعۂ امداد کے طور پر استعمال کیا۔ اقبال کا تعلق صریحی طور پر دوسرے طبقے سے ہے، چنانچہ کلامِ اقبال میں جا بجا منظر نگاری کو وارداتِ قلب، جذباتِ ملّت اور نکاتِ فلسفہ وغیرہ کو دلکش اور مؤثر بنانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ ان کی اوّلیں نظموں میں ”کوہِ ہمالیہ“ کے دُوسرے ہی بند سے اس حقیقت کا ثبوت مِل جاتا ہے کہ وہ ہمالیہ پر ایک بیانیہ نظم نہیں لکھ رہے بلکہ اُن کا اصل موضوع اس عنوان کے پردہ میں ”حبِ وطن“ ہے۔

باوجودیکہ منظر نگاری اقبال کے کلام کا خاص موضوع نہیں ہے لیکن جہاں جہاں کلامِ اقبال میں منظر نگاری موجود ہے، وہاں

یہ ایک سحر انگیز منظر پیش کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر اسی نظم میں ایک جگہ کہتے ہیں ؎

لیلیٰ شب کھولتی ہے آ کے جب زلفِ رسا — دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا — وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا
کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

"ماہِ نو" پر چند اشعار لکھے ہیں۔ میں شروع کے تین اشعار پیش کرتا ہوں، انہی سے کلام کی اس خصوصیت کے کمال کا اندازہ لگا لیجئے منظر نگاری کے تمام لوازم مثلاً قدرتِ زبان، ندرتِ تشبیہ، علوِ تخیل ان چھ مصرعوں میں انتہائی دلکشی کے ساتھ موجود ہیں ؎

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقابِ نیل — ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آبِ نیل
طشتِ گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب — نشترِ قدرت نے کیا کھولی ہے فصدِ آفتاب
چرخ نے بالی چرا لی ہے عروسِ شام کی
نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی

ایبٹ آباد کے پہاڑوں پر گھٹاؤں کے منظر کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے:-

اٹھی پھر آج وہ پورب سے کالی کالی گھٹا — سیاہ پوش ہوا پھر پہاڑ سربن کا
نہاں ہوا جو رخِ مہر زیرِ دامنِ ابر — ہوائے سرد بھی آئی سوارِ توسنِ ابر
گرج کا شور نہیں ہے۔ خموش ہے یہ گھٹا — عجیب مے کدۂ بے خروش ہے یہ گھٹا
ہوا کے زور سے اُبھرا۔ بڑھا اُڑا بادل
اُٹھی وہ کالی گھٹا، لو برس پڑا بادل

برسات کے موسم کی کتنی سچی تصویر ہے۔ ایک ایک مصرع پر فصاحت اور بلاغت نثار ہو رہی ہے، لفظ لفظ نظارے کی تصویر کھینچ رہا ہے خاص کر ساکنانِ راولپنڈی جس قدر ان اشعار کی صداقت کا احساس کر سکتے ہیں اور اُن سے لُطف اندوز ہو سکتے ہیں اور مقام والوں کی قسمت نہیں۔

"ایک شام" جن جذبات کی مظہر ہے اُس کا احساس فقط حساس دِل ہی کر سکتے ہیں۔ دریا کے کنارے شام ہو رہی ہے، سکوت ہر طرف اپنا تسلط جما رہا ہے۔ غیر ممکن ہے کہ اقبال اس خاموش کُن اور غم انگیز منظر سے متاثر نہ ہو۔ کہتا ہے ؎

خاموش ہے چاندنی سحر کی — شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی

وادی کے نوا فروش خاموش ۔۔۔ کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بے ہوش ہو گئی ہے ۔۔۔ آغوش میں شب کے سو گئی ہے
کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے ۔۔۔ نیکر[1] کا خرام بھی سکوں ہے
تاروں کا خموش کارواں ہے ۔۔۔ یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا ۔۔۔ قدرت ہے مراقبے میں گویا

اے دل! تو بھی خموش ہو جا
آغوش میں غم کو لے کے سو جا

[1] دریائے نیکر (ہائیڈل برگ)

"گورستانِ شاہی" میں تو اقبال نے منظر کشی کے جادو کو اعجاز کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ شاندار اسلامی حکومتوں کے ویران کھنڈر شاعر کے سامنے ہیں۔ آنکھیں تباہ شدہ مناظر کو دیکھ رہی ہیں۔ حساس دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ ایک وقت تھا کہ قطب شاہی اور عماد شاہی حکومتوں کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا۔ لیکن آج ان کے عظیم الشان شہنشاہ

سوتے ہیں خاموش آبادی کے ہنگاموں سے دور
مضطرب رکھتی تھی جن کو آرزوئے ناصبور

عالیجناب شیخ صاحب نے جو ہماری خوش قسمتی سے آج کرسیِ صدارت پر جلوہ افروز ہیں، اس بلند پایہ نظم کی تمہید میں جون ۱۹۱۰ء میں چند سطور زیبِ اوراقِ مخزن کی تھیں وہ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کے ایک قصیدہ کا ذکر کرنے کے بعد شیخ صاحب لکھتے ہیں:۔

"دوسری نظم جو گورستانِ شاہی کے عنوان سے شائع کی جاتی ہے ایسی لاجواب نظم ہے جو فی الحقیقت اقبال کے دیرینہ سکوت کی تلافی کرتی ہے، اس کا ایک ایک مصرعہ ایسا درد بھرا اور معنی خیز ہے کہ دل سے داد نکلتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سلاطینِ قطب شاہیہ کے مزار اُن کے قریب گولکنڈہ کا تاریخی حصار، شبِ ماہ مگر ایسی شبِ ماہ جس میں بادلوں کے چاند کے سامنے آنے جانے سے نور و ظلمت میں لڑائی ٹھن رہی تھی سچے شاعرانہ جذبات کے نشوونما کے لئے اس سے بہتر زمین اور اس سے بہتر آسمان کیا ہوگا۔ ان جذبات کا عکس جس خوبی اور صفائی سے جنابِ اقبال نے اُتارا ہے۔ اُنہی کا حصہ ہے۔"

خود علامہ اقبال نے اسی نظم کی تمہید میں لکھا:۔

"حیدرآباد دکن میں مختصر قیام کے دنوں میں میرے عنایت فرما جناب مسٹر نذر علی حیدری صاحب بی۔ اے معتمد محکمہ فینانس مجھے ایک شب اُن شاندار مگر حسرتناک گنبدوں کی زیارت کے لئے لے گئے جن میں سلاطین قطب شاہیہ سو رہے ہیں۔ رات کی خاموشی،

ابر آلود آسمان اور بادلوں میں سے چھن کے آتی ہوئی چاندنی نے اس پُرحسرت منظر کے ساتھ مل کر میرے دل پر ایسا اثر کیا جو کبھی فراموش نہ ہوگا۔ ذیل کی نظم انہی بے شمار تاثرات کا ایک اظہار ہے۔"

شہنشاہوں کے قبرستان کا المناک منظر، شبِ ماہتاب کا ابر آلود نظارہ اور اقبال کا دلِ حساس، اس اتفاق کو اُردو شاعری کی خوش قسمتی سمجھنا چاہئے۔ نظم کا آغاز دیکھئے، کس درجہ بلند پایہ منظر نگاری ہے ؎

آسماں بادل کا پہنے خرقۂ دیرینہ ہے
کچھ مکدر سا جبینِ ماہ کا آئینہ ہے

چاندنی پھیکی ہے اس نظارۂ خاموش میں
صبحِ صادق رو رہی ہے رات کے آغوش میں

کس قدر اشجار کی حیرت فزا ہے خامشی
بربطِ قدرت کی دھیمی سی نوا ہے خامشی

باطنِ ہر ذرۂ عالم سراپا درد ہے
اور خاموشی لبِ ہستی پہ آہِ سرد ہے

یکایک شاعر کی توجہ اس یاس انگیز منظر سے ہٹ کر سامنے گولکنڈہ کے قلعہ کی جانب مبذول ہوتی ہے اور کہتا ہے ؎

آہ! جولانگاہِ عالمگیر یعنی وہ حصار
دوش پر اپنے اُٹھائے سینکڑوں صدیوں کا بار

زندگی سے تھا کبھی معمور اب سنسان ہے
یہ خموشی اس کے ہنگاموں کا گورستان ہے

اپنے سکانِ کہن کی خاک کا دلدادہ ہے
کوہ کے سر پر مثالِ پاسباں استادہ ہے

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ منظر نگاری اقبال کے کلام میں وارداتِ قلب، جذباتِ ملت، نکاتِ فلسفہ اور حبِ وطن وغیرہ مضامین کو دلکش اور مؤثر بنانے کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ اس نظم میں یہ خصوصیت مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے، ان اشعار کو لیجئے:؎

ابر کے روزن سے وہ بالائے بامِ آسماں
ناظرِ عالم ہے نجمِ سبز فامِ آسماں

خاکبازی وسعتِ دُنیا کا ہے منظر اسے
داستاں ناکامیٔ انساں کی ہے ازبر اسے

ہے ازل سے یہ مسافر سوئے منزل جا رہا
آسماں سے انقلابوں کا تماشا دیکھتا

گو سکوں ممکن نہیں عالم میں اختر کے لئے
فاتحہ خوانی کو یہ ٹھیرا ہے دم بھر کے لئے

یا

کیا یہی ہے ان شہنشاہوں کی عظمت کا مآل
جن کی تدبیرِ جہانبانی سے ڈرتا تھا زوال

رُعبِ فغفوری ہو دُنیا میں کہ شانِ قیصری
ٹل نہیں سکتی غنیمِ موت کی یورش کبھی

بادشاہوں کی بھی کشتِ عمر کا حاصل ہے گور
جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور

شورشِ بزمِ طرب کیا عود کی تقریر کیا — دردمندانِ جہاں کا نالۂ شبگیر کیا

اور ؎

موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے — اس ستم گر کا ستم انصاف کی تصویر ہے

یا

اس نشاط آباد میں گو عیش بے اندازہ ہے — ایک غم یعنی غمِ ملت ہمیشہ تازہ ہے

صاف ظاہر ہے کہ مذکورہ آغاز سے شاعر کا مطلب فقط منظر نگاری نہ تھا بلکہ کچھ اور بھی، اگر حبِ ملی اور منظر نگاری کا کمال دیکھنا ہو تو "گورستانِ شاہی" اقبال کے اردو کلام میں بے نظیر چیز ہے۔

"نمودِ صبح" کے زیرِ عنوان ایک نظم ہے، یہ دراصل ایک قصیدۂ مدحیہ کے ابتدائی اشعار ہیں۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ منظر نگاری کا حق ادا کر دیا گیا ہے۔

وقت کی تنگ دامانی کی وجہ سے بعض لاجواب نظموں مثلاً "رات اور شاعر" اور "بزمِ انجم" کو مجبوراً نظر انداز کیا جاتا ہے۔

چونکہ شاعر نے اردو سے زیادہ فارسی میں طبع آزمائی کی ہے، یہ مضمون تشنہ رہ جائے گا، اگر فارسی منظومات میں سے اقتباسات آپ کے سامنے پیش نہ کئے جائیں۔ اقبال کی فارسی تصنیفات میں "پیامِ مشرق" ایک ایسا چمن بے خزاں ہے جس میں اقبال کی منظر نگاری کے اچھوتے اور مکمل نمونے بکثرت دستیاب ہوتے ہیں۔

بہار کا موسم اپنی پورے شکوہ سے جلوہ گر ہے۔ شاعر دعوتِ نظارہ دیتے ہوئے کہتا ہے ؎

خیز کہ در کوہ و دشت — خیمہ زد ابرِ بہار
مستِ ترنم ہزار
طوطی و درّاج و سار
بر طرفِ جوئبار
کشتِ گل و لالہ زار
چشم تماشا بیار

خیز کہ در کوہ و دشت　　خیمہ زد ابرِ بہار

شاعر کی عمیق نظر فقط بہار تک ہی محدود نہیں رہ جاتی بلکہ بہار کے تاثرات کا بھی مشاہدہ کرتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خیز کہ در باغ و راغ　　قافلۂ گل رسید

بادِ بہاراں وزید
مرغ نوا آفرید
لالہ گریباں درید
حسن گلِ تازہ چید
عشق غمِ نو خرید

خیز کہ در باغ و راغ　　قافلۂ گل رسید

نسیمِ صبح کی زبان سے کتنے لطیف اشعار کہلائے ہیں :؎

زروئے بحر و سرِ کوہسار می آیم　　ولیک من نہ شناسم کہ از کجا خیزم
بہ سبزہ غلطم و بر شاخ لالہ می پیچم　　کہ رنگ و بوز مساماتِ او بر انگیزم
خمیدہ تا نہ شود شاخ او ز گردشِ من　　بہ برگِ لالہ و گل نرم نرمک آویزم

ساربانِ حجاز اپنے ناقہ پر سوار جا رہا تھا۔ صبح ہو رہی ہے۔ اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے ؎

مہ ز سفر پا کشید　　در پسِ تل آرمید
صبح ز مشرق دمید　　جامۂ شب بر درید

بادِ بیاباں وزید
تیز ترک گام زن منزلِ ما دور نیست

شاعر نشاط باغ کشمیر میں بیٹھا ہے۔ بہار پورے جوبن پر ہے، دل پر جو کیفیت طاری ہو رہی ہے، اس کا اندازہ ان ان اشعار سے کیجیے ؎

زمیں از بہاراں چو بالِ تدروے　　ز فوارہ الماس بار آبشارے
چہ شیریں نوائے چہ دلکش صدائے　　کہ می آید از خلوتِ شاخسارے
نواہائے مرغِ بلند آشیانے　　در آمیخت با نغمۂ جویبارے

والدین - غالب کے باپ کا نام تمام تذکروں میں عبداللہ بیگ خاں درج ہے۔ مرزا کے کلام سے اس معاملے پر کچھ بھی روشنی نہیں پڑتی۔ لیکن مرزا کے باپ کا کچھ نہ کچھ نام تھا ضرور۔ کیونکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ اب سے کئی سو سال پہلے بھی ہندوستان میں باپوں کے نام ہوا کرتے تھے، مثلاً جہانگیر کے باپ کا نام جلال الدین اکبر اور ہمایوں کے باپ کا نام ظہیر الدین بابر تھا۔ اس تاریخی انکشاف کے بعد اگر قافیہ کی رعایت سے اسداللہ کے باپ کا نام عبداللہ تسلیم کر لیا جائے تو میرے خیال میں کچھ حرج نہیں۔

مرزا کی والدہ ماجدہ کا نام کسی کو معلوم نہیں ہو سکا لیکن انہوں نے اپنے ایک خط میں اس امر کی شکایت کی ہے کہ ایک شخص نے ان کو بڑھاپے میں ماں کی گالی دی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مرزا کی کم از کم ایک ماں ضرور تھی۔

تعلیم - معلوم نہیں مرزا نے تعلیم کہاں پائی۔ مجنوں کے زمانے میں کوئی باقاعدہ سکول تو تھا نہیں۔ صرف ایک دبستان تھا جس کی دیواروں پر مجنوں لام الف لکھا کرتا تھا۔ پس مرزا غالب گھر پر ہی پڑھے ہوں گے۔ بہرحال یہ ظاہر ہے کہ وہ جاہل نہیں تھے۔ اگر ناخواندہ ہوتے تو شعر کیوں کر لکھ سکتے۔ اور اتنی تصانیف کہاں آ جاتیں، انہوں نے اُردو اور فارسی میں نظم و نثر لکھی ہے۔ پس دو دونوں زبانیں جانتے تھے۔

پیشہ اور شغل :- مرزا کا سب سے بڑا پیشہ تو ظاہر ہے، دوسرا کام یہ تھا کہ شعر چن چن کر رسوا ہوتے تھے، خود مانتے ہیں کہ

شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

اس کے علاوہ بعض اور اشغال بھی تھے۔ مثلاً انہوں نے مصوّری بھی سیکھی تھی۔ فرماتے ہیں ؎

سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لئے ہم مصوّری　　تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے

کچھ مدت یہ شیوہ بھی رہا۔ کہ صبح سویرے کان پر قلم رکھ کر نکل پڑتے اور سارا دن لوگوں کے خط لکھتے پھرتے۔ اسی لئے کہتے ہیں :-

مگر لکھوائے کوئی ان کو خط تو ہم سے لکھوائے　　ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

مختصر حالات :- اب مرزا کے مختلف سوانح حیات سنئے، وقت کی تنگی کے باعث میں صرف چند ہی واقعات کے بیان پر اکتفا کروں گا۔

مرزا کی زندگی اگرچہ بستۂ عُسرت میں گزرتی تھی لیکن اس کے لئے اللہ میاں ذمہ دار تھے، خود مرزا کو اقرار ہے کہ خدا نے انہیں دونوں جہان دے رکھے تھے۔ سنئے

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا　　یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر وہ دونوں جہان گئے کہاں؟ جواب مرزا کے اس شعر میں موجود ہے ؎

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے　　یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

پس دونوں جہان بھی گھر کے ساتھ ہی لٹا دیئے ہوں گے مرزا غالب کا گھر نہ صرف ویران تھا بلکہ اس میں ویرانی سی ویرانی تھی۔ چنانچہ

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے　　دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

لیکن ان کا گھر وسیع نہ تھا۔ اور مرزا کو ورزش کے لئے یا شاید کرکٹ کھیلنے کے لئے بہت وسیع جگہ کی ضرورت تھی۔ اس لئے جنگل میں جا رہے تھے، فرماتے ہیں :- ؎

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم　　دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

عادات و خصائل:۔ مرزا بڑے سادہ لوح اور صاف دل انسان تھے اکثر ایسی حرکتیں کر بیٹھتے تھے جن کا نتیجہ نقصان یا تکلیف ہوتا تھا چنانچہ ایک دن محبوب کی گلی میں بیٹھے بیٹھے ذراسی غلطی کے باعث دربان سے چند یا گنجی کرالی کہتے ہیں ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے　　اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

ایک دن خود محبوب سے بھی مار کھائی لیکن قصور اپنا تھا۔ اس لئے نہایت ایمانداری سے اس کا اعتراف بھی کرلیا ہے۔ یعنی ؎

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں　　ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

اسی سادہ لوحی کی بدولت ایک دن محبوب کی حد سے زیادہ تعریف کرکے ایک غمخوار راز داں کو رقیب بنا لیا۔ ثبوت ملاحظہ ہو ؎

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا　　بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا

لیکن دیوانہ بکارِ خویش ہشیار کبھی کبھی رقیب کو جل بھی دے جاتے ؎

تا کرے نہ غمازی کرلیا ہے دشمن کو　　دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا

مرزا نجوم اور جوتش کے نہ صرف قائل تھے بلکہ محبت کے معاملے میں بھی جوتشیوں سے پوچھ گچھ کرتے رہتے تھے، اسی لئے کہا ہے۔

دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض　　اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

مرزا کا دل۔ غالبؔ کا دل عام لوگوں کی طرح خون کا قطرہ یا گوشت کا لوتھڑا نہ تھا، بلکہ آفت کا ٹکڑا تھا اور مرزا اس کی آوارگی کے شاکی تھے۔ ارشاد ہوتا ہے ؎　　میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے　　عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

لیکن اللہ میاں نے فضل کیا، اور مرزا کو جلد ہی اس سے رہائی مل گئی۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے سوزِ نہاں کا دورہ ہؤا۔ اور سارے کا سارا دل بے محابا جل گیا۔ مرزا نے اس واقعہ کا ذکر یوں کیا ہے ؎

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا　　آتشِ خاموش کے مانند گویا جل گیا

غالبؔ کے ناخن بہت جلد جلد بڑھتے تھے۔ چنانچہ زخم ابھی بھرنے بھی نہ پاتا تھا کہ ناخنوں کے کھرپے پھر کھدائی کے لئے تیز ہوجاتے، فرماتے ہیں ؎

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا　　زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

غالبؔ کا زمانہ:۔ غالبؔ کے زمانے میں دلی میں غمِ اُلفت کا قحط پڑ گیا تھا۔ اب خدا جانے کیا حال ہے، فرماتے ہیں :؎

ہے اب اس معمورہ میں قحط غمِ اُلفت اسدؔ　　ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہے کھائیں گے کیا

اس شعر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کی خوراک غمِ اُلفت تھی یا کم از کم غمِ اُلفت ان کی خوراک کا جزوِ اعظم تھا۔

لیکن اس قحط سالی میں ایک دو چیزوں کی ارزانی بھی تھی، مثلاً دل اور جاں بازار میں بکا کرتے تھے۔ اور ہر شخص خرید سکتا تھا۔ مرزا کو اس کا اعتراف ہے ؎ تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اُٹھیں گے　　لے آئیں گے بازار سے جاکر دل و جاں اور

اس زمانہ میں پورے سات آسمان تھے، اور سب کے سب دن رات گردش میں رہتے تھے۔ مرزا لکھتے ہیں ؎

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں　　ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

مرزا کے زمانے کی ایک عجیب خصوصیت یہ تھی کہ اگر کسی کو محبوب کا مُنہ معلوم نہ ہو سکے تو اس کی ہیمدانی کُھل جاتی تھی۔ ایک مرتبہ مرزا کی ہیمدانی بھی کُھل گئی جس کا اعتراف اس شعر میں موجود ہے :-

دہن اس کا جو نہ معلوم ہُوا — کُھل گئی ہیچمدانی میری

سب سے بڑی قباحت اس عہد کی یہ تھی کہ مجرموں کو سخت وحشیانہ سزائیں دی جاتی تھیں۔ چنانچہ مرزا غالب ایسے شخص کو بھی ایک مرتبہ کسی جُرم کی پاداش میں پنجرے میں بند کر دیا گیا لیکن زمانہ اس قدر خراب تھا کہ مرزا اس حالت کو بھی غنیمت سمجھتے تھے۔

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں — گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

غالب کا محبوب - مرزا کا محبوب بین الاقوامی شہرت کا مالک تھا اس کا نام سارے جہان کو معلوم تھا لیکن کسی ملک کسی شہر کسی گاؤں میں کوئی شخص بھی اس کا نام ستمگر کہے بغیر نہ لیتا تھا۔ مرزا کہتے ہیں ؎

کام اس سے آپڑا ہے کہ جس کا جہان میں — لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

اس محبوب کے عادات و خصائل بھی عجیب تھے، مثلاً گالیاں بہت دیا کرتا تھا - مرزا پوچھتے ہیں ؎

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب — یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

اسی طرح اگر کبھی مرزا شکوہ شکایت کریں تو وہ فوراً اُٹھ بھاگتا اور سارے رقیبوں کو جمع کر لیتا۔ اسی لئے مرزا جھنجلاتے ہیں ؎

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو — اِک تماشا ہُوا گِلا نہ ہُوا

جب وہ رقیب کی بغل میں سوتا تو مرزا کے خواب میں آکر پنہاں تبسم کیا کرتا تھا۔ اسی لئے مرزا کہتے ہیں ؎

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ — سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا

معشوق تھا تو ستمگر لیکن آخر میں بے طلب بوسے دینے لگا تھا۔ مرزا کی بدگمانی ملاحظہ ہو ؎

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خُو — دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

اس کے مذہب کے متعلق صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ غیر مسلم تھا۔ جبھی تو مرزا کو کہنا پڑا ؎

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسدؔ — غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

چند متفرق واقعات :- ایک دفعہ مرزا نے اُڑنے کی کوشش کی۔ اس زمانے میں ہوائی جہاز تو تھے نہیں کسی اور طریق سے اُڑے ہوں گے، لیکن جال میں پھنس گئے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے — اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

اس شعر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے کچھ مدت گھونسلے میں بھی گزاری۔

مرزا کا ایک دربان بھی تھا۔ جب مرزا کا گھر ویران ہو گیا تو اس کے لئے کوئی کام نہ رہا۔ مگر تھا وفادار۔ مرزا کا ساتھ نہ چھوڑا اور گھر میں سے گھاس کھود کر گزر اوقات کرتا رہا۔ مرزا فرماتے ہیں ؎

اُگا ہے گھر میں ہر سُو سبزہ ویرانی تماشا کر — مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

مرزا نے کئی مرتبہ بہشت کی سیر بھی کی۔ ایک مرتبہ بہشت سے واپس آکر محبوب سے فرماتے ہیں ؎

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت | یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

خواجہ خضر سے بھی مرزا کی اکثر ملاقاتیں ہوئیں۔ نصرت الملک کے قصیدہ میں فرماتے ہیں ؎

تو سکندر ہے۔ مرا فخر ہے ملنا تیرا | گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

لیکن خضر کو رہنمائی کے قابل نہ سمجھتے تھے۔ اسی لئے کہتے ہیں ؎

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں | مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

مرزا بزدل بھی تھے۔ ایک مرتبہ اُن کو چوروں کا سامنا ہوا تو دیکھتے ہی بھاگ نکلے لیکن دوڑ دھوپ کے باوجود پکڑے گئے۔ ایک ستم ظریف چور نے ڈانٹ کر کہا۔ کم بخت ہمیں اس قدر دوڑایا ہے، لے اب میرے پاؤں داب۔ اس واقعہ کو یوں نظم کیا ہے ؎

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ | ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں

مرزا اپنے رقیب کے دروازہ پر کم نہ زیادہ پورے ایک ہزار مرتبہ گئے۔ شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ محبوب بھی عمر بھر میں ہزار بار ہی رقیب کے گھر گیا ؎

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار | اے کاش جانتا نہ تری رہگزر کو میں

مرزا نے مرنے کے بعد بھی بہت سے شعر کہے اور کسی نہ کسی طرح اپنے شاگردوں تک پہنچا دیئے۔ انہوں نے دیوان میں شامل کر دیئے ان میں سے دو ایک شعر ملاحظہ ہوں ؎

اللہ رے ذوق دشت نوردی کہ بعد مرگ | ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد | مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

مرزا کا محبوب کہیں کعبہ کے گرد و نواح میں سکونت پذیر تھا۔ چنانچہ جب کبھی مرزا کو محبوب کے دروازے پر دھکے پڑتے تو وہ کعبہ کی جانب چل دیتے۔ فرماتے ہیں ؎

اپنا نہیں یہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں | اس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے

مجنوں عمر میں تو مرزا سے چھوٹا تھا ہی، اس کا انتقال بھی مرزا سے پہلے ہی ہوا۔ مرزا کہتے ہیں ؎

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ | مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

مرزا بیچارے کی موت بھی غریب الوطنی میں ہوئی۔ فرماتے ہیں ؎

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور | رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

موت یوں ہوئی کہ آخر عمر میں وحشت کے دورے پڑنے لگے تھے، ایک دن اسی حالت میں سر پھوڑ کر مر گئے۔ مرتے مرتے کہا ؎

مر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی ہے ہے | بیٹھنا اس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

معشوق کو یہ حال معلوم ہوا تو مروت نے جوش مارا اور دوڑا آیا۔ لیکن مرزا غریب میں ایک نظر دیکھ لینے کی طاقت بھی نہ رہی تھی۔ چنانچہ یہ شعر پڑھتے پڑھتے جاں بحق ہوئے ؎ مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے ۔ خوب وقت آئے تم اس عاشق بیمار کے پاس

لیجیئے صاحب، یہ ہے ہمارے خدائے سخن کی وہ صورت جو "تنقید عالیہ" کے آئینے میں نظر آتی ہے +

(ہری چند اختر)

شاہزادہ

مطبُوعات

مکاتیبِ غالب۔ ملک کے ادبی حلقوں کو مولوی امتیاز علی صاحب عرشی ناظمِ کتب خانۂ رامپور کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ اُنہوں نے رامپور کے شاہی کتب خانے میں سے غالب کے وہ خط جمع کرکے شائع کر دیئے جو نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں کے نام لکھے گئے تھے۔ نواب یوسف علی خاں غالب کے شاگرد تھے اور چونکہ اُن کی شاعری غالب کی شاگردی کے ساتھ ہی شروع ہوئی تھی اس لئے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اُن کا پہلا دیوان سر بہ سر غالب کا کلام ہے۔ اسلوبِ بیان سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے، اس کے علاوہ جب نواب صاحب اسیر مرحوم کے شاگرد ہوئے تو اُن کی شاعری کا رنگ قطعاً بدل گیا تھا۔ یہ کتاب ۱۱۷ خطوں کا مجموعہ ہے جن میں سے بیشتر میں پنشن اور روپے کا تقاضا اس قسم کے غیر خود دارانہ الفاظ میں کیا گیا ہے جو غالب کے مداحوں کے لئے خوشگوار نہیں ہو سکتے لیکن چونکہ یہ غالب کے الفاظ ہیں اس لئے غالب کے حقیقی شیداؤں کے لئے بہر حال نعمتِ غیر مترقبہ ہونے چاہئیں۔ ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ گو مرزا صاحب نواب صاحب کو "ولی نعمت" اور "آیۂ رحمت" سمجھتے تھے لیکن ادبی معاملات میں اُن کے سامنے بھی سر رشتۂ خودی نہ چھوڑتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ فارسی فرہنگ نویسوں پر مرزا نے کچھ اعتراض کئے جس پر نواب صاحب کے اہلِ دربار نے اعتراض کیا اور نواب صاحب نے بھی ناراضی ظاہر کی، اس پر مرزا صاحب نے جواب دیا "ان باتوں کو میں نے مانا لیکن نہ فرہنگ لکھنے والوں کی رائے کے بموجب بلکہ اپنے خداوند کے حکم کے مطابق۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُفتادگی اور بے چارگی کی حالت میں بھی اقلیمِ ادب کے اس بادشاہ کو یہ گوارا نہ تھا کہ کم از کم اس کی اپنی اقلیم میں کسی نا اہل کا سکّہ چلے۔

مکاتیب کی زبان وہی فصیح و سلیس اُردوئے مُعلّٰی ہے جو غالب کا طغرائے امتیاز ہے، کتاب نہایت نفیس کاغذ پر خوبصورت نسخ ٹائپ میں چھپی ہے۔ حجم ۱۳۵ صفحات ہے۔ نفیس اور مضبوط جلد پر کتاب کے نام کی ڈائی لگی ہے۔ تصویریں بھی ہیں۔ قیمت مجلد للعہ۔ سٹیٹ لائبریری رامپور سے طلب فرمایئے۔

مُسلم گرلز کالج میگزین:۔ یہ علی گڑھ کے مُسلم گرلز کالج کا رسالہ ہے جو مسز بسم اللہ نیاز احمد صاحبہ بی، اے، بی ٹی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ یہ رسالہ علی گڑھ کے مشہور زنانہ رسالے "خاتون" کا قائم مقام ہے لیکن چونکہ یہ مُسلم گرلز کالج سے وابستہ ہے اس لئے اس میں زیادہ تر اس کالج کی طالبات یا "اولڈ گرلز" کے مضامین ہی چھپتے ہیں۔ سر دست فی الحال یہ رسالہ سالانہ ہے لیکن اگر خواتین اس کی سرپرستی کریں جس کا یہ مستحق ہے تو ماہوار کر دیا جائے گا۔ کالج کی لڑکیوں کے مضامین قابلِ تعریف ہیں اور یہ رسالہ حوصلہ افزائی کا مستحق ہے۔

طرحِ نو:۔ یہ ماہوار اُردو رسالہ اُردو بک سٹال لاہور نے جاری کیا ہے اور اس کی ادارت مشہور نوجوان شاعر سراج الدین صاحب ظفر کے سپرد ہے جن کی شاعری ناظرینِ "ہمایوں" سے بھی خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔ اس رسالہ میں سیاسی اور ادبی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ روس کی طرحِ نو، عورت کی معاشی غلامی، آئندہ جنگ کی تیاریاں، ملکی اتحاد کی ضرورت مفید مضامین ہیں۔ چندہ سالانہ تین روپے

مجلّہ عثمانیہ:۔ یہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ ہے جو اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ مجلّہ عثمانیہ ہر طرح اس شاندار جامعہ کا رسالہ کہلانے کا مستحق ہے۔ ہندوستان کے کسی اور کالج کے رسالے میں اس قدر مفید اور ٹھوس مضامین شائع نہیں ہوتے طلبہ کے فاضلانہ مضامین یونیورسٹی کے طریقۂ تعلیم کی کامیابی کی روشن دلیل ہیں۔

(۱) **شہزادی گلنار** (۲) بچوں کی کہانیاں (۳) لال مُرغی (۴) ننھی مرغابی (۵) نیت کا پھل (۶) چھچھوندر (۷) چھوٹا جموں:۔ مندرجہ بالا سات چھوٹی چھوٹی کتابیں مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی نے بچوں کی تعلیم و تربیت اور دلچسپی کی غرض سے شائع کی ہیں۔ یہ سب کہانیوں کی کتابیں ہیں اور بچوں کی نفسیات کو پیشِ نظر رکھ کر بہت سادہ اور سلیس زبان میں لکھی گئی ہیں۔ بچوں کی دلچسپی کی اس سے بہتر کتابیں مشکل سے مِل سکتی ہیں۔ کتابت طباعت کاغذ نفیس ہے اور تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ قیمت علی الترتیب ۴ر ۔ ۲ر ۔ ۲ر ۔ ۲ر ۔ ۳ر ۔ ۲ر۔ مکتبۂ جامعہ ملیہ نئی دہلی سے طلب کیجئے۔

(۱) **اسلامی حکایات منظوم** (قیمت درج نہیں) (۲) سیرت حضرت جعفر طیار ۴ر (۳) اسلامی روایات ۶ر (۴) اسلام اور غلامی ۴ر (۵) اسلام اور غیر مسلم۔ یہ سب کتابیں محمد حفیظ اللہ صاحب پھلواری نے مرتب کی ہیں اور مُسلم اکیڈیمی پھلواری شریف سے مِل سکتی ہیں۔ اسلامی حکایات میں مشہور شعراء کی نظمیں درج ہیں، اسلامی روایات میں اسلامی تاریخ کے سبق آموز واقعات ہیں، دوسری کتابوں کا موضوع عنوان سے ظاہر ہے۔ اسلامی معلومات کے لحاظ سے یہ کتابیں بچوں کے لئے مفید ہیں۔

یادگارِ اظہر:۔ مولوی سید دلدار حسین اظہر کی طویل حمد حسنِ اہتمام کے ساتھ مجلّد شائع ہوئی ہے۔ اس میں انہوں نے خاص منقول کو ملحوظ رکھا ہے۔ قیمت درج نہیں۔ مصنف کے مدرسہ فوقانیہ دارالشفا حیدرآباد دکن سے مِل سکتی ہے۔

اسلامک برادرہڈ۔ مولوی محمد حفیظ اللہ کی "اسلامی مساوات" کا انگریزی ترجمہ از مولوی عبدالغنی۔ مقدمہ از سر محمد فخرالدین وزیر تعلیم بہار و اڑلیسہ۔ قیمت درج نہیں۔ پتہ: مُسلم بک ڈپو پھلواری شریف، پٹنہ

نغمۂ سرمدوش: فضل الدین صاحب فدا کی رباعیات کا مجموعہ۔ مرتبہ سید کاظم ایڈیٹر رسالہ کہکشاں دہلی جناب مرتب سے منگایئے۔

عروجِ زندگی۔ (افسانہ) مصنفہ ن حسن صاحب ایم۔ اے بی ٹی ایل ایل بی سکریٹری کتب خانہ انجمن ترقی اُردو کلکتہ قیمت ۸ر حضرتِ مصنف حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں بنگال میں اُردو زبان کے لئے کام کرنا ہر طرح قابلِ قدر ہے۔ کتاب جنابِ مصنف سے مِل سکتی ہے +

تبصرۃ الحکما معروف کلیاتِ طبِ جدیدہ: مصنفہ حکیم احمد الدین صاحب موجد طبِ جدید ایڈیٹر تبصرۃ الاطبا شاہدرہ لاہور طب

کے متعلق اس کتاب میں مفید معلومات درج ہیں۔ مختلف طریقہ ہائے علاج پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ طب سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیئے۔ بہت مفید معلوم ہوتی ہے۔ قیمت مجلد ہے۔ کتاب ضخیم ہے، پتہ: دارالکتب انجمن خادم الحکمت شاہدرہ لاہور۔

رومی اور اسلامی ادارۂ غلامی: تفصیلی موازنہ اور تقابلی مطالعہ مرتبہ محمد حفیظ اللہ صاحب ایم۔ اے عثمانیہ۔ قیمت ۴ر۔ پتہ: بزم قانون عثمانیہ کالج حیدرآباد دکن۔

کشف الظلام ترجمہ شفاء السقام:۔ علامہ تقی الدین سبکی کی تصنیف کا ترجمہ ہے۔ زیارت قبور، استمداد، توسل، تشفع، حیات انبیاء و شہداء، مقام محمود وغیرہ کے متعلق بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۱۲؍، پتہ: برقی پریس، سبزی باغ، بانکی پور

عیش دوست:۔ ایک عبرت آموز ناٹک مصنفہ پروفیسر خادم محی الدین صاحب، پتہ: قومی کتب خانہ لاہور۔ قیمت ۱۰ر تعارف حضرت کیفی دہلوی نے کرایا ہے۔ پلاٹ میں مصنف نے اس تنقیح کو لیا ہے کہ اولاد اور بالخصوص لڑکیوں کی شادی قرار دینے کے وقت اصولاً کن امور کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔

راز۔ یہ چند افسانوں کا مجلد مجموعہ ہے، جو محبوبیہ کارخانہ جلد سازی حیدرآباد دکن نے شائع کیا ہے۔ اس قسم کے مجموعے یہ کارخانہ آئندہ بھی بلاتعین وقت شائع کرتا رہے گا اور جو حضرات اپنے نام درج کرادیں گے اُن کو ہمیشہ ۵ر میں پہنچاتا رہے گا قیمت ہمیشہ ۵ر رہے گی۔

پیام عمل۔ شائع کردہ صدیق بک ڈپو امین آباد لکھنؤ۔ قیمت ۸ر۔ یہ کتاب محمد اسرائیل صاحب علی گڑھی نے مسلمانوں کی معاشری اور تمدنی اصلاح کی غرض سے لکھی ہے۔ اصلاح مفاسد کے خیال سے یہ کتاب مفید معلوم ہوتی ہے عام مسلمانوں کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے

تذکرہ سیفی۔ طاہر سیف الدین صاحب کے دہلی و شملہ کے حالات سفر قیمت ۹ر پتہ: مطبع نادری جبل پور۔

زوال غازی:۔ غازی امان اللہ خاں کے زوال کے اسباب پر اس مفصل کتاب میں عزیز ہندی صاحب نے بحث کی ہے قیمت ہے پتہ: ثنائی برقی پریس امرتسر۔

علامہ سیتاپوری:۔ از ڈاکٹر سید ناظم صاحب۔ ناشر: جامعہ ملیہ دہلی۔ قیمت ۴ر۔ اس کتاب میں فورٹ ولیم کالج کے رکن اعظم مولوی اکرام علی مترجم اخوان الصفاء کے حالات درج ہیں۔

انبساط روح: مصنفہ حاجی محمد عبدالغفور صاحب مشتاق و شوق۔ یہ مذہبی اور صوفیانہ نظموں کا مجموعہ ہے۔ کلام معمولی ہے۔ قیمت ۸ر پتہ: مولوی محمد منظور فاضل صاحب اٹالہ۔ الہ آباد۔

ذکر نبی: سوانح رسول مقبول از نصیر الدین ہاشمی، ہاشمی صاحب مشہور مصنف اور محقق ہیں۔ یہ کتاب جس کا حجم ۱۱۶ صفحات ہے قابل قدر ہے قیمت ۱۲ر پتہ:۔ مکتبہ ابراہیمیہ مصطفےٰ بازار حیدرآباد، دکن۔

ہاتھ کی عکسی تصویریں:۔ اس کتاب میں دیواروں پر ہاتھ کا سایہ ڈال کر مختلف جانوروں اور چوپایوں کی شکلیں بنانے کے

طریقے درج ہیں۔ بچوں کے لئے دلچسپ تفریحی مشغلہ ہے، کتاب میں تصویریں دی گئی ہیں۔ قیمت ۵ر پتہ: ایڈیٹر صاحب انڈین مجشین لونا شہر

دُنیا کے بچے: مختلف ممالک کے بچوں کی تصویریں اور حالات۔ بچوں کے لئے بہت دلچسپ اور پُر از معلومات کتاب ہے۔ پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔

فہرس کتب خانہ سٹی کالج:۔ مرتبہ غلام رسُول صاحب مددگار گورنمنٹ سٹی کالج حیدر آباد دکن۔ قیمت مجلّد عا۔ یہ فہرست جس سلیقہ اور حُسنِ اہتمام سے مرتّب کی گئی ہے، وہ قابلِ تعریف ہے۔ فہرست سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سٹی کالج کا کتب خانہ بہت اچھا ہے اور لائبریرین صاحب کو کتابوں کے جمع کرنے کا خاص خیال ہے۔ فہرست کی ترتیب میں جس جدّت اور اجتہاد سے کام لیا گیا ہے وہ یقیناً قابلِ داد ہے۔

حمید کے سَو شعر ۴ر۔ از حمید صاحب لکھنوی۔ کلام اچھا ہے۔ پتہ: مینیجر نامی پریس لکھنؤ

باز کے سَو شعر ۴ر۔ مرتبہ محمد واحد علی خاں صاحب باز۔ کلام اچھا ہے۔ کاشانۂ باز، بازار گھانسی، حیدر آباد دکن۔

خوشۂ پروین ۔۴ر۔ فضل الدین صاحب فدا دینا نگری کے سَو شعر۔ بعض شعر خوب ہیں۔ پتہ بابو فضل الدین فدا مال بابو دینا نگر گورداسپور

ہوش کے ناخن: دلچسپ ڈراما از مخدوم محی الدین صاحب بی اے عثمانیہ۔ حیدر آباد کی سماجی زندگی کا مرقع۔ قیمت درج نہیں۔ پتہ احمدیہ پریس چار مینار حیدر آباد دکن۔

شب چراغ:۔ محمد صادق صاحب ضیاء کے نَو افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت ۸ر۔ پتہ:۔ قصر الادب، دفتر شاعر، آگرہ۔

صہبائے راز: حضرت گویا جہان آبادی کی قابلِ مطالعہ نظم۔ قیمت ۱ر پتہ: العرش پریس۔ بریلی۔

اصلِ حیات از حضرت گویا جہان آبادی۔ منکرینِ حیات بعد الموت کو مدلّل جواب۔ قیمت ۴ر۔ پتہ: رفارم سوسائٹی بریلی۔

رُباعیاتِ جذب: از راگھوندر راؤ صاحب جذب۔ مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ۔ حجم ۱۰۰ صفحات۔ کلام پاکیزہ اور عارفانہ ہے۔ قیمت ۸ر

متاعِ سخن۔ انتخاب کلام نواب عزیز یار جنگ بہادر از ڈاکٹر محی الدین زور قادری۔ قیمت ۱۲ر۔ اُستادانہ کلام ہے۔ پتہ: کتابستان، الہ آباد (یو پی)

مصطفٰے کمال پاشا۔ از سید اشفاق حسین صاحب ایم اے ہیڈ ماسٹر گوریانی ضلع روہتک۔ قیمت مجلد عہ۔

زندگی: یہ مشہور جرنلسٹ مُلّا رموزی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ حجم ۲۱۲ صفحات۔ قیمت عا۔ پتہ: مکتبہ ابراہیمیہ محدود حیدر آباد۔ دکن

قنوج کی راجکماری۔ سنجوگتا اور پرتھی راج کا منظوم قصّہ۔ قیمت ۶ر۔ پتہ: محمد اسلم خاں، صدر بازار، کرنال۔

رموزِ کلامِ غالب:۔ از محمد اسحاق صاحب امرتسری۔ قیمت ۸ر۔ پتہ: دفتر رسالہ "بادۂ تمام" کلکتہ۔

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہ جون ۱۹۳۸ء

تصویر: جنگ کے دنوں میں

شمار	مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ
۱	بزمِ "ہمایوں"	بشیر احمد	۴۱۸
۲	محمد اقبال (نظم)	حامد علی خاں	۴۲۰
۳	جہاں نما	"	۴۲۲
۴	مرحوم اقبال کی یادیں	جناب محمد افتخار الحق صاحب	۴۲۵
۵	زندۂ جاوید اقبال (نظم)	منشی تلوک چند صاحب محروم	۴۲۷
۶	ہندوستان کی قومی زبان	حضرتِ راحل ہوشیارپوری	۴۲۸
۷	اقبال کے آخری لمحات (نظم)	حضرتِ مقبول احمد پوری، بی۔اے	۴۳۰
۸	گورنر کے اختیارات	جناب محمد صدیق صاحب تاونی بی۔اے، ایل، ایل، بی	۴۳۲
۹	پیغمبرِ دینِ خودی (نظم)	حضرتِ حفیظ ہوشیارپوری ایم۔اے	۴۴۳
۱۰	کوارنٹین (افسانہ)	جناب سردار راجندر سنگھ صاحب بیدی	۴۴۴
۱۱	علامۂ اقبال مرحوم (نظم)	جناب مولوی مظفر حسین صاحب شمیم انجمن ترقیٔ اردو ہند	۴۵۳
۱۲	تربیتِ جنسی	جناب نعمان شاغل بھوپالی	۴۵۴
۱۳	اللہ والا فلسفی (نظم)	جناب سید علی منظور صاحب حیدرآبادی	۴۵۸
۱۴	اُمیدوں کی دُنیا (افسانہ)	حضرتِ حفیظ ہوشیارپوری	۴۶۰
۱۵	اقبال رح (نظم)	حضرتِ شاد عارفی رامپوری	۴۶۵
۱۶	دعوت (افسانہ)	جناب پروفیسر سید فیاض محمود صاحب ایم۔اے	۴۶۶
۱۷	تاریخ وفات ڈاکٹر سر اقبال مرحوم	حضرتِ اطہر ہاپوڑی	۴۷۶
۱۸	برقع (ڈراما)	جناب بابر بٹالوی بی۔اے	۴۷۹
۱۹	محفلِ ادب		۴۸۵
۲۰	مطبوعات		۴۹۰

چندہ سالانہ صہ ششماہی سے (مع محصول) — قیمت فی پرچہ ۸ر

بزمِ ہمایوں

اُس ادیب یا ادب پسند کے لئے جسے سوائے ادب کے دنیا کی کسی اَور چیز سے واسطہ نہ ہو، ادب ایک دل خوش کُن حقیقت ہے، کم ازکم ایک پُرامن جائے پناہ ہے لیکن اُس کے لئے جو زندگی کے کسی اور شعبے سے بھی تعلق رکھتا ہو یا رکھنے پر مجبور ہو زندگی چین اور بے چینی کے کھلاڑیوں کے درمیان ایک جنگ یا مقابلہ ہے بلکہ اس بیان میں بھی ایک غلطی ہے۔ پورا امن شاید صرف اُس ادیب کو نصیب ہے جس کے لئے ادب دماغی عیش وعشرت ہو ورنہ کہاں زندگی کا کوئی کام اور کہاں پُورا امن ؟

اُردو کے اہلِ ادب اپنی غفلت یا نیکیوں میں مست تھے کہ زندگی کا ایک نیا فلسفہ اور سیاست کا ایک تازہ طوفان اُن پر ٹُوٹ پڑا ورنہ وہ خوب اپنے مزے میں پڑے اپنے طرح مصرعوں پر غزلیں لکھتے اور ایک دُوسرے کے بامعنی و بے معنی کلام پر سر دُھنتے تھے نئے فلسفے نے انہیں جنجھوڑا اور نئی سیاست نے اُن کی زبان اور رسم الخط کو جڑ سے اُکھیڑ پھینکنا چاہا۔ اُن میں سے بعض پوچھتے ہیں کہ کیا ایسی خوبصورت اور نفیس چیزوں کا یوں قلع قمع کیا جاسکتا ہے ؟ نامناسب ناممکن! انہیں کیا معلوم کہ ان سے پہلے کتنے مغلوں اور ہلاکوؤں اور چنگیز خانوں نے کتنی نفیس وخوبصورت چیزوں کو تہ تیغ کر ڈالا، پھر عجب کیا ہے کہ ان کی تمدنی پیداوار بھی کسی نئے قومی انقلاب کے پاؤں تلے روندی جانے والی ہو!

ڈاکٹر اقبال رح سے ان ہی مشکلوں کا چند ہی ماہ ہوئے میں ذکر کر رہا تھا اور مایوسانہ لہجے میں اُن سے اس کے متعلق رائے طلب کر رہا تھا کہ میری ساری ہی دلایل کے مقابل میں انہوں نے ایک مسکراہٹ کے پنجابی میں بے تکلفی سے جواب دیا تو یہ دیا کہ ایسے ہی نہ رہنے دیجیے آپ کی اُردو برابر قائم رہے گی!

کیا ہوگا یہ تو ہمیں معلوم نہیں۔ ہمیں کیا کرنا ہے ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے۔ آج کل ہر لڑائی بہت سے محاذوں پر لڑی جاتی ہے اُردو کی لڑائی کے بھی بہت سے محاذ ہیں۔ ایک وہ محاذ جہاں متین ادیب اور غافل شاعر علم و ادب کے موتی بکھیرتے ہیں، جہاں بڑے بڑے عالم فاضل ہزاروں لُغت کی اور اور کتابیں کھولے اُردو کی نئی قاموسیں تیار کر رہے ہیں۔ ایک اَور محاذ ہے جہاں روزانہ اخبار اپنی بارود تیار کرتے ہیں اور اپنی بندوقیں سر کرتے ہیں علمی وادبی رسالے ان دونوں محاذوں کے درمیان ہیں کشمکش و پیچ میں ہیں اُنہیں پتہ نہیں چلتا کہ امن سے ادبی کام کریں یا اپنی زبان کے لئے غُل مچائیں۔ ایک اور محاذ پر سیاست کی ہولی کھیلی جا رہی ہے ریزولیوشن تراشے جا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے نقص بیان کئے جاتے ہیں، کبھی تُو تُو مَیں مَیں ہے اور کبھی صلح کی گفتگوئیں ہیں، اِس میں بڑے بڑے سیاست دان اور بڑے بڑے رُوحانی رہنما شامل ہیں۔ اسی طرح چند چھوٹے چھوٹے محاذ اور بھی ہیں۔

سوال تو صرف یہ ہے کہ ہر شخص اپنے لئے کونسا محاذ انتخاب کرتا ہے؛ محاذ کا انتخاب لازم ہے گو بارہا خود حالات ہی اس انتخاب کو عمل میں لے آتے ہیں اور انتخاب کنندہ مُنہ تکتا رہ جاتا ہے۔ پھر بھی سرکاری طور پر انتخاب ہمارے ہاتھوں میں ہے اور ہم اس سے رُو گردانی نہیں کر سکتے۔

خوش قسمت ہیں وہ جنہیں صرف ایک ہی محاذ پر کام کرنا پڑتا ہے، وہ دوسروں کی حالت سے ناآگاہ ہیں لیکن اُنہیں ایک گونہ امن تو نصیب ہے، یکسوئی تو ہے، اپنا کام کر رہے ہیں بُرا ہو یا بھلا۔ ایک خبط ہی سہی، ایک اعتقاد ہی سہی، اپنے دائرے میں بند ہی ہوں، غنیمت ہے کہ کچھ کر رہے ہیں اور بہت اطمینان رکھتے ہیں:

جو کرنا ہے تجھ کو کر ، جو ہونا ہے ہونے دے

حضرت آصل ہوشیارپوری اپنے گرامی نامہ مورخہ ۲۰ مئی میں لکھتے ہیں:-

"ہمایوں بابت مئی ۱۹۳۸ء کی ترتیب خاص طور پر قابلِ تعریف ہے۔ رسالے کی ابتدا اقبال مرحوم کے ذکر سے ہوتی ہے آخری مضمون بھی اقبال پر ہے۔ اس مضمون کے نیچے گرامی مرحوم کے متعلق اقتباسات۔ اس سے آگے گرامی کے آقا زلوہ نواب معظم جاہ کا کلام۔ غالب کی سوانحعمری، غالب کے کلام سے (منقول از شیرازہ) کے بعد مکاتیب غالب پر ریویو!

بابوجی کے بعد منظومات "اظہارِ اُلفت" اور "محبوب کی قبر پر" کے بعد "محبت کی نیرنگیاں"، نیرنگیوں کے بعد "کرشمہ" کیا عمدہ ترتیب ہے۔ اقبال کے متعلق اڈیٹر کی نثر اور جائنٹ ایڈیٹر کی نظم۔ پھر حامد اور حبیب، اور راحل و حفیظ دو بھائیوں کی دو جوڑیاں بزمِ ہمایوں میں نظر آتی ہیں۔ "یادِ گرامی" میں گرامی کی رائے اقبال کے متعلق اور اقبال کی تصویر کے نیچے گرامی کا شعر، واہ سبحان اللہ! گرامی صاحب کے شعر اور حفیظ کی تاریخ "پیغمبرِ دینِ خودی" میں جو مناسبت ہے ظاہر ہے۔ میں اس ترتیب سے بے حد محظوظ ہوا۔"

بشیر احمد

محمد اقبال

فنا پرخندہ زن اقبال عالی گوہری تیری
کہ ہے صورت نما اللہ کی صورت گری تیری

لرز جاتا ہے جذبِ عشقِ حق سے عرش کا پایہ
ہٹاتی ہے پرے جبریل کو بھی بے پری تیری

پھر اب کرّوبیانِ عرش کو اک سجدہ لازم ہے
عروجِ آدمِ خاکی کا زینہ رہبری تیری

انا الحق گو ہے عشقِ حق میں بندوں کی خودآگاہی
بناتی ہے خدا، انسان کو صنعت گری تیری

سکھائے چیونٹی کو تو نے آدابِ سلیمانی
گدا ہو خسروی جس کی، وہ دولت بے زری تیری

رسول اللہ کے پیغام کی تفسیر کی تو نے
چلی ختم الرسل کے بعد بھی پیغمبری تیری

یہ فوق الخلق تخلیق اور یہ صد جلوہ پیدائی
مسلّم ہے جہانِ شاعری میں داوری تیری

حامد علی خاں

۱۸ مئی ۱۹۳۸ء

(۱)

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

اقبال

(۲)

حجازی نے نواز آئے نہ آئے
دلوں میں پھر گداز آئے نہ آئے
سکندر تو ابھی آئیں گے لاکھوں
کوئی آئینہ ساز آئے نہ آئے

حامد علی خاں

(۳)

چو رخت خویش بر بستم ازیں خاک
ہمہ گفتند با ما آشنا بود
و لیکن کس ندانست ایں مسافر
چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

اقبال

(۴)

خودی کا اور خدا کا رازداں تو
ابد سیایہ کا ترجماں تو
پیامبر ابد تیری ہدایات
چراغ فروز دیں تیری زباں تو
نقیبِ شانِ مہدی آخر زماں تو

حامد علی خاں

جہاں نما

اتحادِ ہندو مسلم اور آزادئ ہندوستان

غلام قوموں کی سب سے بڑی بدبختی یہ ہوتی ہے کہ اپنے دورِ زوال میں اُن کا ہر عمل شعوری یا غیر شعوری طور پر غیر ملکی آقاؤں کے مصالح کی تکمیل کا ذریعہ بن جاتا ہے، اس سے زیادہ تکلیف دہ یہ بات ہوتی ہے کہ جو لوگ آزادی حاصل کرنے کے لئے بیقرار نظر آتے ہیں وہ خود بھی حکمرانوں کے پیدا کئے ہوئے فریبوں کا اس طرح شکار ہو جاتے ہیں کہ خود اُن کے اعمال ہی اپنی غلامی کی بنیادوں کو اور زیادہ استوار کرنے لگتے ہیں۔ حاکم قوم دستورِ حکومت میں بعض ایسی خصوصیات رکھ دیتی ہے جن سے اہلِ ملک میں چھوٹے چھوٹے معاملات کے متعلق اندرونی جھگڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ فریب خوردہ عوام اور اُن سے بڑھ کر اُن کے رہنما موہوم اور بے حقیقت مقاصد کے اس دامِ فریب میں یوں گرفتار ہو جاتے ہیں کہ آزادی کا اہم ترمقصد نظر انداز ہو جاتا ہے۔ جب کبھی غلاموں میں آزادی کا ولولہ پیدا ہوتا ہے حکمران قوم ہمیشہ ایک نیا دام پھیلا دیتی ہے اور قیامت یہ ہے کہ غلام اس دام کی حقیقت سے واقف ہونے کے باوجود بھی اس میں گرفتار ہونے کے لئے کھنچے چلے آتے ہیں ۔

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر پھر سُلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

۱۹۱۹ء کے فسادات کے بعد جو بیداری اس ملک میں پیدا ہوئی تھی اس کا بھی یہی حشر ہوا۔ یہ ایک خدا ساز بات تھی کہ ہندو اور مسلمان کچھ دیر کے لئے آپس میں مل بیٹھے تھے لیکن مغربی سیاست نے جلد ہی اپنی زنبیل سے مانٹیگو چیمسفرڈ اصلاحات کی ہڈی نکال کر ان کے سامنے ڈال دی نتیجہ یہ ہوا کہ یہ دونوں مُردار کی اس بے مغز خشک ہڈی کو چچوڑنے کے لئے بیقرار ہو کر ناخن و چنگال سے ایک دوسرے پر حملہ آور ہو گئے اور دونوں طرف کے بڑے بڑے لیڈر بھی اس ہنگ میں شامل نظر آنے۔ دیکھتے دیکھتے وہ اتحاد خواب و خیال ہو گیا جس کی برکت سے ملک نے اس قدر طاقت پیدا کر لی تھی کہ فراعنۂ وقت بھی "ننگے فقیروں" کے سامنے جھکنے لگے تھے اور آزادی کی منزل آنکھوں کے سامنے نظر آ رہی تھی۔

اس کے بعد جب غلامی کی پُرانی شراب آئینِ جدید کی نئی بوتل میں ڈال دی گئی تو ملک اور زیادہ بدمست ہو گیا۔ یہ حقیقت سب نے فراموش کر دی کہ طاقت پیدا کئے بغیر کبھی کوئی "داتا" آزادی نہیں دیا کرتا اور طاقت اتحاد اور ایک متحدہ محاذ کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی ملک کی فعال ترین جماعت کا یہ زوال بہت عبرت ناک ہے کہ وہ اپنے بلند مقاصد کو بھول کر جھوٹی آزادی کے کھلونے سے بچوں کی طرح کھیلنے لگی ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ ملک اگر آج پوری طرح متحد ہو جائے تو ہمارے مطالبات کے تسلیم کرنے جانے میں بہت زیادہ ڈھیل نہ ہوگی۔ لیکن مغربی سیاست کے نت نئے ہتھکنڈے ملک کے ہر فرقے کو اتحاد کی نعمت سے دور ہی دور لے جا رہے ہیں ۔

اس سلسلے میں ہندو قوم کی حالت سب سے زیادہ افسوسناک ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ سب سے زیادہ غافل ہے بلکہ اس لئے کہ وہ سب سے زیادہ بیدار ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اُس عالی حوصلگی سے کام نہیں لیتی جس کی وہ اہل ہے۔ ہندوؤں کو اس ملک میں محض عظیم ترین اکثریت ہی حاصل نہیں بلکہ وہ ہر لحاظ سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ علم، تجارت، دولت، سیاسی تدبّر، سیاسی اقتدار، ہر میدان میں وہ آگے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اقلیتوں سے ڈرتے ہیں۔ حالانکہ اگر اقلیتوں کے مطالبات اپنے حدود سے متجاوز بھی ہوں اور ہندو قوم اتحاد و یگانگی کے اہم مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے، ایک بڑے بھائی کی طرح عالی حوصلگی سے کام لے کر انہیں تسلیم بھی کرلے تو اس کی ہستی کسی طرح خطرہ میں نہیں پڑ سکتی۔ ہندوؤں کو ملک میں اتنی عظیم اکثریت حاصل ہے کہ اگر وہ بلا وجہ بزدل نہ بنیں تو کوئی اقلیت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی خواہ وہ اپنے تناسب آبادی سے کچھ زیادہ حقوق ہی کیوں نہ حاصل کرلے ۔

اقلیتوں کا معاملہ ہی دوسرا ہے۔ ان کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں جس ملک کی قوی ترین اور روشن خیال ترین اکثریت اتنی بزدل اور تنگ حوصلہ ہو اس کی پسماندہ اقلیتوں کا جو حال ہو سکتا ہے ظاہر ہے ؏

قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا

ملکی جمعیت کا موجودہ انتشار ہماری غلامی کی زنجیروں کو روز بروز زیادہ مضبوط کر رہا ہے اور اس انتشار کی سب سے بڑی ذمہ دار ملک کی بیدار ترین فعال جماعت ہے۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ یہ جماعت عملاً نااتفاقی کی تلقین کرتی ہے بلکہ افسوس یہ ہے کہ اس جماعت نے اتحاد کے مقصد عظیم کو ایک عرصے کے لئے پس پشت ڈال دیا اور اس سے قطعاً غافل ہوگئی۔ حالانکہ اس کا سیاسی تدبر اس بات کا متقاضی تھا کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ایثار اور بلند حوصلگی کا مظاہرہ کر کے ملک کی تمام جماعتوں کو اپنا حلقہ بگوش بنا لیتی اور ایک متحدہ ہندوستان آزادی کی منزل کی طرف برابر جادہ پیما رہتا ۔

ہندوستان کا مستقبل

گذشتہ دنوں ہندوستان کے موجودہ حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے پنڈت جواہر لعل نہرو نے یہ حقیقت بیان کی کہ "ہماری صوبجاتی حکومتوں کو جو قوت حاصل ہے، اس کا ماخذ نظامِ حکومت نہیں بلکہ خود کانگرس کی تنظیمی قوت ہے، جنگ اور انقلابات کے اس دَور میں کوئی بات بعید از امکان نہیں۔ اس زمانے میں ہمارے بچاؤ کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ ہم پُرامن رہ کر اپنی اندرونی طاقت بڑھاتے رہیں۔ لیکن کوئی رستہ خطرات سے خالی نہیں ہوتا اس لئے ہمیں گوناگوں دشواریوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر وقت مستعد رہنا چاہیئے ہمارے راستے میں کچھ کم رکاوٹیں نہیں ہیں۔ غیروں کی مخالفت سے زیادہ ہمیں اپنی اندرونی کمزوریوں کے خلاف جدوجہد کرنی ہے کسی دشمن کے

خلاف لڑنے کے مقابلہ میں اپنی کوتاہیوں کے خلاف جہاد کرنا زیادہ دشوار ہوتا ہے ہمیں دونوں طرح کا مقابلہ درپیش ہے۔ ہمارے اندر بہت سی سماجی خرابیاں ہیں جنہیں قدیم رسم و رواج اور عقاید نے غیر معمولی تقویت بہم پہنچا رکھی ہے۔ یہ حالات موجودہ یہ بات قابلِ اطمینان ہے کہ ہم میں اب ایک نئی بیداری ضرور پیدا ہو رہی ہے۔ فضا میں انقلاب کے جراثیم سرایت کر چکے ہیں۔ غربا اپنی فاقہ کشی اور مصیبت کا خاتمہ کر دینے پر تلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دنیا بھر پر جنگ کے مصائب اور جنگ کے خطرات کے بادل چھا رہے ہیں۔ ہندوستانی اب پہلے کی طرح دوسروں کے ہاتھ میں آلۂ کار براری بنے رہنے پر تیار نہیں۔ یہ ملک اب خود اپنی قسمت کا مالک بننا چاہتا ہے، ہندوستان اگرچہ مشینوں اور کارخانوں کو زیادہ پسند نہیں کرتا مگر وہ انہیں اس زمانے میں ترقی کا ایک ناگزیر ذریعہ ضرور سمجھتا ہے اور وہ ان کے وجود کو کسی نہ کسی طرح اپنے معتقدات سے ہم آہنگ کرنے کا خواہشمند ضرور ہے۔ ہمارے ملک کا سب سے بڑا مسئلہ زراعتی مسئلہ ہے بڑے بڑے زمینداروں کا اجارہ غریب کاشتکاروں کی ترقی کے راستے میں بری طرح حائل ہے ایک زبردست زراعتی انقلاب کے بغیر اس مصیبت کا علاج ممکن نہیں لیکن زراعتی انقلاب کے باوجود بھی شہری اور قصباتی بے روزگاروں کی ایک کثیر تعداد موجود رہے گی جن کے لئے کام کرنے کے لئے صنعتی کارخانوں کی تنظیم کی ضرورت ہوگی ۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر

سنہ	صدر	مقام
سنہ ۱۹۰۶ء	نواب وقار الملک	ڈھاکہ
سنہ ۱۹۰۷ء	آدم جی پیر بھائی	کراچی
سنہ ۱۹۰۸ء	سر سید علی امام	امرتسر
سنہ ۱۹۰۹ء	ہز ہائی نس آغا خاں	دہلی
سنہ ۱۹۱۰ء	سید نبی اللہ	ناگپور
سنہ ۱۹۱۱ء	نواب سلیم اللہ	کلکتہ
سنہ ۱۹۱۲ء	میاں سر محمد شفیع	لکھنؤ
سنہ ۱۹۱۳ء	سر ابراہیم رحمت اللہ	آگرہ
سنہ ۱۹۱۵ء	مسٹر مظہر الحق	بمبئی
سنہ ۱۹۱۶ء	مسٹر محمد علی جناح	لکھنؤ
سنہ ۱۹۱۷ء	مولانا محمد علی (نظر بند ہو گئے)	کلکتہ
	راجہ محمد علی محمد خاں	
سنہ ۱۹۱۸ء	مسٹر اے کے فضل الحق	دہلی
سنہ ۱۹۱۹ء	حکیم اجمل خاں	امرتسر
سنہ ۱۹۲۰ء	ڈاکٹر مختار احمد انصاری	ناگپور
سنہ ۱۹۲۱ء	مولانا حسرت موہانی	احمد آباد
سنہ ۱۹۲۳ء	مسٹر غلام محمد بھرگری	لکھنؤ
سنہ ۱۹۲۴ء	سر سید رضا علی	بمبئی
سنہ ۱۹۲۵ء	سر عبد الرحیم	علی گڑھ
سنہ ۱۹۲۶ء	شیخ سر عبد القادر	دہلی
سنہ ۱۹۲۷ء	مولوی سر محمد یعقوب	کلکتہ
سنہ ۱۹۲۸ء	سر محمد علی محمد خاں	کلکتہ
سنہ ۱۹۲۹ء	ڈاکٹر سر محمد اقبال	الہ آباد
سنہ ۱۹۳۱ء	چودھری سر ظفر اللہ خاں	دہلی
سنہ ۱۹۳۳ء	میاں عبد العزیز	کلکتہ
سنہ ۱۹۳۴ء	خان بہادر حافظ ہدایت حسین	دہلی
سنہ ۱۹۳۶ء	سر سید وزیر حسین	بمبئی
سنہ ۱۹۳۷ء	مسٹر محمد علی جناح	لکھنؤ
سنہ ۱۹۳۸ء	مسٹر محمد علی جناح	کلکتہ (اجلاس خاص)

مرحوم اقبال سچا محبِ وطن تھا۔ وہ غلامی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اس کے رگ و ریشہ میں آزادی کی محبت سرایت کر چکی تھی۔ اس نے شہنشاہی کا طلسم توڑ کر رکھ دیا ؎

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ اِنَّ الْمُلُوْک
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سُلا دیتی ہے اُس کو حکمراں کی ساحری

وہ مسلمان کے افلاس سے بھی پوری طرح واقف تھا۔ اُس کی جہالت، پیر پرستی کو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ خوابیدہ مریدوں کی بیداری کا نقشہ کس جوش سے دکھایا ہے ؎

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

آہ! او دُنیائے حاضر کے سب سے بڑے انسان، اب ہم ہمیشہ کے لئے تیرے کلام سے محروم کر دیئے گئے۔ او محسنِ اعظم تُو قوم کا حقیقی معنوں میں لیڈر تھا۔

تیری زندگی قوم پر قربان ہوئی۔ تُو نے سوتی ہوئی قوم کو جگایا۔ مُردہ روحوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔

اقبال! تُو صبر و استقلال کا دیوتا تھا، تُو نے آخری دم تک ملک و قوم کی خدمت سے جی نہ چرایا۔ تجھ کو یقین تھا کہ اب میں کوئی دم کا مہمان ہوں لیکن پھر بھی تُو نے اپنا کام جاری رکھا اور ملت پر جان نثار کی۔

اقبال! موت سے پہلے جو الفاظ تیری زبان سے نکلے وہ ہمارے کانوں میں ہمیشہ گونجتے رہیں گے" میں مسلمان ہوں میں موت سے نہیں ڈرتا۔ جب موت آئے گی میں متبسم چہرے کے ساتھ اس کا خیر مقدم کروں گا"

مرنا سب کو ہے۔ دُنیا کی ہر چیز فانی ہے۔ غیر فانی صرف خدائے واحد کی ذات ہے۔ لیکن تیرے جانے سے جو نقصانِ عظیم قوم کو پہنچا ہے اُس کی تلافی ناممکن نظر آتی ہے۔

او دلیر حوصلہ رکھنے والے رہنما! قوم کے حقیقی بہی خواہ! الوداع! ہمیشہ کے لئے اور آخری الوداع!

محمد افتخار الحق
از خوشاب

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پر یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقتِ قیام آیا (اقبال)

زندۂ جاوید اقبال

قطعہ

ظاہر کی آنکھ سے جو نہاں ہو گیا تو کیا
احساس میں سما گیا، دِل میں اُتر گیا!
کُنجِ مزار میں تنِ خاکی کو چھوڑ کر
قدسی نژاد اوجِ سماوات پر گیا!
کاشانۂ بقا میں مسافر پہنچ گیا
ویرانۂ فنا سے سلامت گزر گیا!
باغِ جہاں میں صورتِ گلہائے تر رہا
باغِ جناں میں مثلِ نسیمِ سحر گیا!
خاکِ چمن میں گوہرِ شبنم نہاں نہیں
خورشید جلوہ بار سے پوچھو کدھر گیا؛
"ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق"
روشن ترا اِس حقیقتِ روشن کو کر گیا!
محرومؔ! کیوں ترے دلِ حرماں نصیب کو
یہ وہم ہو گیا ہے کہ اقبال مر گیا!

تلوک چند محرومؔ

ہندوستان کی مشترکہ زبان

خدا معلوم کیونکر آگئی اُردو زباں مجھکو ۔۔۔ میں کسرائی، وطن طہران، مسکن گونڈوانے میں

(زینت بیگم عالیہ تمکین بانو پروین بنت مرزا عاشق حسین بزم مرحوم)

حقیقت یہ ہے کہ صرف اُردو ہی ہندوستان کی مشترک زبان (لنگوا فرینکا) بننے کی صلاحیت رکھتی ہے اور صلاحیت کا کیا ذکر ایک بڑی حد تک وہ لنگوا فرینکا بن چکی ہے ۔

مسٹر گولڈ سٹریم آئی، سی ایس (ریٹائرڈ)

(ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کے ایک جلسہ میں اب سے تقریباً سولہ برس پیشتر)

زبان کا مرتبہ

تمام دُنیا کے کاموں میں اپنی زبان کا مرتبہ سب سے بڑا ہے ۔ اور زبان کا مدار نازک بیانی و پاکیزہ خیالی پر ہے ۔ میں اپنی زبان پر اپنا وقت اور روپیہ خرچ کرنا تمام مُلکی و قومی نیکیوں سے کہیں بہتر سمجھتا ہوں اور کتنی ہی زیر باری اور دردِ سر ہو اس مشغلہ کو اعلےٰ درجہ پر پہنچائے بغیر نہ رہوں گا ۔

اُردو کا قصور صرف یہی ہے کہ آپ کی زبان ہے ۔ اور کسی کی ہوتی تو خدا جانے کس مرتبہ کو پہنچ جاتی ۔

خان بہادر میر ناصر علی مرحوم

صدائے بازگشت

"جس طرح اُردو زبان ہندو مسلمان دونوں قوموں کی زبانوں سے مُرکّب ہے ، اسی طرح انجمن ترقیِ اُردو دونوں قوموں سے یکساں تعلق رکھتی ہے اور دونوں قوموں کا فرض ہے کہ زبان اُردو کو وسیع معنوں میں قومی زبان یا مُلکی زبان تصوّر کر کے اس کو ترقی دینے کی کوشش کریں اور یہ زبان جس اتحادِ اقوام کی یادگار ہے اُس کو دونوں قومیں مل کر زندہ اور تازہ رکھنے میں ذرا کوتاہی نہ کریں ۔ لیکن فرض کرو کہ دوسری قوم جس کے ساتھ ہمارا چولی دامن کا ساتھ ہے اور جو اُردو زبان پر وہی حق رکھتی ہے جو ہمارا حق ہے ، اس حُبِ وطن کی منزل میں کسی خاص وجہ سے ہمارا ساتھ نہ دے ، جس کو میں بدقسمتی کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتا ، تو پھر اے فرزندانِ اسلام ! تم اپنے فرض سے کیوں غفلت کرو ۔ تم اس محبوب زبان کو ترقی دینے اور اس کو بلند ترین درجہ تک پہنچانے میں کیوں کوتاہی کرو ۔ یاد رکھو کہ اگر تم اپنا فرض ادا کرو گے اور اپنی جدّ و جہد سے ایک قدم پیچھے نہ ہٹو گے اور اپنے اس قومی یا مُلکی منصوبہ کو پیشِ نظر رکھ کر برابر آگے بڑھتے اور منزلِ مقصود کے قریب پہنچتے جاؤ گے تو وہ جو کسی غلطی سے اصلی شاہراہ کو چھوڑ کر کسی اور پگڈنڈی پر چل پڑے ہیں اور وہ جو کوتاہ بینی یا غفلت سے بھائیوں کا ساتھ چھوڑ کر منزل سے دُور جا رہے

ؔ ان کا سلسلۂ نسب کسریٰ شہنشاہ ایران سے ملتا ہے اور ان کی والدہ یورپین تھیں ۔

ہیں تمہارے نقشِ قدم کو پھر تلاش کریں گے، تمہارے قافلہ کے جرس کی صدا پر پھر کان لگائیں گے، تمہاری گردِ راہ کی پرواز کو پھر آنکھیں کھول کر اور دور بین لگا کر دیکھیں گے۔ اپنی پگ ڈنڈی کے انجام پر منزلِ مقصود کو نہ پا کر پھر اس اصلی شاہراہ پر قدم فرسا ہوں گے۔ اُس وقت سمجھیں گے کہ نجات کا آبِ حیات جس کی تلاش میں وہ نکلے تھے تعصب و نفاق کے رستے پر چلنے سے اس کے کنارے تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس وقت وہ دَوڑ دُھوپ کریں گے تاکہ خضرِ اتحاد کا سُراغ لگائیں اور اس کی دستگیری سے آبِ حیات کے چشمے تک پہنچیں۔

بس اے فرزندانِ اسلام! تمہارا فرض ہے کہ اُس وقت کے آنے تک اپنے فرض کے انجام دینے میں سرگرم رہو اور پیچھے پھر پھر کر اپنے بھائیوں کو دیکھتے جاؤ اور یہ خیال دل میں رکھو کہ آخر وہ بھائی ہیں، برادرانہ محبت کا جوش کب تک ان کے دلوں کو بے چین نہ کرے گا، غلط فہمیوں کا غبار کب تک ان کی آنکھوں کو دُھندلا کرتا رہے گا، کب تک وہ یہ نہ جانیں گے کہ جس منزل پر تم چل رہے ہو اُس پر تمہارے اور اُن کے آبا و اجداد پہلے عرصۂ دراز تک چلتے رہے ہیں کب تک وہ یہ نہ سمجھیں گے کہ تمہارے اور اُن کے اسلاف دونوں نے مل کر اس رستے کو خس و خاشاک سے پاک کیا تھا۔ اس کے نشیب و فراز کو ہموار کیا تھا۔ اس کے کناروں پر جا بجا سنگِ نشان قائم کئے تھے، پھر دونوں طرف کوسوں تک پھولوں اور میووں کے درخت قطار در قطار لگائے تھے۔ اب یہ وہی منزل ہے جس میں تم آگے بڑھنا چاہتے ہو اور تمہارے بھائی اس منزل کے سرے سے دوسرا رستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں اور اپنی نئی پگ ڈنڈی کی داغ بیل ڈال کر اس کو اس منزل کی طرح آراستہ و پیراستہ کرنا چاہتے ہیں۔ آخر کب تک یہ تنگ مزاجی اور تنگ چشمی باقی رہیگی۔ کب تک سرد مہری اور بے پروائی سے کام لیا جائے گا۔ بڑھو! آگے بڑھو!! نہ اپنے فرض کو بھولو اور نہ اپنے بھائیوں کو بھولو۔ وہ وقت آج نہیں تو کل ضرور آئے گا جبکہ ہمارے بھائی اسی منزل کو پھر محبت کی نگاہ سے دیکھیں گے جس پر ہمارے اور اُن کے آبائے کرام مدت تک گامزن رہے ہیں۔"

مولوی سید وحید الدین سلیم مرحوم

(از خطبۂ صدارت انجمن ترقی اُردو، سالانہ اجلاس بمقام سورت۔ دسمبر ۱۹۱۸ء)

داخل ہوشیار پوری

اقبال کے آخری لمحات

دل بُجھ رہا ہے آنسو آنکھوں سے بہ رہے ہیں
اقبال سب سے رخصت ہو کر یہ کہہ رہے ہیں

پھر نیند میں خودی کو اپنی سُلا نہ دینا
میرا پیام دِل سے اپنے بھُلا نہ دینا

بُجھتا ہے دل تو کیا غم، آنسو بہیں تو بہہ لیں
اِک بات وقتِ آخر ہم تم سے اور کہہ لیں

میری نوائے دل پر تُم دِل سے غور کرنا
خود دار بن کے جینا خود دار بن کے مرنا

دِل بُجھ چکا ہے آنکھیں بھی خُوب رو چُکی ہیں
سَیلِ سرشکِ غم سے دامن بھگو چُکی ہیں

اِک دلرُبا اندھیری ہرسمت چھا رہی ہے

خوابِ فنا کی پیاری سی نیند آرہی ہے

ہم طوفِ شمعِ وحدت کا قصد کر رہے ہیں

اپنی خودی سے بھی اب آگے گزر رہے ہیں

خوش ہیں کہ سونے والو تم کو جگا کے چھوڑا

تُم کو خودی سے اپنی آگہ بنا کے چھوڑا

کیا خوفِ مرگ ہم کو زندہ ہیں سب کے دِل میں

رہتے ہیں عزم بن کر ہر قلبِ مضمحل میں

دُنیا میں تھے وطن تھا سارا جہاں ہمارا

عقبیٰ میں ہیں وطن ہے کون و مکاں ہمارا

صَد شُکر پیشِ حق بھی ہم نیک نام پُہنچے

لمحاتِ آخری کا سب کو سلام پُہنچے

مقبُول

ہندوستان کے آئینِ نو میں گورنر کے اختیارات

آئین جدید دو خصوصیتوں کا حامل ہے۔ اوّل فیڈریشن، دوم صوبجاتی خود مختاری۔ اوّل الذکر یعنی برطانوی اور ریاستی ہند کا وفاق ابھی تک عمل میں نہیں آیا، مگر صوبجاتی خود مختاری کا یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو سرکاری طور پر نفاذ کیا گیا۔ سطورِ ذیل میں صوبجاتی حکومت کے سب سے اہم جزو یعنی گورنر کے اختیارات اور اُس کی آئینی حیثیت پر بحث کی گئی ہے۔ یہ سوال اس لئے اور بھی اہم ہو گیا کہ پچھلے دنوں کانگرس نے بھی (جو ہندوستان کی سب سے بڑی منظم سیاسی جماعت ہے) کچھ پس و پیش کے بعد نئے آئین کے ماتحت وزارتیں قبول کر لی ہیں۔ کانگرس کا سب سے بڑا اعتراض گورنر کے اختیارات کے متعلق تھا، وہ چاہتی تھی کہ گورنر، وزراء کی آئینی کارروائیوں میں مداخلت نہ کرے۔ گورنر کے اختیارات کی کیا نوعیت ہے؛ اور کیا واقعی گورنر کی مداخلت ہندوستان کے قومی و ملکی مفاد کے لئے مضر رساں ہے؛ ان دو سوالوں پر ہمیں بحث کرنا ہے:۔

ظاہر ہے کہ یہ سوال آئینی پیچیدگیوں سے خالی نہیں اور ان پر کوئی قطعی حکم لگانا خطرے سے خالی نہیں کیونکہ ان سوالوں کا تعلق آئین کے عملی پہلو سے ہے نہ کہ نظری سے۔ جب تک ہمیں نئے آئین کا عملی تجربہ نہ ہو ہم قطعی طور سے اس کے اثرات کو نہیں جانچ سکتے، تاہم اُن آئینی دفعات سے جو گورنر کے اختیارات اور ذمہ داریوں کی تشریح کرتے ہیں کچھ نہ کچھ نتائج مرتب کئے جا سکتے ہیں جو ظاہر کریں گے کہ کہاں تک گورنر کی مداخلت ہمارے سیاسی ارتقاء اور قومی مصالح کے مفید یا مُضر ثابت ہو سکتی ہے۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ صوبجاتی خود مختاری سے کیا مُراد ہے؛ برطانوی پارلیمنٹ کی ہمیشہ یہ حُجت رہی ہے کہ وہ کاروبارِ سلطنت میں ہندوستانیوں کو تعلیم دے گی تا آنکہ وہ اس قابل ہو جائیں کہ اُن کے مُلک کی حکومت اُن کو سونپ دی جائے۔ اس سیاسی سکیم کی پہلی قسط ۱۹۱۹ء کا آئین تھا جس کے ماتحت صُوبوں میں "دو عملی" حکومت کا نفاذ کیا گیا۔ مسٹر مانٹیگو اور مسٹر چیمسفورڈ کا خیال تھا کہ صُوبوں میں اس قسم کی تعلیم بہتر اور زیادہ خوشگوار نتائج پیدا کرے گی، لہٰذا مرکزی حکومت کو چھوڑ کر پارلیمنٹ نے ہندوستانیوں کو صوبوں میں محدود سیاسی قوت دی۔ سائمن کمیشن نے بھی صوبجاتی تجربہ کی سفارش کی اور جب نئے آئین کی ترتیب و تدوین کا کام شروع ہوا تو سلیکٹ کمیٹی نے بھی یہی خیال ظاہر کیا کہ مرکز کو چھوڑ کر صوبوں میں ہندوستانی وزراء کو صوبے کی حکومت دینی چاہئے۔ اس پالیسی کے زیرِ اثر موجودہ آئین پُرانی دو عملی کو رد کر کے تمام سیاسی قوت ہندوستانی وزراء کے سپرد کرتا ہے، یہ ہندوستانی وزراء اُن محکموں کی نگرانی اور انتظام کے لئے جو نئے آئین کے ماتحت اُنہیں سپرد

کیئے گئے ہیں ایک ایسی مجلس قانون ساز کے سامنے جواب دہ ہیں جو عوام کی نمائندہ تصوّر کی جاتی ہے۔

یہ حکومتِ خود اختیاری کی ابتدا ہے۔ رفتہ رفتہ جب ہندوستانیوں میں حکمرانی کی استعداد، برطانوی تدبّر و سیاست کے معیار کے مطابق پیدا ہو جائے گی تو حکومت اُن کو سپرد کر دی جائے گی ——— اور وہ پابندیاں جو کسی نہ کسی مصلحت کے زیر اثر آج کل ہندوستانی وزراء پر عائد کی گئی ہیں، ہٹالی جائیں گی۔ یہ منتہا ہوگا ہندوستان کے سیاسی ارتقاء کا ——— آئین جدید صوبے کے نظم و نسق کا افسرِ اعلےٰ گورنر کو تصوّر کرتا ہے۔ گورنر شہنشاہِ ہند کا نمائندہ ہے، گورنر کو مشورہ دینے کے لئے وزراء کا ایک کابینہ ہوگا جو ہر معاملہ میں گورنر کی راہنمائی کرے گا ماسوا اُن مخصوص حالات کے جن میں پارلیمنٹ کی طرف سے گورنر پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ وہ اپنے ذاتی فہم و منشا کے مطابق عمل کرے۔ بظاہر صوبے میں پولیس، عدالت، مالیات، تعلیم وغیرہ سب کا انتظام ایسے وزیروں کو سپرد کیا گیا ہے جو عوام کی رائے کے مطابق چُنے گئے ہیں اور جو عوام کی نمائندہ مجلس قانون ساز کے سامنے جواب دہ ہیں یہاں تک کہ اگر عوام کی نمائندہ یہ جماعت وزراء کے کام سے مطمئن نہ ہو تو وہ ان کے اختیارات سلب کر سکتی ہے اور اُن کے بجائے ایک زیادہ معتبر جماعت کو حکومت دے سکتی ہے۔

آئین کی دفعات کے سرسری مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا گورنر کے اختیارات ایک نگراں کی حیثیت سے زیادہ نہیں مگر ایک عمیق نظر بتا سکتی ہے کہ حقیقت کچھ اور ہے اور باوجود اس کے کہ تمام قوت ہندوستانی وزراء کو تفویض کر دی گئی ہے گورنر کے اختیارات اس قدر وسیع ہیں کہ وہ صوبے کے ہر انتظامی شعبہ میں مداخلت کر سکتا ہے۔ . . . . .

گورنر کی قوت تین حصّوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے: ۱۔ گورنر کی مخصوص ذمہ داریاں، ۲۔ خصوصی اختیارات، ۳۔ گورنر کی آئین سازی کی قوت۔

ذیل کے تبصرہ میں بجائے اس کے کہ ہر قوت پر جُداگانہ بحث کی جائے یہ کوشش کی گئی ہے کہ ان سب قوتوں کا ایک ہی جگہ ذکر کر دیا جائے جن کی بدولت گورنر کسی معاملہ میں مداخلت کر سکتا ہے۔

گورنر کی سب سے پہلی ذمہ داری صوبہ میں ہر امن سوز تحریک یا قوت کا انسداد کرنا ہے، ظاہر ہے کہ امن کا تعلق صوبے کے انتظام سے ہے لہٰذا یہ ذمہ داری اُس وزیر پر عاید ہونی چاہئے جو صوبہ کی پولیس، عدالت اور اُس کے ضمنی اداروں کے انتظام کے لئے مجلس قانون ساز کے سامنے جواب دہ ہے مگر ایسا نہیں کیا گیا، لہٰذا باوجود اس کے کہ ایک ہندوستانی وزیر صوبہ کا منتظم ہوگا، پھر بھی وہ اپنی ذمہ داری پوری طرح محسوس نہ کرے گا کیونکہ آخری ذمہ داری گورنر پر عاید ہوتی ہے اور گورنر حکومت کے ہر شعبہ میں اس ذمہ داری کی بدولت مداخلت کر سکتا ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ فلاں وزیر کا کوئی حکم صوبہ کے امن کے لئے خطرناک ہوگا اور واضح رہے کہ اس بات کا فیصلہ کہ کوئی چیز گورنر کی مخصوص ذمہ داریوں کے تحت میں آتی ہے صرف گورنر پر منحصر ہے

اور اُس کا فیصلہ کسی عدالت میں نہیں جانچا جا سکتا۔) مزید برآں گو پولیس وزیر کے دستِ اختیار میں ہے تاہم اُس کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ پولیس کے انتظام یا بھرتی کے لئے کوئی قانون بنائے۔ یہ اختیار صرف گورنر کو ہے۔

فرض کیجئے کہ کسی صوبہ میں انارکسٹ صوبہ کے امن میں خلل اندازی کرتے ہیں، قدرتاً وزیرِ انتظامیہ کا فرض ہے کہ وہ ایسی خلافِ قانون کارروائیوں کا انسداد کرے۔ مگر ایسا نہیں۔ نیا آئین گورنر کو اختیار دیتا ہے کہ وہ ایسے موقعوں پر اپنی مخصوص قوتوں سے کام لے اور اپنے کابینہ کے مشورہ کے بغیر جو مناسب سمجھے کرے، وزیرِ انتظامیہ کو اتنا بھی حق نہیں کہ وہ گورنر کو رائے دے یہی نہیں بلکہ آئین اجازت دیتا ہے کہ ایسے حالات میں گورنر ایک خاص افسر انارکسٹ فتنہ کے انسداد کے لئے مقرر کر سکتا ہے یہ افسر مجلسِ قانون ساز کا ممبر ہوگا، وہاں ہر بحث میں اور اجلاس کی عام کارروائی میں حصہ لے سکتا ہے اُس کے اختیارات ایسے ہی ہیں جیسے کہ ایک منتخب شدہ ممبر کے.... (مگر یہ افسر کسی معاملہ میں رائے نہیں دے سکتا) آئین کی یہ دفعہ صاف ظاہر کرتی ہے کہ ابھی تک ہندوستانی وزرار اس قابل نہیں کہ اُن پر اعتماد کیا جا سکے۔ بجائے اس کے کہ ہر معمولی انتظام کی طرح انارکسٹ جیسے فتنوں کا انتظام بھی وزیر کے سپرد کیا جائے آئین ایک نئی مشین بہم پہنچاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مجلس قانون ساز کا منتخب کردہ نمائندہ (وزیرِ انتظامیہ) مجلس کی بحث و تنقید سے بچ جاتا ہے۔ اس کے بجائے ایک خاص افسر گورنر کی کارروائیوں کی وضاحت کرے گا۔ ایسا افسر کہاں تک اپنی ذمہ داری محسوس کرے گا، اس کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

اس خیال کی تائید کہ نیا آئین ہندوستانی وزرار پر زیادہ اعتماد نہیں کرنا چاہتا اس سے ہوتی ہے کہ خفیہ پولیس کی تمام کارروائیاں صیغۂ راز میں رکھی جائیں گی اور کوئی شخص اُن تک راہ نہیں پا سکتا حتےٰ کہ وزیرِ انتظامیہ خود ـــ البتہ صرف وہ پولیس افسر جنہیں انسپکٹر جنرل اجازت دے یا وہ اشخاص جن پر گورنر کی نظرِ کرم ہو خفیہ پولیس کی کارروائیوں تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

ہندوستانی وزیر کے ہاتھ سے انتظامی ادارہ کی اصلی قوت چھین لینے کے لئے یہی کافی تھا کہ صوبہ کا انتظام اور امن گورنر کی مخصوص ذمہ داری بنا دیا جائے، اُس پر خصوصی اختیارات دینا اور وزیر کو خفیہ پولیس کی کارروائیوں سے دُور رکھنا، نئے آئین کو نہایت غیر مرغوب رنگ میں ظاہر کرتا ہے۔

گورنر کی دوسری ذمہ داری اقلیتوں کی جائز خواہشات کا تحفظ ہے ـــ اس ضمن میں یہ معلوم کرنا بہت ضروری ہے کہ اقلیت سے کیا مُراد ہے۔ اقلیت معاشی، مذہبی، لسانی ... کئی حیثیت سے تصور کی جا سکتی ہے۔ غالباً ہندوستان میں اقلیت سے مُراد ایک مذہبی گروہ سے ہے۔ یہ اقلیتوں کے مفاد کا تحفظ کب اور کس طرح ہندوستانی سیاست کا "لاینحل" مسئلہ بنا۔ یہ معلوم کرنا خالی از دلچسپی نہیں۔ غالباً ۱۹۰۶ء سے پہلے یعنی سر علی امام اور سر آغا خاں کے شملہ ڈیپوٹیشن سے پہلے ہندوستانی لفظ اقلیت سے بھی شناسا نہ تھے۔ مسلمانوں کو ہندو اکثریت کے سامنے اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کا خیال ہوا اور اُنہوں نے لارڈ منٹو سے درخواست

کی کہ وہ ان کے مفاد کا تحفظ آئینی شکل میں کریں۔ لارڈ منٹو[1] نے اُن کے اس مطالبہ کو منظور کیا اور آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان جُداگانہ نیابت اور انتخاب کے حقدار ہیں —— قومی سیاست کو اس قسم کے تحفظات سے جو نقصان پہنچ سکتا ہے اُس پر بحث کرنا موجودہ موضوع سے خارج ہے۔ مگر اس کا قدرتی نتیجہ جو جلد یا بدیر ظاہر ہونے والا تھا وہ یہ ہُوا کہ اب دوسرے مذہبی گروہ بھی اپنے مخصوص مفاد کو آئینی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان مطالبات کا نتیجہ "کمیونل اوارڈ" ہے۔ یہی نہیں بلکہ نیا آئین نسلی اقلیت کو بھی تسلیم کرتا ہے اور اینگلو انڈین جماعت کو ریلوے ملازمتوں پر خاص حقوق عطا کئے گئے ہیں۔

یہ قیاس کرنا کہ اقلیتوں کے مفاد کو اکثریت کے تدبر و سیاست پر چھوڑ دینا چاہئے ایک سخت غلطی ہے، کوئی نظامِ حکومت مطمئن اقلیت کے بغیر زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتا۔ ہر وہ ملک جہاں اقلیت غیر مطمئن ہے، جہاں کی اقلیت کو اکثریت پر بھروسہ نہیں، جہاں اقلیت اپنی زندگی کو دوسروں کے رحم و کرم پر مبنی تصوّر کرتی ہے ہمیشہ بدنظمی اور سیاسی پیچیدگیوں میں مبتلا رہیگا یہ سب سچ ہے مگر سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اقلیتوں کے تحفظ کا کیا طریقہ ہے۔ کیا اُن کے "جائز" مطالبات کو آئین میں منضبط کر دینا چاہئے یا جائز مطالبات کا فیصلہ کسی شخصِ واحد کی رائے پر منحصر ہونا چاہئے۔ نیا آئین آخری صورت کو قبول کرتا ہے لہٰذا گورنر اس بات کا فیصلہ کرے گا کہ کسی اقلیت کے کیا حقوق کس وقت، کہاں اور کیسے غصب کئے گئے ہیں۔ گورنر کو ایسا شخص خیال کیا گیا ہے جو کبھی غلطی نہ کرے، وہ ایسی مشین ہے جو خارجی اثرات سے محفوظ ہے، اس کا فیصلہ ہر قسم کی نکتہ چینی اور نظرِ ثانی سے بالاتسلیم کیا گیا ہے مگر کیا یہ سب کچھ ہندوستان کی مکدّر سیاسی فضا اور پارٹی گورنمنٹ میں ممکن ہے؟ اس کا جواب مستقبل دے گا۔

گورنر کی ذمہ داری اقلیتوں کے "جائز" مفاد کا تحفظ ہے۔ آئین نو میں لفظ "جائز" کی کہیں تشریح نہیں کی گئی۔ قدرتاً لفظ "جائز" کا اطلاق ہر اُس چیز پر ہو سکتا ہے جسے گورنر کا دماغ قبول یا ایجاد کرے۔[2]

خِرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خِرد   جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

بلاشبہ اقلیت کو اکثریت پر بھروسا اور یقین ہونا چاہئے مگر بھروسے اور یقین کی جگہ دِل ہے نہ کسی کی چوکھٹ!

اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اقلیتوں کے حقوق کا تصفیہ بجائے مجلسِ قانون ساز کے گورنر کے ڈرائینگ روم میں ہُوا کرے گا۔ ہر وہ ہندوستانی جو پچھلے بیس پچیس برس کی سیاسی تاریخ سے واقف ہے اس قسم کے آئینی تحفظات کے عملی نتائج کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے۔

علاوہ ازیں اقلیتوں کی خواہشات کا تحفظ اس طرح بھی کیا گیا ہے۔ کہ اُنہیں جُداگانہ نیابت اور انتخاب عطا کیا گیا ہے

---

[1] لارڈ مارلے وزیرِ ہند نے ان مطالبات کو آئینی شکل دینے سے انکار کر دیا تھا۔

[2] راما سوامی۔ نئے آئین پر ایک نظر۔

اُن کے نمائندے مجلسِ قانون ساز میں اپنے مطالبات پیش کر سکتے ہیں اور اُن مطالبات کا منوانا اقلیت کی معنوی قوت پر جو اُس کی تنظیم اور سیاسی ارتقا سے وابستہ ہوگی، منحصر ہوگا۔

یہ سمجھنا کہ گورنر ہر دفعہ اقلیت کا تحفظ کر سکتا ہے پارٹی گورنمنٹ کی عملی سیاست سے ناواقفی کا نتیجہ ہے۔ اگر کوئی اکثریت کسی اقلیت کے حقوق غصب کرنے کا تہیہ کرلے تو گورنر کے سامنے صرف دو راستے کھلے ہیں، یا تو وہ اقلیت کے حقوق کا تحفظ نہ کرے یا اکثریت کو دبانے کی غرض سے تمام نظامِ حکومت کو پلٹ دے۔ نئے انتخابات ہوں، نئی وزارت بنے اور مجلسِ قانون ساز میں اقلیت کی سیاسی حیثیت بھی بدل جائے۔ کیا کوئی گورنر ہمیشہ مؤخر الذکر طریقہ اختیار کر سکتا ہے۔

اقلیتوں کو اور تقویت دینے کے لئے "پرچۂ ہدایات" (Instrument of Instructions) گورنر کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ حتی الامکان اُن کے نمائندہ کو کابینہ میں جگہ دے۔ مگر یہ ضروری ہے کہ یہ اقدام کابینہ کی مجموعی ذمہ داری کو گزند نہ پہنچائے۔ گورنر کہاں تک اس ہدایت پر عمل کر سکتا ہے وہ پچھلے چند دنوں کی صوبجاتی سیاست نے واضح کر دیا ہے۔ اڑیسہ کیبنٹ میں کسی مسلمان وزیر کو جگہ نہیں دی گئی مسلمانوں نے گورنر سے استدعا کی کہ وہ اپنی مخصوص ذمہ داری اور "پرچۂ ہدایات" کی بدولت مداخلت کرے اور اقلیت کے مفاد کا خیال کرتے ہوئے ایک مسلمان وزیر کو کابینہ میں جگہ دے ــــ گورنر نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ اس کی رائے میں اقلیتوں کے حقوق ہر طرح سے محفوظ ہیں۔

ظاہر ہے بحالاتِ موجودہ اقلیتوں کے جائز مفاد کا گورنر کے ہاتھ میں ہونا قومی اور ملکی مصالح کے بھی خلاف ہے اور اقلیتوں کو بھی اُن کے حسب منشا فائدہ پہنچانے سے قاصر ہے۔ اِن حالات میں دوسری صُورت یہی ہوسکتی ہے کہ وہ بُنیادی حقوق جو کسی قوم کی مذہبی، ثقافتی، لسانی اور سیاسی زندگی کے حفظ و بقا کے لئے ضروری ہیں آئین میں منضبط کر دیئے جائیں اور جب بھی مجلسِ قانون ساز میں ایسا قانون پیش کرنے کی کوشش کی جائے جو کسی اقلیت کے حقوق پر ناروا حملہ ہو تو قانون کے جواز و عدم جواز کا فیصلہ فیڈرل کورٹ جیسے ادارہ کے سپرد کر دیا جائے، جس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ آئین کی تشریح کرے۔ فیڈرل کورٹ کا یہ اہم ترین فرض ہے کہ وہ آئین کے متعلق تمام مسائل کا فیصلہ کرے اس لئے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ کیوں اقلیتوں کا مسئلہ بھی اسی غیر جانبدار ادارہ کے سپرد نہ کر دیا جائے۔ گورنر کا فیصلہ چاہے کتنا ہی حق بجانب ہو مگر اس پر ہمیشہ شک کی نظریں پڑیں گی، ایسے فیصلہ میں روایتی تعصب، نسلی امتیاز اور حاکمانہ مصلحت اندیشی کی جھلک نظر آئے گی۔ مگر عدالت کا فیصلہ ہاے دماغ کے علاوہ نفسی رجحانات پر بھی اثر انداز ہوتا ہے، لہٰذا ایسا فیصلہ زیادہ قابلِ قبول ہوتا ہے اور آئین پسند دماغوں پر جو سیاسی جد و جہد کے علمبردار ہوتے ہیں، عدالت کی انصاف پسندی نقش ہو جاتی ہے، جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ مابہ النزاع مسائل امن و آشتی سے طے پا جاتے ہیں۔ ورنہ دوسری صُورت میں ہمیشہ گورنر کا فیصلہ خود ایک مسئلہ بن جاتا ہے، جس کا حل

خطرناک نتائج کا حامل ہوتا ہے، آزادی طلب قوم، بدیسی حکمرانوں کے عمل کو شک کی نظروں سے دیکھتی ہے۔ اقلیتوں کے رہنما ہر اُس فیصلہ کو جو کسی دوسری اقلیت کو تھوڑا سا فائدہ پہنچائے، اپنے لئے "مضر اور آئندہ جنگ" کے لئے ایک بہانہ بنا لیتے ہیں۔ قسمتی سے نیا آئین ان نتائج کا کوئی تسلی بخش حل پیش نہیں کرتا۔ گورنر کو اتنی قوت بے دی گئی ہے کہ وہ اُسے کسی پارٹی، کسی گروہ، کسی اقلیت کو "سیاسی انعام" دینے کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔

گورنر کی تیسری ذمہ داری ملازمتوں کے متعلق ہے، آئین چاہتا ہے کہ گورنر ملازموں اور اُن کے متعلقین کے اُن حقوق کی نگرانی کرے جو قانوناً اُن کو بخش دیئے گئے ہیں ۔۔ اس دفعہ کی پہلی شق یہ ہے کہ گورنر ملازمتوں کے جائز حقوق کا تحفظ کرے۔ دوسری شق کا اثر ہماری قومی سیاست کے لئے مضر نہیں ہو سکتا کیونکہ اُن کا تعلق زیادہ تر پنشن یا ملازمتوں پر حقوق وغیرہ سے ہے، مگر پہلی شق زیادہ واضح الفاظ میں بیان نہیں کی گئی، یہاں بھی لفظ "جائز" استعمال کیا گیا ہے اور اس "جائز" کا فیصلہ کرنے والا صرف گورنر ہے ۔۔ اس میں شک نہیں کہ ملک کا انتظام بغیر ایک ایسی منتظم جماعت کے جو اپنے آپ کو، مشاہرہ اور مدتِ ملازمت کے متعلق محفوظ خیال کرے، محال ہے۔ کیونکہ نمائندہ حکومت (Representative Government) ایک ایسی جماعت کے سپرد ہوتی ہے جس کا قیام مجلسِ قانون ساز پر منحصر ہوتا ہے۔ کابینہ کی مدتِ حیات غیر مستقل ہوتی ہے، لہٰذا حکومت کی پالیسی ہمیشہ بدلتی رہتی ہے، مگر یہ پالیسی جاری کرنے والا محکمہ ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ یہ محکمہ جانتا ہے کہ انتظامی مشکلات کیا ہوتی ہیں۔ نئی پالیسی کس طرح جاری کرنی چاہئے۔ قانون کیسے نافذ کئے جاتے ہیں وغیرہ۔ الغرض اس محکمہ کا تجربہ ہر حکومت کے لئے ضروری اور لازم ہوتا ہے، ظاہر ہے یہ تجربہ حاصل کرنے کے لئے ملازموں کی ایک مطمئن جماعت موجود ہونی چاہئے، ایسی جماعت تیار کرنے کے لئے آئین اُن کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے، مگر ان حقوق کا محافظ گورنر کو بنانا قوم پرستوں کے نزدیک قابلِ اعتراض ہے۔ انڈین سول سروس، انڈین میڈیکل سروس وغیرہ ملازمتوں کے قانون وزیرِ ہند کے منشا کے مطابق بنتے ہیں، ان کا "تقرر و تنزل" اس کے ہاتھ میں ہے، وہ اس کے مطیع ہیں اور اسی کے سامنے ذمہ دار ہیں .... مگر حکومت کی مشین میں وہ انتظامی اداروں کے افسر ہونے کی حیثیت سے ایسے وزیروں کے ماتحت ہیں جو مجلسِ قانون ساز کے سامنے جوابدہ ہیں۔ وزیر اگر چاہے کہ اس کا ماتحت افسر (کوئی آئی سی۔ ایس) ایسے قوانین پر عمل کرے جو خود وزیر نے اپنے محکمہ میں زیادہ تسلی بخش انتظام کے لئے وضع کئے ہوں اور اُس کا ماتحت افسر ایسے قوانین کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے یا اُن کی خلاف ورزی کرے تو کیا وزیر اس کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کر سکتا ہے یا اس کو ایسی سزا دے سکتا ہے جو اس نے اُن قوانین کی خلاف ورزی کرنے والے کے لئے تجویز کی ہو؛ جہاں تک آئین کا تعلق ہے، آئین وزیر کو اس قسم کا کوئی اختیار نہیں دیتا۔ وزیر اپنے ایک ماتحت افسر کے خلاف، چاہے وہ افسر وزیر کی کسی پالیسی، تجویز یا کسی حکم کے خلاف عمل کرے، خود کوئی سزا پاس نہیں کر سکتا۔ ایسے عمل کا حکومت اور ملک پر کیا اثر پڑ سکتا ہے اس کا اندازہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔

کابینہ میں تقسیمِ کار اور طریقۂ عمل کا فیصلہ گورنر اپنی مرضی کے مطابق کرے گا۔ آئین کی یہ دفعہ بہت اہم ہے، گورنر کے اس اختیار کے اثرات سے وہی لوگ زیادہ واقف ہیں جو حکومت کی مشین سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ اس اختیار کی بدولت گورنر اگر چاہے تو کسی محکمہ کی اصلی قوت اپنے ہی ہاتھ میں رکھ سکتا ہے۔ طریقۂ عمل کے ضمن میں گورنر کو قانوناً ایسا انتظام کرنا پڑیگا جس کی بدولت وزیر اور اُن کے سکرٹری مجبور رہوں گے کہ وہ خاص اُمور کے متعلق تمام اطلاعیں گورنر کو پہنچاتے رہیں۔ گورنر اگر چاہے تو وہ تمام خبریں اس طرح سے حاصل کر سکتا ہے۔

علاوہ ازیں ہر ایک وزیر اور سکرٹری کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ ایسی چیز جو گورنر کی "مخصوص ذمہ داری" سے متعلق ہو، فوراً گورنر کو پہنچا دے۔ اس دفعہ کی آئینی پیچیدگی یہ ہے کہ سکرٹری کو وزیر کا سا درجۂ امتیاز دیا گیا ہے۔ سکرٹری جو اکثر آئی۔سی۔ایس افسر ہوتا ہے اس کا مجاز ہوگا کہ وہ گورنر سے براہِ راست، وزیر کی مداخلت بلکہ حکم و مرضی کے بغیر کسی خاص محکمہ کے متعلق گفتگو کر سکے، وہ گورنر کو تمام ایسے حالات بتا سکتا ہے جن کا بتانا شاید وزیر مناسب نہ سمجھے، کیا گورنر ایسے موقعوں پر سکرٹری کو وزیر پر ترجیح دے گا؟ یا وزیر خود اپنے سکرٹری پر اعتماد کرے گا؟ یہ ایسے سوالات ہیں جو "رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند" کے تحت آتے ہیں ــــ گورنر کے اسی اختیار کے متعلق پارلیمنٹ میں ایک مخالف ممبر نے کہا تھا "کہ سکرٹری کو وزیر پر ایک محافظ کُتّے کی طرح مسلّط کر دیا گیا ہے"۔

یہ ایسے ہی ملازموں کے لئے ہے کہ اُن کے جائز حقوق کی نگہداشت گورنر کی مخصوص ذمہ داری قرار دی گئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ مضبوط اور انصاف پسند حکومت کے لئے مطمئن ملازم ضروری ہیں تو یہ اور بھی زیادہ صحیح اور اہم ہے کہ ملازموں اور وزراء کے تعلقات خوشگوار ہونے چاہئیں، اُن میں آپس میں اعتماد، تعاون اور پبلک مفاد کے سامنے ذاتی اغراض کو بھول جانے کی ہمّت ہونی چاہئے۔ بے شک آئین ایسا سازگار ماحول پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ اس کے لئے سب سے زیادہ موزوں ادارہ پبلک سروس کمیشن ہے۔ مگر کیا آئین ہر اُس کوشش کو دبانے کا انتظام کرتا ہے جس کا مقصد ملازمت اور وزارت میں کشمکش پیدا کرنا ہو؟ کیا "جائز حقوق" میں سزا پانے کا "حق" بھی شامل ہے؟ کیا گورنر کو اختیار ہے کہ وہ آئی۔سی۔ایس افسروں کو سزا دے سکے؟ نئے آئین کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سزا دینے اور موقوف کرنے کا اختیار بھی صرف سکرٹری آف سٹیٹ (وزیرِ ہند) کو ہے[1] ظاہر ہے گورنر صرف اُن حالات میں مداخلت کرے گا جب کوئی وزیر کسی "ملازم" کے خلاف کوئی اقدام کرے اُس وقت وسیع المعنی لفظ "جائز" (جس کی آئین میں کچھ تشریح نہیں کی گئی) لامحدود قوت عطا کر سکتا ہے۔ یہاں بھی ضروری تھا کہ ملازمت کے حقوق کی حفاظت ایک ایسے ادارہ کے سپرد کی جاتی جو پبلک میں اعتماد پیدا کر سکے۔ جس کا فیصلہ پارٹی گورنمنٹ کی ریشہ دوانیوں اور سیاسی جوڑ توڑ سے بالاتر ہو۔ ایسا ادارہ پبلک سروس کمیشن ہو سکتا ہے۔ یہی ادارہ اُمیدواروں کی جانچ کرتا ہے، اسی کی سفارش اور جانچ پر سکرٹری آف سٹیٹ مختلف آسامیاں پُر کرتا ہے۔ اگر ایسے ہی غیر جانبدار ادارہ کے ہاتھ میں تمام جھگڑے

[1] Sec 59, cl. (c)

چکانے کی قوت بھی دے دی جائے تو زیادہ خوشگوار نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ایسے حالات میں یہ یاد رکھنا بہت ضروری ہے کہ ایک محکوم ملک جہاں ایسی قوم پرست قوتیں برسرِ عمل ہوں جو بدیسی حاکموں کے اثر و اقتدار کو ملک کی آزادی میں رکاوٹ سمجھتی ہوں اُن کے پیشِ نظر یہ بات نہیں ہوتی کہ یہ اثر و قوت قوم و ملک کی بھلائی کے لئے استعمال کئے جا رہے ہیں۔ وہ صرف یہی دیکھتی ہیں اور غالباً دیکھنا چاہتی ہیں کہ موجودہ حالات اُن کی قومی فلاح کے منافی ہیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اس قوت و پبلک میں اعتماد پیدا کیا جائے، اس کی اعانت حاصل کرنے کے لئے دیانت دارانہ کوششیں کی جائیں اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک سیاسی قوت بجائے عوام کے کسی ایک شخص کے فہم و منشا پر منحصر ہے۔

گورنر کی چوتھی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ایسے قانون پاس نہ ہونے دے جو ایسے مقاصد کے منافی ہوں جن کے حاصل کرنے کے لئے امتیازی سلوک والی آئینی دفعات وضع کی گئی ہیں۔

اس پیچیدہ دفعہ کے سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ ۱۹۲۱ء میں ہندوستان کو مالی خود مختاری[1] عطا کی گئی تھی مرکزی مجلس قانون ساز کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ تجارتی معاہدوں پر بحث کر سکے اور اپنے حسبِ منشاء اُن کو طے کرے اور اگر چاہے تو کسی ملک سے ترجیحی سلوک روا رکھے۔ اسمبلی کا ان معاملات پر کہاں تک اختیار تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس نے برطانیہ کے ساتھ ترجیحی معاہدہ (اوٹاوہ پیکٹ) ختم کرنے کا ووٹ دیا اور حکومتِ ہند نے اس فیصلہ پر عمل کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ اسمبلی کو تمام مالی اُمور پر اختیار تھا، بلکہ یہ ایک محدود قوت تھی جو ہندوستانیوں کو تجارتی معاہدے طے کرنے اور کچھ محصول لگانے کے لئے دی گئی تھی۔ تاہم اس کا اتنا اثر ضرور تھا کہ تجارتِ درآمد پر محصول لگانے سے ملکی صنعت کو فروغ ہوا۔ ظاہر ہے اسمبلی برطانوی سامانِ تجارت پر بھی محصول لگا سکتی تھی —— مگر اب یعنی فیڈریشن کے قیام کے بعد یہ گورنر جنرل کی خصوصی ذمہ داری ہو گی کہ وہ ہر اُس امتیازی قانون کو پاس نہ ہونے دے جس کا اثر برطانوی مال یا باشندوں پر پڑے، چونکہ ہندوستان یا بالفاظِ دیگر فیڈریشن کی مالی پالیسی بھی گورنر جنرل کی خصوصی ذمہ داری ہے اور صوبوں کو "مالیات" پر کوئی اختیار نہیں لہٰذا یہ گورنر جنرل ہی کا اختیار ہے کہ وہ جس طرح چاہے ہندوستان کی مالیات کا انتظام کرے اور اس لئے کہ صوبوں میں کوئی ایسا قانون نہ پاس کیا جائے جو اس مصلحت کے خلاف ہو، یہ گورنر کی ذمہ داری قرار دی گئی ہے کہ وہ ایسی کوششوں کی روک تھام کرے، اور فیڈرل اسمبلی یا وائسرائے کے پاس کردہ قوانین کو اپنے صوبے میں نافذ کرے —— فیڈریشن کی مالی پالیسی کو گورنر جنرل کی ذمہ داری قرار دینا، ۱۹۲۱ء میں عطا شدہ "مالی خود مختاری" پر ایک ایسی بندش ہے جو قوم پرستوں کی نظر میں ہمیشہ کھٹکتی رہے گی۔

علاوہ ازیں یہ دفعہ ملکی تجارت پر بھی اثر انداز ہوتی ہے، ہر اُس ملک میں جو صنعت کے میدان میں نیا نیا اترا ہے اتنی قوت نہیں ہوتی کہ وہ بیرونی ممالک سے مقابلہ کر کے اپنی ملکی منڈیوں کو اپنے تجارتی سامان کی کھپت کے لئے محفوظ کرے۔ حکومت ایسے

[1] Fiscal Autonomy

موقع پر قومی مفاد کے پیش نظر ملکی صنعت کو محصول درآمد اور دیگر ذرائع سے مدد پہنچاتی ہے تاآنکہ ملکی صنعت بھی اس قابل ہو جائے کہ بغیر مدد کے بیرونی مسابقت کا مقابلہ کر سکے۔ ہندوستان ایک نیا صنعتی ملک ہے۔ ضرورت ہے کہ حکومت اس کی نوخیز صنعت کی اعانت کرے تاکہ وہ سامان جو یہاں بکفایت تیار ہو سکتا ہے، ملکی منڈیوں میں مہیا کیا جا سکے۔ اس میں شک نہیں کہ تامینی[1] پالیسی کا اختیار کرنا خطرات سے خالی نہیں تاہم قومی مفاد کے لئے اشیاء کی قیمت میں گرانی اور عوام کی قوتِ خریدمیں کمی تھوڑے عرصے کے لئے برداشت کی جا سکتی ہے۔ ۱۹۲۱ء کی مالی خود مختاری کی بدولت اسمبلی اس تامینی پالیسی پر کاربند تھی اور اسی کی برکت تھی کہ ہندوستان لوہے، شکر، دیا سلائی وغیرہ اشیاء کے لئے بیرونی ممالک سے بے نیاز ہوتا جا رہا ہے ... مگر کیا آیندہ بھی اسی پالیسی پر جس کا مقصد ملکی صنعت کا فروغ ہے عمل کیا جا سکے گا؟ اس کا جواب اُمید افزا نہیں قرائن بتا رہے ہیں کہ شاید یہ پالیسی سیاسی مصلحتوں پر قربان کر دی جائے گی۔

محصول درآمد کے علاوہ حکومت کبھی کبھی بعض صنعتوں کی پیداوار پر مقدار کے لحاظ سے نقد[2] روپیہ بھی دیا کرتی ہے، اس کا مقصد بھی ملکی صنعت کو "مصنوعی مدد" سے ترقی دینا ہوتا ہے، اب فرض کیجئے کہ حکومت فیصلہ کرتی ہے کہ اُونی مصنوعات کو ایسی مدد کی ضرورت ہے، لہٰذا ہندوستانی خزانہ سے اس صنعت کو نقد روپیہ دیا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ اُونی مصنوعات تیار کرنے کے کارخانے ہندوستانی اور برطانوی ہر قسم کے سرمایہ سے تیار کئے گئے ہیں ---- کیا اسمبلی اعتراض کر سکتی ہے کہ ہندوستان کا روپیہ کسی انگریزی کارخانہ کو نہ دیا جائے؛ امتیازی سلوک والا آئین ایسے اعتراض کو جائز قرار نہیں دے سکتا، کیونکہ ایسے قانون کا اثر ہندوستانی اور غیر ہندوستانی (انگریزی) کارخانوں میں امتیاز پیدا کرنا ہوگا۔ اس طرح سے یہ قانون غیر ہندوستانی سرمایہ اور کمپنیوں کا تحفظ کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ کوئی ایسا قانون پاس نہیں کیا جا سکتا جو برطانوی باشندوں پر اس قسم کی پابندیاں عاید کر سکے جیسی آج کل جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں پر عائد کی جا رہی ہیں، برطانیہ کا ہر باشندہ تجارت اور کاروبار وغیرہ میں اُن تمام مراعات کا مستحق ہوگا، جو کسی ہندوستانی کو حاصل ہونگی، اس کے مقابلہ میں ہندوستانیوں کو بھی حقوق انگلستان میں حاصل ہوں گے۔

یہ قانون ہندوستان کی معاشی زندگی اور صنعتی ترقی پر براہِ راست اثر انداز ہوتا ہے، گورنر جنرل کی اس ذمہ داری پر ہندوستان کی آیندہ خوشحالی منحصر ہے۔ مالی پالیسی پہلے ہی اسمبلی کی نگرانی اور خردہ گیری سے محفوظ تھی، اب فیڈریشن کے بعد تجارتی معاہدے بھی اس طرح طے کئے جائیں گے کہ ایک نوخیز صنعتی ملک کے مفاد کو پیشِ نظر نہ رکھا جائے، بلکہ دُنیا کے معاشی حالات سے قطع نظر ایک محدود جغرافی اور سیاسی سلطنت کے قیام کو مقصدِ اولین سمجھا جائے۔ یہ ایسے شبہات ہیں جو ہر قوم پرست کے دل میں پیدا ہو سکتے ہیں، تاہم یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ہندوستان باقی دُنیا کی طرح تاریخی قوتوں کے زیر اثر ہے۔ ممکن ہے قوم پرستوں کے شبہات کبھی عملی صورت اختیار نہ کریں۔

[1] Protectionist Policy
[2] Bounty

گورنر کی پانچویں ذمہ داری، ایسے علاقوں کی خوش انتظامی سے متعلق ہے جن کا انتظام باقی صوبے کے مانند کسی ترقی یافتہ نظامِ حکومت کا اہل نہیں۔ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کے ماتحت یہ علاقے گورنر اور اُس کی کونسل (جماعتِ وزراء) کے زیرِ نگرانی تھے ان کی حکومت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ نہ تو ان کے نمائندے مجلسِ قانون ساز کے ممبر ہو سکتے تھے اور نہ مجلسِ قانون ساز کو کسی قسم کی مداخلت کا اختیار تھا۔ دراصل یہ ایسے سرحدی یا جنگلی علاقے ہیں جو تمدنی اور سیاسی اعتبار سے اس قابل نہیں کہ وہاں ترقی یافتہ سیاسی نظام، عوام یعنی وہاں کی آبادی کے لئے مفید ثابت ہو سکے، کوشش یہ ہے کہ رفتہ رفتہ ان کو باقی صوبے کی سیاسی سطح پر لایا جائے ـــــ نئے آئین کے مطابق ان علاقوں کی حکومت صرف گورنر کو تفویض کی گئی، کسی وزیر کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ گورنر کو ان معاملات پر کوئی رائے دے، مجلسِ قانون ساز کو پہلے کی طرح وہاں کے حالات پر کوئی اختیار نہیں۔ وہاں سے کوئی نمائندہ نہیں بلایا جائے گا، گورنر صوبے کے خزانہ سے روپیہ لے کر جس کی منظوری مجلسِ قانون ساز کے ہاتھ میں نہیں ایسے علاقوں کی حکومت اپنے فہم و مرضی کے مطابق کرے گا۔ قوم پرستوں کا خیال ہے کہ مجلسِ قانون ساز کو کم از کم نکتہ چینی کا پورا اختیار ہونا چاہیئے۔ دوسرے وہ چاہتے ہیں کہ ایسی حکومت کی میعاد کم از کم مدت تک محدود ہونی چاہیئے تاکہ برطانوی ہندوستان اور ریاستی ہندوستان کے ساتھ ساتھ ایک تیسرا نیا ہندوستان نہ بس جائے ـــــ

گورنر کی باقی دو ذمہ داریاں فیڈریشن سے زیادہ تعلق رکھتی ہیں، لہٰذا اُن پر تبصرہ کرنا موجودہ بحث سے خارج ہے۔ تاکہ گورنر ان ذمہ داریوں کو بوجہ احسن سرانجام دے سکے، پارلیمنٹ نے اس کو آرڈیننس جاری کرنے کی قوت بھی دی ہے، گورنر کے آرڈیننس دو قسم کے ہوں گے (۱) وزیر کا آرڈیننس، (۲) گورنر کا آرڈیننس۔

وزیر کا آرڈیننس، وزیر کے مشورے پر جاری کیا جائے گا مگر صرف اس وقت جب کہ مجلسِ قانون ساز کا سیشن (مدتِ اجلاس) ختم ہو چکا ہو، ایسے آرڈیننس کے لئے ضروری ہے کہ گورنر کو یقین ہو جائے کہ حالات فوری احکام کے متقضی ہیں، یہ آرڈیننس مجلسِ قانون ساز کے اجلاس میں پیش کیا جائے گا اور اگر مجلس اس کی نامنظوری کا رزولیوشن پاس کر دے تو آرڈیننس ختم ہو جائیگا دوسری صورت میں مجلس کے اجلاس سے چھ ہفتہ بعد آرڈیننس از خود بغیر کسی رزولیوشن کے ختم ہو جائے گا، گورنر اور شاہنشاہِ معظم بھی آرڈیننس کو واپس لے سکتے ہیں۔

گورنر کا آرڈیننس اس وقت جاری ہوگا جب حالات ایسے ہوں جن میں اُسے اپنے فہم و مرضی کے مطابق عمل کرنا ہے، یہ آرڈیننس چھ ماہ تک جاری رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر چھ ماہ سے زیادہ توسیع کرنے کی ضرورت ہو تو یہ آرڈیننس وزیرِ ہند کے توسل سے پارلیمنٹ میں پیش کیا جائے گا۔ ایسا آرڈیننس گورنر یا شاہنشاہِ معظم واپس لے سکتے ہیں۔ یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ یہ آرڈیننس کس قوت کے زیرِ اثر ہیں، وزیر کا آرڈیننس مجلسِ قانون ساز کے ماتحت ہے بصورتِ دیگر کونسل کے اجلاس کے

چھ ہفتہ کے بعد خود بخود ختم ہوجاتا ہے۔ مگر گورنر کا آرڈیننس کسی مجلس کے سامنے پیش نہیں کیا جائے گا اور اُس صورت میں جبکہ اِسے چھ ماہ سے زیادہ نافذ کرنے کی ضرورت ہو اُس وقت بھی پارلیمنٹ اُسے رد نہیں کرسکتی، ایسا کرنا صرف ایک آئینی رسم کا پورا کرنا ہے۔ اس کا جاری کرنے اور واپس لینے والا صرف گورنر ہے ——— یہی نہیں اس کے علاوہ گورنر اگر چاہے تو قانون بھی بناسکتا ہے، ایسا قانون "گورنر کا ایکٹ" کہلائے گا۔ ایسے حالات جن میں گورنر اپنے فہم یا مرضی کے مطابق عمل کرسکتا ہے اُسے یہ حق دیتے ہیں کہ وہ فوراً "گورنر کا ایکٹ" پاس کرے یا مجلس قانون ساز میں ایک پیغام مجوزہ بل کے ساتھ بھیج دے۔ اگر مجلس قانون پاس نہ کرے تو ایک ماہ کے بعد یہ بل از خود قانون بن جائے گا ——— ایسے موقع پر گورنر مجلس اور کونسل کی ترمیمیں قبول کرنے پر مجبور نہیں گو وہ ان پر غور کرسکتا ہے۔

یہ آمرانہ قوتیں، صوبے کی عام سیاسی زندگی کو شل کرسکتی ہیں، ذمہ داریوں کے علاوہ گورنر کو اتنی قوت دینا، وزرا کے معمولی اختیارات کی حقیقت ظاہر کردیتا ہے، مالیات کو مرکزی حکومت یعنی فیڈریشن کے سپرد کردینا اور فیڈریشن کی مالی پالیسی کو گورنر جنرل کی خصوصی ذمہ داری قرار دینا، صوبوں کو مفلوج کردینا ہے، حکومت کے کاروبار سے وزرا، اتنا روپیہ نہیں بچا سکتے کہ وہ تعلیم، حفظانِ صحت، بے روزگاری کے انسداد، وغیرہ قومی کاموں پر صرف کریں . . . . . . ان تمام تحفظات کے باوجود یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ حکومت نظری فلسفہ نہیں بلکہ اس کا تعلق عملی سیاست سے ہے، بے شک نیا آئین قوم پرستوں کی آرزوؤں کی تکمیل نہیں۔ تاہم یہ اتنا بے جان بھی نہیں کہ ہندوستان کے اُن شہروں اور جھونپڑوں میں جو دُور اُفتادہ علاقوں میں بستے ہیں سیاسی بیداری پیدا نہ کردے، نئے انتخابات اس بات کی کافی شہادت ہیں کہ لوگ آئینی مشین سے ڈرتے نہیں بلکہ اس میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ایک سیاسی پارٹی کا احتجاج، ملک میں ہیجان پیدا کرسکتا ہے، مگر عوام کو ملکی مسائل سے آشنا کرکے، سیاسی قوت انہیں دے دینا زیادہ مشکل اور اہم ہے۔ اور یہی ہمارا مطمح نظر ہونا چاہئے۔ ذرائع حصول میں اختلاف ہوسکتا ہے، کوئی چاہتا ہے کہ خونی انقلاب کی ایک ہی کروٹ یہ سب کچھ عطا کردے اور کوئی سمجھتا ہے کہ بتدریج ارتقائی منازل طے کرنا ہمارے لئے زیادہ قرینِ دانش ہے مگر کیا اس پُرشورش، بدلتی دُنیا میں عوام کی قوت سے کوئی انکار کرسکتا ہے؟

محمد صدیق تاؤنی

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں

جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

علامۂ اقبال مرحوم

موت کی تاریکیوں میں سو رہی تھی زندگی
خلوتِ خاموشِ شب میں سو رہی تھی زندگی

انتظارِ نغمہ زن میں زندگی کا ساز تھا
بربطِ خاموشِ ہستی گوش بر آواز تھا

یک بیک اک طائرِ آتش نوا پیدا ہوا
آسماں کی سرزمیں پر حشر سا برپا ہوا

جانبِ پستی اُڑا وہ خوش نوا گاتا ہوا
آتشیں نغموں سے اپنے آگ برساتا ہوا

زہرہ و ناہید کی محفل کو گرماتا ہوا
خونِ تازہ زندگی کی رگ میں دوڑاتا ہوا

صبح کی قندیل روشن کی سوادِ شام میں
جان سی پھر ڈال دی خاکسترِ ایام میں

نغمۂ اقبال تھا یا صورِ اسرافیل تھا
دم بخود، ہیبت زدہ، سہما ہوا جبریل تھا

مرتبہ اقبال کا دُنیا نے پہچانا نہیں
یہ مجاہد کون تھا خلقت نے یہ جانا نہیں

آہ محفل میں نہیں وہ ساقیٔ محشر بدوش
جس کے ہنگاموں سے برپا تھا قیامت کا خروش

"جس کے آوازے سے لذت گیر اب تک گوش ہے"

"وہ جرس کیا اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے"

مظفر حسین شمیم

تربیتِ جنسی اور سماج

جب شباب کا آغاز ہو اور رگوں میں جوانی کا خون جوش مارتا ہو تو ہر نوجوان دِل کی دھڑکنوں کے ساتھ رنگین اُمیدیں پرورش پانے لگتی ہیں۔ جذبات کی دُنیا لہراتی ہے، زندگی یکسر رومان اور فضا نغمہ و تبسم سے لبریز نظر آتی ہے سنہری تخیلات کی موجیں ہونٹوں پر مُسکراہٹ بن کر تھرتھراتی ہیں، ہر سانس ساغر چھلکاتی اور ہر نفس صہبائے کیف لنڈھاتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ انسان ہواؤں پر تیر رہا اور لہروں پر سو رہا ہے۔ عمر کا یہی وہ حصہ ہے جب بے اختیار گنگنانے، بے وجہ مُسکرانے اور کسی کی بارگاہِ ناز میں سجدہ ہائے نیاز پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔

اس "جوشِ نمو" اور "سکر و کیف" کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس میں شک نہیں کہ اس تمام "ذوقِ عبودیت" کی تہ میں شدید ترین "تقاضائے جنسی" کی تڑپ ملتی ہے اور عشق و محبت اور حُسن و شباب کی تمام کارفرمائیاں اسی عنوان سے شروع ہوتی ہیں۔ محبت کا کوئی بلند سے بلند اور پست سے پست تصوّر آپ کر لیجئے، اس کی بُنیاد آپ اسی جنسی تڑپ پر پائیں گے جو نیک و بد سیرتوں کے آئینوں میں مختلف جلووں کی مظہر بنتی ہے، کیونکہ "تقاضائے جنسی" یا دوسرے الفاظ میں "محبت" کا مقصدِ اصلی "حظِ نفس" ہے، اور تربیت یافتہ اور غیر تربیت یافتہ نفس کی تسکین کے پہلو مختلف ہوتے ہیں، چنانچہ کسی نفس کا منتہائے نظر صرف "اتصالِ جنسی" ہوتا ہے، کسی کا اتصالِ بدن، اور کسی کا اتصالِ روح و لمنظر۔ محور ان سب کا ایک ہی ہے اگرچہ گردشیں مختلف ہیں۔ اس کا ایک آسان ثبوت یہ ہے کہ صُورت کا حُسن، سبزہ کی لہک، پھولوں کی مہک، آبشار کے ترنم، شفق کی رنگینی، ہوا کی سنسناہٹ اور کلیوں کی چٹک وغیرہ سے بچوں اور بوڑھوں کے دلوں میں والہانہ کیف اور "گم شدگی" کی وہ کیفیت نظر نہیں آتی جو نوجوانوں میں پائی جاتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ عہدِ طفولیت اور سنِ کہولت میں "جذبۂ نفس" و "تقاضائے جنسی" بہت کمزور اور پژمردہ ہوتا ہے اور جوانی میں پورے زور اور شباب پر۔

الغرض تقاضائے جنسی ایک فطری جذبہ ہے اور اس کی طاقت عظیم الشان طاقت ہے۔ اس کی اگر نفسیاتی اصُولوں پر صحیح تربیت نہ کی جائے تو انتہائی وحشت و بربریت پر منتج ہوتا ہے جس سے نفس کی گندگی بہت گھناؤنے طریقہ پر اُبل پڑتی ہے، اور اسی دلدل سے تمام اخلاقی برائیوں کے مچھر اُڑنے لگتے ہیں۔ لیکن تربیت پا جانے کے بعد یہی وہ طاقت ہے جو اخلاق کی پاکیزگی اور انسانیت کے مجد و شرف کا معیاری نمونہ پیش کرتی ہے اور دِل کا یہی گداز خلوص و ایثار کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ یہ ایک بھڑکتا

ہُوا شعلہ ہے جو قابو میں آجانے کے بعد تعمیرِ تمدن میں بہت مفید مسالے کا کام دیتا ہے ، اور قابو سے باہر ہو کر پوری عمارت کو خاکستر
کر دیتا ہے۔ کیونکہ اس کا اشارہ پاکر مردہ و بے حس روحوں میں زندگی کی وہ تڑپ پیدا ہو جاتی ہے جو عناصر کو مسخر کر سکتی اور مہر و ماہ پر
حکم چلا سکتی ہے ، لیکن اس کا کیا علاج کہ ہماری سماج کے نزدیک کوئی گناہ اس سے بڑھ کر نہیں کہ دو انسانی ہستیوں کے درمیان
میلانِ جنسی کی بنیادوں پر کوئی رابطہ پیدا ہو جائے ، کس قدر حیرت کی بات ہے کہ فطرت کا ایک شدید ترین تقاضا ، جس کو کسی صورت
سے فنا نہیں کیا جا سکتا اور اگر ایک طرف سے اُس پر دباؤ پڑے تو دوسری جانب زیادہ شدت کے ساتھ اُبھر آتا ہے ، سماج کے
قانون میں سب سے بڑا جرم قرار پاتا ہے اور اس کے سنوارنے پر کوئی توجہ نہیں کی جاتی ۔ بلکہ اس کا تذکرہ بھی بہت معیوب اور
انتہائی بے شرمی و بداخلاقی سمجھا جاتا ہے۔

افسانے اور شاعری کی دنیا میں تو رکیک سے رکیک جذبات کا تذکرہ نہ صرف ناگزیر بلکہ مستحسن ہے ، لیکن علمی حیثیت سے ہم
نے اس وقت تک ، جیسا کہ چاہئے ، اس طرف توجہ نہیں کی ۔ دو ایک کتابیں اُردو میں اس موضوع پر ضرور لکھی گئیں یا ترجمہ کی
گئیں ، لیکن وہ یا تو اتنی ادق ہیں کہ ہر شخص اُن سے استفادہ نہیں کر سکتا یا پھر بعض میں سرسری طور پر ضمناً اس کا تذکرہ کر دیا گیا ہے
اور افادی پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے ، یہی وجہ ہے کہ ہماری تربیت گاہوں میں اس کی اصلاح و تربیت پر کوئی مستقل درس نہیں دیا
جاتا ۔ درانحالیکہ جذبۂ جنسی اخلاق کی تعمیر کا وہ بنیادی پتھر ہے جس سے قطع نظر کر لینے کے بعد اخلاق کی عمارت حوادث کے
تھپیڑوں اور سیلاب کے مقابلہ کے لئے زیادہ استقلال و پائیداری اپنے اندر نہیں رکھتی ۔

اس مضمون کے ناظرین میں بعض بزرگ مجھ کو بے حیائی و بے شرمی کا نقیب ضرور قرار دے رہے ہوں گے ، لیکن میں نہایت
ادب سے عرض کروں گا کہ علمِ حقائق کا پردہ پوش نہیں بلکہ حقیقت کے چہرے کا نقاب کشا ہوتا ہے ، یہ بے حیائی کی دعوت نہیں بلکہ
حقیقت کی جستجو ہے ، کیا ہم اپنے بچوں کو کھانے پینے کے طریقے نہیں سکھاتے ، اُن کو گفتگو کے آداب سے واقف نہیں کرتے ؛
کیا سونے جاگنے چلنے پھرنے کے متعلق گفتگو کرنا عیب ہے ؛ یہ سب فطری احتیاجیں ہیں ، اگر تمدن نے ان کے متعلق کچھ آداب اور طریقے
بنائے ہیں تو جنسی احتیاج کے متعلق بھی بنائے ہوں گے جن سے واقفیت حاصل کرنا اور نوجوانوں کو اس کی تعلیم دینا ہمارا فرض ہے
آپ خود غور کیجئے کہ ہماری یہ غفلت ہماری جوان نسلوں میں کن مفاسد کا بیج بو رہی ہے ؛ اور اس جذبہ کی تربیت سے زندگی کے کس شعبہ
میں کام نہیں لیا جا سکتا ؛ اب آیئے اُن اسباب کو تلاش کریں جو اس بے توجہی پر زندگی کے تمام شعبوں میں خرابیوں کی پرورش
کر رہے ہیں !

اوّل اوّل جب آغازِ شباب میں دل میں لطیف خلش پیدا ہوتی اور جذبات میں ہلچل مچتی ہے تو لڑکا نہ تو خود ان احساسات
کو سمجھ سکتا ہے اور نہ کوئی سمجھ والا ہی اُس کو سمجھاتا ہے ۔ وہ خود بھی ہدفِ ملامت بننے کے لئے اپنے ان نئے محسوسات کو کسی کے

سامنے ظاہر نہیں کرتا۔ اس طرح اُس میں بے حسی جڑ پکڑ لیتی ہے اور اپنے اور دوسروں کی حسیات کا تجزیہ کرنے اور اُن کو سمجھنے کی صلاحیت فنا ہوتی جاتی ہے۔

پھر جن کے سامنے یہ باتیں ظاہر کی جاتی ہیں وہ اِس کے ہم سِن اور اسی کی طرح نابلد ہوتے ہیں، وہ نہیں جانتے کہ حسین صُورت کا نظارہ کیوں ان کے دل کی دھڑکن تیز کر دیتا ہے ؛ دلکش راگ کیوں ان کی طبیعت کو لبھاتا ہے ؛ اتفاقاً کسی جوان جسم کا لمس کیوں ان کے بدن میں بجلی کا سا ارتعاش پیدا کر دیتا ہے ؛ اُن کے دِل میں میٹھا میٹھا درد کیوں ہوتا ہے ؛ کیا چیز ان کو گنگنانے اور آپ ہی آپ مسکرانے پر اُکساتی ہے ؛ اور کبھی کبھی ان کو بلا وجہ تنہائی کس لئے مرغوب ہوتی ہے ؛
علاوہ ازیں وہ نہیں جانتے کہ اُنھوں نے زندگی کی کس منزل میں قدم رکھا ہے اور اس راستہ پر ان کو کس طرح چلنا ہے ؛ لہذا ہوا کے موافق یا مخالف جھونکے جدھر چاہتے ہیں اُن کو موڑ دیتے ہیں اور اس طرح طبیعت میں جو ہچکچاہٹ اور گھٹاؤ یا بہیمانہ آزادی اور غیر ذمہ داری جڑ پکڑ لیتی ہے وہ آخر عمر تک نہیں جاتی۔

اس وقت اُن کے معلمین کا فرض ہونا چاہئے کہ وہ اُن کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ اور اُن کے حرکات وسکنات سے اُن کے جذبات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر کے، نفسیاتِ شباب کے اصُولوں کے ماتحت اُن کو صحیح تربیت دیں اور بتلائیں کہ وہ اب زندگی کی کس راہ پر گامزن ہیں اور یہاں اُن کو کس طرح قدم اُٹھانا چاہئے۔

چونکہ سماج کے نزدیک محبّت جرم ہے لہٰذا جب دو انسانی ہستیوں میں اس قسم کی یگانگت پیدا ہوتی ہے تو وہ ہیئتِ اجتماعی کے زیرِ اثر یہ سمجھ کر کہ ہم کسی بہت ہی خطرناک اور ناپاک جرم کے مُرتکب ہو رہے ہیں اپنے خیالات وجذبات کو ناجائز حد تک چھپا کر مجرمانہ ذہنیت کے مہلک اور سریع التاثیر جراثیم غیر شعوری طور پر اپنے اندر پالتے رہتے ہیں۔ افشائے راز کا خوف ہر وقت ان پر مسلط رہتا ہے، وہ چھپ چھپ کر ملاقات وگفتگو کے مواقع نکالتے ہیں۔ اور نتیجہ ان سب کا یہ ہوتا ہے کہ ان کی ذہنی ساخت مستقل طور پر سازشی اور بزدلانہ نوعیت اختیار کر لیتی ہے، صداقت وحقیقت کی طرف سے ان کے دِل میں ہمیشہ کے لئے ڈر بیٹھ جاتا ہے، مکر و دروغ ان کی فطرتِ ثانیہ بن جاتا ہے، ان کے ذہن میں پستی، کردار وعزائم میں کمزوری، امزاج میں تلوّن، لہجہ میں نشادگی، طبیعت میں بزدلانہ شرم اور اخلاق میں ریاکاری آجاتی ہے۔ وہ بے باک فطرت، نڈر دل، بلندیٔ نظر، صفائی قلب اور اخلاقی جرأت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

جنسی جذبات پر سماج بجز ملامت وسرزنش کے اور کسی حیثیت سے توجہ نہیں کرتی اس لئے محبت کی تباہ کاریاں ہی زیادہ دکھلائی دیتی ہیں۔ اگر کسی کا دماغ غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل ہے تو وہ از خود اپنے جذبۂ جنسی کی تربیت کر کے اپنی انسانیت پر جلا کر لیتا ہے، ورنہ عام طور پر اس کا تاریک پہلو ہی منظرِ عام پر آتا رہتا ہے، جس کے باعث اس کو اور زیادہ قابلِ نفرت سمجھا جاتا ہے۔

اگر آپ تحقیق کریں تو بہت تھوڑی جستجو کے ساتھ آپ کو ایسی متعدد مثالیں ملیں گی کہ ایک نکمی فطرت کا لڑکا جو بلید الطبع بھی ہے اور فکر و نظر اور کردار وعزائم کے اعتبار سے بھی پست ہے جو اپنی زندگی کا مصرف نہیں جانتا اور اس کو ناقابلِ برداشت بوجھ تصور کرتا ہے، محبت کا سہارا پاکر اُٹھتا ہے، حیرت انگیز طریقہ پر اپنا چولا بدل کر کشاکشِ حیات میں مردانہ وار حصہ لیتا اور زندگی کا اعلےٰ نصب العین حاصل کرلینے میں محیر العقول کارنامے دُنیا کے سامنے پیش کرتا ہے، گویا اس کے سازِ زندگی کے بہترین نغمے سوئے ہوئے تھے، جو مناسب مضراب پڑتے ہی تار تار سے نکلنے لگے، یا یہ کہ ایک اچھا خاصا ترقی کرنے والا نوجوان محبت میں ناکام ہو جانے اور سماج کے زیرِ عتاب ہو جانے کے بعد یکایک بلندی و رفعت کے منارے سے پستی و جہالت کے گہرے اور تاریک غار میں اوندھے مُنہ جا گرتا ہے، گویا وہ شبنم کا ایک قطرہ تھا جو تمازتِ آفتاب کی تاب نہ لاکر فنا ہو گیا۔ اور اُن خوش قسمتوں کی تعداد تو بہت ہی کم ہے جو حُسنِ اتفاق سے اپنی فطرت کے مطابق شریکِ زندگی حاصل کرکے شادی ہو جانے کے بعد محبت کی لذتوں سے آشنا ہوتے ہیں۔

علم و بصیرت کے اس دَور میں محبت صرف رُومانی گیتوں کے لئے ہی مخصوص نہیں رہی ہے، بلکہ وہ اس وقت علم النفس کی ایک جُداگانہ شاخ اور فلسفہ کا ایک اہم موضوعِ بحث ہے، جس کے ماتحت مہذب قومیں اپنے نوجوانوں کے جذبۂ جنسی کی صحیح اُصولوں پر تربیت کرکے ان کو قوم و وطن کے لئے زیادہ مفید اور کار آمد بناتی ہیں۔

اگرچہ میں نے اس مضمون میں صرف مردوں کے جذبات سے بحث کی ہے اور وہ بھی بہت ہی تشنہ و نامکمل ہے لیکن تربیت جنسی صنفِ نازک کے لئے بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ صنفِ قوی کے لئے بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ، کیونکہ مرد کے مقابلہ میں عورت زیادہ ذہین اور ذکی الحس ہوتی ہے، وہ اضطرابِ درونی و خلشِ باطنی کو مرد سے پہلے محسوس کرتی ہے۔

بہرحال ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم سماجی حیثیت سے ان تمام اُمور کے پیشِ نظر تقاضائے جنسی و جذبۂ نفسانی کے متعلق اپنے روایتی فیصلۂ نفرت و ملامت پر نظرِ ثانی کرکے اپنے قانونِ تربیت میں چند دفعات کا اضافہ کریں اور اخلاقی تربیت کے ساتھ ساتھ تربیت جنسی کے لئے بھی اپنے معاشرتی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے کچھ اصُول وضع کریں۔ کیونکہ ذہنی و اخلاقی تربیت کا تمامتر دارو مدار اسی تربیتِ جنسی پر ہے۔ مجھ کو اُمید ہے کہ ہمارے ملک کے اربابِ فکر و بصیرت اس پر اپنی آراء کا اظہار کرتے ہوئے کوئی صحیح راہِ عمل متعین کریں گے +

نعمان شاغل بھوپالی

محبت روحِ جسمِ عارضی ہے — محبت زندگی کی زندگی ہے

محبت غایت الغایاتِ ہستی — محبت عین منشا ہے حق رسی ہے

اللہ والا فلسفی

کیوں گزشتہ ساعتیں پھر مجھ کو تڑپانے لگیں
زندگی کی حسرتیں پھر دل میں گھبرانے لگیں

بن گیا پھر کیوں پریشاں کُن یہ فانوسِ خیال
وحشتیں پھر کیوں مری تخئیل پر چھانے لگیں

انبساطِ زندگی کی خوش نُما تنویر میں
مَوت کی سی صُورتیں کیوں کر نظر آنے لگیں

اُٹھ گیا دُنیا سے کوئی زندۂ جاوید کیا
کیوں فنا کی بدلیاں دُنیا پہ منڈلانے لگیں

رو رہا ہے کون یہ لے لے کے نام اقبال کا
کچھ لحاظ اس کو نہیں مجھ سے پریشاں حال کا

کیوں نہ مضطر ہُوں نہیں اے دستِ بیجا اضطراب
اور بڑھنا چاہیئے اس وقت میرا اضطراب

مجھ پر اپنا کر قیاس اے ہمنوا تُو ہی بتا
آہ اطمینان حاصل ہے تجھے یا اضطراب

جانتے تھے اپنا رہبر ہم سبھی اقبال کو
کیوں نہ ہوں پھر اس کی فرقت میں سراپا اضطراب

کیا خبر تھی یہ خبر اس درجہ ہوگی جانگسل
ہوگیا محتاجِ تدبیر آہ دل کا اضطراب

اطلاعِ رحلتِ اقبال میں کیونکر سُنوں؟
یہ خبر اُچپ ہے نقیبِ جاہِ پیغمبرؐ سُنوں؟

مُلک و ملّت کا حقیقی رہنما جاتا رہا
آدمیت کا دلِ درد آشنا جاتا رہا

قوم کی بیداریوں کو ناز تھا جس فرد پر
آہ وہ فردِ یگانہ کیا ہُوا؟ جاتا رہا

کیوں نظر آتا نہیں وہ رہبروں کا راہبر
مُدعی جو رہنمائی کا نہ تھا، جاتا رہا

حاسۂ بیدار اس نے کر دیا کُل قوم کا
جاذبِ مخلص دلِ حسّاس کا جاتا رہا

جوشش اس کی قیادت میں تھی اوروں میں کہاں

آب آتش ہے آتش آب ہے آج

چشمِ عبرت سے اسے تماشائی — دیکھ نیرنگِ چرخِ مینائی

صبح ہوتے ہی ہو گئی نابود — شب کے تاروں کی جلوہ آرائی

تھی جو گلشن میں صبحِ فصلِ بہار — وہ کہاں ہے خزاں میں رعنائی

اب کہاں ہے وہ بزمِ جمشیدی — اب کہاں ہے وہ بادہ پیمائی

ہو گئی خاک خاک میں مل کر — شانِ اسکندری و دارائی

آج "اقبال" کا بھی ماتم ہے
یہ نیا حادثہ نیا غم ہے

شاعرِ سحر کار تھا اقبال — آہ معجز نگار تھا اقبال

اس کے زیرِ نگیں تھا مُلکِ سخن — خسروِ تاجدار تھا اقبال

چمنستانِ حُسنِ معنی میں — اِک گُلِ نو بہار تھا اقبال

دورِ حاضر میں ملک و ملت کا — سببِ افتخار تھا اقبال

سلطنت کیلئے بھی اِک حد تک — مایۂ اعتبار تھا اقبال

وادریغا کہ آں سخندان مُرد
فخرِ حسان و رشکِ سحبان مُرد

کوئی بھی ایسا نکتہ داں نہ ہوا — نغز گفتار و خوش بیاں نہ ہوا

ایک عالم میں اس کی شہرت تھی — اُس کا شہرہ کہاں کہاں نہ ہوا

کچھ خدا داد تھا قبولِ سخن — کونسا شعر حرزِ جاں نہ ہوا

تھی جدا سب سے اس کی طرزِ بیاں — کوئی بھی اُس کا ہم زباں نہ ہوا
تھا وہ نازک خیال کچھ ایسا — دل پر اُس کا سخن گراں نہ ہوا

خاص حصہ تھا اُس کا رنگینی
شاعری اس کی تھی کہ گل چینی

تھا وہ اِک نقشِ بے مثال و نظیر — مایۂ نازِ خامۂ تقدیر
صدر آرائے بزمِ حالی و داغ — شہرت افزائے نامِ ذوق و نصیر
کلۂ افتخارِ ملت و ملک — طرۂ اعتبارِ تاج و سریر
فلسفہ اور پھر زبانِ غزل — اور پھر یہ جزالتِ تحریر
شہد سے بھی زیادہ شیریں تھی — اُس کی ہر بات اُس کی ہر تقریر

شاعرِ دورِ انقلاب تھا وہ
نقطۂ فردِ انتخاب تھا وہ

جائے اُو در جوارِ رحمت باد — مرقدش روضۂ زجنت باد
روزیش مغفرت بود ز خدا — بہرہ اش از نبی شفاعت باد
سایۂ رحمتِ خدائے کریم — بر سرش تا دمِ قیامت باد
حرزِ جانہا کلام اُو بادا — صیت نطقش بہر ولایت باد
از پیاسش فروغِ دین بادا — شمعِ ایماں چراغِ تربت باد

اطہر این نوحہ و دعا گفتم
آنچہ گفتم بصد بکا گفتم

اطہر ہاپڑی

بُرقع

افرادِ ڈراما

احسان — ایک نوجوان طالب علم

امجد — احسان کا دوست اور ہم جماعت

محسن — احسان کا بڑا بھائی عمر ۳۵ سال

ناصر علی — احسان اور محسن کا باپ

مریم — محسن کی بیوی

رحمت — ملازم لڑکا

منظر:۔ ایک آراستہ کمرہ۔ احسان ایک صوفے پر بڑے آرام سے لیٹا ہے۔ ٹانگیں آگے کو پھیلا رکھی ہیں۔ ہاتھ میں کوئی اردو رسالہ پکڑے بڑی لَے سے اشعار پڑھ رہا ہے۔ کسی کے آنے کی آہٹ پا کر خاموش ہو جاتا ہے۔ دائیں دروازے سے اُس کا بڑا بھائی محسن داخل ہوتا ہے۔ احسان اپنی ٹانگیں سمیٹ کر صوفے پر سیدھا ہو بیٹھتا ہے۔)

محسن۔ احسان ایک کام تو کرو؟

احسان۔ فرمایئے!

محسن۔ مریم کو اُس کی چچی کے مکان پر پہنچا آؤ۔

احسان (رسالہ تپائی پر رکھتے ہوئے) ابھی؟

محسن۔ ہاں

احسان۔ بھابی تیار ہیں؟

محسن۔ ہاں بالکل۔ (واپس جاتا ہے۔ احسان اُٹھتا ہے اور تپائی پر سے رسالہ اُٹھا کر کھولتا ہے۔ ایک دو صفحے پڑھتا رہتا ہے۔ پھر "ترے خیال کی بیتابیاں معاذ اللہ۔ کہ ایک بار بھلاؤں تو لاکھ بار آئے۔" گاتا ہوا سنگار میز کی طرف جاتا ہے۔ وہاں سے کنگھی اُٹھا کر اپنے گھنے بالوں کو درست کر رہا ہے کہ اتنے میں مریم اپنے بازو پر ریشم کا رنگین برقع ڈالے داخل ہوتی ہے۔)

مریم۔ چلو احسان —— ابھی تیار نہیں ہوئے تم!

احسان (کھونٹی پر سے کوٹ اُتارتا ہے) میرے تیار ہونے میں کیا دیر ہے۔ (کوٹ پہنتا ہے۔ مریم پہلے برقع کا نچلا حصہ پہنتی ہے پھر اُوپر کا نقاب والا حصہ۔ ریشم کا نرم و رنگیں برقع کسی قدر تنگ تراشا جانے سے مریم کے فربہ بدن سے چمٹ جاتا ہے، مزید برآں اُس کا میانہ قد اُس کی ہیئت کذائی کو عجیب سا بنا دیتا ہے۔)

احسان۔ بھابی میں نے کئی بار کہا ہے میرے ساتھ چلتے وقت یہ برقع نہ پہنا کرو۔

مریم۔ (اپنے آپ پر ایک جھلتی نظر ڈالتے ہوئے) کیا ہے اس برقع میں؟

احسان۔ میں کیا بتاؤں اِس برقع میں کیا ہے! ایک ریشم کا دوسرے رنگدار اور پھر چُست سِلا ہوا۔ اِس کی تراش تو دیکھو۔

مریم۔ ساری دُنیا ایسے بُرقع پہنتی ہے۔

احسان۔ اگر ساری دُنیا پہنتی ہے تو موڑ میں بیٹھتی ہے۔

تانگے میں پھرتی ہے، بازاروں میں یوں پیدل تو خاک
چھانتی نہیں پھرتی۔ اگر میرے ساتھ چلنا ہے تو مہربانی
کرکے دوسرا برقع پہن آؤ۔ اس برقع میں ساتھ لے جانے
کے لئے میں ہرگز تیار نہیں۔

مریم۔ تمہارے بھائی جان کو تو اس برقع میں ساتھ لے جاتے
ہوئے آج تک عار نہیں آئی۔ تم آئے ہو بڑے کہیں کے۔۔۔

احسان۔ بھائی جان کی سمجھ پر تو مدت سے پردے پڑ چکے
ہیں، اُن کا تو ذکر ہی چھوڑو۔ انہیں عار آئے یا نہ آئے
مجھے اس سے غرض نہیں۔ (مریم کمرے سے باہر جاتی ہے
احسان صوفے پر بیٹھ کر رسالہ پڑھتا ہے۔ ایک دو لمحے اسٹیج
پر خاموشی رہتی ہے۔ مریم اور محسن داخل ہوتے ہیں)

محسن۔ احسان تم جاتے کیوں نہیں ان کے ساتھ؟

احسان۔ بھائی جان کم از کم اس برقع کے ساتھ میں نہیں
جا سکتا۔ آپ خود ہی دیکھئے تو۔ مجھے بھابی کے ساتھ
جب اُنھوں نے یہ نیلا برقع پہن رکھا ہو بازار سے گزرتے
شرم آتی ہے۔ میں ہر دکاندار اور ہر راہ گیر کی نگاہ کا مرکز
نہیں بن سکتا۔ کوئی دوست کوئی واقف کار مل جاتا ہے،
اور کچھ نہیں تو تانگہ لے دیجئے۔ کوئی سادہ سا برقع ہو تو بات
بھی ہے۔ ایسا برقع پہن کر بازار میں گزرنا سراسر۔۔۔

محسن۔ کیا ہے اس برقع میں۔ ساری دُنیا پہنتی ہے۔

احسان۔ جی ہاں ساری دُنیا تو پہنتی ہے بھابی نے جو کہدیا
کیا آپ نے کوئی ایسا شریف آدمی دیکھا ہے جو بیوی کو
اس قسم کا جاذبِ نظر ریشم کا برقع پہنا کر سرِ عام پیدل
لئے پھرتا ہو؟

محسن۔ کیا بڑا احسان۔ آدمیوں کی آنکھیں تو نکلوائی نہیں جا
سکتیں۔ وہ کمبخت تو ہر صورت دیکھیں گے۔ جاؤ لے
جاؤ، تکرار نہیں کیا کرتے۔

احسان۔ نہیں بھائی جان میں اس برقع کے ساتھ نہیں لے
جا سکتا۔ دوسرا سفید برقع پہن لیں۔

مریم۔ وہ تو دھوبی کو دے رکھا ہے۔

محسن۔ یہاں قریب ہی تو جانا ہے۔

احسان۔ چاہے قریب ہی جانا ہے، آخر بازار میں سے ہو
کر جانا ہے۔ رحمت کو بھیج دیجئے۔ آپ چلے جائیے۔

محسن۔ احسان تمہیں ابھی تک بات کرنے کا سلیقہ نہیں آیا
(مریم سے) جاؤ رحمت کو لے جاؤ۔

مریم۔ (آہستہ سے) وہ ننھی کو باہر لے کر گیا ہے۔

محسن۔ (کمرہ سے باہر نکلتے ہوئے غصہ سے) یہ ڈھیٹ تو بحث
کرنا جانتا ہے۔ کام نہ کاج کہیں کا بڑا عزت دار (مریم
بھی اُس کے پیچھے چلی جاتی ہے)

احسان۔ (بڑبڑاتا ہے) بات کرنے کا سلیقہ ـــ !!! اونہہ۔
ریشم کے رنگین برقع کے ساتھ ساتھ بازار میں سے
سینکڑوں کی نگاہوں کا مرکز بن کر گزروں۔ ہر قدم کی جنبش
سے ریشمی برقع پر لہریں اٹھیں لوگ میری طرف گھوریں
کوئی مُنہ پھٹ بکنے لگے، میں آنکھوں سے اندھا کانوں
سے بہرہ بے غیرت بے حیا چلتا جاؤں۔ کوئی دوست
ملے میں آنکھ بچا لوں۔ کوئی بے تکلف پوچھے میں کہوں

میری بھابی ہے۔ بھائی جان کی بیگم صاحبہ! — مجھے بات
کرنے کا سلیقہ نہیں؟ اُونہہ —! نیچے سے آواز آتی ہے
— احسان")

احسان۔ (کھڑکی میں سے نیچے دیکھ کر) کون ہے؟ امجد!!!
آجاؤ اوپر (ایک کرسی کو راستہ میں سے ہٹاتا ہے/
امجد بائیں دروازے سے مسکراتا ہوا داخل ہوتا ہے۔)

امجد۔ (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) خوب ہوا آج۔ خلیل کے
دوست بھی عجیب ہیں؟

احسان۔ کیا ہوا؟

امجد۔ پہلے یہ بتاؤ وہ رنگیلی لڑکیاں ابھی تک یہیں ہیں نا؟

احسان۔ کونسی؟

امجد۔ وہی جو اُس رات سینما گئی ہوئی تھیں، ریشم کے نیلے
اور سیاہ بُرقع یاد نہیں۔ تم نے بتایا تھا نا کہ تمہارے پڑوس
میں رہتی ہیں۔ بڑی رنگین مزاج ہیں۔

احسان۔ ہاں ہاں، شاید ابھی تک تو مکان نہیں بدلا،
کیوں؟

امجد۔ میں اور خلیل تمہارے ہاں آرہے تھے۔ یہاں تمہاری
گلی کے سرے پر خلیل کو کوئی دوست مل گیا بہت
بے تکلف معلوم ہوتا تھا۔ ہر چند کہا کہ تمہارے ہاں
جانا ہے مگر اُس نے ایک نہ سُنی اور خلیل کو کھینچ کر
اپنے ساتھ لے گیا۔ اِس سلسلہ میں ابھی تکرار ہو رہی تھی کہ
ایک دوہرے بدن کی میانے سے قد کی عورت نیلے
رنگ کا ریشمی بُرقع پہنے گلی سے باہر آتی دکھائی دی۔
خلیل نے اُسے دیکھ کر اندازہ لگایا کہ وہ انہیں رنگیلی
عورتوں میں سے ہے جو احسان کے ساتھ والے مکان
میں رہتی ہیں۔ میں نے بھی اُس کی چال ڈھال اور
تیز رنگ کے بُرقع سے یہی اندازہ لگایا۔ اتنے میں وہ
عورت ہمارے قریب آگئی۔ جُونہی ہمارے پاس سے
گزری خلیل کے دوست نے بیدھڑک کہا "اتنا حسین
بُرقع اور پیدل۔ کہو تو موٹر پر لے چلوں"۔ ہم اُس کی
اس دلیری پر بہت گھبرائے۔

احسان (اپنے چہرے پر سے گھبراہٹ کے آثار چھپاتے
ہوئے) یہ سُن کر وہ عورت کچھ نہ بولی!

امجد۔ نہیں۔ اُس نے ایک نظر خلیل کے دوست کی
طرف دیکھا اور بغیر بولے آگے چلی گئی۔ ہم نے اُس شخص
سے کہا کہ اُسے یوں نہ کہنا چاہیئے تھا۔ کیا پتا کسی شریف
گھرانے کی ہوتی، مگر وہ بات پر اڑا رہا کہ شریف
گھرانے کی عورتیں ایسے جاذب نظر بُرقع پہن کر برسرِ
عام تھوڑی پھرا کرتی ہیں۔ ان عورتوں کا تو مقصد ہی
یہ ہوتا ہے کہ شوقین مزاج لوگوں کو اپنی طرف متوجہ
کیا جائے، خلیل نے بھی کسی قدر میرا ساتھ دیا مگر وہ
شخص چڑ گیا اور یہ کہہ کر کہ اچھا اب تمہیں آزمائش کر کے
دکھاتا ہوں، اُسے کھینچ کر اسی عورت کے تعاقب میں چلا گیا

احسان۔ (کھویا سا جاتا ہے) "چلا گیا؟؟؟ پھر ——"

امجد۔ پھر کیا —— میں تو یہاں آگیا ہوں مجھے کیا پتہ۔

احسان (گھبرا کر) بڑا بیہودہ تھا وہ۔

امجد۔ (مسکرا کر) یوں کہو بڑا بیہودہ تھا وہ بُرقع جس نے
اُس شخص کو یہ کہنے کی جرأت دلائی ورنہ کسی کی مجال ہے
کہ بُرقع پوش عورت کو کچھ کہہ سکے۔

احسان۔ (کچھ سوچتے ہوئے) ہاں یہ بھی ٹھیک ہے سارا
قصور برقع کا تھا مگر ـــ

امجد۔ تم گھبرا کیوں گئے ہو۔ تمہاری بلا سے۔ اپنی پڑوسنوں
سے اتنی ہمدردی کا آخر مطلب کیا؟ (خفیف سا قہقہہ)
خدا جانے لاہور میں ہر روز ایسے کتنے واقعات ہوتے
ہیں ۔ ہیں کیا؟

احسان۔ یہ تو ٹھیک ہے، مگر پردہ کے متعلق تمہارا کیا
خیال ہے؟

امجد۔ پردہ بجائے خود اچھی چیز ہے مگر یہ پردہ چھپ
چھپ کر دیکھنا اور دیکھ دیکھ کر چھپنا جس سے ہم آئے
دن دوچار ہوتے ہیں، فوراً ترک کر دینے کے قابل ہے۔

احسان۔ میرے خیال میں بُرقع بجائے خود ایک مذاق ہے
اور اب وہ زمانہ ختم ہو چکا ہے جب لوگوں کی نگاہ میں
برقع کی قدر تھی اور وہ ایک برقع پوش عورت کی طرف
نگاہ اُٹھانا معیوب سمجھتے تھے۔

امجد۔ اِس میں کیا شک ہے۔ تم یہ سُن کر حیران ہو گے کہ ہمارے
قرابت داروں میں چند عورتوں نے مختلف رنگوں
کے چار پانچ بُرقع سلوا رکھے ہیں اور وہ شادی بیاہ
کے موقعوں پر اُنہیں اُسی طرح بدل بدل کر پہنتی ہیں،
جس طرح عام پہننے والے کپڑوں کے مختلف جوڑے
پہنے جاتے ہیں۔

احسان۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ برقع کا پردہ بھی فیشن سے محفوظ
نہیں رہا اور یہی وجہ ہے کہ اُس کا صحیح مقصد فوت ہو
رہا ہے۔

امجد۔ وہ زمانہ اب ختم ہو چکا ہے جب برقع صحیح معنوں میں
برقع تھا۔ اب اگر کوئی عورت صاف ستھرا بُرقع اوڑھ
اور کوئی اچھا سا جوتا پہن کر بازار میں نکلے تو بیسیوں کیا
سینکڑوں لوگ پہلے پاؤں سے سر تک پھر سر سے
پاؤں تک جا پہنچتے ہیں اور اگر تنہا ہو تو خدا ہی حافظ۔

احسان۔ اور اگر برقع ہو رنگین یا ریشم کا تو لوگ بخدا یوں
دیکھتے ہیں کہ کھا جائیں گے۔ ہمارے بڑے نہیں
سمجھتے کہ اب زمانے کی روش اور ذہنیت ایک خطرناک
صورت اختیار کر چکی ہے ـــ

امجد۔ بالکل ـــ وہ یہی سمجھتے ہیں کہ موجودہ لوگ وہی لوگ ہیں جو
آج سے بیس برس پہلے تھے۔

(دائیں دروازہ سے رحمت داخل ہوتا ہے)

رحمت۔ بڑے میاں جی آ گئے۔

احسان۔ ابا جان؟

رحمت۔ جی ہاں۔

احسان۔ انہیں تو آج شام کو آنا تھا۔ اچھا جاؤ۔

(رحمت جاتا ہے)

امجد۔ بھئی میں بھی چلتا ہوں

احسان۔ وہ کیوں؟

امجد۔ تمہیں والد صاحب سے ملنا ہوگا (اُٹھتے ہوئے) پھر ملیں گے۔ آج شام لارنس گارڈن آؤ گے؛

احسان۔ کچھ کہہ نہیں سکتا۔

(دونوں بائیں دروازہ سے نیچے اُتر جاتے ہیں۔ اسٹیج پر ایک لمحہ خاموشی۔ محسن اور ایک اُدھیڑ عمر کا شخص دائیں دروازہ سے داخل ہوتے ہیں۔ پیچھے پیچھے رحمت آتا ہے)

ناصر علی۔ یہاں تو نہیں؛

محسن۔ یہیں تھا

رحمت۔ اُن کا کوئی دوست آیا تھا، اُن کے ساتھ چلے گئے ہیں شاید۔

محسن۔ (ایک کرسی پر سے کتاب اُٹھا کر) آپ بیٹھئے آ جاتا ہے ابھی۔

ناصر علی۔ کچھ پڑھتا پڑھاتا بھی ہے یا دوستوں کے ساتھ ہی پھرتا رہتا ہے؛

محسن۔ پڑھتا ہے۔ آرام طلب بہت ہے، گستاخ ہے جو مُنہ میں آتا ہے کہہ دیتا ہے۔

ناصر علی۔ بہت لڑکے ہوسٹلوں میں رہنے سے آرام طلب ہو جاتے ہیں۔ (احسان بائیں دروازہ سے داخل ہوتا ہے اپنے باپ کو مؤدبانہ سلام کر کے ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) بھئی کہاں تھے تم؛

احسان۔ ایک دوست کے ساتھ نیچے تک گیا تھا۔

ناصر علی۔ ہم جماعت تھا کوئی؛

احسان۔ جی ہاں!

ناصر علی۔ (محسن کی طرف دیکھ کر) مریم کہاں ہے؛

محسن۔ اپنی پھپی کے ہاں گئی ہے (رحمت سے) جاؤ بُلا لاؤ۔ جلدی آنا۔ (رحمت جاتا ہے)

احسان۔ (والد سے) آپ کو تو آج شام آنا تھا۔

ناصر علی۔ ہاں۔ رحمان اپنی کار میں آرہا تھا۔ میں بھی اُس کے ساتھ ہی آگیا۔

احسان۔ اُس کے کاروبار کا اب کیا حال ہے؛

ناصر علی۔ اچھا ہے۔ اب تو خوب کما رہا ہے۔ (دائیں دروازہ سے مریم داخل ہوتی ہے۔ ناصر علی کو سلام کرتی ہے)

محسن۔ تمہیں تو ابھی رحمت لینے گیا تھا۔

مریم۔ مجھے ابھی زینہ میں ملا ہے۔ میں نے میاں جی کو دیکھ لیا تھا۔ ہم اوپر بیٹھک میں تھے جب ان کی کار کو چوک میں رُکنا پڑا۔ میری نظر اتفاق سے ہی پڑ گئی۔

ناصر علی۔ ہاں بہت بھیڑ تھی وہاں۔ تم اکیلی آئی ہو کیا؛

مریم۔ جی نہیں۔ رمضانی پہنچا کر گیا ہے (احسان سے) تم نہ گئے تو میں کیا پہنچ نہ سکی؛

احسان۔ (اس ناگہانی غیر متوقع حملہ سے گھبرا سا جاتا ہے، اُس کے چہرہ پر غصہ کے آثار پیدا ہوتے ہیں اور الفاظ اُس کے مُنہ سے غیر ارادی طور پر نکلتے ہیں) اچھا ہوا پہنچ گئیں تو۔ پھر کسی کو ساتھ لے جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بس بُرقع اُٹھایا اور چل دیں۔

ناصر علی۔ ہیں بات کیا ہے؛

محسن۔ کچھ بھی نہیں۔ یونہی جھگڑتے ہیں۔ مریم احسان سے کہتی تھی مجھے چچی کے مکان تک پہنچا آؤ۔ یہ نہ گیا۔ وہ اکیلی چلی گئی۔

ناصر علی۔ یہ بُری بات ہے احسان۔ گھر کی عورتوں کو بازار میں اکیلے نہیں جانا چاہیے۔ تم کیوں نہ گئے؟

احسان۔ (پیچ و تاب کھاتا ہے۔ ماتھے پر تیوری ہے۔) میں کیا بتاؤں اباجان، بھائی جان یا بھابی سے پوچھیے میرے نہ جانے کی وجہ کیا تھی۔ وہ کیوں نہیں بتاتے؟

ناصر علی۔ یہ بُری بات ہے احسان۔ تمہاری آرام طلبی اور گستاخی کی شکایت ہوتی ہے۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

(رحمت داخل ہوتا ہے)

رحمت۔ چائے تیار ہے جناب۔

محسن۔ اچھا چلو (سب اُٹھتے ہیں، احسان بیٹھا رہتا ہے)

ناصر علی۔ (دروازہ کے قریب جاکر) آؤ احسان

احسان۔ (اُٹھتے ہوئے) آپ چلیے میں ابھی آیا۔ (سب چلے جاتے ہیں۔ احسان مُنہ بسورے کرسی پر بیٹھا رہتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ کہتا ہے) میری آرام طلبی اور گستاخی کی شکایت ہوتی ہے۔ میں آرام طلب ہوں میں گستاخ ہوں۔ اونہہ۔!!! کیوں کہا کہ میں نہیں جاتا۔ برقع کا فساد۔ تم نہ گئے تو میں کیا پہنچ نہ سکی۔ (نچلے لب کو دانتوں تلے دبا لیتا ہے، کچھ سوچتا ہے) اونہہ —— عورت —— سگ باش برادرِ خُرد۔ ۔ ۔

(رحمت داخل ہوتا ہے)

رحمت۔ میاں جی بلاتے ہیں، چائے پی لیجیے۔

احسان۔ (غصہ میں) چلا جا یہاں سے۔ چائے چائے کی بکواس۔ میں نہیں پیونگا (مُنہ ایک طرف کرکے آہستہ سے) چائے کا بچہ۔ خبیث (رحمت چلا جاتا ہے۔) اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ چائے پی لو۔ زہر پی لو۔

(باہر دُور سے ناصر علی کی آواز آتی ہے) "احسان!"

احسان (آہستہ سے) میں نہیں پیوں گا چائے۔ ۔ ۔ ۔

(ناصر علی کی پھر آواز آتی ہے) "احسان"

احسان (آواز دیتا ہے) آیا جی۔

(چہرے پر غصہ ہے۔ جاتا ہے۔ دروازہ کا کواڑ زور سے بند کرتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

آغا بابر بٹالوی
(بی۔ اے آنرز)

محفلِ ادب

اقبال کی تعلیم

(از جناب ڈاکٹر سید ظفرالحسن صاحب ایم۔ اے ڈی فل (آکسن) صدر شعبۂ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

(ڈاکٹر سید ظفرالحسن صاحب نے فرمایا کہ یہ کوئی مقالہ نہیں خراجِ عقیدت ہے جو میں اقبال کی جناب میں اس موقع پر پیش کرتا ہوں)

ستر اسی برس ہوئے ہندوستان کی اسلامی فضا میں ایک آواز گونجی جس سے زمین اور آسمان بھر گئے۔ اس آواز کا منبع علی گڑھ تھا۔ سر سید نے اس زور شور کے ساتھ مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جگایا کہ در و دیوار گونج اُٹھے اور عالمِ اسلام میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔

مسلمانوں کے ماضی و حال کو دیکھ دیکھ کر سر سید کی آنکھوں سے خون کے آنسو بہتے تھے اور اُن کے استقبال پر نظر کر کے سر سید کے زبان اور قلم تنبیہ اور تنبیہ، تدبر اور تدبیر کا تلاطم پیدا کر رہے تھے۔

پہلا شخص جس نے سر سید کا پیغام شعر کے سانچہ میں ڈھالا وہ حالی تھا۔ حالی نے مسلمانوں کے ماضی و حال کا ایسا نقشہ کھینچا اور ایسے دردِ دل کے ساتھ اس داستان کو بیان کیا کہ شعر کی تاریخ اس کی نظیر سے خالی ہے۔ دوست دشمن سب نے گردن ڈال دی اور حالی اسلام کا سب سے بڑا قومی شاعر مان لیا گیا۔

لیکن سر سید کا پیغام ابھی اجمالی تھا۔ اُنہوں نے قوم کو اس قابل بنایا کہ اپنی حالت کو سمجھے اور حالات کو سمجھے اور پھر یہ بھی سمجھے کہ اس کا مستقبل کیا ہونا چاہئے۔ اس مستقبل کی تفصیل ابھی باقی تھی۔

وہ شخص جس نے اس اجمال کی تفصیل کی جس نے ماضی سے استقبال کی طرف نگاہ کو پھیرا، وہ اقبال ہے۔ اقبال نے اس جوش و خروش اور اس ولولہ اور اُمنگ کے ساتھ زبانِ شعر و ادب میں اس مضمون کو ادا کیا کہ یہ اُس کا حصہ ہو گیا۔ حالی ہمارے حال کا شاعر تھا اقبال ہمارے استقبال کا شاعر ہے۔

ہندوؤں، بدھوں اور عیسائیوں کی تعلیم یعنی نفیِ خودی مسلمانوں میں پھیل گئی تھی۔ تصوف وانزوا نے اُن کے ہاتھ پیر شل کر دیئے تھے۔ نفیِ خودی کی بدولت وہ انفرادی خودی میں سکڑ کر رہ گئے تھے۔ اقبال نے بتایا کہ سرِ حیات نفیِ خودی میں

نہیں بلکہ خودی میں مضمر ہے ۔ یہ کائنات خودی کا مظہر ہے ۔ خودی پیدا کر ۔ یہی خودی ہے جو تجھے ایک اعلیٰ تر خودی یعنی بے خودی میں لے جائے گی اور تو انفرادیت سے نکل کر اجتماعیت میں آ جائے گا ۔

یہ تمام مقامات اقبال نے خود طے کئے ۔ وہ آغاز شعر میں نفی خودی اور وحدتِ وجود میں مبتلا تھا ۔ پھر اُس پر خودی اور وحدتِ وجود کا بھید کھلتا ہے ۔ اور آخر میں وہ بے خودی پر منتہی ہو جاتا ہے ۔

اقبال کی عظمت کا یہ ثبوت ہے کہ وہ جس جس مقام سے گزرتا ہے ایک عالم کے عالم کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے ۔ جب وہ نفی خودی کا راگ گا رہا تھا لوگ اُسے الاپ رہے تھے ، جب اُس نے خودی کا ڈنکا بجایا ہر ساز سے یہی آواز آنے لگی ۔ اب جب کہ اُس نے بے خودی یعنی للّٰہیت اور قوم پرستی کا آوازہ بلند کیا سب اُسی میں آواز ملا رہے ہیں ۔ آج مسلمانوں کا تمدن اور اُن کی سیاسیات بدرجۂ غایت اقبال کے شرمندۂ احسان ہیں ۔

مسلمان ایک گم کردہ راہ قافلہ کی طرح سیاسیات کے لق و دق بیابان میں بھٹکتے پھر رہے تھے مگر اس فلسفۂ حیات اور اسلامیات کے مبصر نے اُن کے لئے ایک مطمحِ پیدا کر دیا جس کے صائب ہونے کو لوگ نہایت سُرعت کے ساتھ مانتے جا رہے ہیں ۔ وقت آ رہا ہے اس کا جھنڈا عنقریب بلند ہو جائے گا ۔

اقبال کہتا ہے کہ ع من نوائے شاعر فردا ستم ۔ لیکن یہ ایک صدائے بازگشت ہے ۔ اے اقبال ! تیری صدا سے عالم اسلام کے دل و دماغ بھر گئے ہیں ۔ وہ تیری ہی تعلیم کی طرف جا رہے ہیں ۔ تو شاعرِ فردا ہی نہیں ، تو شاعرِ امروز بھی ہے ۔ اور تیرا اثر اتنا بڑا ہے کہ شاید ہی کسی اور شاعر کا کبھی ہؤا ہو ۔ تو قومی شاعر ہی نہیں تو شاعرِ عہد ہے ۔ یہ عہد تیرا عہد ہے ۔ عہدِ اقبال ہے ۔ کون شاعر تجھ سے پہلے یا تیرے زمانہ میں ، ہندوستان یا ایران و خراسان بلکہ امریکہ و فرنگستان میں ایسا ہؤا ہے جس کا تتبع اس درجہ کیا گیا ہو ، جس کی آواز میں اس طرح آواز ملائی گئی ہو ۔ آج جو شخص بھی شعر کہتا ہے ، وہ اقبال کے رنگ میں کہتا ہے ، جو مضامین بھی وہ بیان کرتا ہے اقبال کے مضامین ہوتے ہیں ۔ بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ بحریں بھی اقبال ہی کی ہوتی ہیں اور شعر سُنانے کا طریقہ بھی اقبال ہی کا طریقۂ ترنم ہوتا ہے ۔ ہاں یہ باوجود اس کے کہ ترنم کی کم نوائی شوکتِ مضمون کی متحمل نہیں !

زمانہ پر فرنگ چھا گیا تھا ، اُس کا سیلِ بے پایاں ایسا چڑھا تھا کہ عالم اسلام بھی اُس میں ڈوبا چلا جا رہا تھا ۔ اے اقبال ! تو نے اپنی معنی خیز اور سوز انگیز آواز سے ایک سدِ سکندری کھڑی کی اور اسے بتا دیا کہ ؎

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن
قدم اُٹھا ، یہ مقام انتہائے راہ نہیں

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہ جولائی ۱۹۳۸ء

نمبر ۱

تصویر:- بچپن

شمار	مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ
۱	"بزمِ ہمایوں"	بشیر احمد	۴۹۲
۲	جہاں نما	حامد علی خاں	۴۹۴
۳	نوائے راز	"	۴۹۸
۴	پھاگن کی رُت (نظم)	حضرت ذوقی	۴۹۹
۵	فیڈریشن	مسٹر محمد صدیق تاؤنی بی۔اے ایل۔ایل۔بی،	۵۰۱
۶	نورِ حق (نظم)	حضرت اثر صہبائی۔ ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی،	۵۱۰
۷	مسافر (افسانہ)	پیرزادہ احمد ندیم صاحب قاسمی۔بی۔اے،	۵۱۱
۸	امید کا دھارا (نظم)	" "	۵۱۵
۹	گرامی و اقبال	حضرت راحل ہوشیارپوری	۵۱۶
۱۰	غالب (نظم)	مسٹر پرشوتم لال ضیا راماداسی	۵۱۸
۱۱	جنگ کے بعد (افسانہ)	مسٹر ریاض۔اے۔گیلانی	۵۱۹
۱۲	بیکاری ــــ مادرِ وطن	جناب محمد ایوب صاحب	۵۳۱
۱۳	غزل	پروفیسر سید محمد جمیل صاحب واسطی ایم۔اے	۵۳۲
۱۴	گانا	جناب کرشن چندر صاحب۔ ایم۔اے۔ ایل۔ایل۔بی۔	۵۳۳
۱۵	رباعیات	جناب سردار تخت سنگھ صاحب	۵۳۷
۱۶	غزل	حضرت تشنی ملتانی	۵۳۸
۱۷	فخرِ موجودات سرورِ کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	حکیم پنڈت کرشن کنور دت صاحب شرما	۵۳۹
۱۸	نام	جناب سرد جمالی	۵۴۰
۱۹	غزل	پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری۔ ایم۔اے،	۵۴۲
۲۰	بینک میں (افسانہ)	مسٹر حمید نظامی۔بی۔اے۔	۵۴۳
۲۱	خیالاتِ پریشاں	جناب غلام یٰسین صاحب لدھیانوی	۵۴۶
۲۲	آئینۂ حیرت (غزل)	جناب عبدالمجید صاحب حیرت۔بی۔اے، علیگ	۵۴۷
۲۳	خودکشی کا اقدام (افسانہ)	مسٹر سعادت حسن منٹو	۵۴۸
۲۴	مزدور	جناب غلام یٰسین صاحب لدھیانوی	۵۵۲
۲۵	تقدیر کند خندہ (افسانہ)	جناب اشفاق حسین صاحب بی۔ایس سی، ایل۔ایل۔بی،	۵۵۳
۲۶	محفلِ ادب		۵۶۲

چندہ سالانہ صہ ــــ ششماہی سے (مع محصول) ــــ قیمت فی پرچہ ۸/

بزمِ ہمایوں

اک مدت سے یہ کوشش ہے کہ کسی طرح ادبیات کو سیاسیات سے الگ رکھا جائے لیکن کامیابی کی صورت نظر نہیں آتی۔

بقولِ مسٹر جناح اب ہندوستان کی ہر اینٹ اور روڑا اور پتھر سیاسی ہے۔ اب ہر شے پر اور کم از کم شہروں میں ہر شخص پر کسی نہ کسی طرح کا سیاسی رنگ چڑھا ہوا ہے۔ جناح صاحب کا نام سُن کر بعض حضرات ناک بھوں چڑھائیں گے جیسے پنڈت جواہر لال اور گاندھی جی کے ذکر پر بعض اَور اصحاب چراغ پا ہو جاتے ہیں۔ لیکن کیا یہ واقعہ نہیں کہ یہ اور بعض اَور حضرات ہمارے ملک و قوم کے بہترین رہنما ہیں جنھوں نے اپنی زندگیوں کا بیشتر حصہ دوسروں کی خدمت کیلئے وقف کر دیا ہے۔

دِقت یہ ہے کہ ہم ہر شخص کو اپنا ہم خیال بنانا چاہتے ہیں۔ اِس میں بھی حرج نہیں لیکن جب ہم اُسے ہم خیال بنا لینے میں کامیاب نہیں ہوتے تو ہم اپنے عمل یا قول یا کم از کم خیال میں جھنجلانے لگتے ہیں کہ یہ نابکار کیوں ہمارا ہم مشرب بن کر دُنیا کو ایک جنت گاہ بنا دینے میں ہمارا مددگار نہیں ہو جاتا؟

زندگی میں بڑا صبر درکار ہے اور یہ دُنیا خواہ اگلی دُنیا موجود ہو نہ ہو ضرور ایک امتحان گاہ ہے امتحان گاہ۔ گو ممتحن غائب یا بعض لوگوں کے نزدیک مفقود ہی کیوں نہ ہو! اخلاق مذہب علم و ادب سیاست سب میں اختلافات ہوتے ہیں اور کیوں نہ ہوں:۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

عام سیاسیات کو چھوڑ کر اُردو ہندی کی سیاسیات پر ایک نظر ڈالو۔ ہندی کا جھنڈا یوں تو ساٹھ ستر سال سے بلند کیا جا رہا ہے یعنی نئی ہندی کا۔ مالوی جی نے اِس تماشے میں بڑے بڑے کرتب دِکھائے، کچھ اِدھر سے ہوا کچھ اُدھر سے ہوا لیکن تعجب بلکہ افسوس اس پر آتا ہے کہ اُدھر کانگرس ہندوستانی کو مُلکی زبان قرار دیتی ہے اور اُردو اور ناگری دونوں حروف کو تسلیم کرتی ہے اور ادھر اسی کانگرس کے بعض نہایت ممتاز رہنما کشمیر سے راس کماری تک ہندی کا پروپیگنڈا کرتے ہیں۔ خود گاندھی جی بہ نفسِ نفیس جو کچھ کوشش اس بارے میں فرماتے رہے ہیں اُن سے ہندوستان کی دُنیا کا بچہ بچہ واقف ہے۔ گاندھی جی ملک کے مسلّمہ لیڈر ہیں اور اس کے ساتھ نئی ہندی کا وہ فرقہ وارانہ کام کرتے ہیں کہ عقل حیران ہے کہ یہ کیا ماجرا ہے؟

آج ہی ایک "قوم پرست" سے اس کے متعلق بات چیت ہوئی۔ مولانا ابو الکلام آزاد کے تازہ ترین بیان کا ذکر ہوا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ کانگرس نے اس مسئلے میں اپنی غیر جانبداری اور انصاف پسندی کا عملی ثبوت دیا ہے۔ بہار میں کمیٹی مقرر کی ہے

جو ہندوستانی کا لغت تیار کرے گی، اُس میں مولانا عبدالحق صاحب سے اُردو لیڈر شامل ہیں۔ مدراس گورنمنٹ کے لئے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ہندوستانی ریڈر تیار کر چکے ہیں جو بہترین قومی زبان کا قابلِ دید نمونہ ہے۔ اس پر بھی نالائق لیگی لیڈر شور مچا رہے ہیں۔ یہ سب کچھ درست ہے، لیکن جو بات ان نالائقوں کی سمجھ میں نہیں آتی وہ یہ ہے کہ اُردو کی اتنی خاطر ہو رہی ہے پھر بھی "قدم ہندی کا بڑھتا ہے"۔ کہا جاتا ہے کہ ہندی کو ہندوؤں سے واسطہ نہیں وہ تو اپنی ایک زبان ہے کہ اپنا کام کر رہی ہے اپنا قدم بڑھا رہی ہے۔ سب کچھ درست لیکن حضرت آخر اس قلابازی کی کیا وجہ ہے کہ بیس سال ہوئے، یو۔پی میں جہاں اسّی فیصدی ہندو بھائی اُردو اور صرف بیس فیصدی ہندی پڑھتے تھے وہاں اب معاملہ بالکل برعکس ہے اور ہندی ہندی ہو رہی ہے۔ آخر اس قلب ماہیت کا کیا سبب ہے؟ پچھلے بیس بلکہ دس سالوں میں بلکہ پچھلے ہی سال میں کونسا انقلاب آگیا کہ اُردو لٹریچر میں کیڑے پڑ گئے۔ اُس کا رسم الخط یک لخت نامعقول اور بھرشٹ ہو گیا۔ وہ ہندوستان میں ایک ہزار سال رہ کر بھی اجنبی اور ملیچھ قرار دیا گیا؟

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ ملک کے ایک محدود حصے میں کچھ عرصے سے ہندی کا چرچا رہا۔ کئی ہندو عورتیں ہندی سیکھتی رہیں سب سنسکرت دان پنڈت ہندی جانتے تھے لیکن وہ نئی ہندی انوکھا ہندوستانی جس کا پرچار اب بڑے زور شور سے ہونے لگا ہے اُس سے بیشتر ہندوستانیوں کے کان بلکہ آنکھیں اور دماغ تک آشنا نہ تھے۔ یہ کنتو پرنتو جو حشرات الارض بن کر ہر جگہ رینگنا چاہتے ہیں اور لیکن مگر چھوڑ بیچارے پر تک کی جان کے پیچھے پڑے ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ گاندھی جی سے "قوم پرستوں" کو کیوں چند ہی دنوں میں ان سے اس قدر لگاؤ ہو گیا ہے؟

زبان کا مسئلہ بڑا نازک مسئلہ ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کی آخری اور سب سے زبردست نشانی اُردو زبان ہے، اُردو حروف میں لکھی جانے والی زبان! جو اسے برباد کرتا ہے وہ ہندو مسلم مفاہمت کو برباد کرتا ہے، جو اس سے مُنہ پھیرتا ہے وہ قومیت کے صحیح تصوّر سے مُنہ پھیرتا ہے اگر چند سال اور یہی کیفیت رہی تو ہندوستان بابل کا بُرج بن جائے گا جہاں ایک بھائی دوسرے کی بات نہ سمجھے گا اور جس پر زمانے کا طوفان ایک آفت بن کر ٹوٹے گا۔ ہم اپنے اُردو پسند ہندو بھائیوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس معاملے میں اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے اپنے اُردو سے مُنہ پھیرنے والے بھائیوں کو راہ پر لائیں۔ ادھر یہ ہم اعتدال پسند مسلمانوں کا کام ہے کہ اپنے انتہا پسند بھائیوں کو ترغیب دیں کہ وہ اُردو کو ہندوستانی جذبات و خیالات کا صحیح ترجمان بنائیں!

بشیر احمد

معذرت:۔ ہمیں دلی افسوس ہے۔ کہ گذشتہ مہینے حضرت راحلؔ کے مضمون میں محترمہ قرطبیس بانو پروین کے شعر کے نیچے ان کے والد ماجد جناب مرزا عاشق حسین صاحب بزم اکبرآبادی مدظلہ کے نام کے ساتھ مرحوم کا لفظ چھپ گیا۔ حیدرآباد سے مرزا صاحب ممدوح کا گرامی نامہ موصول ہونے پر ہمیں اس غلطی کا احساس ہُوا۔ اس سہو کے لئے حضرت راحلؔ اور ہم مرزا صاحب اور دیگر احباب سے معافی چاہتے ہیں۔

"ہمایوں"

جہاں نما

ہندوستان اور انگلستان

انگلستان کے اخبار "مانچسٹر گارڈین" نے ڈاکٹر ٹیگور سے ہندوستان کے مجوزہ وفاقی نظام حکومت کے متعلق اظہار خیال کرنے کی درخواست کی تھی۔ ڈاکٹر ٹیگور نے جواب میں اس اخبار کے ایڈیٹر کو لکھا ہے کہ اہلِ انگلستان مجوزہ وفاق کے متعلق ایک شدید غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ ان کا یہ خیال صحیح نہیں کہ مجوزہ وفاق قریب قریب حکومت خود اختیاری کا ہم پلہ ہے۔ اپنے اس دعوے کی تصدیق کے لئے ڈاکٹر ٹیگور نے اہلِ انگلستان کو یوں مخاطب کیا ہے :۔

"اُس ملک کو حکومتِ خود اختیاری کیونکر حاصل ہوسکتی ہے جس کی بے شمار آبادی حکماً غیر مسلح ہے، جسے اپنی آمدنی کے ۱/۴ حصے پر کسی قسم کا اختیار نہیں ہے اور جسے اپنے معاملاتِ خارجہ میں قطعاً کسی قسم کا دخل حاصل نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اہلِ انگلستان کو اپنے گھر میں کوئی اس قسم کی حکومت دی جائے جسے ہندوستان کی "حکومت خود اختیاری" سے دور کی نسبت بھی ہو تو وہ اپنے آپ سے نفرت کرنے لگیں۔ انگلستان کی بخیلانہ دریادلی نے ہمیں آزادی نہیں دی بلکہ آزادی کی ہنسی اُڑائی ہے "

اہلِ انگلستان شاید یہ جواب دیں کہ وہ ہندوستان پر محض اس ملک کی ہوا خواہی کے لئے حکومت کر رہے ہیں اور اس ملک میں قیامِ امن واماں کے مقدس فرض نے اُن کے کندھوں پر ایک بارِ عظیم ڈال رکھا ہے۔ آئیے اس دعوے پر بھی روشنی ڈالیں :۔

"اگر کوئی بدلحاظ ہندوستانی آپ کو ہندوستان پر آپ کے طویل دورِ حکومت کا نقشہ دکھائے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ کی حکومت ہندوستان کے لئے افلاس، جہالت اور جسمانی و روحانی تباہی کا ایک نامتناہی سلسلہ لے کر آئی ہے۔ آپ اس نقشے کو دیکھ کر بہت بگڑیں گے اور شاید ہندوستان کو مجرم گردانیں گے لیکن خدا را نظرِ انصاف سے دیکھئے کہ آپ کی حکومت ہماری تعلیم، حفظانِ صحت اور اقتصادی اصلاح پر کتنا روپیہ صرف کرتی ہے اور اس کے بعد دیکھئے کہ جاپان کی حکومت ان محکموں پر کیا خرچ کرتی ہے۔ یہ مقابلہ آبادی کے تناسب کو مدنظر رکھنے سے اور بھی زیادہ دلچسپ ثابت ہوگا۔ میں اہلِ انگلستان کو صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ جب تک وہ ہمیں اپنے پنجے میں گرفتار رکھیں گے انہیں ہمارا اعتماد یا دوستی حاصل نہیں ہوسکتی۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ اپنے گھر میں اہلِ انگلستان بعض غیر معمولی خوبیوں کے
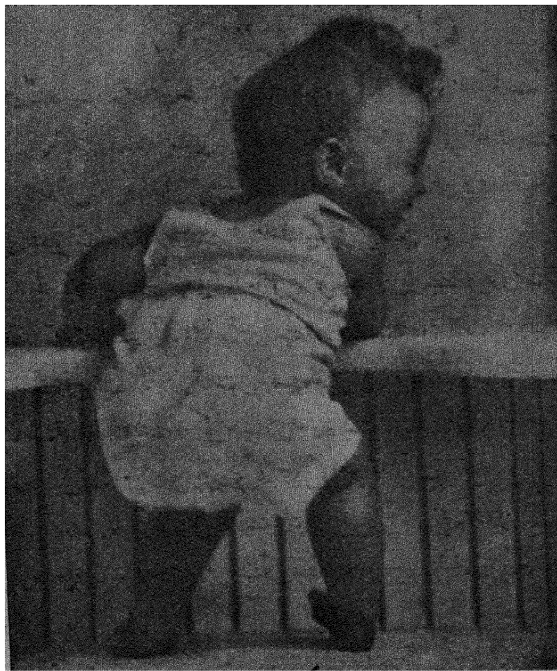
اسیر پنجۂ عہد شباب کر کے مجھے کہاں گیا مرا بچپن خراب کر کے مجھے

مالک ہیں۔ہم ان کے عدل وانصاف کے احساس کی بھی قدر کرتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ آپ لوگ اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ یہی انگریز جو اپنے گھر میں ان خوبیوں کا مالک ہے گھر سے باہر جا کر کس طرح اپنے ملک کی بہترین روایات کی توہین کرنے لگتا ہے۔ مگر یاد رکھئے کہ حکومت کا نشہ ہمیشہ بدمست بنا دیتا ہے اور اس نے آپ کو بھی بدمست کر دیا ہے۔

لیکن انگلستان کے بعض ذی حس لوگوں کو یہ احساس ہو چکا ہے کہ ہندوستان میں انگلستان کے شہنشاہانہ اقتدار کی انہیں بہت گراں قیمت دینی پڑی ہے +

ایک حد سے زیادہ وسیع سلطنت کے بوجھ نے آپ کو اتنا کمزور اور بزدل بنا دیا ہے کہ آپ اُن خیرہ چشم حکومتوں کی خودسرانہ کارروائیوں کی روک تھام کے قابل نہیں رہے جو بین الاقوامی سیاسی اخلاق کی حدود کو توڑ رہی ہیں اور یہی نہیں بلکہ آپ کے رعب وقار کی بنیاد کو بھی ڈھا رہی ہیں۔آپ میں ایسے صاحب تدبّر اور بہادر لوگ ابھی بہت کم ہیں جو ایک طاقت اور جبر سے قائم کردہ حکومت کے رعب وقار کو بے حقیقت سمجھ کر ٹھکرا دیں۔ یہ قلیل گروہ ابھی اس قابل نہیں کہ حکومت کی اُس اندھی طاقت کا مقابلہ کر سکے جو بدمستی کے عالم میں اپنی تباہی کا راستہ خود تیار کر رہی ہے

اگر آپ میری رائے پوچھتے ہیں تو میں صاف کہتا ہوں کہ اب اس تباہی کی روک تھام قریب قریب ناممکن ہو چکی ہے۔میرے خیال میں وہ ایک ہی کام جس میں یورپ کی تمام مختلف قومیں یک دل و یک جان ہو کر لگی ہیں باہمی تباہی کا راستہ صاف کرنے کا کام ہے۔لیکن اس کے ساتھ ہی میرا یہ ایمان بھی ہے۔کہ اگر یہ تباہی آگئی اور کسی قسم کی روک تھام اس کے آڑے نہ آ سکی تو بھی یہ مکافات کی حدود کو نہ توڑے گی۔میں سمجھتا ہوں۔کہ آپ کی تہذیب میں بہت سی خوبیاں بھی ہیں جو کبھی مٹ نہیں سکتیں۔ مگر بعض اوقات تقدیر کا حملہ اندھا بھی ہوتا ہے اور اگر انسان وقت پر سنبھل نہ جائے تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔

لیکن اس تاریکی میں روشنی کی ایک کرن بھی ہے۔یعنی ہندوستان اور انگلستان کی بعض بہترین خصوصیات تباہی کے اِن عناصر کے خلاف صف آرا ہیں :-

یہ درست نہیں کہ ہندوستان انگلستان کی دشمنی پر ادھار کھائے بیٹھا ہے۔بیدار ہندوستان اور بیدار انگلستان دونوں اُن اندھی اور غیر انسانی قوتوں کے خلاف ہیں جو دونوں سے غداری کر رہی ہیں۔ہماری سلامتی کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ جہاں کہیں بھی ایسی انسانیت آشنا قوتیں ہیں جو فرد کو فرد کی لوٹ مار سے اور قوم کو قوم کی لوٹ مار سے بچانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ہم ان سے متفق و متحد ہو جائیں +

سالمات کا ایک نوالہ

اگر آپ ایک گہری سانس لیں تو آپ ہوا کے کم از کم ۰۰۰و ۰۰۰و ۰۰۰و ۰۰۰و ۰۰۰و ۰۰۰و ۰۰۰و ۴۰ سالمات (Molecules) نگل جائیں گے۔ یہ اندازہ حال ہی میں ایک امریکن سائنس داں نے کیا ہے جس نے یہ بھی بتایا ہے کہ یہ سالمات ۱۲۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے حرکت کر رہے ہیں۔ سالمہ دنیا کی اچھی سے اچھی خردبین سے بھی نہیں دیکھا جاسکتا۔ لیکن کن ٹکی کے ڈاکٹر چارلز ہائر نے متحرک تصاویر کی مدد سے ان کی رفتار کا تخمینہ کر لیا ہے۔ یہ ڈاکٹر اگرچہ سالموں کو نہیں دیکھ سکتا تھا مگر چھوٹے چھوٹے اُن ذرّوں کو ضرور دیکھ سکتا تھا جو مائعات میں ادھر اُدھر جھپٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس حرکت کو (Brownian motion) کہتے ہیں اور یہ بات طے ہو چکی ہے کہ اس حرکت کا باعث ذرات پر سالمات کی زبردست یورش ہوتی ہے ۔

ڈاکٹر ہائر نے ان فاصلوں کو ماپ لیا جن میں ذرات ایک خاص وقت میں حرکت کرتے رہے۔ اس غرض سے اُس نے اُن کی متحرک تصاویر لیں جن کے لئے تیز برقی روشنی کے علاوہ ایک زبردست خردبین بطور لینز کے استعمال کی گئی ۔

ہندوستانی تصویر خانہ

"آل انڈیا فائن آرٹس اینڈ کرافٹس سوسائٹی" کے صدر نے حال ہی میں اپیل کی ہے کہ دہلی میں ہندوستان کا ایک "قومی تصویر خانہ" (National Art Gallery) قائم ہونا چاہئیے۔ اس سلسلے میں صاحب موصوف نے ذیل کے خیالات کا اظہار کیا ہے:۔

ملک میں ایسے بہت سے عجائب گھر ہیں جن میں ہندوستانی بت تراشی کے بیش بہا نمونے جمع ہیں۔ بعض ایسے تصویر خانے بھی موجود ہیں جن میں راجپوتی اور مغلیہ دَور کی تصاویر جمع ہیں۔ لیکن ایسی کوئی جگہ نہیں جہاں ہندوستان کے جدید فن مصوّری کے نمونے جمع ہوں۔ جدید مصوّری بہت بلند حیثیت نہ سہی ایک خاصی نمایاں حیثیت حاصل کر چکی ہے اور اب وہ وقت آگیا ہے کہ اُن تمام مصوّروں کے کارنامے منظم طریقے سے یکجا جمع کر دیئے جائیں جو ملک کے مختلف گوشوں میں کام کر رہے ہیں ۔

قومی تصویر خانے کی عمارت اور دوسرے مصارف کے لئے چندہ جمع کرنے کا کام شروع کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ پہلے دن چند ارکان نے ۱۴۰۰۰ روپے کے اعلانات کئے ۔

گیارہ سال کی عمر

نیویارک کی "میٹروپولیٹین لائف انشورنس کمپنی" کے کارکنوں نے اندازہ کیا ہے کہ انسان کی عمر میں گیارہواں سال محفوظ ترین سال ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اوسطاً اس عمر کا بچہ صحت مندی کی معراج کو پہنچ جاتا ہے۔ ایسی صحت نہ اُسے کبھی پہلے حاصل ہو سکتی ہے اور نہ اس کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔ اِس عمر میں صحت کی قوت مدافعت ہر قسم کی بیماریوں پر اتنی غالب ہوتی ہے کہ جو بچے اس عمر میں

مرتے ہیں - وہ عموماً حادثات کا شکار ہوتے ہیں کسی بیماری کا حملہ ان کی موت کا موجب نہیں بنتا- اس زمانے میں شیر خواری اور صغر سنی کی ابتدائی آفات کا دور گزر چکتا ہے اور نوخیزی، جوانی اور بڑھاپے کے تدریجی ترقی کرتے ہوئے عوارض کا سلسلہ ابھی شروع نہیں ہونے پاتا۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے۔ گیارہ سال کی عمر میں موت عموماً حادثات سے واقع ہوتی ہے۔ لیکن اس عمر میں انسانی زندگی کی قوت مدافعت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ حادثات سے بھی نسبتاً کم ہی موتیں واقع ہوتی ہیں ؎

ہندوستانی سنیما اور پریزیڈنٹ سبھاش چندر بوس

ہندوستان میں سنیما نے جس قدر سرعت سے ترقی کی ہے۔ کسی اور تجارت نے نہیں کی۔ اہلِ ملک اب اسے اپنا سب سے بڑا ذریعۂ تفریح سمجھنے لگے ہیں اور جاہل سے جاہل اور غریب سے غریب ہندوستانی بھی اس پر روپیہ صرف کرنے میں دریغ نہیں کرتے۔ عوام پر سنیما کے اثر کو دیکھ کر حکومت بھی اس فن کی خاص نگرانی کرتی ہے۔ اور اکثر وزرائے حکومت بھی سنیما ہاؤسوں کا معاینہ کرتے رہتے ہیں۔ اب تک سنیما والوں کے پیشِ نظر صرف اہلِ ہند کی تفریح اور تعلیمی و اخلاقی ترقی ہی رہی ہے۔ لیکن اب کانگریس کے صدر مسٹر سبھاش چندر بوس نے یہ نیا خیال ظاہر کیا ہے کہ ہندوستان کے مخالف یورپی اور امریکی مصنفین نے اس ملک کے خلاف اپنے ہاں جن غلط خیالات کی اشاعت کر رکھی ہے ان کا توڑ بھی سنیما کے ذریعے سے کیا جائے اور ایسی فلمیں بنائی جائیں جو ہندوستانی تہذیب و معاشرت اور دیگر کوائف کی صحیح نمائندگی کریں - پریزیڈنٹ بوس کا خیال ہے کہ ہماری تعلیمی اور ثقافتی فلمیں اہل مغرب کے دلوں سے وہ غلط خیالات نکال دیں گی جو مخالفانہ پروپیگنڈا کی وجہ سے پیدا ہو چکے ہیں ؎

یہ مقصد بلاشبہ بلند ہے اور طریق کار کی کامیابی میں بھی کوئی شبہ نہیں کیونکہ خود مغربی فلموں نے اہلِ ہند کی ذہنیت پر ایک ناقابلِ انکار اثر ڈالا ہے۔ لیکن یہ امر ابھی مشتبہ ہے کہ ہندوستان کی فلمیں اپنی موجودہ ناترقی یافتہ صورت میں دوسرے ملکوں پر کوئی مفید اثر ڈالنے میں کامیاب ہو سکیں گی۔ ہماری فلمیں ابھی بہت ناکارہ ہیں ؎

اس کے علاوہ یہ امر تو درست ہے کہ ہندوستان کی تہذیب و ثقافت بہت قدیم ہے۔ اور ہندوستان نے دنیا کو بہت کچھ سکھایا ہے۔ لیکن یہ امر مشتبہ ہے کہ صدیوں کی غلامی نے اُس تہذیب و تمدن کا کوئی نشان ہم میں باقی چھوڑا ہے جس کی گذشتہ تاریخ پر ہمیں ناز ہے ؎

حامد علی خاں

تصحیح :- گزشتہ مہینے جناب شمیم کی نظم کا یہ مصرع "زہرہ و خورشید کی محفل کو گرماتا ہوا" غلط چھپ گیا ہے۔ اس کی تصحیح کر لی جائے۔

"ہمایوں"

نواہائے راز

پھر ہوں میں وہی اور وہی غم خانہ ہے میرا
پھر ہے وہی شب اور وہی افسانہ ہے میرا

کچھ اپنی تباہی کا مجھی کو نہیں ماتم
آفاق کا ہر گوشہ عزا خانہ ہے میرا

یہ کیوں ترے دیوانے پہ عالم کی نظر ہے
جس شخص کو دیکھو وہی دیوانہ ہے میرا

ہے شائبۂ عقل یہاں دُردِ تہِ جام
لبریز مئے عشق سے پیمانہ ہے میرا

بیعانۂ ہمت ہے کرم کجکلہوں کا
اے فقر نہ دب حوصلہ شاہانہ ہے میرا

کہتے ہیں جسے چارہ گرِ غیب کی تائید
اِک جذبہ وہ اے ہمّتِ مردانہ ہے میرا

اس کم نگہی پر بھی ترے فیض سے اے عشق
ہر حرف ہر انداز فقیہانہ ہے میرا

افلاک بھی ہمت کی نظر چڑھ نہیں سکتے
خود عرش سے اِک رشتہ حریفانہ ہے میرا

ہے دِل میں وہی آگ وہی سوز وہی نُور
روشن ابھی جلتا ہوا ویرانہ ہے میرا

حامد علی خاں

پھاگن رُت

عشق کا موسم بہ طرزِ والہانہ آگیا
کوئلوں کا اور پپیہوں کا زمانہ آگیا

دل میں پھر نشتر چبھوتی ہے پپیہوں کی پکار
پھر پہاڑوں کو چلیں قازیں قطار اندر قطار
پھر ہوائے صبح میں جاں بخش نرمی آچلی
پھر خمار انگیز، خواب افروز گرمی آچلی
پھر ہوائیں چل رہی ہیں رونگٹے چھوتی ہوئی
مستیوں میں تیرتی پھرتی ہے موجِ سرخوشی
پھر یہ دُنیا بن گئی ہے اِک طلسمی سرزمیں
ہیں مناظر خواب کے مانند شیریں اور حسیں
پھر سلونی شام کی نیلی فضا میں دُور تک
اُڑ رہی ہے آم کے پھولوں کی عنابی مہک

دشت و صحرا جاگ اُٹھے ہیں آب و گِل میں جان ہے
شعر اور رومان کی دُنیا میں پھر ہیجان ہے

(۲)

پھر بھرا ہے دہر نے افسانوی دُنیا کا رُوپ
گرمیوں کے خواب سے معمور ہے جاڑوں کی دھوپ

مُسکراتی ہیں بہاریں وادی و کُہسار میں
اُودی اُودی نرم کلیاں آ گئیں کچنار میں
شاخِ گُل پر رقص کرتی ہیں سُنہری تتلیاں
مست بھونرے گونجتے ہیں نیبوؤں کے درمیاں
روح میں سوزِ محبت کا دریچہ پھر ہے باز
پھر ہواؤں میں ہے اک موہوم خوشبو کا گداز
دل کی دھڑکن پھر سرودِ غم سے ہم آہنگ ہے
پھر ہوا میں مستیاں ہیں پھر فضا میں رنگ ہے
یہ جنوں افروز راتیں! یہ قیامت خیز دن!!
یہ فسانہ ساز راتیں! یہ فسوں انگیز دن!!

ہر قدم پر سوز و سازِ روح کا سامان ہے
عشق ہو جانے کا ہر ہر گام پر امکان ہے!

ذوقی

اُمید کا دھارا

موجوں میں سکوں، تہ میں نہاں آگ کے طوفاں
اُمید کے دھارے پہ بہے جاتے ہیں انساں
فردوسِ نظر ہوتی ہے پانی کی روانی
بجرے پہ تھرکتے ہوئے مانجھی کی جوانی
لہروں سے نکلتے ہوئے معصوم ترانے
بنتے ہیں مسافر کی تسلی کے بہانے
قطروں میں چمکتے ہوئے خورشید کی تصویر
ساحل پہ بکھرتی ہوئی موجوں کا بم و زیر
پہلے تو انہیں دیکھ کے ہوتا ہے سکوں سا
بن جاتا ہے لیکن یہ سکوں ایک جنوں سا

"منزل نہیں ملتی تو لگا مجھکو کنارے
مانجھی مجھے ڈستے ہیں یہ موہوم نظارے
یہ راہ تو کاٹے نہیں کٹتی نہیں کٹتی
اس درد سے مانجھی تری چھاتی نہیں پھٹتی؟"

لگتا ہے کنارے جو اُمیدوں کا سفینہ
پھر حسرتِ دیدار سے جل اُٹھتا ہے سینہ
مانجھی نے وہ پھر جھوم کے چپّو کو سنبھالا
وہ دُور چمکتا ہے اُمیدوں کا شوالا

احمد ندیم قاسمی

گرامی و اقبال

(۱)

بچشمِ ما درِ احمدؐ دریچۂ احد است — زبانِ ما عجمی و نگاہِ ما عربی ست
نہ جبرئیل نہ حسانم و نہ جوہرِ فرد — مدیحِ خواجہ بخوانم کمال بے ادبی ست
سحر رسید بگوشم ندا ز حضرتِ قُدس — کہ صدرِ بزمِ نبوّت یتیمِ مطلبی ست
دماغِ حضرتِ اقبال نکتۂ آورد — چہ نکتہ ایست کہ دروے ہزار بوالعجبی ست
"متاعِ قافلۂ ما حجازیاں بُردند — ولے زباں نکشائی کہ یارِ ما عربی ست"

لسان العشق گرامی رح

(۲)

سخنے راندۂ کہ جز قرشی — بسرِ مسندِ نبیؐ نہ نشست
سنگِ حرفِ تو شیشۂ معنی — در ادب گاہِ امتیاز شکست
درس گیر از گرامیِ ہمہ درد — کہ بُرید از خود و باو پیوست
رمزِ تُرک و خلافتِ عربی — گفت آں میگسارِ بزمِ الست

"ماہ را بر فلک دو نیم کند
فقر را تُرکمانیٔ ہم ہست"

ترجمانِ حقیقت اقبال رح

عقل و عشق

(۱)

عشق را دار و عقل را منبر — عقل در رنگ و عشق خود بیرنگ
مسندِ عقل بر لبِ ساحل — عشق را تختگاہ کامِ نہنگ
عقل را دست بوسِ مور و ملخ — عشق را سُفتہ گوشِ شیر و پلنگ

عقل در پردہ گفت ہاں خاموش — عشق مستانہ برکشد آہنگ
عقل در رنگ اختلاف آورد — عشق صد رنگ را کند یک رنگ
عقل با عشق نسبتے دارد — جامِ بلور و بادۂ گلرنگ

بے ادب ایں سخن چہ می فہمد
ابلہ نشناخت ماہی از خرچنگ

گرامی رح

(۲)

عقل در پیچاکِ اسباب و علل — عشق چوگاں بازِ میدانِ عمل
عشق صید از زورِ بازو افگند — عقل مکار است و دامے می نہد
عقل را سرمایہ از بیم و شک است — عشق را عزم و یقیں لاینفک است
عقل چوں باد است ارزاں در جہاں — عشق کمیاب و بہائے او گراں
عقل محکم از اساسِ چون و چند — عشق عریاں از لباسِ چون و چند
عقل میگوید کہ خود را پیش کن — عشق گوید امتحانِ خویش کن
عقل گوید شاد شو آباد شو — عشق گوید بندہ شو آزاد شو
آں کند تعمیر تا ویراں کند — ایں کند ویراں کہ آباداں کند

اقبال رح

عشق و ہوس

بتمہیدِ وفا سنجاں خاریست تہِ پائے — امیدِ ہوس کوشاں گل بر سرِ دستارے

گرامی رح

در عشق و ہوسناکی دانی کہ تفاوت چیست — آں تیشۂ فرہادے ایں حیلۂ پرویزے

اقبال رح

محمد عبدالرشید ساحل

غالب

وطن کا افتخار اے شاعرِ جادو بیاں تُو ہے
ریاضِ ہند کی گویا بہارِ بے خزاں تُو ہے

عطا فطرت نے کی ملکِ سخن کی قیصری تجھکو
ادب کی سرزمیں کی مل گئی اسکندری تجھکو

تری ہر سطر سلکِ تابدارِ گوہرِ معنی،
تڑپتے ہیں تری ہر بات میں سو دفترِ معنی

سزاوارِ قسم رفعت تری نازک خیالی کی
رسائی تا بہ چرخِ ہفتمیں افکارِ عالی کی

تھی جب بھی بیخودی چھائی ہوئی تیرے دل و جاں پر
"کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر"

ستایش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ ہے "گلدستہ" اللہ اللہ تیرے "طاقِ نسیاں" کا

فنائے عشرتِ گیتی پہ تو اس درجہ گریاں ہے
کہ "صبحِ عید تجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے"

تری "بیرنگ"[1] اُردو سے بھی لاکھوں رنگ پیدا ہیں
تری سنگیں زمینوں سے گُلِ رنگیں ہویدا ہیں

تری شیریں کلامی اور قہرِ تلخیٔ دوراں
ابھی تک رو رہا ہے اپنی بدبختی پہ ہندوستاں

مگر ہو مژدہ غالب تجھکو تیرے ہاتھ کا پودا
بڑھا بڑھتا رہا کچھ اس طرح سے پھول پھل لایا

کہ اُس کے حُسن و خوبی کا چمن سارا ہے شیدائی
درِ اُردو پہ ہے جملہ زبانوں کی جبیں سائی

پرشوتم لال ضیا رامداسوی

[1] فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ ۔ بگزر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگِ من است ۔
غالب

گانا

گانا کئی قسم کا ہوتا ہے، اس کی ایک قسم تو وہ ہے جو متوسّط درجے کے گھروں میں عام طور پر پائی جاتی ہے، دیکھی جاتی ہے، اور ہاں، اگر بھاگ نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہو تو سُنی بھی جاتی ہے، عام طور پر ایک گھٹیا سا رذیل ہارمونیم ہوتا ہے، یوں تو موسیقی کے اعتبار سے ہر ہارمونیم ہی فطرۃً رذیل ہوتا ہے، لیکن پھر اس رذالت کے بھی کئی درجے ہیں، اور متوسط گھروں میں اکثر باجے درجۂ سوم و چہارم کے ہوتے ہیں۔ مگر خیر یہ تو ایک غیر متعلق بات تھی، اصلی چیز تو "گانا" ہے، گانے کے لئے متوسط درجے کے گھر میں ایک لڑکی ضرور ہوتی ہے، بہت سے گھروں میں شاید ایک سے زیادہ ہوتی ہوں گی، لیکن اوسط کے اعتبار سے ایک ہی کافی ہے۔ آپ اس لڑکی کو جو چاہے کہہ کر پکاریئے، بملا، کملا، زبیدہ، پرکاش کور، مطلب ایک ہی ہے یعنی اوسط گھرانے کی لڑکی جو گانا جانتی ہے اور جس پر سارے گھر والوں کو ناز ہے، اب اس لڑکی کو آپ ذہن میں رکھیئے اور پھر اُس ہارمونیم کی طرف بھی خیال کیجیے جو اُس طاقچے میں لکڑی کے صندوق میں جس پر خاکی زین کا غلاف چڑھا ہے نہایت احتیاط سے رکھا ہوا ہے۔

متوسط درجے کے گھروں میں گانا عموماً کھانا کھانے کے بعد شروع ہوتا ہے، اور اس کا محرک بیچارا وہ غریب مہمان ہوتا ہے جو بھولا بھٹکا کبھی متوسط درجے کے گھر میں آنکلتا ہے، پیٹ پر دو تین بار ہاتھ پھیر کر اور چند لمبی لمبی کھٹی ڈکاریں لے کر میزبان مہمان سے پوچھتا ہے:۔

"تاش واش کھیلو گے؟"

"نہیں"

"ایک آدھ بازی برج کی؟"

مہمان ایک جمائی لے کر جواب دیتا ہے "جب سے سکرٹریٹ میں ملازم ہوا ہوں، برج بھی بھلا بیٹھا ہوں"۔

"اچھا تو پھر —— جانتے، گراموفون اُٹھالا"

جاپان کی ترقی کا راز وہاں کے لوگوں کی محنت و مشقت میں نہیں، نہ اس امر میں کہ اُنھوں نے مغربی تہذیب و سائنس کو اپنایا ہے، بلکہ محض اس امر میں ہے کہ وہ لوگ ہندوستان کے متوسط طبقے کو جاپانی گراموفون، جاپانی کریپ، جاپانی سائیکل جاپانی گھڑیاں، جاپانی تصویریں اور اسی قسم کی ہزاروں سستی اور بے کار چیزیں بھیج کر اُسے ہمیشہ فریبِ نفس میں مبتلا رکھتے

ہیں، سیاسی غلامی اور ذہنی غلامی دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

مثال کے طور پر اس گراموفون کو لیجیے۔ دیکھنے میں بے شک خوشنما، بالکل ریڈیو معلوم ہوتا ہے قیمت صرف پچیس روپے دسویں بارھویں دن اس کا فنر (Funner) ٹوٹ جاتا ہے، مگر یہ ایک بالکل فروعی بات ہے، اصل بات تو ہے گانا!" یہ ناچ آپ نے سُنا، پتلی کمر توری بل کھائے جائے"۔ "جی میں نے فلم دیکھا تھا"۔ "اوہ ـــ اچھا یہ ریکارڈ: اک میرے ماہی دی مُندری ـــ بالو، یہ آپ نے نہیں سُنا ہوگا"۔

"اچھا سنا دیجیے"

ریکارڈ بجنا شروع ہوتا ہے، آدھا ریکارڈ ختم ہونے کے بعد فنر ٹوٹ جاتا ہے۔ یا یونہی گھرڑ، گھرڑ کی آوازیں سنائی دینے لگ جاتی ہیں۔

میزبان بُرا سا منہ بنا کر کہتا ہے، ارے مُنّے ـــ گراموفون بند کردو (اور پھر مسکرا کر) بملا! (یا کملا! زبیدہ! پرکاش کور!) انہیں گانا سناؤ بیٹی!

بملا آخر متوسط گھرانے کی لڑکی ہے، حیا سے کانوں تک سُرخ سُرخ ہوجاتی ہے، اور سر جھکا لیتی ہے، اس طرح کہ بیچارے مہمان کو پورا یقین ہوجائے کہ بیچاری بملا گانا تو کجا بولنا بھی نہیں جانتی۔

میزبان دوسری بار پھر پیار سے مگر ذرا اونچی آواز میں کہتا ہے۔ بملا، جا ہارمونیم لے آ نا، وہ اُس طاقچے میں دھرا ہے"۔ اور مہمان جس کی پلکیں نیند سے جھکی جا رہی ہیں آہستہ سے ہمت بڑھانے کو کہہ دیتا ہے، ہاں بہن بملا! کچھ سُنا دو۔ سُنا ہے تم بہت اچھا گاتی ہو، (پھر جلدی سے یہ فقرہ جڑ دیتا ہے) رام بھروسے کی ماں سے سُنا تھا۔

اب یہ سب جھوٹ ہوتا ہے، نہ بیچاری بملا اچھی طرح گا ہی سکتی ہے اور نہ رام بھروسے کی ماں گانا سُن ہی سکتی ہے کیونکہ وہ بیچاری تو بہری ہے، اور پھر "بہن بملا!" لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ہندوستان ہے جہاں عورتوں کی صرف دو قسمیں ہیں، ایک قسم ماں، دوسری بہن، اگر خوبصورت ہو، جوان ہو، تو بہن اور اگر بدصورت، اُدھیڑ یا بوڑھی ہو تو اماں، بس اور تیسری قسم کوئی نہیں، کیونکہ جب عورت کی شادی ہوجائے تو پھر وہ عورت نہیں رہتی، بلکہ پاؤں کی جوتی بن جاتی ہے۔

اب بملا گاتی ہے، باپ حقہ پی رہا ہے، اماں مونڈھے پر بیٹھی اپنے دونوں ہاتھوں کو گود میں لئے لڑکی کی طرف دیکھ رہی ہے کہ کہیں بملا نگاہ اُٹھا کر مہمان کی طرف دیکھ تو نہیں رہی! ...... مدھم باریک آواز میں بملا گا رہی ہے، ہارمونیم الگ اپنے سُروں کو بجا رہا ہے۔

گلا..... ہاں گلا..... کاٹ لو..... گلبدن دھیرے دھیرے

دھیرے دھیرے . . . .

مہمان گانا سُنتے سُنتے تصوّر کی دُنیا میں پہنچ جاتا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ قصاب تیز چھُری گردن پر رکھے بیٹھا ہے اور نیچے بکری ممیا ممیا کر کہتی ہے "گلا . . . . ہاں گلا . . . . کاٹ لو گلبدن! دھیرے . . . . . دھیرے" ایک قصاب کیلئے "گلبدن" کی تشبیہ کتنی نازک اور پیاری ہے، یہ شاعر لوگ بھی عجب دماغ رکھتے ہیں، مہمان ابھی یہاں تک ہی سوچ سکتا ہے کہ بملا دوسرا گانا شروع کر دیتی ہے، اب اک نئی لے ہے، مدھم اور غمگین

تم میرے . . . . . تم میرے . . . . . میں تیری

اُول . . . . . . اُول . . . . اُول

تم میرے . . . . . تم میرے . . . . . میں تیری

اُول . . . . . . اُول . . . . اُول

اور بیچارا مہمان حیران ہو کر سوچتا ہے کہ اس اُول اُول کا کیا مطلب، مگر کچھ سمجھ نہیں سکتا، آخر جرأت کر کے پوچھ لیتا ہے اور . . . . . بہن بملا! اس دوسرے بند کا کیا مطلب؛

اور بہن بملا لجا کر کہتی ہے، جی، مَیں نے فلم میں ایسے ہی سُنا تھا۔

× × ×

متوسّط طبقے سے اُوپر گانا اپنی ہئیت یکسر بدل لیتا ہے، اس کی تمام جزئیات تبدیل ہو جاتی ہیں، ہارمونیم کی جگہ گنبد کی طرح گُونجتا ہُوا ارگن، "یہ میں نے بارہ سو روپے میں خریدا تھا، کچھ اتنا بُرا ابھی تو نہیں" شرمیلی بملا کی جگہ ایک شوخ و شنگ تتلی، رنگین ہونٹ، بے باک نگاہیں، آپ کیا سننا پسند کریں گے؛ بُوڈ بنیوب، یا گریس مُوری کا نغمہ، اچھا؛ آپ مغربی موسیقی کو پسند نہیں کرتے . . . . . مگر سہگل تو کب کا پُرانا ہو چکا . . . . . ارگن پر انگلیاں پھیرتے ہوئے . . . . . اُس دن آپا کماری جو تھیکا رائے کا ایک ریکارڈ لے آئیں، یونہی پسند آ گیا، جیسے ریڈیو پر بھی کبھی کبھی کوئی اچھی چیز آ ہی جاتی ہے، انگلیاں پھیرتے پھیرتے گانا شروع کر دیتی ہیں، اور گانے کے دَوران میں بار بار دیکھتی جاتی ہیں، آپ کی طرف، آپ مُسکرا مُسکرا کر داد دیتے ہیں، اور گانا ختم ہونے پر تالی بجاتے ہیں، "! hmmm "آپ کس سے گانا سیکھتی ہیں؟" "بنّے خاں لکھنوی"، "وہ تو بڑے اُستاد ہیں اپنے فن کے"، "ہاں اڑھائی سَو سے کم نہیں لیتے، پاپا کہتے ہیں گانا سیکھنا ہو تو کسی لکھنوی اُستاد سے سیکھا جائے کیونکہ ناچ بھی وہی سکھاتے ہیں!"

در اصل متوسط درجے سے اُوپر گانا کم اور ناچنا زیادہ ہوتا جاتا ہے۔

× × × × ×

اور پھر گانے کی ایک اور قسم بھی ہے، اس کا نام ہے "کلاسیکل میوزک"۔ . . . .

. . . .

. . . . عجیب شے ہوتی ہے یہ بھی، یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسے ہر کس و ناکس نہیں سمجھ سکتا۔ شاید اسی لئے سوسائٹی کے ہر طبقے میں اسے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، خاصکر وہ گروہ جو اپنے آپ کو ادب اور آرٹ کا ٹھیکیدار سمجھتا ہے۔ کلاسیکل میوزک کے سوا اور کسی شئے کو پسند نہیں کرتا، کوئی "چیز" سنائیے! یہ "چیز" دوسرا نام ہے کلاسیکل میوزک کا۔ "چیز" میں آکر گانا اپنی معراجِ کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص کوئی "چیز" سننے پر اس قدر مصر رہتا ہے۔ ہر شخص یہی کوشش کرتا ہے کہ اپنے آپ کو کلاسیکل میوزک کا ماہر ثابت کرے۔ "اُس دن ہم نے وائی، ایم، سی، اے میں جی، وشوار او جانگٹی کا گانا سُنا کیا دُھرپد الاپا ہے، بھاگ اور سورٹھ جی، مالکونس اور زنگ، واہ، واہ، یا پھر اُس دن لُطف آیا تھا، جو ہم نے پیارو قوال کو نواب صاحب کو دعوت دینے کے موقع پر اپنے ہاں مدعو کیا تھا، واہ، واہ، پٹھے نے کیا کیا تانیں اُڑائی تھیں، کیا کیا "کلیاں" بنائی تھیں۔ بھیم اور جوگ، بھیرویں اور درباری، اور مانڈ . . . . بس مانڈ تو پیارو قوال پر ختم ہے!"

میرا اپنا تجربہ ہے کہ کلاسیکل میوزک کا ماہر بننے کے لئے کچھ زیادہ دقت پیش نہیں آتی۔ آٹھ دس راگ راگنیوں کے نام یاد ہوں، چیز، کلی، تان، کھیرن، پلٹا اور اس قسم کے آٹھ دس فنی نام یاد کر لئے جائیں۔ طبلہ کی تھاپ پر کبھی کبھی سر ہلا دیا جائے، لوگ کہیں دیکھئے، بنّے صاحب بھیم کی گت کیا خوب بجاتے ہیں، آپ کہیں، نہیں صاحب، ہم تو طبلے والے کی تھاپ پر مرے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر مجلس میں لوگ آپ کو کلاسیکل میوزک کا اُستاد سمجھنے لگ جائیں گے، ہر ایک گویا آپ کی طرف ہی بازو ہلا ہلا کر گائے گا "تانی دھا، نی پا ما گا دھا، تانی دھا، تانی دھا!" اور آپ سر ہلا کر کہیں گے بھئی، واہ، واہ، واہ! چیز کس خوبی سے اُٹھائی ہے، بس اب "اُلٹ کلیان" سُنا دو تو رُوح خوش ہو جائے۔

× × × × × × ×

سیانوں سے سُنا تھا کہ گانا رُوح کی غذا ہے، لیکن ان تین قسموں میں کوئی قسم بھی ایسی نہیں جو رُوح کو بالیدگی بخش سکے، یہ سب نام و نمود کے دھندے ہیں، ان تینوں طبقوں کے لوگ گانا سنتے ہیں تا کہ موجودہ تہذیب کے ظاہری لوازم کو پورا کر سکیں، اس کے پس پردہ ڈر ہر وقت موجود رہتا ہے، مبادا کوئی انہیں جاہل، ادب اور آرٹ سے بیگانہ سمجھ لے، اسی لئے تو موٹی توند والا رئیس اور لمبی مونچھوں والا نواب اور باتیں بنانے والا پروفیسر اور سکرٹریٹ کی میز پر سر جھکا کر لکھنے والا کلرک، ہر ایک اپنے آپ کو گانے کا شیدائی جتاتا ہے۔ —— لیکن گانے کی ایک اور قسم بھی ہے، چوتھی، آخری اور سب سے نچلی، یہاں نہ ہارمونیم ہوتا ہے، نہ ستار نہ وائلن نہ ارگن، یہاں نہ کلیاں سنائی جاتی ہیں، نہ پلٹے اُٹھائے جاتے ہیں،

ایک چھوٹی سی ڈھولک ہوتی ہے، اور پچاس ساٹھ مزدور اور اُن کی عورتیں اور لڑکے اور لڑکیاں، اور ننگ دھڑنگ بچے، تالیاں بجاتے، پاؤں ہلاتے "سجریا توری پہ بلہار، سجریا توری" مِلی جُلی آواز میں، موٹی، پتلی، لمبی، کوئی گاتے گاتے کھانسنے لگ جاتا ہے، کوئی گاتے گاتے ہنسنے لگ جاتا ہے، درمیان میں ڈھولک بجتی ہے، کوئی پاؤں میں گھنگرو باندھ کر جھنجھنا رہا ہے تو کوئی کانسی کے کٹورے پر پیسہ رکھ کر بجا رہا ہے، کُھلا سا گندہ صحن ہے، آسمان پر ستارے اُن گھنگروؤں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں، جو کسی مست رقاصہ کے ٹخنوں سے اُتر ادھر اُدھر فرش پر بکھر گئے ہوں، اُن کے درمیان میں چاند ہے، جو کانسی کے کٹورے کی طرح چمک رہا ہے۔ گاتے ہوئے مزدور، چمکتا ہوا چاند، بے ہنگم لیکن پُرمسرت نغمہ، دل کو خوش کرنے والا، دن بھر کی تھکن اُتار دینے والا، سیانوں نے سچ کہا تھا، گانا رُوح کی غذا ہے! —— لیکن کتنی لوگوں کے پاس رُوح نہیں ہوتی، وہ صرف ایک خول رکھتے ہیں +

کرشن چندر

رُباعیات

(۱)

کیوں اپنے کیے پر میں عبث پچھتاؤں
کیوں اب بھی مے و نغمہ سے میں باز آؤں
کیا فائدہ توبہ کا کہ فصلِ گل میں
ممکن ہے میں توبہ سے بھی تنگ آ جاؤں

(۲)

یہ سہما ہوا چاند، یہ سہمے تارے
یہ چاک گھٹاؤں کے حسیں نظارے
یہ صحنِ گلستاں، یہ لبِ جو، یہ سکوت
لعبت بی شمرا! ایسے میں کہاں ہو پیارے

تخت سنگھ

غزل

دریائے عشق میں جو اُترنا پڑا مجھے
ہر موجِ آتشیں سے گزرنا پڑا مجھے

ہر چند کر رہا تھا میں تقدیر کے خلاف
تقدیر دیکھئے وُہی کرنا پڑا مجھے

جنّت کی آرزو کہیں دل میں بسی نہ ہو
کرتے ہوئے گناہ جو ڈرنا پڑا مجھے

آنے لگی تھی اُس کی جبیں پر ذرا شکن
اظہارِ عشق کر کے مُکرنا پڑا مجھے

مے کے بغیر کیف سے خالی تھا نقشِ زیست
یہ رنگ جان بُوجھ کے بھرنا پڑا مجھے

کُھل جائے تاکہ زیست کا اُلجھا ہُوا طلسم
نقشِ وجود بن کے اُبھرنا پڑا مجھے

کشفی کٹھن تھی زیست کی منزل بھی کس قدر
لڑ لڑ کے حادثوں سے گزرنا پڑا مجھے

کشفی مُلتانی

کارڈ بھیجے جائیں اور بہادری (کا تمغہ) مل جائے۔

لیکن میری باتیں صدا بہ صحرا ثابت ہوئیں اور جلسہ دوسرے روز کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔

دوسرے دن پھر ایک مجلس مشاورت منعقد ہوئی جس میں ہر جماعت کے نمائندے موجود تھے۔ بچے کی خالہ صاحبہ نے تجویز پیش کی یوسف بہت مناسب نام رہے گا، بچہ ماشاءاللہ خوبصورت بھی ہے اور عزیز بھی۔

اس کے جواب میں انتہا پسند پارٹی کے لیڈر نے جو فاضلانہ تقریر کی وہ مختصراً یہاں درج کی جاتی ہے:۔

"حاضرین و حاضرات! میں ابتدا ہی میں یہ گوش گزار کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھے اس نام سے کوئی پرخاش نہیں لیکن اس لئے کہیں لوگ غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں، میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اپنے مافی الضمیر کو صاف صاف بیان کر دوں، ان دنوں والدین کو اپنے بچوں کا نام رکھتے وقت اس امر کا ضرور خیال رکھنا چاہئے کہ ان کے نام میں کوئی ایسا عنصر نہ ہو جو ان کے حالات و کوائف پر اثر انداز ہو سکے۔ جب ہم کسی بچے کا نام یوسف رکھتے ہیں تو زلیخا کا تخیل دست بہ دامن ہوتا ہے۔ اب جن والدین کو اپنے لال عزیز ہوں وہ شوق سے ان کا نام یوسف رکھیں۔ میں نے جو بات تھی عرض کر دی تاکہ یہ کہنے کا موقع نہ رہے کہ "ہمیں خبر نہ ہوئی"

اس کے بعد کئی نام پیش کئے گئے جن میں عبدل، شبراتی، کلو وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آخر ایک نوجوان لڑکی نے جو بے حد شوخ و شریر تھی بچے کا نام سنڈ ٹیں ٹیں تجویز کیا کیونکہ یہ ہر وقت ٹیں ٹیں کیا کرتا تھا۔ مختصر یہ کہ کوئی نام بھی پسند نہیں کیا گیا ......

ایک ہفتہ بعد بچے کا عقیقہ ہونا قرار پایا۔ کسی نے ننھے کے ابا سے بچے کا نام دریافت کیا۔ جواب ملا رمضانی۔ ارے یہ رمضانی کہاں سے ٹپک پڑا۔ مجھے بتایا گیا کہ چونکہ بچہ رمضان میں پیدا ہوا تھا اس لئے اس مناسبت سے بچے کا نام رمضانی قرار پایا۔

میں مسکرا کر رہ گیا۔ کچھ دن بعد رمضانی کے والد صاحب سے میں نے پوچھا۔

"رمضانی تو اچھا ہے نا؟"

جواب ملا "بچہ بخیریت ہے"

"ارے یہ کیا، بچہ کیوں، رمضانی کیوں نہیں؟"

ہنس کر کہنے لگے "بھائی صاحب آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ بات یوں ہے کہ یہ نام مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں۔ صرف لوگوں سے پیچھا چھڑانے کے لئے میں نے یہ نام رکھ لیا تھا۔ مجھے تو شجاعت بچے کے لئے مناسب نام معلوم ہوتا ہے۔"

میں نے آہستہ سے کہا "اور شمیم کیوں نہیں"؟ ......

مگر وہ جا چکے تھے۔

سرمد جمالی
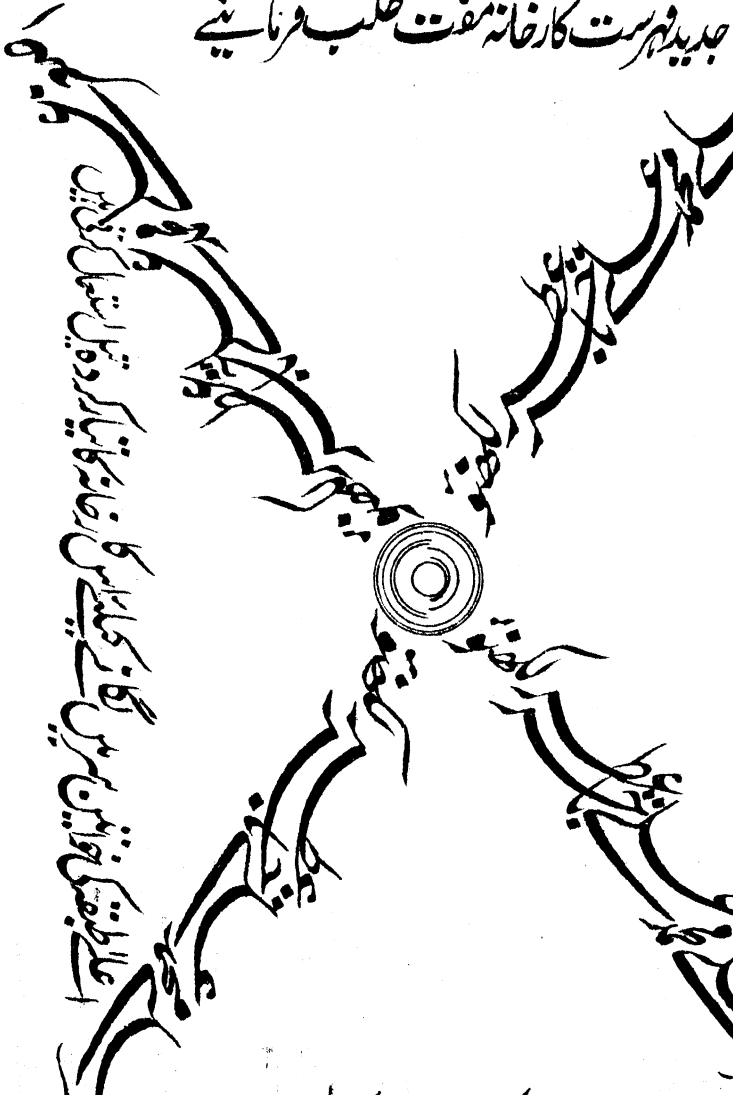
میاں عبداللطیف پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ ہمایوں سے شائع کیا۔

فہرست مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ اگست ۱۹۳۸ء

نمبر (۲)

تصویر :- قبضۂ مخالفانہ

شمار	مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ
۱	بزمِ ہمایوں	بشیر احمد	۵۶۵
۲	جہاں نما	حامد علی خاں	۵۷۰
۳	امیر حمزہ اور عمرو عیار	پروفیسر سید فیاض محمود صاحب ایم-اے	۵۷۳
۴	کامنی (نظم)	حضرتِ ذوقی	۵۸۷
۵	سفینۂ راحل	حضرتِ راحل ہوشیارپوری	۵۹۰
۶	اقبال اور گارڈنر	جناب سید ظفر احمد صاحب کوکب	۵۹۱
۷	اے ندی (نظم)	جناب تاجور سامری	۵۹۳
۸	خبرے رفت زگردوں بہ شبستانِ ازل (نظم)	جناب عطاء اللہ صاحب سجاد بی-اے	۵۹۴
۹	سات بہنیں (افسانہ)	جناب محمد سراج صاحب منشی فاضل	۵۹۵
۱۰	مکتب کے دن (افسانہ)	جناب عبدالکریم صاحب بی-اے مرادپوری	۵۹۶
۱۱	ریل کا راگ (نظم)	سید حمید صاحب کاظمی بی-اے علیگ	۶۰۴
۱۲	سر اقبال دے نال سیل	حامد علی خاں	۶۰۵
۱۳	کیلاش کنول (تراجم از پیامِ مشرق)	حضرتِ مقبول احمدپوری	۶۰۹
۱۴	ہار (افسانہ)	جناب ہمنوا حیدرآبادی	۶۱۰
۱۵	آہ وہ برساتیں	جناب پروفیسر صادق الخیری صاحب ایم-اے	۶۱۳
۱۶	غزل	جناب سید ضمیر صاحب جعفری	۶۱۷
۱۷	اختلاج کے لمحے (نظم)	حضرتِ جلال ملیح آبادی	۶۱۸
۱۸	انقلابِ ایران کا ایک شاعر	جناب ملک عطاء اللہ صاحب کلیم ایم-اے	۶۱۹
۱۹	رفتارِ زمانہ (نظم)	حضرتِ وقار انبالوی	۶۲۴
۲۰	ایمانِ محکم (نظم)	جناب محترمہ زیب عثمانیہ صاحبہ	۶۲۶
۲۱	مسافر (〃)	حضرتِ مجاز بی-اے علیگ	۶۲۶
۲۲	محفلِ ادب		۶۲۷
۲۳	مطبوعات		۶۳۴

چندہ سالانہ ؎ — ششماہی ؎ مع محصول — قیمت فی پرچہ ۸؍

بزمِ ہمایوں

"ہندو مسلم اتحاد کا انحصار محض اُردو کی بقا پر ہے !"

یہ ہے سرتیج بہادر سپرو کا مشہور قول - ایک انصاف پسند صاحبِ نظر ہندوستانی کی زبان سے ہمیں ایسی ہی دل ملانے والی باتیں سننے کی اُمید ہے - یہ ہیں وہ لوگ جو اس فرقہ وار جھگڑوں کے تاریک زمانے میں اپنی مشعل بلند رکھتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ سچائی کا تقاضا یہی ہے -

سرتیج بہادر نے انجمن بہارِ ادب لکھنؤ کے جلسے میں اَور بھی بڑے پتے کی باتیں کہیں کہ "اُردو دراصل ہندو اور مسلمانوں دونوں کے اسلاف کی بنائی ہوئی زبان ہے اُردو زبان کا بڑا کام یہ رہا ہے کہ ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے کی تہذیب و تمدن کے سمجھنے اور اختیار کرنے میں سہولت ہو تاکہ باہمی یک جہتی اور ہم آہنگی قائم ہو سکے"

یہ تو ہے بقول مولوی عبدالحق صاحب کے ایک "حقیقت شناس" کا قول - اب اس کے مقابلے میں بعض اور بڑے بڑے آدمیوں کے عمل دیکھئے - کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ وہ کانگرس جسے ملک کی واحد سیاسی انجمن ہونے کا دعویٰ ہے وہ کانگرس جس نے واقعی اس بدبخت ملک کے لئے آزادی کے بارے میں سب سے زیادہ مفید کام کیا ہے وہ کانگرس جو اپنے کراچی کے اور بعد کے ریزولیوشنوں میں ہندوستانی کو ملکی زبان تسلیم کر چکی ہے جو اُردو اور ہندی کے بارے میں انصاف کی تراز و تھامے رکھنے کی مدعی ہے جو اُردو اور ناگری دونوں خطوں کے متعلق غیر جانبداری کا اعلان کر چکی ہے دونوں کو قومی خط بھی تسلیم کر چکی ہے دیکھئے اُسی قومی اور قوم پرست اور قومیت پرور کانگرس کا قول کیا ہے اور عمل کیا ہے ؛ مولانا ابوالکلام آزاد مسٹر جناح کی فرقہ پرستی پر قومیت کے تیر برساتے ہوئے اُن کی اس شکایت کو کہ کانگرس ہندی کا پروپیگنڈا کر رہی ہے جہالت کا اظہار پکارتے ہیں لیکن مولانا کا تجاہلِ عارفانہ ملاحظہ ہو کہ محض کانگرسی قراردادوں کا پلیند اسنبھالے واقعات کی طرف سے آنکھیں بند کئے اُردو کی حمایت کرنے والوں کو بُرا بھلا کہے جاتے ہیں - اِسے کہتے ہیں **جماعت بندی !**

قراردادوں اور اعلانوں کا بلند آواز سے شکریہ ادا کرنے کے بعد آیئے ہم دیکھیں کہ غریب اُردو پر ان قوم پرستوں کے ہاتھوں کیا گزر رہی ہے ؛ اور چونکہ ممکن ہے کہ ہمیں فرقہ پرست اور کوتاہ بیں سمجھا جائے - اس لئے بہتر ہے کہ ہم بعض انصاف پسند قوم پرستوں ہی کے قدموں میں جا بیٹھیں اور اُن کی زبانی سُنیں کہ وہ کیا فرماتے ہیں ؛

اِس وقت اُردو کے تین مؤقر رسالے میرے سامنے پڑے ہیں ۔ "اُردو" بابت اپریل ۱۹۳۸ء جس کے محترم ایڈیٹر کو سب اصحاب

متفقہ طور پر ایک غیر سیاسی انصاف پسند خادمِ زبان جانتے ہیں۔ "ایشیا" بابت جنوری فروری مارچ ۳۸ء جس کے دلکش شخصیت رکھنے والے مدیر کو کانگرس سے محبت اور بھارت ماتا سے سچا عشق ہے۔ "نگار" بابت جون ۳۸ء جس کے فاضل مدیر ہمیشہ سے مسلم لیگ کے مخالفین کے حلقے میں شریک رہے ہیں۔ ذرا سنیئے یہ تینوں فاضل ادیب جنہیں اسلامی فرقہ پرستی سے ذرا واسطہ بھی نہیں کانگرسی انصاف پسندی کی کیسی تصویر کھینچتے ہیں۔ ذیل میں مدیر اُردو نے بمبئی میں کانگرسی وزیرِ اعظم کی توجہ حکومت کے اس اعلان کی طرف منعطف کرائی کہ بمبئی میں ہندی کی اشاعت و ترقی کے لئے ایک رقم مخصوص کردی گئی ہے۔ جواب ملا کہ ہم سے غلطی ہوئی ہماری مُراد ہندوستانی تھی۔ اس پر مولوی عبدالحق صاحب نے فرمایا کہ یہ کیا بات ہے کہ یہ غلطی اکثر کانگرسی حکومتوں اور اُن کے وزرا سے ہوتی ہے۔ اور افسوس ہے کہ مجھے کانگرس کی حکومتوں اور کانگرس کے وزراء کو یہ بتانا پڑتا ہے۔ اُنہوں نے وعدہ کیا کہ اس کی اصلاح کردی جائے گی اور جو آپ کا منشا ہے وہ مجھے لکھ دیجئے تاکہ اس پر عمل درآمد کیا جائے"۔ لیکن مولوی صاحب کی "حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی"۔ جب انہوں نے بعد میں ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۱۱ر اپریل ۳۸ء میں انہیں وزیر صاحب کی تقریر پڑھی کہ "سب نے اس بات کو تسلیم کرلیا ہے کہ مشترک زبان ہندی ہونی چاہئے"۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں" یا تو یہ لوگ ہندی ہندوستانی کا فرق نہیں سمجھتے یا کسی نہ کسی طرح سے ہندی کو سامنے لانا چاہتے ہیں۔ اوّل ہندی کہتے ہیں جب اعتراض ہوتا ہے تو ہندی یا ہندوستانی لکھ کر خاموش کردیتے ہیں"۔

"بہت دنوں کے غور کے بعد" ایک" راز کھلا اور وہ یہ ہے کہ کانگرس سے بھی بالا اور اعلیٰ ایک ہستی ہے جس کے ایک اشارے ایک لفظ کے سامنے کانگرس کے تمام ریزولیوشن اس کا دستور اور اُس کے ضوابط اور قواعد سب ہیچ ہیں۔ گاندھی جی نے چونکہ ملک بھر میں ہندی کی اشاعت کا بیڑا اُٹھایا ہے اس لئے کانگرس کا ہر وزیر اور ہر رُکن وہی کہتا ہے جو "مہاتما جی" کہتے ہیں۔ جو نیت امام کی وہی ان کی"۔ "اور لطف یہ ہے کہ گاندھی جی سیاسیات سے بالکل کنارہ کش ہوگئے ہیں اس لئے اُن سے کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ آپ کانگرس کے رزولیوشن کی کیوں پابندی نہیں کرتے۔ باوجود اس کے کانگرس اُن کی اُنگلیوں پر ناچتی ہے۔ اور پھر "لُطف یہ ہے کہ ہندوستانی کا رزولیوشن جو کانگرس نے منظور کیا وہ حضرت (گاندھی جی) ہی کا لکھا ہوا ہے۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ کانگرس والے تو اُن کے منشا اور نیت کو دیکھتے ہیں۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ انڈین نیشنل کانگرس کا نام بدل کر گاندھی کانگرس رکھ دیا جائے کہیں تو قول و فعل میں مطابقت ہو۔ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی گاندھی جی مسٹر جناح سے بات چیت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اس پر میر صاحب کا یہ مصرع یاد آتا ہے

" دریا کا پھیر پایئے تیرا نہ پایئے "

"کانگرسی حکومتوں کے اکثر وزیر محض ایک بڑے شخص کی تقلید میں اندھوں کی طرح کام کررہے ہیں"۔ "گاندھی جی کیا جانیں کہ ہندوستانی تہذیب کا ہندوستانی زبان سے کیا تعلق ہے۔ ہندوستانی زبان سے غفلت کرنا ہندوستانی تہذیب کا برباد کرنا اور ہندو مسلم اتحاد کی جڑ کاٹنی ہے"۔

"طرفہ بات یہ ہے کہ جناب سوباش چندر بوس نے انڈین نیشنل کانگرس میں جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا وہ ایسی مشکل ہندی میں تھا کہ

خود بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے تھے اور ایک شخص پیچھے بیٹھا ہوا برابر لقمہ دیتا جارہا تھا۔ شاید اسی لئے لوگ کہتے ہیں کہ کانگرس والوں کے قول اور فعل میں بڑا ابل ہے۔" یہیں ۲۰ فروری کو کانگرس ہی کے پنڈال میں راشٹر بھاشا (قومی زبان) کا اجلاس ہوا۔ یہ راشٹر بھاشا خدا کے فضل سے ہندی تھی!

ایشیا کے مدیر کانگرس کی جی کھول کر تعریف کرنے کے بعد فرماتے ہیں:۔

"کانگرس زبان کے مسئلہ کے متعلق بارہا اپنا فیصلہ بیان کر چکی ہے اور جب ضرورت ہوتی ہے اس کا اعادہ بھی کرتی رہتی ہے لیکن کانگرس کے تمام لیڈر جن میں گاندھی جی بھی شریک ہیں ناگری رسم الخط اور خالصاً ہندی زبان کے مؤید ہیں۔" اس حیثیت سے کہ صدر کانگرس جملہ اقوام ہند کی محبوب ترین متاع ہیں مسلمان یہ دریافت کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ ہری پور کانگرس میں جس زبان میں انہوں نے اپنا خطبۂ صدارت فرمایا کیا اس زبان کو ہندوستانی کہا جاسکتا ہے؟" "اس کے معنی کیا ہیں؟ کہ آپ رزولیوشنوں قرار دادوں اور اجلاسوں میں بلند بانگ دعوے کرتے ہیں اور آپ کا عمل سرتاسر آپ کے قول کے خلاف ہوتا ہے۔ کرتے آپ ہیں اور بھرنی ہم کو پڑتی ہے یعنی آپ کا طرزِ عمل اُن لوگوں کو مخالفین کے سامنے سرنگوں کر دیتا ہے جو آپ کے ساتھی اور ہندوستان کے فطرۃً دیوانے ہیں۔" "متحدہ قومیت کے بلند اور ارفع تصور کی پیداوار وہ زبان ہے جس کو اُردو (یا ہندوستانی) کہتے ہیں۔ یہ زبان ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کے میل جول اور ربط و اتحاد سے بنی۔ مسلمان قوم کی ہند پرستی کا اندازہ اس تاریخی حقیقت سے ہوسکتا ہے کہ مُسلم بادشاہوں نے فارسی و ترکی کو اس زبان کی خاطر ترک کر دیا جو ہندوستان کی خالص پیداوار تھی اس لئے اس کو بجا طور پر قومیتِ متحدہ کی قومی زبان کے نام سے پُکارا جاتا ہے۔"

"گاندھی جی اور اُن کے خاص متبعین جو کانگرس کے ہائی کمانڈ سے تعلق رکھتے ہیں کُلّی طور پر یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ تمام ہندوستان کی زبانوں اور رسم الخطوں کو دفن کر دیا جائے اور ناگری رسم الخط کو جاری کیا جائے اور اگر یہ خیال غلط ہے تو کوئی ہمیں بتائے کہ ہم مسلم لیگ کے سامنے اس حقیقت کی کیا تاویل کریں کہ ہری پورہ کانگرس کے پنڈال میں "آل انڈیا ہندی سمیلن" منعقد ہوتا ہے اور ہندوستان کی واحد سیاسی نمائندہ انجمن کا خطبۂ صدارت ٹنڈن صاحب کی اُس زبان میں پڑھا جاتا ہے جس کو وہ خود ہی سمجھتے ہیں جو مسلمان ہری پورہ کانگرس میں شریک ہوئے اُن کا بیان ہے کہ خطبۂ صدارت کا ایک لفظ بھی وہ نہیں سمجھ سکے۔ کیا راشٹریہ بھاشا کا یہی تصور ہے جس کی بنا پر آپ ایک زبان پیدا اور وضع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟"

"ایک طرف اس کی کوشش ہوتی ہے کہ "مسلم ماس کانٹیکٹ کمیٹی" بنائے اور دوسری سمت وہ ایسا طرزِ عمل اختیار کرتی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کانگرس ناگفتنی مشکل میں تبدیل ہوتی جارہی ہے!؟" "کانگرس کے لئے یہ طرزِ عمل نازیبا و ناروا ہی نہیں خطرناک ہے۔"

"اس کا واحد حل یہ ہے کہ جب ۱۹۳۹ء کے اجلاس کانگرس میں صدر اس عجیب و غریب زبان میں خطبہ ارشاد فرمائے تو ایک لمحے

سے ۵۰ ہزار مسلمان کھڑے ہو کر اس سے صاف کہہ دیں کہ ہم نہیں سمجھتے۔ اگر ہم کو سمجھانا چاہتے ہو تو ہندوستانی زبان میں ہم کو مخاطب کرو"۔

خدا کرے میرے عزیز دوست ساغرؔ صاحب کا یہ واحد "حل" کارگر ثابت ہو اور اُن کا پچاس ہزار کا اُردو لشکر اپنی یلغار میں پوری طرح کامیاب و ظفرمند ہو جائے (آمین)۔

جناب مدیر نگار فرماتے ہیں :۔

"میں کانگرسی خیال کا آدمی ہوں" "یہاں تک کہ میں نے مُسلم لیگ کے وجود کو ہمیشہ بے کار سمجھا" "جس وقت کانگرس کی طرف سے "پورنا سوراج" کا اعلان ہوا تو میں نے غور کیا کہ کیا واقعی وہ مذہب و دولت کی دُنیا سے علیحدہ صرف "انسانیت" کے اصُول پر عمل کرے گی لیکن قبل اس کے کہ میں کسی نتیجے پر پہنچتا خود کانگرس ہی کے طرزِ عمل نے بتا دیا کہ اتنی بلند چیز سے اس کو نسبت دینا درست نہیں"۔

"اگر ہم کو گاندھی جی کی ذہنیت کا اندازہ ہو جائے تو کانگرس کا اصُولِ کار آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے" "لفظ پورنا کی جو عملی صورت گاندھی جی کے ذہن میں ہے وہ یا تو اتنی ناقص ہے کہ ہم اس کا ترجمہ کامل کر ہی نہیں سکتے یا پھر وہ اتنی انتہا پسند ہے جسے ہم صرف عصبیت کہہ سکتے ہیں یا زیادہ واضح الفاظ میں "ہندو راج"" "الغرض گاندھی جی کا ضمیر کیسا ہی پاک و صاف ہو لیکن جو راہ اُنہوں نے کانگرس کے لئے متعین کی ہے اس میں ضرور ایسی آلودگیاں نظر آتی ہیں جو ایک بلند تخیل کی ڈیماکریسی کے لئے ناقابلِ برداشت ہیں" "گاندھی جی کے ڈپلومیٹ ہونے میں شک نہیں۔ اُن کے عزائم میں ایک شیر کا سا ولولہ نہیں ہے بلکہ گھات میں لگے رہنے کا سا انداز ہے" "گاندھی جی کی ڈکٹیٹر شپ نے کانگرس کی طرف سے مُلک کے بعض طبقوں کو بدظن کر دیا ہے اور وہ کانگرسی حکومت میں وہ صاف باطنی نہیں پاتے جو مختلف الخیال جماعتوں میں اعتماد پیدا کر کے مرکزیت پیدا کر دیتی ہے" "حقیقت یہ ہے کہ ہندو جماعت جس کا ذہن آزادئ کامل کے تصور سے بالکل خالی ہے اس (استعماراتی آزادی) سے زیادہ کی تمنا کر بھی نہیں سکتی"۔

"دُنیا کی اور چیزوں کی طرح حکومت کے بھی دو پہلو ہوا کرتے ہیں۔ داخلی و خارجی۔ خارجی پہلو کے متعلق تو خیر کچھ کہنا ہی فضول ہے کیونکہ صفائی و پاکیزگی کا جو مفہوم ہندو قوم نے متعین کیا ہے وہ بالکل علیحدہ ہے اور اس لئے اگر ہمیں کانگرسی حکومت کے دفاتر میں ظاہری بدترتیبی گندگی اور بھونڈا پن نظر آتا ہے تو حیرت نہ کرنا چاہئے لیکن افسوس تو یہ ہے کہ اس کا داخلی پہلو بھی قابلِ تعریف نہیں اور یہی وہ چیز ہے جو ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتی ہے کہ ہندوؤں کا واقعی منشا کیا ہے اور گاندھی جی کی رہنمائی میں کونسی ذہنیت نشو و نما پا رہی ہے"۔

یہ سب نیازؔ صاحب کے ارشادات ہیں۔ پھر وہ لکھتے ہیں :۔

"یقیناً کانگرسی حکومت نے کبھی سرکاری طور پر اس کا اعلان نہیں کیا کہ وہ دوسری قوموں کے مقابلے میں ہندوؤں کا ساتھ دے گی لیکن اُس کے عمل سے یہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔" "اُن کی پیدا کی ہوئی ذہنیت مسلمانوں کے ساتھ اتحاد کے بجائے اور زیادہ افتراق کی صورتیں پیدا کرتی چلی جا رہی ہے۔ یہ ہم اس سے پہلے بھی کئی بار لکھ چکے ہیں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت ہندوؤں سے بالکل مختلف ہے اور ہندوؤں نے اگر اُن کی خصوصیاتِ قومی کو ملحوظ نہ رکھا تو اتحاد ناممکن ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ زبان کا ہے لیکن بدقسمتی سے اُس کو بہت معمولی سمجھا جاتا ہے۔"

"آل انڈیا کانگرس کمیٹی اعلان کرتی ہے کہ وہ ایک مشترک زبان "ہندوستانی" کے نام سے رائج کرنا چاہتی ہے جو اُردو اور ہندی رسم خط دونوں میں لکھی جائے لیکن کانگرسی حکومتوں کو جو مطلب اس کا بتایا جاتا ہے وہ کچھ اور ہے۔ چنانچہ ہمارے صوبے (یو۔پی) کی حکومت کا طرزِ عمل ملاحظہ ہو۔ کیا مشترک زبان پیدا کرنے کی یہی صورت ہوا کرتی ہے؟" "ہمارے صوبے کی کانگرسی حکومت نے ہندستانی زبان کا معیار یہ قرار دیا ہے کہ ہر وہ لفظ جو فارسی یا عربی الاصل ہے خارج کر دینے کے قابل ہے۔ خواہ وہ کتنا ہی عام فہم کیوں نہ ہو۔" (اس کے بعد بعض کانگرسیوں کے ایجاد کردہ ترجمے لکھے گئے ہیں مثلاً Applicable کا ترجمہ نافذ کی بجائے لاگو صوبہ متحدہ کی جگہ جُٹ صوبہ۔ Supplementary question کا ترجمہ دُم سوال) جناب مُدیر لکھتے ہیں "جل جلالہ۔ بوجھیں لال بجھکڑ! اور نہ بوجھے کوئے۔" پھر فرماتے ہیں: "میں نے بہت غور کیا کہ ایسا کیوں ہے اور ہندوؤں کی ذہنیتوں میں یہ تغیر کیوں ہوا تو اس کا سبب سوائے اس کے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ مسلمانوں سے بالکل علیحدہ ہو کر اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں اور ہندوستان میں اسی کو زندہ رہنے کا مستحق سمجھتے ہیں جو گایتری کا جاپ کر سکتا ہے اور گائے کی پوجا —— ہندو مہا سبھا اور اس جماعت میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ وہ علی الاعلان مسلمانوں کی مخالف ہے اور یہ گھات سے کام لے رہی ہے۔" اخیر میں مدیر نگار رقمطراز ہیں کہ "ضرورت ہے کہ اجتماعی حیثیت سے (کانگرس میں) جوق در جوق شرکت کی جائے اور کانگرسی وزارتوں کے اس طرزِ عمل پر جو مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہو نکتہ چینی کی جائے اور اُن کے خلاف نہایت وسیع محاذِ جنگ تیار کیا جائے!"

خدا کرے کانگرس کے ہائی کمانڈ والے اس "نہایت وسیع محاذِ جنگ" کی تیاری کا حال سُن کر خالص ہندوستانی کے "راشٹر بھاشا" ہو جانے کا فوراً اعلان کر دیں!

بشیر احمد

جہاں نما

گیتا کا پیغام

ہندوؤں کے نزدیک زندگی کے تصور میں دھرم کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا یہ کافی ثبوت ہے کہ ہندو قدیم زمانے ہی سے ویدوں کے بیشتر حصے کو دھرم ہی کی تفسیر و تشریح سمجھتے رہے ہیں۔ دھرم کی اہمیت ہمیشہ مسلّم رہی ہے البتہ اس کی غرض وغایت کے متعلق خاصا اختلاف رہ چکا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ انسان کے معاشری اور ہر قسم کے اجتماعی مفاد پر دھرم کا اثر کچھ ہی کیوں نہ ہو در اصل اس کا مقصد محض کسی نہ کسی قسم کے ذاتی فائدے کا حصول ہے۔ خواہ یہ ذاتی فائدہ اس دُنیا کے متعلق ہو یا دوسری دُنیا کے متعلق۔ بعض اور لوگوں کا خیال تھا کہ دھرم کا یہ تصوّر اُس کے مرتبے کو پست کر دیتا ہے اور اس کی حیثیت محض ایک وسیلے کی سی رہ جاتی ہے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ دھرم اپنا مقصد آپ ہے۔ یہ بجائے خود سراسر بھلائی ہے اور ایسی بھلائی ہے جسے خود اسی کے لئے، نہ کسی اُور مقصد کے لئے حاصل کرنا چاہیئے۔ ہندوؤں کے فلسفے کی کتابوں میں اس بات کے بہت سے ثبوت ملتے ہیں کہ ایک زمانے میں ان دونوں نظریّوں کا کافی زور تھا لیکن اب بہت عرصے سے ویدانت کے نظریّے نے ان کی جگہ لے لی ہے اور یہی نظریہ اب عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے مطابق اُوپر کے دونوں نظریّوں میں سے کوئی بھی پورا پورا درست نہیں۔ ویدانتی خیال کے مطابق یہ بات درست نہیں کہ دھرم بجائے خود کوئی مقصد ہے کیونکہ جس قسم کی جدو جہد کی ترغیب یہ دیتا ہے وہ کسی خاص معیّن مقصد کے بغیر جاری نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ اوپر کے دو نظریّوں میں سے پہلے نظریّے کی طرح یہ نظریّہ بھی اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ دھرم ایک وسیلہ ہے لیکن اس کے خلاف یہ اس بات کی تردید کرتا ہے کہ اس کا آخری مقصد کوئی اُس قسم کا شخصی مفاد ہے جو اوپر مذکور ہو چکا ہے۔ یہ درست ہے کہ دھرم کا کام ایک وسیلے کا سا ہے لیکن جو مقصد یہ وسیلہ حاصل کرتا ہے وہ فطری خواہشات کی تسکین نہیں۔ ان خواہشات کی تو اصلیّت ہی ایسی ہے کہ وہ کبھی پوری اچھی قطعی تسکین نہیں پا سکتیں۔ دھرم کا مقصد یہ ہے کہ ان خواہشات پر انسان پورا پورا غلبہ پالے۔ کیونکہ اسی طرح انسان اپنی اکملیت کو پہنچ سکتا ہے۔ اصطلاحی الفاظ میں یہ بات یوں بیان ہو سکتی ہے کہ دھرم پر پورا پورا عمل کرنے سے انسان "ستو اسدھی" یعنی صفائے قلب حاصل کر سکتا ہے۔ اور اس طرح "موکشا" یا خود شناسی کے مرتبے کو پہنچ سکتا ہے یہ گیتا کی مشہور تعلیم ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلیم محض "فرض برائے فرض" کے عقیدے سے بہت زیادہ ہے۔

بعض لوگ اس خیال کو دوسری طرح پیش کرنا پسند کرتے ہیں کیونکہ وہ گیتا کے خدا پرستانہ پہلو پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس نظریّے کا مطلب یہ نہیں کہ انسان آخر کار "موکشا" کے قابل بننے کے لئے فرض کو بے غرضانہ طور پر ادا کرتا ہے بلکہ

یہ ہے کہ وہ تمام دھرم (سروادھرمان) کو چھوڑ کر اب اور اسی دُنیا میں خدائی زندگی کی پیروی اختیار کرے۔ اور اس طرح خدا کی ذات میں پناہ حاصل کرلے۔ مسٹر آروبندو گھوش کا عقیدہ بھی یہی تھا اور اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ سری کرشن ایک سے زیادہ مرتبہ ارجن کو جس قسم کی زندگی بسر کرنے کی ترغیب دیتے ہیں، وہ ویسی ہی زندگی ہے جیسی خود کرشن گزار رہے تھے۔

بُدھ کی اخلاقیات

سر ایس رادھا کرشنن جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں مشرقی مذاہب کے پروفیسر ہیں لکھتے ہیں کہ بلند نظرانہ شائستگی [illegible] توہمات کی یکجائی سے اتنی گرد و پیدا ہوگئی ہے کہ بعض عام مذہبی مبلغ بہت سی خارج از قیاس اور بعض اوقات ملحدانہ تعلیمات کی تبلیغ کرتے پھرتے ہیں۔ یہی حال بُدھ کے زمانے میں ہوگیا تھا۔

بدھ دراصل تمام اُن آزاد اور باریک بین دماغ رکھنے والوں سے مخاطب ہوا تھا جو نہ صرف مذہبی معاملات میں متخاصم آراء سے گھبرائے ہوئے تھے بلکہ یہ محسوس کرتے تھے کہ اُن کو مذہب کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان لوگوں کے لئے خدا کی حقیقت ایک لفظ سے اور مذہب کی حقیقت ایک قدیم غلطی سے زیادہ نہ تھی۔ بدھ نے اس قسم کے لوگوں کی ہدایت کے لئے ان کے سامنے اصولِ اخلاق کو اِن کی حیثیت مطلقہ میں پیش کیا۔ اُس نے کہا کہ ہم ضبطِ نفس، ہمدردی اور محبت کی زندگی بسر کرنے سے اپنی ہستی میں ایک ایسی تبدیلی پیدا کرسکتے ہیں جو ہمیں انسانی معراج تک پہنچا سکتی ہے۔ یہ راستہ مرد عورت امیر غریب سب کے لئے کھُلا ہے۔

پروفیسر صاحب نے بتایا کہ اخلاقیات کا اعتلا بدھ کی تعلیم کی کُنجی ہے اور یہ حقیقت اس کی زندگی اور خیالات میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ وہ زیادہ نفس پرستی کو ادنے اہمیت اور زیادہ نفس کشی کو دیوانگی اور وہم پرستی سمجھتا ہے۔

اس نے اپنے پیروؤں کو حد سے زیادہ نفس کشی سے روکتے ہوئے اعتدال کا راستہ دکھایا ہے۔

بُدھ کائنات اور اُس کی غرض وغایت کے متعلق فلسفیانہ غور وفکر کرنے سے منع کرتا ہے۔ کیونکہ نجات کا جو طریقہ اُس نے بتایا ہے اُس سے اِن باتوں کا کوئی تعلق نہیں۔

دُنیا اور رُوح کے متعلق بُدھ نے جو حقائق پیش کئے ہیں ان کی محرک بھی محض یہی بات ہے کہ بدھ کو اخلاقیات سے بے حد دلچسپی تھی۔

سکھ مذہب کی نشوونما

پروفیسر تیجا سنگھ نے سکھ مذہب کے متعلق ایک مضمون لکھتے ہوئے بیان کیا ہے کہ اس مذہب کی بنیاد رکھنے والے گرو جنہوں

کے اقتدار، بت پرستی اور شرک سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اُنہوں نے کسی قومیت کی بنیاد نہیں رکھی تھی بلکہ بعض مختلف الرائے مذہبی فرقوں کو نشوونما دی تھی جو اُن کے مرنے کے بعد بھی اپنی حالت پر قائم رہے۔

اصلاح کے صحیح طریقوں کے استعمال کی سعادت گرونانک کے لئے مقدر ہو چکی تھی اور گرونانک ہی نے گرو گوبند سنگھ کے لئے راستہ صاف کر دیا تھا چنانچہ اُنہوں نے گرونانک کی قائم کردہ بنیادوں پر ایک نئی ملت کی تشکیل کی اور مذہبی سیاسی اور نسلی مساوات کے اصول کو عملی صورت میں پیش کیا۔ دس بڑے گروؤں میں سب سے پہلے گرونانک (۱۴۶۹ء سے ۱۵۳۹ء) نے خدا کی وحدانیت کا اعلان کر کے اپنے مذہب کی بنیاد رکھی۔ اُنہوں نے مذہبی ضروریات کے لئے مقامی زبان کا استعمال کر کے لوگوں میں قومیت کا جذبہ پیدا کر دیا اور چونکہ یہ لوگ اکٹھے ہو کر ایک ہی قسم کے مذہبی گیت گاتے تھے، اس لئے مقصد او رخیال کی یکجہتی سے یہ جذبہ اور بھی قوی ہو گیا۔ گرونانک جہاں جاتے تھے وہاں اپنے چیلوں کی "سنگتیں" قائم کر دیتے تھے۔ یہ سنگتیں ادھر چیلوں کو آپس میں متحد کر دیتی تھیں اور اُدھر اس نظام کے مرکز کے طور پر گردو سے بھی لوگوں کا تعلق استوار ہو جاتا تھا۔

اس کے بعد گرو انگد نے برہمنوں سے پوری طرح نجات حاصل کرنے کے لئے ایک نیا رسم الخط اختیار کر لیا۔ گرو امرداس نے سنگتوں کے بہتر انتظام کے لئے انہیں چھوٹے چھوٹے دائروں میں تقسیم کر دیا۔ گرو رام داس نے امرت سر کو مرکز بنایا اور ہر طرف مُسَنَد (مبلغ) بھیج کر جماعت کو مضبوط بنایا۔ گرو ارجن نے امرتسر میں دربار صاحب تعمیر کرایا اور اُس میں اپنا مُرتبہ گرنتھ صاحب رکھا۔ مذہبی حیثیت سے یہی گرنتھ مستند سمجھا جاتا ہے۔ اس گرنتھ صاحب میں گرو ارجن اور اُن کے پیشروؤں کی تحریروں کے علاوہ بعض ہندو اور مسلمان بزرگوں کی تحریریں بھی جمع کی گئی ہیں۔ یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ ان بزرگوں میں سے بیشتر اچھوت تھے۔

اسلام

اسلام ایک معاشری نظام ہے جس کے قوانین انسان کی فطری زندگی سے بالکل ہم آہنگ ہیں۔ ان قوانین میں ہر موقع اور محل پر کام دینے کے لئے کافی وسعت اور لچک ہے۔ اسلام کا معجزہ یہ ہے کہ یہ وسعت اور لچک اسلام کو باوجود اس قدر ہمہ گیر ہونے کے انسانی فطرت کی اُن بنیادی صداقتوں کی حد سے کسی طرح باہر نہیں جانے دیتی جو قرآن مجید پیش کر چکا ہے۔ زندگی کے متعلق اسلام کی نظر ارتقائی ہے اور وہ معاشرہ کی پیہم تغیر پذیر ہیئتوں کو تسلیم کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ انسانی فطرت کے اُن قوانین کی سختی سے پابندی کرتا ہے جنہیں فطرتِ انسانی مسلّمہ طور پر غیر متبدل ثابت کر چکی ہے۔ اسی وجہ سے اسلام کے معاشری، سیاسی اور اقتصادی قوانین اس طرح ڈھالے گئے ہیں کہ وہ انسانی فطرت سے کسی طرح متصادم نہ ہوں۔ انسانی فطرت کی عالمگیری اور ناتغیر پذیری تو بہرحال مسلّم ہے ہی۔

دوسرے قوانین کے علاوہ اسلام نے تقسیمِ دولت اور تقسیمِ جائداد کے متعلق بھی نہایت واضح اور کھلے ہوئے قوانین بنا دیئے ہیں اور یہ قوانین ایک نہایت معتدل اور قابلِ عمل اشتراکیت کی اولین اور قطعی بنیاد قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ یہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کہ ان قوانین کے نفاذ اور جبر و ناانصافی کی روک تھام کے لئے اسلام ایک طاقتور مذہبی حکومت کے قیام پر بہت زور دیتا ہے۔ وصلی اللہ علیٰ [illegible]

حامد علی خاں

امیر حمزہ اور عمرو عیّار

داستانہائے اردو کے یہ جلیل القدر کردار اس دفترِ بے کراں سے تعلق رکھتے ہیں جسے داستانِ امیر حمزہ کہا جاتا ہے۔ یہ داستان ایک مصنّف کی شرمندۂ قلم نہیں۔ اور نہ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ پہلے پہل یہ کب لکھی گئی۔ سب سے پرانا نسخہ جو میں نے دیکھا ہے وہ ایک قسم کا خلاصہ ہے اور وہ ۱۸۵۵ء میں کلکتہ میں طبع ہوا۔ اور شاہزادہ فتح حیدر خلف اکبر سلطان ٹیپو شہید کے داماد نواب میرزا امان علی خاں لکھنوی نے فارسی زبان سے اس کا ترجمہ کیا۔ نواب امان علی خان تمہیداً لکھتے ہیں کہ اس داستان کی بنیاد سلطان محمود غزنوی کے وقت سے ہے اور وجہ اس کی تصنیف کی یہ بیان کرتے ہیں کہ اس سے ہر طرح کی خلقت کا طریق معلوم ہوتا ہے اور قلعہ ستانی اور ملک گیری کا خیال دل میں آتا ہے۔ اس لئے بادشاہ مذکور ہمیشہ اسے شوق سے سنا کرتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اصل فارسی میں یہ داستانیں خواہ کس مطلب کے لئے لکھی گئی ہوں، اردو میں انہیں لکھنے کے محرک لکھنؤ اور اس کے اطراف کے روسا اور امرا کی بیکاری اور انیسویں صدی کا رواج داستان گوئی ہے۔ چنانچہ تین نامور داستان گویوں کے نام اس طویل حکایت سے وابستہ ہیں۔ شیخ تصدق حسین، سید محمد حسین جاہ اور منشی احمد حسین قمر، اگرچہ تین اور حضرات یعنی مولوی محمد اسمٰعیل میر احمد علی اور منشی انبہ پرشاد کا نام بھی حوالتہً بیان کیا جاتا ہے۔ چھپنے سے پہلے یہ داستان جو کم از کم تیس دفاتر پر مشتمل ہے، روسائے لکھنؤ اور شاہزادگانِ اودھ کے سامنے ہر بار کسی نہ کسی قدر اضافہ کے ساتھ پڑھی جا چکی تھی۔ ان حضرات کے حوالہ جات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس داستان کے بہت سے حصص شیخ ابوالفیض فیضی نے برائے تفریحِ طبع شہنشاہِ اکبر فارسی میں رقم کئے تھے جن میں سے مندرجہ ذیل بہت مقبول ہوئے:- نوشیرواں نامہ، ہرمز نامہ، کوچک باختر، بالا باختر، ایرج نامہ، طلسم ہوشربا، صندلی نامہ، تورج نامہ، لعل نامہ۔ ان کے علاوہ بھی ان حضرات نے ترجمہ، تصرف اور تصنیف کی بدولت درجنوں دفاتر اور مرتب کئے۔ الفہرست میں ایسی چھیالیس جلدوں کے نام درج ہیں۔ فقط شیخ تصدق حسین نے ہی اکتیس[۳۱] جلدیں لکھی ہیں یعنی بڑی تقطیع کے کم از کم چھتیس ہزار صفحات۔ یہ سب منشی نولکشور اور اُن کے صاحبزادہ منشی پراگ نرائن نے ان حضرات سے لکھوا کر ۱۸۸۱ء سے ۱۹۰۰ء کے درمیان چھپوائیں۔ انیسویں صدی کے ربع سوم میں اس داستان کے سات دفتر سلطان نصیر الدین شاہ ایران نے تاجروں کے ذریعہ ہندوستان سے مواد منگوا کر اور اپنے ہاں کے شاعروں اور نثّاروں سے لکھوا کر دو ضخیم جلدوں میں طبع کرائے۔

لہ منشی احمد حسین قمر اس کا حوالہ طلسم ہوش رُبا کی جلد ششم کے تتمہ میں دیتے ہیں۔

اس داستان کے سب دفاتر میں زلزلۂ قاف، ثانیٔ سلیمان یعنی امیر حمزہ صاحبقران، ان کے بیٹوں، پوتوں، نواسوں اور بہتر بہتران، بہتر بہتران یعنی مہر سپہر عیاری خواجہ عمرو بن امیہ ضمیری اور ان کے فرزندوں اور شاگردوں کی ملک گیری طلسم کشائی اور جہاں گردی کا حال بالتفصیل درج کیا ہوا ہے۔

آغاز ہر داستان کا کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ یا امیر حمزہ اور ان کا لشکر کسی جھوٹے خدا کی بیخ کنی کرنے کے لئے جگہ جگہ جاتے ہیں یا بوقتِ شکار یا عین لڑائی میں امیر حمزہ کے لشکر سے کوئی جادوگر یا جادوگرنی کسی شہزادہ کو لے اڑتی ہے اور کہیں جاکر یا اسے دشمنی سے قید کر دیتی ہے یا طالبِ وصل یا مددہوتی ہے، ہر سہ صورتوں میں کسی نہ کسی کو اس کے پیچھے جانا پڑتا ہے چنانچہ علمِ نجوم سے معلوم کیا جاتا ہے کہ فلاں طلسم کا فاتح کونسا فرزند یا نبیرۂ حمزہ ہے، پھر وہ شاہزادہ بعض دفعہ اپنے عیار کے ساتھ اور اکثر تنہا طلسم کشائی کو نکلتا ہے۔ بعد از ہزار صعوبت و پریشانی چند شاہزادیانِ طلسم کی مدد سے ضرور اس آفتابِ حسن اور صاحبِ سطوت و صولت پر عاشق ہو جاتی ہیں وہ شیر بیشۂ جرأت اس طلسم کو فتح کر لیتا ہے۔ اس طرح سینکڑوں طلسم پسران اور نبیرگانِ حمزہ نے فتح کیے ہیں۔ ہر جگہ، ہر وقت، ہر مصیبت میں عیار آکر اُن کی مدد کرتے ہیں۔ جادوگروں کو دھوکا دے کر مارتے ہیں اور صحیح معنوں میں طلسم توڑتے ہیں۔ مختلف دفتروں میں امیر حمزہ کے نامور فرزندوں اور پوتوں کے خروج اور فتاحی کے قصے درج ہیں۔ مثلاً ہرمز نامہ میں قاسمِ خونریز نقاب دار سرخ پوش بن کر آتا ہے اور امیر حمزہ سے مقابلہ کے دعوے کرتا ہے اور بانہائے صاحبقرانی چھین لینے کا دم بھرتا ہے۔ کوچک باختر میں شاہزادہ بدیع الزماں ملک سنجان کو فتح کرتا ہے اور بہت شوکت کے سامان پیدا کرتا ہے۔ بالا باختر میں زمرد شاہ باختری سے جو خدائی کا دعوے کرتا ہے مقابلہ ہوتا ہے اور یہاں بدیع الزمان اور قاسم اور آخر میں اسد بن کرب اور شاہزادہ نورالدہر بہت معرکہ آرائیاں کرتے ہیں۔ ایرج نامہ میں ایرج بن قاسم جو ایامِ طفلی میں گم ہو گیا تھا، آفتاب پرستوں میں پرورش پا کر انہیں کا مذہب اختیار کر لیتا ہے اور امیر حمزہ کے لشکر سے مقابلہ کرتا ہے اور بہت عروج پاتا ہے۔ اسی میں نورالدہر بن بدیع الزماں کی جنگ آزمائیاں بھی درج ہیں۔

صندلی نامہ میں قمور بن حمزہ اور حمزہ ثانی کے خروج کا قصہ ہے اور تورج نامہ میں رستمِ ثانی بن ایرج اور بدیع الملک بن نورالدہر کی رستمی اور طلسم کشائی کے قصے لکھے گئے ہیں۔

یہ جوانانِ صف شکن اور شاہزادگانِ تہوّر شعار سب امیر حمزہ کی طرز پر وضع کیے گئے ہیں۔ اگرچہ ایک آدھ خصوصیت ان کو ایک دوسرے سے ممیز کرنے کے لئے ضرور ان میں رکھ دی جاتی ہیں۔ جو صفات امیر حمزہ میں موجود ہیں وہی ان سب میں ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ امیر ان سے حلم میں زور میں برداشت میں اور مروّت میں قدرے بڑھے ہوئے ہیں۔ عیارانِ لشکر جن کی تعداد ایک لاکھ چوراسی ہزار ہے، خواجہ عمرو عیار کے شاگرد ہیں اور ان کی شکل و شباہت میں فرق ہو یا نہ ہو مگر

طریقِ عیاری میں بہت کم فرق ہوتا ہے۔ کبھی ایک حسین و جمیل عورت کا بھیس بدل کر ساحروں کو لبھاتے ہیں اور داروئے بیہوشی شراب میں ملا کر یا کبھی پھول سنگھا کر یا آگ پر کچھ ڈال کے یا حباب مار کر ان کو بیہوش کرتے ہیں اور اسی صورت میں انہیں قتل کرتے ہیں۔ ان عیاروں میں سب سے نامور مہتر قران خلیفہ عمرو عیار ہے جو پہلے ملک حبش کا بادشاہ تھا، خواجہ عمرو کبھی براہِ شفقت اسے "میرا جان بخش" یا "میرا کالیا" کہہ کے پکارتے ہیں۔ پھر مہتر برق فرنگی جو قوم کا انگریز ہے، پھر مہتر برک خطائی اور مہتر چالاک بن عمرو۔ ان چار مہتروں کے بعد چودہ سرہنگ ہیں جن میں سے یہ چند بزرگ بہت مشہور ہیں:۔ ابوالفتح، سیارہ بن عمرو، جواہر بن عمرو، امیہ بن عمرو، سمک بیلمانی، گلباد عراقی، شاپور شیردل وغیرہ۔ ان کی عیاریوں کا رنگ ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہے سوائے مہتر قران اور برق فرنگی اور کہیں کہیں چالاک بن عمرو کے۔ مگر ان سب کے استاد اور دراصل شہنشاہ اوج عیاری خواجہ عمرو ہیں جن کے پاس تحفہ جات ہفت پیمبراں ہیں اور جو واقعی عیاری میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔

امیر حمزہ خواجہ عبدالمطلب بن ہاشم کے فرزند ہیں اور قوت میں، جسارت میں، جلالت میں صاحب قران ہیں۔ ان کے خروج کا قصہ یہ ہے۔ نوشیرواں شاہِ ایران نے ایک رات ایک بھیانک خواب دیکھا، جسے وہ صبح اٹھتے ہی بھول گیا۔ برسرِ دربار اس نے اپنے وزرا سے یہ کیفیت بیان کی۔ اس کے وزیر بزرجمہر نے جو علم کہانت میں کمال رکھتا تھا زائچہ کھینچ کر یہ تعبیر بتائی کہ مشرق کی طرف سے شہر خیبر کا بادشاہ کسی زمانہ میں آپ پر چڑھائی کرے گا اور شہر مکہ سے ایک جوان حمزہ نامی آکر آپ کو بچائے گا۔ نوشیرواں نے بزرجمہر کو اسی وقت مکہ بھیجا کہ وہاں جاؤ اور اگر وہ لڑکا پیدا ہوا ہو تو ہمارا فرزند مشہور کر کے اس کی مناسب پرورش کا انتظام کر کے آؤ۔ بزرجمہر نے مکہ پہنچ کر خواجہ عبدالمطلب کا گھر دریافت کیا اور پھر مکہ کے ان نوزائیدہ بچوں کو طلب کیا جو ایک دن ہی پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ حمزہ اور عمرو اور مقبل تین بچے اس کے سامنے لائے گئے۔ اسے علم نجوم سے معلوم ہو ہی چکا تھا کہ تینوں اور خصوصیت سے اوّل الذکر دونوں بہت نامور ہوں گے۔ چنانچہ ان کا خاطر خواہ انتظام کر کے واپس مدائن آگیا۔

جب یہ جوان ہوئے تو اپنے اپنے ہنر میں فرید روزگار اور پیغمبروں کے منظورِ نظر ہوئے۔ جب حشام بن علقمہ خیبری نے نوشیرواں پر چڑھائی کی تو امیر حمزہ نے جا کر اسے زیر کیا۔ چنانچہ ان کی اور ان کے یارانِ نامور یعنی عمرو عیار اور مقبل وفادار کی بہت قدر ہوئی۔ امیر حمزہ ملکہ مہرنگار دختر نوشیرواں پر عاشق ہوئے اور اس عشق میں بہت مصیبت اٹھائی۔ نوشیرواں کا دوسرا وزیر بختک بہت شیطان صفت تھا، وہ ہمیشہ اسے بری صلاح دیا کرتا تھا۔ اس کے مشوروں سے نوشیرواں بہت تباہ حال ہوا۔ اوّل تو اس نے حمزہ کو ہندوستان بھیجا کہ دارائے ہند لندھور بن سعدان جیسے کوہ پیکر پہلوان کو زیر کرے جس کا قد ایک سو چھپیں گز کا اور جس کا گرز ایک ہزار سات سو من کا تھا۔ امیر اس سے پہلے دو بہادروں یعنی عمرو معدی کرب اور بہرام گرد بن خاقانِ چین کو زیر کر چکے تھے۔ ہندوستان پہنچ کر لندھور کو بھی زیر کیا۔ کوہ سراندیپ پر خواب میں انہیں انبیائے کرام نظر آئے اور انہیں بہت

سے تحفے عطا کئے۔ عمرو عیار بھی ساتھ تھے۔ انہیں بھی وہاں سے بہت تحائف ملے جن میں سب سے افضل حضرت آدم کی زنبیل تھی جو بظاہر ایک بٹوے کے مانند تھی مگر اس کے اندر بہت سے ملک آباد تھے، اس میں جو چیز ڈالتے سما جاتی اور جو چیز چاہتے نکل آتی، اس پر ہاتھ رکھ کر اگر دعا کرتے تو جس طرح چاہتے صورت تبدیل ہو جاتی۔ حضرت داؤد نے لحن داؤدی اور موسیقی میں کمال عطا فرمایا۔ اسی طرح حضرت دانیال نے ایک بارگاہ دی جو چاہتے تو سمٹ کر چھتری بن جاتی اور اگر پھیلاتے تو اس میں ہزاروں آدمی بیٹھ سکتے۔ حضرت الیاس نے ایک جال دیا کہ جو اور جس قدر اشیا اس میں باندھتے بندھ جاتیں اور اٹھانے والے کو بوجھ محسوس نہ ہوتا۔

ہندوستان سے واپسی پر بختک نے پھر نوشیرواں کو بہکایا کہ امیر کو اب کسی اور مہم پر بھیجو تاکہ وہاں جا کے مارا جائے اور تمہیں اپنی بیٹی اسے نہ دینی پڑے۔ چنانچہ نوشیرواں نامہ میں انہی مہمات کا ذکر ہے۔ اسی طرح کئی سال گزر گئے اور امیر نے بہت سے ممالک فتح کئے کہ ایک دن امیر کو شہپال بن شہرخ بادشاہ پریہائے قاف نے دنیا سے اٹھوا منگوایا کیونکہ دیووں نے بغاوت کر کے اس کا پایۂ تخت چھین لیا تھا۔ امیر نے قاف میں اٹھارہ سال صرف کئے اور تمام دیووں کو زیر کیا اور زلزلۂ قاف لقب پایا۔ وہاں آسمان پری دختر شہپال سے شادی کی۔ ۱۸ سال بعد دنیا میں واپس آئے۔ اس دوران میں عمرو عیار جسے وہ اپنا نائب کر گئے تھے لشکر کو اور ملکۂ مہرنگار کو جسے امیر نوشیرواں کے جور و جفا سے تنگ آ کے مدائن سے نکال لائے تھے، مختلف قلعوں میں چھپاتا اور دشمنانِ امیر سے بچاتا رہا۔ اکثر سردار منتشر ہو گئے تھے، زندگی اجیرن ہو گئی تھی، دشمن چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے کہ امیر واپس آئے اور سب کو شکست دی۔ نوشیرواں جسے بختک ملک بملک پھراتا اور حمزہ سے دشمنی پر ہمیشہ اکساتا رہتا تھا لڑ لڑ کے عاجز آ چکا تھا۔ آخر ایک جگہ شکست فاش کھا کے اور مجبور ہو کر اس نے امیر کی مہرنگار سے شادی پر رضامندی ظاہر کی اور بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ ملکہ مہرنگار کے بطن سے شاہزادہ قباد پیدا ہوا جسے امیر نے بادشاہِ لشکرِ اسلام کیا۔ بعد میں امیر نے بہت سے محل کئے جن سے چند ایک نامور فرزند پیدا ہوئے جن میں رستم پیلتن اور بدیع الزماں بہت مشہور ہیں۔ رستم کے لڑکے قاسم خونریز خاوری اور پوتے ایرج نوجوان اور بدیع الزماں (جن کا لقب گرد شکن مشہور تھا) کے بیٹے نورالدہر نے بہت نام پایا۔ امیر حمزہ کی ایک دختر بلند اختر بھی تھیں جن کا نام زبیدہ شیر گیر تھا اور وہ بدیع الزماں کی حقیقی بہن تھیں ان کے بطن سے اسد غازی پیدا ہوا جس نے طلسم ہوشربا جو داستان امیر حمزہ کا مقبول ترین حصہ ہے عمرو عیار اور پانچ اور عیارانِ جانباز کی امداد سے فتح کیا۔ امیر حمزہ عمر کے آخری حصہ میں ذیل رستمی حمزۂ ثانی کو دے کر مکہ معظمہ چلے جاتے ہیں اور وہاں بشراکت رسول اکرم جنگِ احد میں لڑتے ہیں اور اسی غزوہ میں شہید ہو جاتے ہیں۔

امیر حمزہ اور عمرو عیار کے کردار مثالی ہیں اور ان کے اوصاف مافوق الفطرت، اس لئے ان کو جانچتے وقت ہم وہ قوانینِ فن نگاہ میں نہیں رکھ سکتے، جنہیں عام افسانوں یا ناولوں کی تنقید کے موقع پر ہم منتر کی طرح جپتے ہیں۔ ان پر افسانہ نگاری کا

پہلا اصول ہی عاید نہیں ہوتا - یعنی ان کی ترکیب میں حقیقت نگاری سے کام نہیں لیا گیا اور ان کے کارہائے نمایاں میں واقعیت سرے سے ہے ہی نہیں - مگر صاحب کمال ہو کر اور محیّر العقل اوصاف کے مالک ہوتے ہوئے بشریت سے کام لینا بھی تو ایک قسم کی حقیقت نگاری ہے، مثلاً امیر حمزہ کے کردار کو لیجئے - امیر شجیع ہیں، شکیل ہیں اور ایک بلند نظر خوش خلق اور بامروت انسان کا نمونہ ہیں - ان کی خلقت ہی اس طرح ہوئی ہے کہ ان سے کوئی کم ظرفی، بدعہدی یا ظلم نہیں ہو سکتا - نوشیرواں کی لڑکی پر عاشق ہو گئے ہیں - مہر نگار خود ان پر مائل ہے اور باوجود دیکھ بختک کے پنجۂ ستم و مکر سے مامون کرنے کے لئے اُسے خود اپنے لشکر میں لے گئے ہیں مگر بغیر رضامندئ نوشیرواں کے شادی سے گریز کرتے ہیں - یہ بات غیر معمولی جذب اور تدبّر کا پتہ دیتی ہے - آپ مہر نگار سے عہد کرتے ہیں کہ جب تک اس سے شادی نہ ہو کہیں اور بیاہ نہیں کریں گے مگر پردۂ قاف میں ایک چھوڑ تین نکاح کر لیتے ہیں آسمان پری سے، ریحانہ پری سے اور قمر چہرہ سے -

نوشیرواں ہزار بار دھوکا دیتا ہے سینکڑوں دفعہ وعدہ خلافی کرتا ہے مگر طرح دیتے ہیں اور اگرچہ اس پر قبضہ کر کے اسے اس کی فریب کاریوں کی سزا دے سکتے ہیں مگر باز رہتے ہیں مگر جب عمرو عیار بختک کی شیطنت سے تنگ آ کر اسے قتل کر کے اس کا حریسہ پکاتا ہے اور نوشیرواں کو کھلا دیتا ہے تو امیر اس مکروہ حرکت کو نظر انداز بھی کر دیتے ہیں - پھر اگرچہ امیر حمزہ بہت حلیم ہیں مگر جب انہیں غصہ آ جاتا تو بے وجہ اور بہت جلال سے آ تا ہے مثلاً ہرمز نامہ میں لندھور بن سعدان کا مقابلہ ایک پہلوان سے ہوتا ہے مبارزہ میں لندھور جھلا کے اپنے حریف کو ایک گھونسا رسید کرتا ہے جس سے اس کا مدِ مقابل نیورا جاتا ہے اور لندھور اسے گرا دیتا ہے - وہ بہادر زیر تو ہو جاتا ہے مگر جب امیر حمزہ مسلمان کرنے پر اس سے سوال کرتے ہیں کہ تجھے لندھور نے کیسے زیر کیا تو وہ شکایت کرتا ہے - امیر حمزہ لندھور سے ناراض ہوتے ہیں اور بہت نازیبا طور پر اور اسے لشکر سے نکال دیتے ہیں - لندھور ان کا یارِ غار ہے ان کا جانشین ہے، دستِ راست کے بہادروں کا سردار ہے مگر نہ اس کی منتوں کی پروا کرتے ہیں اور کسی کی سفارش کو منظور کرتے ہیں - حتےٰ کہ حکم دیتے ہیں کہ جو لندھور کی سفارش میں زبان ہلائے گا اسے بھی دربار سے نکال دیا جائے گا - لندھور معافی مانگتا ہے اسے معافی نہیں دیتے حتےٰ کہ وہ سب ہتھیار چھوڑ، فرزند اور فوج چھوڑ جنگل میں نکل جاتا ہے اور فقیر ہو جاتا ہے اور اس پر بہت مصیبتیں آتی ہیں مگر امیر بہت مدت تک غصہ نہیں چھوڑتے - یہ مند امیر میں موجود ہے -

پھر ایرج نامہ میں امیر اپنے یار جانی اور محبوب خواجہ عمرو عیار سے بگڑ جاتے ہیں اور اسے ایک دشمن کے حوالے کر دیتے ہیں کیونکہ عمرو عیار نے اس دشمن کو کوڑوں سے مارا تھا - وہ دشمن عمرو عیار کو باندھ کے کوڑوں سے بے حد مارتا ہے - امیر حمزہ ٹس سے مس نہیں ہوتے - آخر عمرو عیار اس بے عزتی کو برداشت نہ کرتے ہوئے لشکر سے نکل جاتا ہے اور ایرج[1] کو ڈھونڈ کر اسے تعلیم دیتا ہے اور فنونِ سپہ گری میں طاق کر کے امیر پر حملہ کراتا ہے - مگر امیر عمرو پر ایسے ناراض ہیں کہ اس کا نام نہیں

[1] ایرج نامہ

لیتے۔ یہ خصوصیت ان کے حلم کے منافی ہے مگر جیسے ہم سب کبھی نہ کبھی بے وجہ اور نامناسب طور پر نار اض ہو جاتے اور پھر اپنی ضد پر قائم رہنا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے ہیں، اسی طرح امیر حمزہ میں بھی یہ کمزوری پائی جاتی ہے۔ اپنے رواداری اور مروت اور حسنِ سلوک کے اصول کو اس شدید طریقہ سے نباہتے ہیں کہ کئی دفعہ انہوں سے ناانصافی ہو جاتی ہے اور امیر پروا نہیں کرتے۔ ان متضاد خصوصیات کی موجودگی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ امیر حمزہ کے کردار میں کہیں نہ کہیں بشریت کے آثار ضرور پائے جاتے ہیں۔

مگر ان کا کردار جامد ہے۔ یعنی جو طبیعت ان کی جوانی کے عالم میں ہے، آخر تک بغیر کسی تغییر یا ترقی کے رہتی ہے۔ بڑھاپے میں مصنفین ان کے بال سفید کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں مگر ان کی قوت و شہامت میں کوئی فرق نہیں آتا شاید بزرگان دین کی نظر کے طفیل سے یا شاید صاحبقرانی کی وجہ سے کسی پہلوان یا بہادر سے زیر نہیں ہوتے، جہاں رستم پیلتن جیسے بہادر اور بدیع الزماں جیسے زور آور اور قاسم خونریز خاوری جیسے تند مزاج اور ایرج اور نور الدہر اور اسد بن کرب غازی جیسے صف شکن بہادر لڑتے لڑتے تھک آجاتے ہیں وہاں امیر اس عمر میں بھی جا کر دشمن کو زیر کر لیتے ہیں۔

پھر شاہزادوں کا ایک عجیب قاعدہ ہے۔ امیر اور اُن کے فرزند جہاں کہیں پہنچتے ہیں شادی کر لیتے ہیں اور دو ایک ماہ وہاں رہ کے آگے روانہ ہو جاتے ہیں۔ ان کے لڑکے جب سن بلوغت کو پہنچتے ہیں جس کے لئے انہیں اکثر بارہ برس ہی لگتے ہیں، تو کوئی ایک ملک فتح کر کے نقابدار بن کر امیر کے لشکر سے آکر مقابلہ کرتے ہیں۔ اپنے بھائیوں بھتیجوں سے لڑتے، ان سے نہ زیر ہوتے ہیں اور نہ اکثر انہیں زیر ہی کر سکتے ہیں، سوائے بدیع الزماں کے جو زور میں باقیوں سے کچھ فوقیت رکھتے ہیں۔ آخر امیر کے ہاتھ سے زیر ہو کر اپنا نام بتاتے ہیں۔ یہ قاعدہ آخر تک جاری رہتا ہے اور امیر حمزہ آخر تک ہر جوان بیٹے یا پوتے پر خواہ وہ کتنا ہی بہادر اور کیسا ہی بطلِ زمان کیوں نہ ہو، حاوی رہتے ہیں۔

اگر آپ یہ کہیں کہ امیر بمقابلہ لندھور، فند زرشان، ہردم، اسر بال یا گاؤلنگی جو قد میں امیر سے کم از کم دس سو گز لمبے ہیں کیسے ان کے سروں پر گرز لگا سکتے ہیں یا ان کے سر پر امیر کی تلوار ہی کیسے پہنچتی ہے یا یہ کہ دورانِ جنگ یا مبارزت میں امیر کے لشکر کو کوئی نہیں ہلا سکتا اور یوں ہر ایک عیار انہیں بیہوش کر کے پشتارہ باندھ اپنی راہ لیتا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے، اس کے دو جواب ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوہ سراندیپ پر حضرت آدم نے امیر سے وعدہ کیا تھا کہ لڑائی کے وقت تمہارے بازو کسی حملہ یا ضرب کی وجہ سے خم نہیں ہونگے اور تم جس کسی حریف پر حملہ آور ہو گے خواہ وہ کتنا ہی بلند قامت کیوں نہ ہو تمہارا حربہ اُس کے سر تک پہنچے گا۔ اور عیار جو انہیں اٹھا لیتے ہیں تو بیہوش کر کے اٹھاتے ہیں۔ جب امیر ہوش میں ہوں اور بوقتِ کشتی لنگر مار لیں تو کوئی انہیں ایک اِنچ نہیں ہلا سکتا۔ دوسرے یہ کہ ہم ممکنات کی دُنیا کی سیر ہی نہیں کر رہے ہم تو اس دُنیا میں ہیں جو تخیل کی سدرۃ المنتہا ہے۔ یہاں کا کارخانہ ہی الگ ہے، یہاں ہم جیسے بندے نہیں بستے، یہاں ہزار ہزار من کے گرز عام ہوتے ہیں اور ایک سو اسی گز اونچے پہلوان،

اور سمندوں ہزار دست جیسے دیو، یہاں میرے اور آپ کے وضع کئے ہوئے تنقیدی اصول بیکار ہیں۔ اس دُنیا میں داخل ہونے کی شرط ہی یہی ہے کہ آپ اعتراض نہ کریں اور خوش اعتقادی سے کام لیں۔

اب رہے خواجہ عمرو عیار۔ یہ حضرت عیاری اور مکاری کے دیوتا ہیں۔ دورانِ جنگ میں اس طرح نعرہ لگاتے ہیں:۔

عمرو ہوں میں عیار صاحبقراں — مرے مکر سے کانپتا ہے جہاں

تراشندۂ ریش کفار ہوں — زمانے کا مکار غدار ہوں

مرا تیز رفتار ہو کر قدم — صبا ٹھوکریں کھائے ہر ہر قدم

اُڑا دوں صبا کے بھی میں ہوش کو — نیائے مری گرد پاپوش کو

دوندہ جہاں گرد طرار ہوں — جہانگیر عالم کا عیار ہوں

خواجہ کی یہ تعلّی بلا سبب نہیں۔ بڑے بڑے نامور ساحروں نے جو خدائی کا دعوٰے رکھتے تھے اور عیاروں کی حقیقت پشہ کے برابر بھی نہیں سمجھتے تھے آخر عمرو سے دھوکا کھایا اور مارے گئے۔ ان کا حلیہ بیان کرنے میں جس ظرافت کو کام میں لایا گیا ہے اس کا معیار بہت بلند نہیں اور میرے خیال میں یہ مصنّفین کے فنِ تخلیق پر ایک بدنما دھبا ہے۔ خواجہ کو اُنہوں نے دُبلا، پتلا تانتیا، بدشکل اور بدقطع لکھا ہے۔ بدمانس اور غول بیابانی کہنے پر ہی اکتفا نہیں کیا، تفصیل سے ان کا سراپا یوں کھینچتے ہیں "تومڑیا سا سر تھا، زیرہ سی آنکھیں، خوبانی سے کان، کلیجہ کی طرح گال، تاگا سی گردن، رسی سے ہاتھ پاؤں، نیچے کا جسم چھ گز اور اوپر کا تین گز تھا"۔ یہ حلیہ مضحکہ خیز ضرور ہے مگر خواجہ کا کردار محض مسخرے کا نہیں۔ خواجہ سے آپ ہر قسم کی حرکت کی توقع کر سکتے ہیں مگر وہ بھانڈپن پر کبھی نہیں اُترتے۔ عیاری کے موقع پر بھونڈے مذاق بھی ان سے ہو جاتے ہیں اور بڑے بڑے ساحروں اور خدائی کے دعویداروں کی داڑھی پیشاب سے مونڈنا بھی ان سے بعید نہیں مگر اس سے لازم نہیں آتا کہ ان کا حلیہ بھی کریہہ بنا دیا جائے تاکہ عورتیں انہیں دیکھ کر ڈر جائیں مگر مصنّفین نے انہیں امیر حمزہ کے حسن کے مقابل میں بدشکل بنا کر گویا ایک قسم کا توازن یا ضد قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ خواجہ کے کمالات کو دیکھ کر کوئی بھی ان کے حلیہ کو یاد نہیں رکھ سکتا۔

ان کی عیاری کیا تھی کرامات تھی، طلسم ہوشربا میں اور دوسرے دفاتر میں ان کی بہت سی بے نظیر عیاریاں مرقوم ہیں۔ ایک دفعہ خداوند نہنگ بن کرجھاندار شاہ بادشاہ بیابان گلریز کو پکڑ لیا اور اسے مطیع کیا۔ لاہوت جادو اور اس کی بیوی زرد مرگ نشیں کے باغ میں جو سحر بند تھا سرداران لشکرِ اسلام قید تھے، افراسیاب جادو شہنشاہ طلسم ہوشربا بنفسِ نفیس وہاں موجود تھا۔ اس کی عیارچی ملکہ صرصر بھی ہمراہ تھی، عمرو عیار پہلے ایک کالی بلی بن کر آئے، پھر شہنشاہ جنات بنے اور اس لطف سے عیاری کی کہ صرصر جیسے دلاور تھا کہ عمرو کوئی عیاری کرے وہ پہچان لے گی سب ہیکڑی بھول گئی اور شاہ جنات کو دیکھتے ہی کانپ اٹھی اللہ عمرو

نے اپنے سب رفیق قید سے چھڑا لئے۔ خداوندِ جمشید جادو بن کر افراسیاب جادو سے لوحِ طلسمی کا پتہ لیا، لاچین جادو سابق شاہِ طلسم اور بدیع الزمان جو دس سال سے طلسم میں قید تھے ان کی قید کا مقام دریافت کیا۔ پھر حیات جادو نے جو ملکہ حیرت جادو زوجہ افراسیاب کا والد اور بڑا ہی جید ساحر تھا بلا بھیجا تو وہاں جا کے عیاری کی اور حاضرات کے دھوکے سے امیر حمزہ کی زمرد شاہ خداوند لقا سے جنگ کا نقشہ دکھایا اور صاف بچ کے نکل آئے۔ یہی وہ عیاریاں ہیں جن کی وجہ سے ساحران کے نام سے کانپتے تھے۔

کہیں وہ نازنین بنے کسی جادوگر کا مال ہتھیانے کی فکر میں ہیں، کہیں یونہی خوش وقتی کے طور پر کسی جادوگر کو لوٹ کر اس کا مال زنبیل کی نذر کرتے ہیں۔ وہاں پہنچتے ہیں جہاں طائرِ وہم بھی نہ پر مار سکے۔ جب[1] افراسیاب جادو سب کچھ کھو بیٹھتا ہے تو آفتاب فلک سیر جادو سے چند تحائف طلسمی کو جو اس کے آباو اجداد نے سامری و جمشید سے حاصل کئے تھے، افراسیاب لاتا ہے اور ایک گنبدِ سحر تعمیر کر کے وہ تحفہ جات وہاں لٹکا دیتا ہے ان کی تاثیر سے جو دشمن بھی اس گنبد کے سایہ میں پہنچتا ہے خواہ وہ کتنا ہی بڑا ساحر کیوں نہ ہو، اتنے برچھے اور بھالے اور تلواریں اس پر پڑتی ہیں کہ وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ خواجہ عمرو جان پر کھیل کر آفتاب فلک سیر سے آئینہ طلسمی لاتے ہیں اور اس کی بیوی گلزار جادو کی شکل میں وہ آئینہ اس گنبد کو دکھا کے اسے برباد کرتے ہیں۔ افراسیاب کو تو آخر میں وہم ہو جاتا ہے کہ جہاں خواجہ کا نام کسی نے ایک دفعہ لیا، انہیں معلوم ہو گیا اور دوسری دفعہ نام لینے پر وہ اس طرف چل پڑے اور تیسری دفعہ جو نام لیا وہ آئے اور پھر کسی کی قضا آئی۔ اسی لئے سب انہیں شہنشاہ اقلیم عیاری کہتے ہیں۔

بعض عادات خواجہ کی بہت دلچسپ ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ حد درجے کے بخیل اور حریص ہیں اگر کسی جادوگر کو مارتے ہیں تو اس کے کپڑے تک اُتار لیتے ہیں۔ شاگردوں کو خلعت ملے تو ان سے وہ بھی رکھوا لیتے ہیں۔ جب امیر حمزہ نے خواجہ عمرو، مہتر قرانِ برق فرنگی، ضرغام اور جانسوز کو شاہزادہ اسد کے ساتھ طلسم ہوشربا کی طرف جانے کو کہا تو خواجہ نے کہا ہم تو مکہ زیارت کو جاتے ہیں۔ جب امیر نے پانچ لاکھ روپیہ زادِ راہ دینے کا نام لیا تو خواجہ نے روپیہ چھوڑنا مناسب نہ سمجھا اور اسد کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئے جب کبھی کسی مہم پہ جانا ہو تو پہلے خواجہ اسی طرح بگڑتے جب کچھ روپیہ مل جاتا تو ملتے۔ بعض دفعہ ان کی اور اسد یا امیر یا بدیع الزماں کی خوب نوک جھونک ہوتی، وہ کہتے ہم واپسی پر روپیہ دیں گے۔ خواجہ پیشگی پر اصرار کرتے۔ مگر یہ سب کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو بہانے ہیں، خواجہ جانے کو پہلے سے ہی تیار تھے۔ مگر جب امیر نے اس دفعہ باقی کے چار عیاروں کو بھی پانچ لاکھ روپیہ عنایت کیا تو عمرو نے کہا "یا امیر آپ ناحق میرے شاگردوں کو روپیہ دے کر خراب کرتے ہیں" پھر اُن عیاروں سے کہا " او ناشدنیو تم یہ پانچ لاکھ روپیہ لے کر سب برباد کرو گے لاؤ مجھ کو دو میں رکھ چھوڑوں، وقت پر تمہارے کام آئے گا۔ استاد روپیہ لے کر تم عیاری خاک کرو گے، کیا اپنے پاس کا روپیہ صرف کر کے طلسم میں جاؤ گے" عیار سمجھے کہ اُستاد روپیہ دیکھ چکے ہیں، چھوڑیں گے نہیں۔ غرض انہوں نے وہ روپیہ بھی عمرو کی نذر کیا۔

[1] طلسم ہوشربا۔ جلد ہفتم

جہاں لشکرِ اسد کو فتح ہوتی اگر خواجہ ساتھ ہوتے تو پہلے ہی جا کر جال الیاسی مار کر ایک ہی ہلہ میں سب خزانہ داخلِ زنبیل کر لیتے اور بارگاہ میں آکر مسکین سی صورت بنا کر بیٹھ رہتے اگر کوئی پوچھتا تو کہتے کہ لڑائی میں خیال نہ رہا، دو صندوقچے جواہرات سے بھرے ہوئے کہیں گر پڑے، اب مہاجن سُود کے لئے پیچھے پڑے ہیں۔ اگر کسی زبردست ساحر سے مقابلہ ہوتا اور سردارانِ لشکر خواجہ سے کہتے کہ خواجہ بہرِ خدا جاؤ اور عیاری کرو تو مُنہ پُھلا کے کہتے "میں مقروض ہوں، قرضخواہ سُود کے لئے پیچھے پڑے ہیں۔ باہر نکلنا بند ہے۔ باہر جاؤں تو کیسے جاؤں"۔ سب سردار خوشامد کرتے مگر خواجہ کہتے "بھائیو باتوں سے کچھ نہیں بنتا۔ کچھ روپیہ خرچ کرو" تو بنے سب طرف سے اشرفیاں اور زیورات انہیں دیئے جاتے تو وہاں سے ہٹتے۔ خواجہ کو روپیہ اتنا عزیز تھا کہ اگر حیرت جادو کی مدد کو کوئی اس کا عزیز لشکر لے کر آتا اور حیرت جادو اس پر زر نچھاور کرتی آتی تو خواجہ کسی شہدے کا بھیس بدل کے یہ روپیہ ہی لُوٹتے پھرتے۔ جب افراسیاب جادو مارا گیا اور اس کا خزانہ اسد کے ہاتھ آیا تو خواجہ کی طبیعت کو جانتے ہوئے انہوں نے باغبان جادو اور معمار قدرت دو افسران لشکر کو خزانہ کا روپیہ شمار کرانے پر منتظم مقرر کیا اور حکم دیا کہ خواجہ کو ادھر نہ آنے دینا چنانچہ اُنہوں نے خواجہ کو تو اُدھر آنے سے منع کیا۔ مگر خواجہ نے منت کی کہ وہ اور کچھ نہیں چاہتے فقط اِدھر سے اُدھر پھر کے روپوں کے انباروں سے گزر جائیں گے۔ ان کا کیا حرج ہے۔ مگر اسد بن کرب جو جوانی کے عالم میں خود قزاقی کیا کرتے تھے خواجہ کی چالاکیوں سے واقف تھے انہوں نے خواجہ کی جوتیوں کی طرف نگاہ کی۔ دیکھا گیا کہ خواجہ نے تلوں کے نیچے موم لگا رکھا ہے اور اِدھر سے اُدھر گزرنے پر کچھ اشرفیاں تلوں سے چمٹ گئی ہیں۔

خواجہ کی اس خصوصیت پر اُس قدر زور دیا گیا ہے کہ بعض دفعہ تو ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ ظرافت میں بھی غلو کام نہیں دیتا مگر اس سے یہ مُراد نہیں کہ خواجہ نے کبھی روپیہ خرچ نہیں کیا۔

جب کرب غازی کی نسبت ملکہ زبیدہ شیر گیر سے پختہ ہوگئی تو کرب[1] غازی جنہیں خواجہ عمرو نے اپنا فرزند بنا رکھا تھا اور جن سے انہیں بہت اُلفت تھی بہت ملول و پریشان ہوئے کہ میں اتنا امیر نہیں کہ دخترِ امیر کا ہم پلّہ ہو سکوں، اس کی حیثیت کے مطابق برات اور زیور لے جا سکوں تو خواجہ نے تمام خرچ اپنے ذمے لیا اور اس فراخدلی سے خرچ کیا اور اس دھوم دھام سے برات لے کر گئے کہ شاہانِ عالم دنگ رہ گئے۔ پھر جب[2] امیر نے خواجہ کو ملک سنجان میں شاہزادہ بدیع الزمان کی خبر کو بھیجا تو خواجہ راہ میں زمرد شاہ کے پایہ تخت سائل میں سے گزرے جو باختر میں خدائی کرتا تھا وہاں کئی ایک توڑے اشرفیوں کے گردمرو عیار سے شرط میں جیتے۔ اس شہر میں خواجہ کی ہمشیرہ اور بہنوئی اخی سعید بستے تھے۔ خواجہ جب اپنی ہمشیرہ سے ملنے گئے تو وہ سب توڑے اشرفیوں کے اپنی بہن کی نذر کئے۔ مگر ایسے واقعات خواجہ کی زندگی میں شاذ ہی گزرتے تھے اور عام طور پر ان کی حرص کی کیفیت سے بیان میں ظرافت کی چاشنی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔

[1] بہرہ نامہ ـ ۲ ـ ـ کوچک باختر

خواجہ عمرو دُنیائے ظرافت کے ایک اور مشہور کردار کی طرح خود ہی ظریف نہیں بلکہ دوسروں میں بھی ظرافت کا باعث ہوتے ہیں۔ یعنی بختیارک بن بختک جو پہلے نوشیرواں پھر فرامرزا اور ہرمز فرزندانِ نوشیرواں کا وزیر ہوتا ہے اور بعد میں خداوند لقائے باختری کا شیطان بنتا ہے ایک اور مزاحیہ کردار ہے۔ خواجہ اس سے ہمیشہ ریش کا خراج لیتے ہیں۔ وہ اُن کے نام سے کانپتا ہے جب کبھی اسے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ محفل میں موجود ہیں تو اونچی آواز میں صلوٰۃ برابراہیم کہنے لگتا ہے اور ایسی مسخرہ پن کی باتیں کرتا ہے کہ پڑھنے والا اکثر بے ساختہ مسکرا دیتا ہے۔

مگر خواجہ کا کردار بھی امیر حمزہ کی طرح جامد و ساکن ہے۔ شروع سے لے کر آخر تک اُن کی طبیعت میں کوئی فرق اور فطرت میں حوادثِ زمانہ یا تجرباتِ زندگی سے کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ یعنی وہ شروع ہی سے ایک مکمل شخصیت کی صُورت میں پیش کئے گئے ہیں اور آخر تک ان میں وہی خصوصیات قائم رہتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ یہ دونوں کردار دو قسم کی شخصیتوں کے نمونے ہیں مکمل جیتے جاگتے گوشت پوست رکھنے والے کردار نہیں۔ ہمیں امیر کی بہادری، پہلوانی اور جہانگیری کے علاوہ سوائے ان کے متعدد معاشقوں کے جو ایک دوسرے سے سرِمُو فرق نہیں رکھتے، اور کچھ معلوم نہیں۔ امیر کسی قتالۂ جہاں کو دیکھ کر اسی طرح بیہوش ہو جاتے جیسے وہ حسینہ آپ کو دیکھ کر اور یہی طرزِ عشق بازی دوسرے شاہزادوں اور شاہزادیوں کی ہے۔ چند ایک مصائب کے بعد کہ یہ مصائب بھی تقریباً ایک ہی تراش خراش کے ہوتے ہیں، ان دونوں عشق زدوں کا انجام بخیر ہو جاتا ہے۔ یہ کہ امیر ان بیویوں سے کیسا سلوک کرتے ہیں، صبح اُٹھتے ہیں تو ان کا مزاج کیسا ہوتا ہے، اتنے فرزند اور پوتے ہیں، کس کو کس سے زیادہ چاہتے ہیں اور ایسی ہی اور باتوں کے متعلق ہمیں کچھ علم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان کی فقط ایک ہی شکل دیکھتے ہیں۔ انہیں ہر رُخ اور ہر پہلو سے نہیں دیکھ سکتے۔

ایسے ہی خواجہ عمرو کو ہم ایک جانباز کی حیثیت سے ایک نڈر، چالاک، بیباک، طرّار، مکار، عیار کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، یا ایک لالچی اور ظریف شخص کے رُوپ میں یا ایک بے مثال گویئے کے رنگ میں۔ ہمیں ان کے خیالات، ان کے ذاتی افکار، ان کے خانگی حالات، ان کی صحت، ان کی طرزِ بود و ماند ان کی چھوٹی چھوٹی جزئی باتوں سے مصنف آشنا نہیں کرتے۔ لہٰذا ان کا کردار فنی لحاظ سے ادھورا اور یک رُخہ رہ جاتا ہے۔ مگر اس کے مقابلہ میں ان کی باتیں سنیئے، ان کی عیاریاں دیکھئے، ان کی بذلہ سنجی، حاضر جوابی اور دانشمندی ملاحظہ کیجیئے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ بیشک خواجہ عمرو عیار اُردو فسانہ نگاری کے ایک لعلِ عظیم ہیں۔

اب ذرا دو کلمے ان داستانوں کی طرزِ نگارش کے متعلق کہنا چاہتا ہوں:۔

اس داستان طویل میں تخیّل کی جو فراوانی پائی جاتی ہے وہ شاید دُنیا کی کسی اور داستان میں صرف نہیں کی گئی۔ افسوس اس امر کا ہے کہ اگرچہ تخلیق کے موقع پر تخیّل سے کام نہیں لیا گیا مگر ضبط اور اصُول کی پابندی کا بالکل خیال نہیں رکھا۔ مبالغہ آمیزی کسی حد تک

ایسی داستانوں کی جان ہوتی ہے مگر نہ اس حد تک کہ بدیع الزماں[1] گنجاب شاہ سنجان کے لشکر پر تیس شب خون اکیلا مارتا ہے اور پھر جب اس کا ہم چشم قاسم خونریز باختر[2] میں جاکر لقائے باختری کے لشکر پر اسی طرح اکیلا ۲۵ شب خون مارتا ہے تو بدیع الزماں چالیس روز خوں مارتا ہے۔ لاکھوں کا لشکر اور یہ شب خون اور روز خون ہر شب لعدہ ہر روز اور ان دونوں کو کوئی خفیف سی ضرب آ جائے تو آ جائے ورنہ کوئی زخم کاری نہیں لگتا۔ ایک اور ظلم ملاحظہ ہو، اور یہاں تو قاعدہ اور تناسب چھوڑ صریحاً جہالت اور کور ذوقی سے کام لیا گیا ہے۔ سرفتنہ نورافشاں میں مندرجہ ذیل شاہزادے برائے فتاحی طلسم نکلتے ہیں: شاہزادہ سکندر زریں علم بن ایرج، شاہزادہ ضیغم شیر شکار بن اسد غازی، شاہزادہ سروِ سہی قبا بن سعد بن قباد بن حمزہ اور شاہزادہ مہران جواں بخت بن نورالدہر۔ یہ امیر حمزہ کے پوتوں کے بھی پوتے ہیں اور طلسم کشائی امیر حمزہ کے ہاتھ سے ہوتی ہے۔ جہاں شاہزادیاں طلسم ان جوان شاہزادوں پر عاشق ہوتی ہیں وہاں امیر پر بھی اسی طرح فدا ہوتی ہیں اور امیر کی وجاہت اور شکل و صورت کی بھی انہیں الفاظ میں تعریف ہوتی ہے جن میں ان پڑپوتوں کی۔

نوشیرواں نامہ میں مصنف کو رستم پیلتن فرزند حمزہ کی شوکت دکھانی منظور ہے، چنانچہ ایک جگہ لندھور بن سعدان جانشین امیر کو جسے امیر جوانی کے عالم میں بھی سر سے بلند نہ کر سکے تھے رستم پیلتن مع لندھور کے ہاتھی میمونہ کے سر سے اونچا اُٹھا لیتے ہیں۔ یہاں اس بات کی شکایت نہیں کہ یہ شاہزادے دیووں کو اُٹھا کے پھینک دیتے ہیں اور اژدہوں کو چیر ڈالتے ہیں اور شیروں کو گھونسا مار کے ہلاک کر دیتے ہیں، ہاتھی کی سُونڈ پکڑ کر مع نرخرہ اس کی گردن کھینچ لیتے ہیں۔ یہ تو اُن کا روزمرہ ہے مگر یہ اعتراض ضرور ہوتا ہے کہ فقط امیر کے ایک فرزند کی شوکت نمائی کے لئے ایسے بہادر کی یوں توہین کرنا اصُولِ داستان نویسی کے خلاف ہے۔

ایک اور امر جو خاص طور پر ان داستانوں میں ناظرین کی آنکھ میں کھٹکتا ہے وہ مصنفین کا ان بہادروں سے برتاؤ ہے جو امیر یا اس کے فرزندوں سے زیر ہو جاتے ہیں، یا ان جادوگروں اور جادوگرنیوں سے جو لڑ کر مطیع لشکرِ اسلام ہو جاتی ہیں۔ یہ بہادر جب اوّل اوّل مقابلے میں آتے ہیں تو ہر شاہزادے سے لڑتے اور بہتوں سے برابر رہتے ہیں اور یہ ڈر ہوتا ہے کہ یہ بہت زبردست پہلوان ہیں ان کی بدعت سے خدا بچائے مگر کوئی نیا پہلوان یا بہادر یا بادشاہ لڑنے کو آتا ہے تو یہ پہلوان پر اتنی فوقیت رکھتا ہے کہ اس کو زیر کرنے میں پھر صاحبقران سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ سوائے معدودے چند مثلاً لندھور مالک اژدر، بہرام گرد یا ایک آدھ اور کے طلسم ہوشربا میں جو نئی جادوگرنی یا جادوگر آتا ہے بہت زبردست دکھائی دیتا ہے مگر جب مطیع ہوتا ہے تو پھر اس سے کوئی خاص نمایاں کام سرزد نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر فقط دو شہزادیوں کو لیجئے، ملکہ ماران زمین کن اور ملکہ لعل سخنداں۔ یہ دونوں جب افراسیاب کی طرف سے آتی ہیں تو ان سے سب لشکرِ اسلام کانپتا ہے اور جب یہ طرفدارِ اسد ہو جاتی ہیں تو ان کا رُتبہ ان شاہزادیوں سے بہت کم ہوتا ہے جو اوّل اوّل مطیع ہوئیں، مثلاً ملکہ بہار گلعذار اور محمور سرخ چشم اور برق والدہ رعد جادو اور برق لامع وغیرہ سے۔

[1] کہیک باختر۔ [2] بالا باختر۔

ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس داستان کا چونکہ ہر کردار جادو ساگن ہے اس لئے ان پر دس پندرہ سال کی مدت کچھ اثر پیدا نہیں کر سکتی۔ مثلاً غضنفر بن اسد غازی طلسم ہوشربا کی جلد اوّل میں جب اپنے قزاقوں سمیت لشکرِ اسد کی مدد کو آتا ہے تو اس کی عمر بارہ برس کی ہوتی ہے اور پندرہ سال گزرنے پر جب جلد ہفتم میں شریکِ لشکر طلسم کشا ہوتا ہے تو اسی طرح کمسن ہوتا ہے اور گھوڑے پر اس کی پٹڑی ابھی تک ٹھیک طور سے نہیں جمتی۔

ایک بات جو عیاروں یا عیار بچیوں کی عیاریوں میں سمجھ میں نہیں آتی یہ ہے کہ خواجہ عمرو جن کا قد نو گز کا ہے کیسے صرصر شمشیر زن عیار بچی افراسیاب جادو کا بھیس بدل سکتے ہیں یعنی وہ اپنے قد کو کیا کرتے ہیں، یا صرصر جب عمرو عیار کا بھیس بدل کر اور شکل بنا کے لشکر اسلام میں جاتی ہے تو وہ اپنے بوٹے سے قد کو کھینچ کر اتنا لمبا کیسے بنا لیتی ہے۔ اسی لئے مہتر قران کی عیاری ہمیشہ پسندیدہ سادہ اور انوکھی ہوتی ہے، وہ کبھی عورت کا بھیس نہیں بدلتے اور نہ کسی چھوٹی عیاری میں شرکت ہی کرتے ہیں۔

اب رہا ان مصنفوں کا اسلوب بیان:۔

ہر سہ حضرات نے ترجمہ کرتے وقت نہایت فراخدلی سے داستان میں تصرف کیا ہے اور کبھی اضافہ کرتے وقت سلسلۂ بیان کو قطع کر کے اس امر کا فخریہ اظہار کر دیتے ہیں، جو اکثر پڑھنے والے کو ناگوار ہوتا ہے۔ ان تینوں حضرات میں سے شیخ تصدق حسین میں تکلف زیادہ ہے، یعنی اگرچہ اکثر سلیس زبان لکھتے ہیں مگر مقفّیٰ ہونے کے سبب زبان آج کل کے ناظرین کو پُر تصنع معلوم ہوتی ہے۔ منشی احمد حسین قمر کی زبان نسبتہً علمی ہے۔ سید محمد حسین جاہ کی زبان میں روزمرہ کی چاشنی اور سادگی زیادہ ہے خصوصاً عورتوں کی زبان وہ خوب لکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ چند سطور لیجئے:۔

"ضرغام اسد بن کرب کا عیار حیرت جادو کے لشکر میں عیاری کرنے گیا، گرفتار ہو گیا، ایک زنجیر میں لٹک گیا۔ حیرت نے سحر پڑھا وہ زنجیر ضرغام کو حیرت کے سامنے لے آئی۔ حیرت نے اسے زنجیر سے چھڑایا اور پہچان کر ایک طمانچہ ڈھیلے ہاتھ سے اسے مارا کہ موئے تو یہاں کہاں آیا۔ اے موذی کا ٹو تم تو ہمزاد ہو گئے کہ جہاں جاؤ وہاں ساتھ۔ ضرغام نے کہا میرا بھی جی سیر کو چاہا آپ کے ساتھ چلا آیا بلی چلی آتی ہے کہ گھر آتے کتے کو بھی نہیں نکالتے، تم نے تو طمانچہ مارا۔ ملکہ اس بے باکانہ کلام سے ہنس پڑی اور کہا ہم ایسے ہی بے مروّت ہیں مگر آپ تشریف لے جائیے۔ اس نے جواب دیا کہ کیا میں اس زمین کے موتی توڑ لوں گا، اتنا اترانا اچھا نہیں، سیر کو آئے تھے چلے جائیں گے۔" یا اس مثال کو لیجئے:۔ "کنیزانِ حیرت جادو میں ایک کو احتیاج ہوئی ——— اس نے اپنے ساتھ والیوں سے کہا بہنا مجھ کو جائے ضرور پر جانا ہے کوئی چلتا ہے میرے ساتھ اس نے کہا تجھ کو ہر بار ایسی ہی جگہ پر احتیاج ہوتی ہے بھلا یہ کون موقع ہے شہنشاہ آنے والے ہیں، نہ بی بی ہم میں سے کوئی نہ جائے گا۔ یہ کیا تو نے عادت سیکھی ہے کہ ایک تو آپ جاتی ہے اور دوسرے اور کو لے جاتی ہے۔ ایک عورت نے ان میں سے کہا کہ یہ رنڈی اپنے پیلے چمڑے پر اتراتی ہے۔ اس نازنین نے جواب دیا کہ اُوئی اتنا پھرا!

پوچھنا کہ ساتھ چلو غضب ہوگیا، ہزاروں باتیں تم نے مجھے پکڑائیں، اگر تم میرے ساتھ نہ جاؤگی تو مجھ کو کوئی کھا نہ جائے گا۔"

مگر سب کی زبان عام طور پر مقفیٰ ہوتی ہے مثلاً یہ چند مثالیں[1] ملاحظہ ہوں:-

" اے مردانِ عالم سے آنکھیں چار کر، ہم پر وار کر، غیر ساحر کو دیکھ کر بہت پھولا، اپنی حقیقت بھولا"۔ یا ملک اطلس نے قہقہہ مار کر آواز دی" او افراسیاب کیوں جامے سے باہر ہے ہمارے بندوبست سے نہیں ماہر ہے، ہمارا تیرا چولی دامن کا ساتھ ہے لیکن اب تیرا گریبان ہے اور میرا ہاتھ ہے"۔ یا پھر:- "بےحیائی آنکھوں میں سمائی، کبر و غرور کی مزاج میں رسائی، شیطان کا سگا بھائی"۔

ہر سہ حضرات نے تعریفِ حُسن یا مناظرِ قدرت یا کیفیت عشاق یا رزمیہ بیان میں ایک جیسی تراکیب استعمال کی ہیں اور ایک جیسا انداز پایا ہے۔ ہر نازنین کے حُسن کی ایک جیسے الفاظ میں تعریف کرتے ہیں مثلاً" طاؤس طناز، ماہ رخسار، گلعذار، کبک رفتار، شیریں گفتار، سرو بوستانِ خوبی، غنچۂ حدیقۂ محبوبی، دریائے جواہر میں غوطہ زن، معشوق پُرفن، رشکِ چمن"۔ عاشق کسی محبوبہ کو یوں پکارتے ہیں "اے گُلِ گلزار خوبی، اے سروِ نوخاستۂ حدیقۂ محبوبی، اے سروِ خرامانِ گلشنِ دلفریبی، اے شاخ نہالِ چمنستانِ رنگیں مزاجی"۔ وغیرہ خواجہ عمرو نعرہ بھی کرتے ہیں تو مسجع عبارت میں مثلاً "منم مہر سپہر عیاری و ہزبر دشت طراری، ماہ آسمان مکاری، آفتاب چرخ خنجر گزاری"۔ اگر کسی شاہزادہ کی تعریف کرنی ہو تو اسد بن کرب غازی کی تعریف کو نمونہ سمجھ لیجئے:- "شاہبازِ اوجِ شوکت، عقابِ شکارگاہ جرأت و لیاقت، یکہ تازِ میدانِ جلالت، شہسوارِ معرکۂ ہمت، صاحب جاہ و وقار، اسد نامدار"۔۔۔۔۔

عاشق و معشوق کے فراق یا وصال کے بیان میں بھی وہی مشابہت ہے۔ عورت کے سراپا اور وصل کی کیفیتوں کے بیان کرنے میں کہیں کہیں عریانی سے کام لیا گیا ہے، یہ بات خصوصیت سے محمد حسین جاہ میں پائی جاتی ہے۔

مگر جہاں یہ تصنع موجود ہے وہاں ناموں کی شوکت اور جنگ کی کیفیت بیان کرنے میں یہ لوگ بہت کمال رکھتے ہیں۔ طلسم ہوشربا میں جب افراسیاب سب طرف سے گھر جاتا ہے تو اس کی آخری لڑائی سے وہ شوکت اور جلال ٹپکتا ہے کہ ہر کس و ناکس خواہ دشمن خواہ دوست اس کے سحر سے مرعوب ہو جاتا ہے۔ واقعی یہ لڑائی بہت پُرزور انداز میں لکھی گئی ہے۔ پہلوانوں، جادوگروں اور شہزادیوں کے نام بہت دلچسپ ہیں۔ مندرجۂ ذیل نام ملاحظہ ہوں" شبرنگ سیہ فام سگ پیکر خوک دندان اژدر چشم تیرہ پیشانی جادو"۔ اس کی بیوی کا نام یہ ہے" ظلمات تیرہ فام میمون صورت خرس دندان شیر صولت درازلب بلند بینی جادو"۔ چند پہلوانوں کے نام جو ایک ہی صفحہ سے لئے گئے ہیں یہ ہیں:- "توسن اشہب سوار۔ عیوق برف بار، سالارِ آسمان سیر۔ منقار کرگدن سوار۔ اختر گلگوں پوش، شیدائے بلند آواز اہرام دراز بینی۔ مبہوت شیر پیکر۔ ببرانِ صحرا نورد وغیرہ"۔ فقط ان شہزادیوں کے نام ملاحظہ ہوں جو شاہزادہ اسد بن کرب غازی پر عاشق ہوئیں:- "مہ جبیں الماس پوش۔ لالان خوں قبا۔ لعل سخندان، مواج قطرہ زن، طاؤس پر چہرہ۔ ملکہ ناہید کاکل کشا، ملکہ گلنار گلنار پوش اور ملکہ خورشید روشن جمال" وغیرہ۔

[1] طلسم ہوشربا جلد ہفتم، جلد ششم، جلد دوئم

روزمرّہ تو بالکل لکھنؤ کے انداز میں ہے ۔ خواہ ماں بیٹی کی گفتگو ہو خواہ کنیزوں کی نوک جھونک ، بیوی خاوند سے گلہ کرے خواہ ماں بیٹی کا بین کرے سب نہایت سلیس بامحاورہ اور پُرلطف زبان استعمال کرتی ہیں ۔ بازار کے لوگوں کی گفتگو ، فوجیوں کی تُو تُو مَیں مَیں، شہدوں فقیروں اور گھوسیوں کی زبان ان کے اپنے طبقے کی زبان ہوتی ہے مگر ایک نقص ضرور ہے کہ خواہ حیرت جادو ملکہ طلسم ہوشربا افراسیاب کو دوسری بیوی کر لینے پر کوسے ، خواہ گلچین جادو زوجہ باغبان قدرت وزیر اعظم افراسیاب جادو اپنے خاوند سے تکرار کرے ان میں اور عام طبقہ کی عورتوں کی زبان اور انداز میں کم فرق پایا جاتا ہے ۔ مثلاً حیرت جادو اپنی بہن بہار جادو کو جو شریک عمرو ہے یوں کوستی ہے " ارے تو نا شاد مرے ، اپنی جوانی سے جائے تو موئی میرے وارث کو کوستی ہے ، تیری سلطنت کو خاک میں ملاؤں ، تجھے گہری گور میں توپوں "۔ ناقوس جادو کے مرنے پر اس کی بیوی نے نتھ اتاری ، چوڑیاں توڑیں ، لاشہ پر بین کرنے لگی کہ " ہے ہے وارث میرے ، ہے ہے راج سہاگ میرے ۔ ارے میرے سر سے بادشاہی چتر اُٹھ گیا ، میرا راج لُٹ گیا ، اب میں کس کی رہوں گی ہائے افسوس مجھ کو رانڈ کر گئے ۔ ارے صاحب کچھ میرے لئے کہہ بھی نہ گئے ، اس لونڈی سے کیا تقصیر ہوئی جو خفا ہو گئے "۔

پھر بھی سید محمد حسین جاہ نے جو زبان میں تماس پیدا کی ہے اور جو نقشے فوجی لوگوں ، میاں بیوی ، خادم و کنیز کے کھینچے ہیں ، وہ لکھنؤ کی تہذیب کے آئینہ دار ہیں ۔ مثال دیتے وقت ایک جادوگر سے جسے عمرو عیار نے اپنی زنبیل میں کچھ عرصہ قید رکھا تھا یہ کہلواتے ہیں " عمرو کی قید بدتر از قید فرنگ ہے "۔ فوج میں بھگدڑ پڑی ہے ۔ محمد حسین جاہ اس حالت کو یوں بیان کرتے ہیں " سب سردار بیدل ہوئے ، رعایا وغیرہ اپنا اپنا انتظام کرنے لگے کہ شاہ طلسم نے ملکہ کو پکڑوا منگوایا ہے مبادا کوئی آفت آ جائے تو اسباب لُٹ جائے گا ، غفلت میں جان جائے گی ، اس سے مناسب ہے کہ اسباب ہٹا دیں ، آپ ٹل بیٹھیں پھر جس راجہ کا راج ہوگا دیکھ لیا جائیگا "۔ یہ خالصتہً ہندوستانی افواج کا نقشہ ہے ۔

غرض یہ کہ اگر آپ جادوگری اور ناممکنات داستان کو ایک لمحہ نظر انداز کر دیں تو عام لوگوں کی زندگی کے بیان پڑھتے وقت آپ کو محسوس ہوگا کہ لکھنؤ کے اطراف کا حال بیان کیا جا رہا ہے [1]

سیّد فیاض محمود

---

[1] یہ مضمون مختصر صورت میں آل انڈیا ریڈیو لاہور سے ۲۵ مئی ۱۹۳۶ء کو نشر کیا گیا تھا ۔

کامنی

(۱)

بدن چرائے، نظر جھکائے
یہ کون نازک سی کامنی ہے؟
خرام کا لوچ کیا ہے گویا
ندی کی خاموش راگنی ہے

حسین قامت کی شوخیوں میں
عجب قیامت کی دلکشی ہے
کہ جیسے چمپا کی نرم ٹہنی،
ہوا کی رو میں لچک رہی ہے

نگاہ اٹھ اٹھ کے رک رہی ہے دراز پلکوں کی چلمنوں میں
کہ جیسے سہمے ہوئے پرندے جھجک رہے ہوں نشیمنوں میں

(۲)

مہین آواز نم لبوں سے
پھوار بن کر ٹپک رہی ہے

بسنت کی چاندنی میں گویا
کسُم سے شبنم چھلک رہی ہے

شباب یوُں مسکرا رہا ہے
رُخ حسیں کی صباحتوں میں
کنوْل کوئی جیسے کھل رہا ہو
سحر کی دوشیزہ طلعتوں میں

سیاہ زلفوں کی کچھ لٹیں مستیوں میں عارض کو چُومتی ہیں
کہ جیسے ساون کی نم گھٹائیں اُفق پہ لہرا کے جھُومتی ہیں

(۳)

عمیق جھیلوں کی ظلمتیں ہیں
سیاہ آنکھوں کی دلکشی میں
شفق کی گلرنگ سُرخیاں ہیں
لبوں کی نورس شگفتگی میں

جمالِ رُخ کے سلونے پن میں
عجب طلسمی صباحتیں ہیں
ملاحت افروز تازگی ہے

حباب کی سی نزاکتیں ہیں

ابھی ابھی سانولا تھا چہرہ، ابھی ابھی رنگ کھل گیا ہے

کہ جیسے کچنار کا شگوفہ کہ مینہ برسنے سے دُھل گیا ہے

(۴)

جبیں پہ معصومیت کی لہریں
نظر میں عفّت کی سادگی ہے
یہ وہم ہے شوق کے فسوں کا
کہ واقعی مُسکرا رہی ہے؛

لبوں پہ ہلکا سا کچھ تبسّم
مگر تبسّم ملُول سا ہے
سُتا ہوُا ہے حسین چہرہ
حسین چہرہ جو پھُول سا ہے

حیا میں کچُھ ایسی تمکنت ہے کہ سب کی آنکھیں جھُکی ہوئی ہیں!!
اگرچہ حیرت کا ہے یہ عالم دلوں میں سانسیں رُکی ہوئی ہیں!!

ذوقی۔

سفینۂ راحل

کبھی کی یاد

(۱)

یاد ہے کچھ؟ اے چاند! وہ نقشہ — اک شب میں اور وہ بُتِ ترسا
آئے تھے یہاں برلبِ دریا — اور اُلفت کا عہد کیا تھا
محرمِ رازِ ہمارا تُو ہے — اس لئے مجھ کو پیارا تُو ہے!!

عندلیب

(۲)

سکوتِ شام تھا، ہم تم تھے، دریا کا کنارہ تھا — جُدا ہونے سے پہلے کس قدر دلکش نظارہ تھا
سفینہ چاندنی کا تھا رواں دریا کے سینے پر — ہمارے عیش کے دِن جا رہے تھے اُس سفینے پر

تابش

سوزِ ناتمام

(۱)

گلستاں گرمیٔ انفاسِ گُل سے تمتما اُٹھا — کہ رُوحِ عشق لے کر زندگانی کا شرار آئی
گھر آیا جھومتا، دُھومیں مچاتا ابرِ آزاری — اور اُس کی پیشوائی کو یہ چشمِ اشکبار آئی
صبا کے مست سحر انگیز جھونکے پے بہ پے آئے — بُھلانے پر بھی یاد اُس بے خبر کی بار بار آئی

حامد علی خاں

(۲)

اندوہ سے ہوئی نہ رہائی تمام شب — مجھ دل زدہ کو نیند نہ آئی تمام شب
چشمک چلی گئی تھی ستاروں کی صبح تک — کی آسماں نے دیدہ درائی تمام شب
تارے سے میری پلکوں پہ قطرے سرشک کے — دیتے رہے ہیں میرؔ دکھائی تمام شب

میر تقی

راحل ہوشیارپوری

اقبال اور گارڈنر

"ایک زمانہ سے میرے نام مسٹر گارڈنر کا یہ خط بزبان انگریزی میری فائل میں پڑا تھا۔ اتفاقاً ایک ساتھ دو ایسی باتیں پیش آگئیں کہ طبیعت خواہ مخواہ مجبور ہوگئی کہ اس کا اردو ترجمہ شائع کردوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ابھی ابھی مسٹر کوئلر کوچ کی کتاب "مضامین گارڈنر" پر میری نظر پڑی، اور اپنے خط کو مضمون کی شکل میں اس میں درج پایا اور دوسرے یہ کہ اس مضمون کے آخری حصہ میں اس مایۂ ناز ہستی کا تذکرہ آگیا ہے جس کے کھو جانے کی تلافی کم از کم اس صدی میں نہیں ہوسکتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارا مضمون اس مرحوم کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ آہ ــــ اقبال!"

کوکب

۱

مائی ڈیر مسٹر گارڈنر!

میں چونکہ انگریزی جریدہ نویسی کی دنیا میں صرف آپ ہی کا قائل ہوں، اس لئے میں نے طے کیا ہے کہ ایک نہایت ہی اہم سوال آپ کے سامنے پیش کروں اور مجھ کو یقین ہے کہ آپ اس کا بہترین جواب دیں گے جس کے بعد ایک طویل مضمون ہندوستانی رسالوں کے لئے قلمبند کروں گا۔ **سوال:** موجودہ ہندوستان میں آپ کس کو سب سے بڑا انسان سمجھتے ہیں اور کیوں؟؟

خاکسار سید ظفر احمد کوکب

۲

فلیٹ اسٹریٹ لندن۔

ڈیر مسٹر ظفر!

یہ ممکن تھا کہ میں بتا سکتا کہ دنیائے جدید کے مشہور اکابر کون کون ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ میں پوئن کارے اور لائڈ جارج، برنارڈ شا اور چارلی چپلن، ٹراٹسکی اور مسولینی اور آئنسٹین اور ردرفورڈ کے موازنے دنیا کے سامنے پیش کرسکتا لیکن آپ کے سوال کا تشفی بخش جواب دینا صرف میرے لئے نہیں بلکہ تمام لوگوں کے لئے غیر ممکن ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم اندازہ کرسکتے ہیں اور اس میں غلطی کا امکان ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا آدمی کسی اور جگہ چھپا رہتا ہے۔ مرنے کے بعد البتہ اس کی شہرت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر آپ شیکسپیئر کو لیجئے۔ کس کو معلوم تھا کہ وہ ایک دن فلکِ شہرت کا سب سے بڑا ستارہ مان لیا جائے گا! اس کے مرنے کے دو سو سال بعد اس کی حقیقت معلوم ہوئی اور اس پر طرہ یہ کہ پہلے پہل غیر ملکی نقادوں نے اس کو ثابت کیا۔ کیا آپ کو تاریخ کے اوراق نہیں

بتاتے کہ زمانہ بعید میں روما کے تخت پر ایک شخص آگسٹس سیزر جلوہ افروز تھا جس کی شہرت تمام عالم میں ایک دیوتا سے کم نہ تھی لیکن اسی زمانے میں ایک معمولی سے صوبہ میں ایک چھوٹا سا بچہ بھی پرورش پا رہا تھا جس کی تقدیر میں یہ لکھا تھا کہ وہ جوان ہو کر دُنیا کا نقشہ بدل دیگا۔ اور سیزر کی روشنی اس کے سامنے بالکل ماند پڑ جائے گی۔ یہ کون تھا؟ (حضرت) عیسٰے (علیہ السلام)!

پھر آپ فرض کیجئے کہ آپ ۱۵۰۰ء میں بمقام ولیڈ ویسٹوک مقیم ہیں اور آپ سے یہی سوال کیا جاتا ہے۔ آپ یقیناً کہیں گے کہ پاپائے روم یا شہنشاہ فرڈیننڈ سب سے بڑی ہستیاں ہیں۔ آپ کو کبھی خیال نہیں ہوتا کہ ایک مشہور شہر کی ایک معمولی گلی میں ایک بچہ جو زندگی کی کٹھن گھڑیاں گزار رہا ہے اُن ظاہری بڑے لوگوں سے حقیقتاً کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر ہے۔ اس لئے نہیں کہ اس نے صرف ایسٹ انڈیز کی نئی راہ نکالی بلکہ اس لئے کہ اس نے امریکہ ایسے ایک عظیم الشان برّاعظم کو دُنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ کیا اس حقیقت سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے کہ اس صدی نے کولمبس کا کوئی دوسرا مقابل پیدا نہیں کیا؟

اچھا آگے چلئے اور سمجھئے کہ ۱۵۳۰ء میں مجھ سے کوئی سوال کرتا کہ اس دَور کے سب سے بڑے لوگ کون کون ہیں۔ بلاشبہ میں کہہ دیتا کہ ہنری ہشتم، چارلس پنجم، اور فرانسس اوّل اور ان میں افضل ترین اور اکبر ترین ہنری ہشتم۔ لیکن یہ میری ایک زبردست غلطی ہوتی کیونکہ دراصل اس کا حقدار ایک دوسرا شخص تھا جو دریائے وسٹولا کے کنارے پیدا ہوا تھا اور جس کا نام کوپرنکس تھا۔ اسی شخص کی بدولت انسان اس دُنیا کو بالکل ایک نئی چیز سمجھنے لگا اور یہ امر واضح اور ثابت ہو گیا کہ اس کے قبل اس زمین کے متعلق جتنے علوم دریافت ہو چکے تھے قطعی غلط تھے۔ یہ زمین جس کو زمانہ ایک وسیع شے سمجھے ہوئے تھا محض ایک ذرۂ بے حقیقت نکل آئی۔ اس زمانے میں اگر یہی کوپرنکس ایسی بات کرتا تو غالباً وہ دُنیا کا افضل ترین انسان نہ سمجھا جاتا۔

اب دوسری مثال آپ اٹھارہویں صدی کی لیجئے۔ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ایسے سوال کے جواب میں ہر سمجھدار انسان پٹ، برک، جانسن، واشنگٹن، نلسن اور نپولین کے نام گنوا دیتا، اس کا خیال کبھی اُس ایک حقیر شخص کی طرف نہ جاتا جو گلاسکو کی یونیورسٹی میں محض ایک مستری کا کام کر رہا تھا لیکن حقیقت پوچھئے تو وہ جیمز واٹ ہی تھا جس کا مقابل آج تک دُنیا پیدا نہ کر سکی۔ اس نے انسان کی سب سے بڑی مخفی طاقت کا انکشاف کیا۔ یہ ریل گاڑی جو پٹڑیوں پر گڑگڑاتی نظر آتی ہے، یہ جہاز جو ہوا اور پانی کی راہ پیمائی کرتا نظر آتا ہے، یہ انجن جو بڑے بڑے کارخانوں کو چلانے میں مشغول ہے، اسی عجیب و غریب انسان کے خیالات پریشاں کے اجزا ہیں۔

اس لئے میں آپ کو صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں آپ کے سوال کا جواب دینے سے قاصر ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک ایسا انسان ہو جو آئندہ مکمل ہونے والے نئے معلومات کے ذخیرے میں چپ چاپ ذہن پردازی کر رہا ہو اور ہو سکتا ہے کہ یہ ایک دا، دُنیا کو ہلا دے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک شاعر ہو یا ایک سائنسدان۔ لیکن ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک سپاہی

یا قومی لیڈر نہیں ہو سکتا۔ یہ لوگ دُنیا میں ایک ہیجان ڈالنا ضرور جانتے ہیں لیکن خاص طور پر یہ کوئی ایسی بات نہیں نکالتے جس پر مستقل طور پر عمل کر کے آئندہ نسل ترقی کر سکے۔ نوع انسان کا سب سے بڑا فرد بہ ظاہر بالکل خاموش ہوتا ہے۔ اس کی آواز دیر میں پہنچتی لیکن پہنچتی ہے تو اس طرح کہ کبھی ختم نہیں ہوتی۔

آپ منصفی کا واسطہ دے کر یہی سوال اپنی قوم کے اکابر سے کر سکتے ہیں۔ کیا اُن کو نہیں معلوم ہے کہ جگدیش بوس، رابندرا ٹاگور اور اقبال کی آواز جو ابھی دھیمے طور پر ان کے کانوں تک پہنچتی ہے بلند ہو گی اور ایسی بلند ہو گی کہ ہمیشہ ایورسٹ کی ہم پلہ رہیگی۔

گو میرا یہ طویل جواب بھی بالکل ناکافی ہے لیکن آپ میری مجبوری سمجھ کر مجھے ضرور معاف فرمائیں گے۔

آپ کا ....

اے۔ ایچ۔ گارڈنر

سید ظفر احمد کوکب

اے ندی

اے ندی تیرے کنارے دن ڈھلے پانی بھرنے آتی تھی لڑکی کوئی

جب بجاتی تھی تُو اپنا جلترنگ چھیڑتی تھی وہ بھی کوئی راگنی

اور یونہی کھوئی ہوئی سی دیر تک کھیلتی رہتی تھی لہروں سے تری

اب کہاں ہے وہ بتا سکتی ہے تُو؟

گیت اُس کا یا سُنا سکتی ہے تُو؟

تاجور سامری

ریل کا راگ

محافظ نے جس وقت سیٹی بجائی — بہ اذنِ سفر سبز جھنڈی دکھائی
سٹیشن سے اُس دم رواں ہو گئی میں — ہوئی تیز پھر اور رواں ہو گئی میں
لگی موج میں آ کے بھرنے سپاٹا — تو میلوں کی منزل کو منٹوں میں کاٹا
چھلاوہ ہوں سیماب پا ہوں ہوا ہوں — بگولا ہوں آندھی ہوں برق و بلا ہوں
مراحل کو پیوستہ للکارتی ہوں میں — دھواں دھار سرگرم رفتار ہوں میں
بصد جوش میں پا بجولاں چلی ہوں — گرجتی ہوئی شکلِ طوفاں چلی ہوں
کئے پے سپر میں نے کتنے ہی جل تھل — چلم چل۔ چلم چل۔ چلم چل۔ چلم چل
عجب زور میں بھر رہی ہوں طرارے — دہن سے نکلنے لگے ہیں شرارے
مری سدِ راہ ہے نہ گنگا نہ جمنا — جو منزل سے چلنا تو منزل پہ تھمنا
میں ندیوں کے پل سے گزرتی ہوں بے غم — زدم دم۔ زدم دم۔ زدم دم۔ زدم دم
مہیا نہ آتی ہوں جب دندناتی — زمیں کی دہلتی ہے یکلخت چھاتی
ہوں پابند گو جادۂ آہنیں کی — ابھی کھینچ دوں گی طنابیں زمیں کی

بہت کم رہی اب تو منزل بلاشک
چھکا چھک، چھکا چھک، چھکا چھک، چھکا چھک

سید حمید کاظمی بی۔ اے
(علیگ)

"سر اقبال دے نال میل"

"پیر خانے" دے اندر

علامہ اقبال علیہ الرحمۃ سے ملاقات کی یہ دلچسپ تفصیل پنجابی رسالہ سارنگ بابت ماہ دسمبر ۱۹۳۰ء میں چھپی تھی۔ اس رسالے کے لیڈیٹر ایک ہندو نوجوان مسٹر ایس۔ ایل۔ پراشر تھے۔ علامہ اقبال سے یہ ملاقات غالباً مسٹر ایس ایل پراشر نے خود کی تھی۔ میں نے اس مقالہ کا لفظی ترجمہ کیا ہے اور حتے الامکان کوشش کی ہے کہ اصل پنجابی اندازِ بیان بڑی حد تک قائم رہے۔ حامد علی خاں

آج ڈاکٹر سر اقبال کا نام دُنیا میں بڑے فخر سے لیا جاتا ہے۔ سارے ہندوستان کو اُس کی ذات پر ناز ہے۔ واقعی اقبال نے پنجاب کو سر اونچا کرنے کے قابل بنادیا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ہم لوگوں کو بہت کم یہ خیال آتا ہے کہ اقبال پنجاب کا رہنے والا اور پورا پکا پنجابی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اقبال کی ساری شاعری اُردو یا فارسی زبان میں ہے۔ اور اُس میں پنجاب کی زندگی یا پنجاب کی خوبصورتی کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اُس کی شاعری کا پیغام کسی خاص ملک کے لوگوں کے لئے نہیں بلکہ ساری دُنیا کے لئے ہے۔ اُس کی نظموں کے مردوں، عورتوں، پرندوں، جانوروں، گھاس بوٹیوں، پھولوں اور پودوں کی کوئی اصلیت نہیں ہوتی۔ یہ سب خیال کی تخلیق ہیں۔ تخیل ہی انہیں پیدا کرتا ہے تخیل ہی مارتا ہے اور تخیل ہی بٹھاتا اور اُٹھاتا ہے۔ اِقبال اپنے تخیل کی دُنیا میں خیالوں کی آمد و شُد کا تماشا دیکھنے میں مست ہو چکا ہے ؎

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندِ دِگر

خیالوں کا یہ کھیل اقبال کے لئے شطرنج کی بازی سے بھی زیادہ پُر لطف ہے، وہ شاہ کو مات کرنے کی دھن میں لگا ہُوا ہے کبھی وقت دم بھر کے لئے وہ حُقّے کا ایک آدھ کش لگاتا ہے اور پھر اپنی بازی میں محو ہو جاتا ہے۔ اُسے کسی دُوسری بات کی سُدھ بُدھ نہیں۔ کوٹھی[1] کا احاطہ ویرانہ سا ہو رہا ہے۔ گرد اور خاک دھول کی کثرت سے جگہ اُجڑی اُجڑی لگتی ہے۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی بیریوں کی ایک قطار کسی خانقاہ کے مجاور کے حجرے کی راہ دکھاتی ہے۔ صفائیوں کا کس کو دھیان ہے؛ کون یہاں بیٹھا گھاس پھوس اُگایا کرے؛ بابا کے حال کی کسی کو خبر بھی ہو!

ہمیں یاد ہے جب ہم اقبال صاحب سے ملنے گئے تو وہ بیٹھک میں ایک آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے، سخت کالر لگا رکھا تھا اور

[1] یہ جاوید منزل سے پہلی کوٹھی کا ذکر ہے۔

پرانے زمانے کا کالا انگریزی سوٹ پہنے حقہ پی رہے تھے شکل وصورت سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ کسی یونیورسٹی کے فلسفے کے استاد ہیں۔ پل بھر کے لئے ہم نے سامنے بیٹھے ہوئے وکٹوریئن سے آنکھ بچا کر کمرے کی چیزوں پر ایک نظر ڈالی۔ ہمارے سامنے ہی انگیٹھی پر ملکہ وکٹوریا کی تصویر پڑی تھی۔ ہم سے مسکرائے بغیر نہ رہا گیا اور ہم نے اُن سے پوچھا "اس تصویر سے کوئی خاص پیار ہے؛ یا کسی خاص مطلب سے یہاں رکھی گئی ہے؟" اُنہوں نے جواب دیا "یہ تصویر ایک دفعہ میرا بھائی کہیں سے لے آیا تھا اُس نے یہاں رکھ ڈالی ہے۔ اور یہ یہاں پڑی ہے میں نے تو کبھی خیال ہی نہیں کیا کہ ہے بھی یا نہیں۔" یہ اقبال کا حال ہے۔ وہ اپنی دُنیا میں مست ہے اُسے باہر کی چیزوں کے دیکھنے بھالنے کی فرصت ہی نہیں۔

اُنہوں نے خود ہی ہمیں بائیں ہاتھ کی دیوار پر دو میموں کی تصویروں کی طرف توجہ دلائی اور ہنس کر ایک مولوی صاحب کی بات سُنائی؛ "ایک دفعہ ایک مولوی میرے پاس آیا ہوا تھا۔ نماز کا وقت ہوا تو وہ اس کمرے میں نماز پڑھنی شروع کرنے لگا لیکن ان تصویروں کو اپنے سامنے دیکھ کر رُک گیا اور بولا "یہ تصویریں یہاں سے ہٹوا دیجئے"۔ میں نے کہا آپ ان تصویروں کی طرف دھیان ہی نہ کیجئے۔ یہ اس جگہ دیوار کا عیب چھپانے کے لئے لگائی گئی ہیں۔ لیکن مولوی نہ مانا۔"

ہم نے اقبال صاحب سے پوچھا کہ "آپ کا پنجابی بولی کے متعلق کیا خیال ہے؟" ان کا جواب یہ تھا کہ "پنجابی بولی اس وقت علمی زبان نہیں، اس میں نثر بہت کم ہے۔ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ نثر کے لکھے جانے سے یہ علمی زبان نہ بن سکے۔ پنجابی میں "جنگنامے" بہت ہے لیکن اس کی وجہ یہ رہی ہے کہ عام طور پر کم پڑھے لکھے آدمی ہی اسے پڑھتے لکھتے رہے ہیں۔ پڑھے لکھے آدمیوں کی ہمت سے اس میں لطافت اور نزاکت پیدا کی جا سکتی ہے۔ پنجابی میں "بنتر" (Form) پر بہت کم زور دیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بحروں کا لحاظ قائم نہیں رہتا۔ بہاولپور کے احمد یار نے تھوڑی بہت ہمت کی ہے۔ اُس کا دعوے ہے کہ مجھ سے پہلے کسی نے بحر قافیے اور ردیف کا اتنا خیال نہیں رکھا۔ پنجابی شاعری بڑی بڑھیا شاعری ہے اور خاص طور پر جذبات سے بھیگی ہوئی ہے۔ پنجابی شاعری کی زبان بڑی سیدھی سادھی نرم اور میٹھی ہوتی ہے، جذبات سچے ہوتے ہیں اور بڑے کھلے الفاظ میں بیان کئے جاتے ہیں لیکن تشبیہوں میں بعض اوقات مذاق پست ہو جاتا ہے۔ ایک شعر میں نتھ کا بیان کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے ۔

جے بینسری جھمک لباں تے آئی کوئی آب حیات دے پیونے نوں
یا وت پت جلیب حسن دی پئی کڑاہ تلیونے نوں (علی حیدر)

عشق کے رموز پنجابی میں خوب بیان کیا جا سکتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ پنجابی شاعری میں صرف مجازی عشق ہی ہوتا ہے نہیں بلکہ عشق حقیقی زیادہ ہوتا ہے۔ پنجابی شاعری تصوف سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات یوں معلوم ہوتا ہے کہ پنجابی شاعری میں تصوف کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ پنجابی شاعری میں ایک اور خصوصیت ہے اس میں وطن کی محبت کے متعلق بڑے پُرجوش گیت ملتے ہیں فوجی

کہ ... نا ... ر ... در ... مجھ ... کر فتہ ... کا ماندہ ... گنوا رہی -

گیتوں کی بھی کمی نہیں۔ عام لوگوں کے گیتوں اور "بولیوں" کی تو کوئی حد ہی نہیں۔ اُردو میں تصوّف کی شاعری ہے ہی نہیں۔ صرف ایک میر درد کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اُردو میں وطن کی محبت کی شاعری اور قومی گیت بھی نہیں ہیں۔ اُس کی عشقیہ شاعری میں بناوٹ زیادہ اور جذبات کا زور کم ہے۔ عام لوگوں کے گیت تو اس میں بالکل نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُردو شاعری درباروں اور امیروں اور مصاحبوں کے ہاتھوں میں پھلی پھولی ہے۔ وہ لوگ یا تو ایرانی تھے یا ایرانی مذاق کو پسند کرتے تھے۔ اُن کا میل جول عام لوگوں سے نہیں تھا۔ اسی وجہ سے اُردو شاعری میں امیرانہ رنگت آ گئی تھی۔ وہ شعر کہنے کو ایک فیشن سمجھتے تھے۔ شعرگوئی پر قدرت حاصل کرنا ہی شاعری کی خوبی سمجھی جاتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض اوقات صرف بحر، قافیے اور ردیف کی خاطر بناوٹی جذبے اور بناوٹی خیال گھڑنے کی ضرورت پڑتی تھی لیکن پنجابی کے لئے اُردو کی خوبیوں کی ضرورت ہے۔ پنجابی شاعروں کو اُردو شاعروں کی طرح "بندش"[1] پر قدرت حاصل کرنی چاہئے اور اُردو شاعری کی قوّت اور پاکیزگی پنجابی شاعری میں پیدا کرنی چاہئے۔"

ہم نے اقبال صاحب کے بڑھے گاڑھے یار محمد حسین صاحب سے سُن رکھا تھا کہ اقبال صاحب پنجابی شعر پڑھنے سُننے کے بڑے شوقین ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ غلام قادر کی "چٹھیاں"[2] سنتے ہوئے وہ رو پڑے تھے۔ پھر بھی ہم پنجابی شاعری کی حقیقت سے اُن کی یہ واقفیت دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ اُنہوں نے اُردو شاعری سے مقابلہ کرکے دونوں زبانوں کی شاعری کے مذاق کا خلاصہ بیان کر دیا تھا۔ پنجابی شاعری کی بُنیاد عام لوگوں کی زندگی پر ہے اور اُردو شاعری کی بُنیاد امیروں اور مصاحبوں کی زندگی پر۔

اس موقع پر ہمیں بہت افسوس آیا کہ پنجابی کی بہت سی کتابیں گورمکھی حروف میں ہیں جس کے باعث لوگوں کو پنجابی کے علمی خزانوں کا حال معلوم نہیں۔ پنجابی بولی کے متعلق اقبال صاحب کے خیالات سُن کر ہماری ہمت بندھی اور ہم نے پوچھا کہ "کیا آپ کے لئے یہ سوال پیدا نہیں ہوا تھا؟ آپ کو پنجابی زبان میں لکھنے کا خیال کبھی نہیں آیا تھا؟"

اقبال صاحب نے جواب دیا "نہیں۔ میری تعلیم ہی کچھ ایسی ہوئی تھی کہ مجھے کبھی پنجابی لکھنے کا خیال نہیں آیا تھا اور نہ میں اب لکھ سکتا ہوں۔"

ہم نے پوچھا "فارسی میں لکھنے کا خیال آپ کو کس طرح آیا؟" اُنہوں نے جواب دیا "میں نے دیکھا تھا کہ فارسی میں میرے خیالات اچھی طرح ادا ہو سکتے ہیں دوسرے فارسی دُنیا کے بہت سے حصّوں میں سمجھی جاتی ہے۔"

ہم نے کہا "ہمیں تو بڑا افسوس ہے کہ آپ کے سے جاننے اور ماننے ہوئے پنجابی نے اپنی زبان میں نہیں لکھا۔ پنجابی کو تو آپ جیسے آدمی کی ضرورت تھی جس طرح گوئٹے نے اپنے وقت کی بے حقیقت جرمن بولی کو دُنیا کی ایک مسلمہ عظیم الشّان زبان بنا دیا تھا اُسی طرح آپ بھی پنجابی زبان کو ترقی دے سکتے تھے۔"

سر اقبال نے کہا "کوئی بولی بھی ہو ایک زبردست شخصیت اُسے بنا سکتی ہے اور کوئی تعجب کی بات نہیں کہ پنجابی کو بھی کوئی

[1] خیالات و الفاظ کی تراش خراش اور بناوٹ۔ [2] پنجابی گیتوں کی ایک قسم جس میں محبوب کے نام خط لکھا جاتا ہے۔

گوسٹے جیسا آدمی مل جائے۔"

ہم سے یہ پوچھے بغیر نہ رہا گیا کہ "کیا آپ نے یہ محسوس نہیں کیا تھا کہ اپنی شخصیت کا پورا اظہار اپنی زبان کے سوا اور کسی زبان میں نہیں ہو سکتا؟"

اُنہوں نے جواب دیا "میں نہیں مان سکتا کہ اپنی زبان کے سوا آدمی اور کسی زبان میں اپنا مطلب پوری طرح بیان نہیں کر سکتا۔ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ زبان کا سوال اتنا اہم نہیں ہوتا خواہ کوئی زبان ہو صرف مشق ہونی چاہیئے۔ ہر ایک زبان میں لکھا جا سکتا ہے۔ اصل چیز تو خیال ہے۔"

ہم اقبال صاحب کے اس جواب پر حیران ہوئے کہ ایک شاعر کا یہ خیال ہے کہ آدمی اپنی سچ کی زندگی کا "اظہار" پرائی بولی میں کر سکتا ہے۔ مگر ہم سمجھ گئے کہ اُنہوں نے صرف اپنی شاعری کو پیش نظر رکھا ہے جس میں زیادہ تر تخیل کا اُتار چڑھاؤ دکھایا گیا ہے۔

ہم نے پھر کہا "معاف کیجیئے آپ کا یہ عقیدہ کہ زبان کا سوال اتنا اہم نہیں ہوتا ایک ناول یا ڈراما لکھنے والے کیلئے کس طرح درست ہو سکتا ہے؛ ناول یا ڈراما لکھنے والے کو بہر حال لوگوں کی زندگی سے سابقہ پڑتا ہے۔ اُس کے لئے لوگوں کی زبان استعمال کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا "ہاں ناول یا ڈراما لکھنے کے لئے لوگوں کی زبان استعمال کرنی پڑتی ہے۔ اگر کوئی شخص پنجابی ناول یا ڈرامے لکھنا چاہے تو کیا حرج ہے اگر وہ پنجابی میں لکھے۔"

ہم نے کہا "کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر رچرڈ کا خیال ہے کہ ایک بدیشی آدمی دوسرے ملک کی شاعری سے پوری طرح لطف نہیں اُٹھا سکتا۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

اقبال صاحب کے جواب نے ان کی صفائی پیش کر دی۔ اُنہوں نے کہا "میں ایسی شاعری کو شاعری نہیں سمجھتا۔ اصل شاعری روح کی شاعری ہوتی ہے اور وہ ساری دُنیا کے لئے ہوتی ہے۔" گفتگو کا رُخ بدلنے کے لئے اقبال صاحب نے قرآن کی ایک آیت پڑھی جس کا مطلب بابا نانک کے الفاظ میں یہ ہوتا ہے:۔ رل مل بیٹھو صفا بچھائے

یَا اَھْلَ الْکِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمْ (قرآن مجید)

مطلب یہ ہے کہ ہم سب خدا کو مانتے ہیں۔ ہمیں مل جل کر رہنا چاہئے۔ اس لحاظ سے جو بھی خدا کو مانتا ہے وہ مسلمان ہے۔

ہم نے کہا "تو پھر آپ کی شاعری میں مسلمانوں سے خطاب ایسے ہی مسلمانوں کے لئے ہوتا ہے؟"

اُن کا جواب تھا "ہاں آپ نے ٹھیک بوجھ لیا ہے۔"

ہم کہنے ہی والے تھے کہ پھر آپ اپنی شاعری میں مسلمانوں کے پیغمبروں کے نام اور اُن کی روایتیں کیوں لے آتے ہیں کہ اُنہوں نے خود ہی کہہ دیا "میں اپنے ہندو اور سکھ دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ آپ مسلمان ہادیوں اور پیغمبروں کے ناموں کی جگہ بیشک ہندو اور سکھ بزرگوں کے نام استعمال کر لیا کیجئے۔ میں جو مسلمان بزرگوں کے نام لکھتا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ایک مسلمان گھر میں پیدا ہوا اور پروان چڑھا اور میری تعلیم اسلام کی تاریخ اور [illegible]

کچھ مرد بھارکس (بیل گاڑی۔ رتھ) والوں سے معاملہ کرنے اور سائی دینے چلے گئے۔ باقی سودا سُلف خریدنے جا رہے ہیں۔ جھپا جھپ چیزیں منگائی جا رہی ہیں۔ اوڑھنے بچھونے ٹھیک سے کیے جا رہے ہیں۔ رات بھر سونے کی فرصت کم ملے گی۔ آخر ہری مرچیں اور قیمہ بھنی اور بیسنی روٹیاں، اشٹوا اور آم کا اچار بھی تو تیار کرنا ہے! ابھی مرغ نے آمدِ صبح کا اعلان نہیں کیا، تین ہی بجے ہوں گے مگر عورتوں اور بچوں نے ناک میں دم کر دیا ہے کہ "جلدی گاڑی لاؤ، دیر ہو رہی ہے، اتنی دُور جانا ہے سُستی کرو گے تو قطب کیسے پہنچیں گے"؛ مرد کسمساتے اُٹھے اور گجردم مقامی سے حوض پہنچے۔ بھارکس والے بیل جوت رہے ہیں۔ "کہو چودھری! کیا دیر دار ہے؛ آسمان کو تو دیکھو، گھٹا ٹلی کھڑی ہے۔"

"آئیے مولیصاب! البس تیار ہی سمجھئے۔ ارے بخشو ذرا ذلدی (جلدی) کر۔ دیکھ تو ان بچاروں کو خود آنا پڑا!"

ابھی پو نہیں پھٹی، آسمان کے کناروں پر سیاہ بدلیوں کی گوٹ ٹنکی ہوئی ہے۔ دِلی دروازے سے باہر آٹھ دس بھارکسیں آگے پیچھے لین ڈوری بنائے چلی جا رہی ہیں۔ بیلوں کے گھنگرو اور گھنٹیاں اور ہنکانے والوں کی ٹخ ٹخ اور چمکاریں سُنائی دے رہی ہیں۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے۔ بچوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ مرد بھی ہنستے بولتے گاڑیوں کے دائیں بائیں پیدل چل رہے ہیں۔ جب تھک جائیں گے تو دو گھڑی کے لئے سوار ہو جائیں گے۔ جنتر منتر سے آگے نکل کر عورتوں کی بادشاہت ہے۔ کیوں نے بُرقعے اُتار کر گھٹنوں کے نیچے دبا لیے ہیں۔ البتہ دو چار ہچکچا رہی ہیں مگر باقی کیوں چپ رہیں؛ ایک ادھیڑ عمر کی بوڑی بولیں "دئی بوا! یاں کونسا لگوڑا غیر مردوا ہے جو تم اپنا دم گھونٹ رہی ہو؛" دِن ڈھلتے فیروز شاہ کے کوٹلے، پُرانے قلعے، نظام الدین اولیأ اور ہمایوں کے مقبرے ہوتے ہوئے مدرسے (صفدر جنگ) پہنچے۔ بھوک نے بلبلا دیا ہے، اس پر غضب یہ ہے کہ بارش کے ایکا ایکی رُک جانے سے گُجّی گرمی پڑ گئی ہے۔ دوپہر کا کھانا یہیں کھایا جائے گا۔ ذرا دم لے کر پھر لمبا سفر کرنا ہے۔ ان دنوں مدرسے میں میلہ سا لگا ہے، ہر طرف سیلانی جیوڑوں، خوش باش بے فکروں اور بڑی چھوٹی عورتوں کے جمگھٹے ہیں۔ یہ سب بھی یہیں کہیں بیٹھ جائیں گے۔ دسترخوان پھیلا دیا گیا، سب ساتھ مل کر کھا رہے ہیں۔ بڑی بوڑھیاں نکال رہی ہیں، کنواری بیٹیاں ایک ایک کے آگے رکھ رہی ہیں۔ جب سب کھا چکیں گے تو بچا کھچا ان کے حصے میں آئے گا۔ اِسی لئے تو کہتے ہیں ان بچاریوں کو اپنے گھروں میں اچھی طرح کھانے پینے دو، پھر تو یہ ساون کی چڑیاں ہیں، کچھ دنوں میں سُسرال کا ڈولا دروازے آ لگے گا۔ کون جانے یہاں ان کی قسمت میں کیا لکھا ہے! بچے تو بچے ہی ہیں، اُنہوں نے آکر آموں سے اپنے ہاتھ مُنہ سان لئے ہیں تو کیا ہوا، بڑوں کو دیکھو بچوں میں بچے بنے ہوئے آم چوس چوس کر چھلکے اور گٹھلیاں نہر کے پانی میں کیسے خوش ہو ہو کر پھینکتے ہیں۔ بجلی کوندتی دیکھی تو کھا پی سب جلدی جلدی سوار ہو گئے۔ پُروا ہوا چلنے لگی ہے۔ بادل گھر گھر کر آ گئے ہیں۔ کہیں برس گیا تو کچے گھروندوں کو لے بیٹھے گا۔ ابھی تو آدھا راستہ باقی ہے۔ ڈرتے ڈرتے چلنا ہی پڑے گا۔ مطلع ابر آلود ہوتے ہی مور ناچنے لگے ہیں۔ سرسبز جھاڑیں

کے آس پاس طاؤسی رنگ کیا کھل رہا ہے۔ کوئل کی کوک اور پپیہے کی "پی کہاں" سُن کر بیاہی بیٹیوں کو ساجن یاد آرہے ہیں۔ میکے آنے اور ساون منانے کی خوشی میں ایک دُکھ بھری یاد بھی تو شامل ہوگئی ہے۔ مگر کیا کریں، والدین کی خوشی مقدم ہے۔

خدا نے بڑی خیر کی۔ بدلیاں ہوا میں تیرتی رہیں اور بیل گاڑیاں دونوں وقت ملتے صحیح سلامت قطب صاحب پہنچ گئیں۔ اور جو کہیں آج کل کا زمانہ ہوتا تو جان ست ہی ست پر نہ ہوتی۔ موٹر میں بیٹھے اور آنکھ جھپکاتے قطب صاحب پہنچ گئے لیکن اس سے فائدہ تو کچھ نہ ہوتا۔ لطف تو اس میں ہے کہ بھیگ رہے ہیں اور بگڑ رہے ہیں مگر راستہ ہے کہ ختم ہی نہیں ہونے پاتا۔ بیل تو وہی ہولے ہولے ڈگمگ ڈگمگ چلیں گے۔ قطب صاحب کی پشت پر مہرولی ہے جہاں ان دنوں بڑی رونق اور چہل پہل ہوتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے بازاروں کے دونوں طرف دومنزلے ہیں۔ نیچے دُکانیں اور اوپر کوٹھے۔ برسات میں یہ کوٹھے کرائے پر لے لئے جاتے ہیں۔ پھول کی ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ ایک زور کا کڑاکا ہوا اور آنکھوں کو چکا چوند کر دینے والی چمک دیواروں پر سے پھسلتی ہوئی یک لخت غائب ہوگئی۔ پھر تو چھاجوں ہی پانی پڑ گیا، گویا اب برس کر پھر کبھی نہ برسے گا۔ صبح ہوتے تک دُعائیں مانگی گئیں "الٰہی ابھی جھڑی نہ لگے ورنہ ہم بچاریوں کا مزا کرکرا ہو جائے گا!" اللہ میاں عورتوں کی دُعا جلدی قبول کر لیتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دھواں دھار طوفان بوندا باندی ہو کر رہ گیا۔ دُکانیں کھل گئیں، لوگ باگ اِدھر اُدھر پھرنے پھرانے لگے۔ بازاروں کی گہما گہمی سیر و تفریح کی دعوت دینے لگی۔ مرد تنوروں کے گرد بیٹھے ہیں۔ روے میدے کے پراٹھے اور بیسن کی روٹیاں کوا کر لونگ چڑے، شامی کباب، آم اور جامنیں خریدیں گے۔ اتنے میں عورتیں چٹنی، اچار اور سالن تیار کر لیں گی۔ پھر کچھ گھر پر رہیں گے باقی سیر کے لئے نکلیں گے۔ کم از کم آٹھ دس دن ٹھیرنا ہے اس لئے باری باری سب ہی سیر کر لیں گے۔ کسی کی حق تلفی نہیں ہوگی۔ پھر کوئی مُنہ کیوں پھُلائے۔

شمسی باغ کے پیچھے اندھیری باغ میں بڑی بہار رہے۔ دلی والے میلے ٹھیلوں کے رسیا برسات کا لطف اٹھانے آئے ہیں۔ سارا باغ آم اور جامن کے درختوں سے پٹا پڑا ہے۔ امریوں میں آج کل کونے کونے اور چپے چپے پر ہما ہمی ہے۔ کھم گڑے ہیں، جھولے پڑے ہیں، کڑاہیاں چڑھی ہوئی ہیں۔ پکوان ہو رہے ہیں۔ گھٹا جھوم جھوم کر چھا رہی ہے۔ پھوار بھی پڑنے لگی ہے لڑکی بالیاں جھولنے میں مشغول ہیں۔ پینگیں بڑھائی جا رہی ہیں۔ ہنسی مذاق ہو رہا ہے۔ رنگ برنگی کپڑوں اور گنگا جمنی جھولوں نے عجب سماں پیدا کر دیا ہے۔ جھولنے والیاں ہولے ہولے گاتی بھی جاتی ہیں۔ کنواری بچیوں کا گیت سنیئے:۔

ننھی ننھی بوندیاں رے ساون کا مورا جھولنا

ایک جھولا ڈالا میں نے امواکے ڈال پر — چھوٹی بڑی پینگیں رے ساون کا مورا جھولنا

ننھی ننھی بوندیاں رے

بیاہیوں کا گیت مختلف ہے:۔

جھلوا جھولت ناگن ڈس گئی اور ڈس گئی اُنگلی کی پور
ساس جی سے کہیو تہارے پیاں لاگوں اور نند جی سے کہیو سلام
سیاں جی سے کہنا ناگن ڈس گئی جھلوا جھولت ناگن ڈس گئی

کوئی زیرِ لب یہ الاپ رہا ہے :۔

چھائی بدریا کالی

اور کہیں سے یہ گانے کی آواز آرہی ہے :۔

جھولا کن نے ڈالو رے امریاں
دو سکھی جھولیں، دو ہی جھلائیں، چاروں مل گئیاں ۔ شوخ رنگ سیّاں، بھول بھلیاں
جھولا کن نے ڈالو رے امریاں
باغ اندھیری تال کنارے، مُرلا جھنگا رے ۔ بادل کارے برسن لاگیں بوندیں پھوئیاں پھوئیاں
جھولا کن نے ڈالو رے امریاں

قطب صاحب اور مہرولی کی سیر کے بعد دوسری جگہوں کا نمبر ہے۔ اِدھر حوضِ خاص اور منصور کا مقبرہ اور اُدھر تغلق آباد اور اوکھلا خاص مقامات ہیں۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قطب کی لاٹھ تک آئیں اور ان یادگاروں کی سیر نہ کریں ؛ بھری برسات ان مقامات پر رنگ رلیاں اور جشن رہتے ہیں۔ لوگوں کی آرجار میں کوئی فرق نہیں آتا، بلکہ جوں جوں گھٹائیں زیادہ کالی کالی اُٹھتی ہیں سیلانی جیوڑوں کی تعداد بڑھتی ہی جاتی ہے۔

برسات اب بھی ہوتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ جو لطف اگلے وقتوں کے "جاہل اور غریب" لوگوں نے اُٹھالیا ہم "ترقی یافتہ اور دولت مند" لوگ قیامت تک نہیں اُٹھا سکتے۔ وجہ یہ ہے کہ اُس وقت لوگوں کے پوٹے ترتھے۔ دھیلی بارہ آنے کماتے تھے، تو پاؤلی جمع بھی کرتے تھے۔ اور ہمارا حال یہ ہے کہ روپیہ کی آمدنی ہو تو سوا روپیہ خرچ۔ پھر ان کا دل بڑا تھا اور وہ خوشی کے وقت خوش ہونا جانتے تھے۔ آج کل کی طرح نہیں کہ خوش ہونا چاہیں تو بھی معذور ہیں۔ اُن کے سینوں میں طاقت اور جسم میں جان تھی۔ اسی لئے اُن کے قہقہے دیوار کے پیچھے تک سنائی دیتے تھے۔ برخلاف اس کے ہماری ہنسی مدقوق کی کھانسی سے زیادہ نہیں۔

بس بھائی! رات جا چکی۔ صبح کا ستارہ جھلملا رہا ہے۔ صحبتِ شب کے افسانے ختم ہوئے۔ اب چل چلاؤ کا وقت ہے۔ ہم بڈھے ٹھڈے قبروں میں پیر لٹکائے موت کے منتظر ہیں۔ کچھ ہم نے سُنا اور دیکھا تو اگلے وقتوں کے میلے ٹھیلوں کھیل

تماشوں، رنگ رلیوں کی ایک جھلک دکھا بھی دی، کل کوئی یہ جھلک دکھانے والا بھی نہ ہوگا۔

سچ تو یہ ہے، بدنصیب دلی کی داستانیں اب کوئی کتنی ہی عمدگی سے سُنائے، ان میں وہ حلاوت اور پاکیزگی نہیں جو دلی کے اُس ازلی پرستار کی تحریر و تقریر میں تھی جو علامہ راشد الخیری رح کی ہیئت میں جلوہ آرا ہوا اور اب خاک دہلی میں آرام سے محوخواب ہے۔

صادق الخیری

غزل

تمہاری یاد میں ہے روح بے قرار ہنوز
ہے اشکبار مری چشم انتظار ہنوز

مرے چمن پہ ہے چھائی ہوئی خزاں ابتک
مری خزاں نہیں شرمندۂ بہار ہنوز

اگرچہ مدتیں گزریں تمہیں بھلائے ہوئے
تمہارے نام پہ آتا ہے پھر بھی پیار ہنوز

اگرچہ مدتیں گزریں نہیں سلام و پیام
مگر ہے دل کو کسی شئے کا انتظار ہنوز

ملول رُوح میں کوئی خلا سا رہتا ہے
اُسی طرح دلِ محزوں ہے سوگوار ہنوز

وہ شرحِ دردِ محبت جو میں نے کی تھی کبھی
اُس اِک خطا پہ ہوں میں آہ شرمسار ہنوز

اگر دلوں کو نہ تھا کوئی ربط آپس میں
تو پھر ضمیر ہے کیوں رُوح بے قرار ہنوز

سید ضمیر جعفری

اختلاج کے لمحے

دوستو! اس بے دلی کا بھی ہے کیا کوئی علاج ؟ بولتی ہے فاختہ ہوتا ہے مجھ کو اختلاج

چاندنی راتوں میں جب آتی ہے کوئل کی صدا چھاؤں میں تاروں کی یہ کیوں دم اُلجھتا ہے مرا

جھٹپٹے کو گاؤں میں ہوتے ہیں جب روشن چراغ دیکھ کر اُن کو اُبھر آتے ہیں کیوں سینے کے داغ

جھوم کر آتی ہے جب برسات کی پہلی گھٹا دل پہ چھا جاتی ہے کیوں رقت یہ کیا ہے ماجرا

مطربوں کے راگ سے کیوں دل میں چبھ جاتی ہے پھانس جب سنکتی ہیں ہوائیں کیوں اُکھڑ جاتی ہے سانس

شعر سُن کر اُوبھتا ہے دم یہ کیوں بے اختیار اشک بھر آتے ہیں کیوں جب شب کو بجتا ہے ستار

جب کوئی ماضی پہ کرتا ہے خیال آرائیاں وجہ کیا ہے سرد پڑ جاتی ہیں میری اُنگلیاں

قہقہوں کو سُن کے میں آنسو بہا دیتا ہوں کیوں؟

جب کوئی کرتا ہے ماتم مسکرا دیتا ہوں کیوں؟

جلال ملیح آبادی

انقلابِ ایران کا ایک شاعر

آزادیِ تقریر ایشیا کے "رسمی" شعرا کے حصے میں نہیں آئی۔ ان کی قسمت میں کسی بے راہ رو امیر کی مدح خوانی ہے یا کسی حقیقی یا خیالی معشوق کی آستاں بوسی۔ مگر پیغمبرانِ سخن سے کوئی زمانہ خالی نہیں۔ ہر بلا انگیز دور میں جب بیداد و ستم کی حکومت ہو، فرعونی طاقتیں سربلند ہوں اور سچی بات کرنے پر زبان کٹتی ہو، کوئی مردِ خدا رسومِ شاعری اور آدابِ مدح کو بالائے طاق رکھ کر صدائے حق بلند کرتا ہے۔ ایسی مثالیں کم ہوں مگر ملتی ضرور ہیں۔ ہر فرعون کو ایک موسیٰ اور ہر فتنہ کو ایک ربّانی قوت سے زیر ہونا پڑتا ہے۔ فارسی شاعری کی تاریخ بھی ایسی مثالوں سے خالی نہیں۔ فتنۂ تاتار کو جس بیباکی سے سعدی نے للکارا تھا اسے کون نہیں جانتا اور فتنۂ قاچار کو جس طرح ادیب الملک امیری نے دعوتِ مقابلہ دی اس کا بیان ان صفحوں میں آئے گا۔

خاندانِ قاچار اپنے آخری دور میں چنگیز اور ہلاکو کی تباہ کاریوں کی یاد دلاتا ہے۔ اگرچہ روسی جنگوں نے شاہی وقار کو خاک میں ملا دیا تھا اور ملک پے در پے شکستوں سے کمزور ہو چکا تھا اور خزانہ مصارفِ جنگ اور شاہی اسراف کا متحمل نہ ہو سکتا تھا، لیکن قاچاری غرور حسبِ دستور فرعون و نمرود کی روایات کو تازہ کرتا رہا۔ شکست خوردہ شاہ کی بدنصیب رعایا صبر آزما ذلتوں سے دوچار اور زہرہ گداز مظالم کا شکار ہوتی رہی۔ ایک عرصہ تک ان انسانیت سوز مظالم کے خلاف کوئی آواز بلند نہ ہوئی۔ مطلق العنان شاہ اور اس کے نالائق مشیر خداوندِ مطلق بنے رہے اور جمہور خون کے گھونٹ پی کر صبر کرتے رہے لیکن آخر صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور حق اپنی بے سروسامانی کی پروا نہ کرتے ہوئے باطل کی قوتوں سے معرکہ آرا ہوا۔ حق و باطل کی اس جنگ میں سب سے پیش پیش ادیب الملک شیخ امیری فراہانی تھے جنہیں اپنے وقت کا سعدی کہنا چاہیے۔ کیونکہ شیخ شیراز کی طرح شیخ فراہانی بھی انعام و اکرام کی طمع سے بے نیاز ہو کر قید و بند کی سختیوں کو خاطر میں نہ لا کر اعلانِ حق کرنا اپنا فرض ہی نہیں بلکہ مقصدِ حیات سمجھتے تھے۔

حق پرست امیری نے اپنے مقصدِ زندگی کا اعلان ان الفاظ میں کیا ہے: ؎

۱۔ برآنم کہ گر بخت نیرو دہد   ستارہ مرا فال نیکو دہد

میرا ارادہ ہے کہ اگر قسمت یاور ہو   اور ستارہ نیک ہو (تو)

۲۔ برآرم ز بن بیخ بیداد را   بگردوں زنم پایۂ داد را

ظلم و ستم کو جڑ سے اکھیڑ دوں   اور انصاف کا نام بلند کروں

۳۔ بشویم رُخ گیستی از اہرمن | برانم دو از دشت و زاغ از چمن
اہرمن کو دُنیا سے مٹا دوں۔ | دیووں کو صحرا سے اور کوّوں کو باغ سے نکال دوں

اس کے بعد شیخ ملوکیت کے خلاف اپنی مہم کا آغاز کرتا ہے۔ ظالم بادشاہ کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ تم ہر کس خیال میں جو جی میں آتا ہے کرتے ہو، جو مُنہ میں آتا ہے کہہ دیتے ہو۔ ہوش میں آؤ۔ تمہارے سر میں کیا سودا سمایا ہُوا ہے؛

۱۔ بیندیش از انجام بد زینہار | باندیشۂ خود مکن ہیچ کار
اپنے بُرے انجام کا خیال کرو | ہمیشہ اپنی مرضی پر ہی نہ چلو

۲۔ کہ ناید دلت را زیزداں سروش | سخن ز آسمانت بیاید بگوش
تم پر آسمان سے وحی تو نازل نہیں ہوتی | (البتہ) یہ صدا ضرور آتی ہے

۳۔ تو شاہی ہمانا پیمبر نہ | بگو ہر ازیں خلق برتر نہ
تم بادشاہ ہو پیغمبر نہیں ہو | تم ان لوگوں سے بہتر چیز کے بنے ہوئے نہیں ہو۔

عالی نسبی کے دعوے کی دھجیاں بکھیرنے کے بعد شاعر بادشاہ کو اس لطیف نکتہ سے آگاہ کرتا ہے کہ اس کی عظمت کا انحصار رعیت کی بہبود پر ہے۔ رعیت آسودہ ہے تو بادشاہ سربلند ہے۔ اگر رعیت پریشاں حال ہے تو بادشاہ کا تزک و حشم بھی چند روزہ ہے۔ اگر سلطنت انصاف پر مبنی ہے تو وہ چٹان کی طرح ہر سیلِ مخالف کا مقابلہ کرے گی اور اگر اس کی بنیاد انصاف پر نہیں تو سیلاب کا پہلا ریلا اسے خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائے گا۔ بادشاہ کو اپنی سلطنت کی حفاظت کے لئے دہقان کے مضبوط بازو کی ضرورت ہے اور دہقان انصاف کا طالب ہے

۱۔ شاہی بسپاہ است و سپاہی بازر | زر از کفِ دہقاں رسد اندر کشور
سلطنت فوج سے قائم ہے اور فوج روپیہ سے | دہقاں کا ہاتھ بادشاہ کو روپیہ دیتا ہے

۲۔ دہقاں با داد ماند اے شہ بنگر | کایں داد درخت است و شہی او را بر
دہقاں انصاف سے قائم ہے۔ اے بادشاہ دیکھ | کہ انصاف ایک درخت ہے جس کا پھل بادشاہی ہے

شاہ ایران اس منطق کا قائل نہ ہُوا۔ اس نے ایک اور قسم کا باغ لگایا جس کا منظر شاعر نے اس دردناک نظم میں کھینچا ہے

۱۔ بباغ خویش بنازد شہنشہِ ایراں | چنانکہ مانی بر کارخانۂ ارژنگ
شاہِ ایران کو اپنے باغ پر ناز ہے | جس طرح مانی مصور کو اپنے نقش ارژنگ پر

چگونہ باغے کز ہر طرف درونگری | زخونِ بیگنہاں لالہ رستہ رنگارنگ

۳۔ ہمی تو گوئی کا سنجا حدیقۃ الموت است — بجائے سرو دراں نیزہ جائے سبزہ خدنگ

یہ گمان ہوتا ہے کہ گویا موت کا باغ ہے — جہاں سرو کی جگہ نیزہ اور سبزہ کی جگہ تیر ہیں

۴۔ بجائے نار دلِ بیدلاں طپیدہ بخوں — بجائے تاک سرِ خستگاں ز دار آونگ

جہاں انار کی جگہ خوں شدہ دل ہیں — اور انگور کے خوشوں کی بجائے غریبوں کے سر دار (ختول) پر لٹک رہے ہیں

۵۔ ریاضِ آں ہمہ آگندہ از بلاد نقم — حیاضِ آں ہمہ انباشتہ بزہر و شرنگ

اس کے باغ مصیبتوں اور بلاؤں سے پٹے پڑے ہیں اور اُس کے حوض زہر اور اندرائن سے بھرے ہوئے ہیں

۶۔ زسیلِ اشکِ یتیماں و خونِ مظلوماں — بگل فرو درود پائے اسپ تا آرنگ

یتیموں کے آنسوؤں اور بے گناہوں کے خون سے — گھوڑا تا بہ کمر کیچڑ میں دھنس جاتا ہے

فرائض شہنشاہی سے یہ مجرمانہ غفلت دیکھ کر شیخ فراہان کے غصہ کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ وہ تاریخ کی عدالت میں شاہِ ایران کا امتحان لیتا ہے اور اس کے لئے مناسب تعزیر تجویز کرتا ہے۔ پہلے وہ قانون کی وضاحت کرتا ہے ؎

۱۔ شہاں را نباید کہ رامش کنند — بگلگشتِ بستاں خرامش کنند

بادشاہوں کو ناچنا گانا نہیں چاہئے — اور نہ اپنا وقت باغوں میں (عیش و عشرت میں) ضائع کرنا چاہئے۔

۲۔ بُتِ سادہ را با شہاں کار نیست — بطِ بادہ را نزدِ شہ بار نیست

حسین معشوق بادشاہ کے لئے نہیں — اور شراب کا داخلہ شاہی مجلس میں ممنوع ہے

۳۔ سرودِ شہاں است گفتارِ پیر — زخوں بادہ و شاہد از تیغ و تیر

بادشاہ کے لئے بوڑھوں کی نصیحت ہی ایک نغمہ ہے — اس کی شراب خون ہے اور تیغ و تیر اس کے معشوق ہیں۔

اس کے بعد شیخ فراہاں فیصلہ سناتا ہے ؎

۴۔ چو شہ تیغ راہشت و ساغر گرفت — بداں تیغ باید سرش برگرفت

اگر بادشاہ تلوار کو چھوڑ کر شراب کا پیالہ اُٹھا لے — تو اسی کی تلوار سے اس کا سر کاٹ دینا چاہئے

ملوکیت کے قتل نامہ پر مہر ثبت کرنے کے بعد شاعر بربادیِ وطن پر آنسو بہاتا ہے اور غدارانِ ملت کے رویہ پر پیچ و تاب کھاتا ہے

۱۔ اے دریغا رفت آں قصرے کہ بود اندر کنارش — دامنِ قلزم زسوے، ساحلِ جیحوں ز یکسو

افسوس! وہ قصر مٹ گیا جس نے ایک طرف قلزم اور دوسری طرف جیحوں کا دامن تھاما ہوا تھا

۲۔ اے دریغا! رفت آں گنجے کہ بردے رشک بروے — دستِ موسٰے یک طرف گنجینۂ قاروں ز یکسو

افسوس، وہ خزانہ لٹ گیا جس پر ایک طرف دستِ موسٰے اور دوسری طرف گنجِ قاروں رشک کرتے تھے۔

۳۔ زیں تجارت آتشم در دل فروزد چونکہ بینم — سودِ سوداگر ز سوئے حسرتِ مغبوں زیکسو

اس تجارت کو دیکھ کر میرا دل جل جاتا ہے — کہ ایک طرف سوداگر نفع اٹھاتا ہے دوسری طرف جس کا مال گیا ہے وہ ہوتا ہے

تیسرے شعر میں ان وطن فروشوں کی طرف اشارہ ہے جو شیر و آفتاب کی سرزمین کو اغیار کے حوالے کرنے پر رضامند ہو گئے تھے۔

شیخ فراہان وطن کی حفاظت کے لئے ہر ممکن قربانی کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس کا ہر شعر مردانہ جذبات کو ابھارتا ہے اور قوتِ عمل کو اُکساتا ہے۔ اس کا سادہ اور پُرجوش اندازِ تحریر اثر دکھائے بغیر نہیں رہتا۔ ہر ایرانی کا دل اس کے اشعار سُن کر تڑپتا ہے اور ایران کے ہر گوشہ میں اس کا نعرۂ جنگ گونجتا ہے :۔

۱۔ ز مرگ‌ اں میندیش و با عزم باش — شب و روز آمادۂ رزم باش

موت سے نہ ڈرو اور ارادوں کو کمزور نہ ہونے دو۔ — ہر وقت جنگ کے لئے کمربستہ رہو

۲۔ چرا باید اندیشہ کردن ز جنگ — نہ ما از کلوخیم و دشمن ز سنگ

جنگ سے ڈرنا فضول ہے۔ — نہ ہم کچی مٹی کے بنے ہیں اور دشمن پتھر کے

۳۔ چرا تن بہ زنجیرِ دشمن دہیم — بزندانِ اہرمیناں تن دہیم

ہم دشمن کی زنجیروں کو کیوں قبول کریں — اور اس کے زندان میں رہنا اختیار کریں

۴۔ گر او را بود دست و شمشیر تیز — ترا ہم بود دست و شمشیر تیز

اگر اس کے ہاتھ ہیں اور ہاتھ میں تلوار ہے — تو تمہارے بھی ہاتھ ہیں اور تمہارے ہاتھ میں بھی تلوار ہے

۵۔ مبر ز آشتی نام ہنگام جنگ — مبر دل ز نام و مدہ تن بہ ننگ

جنگ کے وقت صلح کا نام نہ لو۔ دل سے عزت کے خیال کو دُور نہ کرو اور بے غیرتی قبول نہ کرو۔

ان اشعار سے اس نتیجہ پر نہ پہنچنا چاہئے کہ شیخ فراہان کو جنگ کے شعلوں سے عشق ہے اور وہ ہر حالت میں امن سوزی کو جائز سمجھتا ہے۔ یہ خیال سراسر غلط ہے۔ وہ جنگ کو بامرِ مجبوری اختیار کرتا ہے، وہ جنگ کا نہیں بلکہ ان قابلِ قدر اصولوں کا شیدا ہے جن کے لئے جنگ کی جاتی ہے، جن اصولوں کی قیمت ان لاتعداد جانوں سے بھی زیادہ ہے جو جنگ میں قربان کی جاتی ہیں۔ موجودہ زمانے میں جب جنگ کے مہیب بادل فضا میں منڈلا رہے ہیں، شیخ فراہاں کا کلام آفتابِ ہدایت کی حیثیت رکھتا ہے۔ شیخ کو جنگ کی تباہ کاری اور ہلاکت آفرینی کا پورا احساس ہے اس لئے وہ اس کا نقشہ کھینچنے کے لئے ایک صحیح اور سبق آموز پیرایہ اختیار کرتا ہے، ذیل کے اشعار کسی موجودہ یا آئندہ زمانے کی جنگ پر صادق آئیں گے۔

برہم زنند منزل و ماوائے یکدگر — ویراں کنند خیمہ و خرگاہِ خویشتن

ایک دوسرے کے گھروں، شہروں اور اپنے خیمہ و خرگاہ کو تباہ کرتے ہیں

محفلِ ادب

لطائفِ اقبال

(جناب فضل کریم صاحب درانی بی۔ اے)

حسرت صاحب کو اصرار ہے کہ میں اقبال کے متعلق کچھ لکھوں اور مجھے اُردو نویسی کی مشق نہیں۔ علامۂ مرحوم کے ساتھ میری گفتگو عموماً دینی یا سیاسی مباحث پر ہوا کرتی تھی اور یہ دونوں موضوع شیرازہ کے لائحہ عمل سے باہر ہیں۔ اس ازراہِ امتثالِ امر صرف دو ایک لطیفوں پر اکتفا کروں گا۔ جن سے اقبال کی سیرت اور عقاید پر روشنی پڑتی ہے۔

آنحضرت صلعم سے عشق :-

۱۹۳۵ء کے گرما میں ختم نبوت کی بحث بہت گرم تھی۔ علامۂ مرحوم نے اس سال کے ماہ مئی میں قادیانیوں کے خلاف ایک بیان دیا تھا جس نے اس جماعت کے دونوں فریقوں کو ڈاکٹر صاحب سے ناراض کر دیا تھا اور انہوں نے ایک لایعنی بحث چھیڑ دی تھی یاد نہیں علامہ مرحوم نے کس غرض سے طلب فرمایا تھا۔ اتنا یاد ہے کہ گفتگو زیادہ تر ختم نبوت کے مسئلہ پر ہوئی تھی۔ آپ نے مقام نبوت پر تقریر کرتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیق رض کی سیرت سے ایک واقعہ بیان فرمایا اور کہا حضرت ابوبکر رض سے کسی نے پوچھا۔ کیا آپ کو اللہ تعالےٰ کے ساتھ زیادہ محبت ہے، یا اللہ کے رسول کے ساتھ۔ ایک خشک زاہد تو عموماً یہی جواب دے گا کہ مجھے اللہ کے ساتھ زیادہ محبت ہے کیونکہ رسول کے ساتھ زیادہ محبت اس کے نزدیک شرک ہوگا۔ لیکن حضرت ابوبکر نے فرمایا، مجھے اللہ کے رسول کے ساتھ زیادہ محبت ہے۔ کہنے لگے رسول اللہ کی بعثت سے پہلے ہم بھی یہیں تھے اور اللہ بھی یہیں تھا۔ نہ اس نے ہم کو پوچھا نہ ہم نے اس کو پہچانا۔ اب جو اللہ کا رسول آ گیا تو ہم نے اللہ کو پہچان لیا اور اللہ نے بھی ہم کو پہچان لیا۔ علامۂ مرحوم نے فرمایا میں نے یہ واقعہ شعر میں بیان کیا ہے چنانچہ آپ نے دو شعر سنائے۔ علامۂ مرحوم کو آنحضرت صلعم سے عشق تھا اور میرا ایمان ہے کہ حضور صلعم سے عشق ایک انسان کی نجات کے لئے کافی ہے۔ آپ نے ایک شعر تو صاف پڑھ لیا۔ تیسرے مصرعہ پر رقت طاری ہوئی۔ گھگی بندھ گئی۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور بڑی مشکل سے شعر پورا کیا۔ شعر رموزِ بیخودی میں ہیں ؎

معنیٔ حرفم کنی تحقیق اگر — بنگری با دیدۂ صدیق اگر

قوتِ قلب و جگر گردد نبی — از خدا محبوب تر گردد نبی

الارض للّٰہ

علامہ مرحوم نے ایک دن ذیل کا لطیفہ بیان فرمایا:-

جنگ سے غالباً پہلے یا شاید جنگ کے دنوں کا واقعہ ہے۔ پنجاب گورنمنٹ انہار پر مربعہ جات تقسیم کر رہی تھی۔ میں ان دنوں انارکلی میں رہا کرتا تھا۔ ایک دن مغربی پنجاب کے ایک پیر صاحب تشریف لائے۔ عموماً آیا کرتے تھے، شریف آدمی تھے اور میری ان کی دیرینہ ملاقات تھی۔ (ڈاکٹر صاحب نے ان پیر صاحب کا نام و مقام بھی بتایا مگر مجھے یاد نہیں رہا۔) کہنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب مجھے ایک درخواست لکھ دیجئے کہ مجھے بھی کچھ مربعے دیئے جائیں۔ میں نے کہا۔ یہ بھی آپ نے دریافت کر لیا ہے کہ زمین کس کی ہے؛ پیر صاحب میرے سوال سے کچھ پریشان سے ہو گئے اور جلدی میں کہنے لگے۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ میں نے کہا۔ پہلے آپ یہ دریافت کرآئیں کہ زمین کس کی ہے۔ پھر میں درخواست لکھ دوں گا۔ چنانچہ پیر صاحب چلے گئے، دوسرے دن پھر آئے اور کہنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب آپ کا سوال سمجھ میں نہیں آیا۔ زمین گورنمنٹ دے رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ زمین گورنمنٹ کی اپنی ہی ہو گی۔ میں نے کہا۔ شاہ صاحب ایک کتاب ہے بہت پرانی، اس کو لوگ قرآن کہتے ہیں۔ ایک شخص ہمارے یہاں سے دور ملک عرب میں ہوا ہے، اس کا نام تھا محمد صلعم) یہ کتاب اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی تھی، اس کتاب میں لکھا ہے کہ زمین خدا کی ہے۔ اب آپ فرمائیں تو میں اللہ تعالیٰ کے نام چٹھی لکھ دیتا ہوں۔

پیر کے سینے میں ایمان کی روشنی باقی تھی، وہ بے حد متاثر ہوا۔ رو پڑا اور کہنے لگا۔ ڈاکٹر صاحب کوئی درخواست نہ لکھئے میں زمین کے لئے انگریز سے درخواست نہیں کروں گا۔

اتفاق سے پیر صاحب کو دلی جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں فوج میں ان کے بہت سے مرید تھے۔ اُنہوں نے پیر صاحب کی ضیافت کی جس میں اپنے افسروں کو بھی بلایا جن میں کمانڈر انچیف بھی تھا۔ کھانے کے بعد یکایک ایک مُرید نے اُٹھ کر تقریر کی کہ ہم سب لوگ ان پیر صاحب کے مرید ہیں۔ ہمارے پیر کو زمین ملنی چاہئے۔ کیونکہ ان کے لنگر کا خرچ بہت زیادہ ہے، فوجی افسر سادہ لوح ہوتے ہیں اور ان کو اپنے سپاہیوں کی مدارات کا بہت خیال ہوتا ہے۔ قصہ مختصر کمانڈر انچیف نے اپنے طور پر سرمائیکل اوڈوائر لفٹنٹ گورنر پنجاب کو لکھا اور پیر صاحب کو دس مربعہ زمین بغیر درخواست مل گئی۔

شانِ بے نیازی:-

علامہ مرحوم کچھ دن ریاست بہاولپور کے قانونی مشیر بھی رہے تھے۔ ایک دفعہ ریاست کے کسی کام پر ان کو وائسرائے سے ملاقات کے لئے دلی جانا پڑا۔ دورانِ ملاقات میں وائسرائے نے ڈاکٹر صاحب سے کہا۔ کل شام کا کھانا آپ میرے ساتھ کھائیں۔ وائسرائے کی دعوت اہلِ جاہ کے لئے بہت بڑی نعمت ہوتی ہے۔ اس قسم کی دعوت حاصل کرنے کے لئے بڑے بڑے جتن کئے جاتے ہیں۔

پھر ان دعوتوں کا اشتہار اخباروں میں شائع ہوتا ہے۔ سرکاری گزٹ نکلتا ہے اور جن کو یہ نعمت حاصل ہو جائے، وہ اس گزٹ کو حرز جاں بنائے رکھتے ہیں اور پشت در پشت اس گزٹ کی حفاظت کرتے ہیں لیکن ؎

گدائے میکدہ کی شان بے نیازی دیکھ   پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو

علامہ مرحوم نے وائسرائے کی دعوت کا جواب دیا۔ میں کل تک نہیں ٹھہر سکتا۔ میں تو آج شام کو لاہور واپس چلا جاؤں گا۔ وائسرائے نے اصرار کیا کہ ایک دن اور ٹھہر جاؤ۔ کل چلے جانا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ اگر آپ کو کھانا کھلانے پر بہت اصرار ہے۔ تو آج شام کو کھلا دیجئے تاکہ میں رات کی گاڑی میں سوار ہو سکوں۔ لیکن کل تک تو میں ہرگز نہیں ٹھہر سکتا۔ اُدھر سے اصرار، اِدھر سے انکار۔ آخر وائسرائے مجبور ہو گیا، اور پہلے کے تمام انتظامات کو درہم برہم کر کے ڈاکٹر صاحب کے لئے کھانے کا جلدی جلدی اسی دن انتظام کیا گیا اور ڈاکٹر صاحب کھانے کی رسم ادا کر کے اسی شام لاہور روانہ ہو گئے۔ لاہور پہنچے پر ان کو ریاست کی طرف سے ایک تار ملا کہ فوراً بہاول پور پہنچو۔ ڈاکٹر صاحب کو تار دیکھ کر سخت غصہ آیا۔ کہنے لگے ان کمبختوں نے مجھے اپنا نوکر سمجھ لیا ہے۔ میں نہیں جاؤں گا۔ چنانچہ ایک ہزار روپیہ ماہانہ کی آمدنی پر لات ماردی اور استعفا بھیج دیا۔

شہزادہ

ڈاکٹر اقبال

(علی بخش کی زبانی)

(۲)

میاں علی بخش کا قاعدہ ہے کہ وہ علامہ اقبال کی زندگی کے حالات بیان کرتے کرتے غیر متعلق باتیں کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ خیر اس کا تو یہ علاج ہے کہ لکھتے وقت ان باتوں کو قلم انداز کر دیا جائے، لیکن ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ وہ کسی ترتیب سے حالات بیان نہیں کرتے بلکہ ۱۹۰۵ء کے واقعات بیان کرتے کرتے دفعتہً سنہ ۱۹۳۰ء کے حالات بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ علامہ مرحوم کی زندگی کے کسی پہلو کے متعلق اُنہوں نے ایک ملاقات میں چند باتیں کہیں اور چپکے ہو گئے۔ دوسری ملاقات میں اسی موضوع کے متعلق چند اور باتیں بیان کر گئے۔ یہ ظاہر ہے کہ سوانح نگاری کے عام اصولوں کے پیش نظر ان تمام باتوں کو یکجا اور ایک خاص ترتیب سے بیان کرنا چاہیے تھا لیکن اس طرح یہ مضمون میاں علی بخش کا بیان نہ رہتا، بلکہ ڈاکٹر صاحب کی مرتب تاریخ حیات کی صورت اختیار کر لیتا۔ اس لئے میں نے کسی ترتیب کا خیال نہیں رکھا بلکہ میاں علی بخش نے جو جو باتیں کہی ہیں انہیں اسی طرح لفظ بلفظ نقل کر دیا ہے۔

حسرت

یہ بات نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کو اچھے کھانے کا شوق نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ سے بہت خوش خوراک تھے۔ دسترخوان پر ہمیشہ دو

تین قسم کا سالن ضرور ہوا کرتا تھا ۔ البتہ وہ کھاتے بہت تھوڑا تھے ۔ عام طور پر صرف ایک وقت کھانا کھاتے تھے ۔ بہت ہوا تو رات کو نمکین چائے پی لی ۔ صبح کو چائے بھی نہیں پیتے تھے ۔ اکثر اوقات کچھ کھائے پئے بغیر کالج چلے جاتے تھے اور دوپہر کو آ کے کھانا کھاتے تھے ۔

خشکہ ان کی طبیعت کو راس نہیں آتا تھا ۔ اس لئے وہ عام طور پر روٹی ہی کھاتے تھے ۔ شبدیگ کا بہت شوق تھا اور شبدیگ ہمیشہ خشکہ کے ساتھ کھاتے تھے ۔ آخر آخر میں صبح کو چائے بھی پینے لگے تھے اور پلاؤ بھی بڑے شوق سے کھایا کرتے تھے ۔

صبح کی نماز اور قرآن خوانی مدت سے ان کا معمول تھا ۔ قرآن بلند آواز سے پڑھتے تھے ۔ آواز ایسی شیریں تھی کہ ان کی زبان سے قرآن سُن کر پتھروں کے دل پانی ہو جاتے تھے ۔ بیماری کے زمانے میں قرآن پڑھنا چھوٹ گیا تھا ۔ نماز بھی کم پڑھتے تھے ۔ موت سے کچھ عرصہ پیشتر مجھ سے کہنے لگے " علی بخش میرا جی چاہتا ہے کہ آج نماز پڑھوں " ۔ میں نے کہا ۔ آپ پلنگ پر بیٹھ جائیے ۔ میں آپ کو وہیں بیٹھے بیٹھے وضو کرا دیتا ہوں ۔ وضو کر چکے تو میں نے کہا ۔ ڈاکٹر صاحب میں نے مہر صاحب کو لیٹے لیٹے نماز پڑھتے دیکھا ہے خدا جانے یہ کیا بات ہے ! کہنے لگے ، ہاں مجبوری کی حالت میں یہ بھی جائز ہے ۔

جن دنوں ہم بھاٹی دروازہ میں رہتے تھے ایک دفعہ وہ پورے دو مہینے بڑی باقاعدگی سے تہجد کی نماز پڑھتے رہے ۔ ان دنوں ان کا عجب حال تھا ۔ قرآن اس خوش آوازی کے ساتھ پڑھتے تھے کہ جی چاہتا تھا بس سارے کام کاج چھوڑ چھاڑ کر انہیں کے پاس بیٹھا رہوں ۔ اس زمانہ میں کھانا پینا بھی چھوٹ چکا تھا ۔ صرف شام کو تھوڑا سا دودھ پی لیا کرتے تھے ۔ خدا جانے اس میں کیا رمز تھی ۔

جوانی میں ورزش بھی کرتے تھے ۔ بھاٹی دروازے والے مکان میں تو صبح سویرے اٹھ کر ڈنٹر پیلنا شروع کر دیتے تھے ۔ کبھی کبھی مگدر بھی ہلاتے تھے ۔

ڈاکٹر صاحب اورینٹل کالج میں تھوڑے ہی دن رہے ، وہاں سے گورنمنٹ کالج میں چلے گئے ۔ اس زمانے میں سید تقی شاہ ، بابو میراں بخش ، فقیر افتخار الدین اور شیخ عبدالقادر سے ان کا بڑا میل جول تھا ۔ مولوی حاکم علی سے بھی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں ۔ لیکن ان کے وقت کا زیادہ حصہ لکھنے پڑھنے میں صرف ہو جاتا تھا ۔ لکھتے کم تھے ۔ پڑھتے زیادہ تھے ۔ جس کمرہ میں وہ سوتے تھے اس میں ایک بڑی میز پر کتابیں پڑی رہتی تھیں ۔ کبھی کبھی میں ان کتابوں کو ترتیب سے الماری میں رکھ دینے کا ارادہ کرتا تھا تو کہتے تھے انہیں پڑا رہنے دو ۔

کانگڑے کے زلزلہ میں لاہور پر بھی بڑی آفت آئی ۔ شہر میں بہت سے مکان گر پڑے ۔ ہر طرف کہرام مچا ہوا تھا ۔ میرا یہ حال تھا کہ کبھی گھبرا کر کوٹھے پر چڑھ جاتا ۔ کبھی نیچے آ جاتا تھا ۔ جب زلزلہ آیا ۔ ڈاکٹر صاحب اپنے کمرے میں چارپائی پر لیٹے کتاب پڑھ رہے تھے ۔ لیکن جس طرح لیٹے تھے ۔ اسی طرح لیٹے رہے ۔ ذرا ہلے جلے تک نہیں ۔ ہاں میری بے تابی دیکھ کر ایک دفعہ کتاب

پڑھتے پڑھتے سر اُٹھایا اور کہنے لگے۔ علی بخش! یوں بھاگے بھاگے نہ پھرو۔ سیڑھیوں میں کھڑے ہو جاؤ۔ یہ کہہ کر پھر اسی اطمینان سے کتاب پڑھنے لگے۔

زلزلہ کے بعد میں گھر سے نکلا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کے دوست شیخ عبدالقادر کا مکان گر پڑا۔ شیخ صاحب اس وقت ولایت میں تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ خبر سُن کر بہت افسوس ہوا اور اسی وقت انہیں یہاں کے سارے حالات لکھ بھیجے۔

ایک دفعہ میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب پلنگ پر بیٹھے ہیں۔ سامنے کاغذ اور پنسل ہے۔ کبھی کچھ سوچنے لگتے ہیں۔ کبھی کاغذ پنسل سے کچھ لکھ لیتے ہیں۔ کبھی پیشانی پر بل پڑے ہوئے ہیں اور سر جھکا ہوا۔ کبھی ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے اور آہستہ آہستہ کچھ پڑھ رہے ہیں۔ اس وقت تو میری سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب شاعر ہیں اور ان کے شعر کہنے کا یہی انداز ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ شعر، شاعر اور شاعری کا مطلب بہت دیر کے بعد میری سمجھ میں آیا۔

شعر کہتے وقت ڈاکٹر صاحب کی عجب کیفیت ہوتی تھی۔ بیٹھے بیٹھے لیٹ جاتے، بار بار پہلو بدلتے، پھر اُٹھ بیٹھتے۔ کبھی چہرہ پر اضطراب ہوتا تھا، کبھی بشاشت۔ ان کے پلنگ کے پاس ایک میز ہوتی تھی۔ اس پر ایک کاپی پڑی رہتی تھی۔ جب شعر کہنے کو طبیعت چاہتی لکھنا شروع کر دیتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی ملنے کو آجاتا تھا تو اسے شعر لکھوا دیتے تھے۔

ایک دفعہ شیخ عبدالقادر کو شعر لکھوانے شروع کئے اور دونوں ساری رات بیٹھے لکھتے لکھاتے رہے۔ صبح ہوتے ہوتے نظم ختم ہو گئی۔ یہ نظم انجمن کے جلسے میں پڑھی گئی۔ مجھے یاد نہیں کہ یہ کونسی نظم تھی، شکوہ؟ نہیں شکوہ نہیں تھا۔ شکوہ جس جلسے میں پڑھا گیا۔ اس میں میں بھی موجود تھا۔ ابھی ڈاکٹر صاحب نے چند شعر ہی پڑھے تھے کہ ایک بوڑھے آدمی نے جس کے بال روئی کی طرح سفید تھے، سبحان اللہ کہا اور جلسہ گاہ کے درمیان میں آگیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ اسے دیکھ کر دوسرے لوگوں پر بھی بہت اثر ہوا۔ کوئی شخص ایسا نہیں تھا جس کی آنکھوں میں آنسو نہ ہوں۔

میں پڑھا لکھا نہیں اور نہ ڈاکٹر صاحب کے شعروں کا مطلب سمجھ سکتا ہوں۔ ان کی باتوں میں ایسی بھیدی ہیں کہ اللہ والے ہی انہیں سمجھ سکتے ہیں۔ مگر شکوہ کے کچھ شعر مجھے بھی یاد ہیں اور اسی زمانے سے یاد ہیں۔

علی بخش نے یہاں پہنچ کے شکوہ سنانا شروع کر دیا۔ اس وقت رات کی تاریکی پوری طرح جاوید منزل پر چھا چکی تھی۔ سپید بیل پایوں والی عمارت تاریک فضا میں سر اُٹھائے کچھ سوچتی اور غور کرتی معلوم ہوتی تھی۔ میں اور علی بخش آمنے سامنے چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ اس کے پہلو میں ڈاکٹر صاحب کا دوسرا ملازم رحمان بیٹھا تھا۔

میں نے کہا "میاں علی بخش۔ اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب کا لباس کیا تھا؟"

وہ کہنے لگا۔ ان دنوں ڈاکٹر صاحب عام پنجابیوں کی طرح شلوار اور قمیص پہنتے تھے قمیص پر کوٹ انہیں فراک کوٹ نہیں۔ یہی عام کوٹ۔ جو آپ اور ہم پہنتے ہیں، لیکن اتنا چھوٹا نہیں، البتہ جاڑے میں وہ بند گلے کا فراک پہنتے تھے۔ سر پر سپید ململ کی پگڑی ہوتی تھی، موتیے رنگ کی پگڑی کا بھی شوق تھا۔ بعد میں ترکی ٹوپی بھی اوڑھنے لگے۔

ڈاکٹر صاحب نے ولایت جانے سے پہلے سوٹ کبھی نہیں پہنا۔ اور سوٹ بھی کبھی کبھار ہی پہنتے تھے، ورنہ انہیں دل سے دیسی لباس پسند تھا۔ ان دنوں گوجر سنگھ کے قلعہ میں نظام الدین نام ایک بڈھا درزی تھا۔ ڈاکٹر صاحب ہمیشہ کپڑے اسی سے سلواتے تھے اسے بھی ڈاکٹر صاحب سے بڑی محبت تھی۔ اور ان کے کپڑے بڑی محنت سے سیا کرتا تھا۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگا "علی بخش میں شیخ صاحب سے بہت ڈرتا ہوں بھئی آخر شاعر ہیں، کہیں غصہ میں آکر میرے خلاف ایک آدھ شعر لکھ دیں تو میں کہیں کا نہ رہوں۔"

سچ پوچھئے تو ڈاکٹر صاحب کو اچھے لباس کا شوق نہیں تھا، جیسا کپڑا کسی نے لا دیا پہن لیا۔ کپڑے پسند کرنے کا کام یا منشی طاہر الدین کے سپرد تھا یا میرے، انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ یہ کپڑا اچھا نہیں۔ اس کا رنگ خراب ہے۔ اصل میں انہیں ان چیزوں کی پرواہی نہیں تھی۔ بیماری کے زمانے میں کچھ انگریز سوداگر[1] قالین لے کے آئے۔ بظاہر ان کے رنگ بہت شوخ اور خوبصورت تھے۔ اس وقت جتنے لوگ پاس بیٹھے تھے، سب نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب انہیں خرید لیجئے، غرض بارہ سو روپیہ کے قالین خریدے گئے۔ لیکن کوئی مہینہ ڈیڑھ مہینہ کے بعد معلوم ہوا کہ یہ کمبخت دگنی تگنی قیمت لے گئے ورنہ قالین بہت گھٹیا ہیں۔

ڈاکٹر صاحب اپنی آمدنی اور خرچ کا حساب نہایت باقاعدگی سے رکھتے تھے۔ منشی طاہر الدین کے پاس آج بھی تیس پینتیس سال کا سارا حساب لکھا ہوا موجود ہے۔ کیا مجال ہے کہ اس میں ایک پائی کا بھی فرق ہو۔ منشی طاہر الدین کو آپ جانتے ہوں گے، وہ مدت تک ڈاکٹر صاحب کے پاس رہے ہیں۔ جب ڈاکٹر صاحب وکالت کرتے تھے تو سارا کام کاج منشی جی کے سپرد تھا لیکن انہوں نے وکالت چھوڑ دی تو منشی جی نے اپنا علیحدہ کاروبار شروع کر دیا۔ لیکن آخری وقت تک حساب کتاب انہیں کے سپرد رہا۔ انہیں اس کام کی باقاعدہ تنخواہ ملتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کے ولایت جانے سے کچھ عرصہ پہلے ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد صاحب پر جو ان دنوں فورٹ سنڈیمن میں انجینئر تھے ایک مقدمہ بن گیا۔ ڈاکٹر صاحب کو اس سلسلے میں بلوچستان جانا پڑا۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ "بلبل کی فریاد" جو ان کی مشہور نظم ہے، انہوں نے راستہ میں ہی لکھی تھی۔ مقدمہ بہت دیر چلا۔ آخر شیخ عطا محمد بری ہو گئے۔ شاید اسی مقدمہ کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو قانون کی طرف توجہ ہوئی اور انہوں نے بیرسٹری کی تعلیم کے لئے ولایت جانے کا ارادہ کر لیا۔ کچھ [illegible]

[1] غالباً یہ سوداگر ہالینڈ کے رہنے والے تھے۔

اُنھوں نے خود جمع کر رکھا تھا۔ کچھ شیخ عطا محمد سے لیا اور ولایت روانہ ہو گئے۔ کانگڑہ کا زلزلہ کس سال آیا تھا؟ ۱۹۰۵ء میں۔ تو زلزلہ سے کوئی سال بھر بعد یعنی ۱۹۰۶ء میں وہ ولایت گئے ہوں گے۔

اصل میں ڈاکٹر صاحب دُنیا دار آدمی نہیں تھے اور دُنیا والوں کے اینچ پینچ اور اُلٹ پھیر انہیں نہیں آتے تھے، وہ کبھی اپنے پاس روپیہ پیسہ نہیں رکھتے تھے۔ منشی طاہر الدین ان کے خزانچی تھے اور ان کے ہاتھوں روپیہ خرچ ہوتا تھا۔ مجھے کئی دفعہ ان کے ساتھ سفر کا اتفاق ہوا ہے۔ سفر میں روپیہ پیسہ بلکہ ریلوے کا ٹکٹ تک میرے پاس رہتا تھا۔ اپنے پاس وہ پھوٹی کوڑی تک نہیں رکھتے تھے۔ انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اُنھوں نے جو نظمیں کہی ہیں ان کو چھاپ کے فروخت کیا جا سکتا ہے۔ کچھ نظمیں شیخ عبدالقادر چھاپنے کو لے جاتے تھے۔ کچھ مولانا ظفر علی خاں کے اخبار میں چھپ جاتی تھیں۔ ان دنوں منشی فضل الٰہی مرغوب رقم ایک خوشنویس ہوا کرتے تھے، اُنھوں نے بھی ڈاکٹر صاحب کی بہت سی نظمیں کتاب کی صورت میں چھاپیں اور ہزاروں روپے کمائے اور شاید انہیں کبھی کتابیں چھاپنے کا خیال ہی نہ آتا۔ بھلا ہو چودھری محمد حسین صاحب کا جنھوں نے ڈاکٹر صاحب کو یہ بات سمجھائی۔

ڈاکٹر صاحب کے ہاں چودھری صاحب کا آنا جانا مدت سے ہے جب وہ کالج میں پڑھتے تھے، اس زمانے میں بھی اکثر آیا کرتے تھے لیکن جب وہ کالج چھوڑ کر ملازم ہوئے تو روزانہ آنے لگے۔ شاید ہی کبھی کوئی ایسا اتفاق ہوا ہو کہ چودھری صاحب نہ آئے ہوں، ورنہ مینہ آئے یا آندھی چودھری صاحب ضرور شام کو ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پہنچ رہتے تھے۔

اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی پہلی کتابیں ہیں جو ڈاکٹر صاحب نے خود چھاپیں۔ ان کے بعد تو سلسلہ شروع ہو گیا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ بانگِ درا چھاپنے کے لئے ڈاکٹر صاحب کو بڑی محنت کرنی پڑی۔ بانگِ درا کی ساری نظمیں مختلف اخباروں اور رسالوں میں چھپ چکی تھیں اور ان میں سے اکثر ایسی تھیں جن کی نقل بھی ڈاکٹر صاحب کے پاس موجود نہیں تھی۔ البتہ بہت سے لوگوں نے ڈاکٹر صاحب کا کلام جمع کر رکھا تھا۔ بڑی مشکل سے یہ ساری نظمیں جمع کی گئیں اور بہت سی کانٹ چھانٹ کے بعد انہیں چھاپا گیا تھا۔

شیرازہ

مطبوعات

طنزیاتِ مانپوری ۔ یہ جناب مانپوری کے چودہ طنزیہ مضامین کا مجموعہ ہے ۔ مضامین دلچسپ اور بعض مقامات پر قابلِ داد ہیں مجلد شائع ہوئی ہے ۔ قیمت درج نہیں ۔ پتہ : منیجر صاحب رسالہ "ندیم" گیا ۔

ہمارے نبیؐ کے صحابہؓ ۔ از محمد اعجاز الحق صاحب قدوسی ۔ یہ کتاب اسوۂ صحابۂ رسولؐ کا دل افروز مرقع ہے ۔ اسلامی روایات کا ایک قابلِ قدر ذخیرہ اس میں موجود ہے ۔ حجم ۱۲۰ صفحے ۔ قیمت ۸ ۔ پتہ : عبدالقادر تاجر کتب چار مینار حیدر آباد (دکن)

سراپائے رسولؐ ۔ یہ بھی اعجاز الحق صاحب کی کتاب ہے ۔ حضورؐ کا حلیۂ مبارک ، عادات و خصائل ، لباس ، معاشرت ، آداب و اطوار اور عام طریقِ زندگی کی مختصر سرگزشت ۔ قیمت ۶ ۔ پتہ : عبدالقادر صاحب تاجر کتب چار مینار حیدر آباد دکن ۔

شمعِ راہ ۔ محمد سجاد مرزا بیگ صاحب دہلوی مرحوم کے مذہبی خطبات کا مجموعہ ۔ حسب ذیل موضوع زیر بحث لائے گئے ہیں (۱) کعبہ ، (۲) شادی ، تدبیر منزل (۳) ذکر میلاد (۴) تعلیم ۔ مضمون پڑھنے کے قابل ہیں ۔ حجم ۱۱۳ صفحات ۔ کاغذ نفیس قیمت ۸ ۔ پتہ : دفتر کتابت صفوۃ اللہ بیگ صاحب صوفی سجاد منزل دہلی ۔

سر سید و حالی ۔ یہ جناب تبسم قریشی کی نظم ہے جس میں سر سید و حالی کے کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ شعر اچھے ہیں ۔ قیمت ا ۔ تبسم قریشی صاحب ناظم بزمِ سیرت گجرات پنجاب سے طلب کیجئے ۔

مولویت اور اسلام ۔ از حاجی نبی احمد صاحب بریلوی ۔ یہ کتاب مولوی حضرات کے خلاف لکھی گئی ہے ۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ خود کام مولویوں کے جہل و توہم پرستی اور خود غرضی نے اسلام کو کیا نقصان پہنچایا ۔ قیمت ۴ ۔ پتہ : حاجی نبی احمد صاحب بریلی ۔

احکام القرآن ۔ بزبانِ اردو ۔ یہ کتاب مسلمانوں کے لئے دستور العمل کا کام دے سکتی ہے ۔ اس میں ۱۱۵ احکام درج کئے گئے ہیں اور ہر جگہ آیت وغیرہ کا حوالہ دیا گیا ہے ۔ مؤلف مولوی حبیب حسین صاحب صدیقی ۔ قیمت ۸ ۔ پتہ : سجاد حسین عبدالرزاق صاحبان ، اودولی ، ضلع بارہ بنکی ۔

النبی الخاتم ۔ سوانح رسولِ مقبولؐ از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی پروفیسر جامعہ عثمانیہ ۔ یہ مختصر مگر جامع اور بصیرت افروز کتاب ہر مسلمان کو پڑھنی چاہئے ۔ حجم ۱۷۰ صفحات ، کاغذ و کتابت نفیس قیمت ۸ ۔ پتہ : مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن ۔

جگ بیتی ۔ یہ ایک نئے طرز کی مثنوی ہے جو اردو مثنوی کی تاریخ میں ایک نیا عہد قائم کرتی ہے ۔ اس کے مصنف اردو کے زبردست عالم اور سرپرست علامہ برجموہن دتاتریا کیفی دہلوی ہیں ۔ مثنوی کا اندازِ نگارش اور طریقِ بیان ہی نیا نہیں بلکہ اس میں

حالات و واقعات بھی بالکل جدید معاشرہ کے ہیں۔ حجم ۶۶ صفحات۔ قیمت درج نہیں۔ پتہ: انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن۔

نغمۂ قصیر : مرتبہ مسٹر من موہن لال ماتھر دہلوی ایم اے پروفیسر اُردو و فارسی، ہندو سبھا کالج امرت سر۔ قیمت قسم اعلیٰ ۱۲؍ معمولی ۱۲؍
اس کتاب میں منشی گوری شنکر صاحب قصیر دہلوی کی بے نظیر ٹھمریاں، دادرے، رنگین ہولیاں، دلکش ملاریں اور بھجن درج ہیں۔
حجم ۱۶۰ صفحات۔ پتہ:۔ کائستھ اُردو سبھا دہلی۔

خادماتِ خلق ۔ بہی خواہِ خلائق خواتین کے حالات مرتبہ مرحومہ سیدہ خاتون صاحبہ، حجم ۱۲۱ صفحات، کتابت طباعت اور کاغذ نفیس
قیمت ۱۰؍۔ پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔ اس کتاب میں ژان دارک، سارہ مارٹن، گریس ڈارلنگ، فرانسس ویلارڈ، سسٹر ڈورا،
مس ویٹیلے، فلورنس نائیٹنگیل، اگنس جونز وغیرہ کے سبق آموز حالات درج ہیں۔ یہ کتاب ہر گھر میں موجود ہونی چاہئیے۔

پیامِ حریت ۔ جناب ظ انصاری کی حریت آموز نظم۔ قیمت ۱؍۔ پتہ: عبدالقدیر صاحب ۲؍۱ شاہ گنج، الہ آباد۔

غالب شکن ۔ از "امام الغزل" میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی۔ حضرت امام الغزل نے اس کتاب میں غریب غالب کے خلاف "چنگیزیت"
کے خوب جوہر دکھائے ہیں، اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ اس کتاب سے کسی قسم کا علمی یا ادبی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ کاش
میرزا صاحب کسی مفید کام میں وقت صرف کریں اور غالب کو مٹانے کے بجائے اُن شعرا کو زندہ رکھنے کی کوشش کریں جن کو وہ اس قابل سمجھتے ہیں۔ پتہ: اُردو

رقصِ حیات ۔ یہ جناب کامدار الدنی کے افسانوں کا مختصر مجموعہ ہے۔ الدنی صاحب ایک نوجوان اور ہونہار افسانہ نویس معلوم
ہوتے ہیں۔ قیمت ۸؍۔ پتہ آفتاب بک ڈپو علی گڑھ۔

حُسنِ کلام ۔ مجموعۂ کلام حضرت ظفر ہاشمی حجم ۱۲۰ صفحات قیمت فی جلد ۸؍۔ پتہ: حضرتِ ظفر۔ رائٹ انسٹیٹیوٹ ۲۱ ایسٹ لنکاشائر
رجمنٹ کسولی۔ حضرتِ ظفر ایک خوشگو نوجوان شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں مذہب تصوف اور تغزل کا امتزاج ہے۔

گلشنِ فانی ۔ مجموعۂ کلام محبب الدین احمد صاحب لدھیانوی تلمیذ حضرتِ بیخود دہلوی۔ حجم ۱۳۰ صفحات قیمت ۸؍۔ مطبوعہ جید برقی پریس دہلی۔
اشعار دلکش ہیں اور زبان صاف ہے۔

ماہِ عرب ۔ سوانح رسول مقبول۔ مؤلفہ سید محمد ہادی بی۔ اے۔ حجم ۸۵ صفحات قیمت ۲؍۔ یہ کتاب بچوں کے لئے بہت مفید ہے،
سادہ اور سلیس زبان میں دلکش طریقے سے لکھی گئی ہے، پتہ: سید محمد ہادی صاحب ہیڈ ماسٹر انجمن اسلام ہائی سکول، احمد آباد۔

گیتا ولی ۔ مصنفہ پنڈت اند جیت صاحب شرما ماچھرہ ضلع میرٹھ۔ قیمت ۴؍۔ یہ گیتوں کا مجموعہ دلکش اور سادہ ہندوستانی زبان
میں لکھا گیا ہے۔ گیت پڑھنے کے قابل ہیں۔ جنابِ مصنف سے طلب کیجیے۔

نواب حیدر علی خاں اور ٹیپو سلطان کے شاہکار ۔ مؤلفہ آر عبد القادر۔ حجم ۲۸ صفحات۔ قیمت ۵؍، پتہ: ہمدرد بکڈپو
نیو مارکٹ بنگلور۔ مسلمانانِ میسور کی ہزار سالہ تہذیب، تمدن، صنعت و تجارت اور زراعت وغیرہ پر تبصرہ آثارِ قدیمہ کے حالات تاریخ

کے شائقین کے لئے قابلِ مطالعہ ہے۔

آفتابِ رسالت۔ یہ سرکارِ دو عالم کی منظوم سیرت ہے مؤلف جناب راؤ بہادر محمد عبدالمجید خاں صاحب ؔ ہیں یہ کتاب مسلمان بچوں کے لئے خاص طور پر مفید ہے۔ حجم ۱۴۸ صفحات قیمت درج نہیں۔ پتہ: سکرٹری بزمِ ادب۔ باغپت ضلع میرٹھ۔

یادگارِ محشر۔ جوانامرگ شاعر عبید اللہ محشر تیمی مرحوم کا مجموعۂ کلام۔ کاغذ کتابت اور طباعت نفیس ہے۔ حجم ۴۸ صفحات۔ پتہ: عاصی پریس گورکھپور۔ یو پی۔

قادیانی قول و فعل۔ اس کتاب میں سلاح الدین صاحب الیاس برنی ایم اے ایل ایل بی علیگ پروفیسر جامعہ عثمانیہ دکن نے دلائل کے ساتھ قادیانی مذہب کو غلط ثابت کیا ہے۔ حجم ۱۰۰ صفحات قیمت ۱۲/ پتہ اکمال احمد صاحب فاروقی بیت السلام حیدر آباد دکن۔

نورِ مشرق۔ مجموعۂ کلام دہر لعل صاحب ضیا ایم اے فتح آبادی۔ ضیا صاحب ایک ہونہار اور نوجوان شاعر ہیں۔ اُن کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی وقت اُردو شاعری میں نام پیدا کر لیں گے۔ حجم ۱۳۶ صفحات۔ قیمت مجلد ایک روپیہ۔ پتہ: گجندر لال صاحب سونی، کٹرہ کرانا، پھاٹک حبش خان، دہلی۔

۱۔ مویشی۔ ۲۔ کسان کے حقوق و فرائض ۳۔ مٹی ۴۔ پنجاب کی فصلیں ۵۔ پنچایت ۶۔ قانون اور پولیس ۷۔ کسان کے دوست پرندے ۸۔ کسان کے دشمن پرندے ۹۔ حکومت اور انسدادِ امراض ۱۰۔ انسان اور شہریت ۱۱۔ عالمِ نباتات، ۱۲۔ کسان اور اُس کا مکان ۱۳۔ آبپاشی ۱۴۔ آلاتِ زراعت ۱۵۔ بُری رسمیں اور اُن کا انسداد ۱۶۔ زمیندار اور اس کے ذاتی معاملات ۱۷۔ کیڑے +

مندرجۂ بالا ۱۷ رسالے ہمیں گورنمنٹ نارمل سکول گکھڑ کی طرف سے موصول ہوئے ہیں۔ ان سب کا تعلق دیہاتی سائنس سے ہے۔ یہ مضمون حال میں پنجاب کے نارمل اور ورنیکلر مڈل سکولوں کے نصاب میں داخل کیا گیا ہے۔ مندرجۂ بالا رسالے گورنمنٹ نارمل سکول گکھڑ کے ہونہار طلبہ کی کاوش سے تیار ہوئے ہیں۔ یہ رسالے اپنے اپنے موضوع کے متعلق بہت مفید اور دلچسپ معلومات سے پُر ہیں۔ زمینداروں اور دیہاتی سائنس کے اساتذہ اور طلبہ کے لئے ان کا مطالعہ خاص طور پر مفید ہوگا۔ زبان صاف ستھری ہے اور جگہ جگہ تصویریں دے کر مضمون کی وضاحت کی گئی ہے۔ ہم نارمل سکول گکھڑ کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اس کے طلبہ اس قدر مفید اور قابلانہ کام کر سکتے ہیں۔ تمام رسالوں کے مجموعہ کی قیمت غالباً ایک روپیہ ہے اور گورنمنٹ نارمل سکول گکھڑ ضلع گوجرانوالہ پنجاب سے مل سکتے ہیں۔

انتظامِ کتب خانہ۔ قیمت ۴/ اس کتاب میں کتب خانے کے انتظام کے متعلق مفید ہدایات درج ہیں۔ محبوبیہ کارخانہ جلد سازی حیدر آباد دکن سے طلب کیجئے۔

نظمِ اقبال۔ مرتبہ تصدق حسین صاحب تاج۔ یہ وہ دو نظمیں ہیں جو علامہ اقبال نے ۱۹۱۰ء میں سفرِ حیدرآباد کے تاثرات کے طور پر لکھیں۔ نظموں کے متعلق سر عبدالقادر اور علامۂ اقبال کی مختصر تحریریں بھی ساتھ شامل ہیں۔ پہلی نظم کا عنوان "شکریہ" ہے اور یہ مہاراجہ سرکشن پرشاد کے متعلق ہے، دوسری نظم گورستانِ شاہی شاہانِ گولکنڈہ کے مزاروں کو دیکھ کر لکھی ہے۔ قیمت ۴ر۔ پتہ: احمدیہ پریس چارمینار حیدرآباد دکن۔

تین افسانے۔ یہ سر عبدالقادر کے حسبِ ذیل تین افسانوں کا مجموعہ ہے (۱) تاجدار بیوی کا بے تاج شوہر (۲) وطن آخر وطن ہے۔ (۳) دل ہی تو ہے۔ سر عبدالقادر کا نام ان افسانوں کی خوبی کا ضامن ہے۔ پتہ: احمدیہ پریس حیدرآباد دکن۔

تعلیم بالغاں۔ یہ بڑی عمر کے لوگوں کو اُردو سکھانے کے لئے نہایت کارآمد قاعدہ ہے جو ایس ایم شاہ ولی امینی صاحب بی۔اے آنرز ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ نارمل سکول گکھڑ نے لکھا ہے۔ اس قاعدہ میں بالغوں کی نفسیات کو مدِنظر رکھ کر مناسب طریقہ استعمال کیا گیا ہے اور قاعدے کے اسباق میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ پڑھنے والے جلد نوشت و خواند کے قابل ہو جائیں۔ قیمت ۴ر۔ مصنف سے منگائیے۔

سہ نظمِ ہاشمی۔ یہ مولوی سید ہاشمی صاحب کی تین نظموں کا مجموعہ ہے۔ ہاشمی صاحب جدت پسند اور صاحبِ ذوق لیکن کم گو شعراء میں سے ہیں۔ اُن کی یہ تینوں نظمیں پڑھنے کے قابل ہیں۔ قیمت ۴ر۔ پتہ: انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن۔

آئی سی ایس اور دوسری کہانیاں۔ از سید عباس علی صاحب حسینی۔ یہ ہندوستانی زندگی کے چودہ دلکش مرقع ہیں۔ زبان صاف اور سلیس ہے۔ کاغذ اور کتابت و طباعت اچھی ہے۔ قیمت مجلد ۱عہ۔ پتہ: انڈین پریس الہ آباد۔

میثاق النبیین۔ مولوی عبدالحق صاحب ودیارتھی نے جو سنسکرت اور عبرانی کے فاضل ہیں اس کتاب میں اُن پیشینگوئیوں کا ذکر کیا ہے جو تمام مذاہبِ عالم کی کتابوں میں رسولِ مقبولؐ کی آمد کے متعلق موجود ہیں۔ مذہبی معلومات کے لئے کتاب بہت اچھی ہے حجم ۲۷۲ صفحات قیمت عہ علاوہ محصول۔ دارالکتب اسلامیہ احمدیہ بلڈنگ لاہور سے مل سکتی ہے۔

طب العرب۔ یہ پروفیسر ایڈورڈ جی براؤن کا پہلا طبی تاریخی لکچر ہے جس کا ترجمہ حکیم سید علی احمد صاحب نیرؔ واسطی نے کیا ہے۔ عربی کے طب کے نشوو ارتقاء کے متعلق یہ تاریخی مقالہ بہت قابلِ قدر ہے۔ ترجمہ بہت اچھا ہے اور فاضل مترجم نے جگہ جگہ نہایت اچھے حواشی درج کئے ہیں۔ قیمت عہ۔ پتہ:۔ منیجر رسالہ شمس الاطبا جڑی بوٹی، بھاٹی دروازہ لاہور۔

اسلامی معاشرت۔ یہ کتاب جناب پرویز نے اسلام کے معاشری قوانین کے متعلق لکھی ہے۔ جگہ جگہ قرآن مجید سے استشہاد کیا ہے۔ کتاب پڑھنے کے قابل ہے۔ قیمت ۴ر۔ پتہ: شیخ نفضل الرحمٰن۔ ۴۔ ایل وڈ چوبرجی سٹیٹ لاہور۔

جلد (۳۴)

نمبر (۳)

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ ستمبر ۱۹۳۸ء

تصویر:- معصومیت

شمار	مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ
۱	بزمِ "ہمایوں"	بشیر احمد	۶۳۹
۲	جہاں نما	حامد علی خاں	۶۴۱
۳	"بھین بھرا دے گیت"	"	۶۴۶
۴	شرحِ مبادلہ	شیخ انوار الحق صاحب ایم اے	۶۵۴
۵	فکرِ ہر کس (نظم)	جناب مولانا سید احمد حسین صاحب امجد حیدر آبادی	۶۶۱
۶	اگلے وقتوں کی دِلّی	حضرتِ حفیظ ہوشیار پوری ایم اے	۶۶۴
۷	اُمید (نظم)	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب ایم اے، پی، ایچ، ڈی	۶۷۰
۸	گلنار (افسانہ)	جناب سیّد علی عباس صاحب بی اے	۶۷۱
۹	غزل	معراج الشعراء مرزا عاشق حسین صاحب بزم آفندی اکبر آبادی	۶۸۶
۱۰	واقعاتِ سنہ ہجری پر ایک نظر	جنابِ کامدار الدنی	۶۸۷
۱۱	یادِ اقبال (نظم)	جناب منوہر لال صاحب ہادی	۶۹۸
۱۲	نغمۂ اقبال (نظم)	جناب ہربنس لال صاحب نسیم	۶۹۹
۱۳	ماضی، حال اور مستقبل	"چاند"	۷۰۰
۱۴	محفلِ ادب		۷۰۳
۱۵	مطبوعات		۷۱۰

چندہ سالانہ ۵ر ششماہی ۳ر مع محصول — قیمت فی پرچہ ۸ر

بزمِ ہمایوں

میرے ایک پنجابی پروفیسر دوست جو لُدھیانہ میں خاموشی سے اپنا کام کرتے ہیں مِلّی و مُلکی جھگڑوں سے بھی الگ رہتے ہیں بلکہ جنھوں نے اُردو میں خط لکھنا بھی میری ترغیب پر شروع کیا۔ میری طرف اپنے ایک خط میں ایسے جذبات کا اظہار کرتے ہیں جو جدوجہد کی اس دُنیا میں ایک علمی و ادبی ذوق رکھنے والے شخص کے دِل میں پیدا ہوتے ہیں اور ایک حد تک اُسے اس جدوجہد میں کسی نہ کسی شکل میں حصّہ لینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

مجھے "ڈیر" سے خطاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"یہ ڈیر کچھ ریسمی ڈیر نہیں ہے اگرچہ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اس کا اُردو مترادف کیوں نہیں لکھا۔"

"یہ روٹی کمانے کے لئے تگ و دو بھی ضرورت سے زیادہ تکلیف دہ معلوم ہوتی ہے۔ کبھی کبھی اس سے تنگ آکر خیال کرتا ہوں کہ اگر میرا وقت میرا اپنا وقت ہوتا تو اس کا بہتر استعمال کر سکتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس صحبت میں میری کاہلی کارفرما ہو اور "غمِ روزگار" سے نجات پاکر میں سینکڑوں دوسرے ہندوستانیوں کی طرح نہایت لغو اور ناکارہ زندگی بسر کرتا۔"

"کبھی یہ بھی سوچتا ہوں کہ روٹی کمانے کا تازیانہ میری کاہلی کے دُور کرنے کے لئے لازمی ہی سہی لیکن میری آمدنی قلیل کیوں ہے؟ اب "نافکری" کی آواز میرے دِل کے کانوں میں گونج اُٹھتی ہے اور دِل کی آنکھ میں اُن ہزاروں شکلوں کا تصوّر پھر رہا ہے جو میری آمدنی کے دسویں بارھویں حصّے کے لئے بھی بے تابی کے ساتھ متلاشی ہیں اور پھر یہ مجھ سے کس نے کہا تھا کہ تین نہ چار اکٹھے چھ بچوں کا باپ بن بیٹھوں. . . . ."

"یہ سلسلۂ خیالات ایک گونہ Anti-illiteracy Campaign[1] سے متعلق ہے۔ گزشتہ سال سے میں کالج کے طلباء کو اَن پڑھوں کے پڑھانے کے لئے تیار کر رہا تھا۔ اس سال گرمیوں کی چھٹیوں میں چند طالب علم خدا واسطے اپنے گاؤں یا قصبے کے اَن پڑھوں کو پڑھائیں گے اور میں چھٹیوں کے بارہ ہفتے ضلع کا گشت کیا کروں گا۔ کہیں خود بھی پڑھاؤں گا کہیں طالب علموں کی مدد کروں گا اور یہ بھی کوشش کروں گا کہ یہ کام کالج کھلنے کے بعد گاؤں کے پڑھے لکھے خود جاری رکھیں۔ طالب علموں کی ٹولیاں بنانے اُنہیں ضروری ہدایات دینے، اُنہیں پڑھانے کے طریق سکھانے میں رات کے گیارہ بارہ یونہی بج جاتے ہیں۔

یہ کام ہے بڑا نیک لیکن مشکل بھی بہت ہے۔ مجھے ہنسی آتی ہے کہ مرکزی حکومت مغرب سے ماہرین اس قدر روپیہ صرف کرکے بلواتی ہے کہ وہ ہمیں نئے نئے تعلیم کے طریقے اور نصاب بتلائیں گویا ہندوستانی یا ہندوستان میں ملازم انگریز قطعی لاعلم اور بے وقوف ہیں اور نہیں

[1] جہالت کے خلاف جہاد

آج تک یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ تعلیم و تعلّم چیز کیا ہے۔ موجودہ طریقِ تعلیم و نصاب کے نقائص کسے معلوم نہیں لیکن اُن کی اصلاح سے بھی زیادہ ضروری چیز ہمدرد حکومت اور بے لوث و شفیق اُستاد کی ہے۔ مرض معلوم ہے حکیم نہیں ملتا اور مریض بھی صد درجہ لاپروا ہے، اگرچہ میں اسے چنداں قصور وار نہیں ٹھہراتا۔ گاؤں کا رہنے والا صدیوں کی جہالت و غفلت اور اس سے بھی بڑھ کر دوسروں کی خود غرضیوں کا شکار بنا رہا ہے؛ جو بھی اُس کے پاس جاتا ہے عموماً کسی ذاتی مقصد کو لئے ہوئے جاتا ہے اور اُس کی قربانی سے اپنی فلاح ڈھونڈتا ہے، پھر کیا عجب کہ دیہاتی ایسی اصلاح اور ایسے مصلحوں سے بیزار ہے اور اُن کی باتوں پر کان نہیں دھرتا۔ مجھے یقین ہے کہ سچی ہمدردی اور بے غرض خدمت اُس کے دل میں گھر کر سکتی ہے۔ کتنا آسان ہے اُس کی خامیوں گناہوں اور جُرموں پر ہنسنا! کسی چائے پارٹی میں صوفوں کے نرم نرم گدیلوں پر بیٹھ کر یا سرمایہ داری کی دُنیا کے سامانِ عیش و عشرت مہیا پا کر یا اتفاقیہ حکومت کی کُرسی پر بیٹھ کر اُس کی غلاظت جہالت توہمات رسم و رواج قرض، لڑائیاں، جھگڑے قتل کس قدر مکروہ اور قبیح معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ کبھی کسی نے سوچا کہ اگر ہماری بود و باش بھی انہیں حالات میں ہوتی تو پھر؟ اُس آدمی کے لئے جس کی رُوحانی آنکھ تعصب اور تنگ نظری نے بالکل بند نہیں کر دی یہ کافی تکلیف دہ اور پریشان کُن سوال ہے!

میں دیہات کے رہنے والے کی خامیوں اور جُرموں سے ہمدردی نہیں رکھتا لیکن خود اُس سے ضرور رکھتا ہوں اور یہ بھی خوب جانتا ہوں کہ اُس کی اس حالت کی ذمہ داری زیادہ تر سرمایہ داروں پر یا سوسائٹی یا حکومت پر ہے۔ لہٰذا اُسے اُبھارنے اور غفلت اور جُرم کے گڑھوں سے نکالنے کا فرض بھی بدرجۂ اتم اِن پر عائد ہوتا ہے۔

اُس کی اصلاح کے لئے کئی سالوں کی متواتر اور بے غرض محنت اور خدمت درکار ہے اور اگر یہ میسّر نہیں تو محض نیک الفاظ یا خواہش نہ کبھی کچھ کر سکی ہیں اور نہ کر سکیں گی۔ میں عموماً نا اُمید نہیں ہوتا، شکست بھی حتےٰ الامکان نہیں مانتا لیکن یہ ڈر مجھے ضرور ہے کہ اگر اب بھی یہ پڑھانے کا زور شور محض تجویزوں کے دکھلاوے اور رپورٹ بازی میں ختم ہو کر رہ گیا تو کئی ایک دِل سے کام کرنے والوں کو نہ صرف صدمہ ہوگا بلکہ کام کرنے میں اُن کے حوصلے بھی کچھ نہ کچھ پست ضرور ہو جائیں گے۔ دُعا کریں کہ جس نیک جوش سے اس کام کو ہم پنجابی اور دوسرے صوبوں والے شروع کر رہے ہیں وہ بڑھتا چلا جائے اور ہمارے مُلک سے بھی جہالت کی لعنت کچھ تو دُور ہو!"

"یہ خط ضرورت سے زیادہ لمبا ہو گیا ہے۔ اپنی سمع خراشی اور اُردو کے اِس "قتل" کی ذمہ داری آپ پر ہے۔" "بہرحال شاگرد حاضر اور تمنائی ہے، اب اصلاح آپ کے ہاتھ میں ہے۔"

ڈیر سِس! کام کرنے والوں کی باتیں بنانے والے کیا اصلاح کریں گے۔ اور اُردو کے بارے میں تو ہم پنجابیوں کو خاصی آزادی حاصل ہے۔ سو آپ بیدھڑک اُردو میں لکھتے جایئے اور اپنا شہری اور دیہاتی کام کئے جایئے!

بشیر احمد

جہاں نما

میاں محمد شاہنواز مرحوم

افسوس کہ ۱۱ر اگست ۱۹۳۸ء کی صبح کو ۴½ بجے "موتی محل" سولن میں فالج کے ایک ناگہانی حملے سے میاں محمد شاہنواز کا انتقال ہوگیا۔ میاں صاحب اکتوبر ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک کامیاب بیرسٹر ہونے کے علاوہ ایک بہت بڑے زمیندار بھی تھے۔ سیاسیات سے انہیں بے حد دلچسپی تھی۔ چنانچہ وہ آٹھ سال تک مرکزی اسمبلی اور سات سال تک پنجاب کونسل کے ممبر رہنے اور کچھ عرصے تک مرکزی اسمبلی کی معتمدی اور "ایج آف کنسنٹ کمیٹی" کی رکنیت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ اب کئی سال سے مرحوم علالت کے باعث عملی سیاسیات سے علیحدگی اختیار کر چکے تھے اور زیادہ تر صاحبِ فراش ہی رہتے تھے۔

اس دردناک حادثے میں جمہور کے علاوہ اکابرِ ملک نے جن میں وائسرائے، گاندھی، گورنر اور وزرا وغیرہ شامل ہیں محترمہ بیگم شاہنواز سے دلی ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔

علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے انتقال کے بعد ہی میاں محمد شاہنواز کا انتقال خلوص و محبت کے اُس رشتے کی یاد تازہ کر دیتا ہے جو ان دونوں بزرگوں کے درمیان ابتدا سے قائم تھا۔ گزشتہ "یومِ اقبال" کے موقع پر میاں محمد شاہنواز نے علامہ اقبال کی اجازت سے اپنی اراضی میں سے دس مربعے اُن کے صاحبزادے جاوید اقبال کے نام منتقل کر کے اپنی دیرینہ آرزو پوری کی۔ یہ گویا اُس محبت کا عملی ثبوت تھا۔

اب چند سال سے دونوں دوست بیماری کے باعث چلنے پھرنے سے معذور ہو کر خانہ نشیں ہو چکے تھے اور باہمی ملاقاتوں کا سلسلہ بڑی حد تک منقطع ہو گیا تھا لیکن پھر بھی جب میاں صاحب کو علامہ اقبال کی شدید علالت کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے ملازم سے کہا کہ مجھے موٹر میں بٹھا کر جاوید منزل لے چلو۔ موٹر "جاوید منزل" کے برآمدے کے سامنے جا کر رکی تو ڈاکٹر صاحب حسبِ معمول برآمدے میں پلنگ پر لیٹے تھے۔ نہ ڈاکٹر صاحب میں طاقت تھی کہ وہ اپنے دوست کی پیشوائی کے لئے اُٹھیں اور نہ میاں صاحب میں سکت تھی کہ اُٹھ کر اُن تک پہنچیں۔ دونوں دوستوں کی حسرت آمیز نگاہیں ایک دوسرے کی عیادت کر رہی تھیں۔ اس موقع پر علامہ اقبال کی فطری بذلہ سنجی کو تحریک ہوئی اور اُنہوں نے اس ملاقات پر "چکوی چکوے کی ملاقات" کی پھبتی کہی۔

علامہ اقبال کی موت کی خبر میاں شاہنواز سے خاص اہتمام کے ساتھ چھپائی گئی تھی لیکن ایک مہینے کے بعد کسی ملاقاتی نے

بے خبری میں یہ راز فاش کر دیا۔ یہ خبر سُن کر میاں صاحب کو ناقابلِ بیان صدمہ ہوا اور وہ اُسی وقت مرحوم دوست کے بچوں سے ملنے کے لئے کسی نہ کسی طرح "جاوید منزل" میں پہنچ گئے۔

اس کے تقریباً تین ہی مہینے بعد وہ اپنے دوست کے پاس حقیقی جاوید منزل میں جا پہنچے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

نئی ترکی پر ایک نظر

حال میں "مجلسِ ملّی کبیر" کے ایک اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے کمال اتاترک نے کہا کہ ہمارا نصب العین یہ ہے کہ ترکی قوم کو تہذیب اور خوشحالی کے بلند ترین معیار تک پہنچا دیں۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ قول اور عمل کی رفتار یکساں ہو۔ کامیابی کا صرف یہی طریقہ ہے کہ ایک باقاعدہ نظامِ عمل تیار کر کے اس پر پُوری تندہی سے عمل شروع کر دیا جائے۔

ترکی قوم کی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے اتاترک نے کہا کہ کوئی ایسی رُکاوٹ جو ہمارے قومی مفاد کی راہ میں حائل ہو نہ اب برداشت کی جاتی ہے اور نہ آئندہ کبھی برداشت کی جائے گی۔ انقلاب سے ہمارے مُلک میں جو اہم تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں اُن کا قائم رکھنا ہر حال میں ضروری ہے اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے ہر شخص کو مسلسل جدوجہد کرنی چاہیئے۔

حکومت کی زراعتی حکمتِ عملی کا ذکر کرتے ہوئے اتاترک نے کہا کہ ملک میں ایک بھی کاشتکار زمین کے بغیر نہ رہنا چاہیئے اور مناسب ہے کہ یہ زمین ناقابلِ تقسیم قرار دی جائے، بڑے زمینداروں کی ملکیت میں جو زمین رہے اُس کی مقدار بھی حکومت کی طرف ہی سے مقرر ہو گی، اس سلسلے میں یہ بھی لازم ہے کہ زمین کی زرخیزی اور مقامی معاشی حالات مدِّنظر رکھے جائیں۔ چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کو ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی جائے گی، اور انہیں نئے زراعتی آلات مہیا کئے جائیں گے۔ اِن مقاصد کی تکمیل کے لئے اتاترک ملک کو مختلف زراعتی رقبوں میں تقسیم کر دینا چاہتے ہیں۔ ہر رقبے میں کاشتکاروں کی مدد اور رہنمائی کے لئے ایک زراعتی مرکز قائم کیا جائے گا۔

اتاترک نے کہا کہ ترکی کو ہر طرح ترقی یافتہ اور خوش حال بنانے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ صنعتی کارخانوں کو فروغ دیا جائے اور ملک میں جگہ جگہ نئے کارخانے قائم کئے جائیں۔ ہمیں لازم ہے کہ اپنے پہلے پنج سالہ صنعتی منصوبے کو جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچا دیں۔ اور باقی چند مجوّزہ کارخانے بھی جلد قائم کر دیں تاکہ اس کے بعد مزید ترقی کی تجویزوں پر عمل کیا جائے۔

صنعت اور زراعت کی مناسب تنظیم اسی صُورت میں ہو سکتی ہے کہ حکومت ملک کی تجارتی سرگرمیوں کی کڑی نگرانی کرے۔ ہماری بیرونی تجارتی حکمتِ عملی کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ ہم اسے مُلکی اور خارجی معاشی حالات کے مطابق ڈھالتے رہتے ہیں۔

تجارتی مقاصد کو پورا کرنے کے لئے ہمیں جہازوں کی ضرورت ہے۔ ان کے لئے بیرونی ممالک سے انتظام کیا جا چکا ہے اور وہ آئندہ موسم بہار میں ہمیں مل جائیں گے۔ یہ سچ ہے کہ جہازوں کی یہ زائد تعداد بھی ہماری آئندہ بڑھتی ہوئی ضروریات کے لئے ناکافی ہو گی مگر ہمیں اطمینان ہے کہ اپنے منصوبوں پر باقاعدہ عمل کرنے سے ترک قوم جلد ہی ایک بڑی بحری قوم بن جائے گی کیونکہ ہمارے ملک کی تین اطراف سمندر سے گھری ہوئی ہیں۔

اس کے بعد اتاترک نے ترکی کی ان ترقیوں کی طرف اشارہ کیا جو ریلوے کی توسیع سڑکوں اور پلوں کی تعمیر اور قوم میں اپنا نہ ذہنیت پیدا کرنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان تبدیلیوں نے نہ صرف وقت اور فاصلے کی طنابیں کھینچ دی ہیں بلکہ ترکی کی معاشی ترقیوں میں مدد دے کر ملک کو زیادہ طاقت ور اور خوشحال بھی بنا دیا ہے۔

اس کے بعد اتاترک نے ترکی کی قابل اطمینان مالی حالت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا میزانیہ نہ صرف متوازن ہوتا ہے بلکہ اس میں ہر سال ملکی حفاظت اور تعمیری و تجارتی مقاصد کے مصارف کو پورا کرنے کے لئے بھی گنجائش رکھی جاتی ہے۔

تعلیمی ترقیوں کا ذکر کرتے ہوئے اتاترک نے ترکی میں تین نئی یونیورسٹیوں کے قیام کا ذکر کیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے "مجلس تاریخ" اور "مجلس ترقی زبان ترکی" کی سرگرمیوں کو سراہا۔

فوج کا ذکر کرتے ہوئے اتاترک نے اس کی قوت، اس کی تربیت اور اس کی حب وطن کی تعریف کی اور کہا کہ فوج ہی ہمارے ملک کی ناقابل تسخیر محافظ ہے اور یہی اس منظم جدوجہد کے جاری رہنے کی ضامن ہے جو ہم اپنے بلند مقاصد کے لئے عمل میں لا رہے ہیں۔ ہماری ہوائی فوج بھی روز بروز زیادہ تربیت یافتہ ہو رہی ہے اور اس سلسلے میں ہمارا سہ سالہ منصوبہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے مگر آئندہ یہ نہایت ضروری ہے کہ ہمارے تمام ہوائی جہاز اور ان کے انجن ترکی ہی میں بنیں۔

ترکی افغانستان عراق اور ایران کے درمیان اتحاد کے معاہدے کا ذکر کرتے ہوئے اتاترک نے کہا کہ اس سے اخوت اور دوستداری کی اس حکمت عملی پر روشنی پڑتی ہے جو ہم نے مشرقی ممالک میں اختیار کر رکھی ہے۔

آخر میں جمہوری جماعت کے اصولوں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ان اصولوں کو الہامی کتابوں کے آسمانی اصولوں کی طرح نہیں سمجھنا چاہیے۔ ہمارے الہام کا ماخذ آسمان نہیں بلکہ چلتی پھرتی زندگی کا تجربہ ہے۔ ہمارا نظام عمل ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم ملک کے کسی خاص فرقے کی طرف زیادہ توجہ کریں کیونکہ ہم تمام ترک قوم کے خادم ہیں۔

غذائیں اور حیاتین

نئی طب سے اس بات کی تحقیق ہوئی ہے کہ مختلف غذاؤں میں مختلف قسم کی قوت حیات یا غذائی جوہر ہوتا ہے۔ اصطلاحاً

معصومیت
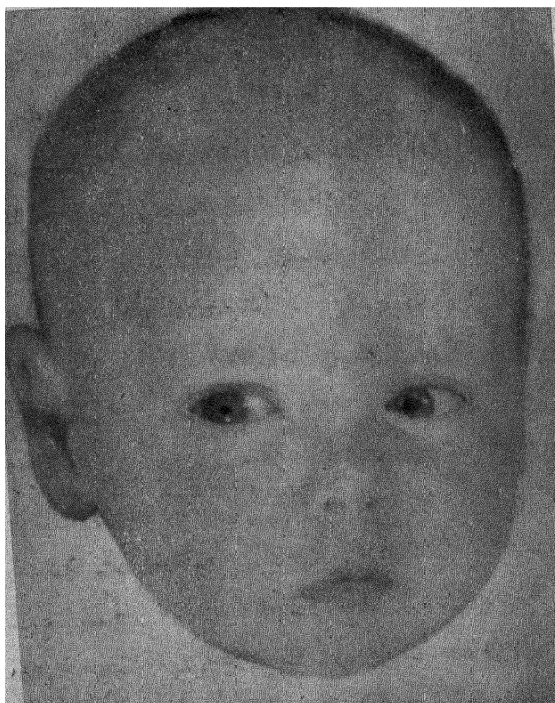
"بھَین بھَرا دے گیت"[1]

پنجابی شاعری میں اپنی ایک مخصوص دلکشی ہے۔ اس میں جذبات کا جو خلوص ملتا ہے وہ زیادہ علمی زبانوں کی شاعری میں قریب قریب ناپید ہے۔ پنجابی بڑے بڑے شہروں اور اُونچے اُونچے محلوں میں رہنے والے اُمراء کی زبان نہیں بہ چھوٹے چھوٹے اور نیچے نیچے کچے گھروندوں میں بسنے والے غریب کسانوں کی بولی ہے۔ جیسے سیدھے سادھے دیہات کے رہنے والے ہیں ویسی ہی سادہ اور تکلف سے پاک اُن کی شاعری ہے۔

علامہ اقبال نے ایک موقع پر اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ "پنجابی شاعری میں شعر کی ظاہری تراش خراش کا زیادہ خیال نہیں رکھا جاتا۔ اسی وجہ سے اس میں بحروں کا بھی کوئی خاص لحاظ نہیں رہا" علامہ اقبال کی رائے بالکل درست ہے لیکن پنجابی شاعری کے اسی عیب نے اُس کی جذبات نگاری میں خلوص اور زبان میں لوچ پیدا کر دیا ہے۔ چنانچہ اسی موقع پر علامہ اقبال نے یہ رائے بھی ظاہر کی تھی کہ "پنجابی شاعری بڑی اچھی شاعری ہے اور اس کا حرف حرف جذبات میں ڈوبا ہوا ہے"۔

سچ تو یہ ہے کہ اگر پنجابی شاعری بھی بعض جدید پنجابی اُدبا کی کوششوں کے طفیل بحروں کی سخت قیود و قافیہ اور عروض کی جکڑبندیوں میں پھنس گئی تو پھر اس کی سادگی اور خلوص بھی اہل علم کی منطقیانہ ظاہر پرستی اور ضابطہ پسندی کی نذر ہو جائے گا اور یہ بھی بعض زیادہ ترقی یافتہ زبانوں کی طرح محض اہلِ علم یا اہلِ دولت کے محدود طبقے کی مصنوعی زندگی کی بے روح تصویر بن جائے گی۔

ملک کے قومی ادب میں دیہاتی گیتوں کی ایک خاص اہمیت ہے۔ ان میں سے بعض گیت بہت پرانے ہیں اور ہمارے قدیم تمدن و معاشرت، رسم و رواج اور ان لکھی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ گیت جہاں ہمیں اپنے بہت سے تمدنی و معاشرتی نقائص کی طرف متوجہ کرتے ہیں وہاں کتنی ہی ایسی خوبیوں کی طرف بھی توجہ دلاتے ہیں جو اب ہماری معاشرتی زندگی کا جزو نہیں رہیں۔

پنجابی گیتوں کی کئی قسمیں ہیں:۔ ہولر، لوری، گھوڑیاں، سہاگ، ڈھولے، ٹپے، ماہیئے، تھال، کلکلی وغیرہ۔ ہر قسم کے گیتوں کا موضوع مخصوص ہوتا ہے لیکن یہاں اس کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ اس وقت ہمیں پنجابی گیتوں کی ایک خاص نوع سے سروکار ہے یعنی "پنجابی بہن کی محبت کے گیت"۔ دنیا کی بہت کم زبانوں میں بہن کی محبت کے ایسے پُرخلوص ترانے مل سکتے ہیں جیسے پنجابی میں ہیں۔ زیادہ علمی زبانوں میں شاعری کی اس شاخ کو ایسی نمایاں حیثیت حاصل نہیں ہے۔

یہ سچ ہے کہ ہر ملک کی بہنوں کو بھائیوں سے محبت ہوتی ہے لیکن ہندوستان اور بالخصوص پنجاب میں دیہات کے خاص معاشری

[1] پنجابی بہن بھائی کی محبت کے گیت

قوانین اور قدیم رسم ورواج کی پابندی نے بھائی کے وجود کو بہن کے لئے اور بھی محبوب تر بنا دیا ہے۔ دیہات میں شادی کے بعد لڑکیوں کی حالت صدیوں سے قابلِ رحم رہی ہے۔ دوسرے اسباب کے علاوہ دیہات کا افلاس وجہالت اور تمدن دُنیا سے علیحدگی بھی اس خرابی کا باعث قرار دی جاسکتی ہے۔ سسرال میں لڑکی کی حیثیت ایک کامٹن یا لونڈی کی سی رہ جاتی ہے۔ ساس سُسر جیٹھ دیور اُنند سب کی خدمت اُس کے سپرد ہوتی ہے اور سب کی ڈانٹ ڈپٹ اور طعن وتعریض اسے برداشت کرنی پڑتی ہے۔ شوہر کی شرافت کا معیار یہ سمجھا گیا ہے کہ وہ اس ظلم وستم کے خلاف بی بی کی حمایت میں ایک حرف تک مُنہ سے نہ نکالے۔ بی بی کو سب سے بُرا کھانے کو اور سب سے بُرا پہننے کو ملتا ہے اور ساس سُسر دیور اور جیٹھ وغیرہ بعض اوقات اسے ذرا ذرا سی بات پر جسمانی سزا بھی دے سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکیاں سُسرال میں رہنے پر موت کو ترجیح دیتی ہیں۔ ساس کے ظلم وستم کا دیہات میں گھر گھر چرچا ہوتا ہے اور اُس کی سخت گیری ہی نے دیہاتی بہوؤں سے اس قسم کے گیت کہلوائے ہیں:۔

نگدی

تے سستے پیر لگ لین دے	اے ساس ذرا میرے قدم بھی یہاں جم لینے دے
تیری گُت گلیاں وِچ رُلدی	پھر تجھے دکھا دوں گی کہ تیری کٹی چوٹی کس طرح گاؤں کی گلیوں میں خوار ہوتی پھرتی ہے۔

دیہات کی لڑکیاں عموماً ساون کے مہینے میں میکے جاتی ہیں۔ اس موقع پر اکثر بھائی ہی بہن کو لینے کے لئے جاتا ہے، چنانچہ بہن اپنے بھائی کو قدرۃً نجات دہندہ اور سُورما سمجھتی ہے اور اسے وِیر یا بِیر یعنی بہادر کہتی ہے اور کیوں نہ کہے کہ بھائی ہی اُس کی حفاظت کرتا ہے۔ سُسرال والوں سے اس کی حمایت میں لڑتا جھگڑتا ہے اور اسے عزت اور قدر ومنزلت سے اپنے ساتھ لے جاتا ہے غالباً انہیں حالات نے دیہاتی بہن کے دِل میں بھائی کی محبت دہ چند کر دی ہے۔ سُسرال کی کیفیت کو پیشِ نظر رکھ کر مظلوم لڑکی کا میکے کی یاد میں تڑپنا آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے جہاں وہ آزادی اور خودداری کی فضا میں بے فکری سے بچپن کے پیارے پیارے کھیل کھیل چکی ہے۔ ساون کے شروع ہوتے ہی دیہاتی دُلہنیں میکے جانے کیلئے بیقراری کے ساتھ بھائی کا انتظار کرنے لگتی ہیں۔

پنجابی شاعری میں بہن کی محبت کا سُراغ جگہ جگہ ملتا ہے۔ مشہور پنجابی نظم ہیر میں مذکور ہے کہ جب ہیر اور رانجھا کے عشق کا راز کُھلا اور لوگوں میں اُن کا چرچا ہونے لگا تو ہیر کا بھائی سلطان غیرت کے مارے اپنی ماں کے پاس گیا۔ وارث شاہ کہتا ہے ؎

سُلطان بھائی آیا ہیر سندا آکھے ماں نوں ہیر نوں تاڑ اماں	جیکر پھیر میں باہر ایہہ ڈِٹھیائی پھیراں ایسدی دھون تلوار اماں
اِہدے گُجھیاں جھنیاں ڈوب دِتا اسیں جگ سنسار خوار اماں	ایہہ دِمی بُریار نہ رکھ ملئے مُوہرا دے کے ایسنوں مار اماں

ترجمہ:۔ ہیر کے بھائی سُلطان نے آ کر ماں سے کہا "اماں ہیر کو سختی سے ڈانٹ ڈپٹ کر رکھ۔ اگر میں نے اب اسے گھر سے باہر قدم رکھتے دیکھ لیا تو تلوار سے اس کی گردن کاٹ دوں گا۔ لوگوں کے چھپواں طعنوں سے میری جان ہلکان ہوئی جاتی ہے اور ہم دُنیا جہان میں ذلیل ہو رہے ہیں۔ اے اماں یہ بدقماش بیٹی زندہ رکھنے

کے قابل نہیں اسے زہر دے کر مار ڈال "

بھائی کی یہ درشت اور ملامت آمیز تقریر سن کر ہیر نے جو جواب دیا وہ جہاں عشق کی سرمستی میں ڈوبا ہوا ہے وہاں اس سے پنجابی بہن کی محبت بھی پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہے ؎

اکھیں لگیاں مڑن نہ ویر میرے بیبا وار گھتی بلہاریاں وے — وہن پئے دریا نہیں کدی مڑدے وڈے لا رہے نس ورتے زاریاں وے
بدی لکھی ہے ایہہ نصیب میرے بھاویں وڈھ توں نال تلواریاں وے — اوّل روز دا لکھیا آن ملیا ہیر گھول گھتی وار و واریاں وے

ترجمہ :۔ میرے پیارے بھائی میں تجھ پر واری جاؤں۔ جب آنکھ کہیں الجھ جائے تو بس نہیں چلتا۔ دریا بہ نکلے تو اس کا رخ کون موڑ سکتا ہے؟ اس کوشش میں بڑے بڑے زور آزمائی کر کے آخر کو رو دھو چکے ہیں تو چاہے مجھے تلوار سے کاٹ ڈال مگر میری قسمت کی لکھی یہ بدی نہیں ٹل سکتی۔ ہیر کی زندگی تجھ پر بار بار قربان ہو بھائی! ازل کا لکھا ہوا آخر پیش آ چکا ہے۔

دیہاتی بہن سسرال میں بھائی کے انتظار کے دن گن گن کر کاٹتی ہے اور اس کی تواضع کے لئے اچھی اچھی چیزیں جمع کرتی رہتی ہے کھانڈ، بادام، گری، چھوہارے، دودھ اور گھی بہت مرغوب غذائیں ہیں۔

ایک پنجابی بہن اپنے بھائی کی راہ دیکھتے دیکھتے تھک جاتی ہے اور بے اختیار اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلتے ہیں ؎

چاندی	چاندی
تے چھیتی چھیتی آ ویرا	پیارے بھائی اب تو ادھر کا رخ کر
میری کھنڈ سسری پئی کھاندی	اب تو تیرا انتظار کرتے کرتے میری کھانڈ بھی اتنی پرانی ہو گئی ہے کہ اس میں سرسریاں سرسرانے لگی ہیں۔

یہ ٹپہ ہے۔ ٹپوں کا ابتدائی لفظ محض قافیہ ملانے کے لئے مہمل طور پر آتا ہے۔

ایک اور بہن کہتی ہے ؎

چھاواں	چھاواں
تے کھوہ وچوں کڈھ ویر دے	اے میرے بھائی مجھے سسرال کے اندھے کنویں سے نکال
تینوں سوہریاں دا حال سناواں	کہ میں تجھے یہاں کی بپتا سناؤں۔

بھائی ہی مصیبت سے نجات دلانے والا ہے اور وہی بہن کے دکھڑے سنتا ہے۔

ساون آگیا ہے لیکن بھائی بہن کو میکے لے جانے کے لئے نہیں آیا۔ لڑکی عالمِ خیال میں ماں سے کہتی ہے :۔

پنج ست پنیاں پا کے میریئے مائے نی	اماں پان سات پنڈیاں بنا کر میرے بھائی کو
ویر میرے نوں بھیج ساون آیا	بھیج کہ ساون آیا ہے۔

پھر کہتی ہے:۔ اُچڑا اچڑا چونترا اتے سوہنا میرا ویر
میرا چبوترہ بلند ہے اور میرا بھائی خوبصورت ہے۔

کھلی میں اُڈیکاں راہ ساون آیا۔
میں چبوترے پر کھڑی اس کی راہ دیکھ رہی ہوں کہ ساون آیا ہے۔

اتنے میں بھائی آ پہنچتا ہے اور بہن کو بُرے حال میں دیکھ کر پوچھتا ہے:۔

رتّے رتّے پیڑھے توں بیٹھی اماں جایئے نی
میری ماں جائی تو سُرخ سُرخ پیڑھے پر بیٹھی ہے۔

کہیا تیرا میلا بھیس ساون آیا۔
لیکن تیری پوشاک ایسی میلی کچیلی کیوں ہے؛

کِس دے دُکھے توں دُکھی میریئے بھینے نی
اے میری بہن کس نے تجھے دُکھیا بنا دیا ہے۔

کون وڈے وڈے بول ساون آیا۔
کون بڑے بڑے بول بولتا ہے۔

بہن جواب دیتی ہے:ـ

سس دے دُکھے میں دُکھی اماں جایا وے
میرے ماں جائے بھائی ساس کے آزار نے میرا یہ حال کر دیا ہے

نند وڈے وڈے بول، ساون آیا۔
اور میری نند بڑے بڑے بول بولتی ہے۔

یہ سُن کر بھائی تسلّی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ساون آگیا ہے، اب میں تجھے سُرخ ڈولی میں بٹھا کر اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔

رتّے رتّے ڈولڑے توں بیٹھیں اماں جایئے نی
(میری پیاری بہن غم نہ کھا) میں تجھے سُرخ ڈولی میں بٹھا کر ساتھ لے جاؤں گا

ویرا گھوڑی اسوار ساون آیا۔
تیرا بھائی گھوڑی پر سوار ہو کر آن پہنچا کہ ساون آیا ہے۔

بہن کنوئیں پر گھڑا بھر رہی ہے، اردگرد سہیلیوں کا جمگھٹا ہے۔ اتنے میں ایک سہیلی اچانک آ کر بھائی کی آمد کی خبر سناتی ہے۔ یہ خوشخبری سُن کر بہن خوشی سے بے خود ہو کر چلّا اُٹھتی ہے ؎

کیہڑی سہیلی آن دسیا ویر آیا اے
پیاری سہیلیو یہ خوشخبری میں نے کس کے مُنہ سے سُنی کہ بھائی آیا ہے۔

لسّی شسّی دُور کرو تے ماجھا دُدھ پیایا اے۔
اب چھاچھ واچھ کا نام بھی نہ لو اور میرے بھائی کے لئے بھینس کا گاڑھا دودھ لاؤ۔

بھائی کی آمد کی خبر سُن کر ایک بہن خوشی خوشی اس کے خیر مقدم کی تیاریاں کر رہی ہے۔ فرطِ مسرت سے اس کے گھر کے در و دیوار بھی جگمگا اُٹھے ہیں چاول پک رہے ہیں اور بہن عالمِ طرب میں اُبلتی ہوئی دیگچی سے مخاطب ہو کر کہتی ہے:ـ ؎

اُبل اُبل ولٹوہیئے نی لپ چولاں دی پاواں
اُبل اُبل اے تنگ مُنہ کی دیگچی اُبل میں تجھ میں مُٹھی بھر چاول ڈال دوں۔

جے ویر ڈٹھا آؤندا لپ ہور وی پاواں
بھائی کو آتے دیکھ لوں گی تو مُٹھی بھر چاول اور ڈال دوں گی۔

جے ویرا آیا روڑے، روڑے ہونج سٹاواں
بھائی گاؤں کے میدان میں پہنچے گا تو راستے کے کنکر اُٹھا کر پھینکوا دوں گی۔

جے ویرا آیا گلیاں پٹ دریائی وچھاواں
بھائی گلی میں پہنچے گا تو میں وہاں ریشم کا فرش بچھا دوں گی۔

جے ویرا آیا ویہڑے رتّا پلنگ ڈہاواں
بھائی صحن میں پہنچے گا تو میں اس کے لئے سُرخ پلنگ بچھوا دوں گی۔

جے ویر منگے پانی لُوڑی مجھ چوآواں
بھائی پانی مانگے گا تو میں اسے بھوری بھینس کا (گاڑھا) دودھ پلاؤں گی۔

جے ویر منگے روٹی گری چھوارے کھواواں
بھائی روٹی مانگے گا تو میں اسے گری اور چھوہارے کھلاؤں گی۔

جے ویر بیٹھا چونکے بھانڈیاں رشماں چھڈاواں
بھائی اگر رسوئی میں بیٹھے تو برتن اتنے چمکاؤں کہ روشنی کی کرنیں پھوٹ نکلیں

جے ویر اندر وڑیا۔ دیوا لٹ لٹ بلیا
بھائی اندر گیا تو دیئے کی لاٹ اور بھی زیادہ روشن ہوگئی

جے ویر چڑھیا کوٹھے بالا چند بھی چڑھیا
بھائی کوٹھے پر چڑھا تو ساتھ ہی دُوج کا چاند بھی نظر پڑا۔

ایک لڑکی ساون میں اپنے سسرال والوں سے بھائی کے ساتھ میکے جانے کی اجازت طلب کرتی ہے سسرال والے طرح طرح کے حیلے تراشتے ہیں اور کسی طرح اُسے اپنے کاموں سے فارغ نہیں ہونے دیتے۔ اس کا گیت بھی سنیئے:۔

لڑکی۔ نینداں آئیاں سسّو ساؤنوں پیئے پہنچا
ساس۔ مَیں کی جاناں نُوہیں، کونت نوں پُچھ کے جاویں پچھا کے جاویں جھبّے مُڑ آویں

ترجمہ { اے ساس اب مجھے ساون کی نیندیں آتی ہیں۔ مجھے جلد میکے پہنچا دے۔
مَیں کیا جانوں بہو اپنے خاوند سے پوچھ پچھا اور چلی جا مگر جلد واپس آ جائیو۔ }

لڑکی۔ کونتا کم کریندیا مَیں گھر آیا وِیر سونے دا تیر لُنگی پٹ دار جُتی تِلے دار مَیں جاناں پیئے
خاوند۔ مَیں کی جاناں نارے سوہرے نوں پُچھ کے جاویں پچھا کے جاویں جھبّے مُڑ آویں۔

ترجمہ { میرے کام میں لگے ہوئے شوہر میرا بیر آیا سونے کا تیر آیا۔ لنگی ریشمی، جوتا طلائی کامدار۔ میں میکے جانا چاہتی ہوں۔
نیک بخت میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ اپنے سسر سے پوچھ پچھا اور چلی جا مگر جلد واپس آ جائیو۔ }

لڑکی۔ سوہریا پلنگ بیٹھیا مَیں گھر آیا وِیر سونے دا تیر لُنگی پٹ دار جُتی تِلے دار مَیں جانا پیئے
سسر۔ مَیں کی جاناں دِھیئے جیٹھ نُوں پُچھ کے جاویں پُچھا کے جاویں۔ جھبّے مُڑآویں۔

ترجمہ { پلنگ پر بیٹھے ہوئے سسر میرے گھر بیر آیا سونے کا تیر آیا۔ لنگی ریشمی جوتا طلائی کامدار مجھے میکے جانے دے۔
بیٹی میں کیا جانوں اپنے جیٹھ سے پوچھ پچھا اور چلی جا مگر جلد واپس آ جائیو۔ }

لڑکی۔ جیٹھا کھوہ تے بیٹھیا مَیں گھر آیا وِیر سونے دا تیر لُنگی پٹ دار جُتی تِلے دار مَیں جانا پیئے
جیٹھ۔ مَیں کی جاناں بھابی نند نوں پُچھ کے جاویں پُچھا کے جاویں جھبّے مُڑ آویں۔

ترجمہ { کنوئیں پر بیٹھے ہوئے جیٹھ میرے گھر بیر آیا سونے کا تیر آیا۔ لنگی ریشمی، جوتا طلائی کامدار مجھے میکے جانے دے۔
بھابی میں کیا جانوں اپنی نند سے پوچھ پچھا اور چلی جا مگر جلد واپس آ جائیو۔ }

لڑکی۔ نندے چرخا کتدیئے میں گھر آیا وِیر سونے دا تیر لُنگی پٹ دار جُتی تِلے دار میں جانا پیئے۔

نند۔ بھابو گھر آیا رُول، توں پنجا کے جاویں، کتا کے جاویں، وٹا کے جاویں، اُنا کے جاویں، دھوا کے جاویں، رکھا کے جاویں جھبے مُڑ آویں۔

ترجمہ { چرخا کاتنے والی نند میرے گھر بیر آیا۔ سونے کا تیر آیا۔ لنگی ریشمی جوتا طلائی کا مدار مجھے میکے جانے دے۔
بھابی گھر روئی آئی ہے اسے دُھنوا کر جائیو، کتوا کر جائیو۔ بٹوا کر جائیو۔ بُنوا کر جائیو، دھلوا کر جائیو، رکھوا کر جائیو۔ پھر جلد واپس آجائیو۔ }

لڑکی جھنجھلا کر کہتی ہے :۔

وِیرا سُن وے میری نند دا مرگیا ابا۔ میں بن وِچ دباں، مَیں دھڑ دھڑ پِٹاں مَیں نہیں جانا پیئے۔ وِیرا توں جا وے۔

میرے پیارے بھائی سُن میری نند کا باپ مر گیا۔ میں بن میں اس کی قبر سناؤں گی۔ مَیں دھڑ دھڑ پیٹوں گی مَیں میکے نہ جاؤں گی۔ اب تُو جا خدا حافظ۔

بچپن کے زمانے ہی سے دِہاتی لڑکی کے دل میں بھائی کی محبت راسخ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے کھیلوں میں جو گیت گاتی ہے اُن میں بھی بہن کی معصوم محبت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ دِہاتی لڑکیاں بچپن میں کچے سُوت کی گیندوں سے کھیلتی ہیں اور اُچھلتی گیند کی تال کے ساتھ اس قسم کے تھال گاتی ہیں :۔

تن کتیر —— گلی گلی کھڈاواں ویر — تن کتیر —— میں گلی گلی "بیر" کو کھلاتی پھروں
گلی گلی نوں لگے چھتے — گلی گلی گھونگروؤں کی صدا سے جھنجھنا اُٹھے
ویر میرے نُوں اللہ رکھے — یا اللہ میرے بھائی کی نگہبانی کر
رکھن والا اللہ — میرے بھائی کا رکھوالا اللہ ہے
کھڈان والا اچھلا — اُس کا دِل بہلانے والا اچھلا ہے۔

کلکلی دِہاتی لڑکیوں کا ایک نہایت مرغوب کھیل ہے۔ ایک دوسری کا ہاتھ پکڑے لڑکیاں پھُدک پھُدک کر چکّر کھاتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس قسم کے گیت گاتی ہیں :۔

کِلکلی کلیر دی
پگ میرے وِیر دی
دوپٹہ میرے بھائی دا
لال سپاہی دا

اس گیت میں بھائی کی پگڑی اور چادر وغیرہ کی بلائیں لے کر بہن نے فخر سے اُسے "لال سپاہی" کہا ہے۔ دِہاتی بہنیں ہمیشہ اپنے بھائیوں کو اچھے سے اچھے عہدوں پر فائز دیکھنا چاہتی ہیں۔ چنانچہ ایک بہن کہتی ہے :۔

آری —— دو وِیر دے وے ربا — آری —— یارب مجھے دو بھائی عطا کر
اِک مُنشی تے اِک پٹواری — جن میں سے ایک مُنشی بنے اور ایک پٹواری ہو۔

کیوں نہ ہو بہن کے لئے بھائی سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا ہے۔ ایک لڑکی کہتی ہے:

چھوئی ـــــ گھم گھم سڑک وگے
میرے ویر جیہا نہیں کوئی

چھوئی ـــــ سڑک پر راہ گزروں کی بڑی گہما گہمی ہے
مگر اُن میں میرے بھائی جیسا گبرو کوئی بھی نہیں۔

ایک لڑکی تنور میں روٹی لگا رہی ہے۔ اتنے میں ڈاکیا اُسے بھائی کا خط دے جاتا ہے۔ وہ روٹیوں کو جلتا ہوا چھوڑ کر اُس کے پیچھے خط پڑھوانے کے لئے بھاگتی ہے کہ روٹیاں جائیں بھاڑ میں "بیرن" کی چٹھی تو سُن لوں:

تنوری تائی ہوئی آ
تے کھماں لوں کھان روٹیاں ـــــ چٹھی ویر دی آئی ہوئی آ

ایک بہن نے گوبھی پکائی ہے۔ بگھارتے وقت اُسے خیال آتا ہے، کاش آج بھائی بھی آتا اور گوبھی کھاتا۔ اس خیال سے وہ گوبھی کا کچھ سالن الگ رکھ دیتی ہے۔ اتفاقاً آدھی رات کے وقت بھائی بھی آن پہنچتا ہے:

اساں گوبھی تڑکی اے
تے ادّھی راتی ویر آیا ـــــ گرگابی کھڑکی اے

لاڈلا بھائی عام دیہاتیوں کی طرح بھدا گامے شاہی جوتا پہن کر نہیں آتا۔ اس کے قدموں کی چاپ ہی بتا دیتی ہے کہ "گرگابی کھڑکی اے"

ایک لڑکی کا بھائی سنگدل اور اکل کھرا ہے لیکن پنجاب کی بہن کو کسی طرح یقین نہیں آسکتا کہ کوئی بھائی بھی ایسا بُرا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ وہ اس کی بُرائی کا الزام اپنی سیالکوٹی بھاوج کے سر تھوپ دیتی ہے:

فیتا ـــــ تے بھابیئے سیالکوٹنے
کیہا ویر دا پتھر دِل کیتا

گویا "ویر" کا دل سیالکوٹن بھابی ہی نے پتھر بنایا ہے۔ وہ تو بچارا موم کی ناک ہے۔

لوگوں کو نہر کے کنارے ایک نوجوان کی لاش پڑی ملتی ہے جسے چوروں نے مار ڈالا ہے۔ لاش کو دیکھ کر دیہاتی لڑکی کی خواہرانہ محبت جوش میں آجاتی ہے اور وہ کہتی ہے۔ آہ! یہ بھی کسی نصیبوں جلی بہن کا بھائی ہوگا۔ بھائی کی موت اُسے ہر دوسرے عزیز کی موت سے زیادہ دردناک معلوم ہوتی ہے:

کھیرا ـــــ تے نہر کنڈھے چور ماریا
کہیے بھین تتی دا ویرا

غور کیجئے وہ یہ نہیں سوچتی کہ یہ کسی دکھ جلی ماں کا بیٹا، کسی بے کس بچے کا باپ، یا کسی نوجوان رانڈ کا شوہر ہے۔ اُسے سب سے زیادہ دردناک موت بھائی ہی کی معلوم ہوتی ہے۔

آخر میں ایک پُرلطف گیت سنیئے۔ اس میں دہاتی لڑکی کی میکے سے محبت اور سسرال سے نفرت بہت دلچسپ طریقے سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ گیت "بٹوے کے گیت" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے ہر مصرع میں بہن اپنے بھائی کی بلائیں لیتی ہے اور ساتھ ساتھ اپنے پسندیدہ بٹوے پر فخر کا اظہار بھی کرتی جاتی ہے۔ گیت کا مضمون یہ ہے کہ عالم خیال میں جوہڑ کے کنارے شیشم کے ایک درخت پر بہن چڑھتی ہے اور دوسرے بھائی پہلے وہ بھائی کو تصور میں اپنا میکہ دکھاتی ہے جہاں اُن کا خوشحال باپ موٹی تازی دودھیل بھینسیں چراتا نظر آتا ہے اور بھینسوں کی کٹڑیوں کی حفاظت پر اُس کا چھوٹا بھائی مامور ہے۔ اس کے بعد وہ اُسے سسرال کی ایک جھلک دکھاتی ہے جہاں اُس کا سسر کتیاؤں کو ہانک رہا ہے اور اُس کا دیور کتے کے پلّوں کے پیچھے پیچھے پھرتا نظر آتا ہے۔

بٹوے کا گیت

واری چھپڑ کنڈھے دو ٹاہلیاں واری اُگیاں سِدھیاں تیر
میرا بٹوا نرمے دا
واری اِکّی ٹاہلی میں چڑھاں، واری اِکی چڑھے میرا ویر
میرا بٹوا نرمے دا
واری اُتر ویرا ہُن میں چڑھاں واری دیکھیئے پیکا دیس
میرا بٹوا نرمے دا
واری پیکیاں دا کی ویکھناں، واری پیکیاں دا کی ویکھناں
میرا بابل تے مجھیں چار دا تے کٹیاں مغر میرا وِیر
میرا بٹوا نرمے دا
واری اُتر ویرا ہُن مَیں چڑھاں واری دیکھیئے سوہرا دیس
میرا بٹوا نرمے دا
واری سوہریاں دا کی ویکھناں واری سوہریاں دا کی ویکھناں
میرا سوہرا تے کُتیاں چار دا تے کتوُریاں مغر میرا دیور
میرا بٹوا نرمے دا

حامد علی خاں

یہ مضمون کسی قدر مختصر صورت میں آل انڈیا ریڈیو لاہور سے نشر کیا گیا تھا اور اب حسب اجازت شایع کیا گیا ہے۔

موسیٰ نے اسی کو طُور پہ دیکھا ہے

خطاب صوفی صاحب سے:۔

(۴)

صوفی صاحب! ذرا مراقب ہوکر کچھ آپ اپنی زباں سے فرمائیے گا
کہتے ہیں کسے خدا؛ تو ارشاد ہُوا وہ ساتھ ہے آپ کے جہاں جائیے گا

مظہر ہیں اسی کے سب، یہ سافل عالی
خود اپنا وجود، اس سے کب ہے خالی

خطاب شاعر سے:۔

(۵)

شاعر صاحب! خدا کو تم کیا سمجھے شاعر بھی تو دُور کی خبر لاتے ہیں
کچھ وزن میں گنگنا کے یوں فرمایا ہم اپنے خیال میں اسے پاتے ہیں

دُنیا والے خیال کہتے ہیں اسے
ہم جلوۂ ذوالجلال کہتے ہیں اسے

خطاب امجد صاحب سے:۔

(۶)

امجد صاحب! کچھ آپ ارشاد کریں ہم بھی تو سنیں کہ آپ کیا کہتے ہیں
فرمایا کہ "یُؤمِنُونَ بِالْغَیْبِ" کے تحت ہم "طاقتِ غیبی" کو خدا کہتے ہیں

وہ طاقتِ غیبی، جو "محیط الکُل" ہے
ثابت کرتی ہے جس کا ہونا، ہر شے

راوی

کوئی نہ مِلا، اُس سے مِلانے والا دیکھا نہ گیا، کوئی دکھانے والا
اِس دَور میں ایک بھی کو ملبس نہ ہُوا امریکہ کا پتہ چلانے والا

ہم مُوردِ الطاف و کرم کس کے ہیں
یا خوگرِ صد جور و ستم کس کے ہیں
ہر چیز جہان میں ہے اِس کی، اُس کی
لیکن نہیں معلوم کہ ہم کس کے ہیں؟

سمجھایا ہر اِک نے اپنے اپنے ڈھب سے
لیکن ہم کو تو کوئی رستہ نہ مِلا
پہنچے ہم اسی فکر میں اِک دوست کے گھر
واں کھیل رہا تھا ان کا کم سِن بچہ
پھُولے ہوئے گال، رُخ پہ بکھرے ہوئے بال
اک چاند کا ٹکڑا، بدرِ کامل کی مثال

ہم نے اسے گود میں اُٹھا کر پوچھا
معصوم فرشتے! تم ہی کچھ سمجھاؤ
بولو، کہ خدا کہاں ہے؟ اور کیا ہے؟
ہنس کر بولا، کہ آؤ گھر میں آؤ

جس کو تم پوچھتے ہو، وہ تو یاں ہے
کیا تم کو بتا ہی دوں؛ وہ "میری ماں" ہے
بچّوں کی زباں پر ہے ہر دم امّی
تم کہتے ہو رَبّی رَبّی، اور ہم، امّی

رُباعی

مقولۂ طفل :-

تم بھی یوں ہی تمام رحمت ہو جاؤ
دُنیا کے لئے مُوجبِ راحت ہو جاؤ
بن سکتے ہو تم خود بھی خُدا، گر چاہو
بس کچھ نہیں بندۂ محبت ہو جاؤ

رُباعی

"

رب، اپنے ہر اک بندے کے ہمراہ ہُوا
اس واسطے انتظامِ دِل خواہ ہُوا
ہے رحم و کرم ہی سے خدائی کا رواج
اللہ بھی محبت ہی سے "اللہ" ہُوا

سیّد احمد حسین امجد

اگلے وقتوں کی دِلّی

تذکرہ دہلیٔ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ　　نہ سُنا جائے گا ہم سے یہ فسانا ہرگز
لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح　　دیکھ اِس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز　　(حالیؔ)

جمنا کے آس پاس کے اُس علاقے میں جو اراولی کی پہاڑیوں کے انتہائی شمالی سرے کے قریب ہے قدیم زمانے سے کئی بڑے بڑے شہر ایک دوسرے کے بعد بس بس کر اُجڑتے رہے ہیں۔ ان میں سب سے پہلا شہر اندرپرست تھا جو مہابھارت کی روایت کی رُو سے پانڈوؤں کے سردار یدھشٹر نے آباد کیا تھا۔ اس میدان پر قبضہ جمانے کے لئے بڑی خونریز لڑائیاں ہوئیں۔ یہ شہر عظمت و شوکت میں ہومر اور ورجل کے یونانی شہروں ایلیڈ اور اینیڈ سے کم نہیں تھا۔

دِلّی بھی اسی علاقے میں مختلف مقامات پر بس بس کر اُجڑتی رہی اور جتنے انقلاب اس نے دیکھے ہیں ہندوستان کے کسی اور شہر نے نہیں دیکھے ہوں گے۔ یہ شہر نہ صرف بڑی بڑی سلطنتوں کی راجدھانی رہا ہے بلکہ اس کے دامن میں کئی تہذیبوں اور تمدنوں نے پرورش پائی جن کے آثار آج تک ہماری آنکھوں کے لئے عبرت کا سرمایہ ہیں۔

فرشتہ لکھتا ہے کہ سب سے پہلے راجہ دِلّو نے اسکندرِ اعظم کے حملے سے پہلے دِلّی کی بُنیاد رکھی تھی۔ لیکن یہ نظریہ قابلِ اعتبار نہیں۔ اس کی بہت سی وجوہ ہیں۔

اوّل یہ کہ یونانی مؤرخوں نے سکندرِ اعظم کے حملے کے جو حالات لکھے ہیں اُن میں دلّی کا کہیں ذکر نہیں۔ اگر اُس وقت دلّی آباد ہوتی یا اُسے وہ نمایاں حیثیت حاصل ہوتی جو بعد میں ہوئی تو اس پر سکندر کی نظر ضرور پڑتی یا کم از کم یونانی مؤرخ اس کا ذکر ضرور کرتے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت مسیح سے تین سَو سال پہلے جو سکندرِ اعظم کے حملے کی تاریخ ہے دِلّی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ اس کے بعد دُوسری صدی قبلِ مسیح میں یونان و باختر کی متحدہ فوجیں حملہ آور ہوئیں۔ اُن کے تذکروں میں بھی دلّی کا نام کہیں نہیں آتا۔

چینی سیاح فاہیان اور ہیون سانگ جو پانچویں اور ساتویں صدی عیسوی میں ہندوستان آئے اُن کے سفرناموں میں بدھ مت کے مقدس مقامات کا ذکر تو ہے لیکن دِلّی کا نام موجود نہیں۔

اب ذرا آگے چلئے۔ محمود غزنوی نے پہلی دفعہ ایک ہزار عیسوی کے قریب حملہ کیا اور اس کے بعد کئی متواتر حملے کئے۔ اس کے

حملوں میں قنوج اور متھرا کے ساتھ دِلّی کا ذِکر کہیں نہیں آیا۔

دِلّی کا نام پہلی دفعہ ایک پُرانے منظوم قِصّے میں آتا ہے جس میں لکھا ہے کہ آٹھ سو برس تک یہ شہر ویران رہا۔ اس کے بعد دوبارہ آباد ہُوا۔ افسوس کہ پچھلے دو تین ہزار سال کی تاریخ ہی نہیں ملتی۔ کتبوں سے جو حالات ہم تک پہنچے ہیں، اُن کا تعلق زیادہ تر مذہبی اُمور سے ہے۔

تاریخ میں پہلی دفعہ دلّی کا ذکر راجہ اننگ پال کے نام کے ساتھ آتا ہے جس نے ۱۰۵۲ء میں یہ شہر آباد کیا۔ دلّی کی مشہور لوہے کی لاٹ پر بھی یہی تاریخ درج ہے۔ اگر اس منظوم قِصّے کی روایت درست مان لی جائے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ دلّی تین سو عیسوی کے قریب آباد ہوئی۔ پھر آٹھ سو سال تک ویران رہی اور اننگ پال نے اسے نئے سرے سے بسایا۔

اننگ پال تومار قوم کا راجپوت تھا۔ اُس نے دلّی کا شہر اُس مقام پر آباد کیا تھا جہاں آج کل قطب مینار ہے۔ اس علاقے کے اردگرد جس پُرانے قلعے کے مٹے ہوئے آثار موجود ہیں وہ اننگ پال ہی نے بنوایا تھا۔ لوہے کی لاٹ بھی اننگ پال نے متھرا سے لاکر یہاں نصب کی تھی۔

لاٹ کے متعلق ایک عجیب غلط روایت مشہور ہے جس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ ایک برہمن نے راجہ کو خوش کرنے کے لئے یہ افسانہ تراشا کہ لاٹ اتنی گہری چلی گئی ہے کہ "شیش ناگ" کا سر جو دھرتی کو سنبھالے ہوئے ہے اور دُنیا کے انقلابات کا باعث ہے اس سے زخمی ہوگیا ہے۔ اور اب وہ کوئی حرکت نہیں کرسکے گا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس شہر پر ہمیشہ راجہ اننگ پال کا خاندان حکمران رہے گا اور یہاں کوئی انقلاب نہیں آئے گا۔ راجہ یہ سُن کر بہت خوش ہُوا لیکن اُسے یقین نہ آیا۔ اطمینان حاصل کرنے کے لئے لاٹ کو کھُدوایا تو واقعی اُس کا سرا خُون سے بھرا ہُوا تھا۔ راجہ نے حکم دیا کہ لاٹ کو اُسی مقام پر دوبارہ نصب کردیا جائے لیکن اُسے برہمن کی بات پر یقین نہ کرنے کی یہ سزا ملی کہ لاٹ پہلی سی مضبوطی کے ساتھ زمین میں نہ جم سکی اور "ڈھیلی" رہ گئی۔ اسی وجہ سے شہر کا نام "دہلی" پڑگیا۔ یہ روایت اس اعتبار سے بھی ناقابلِ یقین ہے کہ دہلی کا لفظ تومار خاندان سے بہت پہلے کا ہے۔

اننگ پال کا خاندان سَو سال تک دِلّی پر حکمران رہا۔ اس کے بعد اجمیر کا چوہان راجہ وسال دیو اس شہر پر قابض ہوگیا۔ وسال دیو کا پوتا پرتھوی راج اجمیر اور دہلی دونوں پر حکومت کرتا رہا۔ اُس نے "رائے پتھورا" کے نام سے دوسرا شہر آباد کیا جس کی شکستہ دیواریں قطب مینار کے اردگرد دُور تک نظر آتی ہیں۔

پرتھوی راج کی مَوت کے ساتھ ہندو دہلی کی تاریخ ختم ہوگئی۔ ہندو دہلی کے تمدن کی تاریخ نایاب ہے لیکن کم از کم اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ بارھویں صدی عیسوی کے اخیر میں یہ ہندوؤں کا مشہور ترین شہر تھا۔ اس میں ستائیس کے قریب مندر تھے۔ لوگ امن اور چین کی زندگی بسر کرتے تھے اور ابتدائی مسلمان حملہ آور بھی اُن کے آرام و آسائش اور مدنی زندگی کی آزادی میں دخل انداز

نہیں ہوتے تھے۔

محمد غوری کے انتقال کے بعد اُس کے غلام قطب الدین ایبک نے دِلّی کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور خاندانِ غلاماں کی بنیاد رکھی۔ دِلّی کی پُرانی جامع مسجد "قوت الاسلام" کی تعمیر فتح دہلی کے بعد ہی شروع ہوگئی تھی۔ قطب مینار اسی عظیم الشان مسجد کا ایک مینار ہے جس پر سے اذان دی جاتی تھی۔ اگرچہ یہ مسلمانوں کے فنِ تعمیر کی یادگار ہے لیکن اس کی مغربی دیواروں اور بعض دُوسرے حصّوں پر باریک نقاشی ہندو فنِ تعمیر کی یاد دلاتی ہے۔ ابنِ بطوطہ نے جو سلطان محمد تغلق کے زمانے میں دلی آیا اس مسجد کی بہت تعریف کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ مسجد اس قدر وسیع وخوبصورت اور اس کا مینار اس قدر عظیم الشان ہے کہ اسلامی دُنیا میں ان کی نظیر نہیں، امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ نے قران السعدین میں بادشاہ کے ذکر کے ساتھ اس مسجد کا ذکر یوں کیا ہے ؎

مسجدِ او جامع فیضِ الٰہ ــــ زمزمۂ خطبہ او تا بماہ

خاندانِ غلاماں کے بادشاہ خود عالم وفاضل اور علماء وفضلاء کے قدر داں تھے۔ اُن کے زمانے میں علُوم وفنون نے بہت ترقی کی۔ التمش عدل وانصاف کے ساتھ علم وفضل کی دولت سے بھی مالامال تھا۔ بلبن کے متعلق بھی یہی لکھا گیا ہے۔ بلبن کا بڑا لڑکا خان شہید جو ولی عہد اور سندھ کا گورنر تھا عالم اور سخن فہم تھا۔ اہلِ علم کی بہت قدر کیا کرتا تھا۔ اس زمانے کے مشہور فقیہہ اور صُوفی سلطان نظام الدین اولیاء کے مریدانِ خاص امیر خسرو اور خواجہ حسن دہلوی کے علاوہ اور بہت سے علماء اس کی ملازمت میں تھے۔ امیر خسرو کے شعر اب بھی تروتازہ ہیں اور اُس زمانے کی یادگار ہیں ؎

رہے نہ ایبک وغوری کے معرکے باقی ــــ ہمیشہ تازہ وشیریں ہے نغمۂ خسرو

اس زمانے کے ایک اور عالم وفاضل اور خدارسیدہ بزرگ قطب الدین بختیار کاکی تھے۔ ایک دفعہ قوال شیخ احمد جام زندہ پیل کا یہ شعر پڑھ رہے تھے ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ــــ ہر زماں از غیب جانے دیگر است

کہ وجد کی حالت میں آپ کا وصال ہوگیا۔ سُلطان شمس الدین التمش نے بھی اسی سال وفات پائی۔

التمش سے سلطان علاء الدین خلجی تک کا وہ زمانہ تھا کہ مغلوں کے لشکر تمام ایشیا اور یورپ کے مشرقی حصّوں کو تہ وبالا کر رہے تھے، ان بادشاہوں نے مغلوں کے پے در پے حملوں کا مقابلہ کیا۔ حملہ آوروں کی روک تھام کی مشکلات کے باوجود اس عہد میں علم وفضل کی جو قدر ہوئی وہ قابلِ تعریف ہے۔

علاء الدین خلجی حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لئے سیری کے مقام پر فوجیں رکھا کرتا تھا۔ جب مغل واپس چلے گئے تو پُرانے شہر کی بڑھتی ہوئی آبادی کو دیکھ کر اُس نے اس جگہ نیا شہر آباد کیا۔

غیاث الدین تغلق نے مشرق کی طرف چار میل کے فاصلے پر ایک نیا دارالخلافہ تغلق آباد کے نام سے بنایا۔ یہ دلی کا چوتھا شہر تھا۔ اس کے کھنڈر بھی اب تک موجود ہیں۔ شاہی خزانے اور محل یہیں تھے۔ اس نئے شہر میں بادشاہ نے ایک عالیشان محل تعمیر کرایا تھا جس کی اینٹوں پر سونا چڑھا ہوا تھا۔ جب اس پر سورج کی شعاعیں پڑتیں تو کوئی اس کی طرف آنکھ جما کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔

تغلق خاندان کے دوسرے بادشاہ محمد تغلق نے علاءالدین کے زمانے سے پہلے کی دلی اور سیری کے اردگرد ایک فصیل کھینچ کر دونوں شہروں کو ملا دیا اور اس پانچویں شہر کا نام جہاں پناہ رکھا۔ اس شہر میں ایک ہزار مدرسے، دو ہزار مسجدیں اور ستر ہسپتال تھے۔ شہر کے باہر دو میل لمبا اور ایک میل چوڑا حوض تھا جس کا نام "حوض شمسی" تھا۔ اس کے علاوہ چالیس گنبدوں والا ایک "حوض خاص" تھا جہاں اہلِ طرب کا جمگھٹا لگا رہتا تھا اور اسی نسبت سے اسے "طرب آباد" بھی کہتے تھے۔

مشہور سیاح ابن بطوطہ محمد تغلق کے زمانے میں دلی آیا۔ بادشاہ نے اُسے شہر کا قاضی بنا دیا اور وہ نو سال تک وہیں رہا۔ اس نے اپنے سفرنامے میں "شہر" کی خوبصورتی، پائداری اور فراخی کی بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ اس کی فصیل جس کی کوٹھڑیوں میں غلے کے کھتے یا انبار محفوظ رہتے ہیں بے نظیر ہے۔ شہر کے اٹھائیس دروازوں میں سے بعض مشہور یہ تھے:-

(۱) "بدایوں دروازہ" (۲) "مندوی دروازہ" (۳) "گُل دروازہ" (۴) "کمال دروازہ" (۵) "غزنی دروازہ"۔

محمد تغلق کے زمانے کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ اُس نے اپنی رعایا کو دلی چھوڑ کر دولت آباد جانے پر مجبور کیا یہاں تک کہ شہر بالکل ویران ہو گیا۔ اور پھر دوسرے شہروں سے لوگوں کو لا کر وہاں آباد کرنا پڑا۔

محمد تغلق عربی اور فارسی کا ماہر اور فصیح و شیریں بیان مقرر تھا۔ شاعر اور خوش نویس بھی تھا۔ تاریخ، طب، حکمت، نجوم، ریاضی اور منطق میں مہارت حاصل تھی۔ ضروری تھا کہ جو بادشاہ اتنے علوم و فنون جانتا ہو وہ دوسرے عالموں اور فاضلوں کی بھی قدر کرے۔ چنانچہ بادشاہ کے ساتھ خاص دسترخوان پر دونوں وقت دو سو عالم اور فاضل کھانا کھایا کرتے تھے اور اس وقت علمی گفتگو ہوتی تھی۔

اُس نے نہ صرف دلی کے علما کو اپنی سخاوت سے مالا مال کیا بلکہ دوسرے ممالک کے فضلا کی ہمت افزائی بھی کیا کرتا تھا۔ شمس الدین اندگانی حکیم اور شاعر کو، ۲۷ شعروں کے قصیدے کے صلے میں ہر بیت کے عوض ہزار دینار کے حساب سے انعام دیا۔ عبدالعزیز اردبیلی فقیہ اور محدث کو سونے کی تھالی میں دو ہزار اشرفیاں پیش کیں۔ خواجہ حافظ کے ہم عصر قاضی مجدالدین کو شیراز میں دس ہزار روپیہ بھیجا اور جب اُسے معلوم ہوا کہ برہان الدین واعظ کو قرض لے کر سخاوت کرنے کی عادت ہے تو اسے اپنے وطن میں چالیس ہزار دینار بھیجے اور ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ اُنھوں نے اس رقم سے قرض ادا کر دیا اور ہندوستان نہ آئے۔

فیروز شاہ تغلق نے سری کے شمال مشرق کی طرف اپنا نیا دارالخلافہ فیروز آباد کے نام سے بنوایا۔ یہ گویا چھٹی دلی تھی۔

محمود تغلق کے زمانے میں امیر تیمور نے حملہ کیا۔ اگرچہ محمود نے شکست کے بعد سلطنت کا کچھ حصہ دوبارہ حاصل کر لیا لیکن چونکہ

برس کے بعد اُس کا انتقال ہوگیا۔ پندرھویں صدی کے وسط تک خاندانِ سادات نے حکومت کی جس کے بعد لودھی خاندان نے آگرہ کو دارالخلافہ بنالیا۔

ہمایوں نے پھر دہلی کو دارالخلافہ بنایا اور پرانا قلعہ تعمیر کیا۔ ہمایوں شعروسخن کا دلدادہ تھا اُس کے دربار کے فارسی شاعروں میں یہ نام قابلِ ذکر ہیں :۔ جذبی بدخشانی، مُلا حیرتی، نادری سمرقندی الشیخ ابوالواحد فارغی اور حیدر تونیائی۔

شیر شاہ سُوری نے ہمایوں کو شکست دے کر فیروز آباد کے مقام پر از سرِ نو دِلّی تعمیر کی اور اس کے گرد ایک فصیل کھنچوائی۔ یہ دِلّی کا ساتواں شہر تھا۔ شیر شاہ کے عہد میں اس نے بہت ترقی کی۔ نئے باغوں اور سڑکوں سے اس کی رونق کو چار چاند لگ گئے۔ ڈاکوؤں اور لٹیروں سے محفوظ ہوگیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں دِلّی کے امن وامان کی یہ حالت تھی کہ اگر سڑک پر کوئی چیز نظر آتی تو کسی کو اُسے بُری نیت سے دیکھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ شیر شاہ نے بہت سی سماجی اصلاحیں بھی کیں۔

ہمایوں نے دِلّی پر دوبارہ قبضہ کیا تو چھ مہینے کے بعد اُس کا انتقال ہوگیا۔ اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں دارالخلافہ یا آگرہ تھا یا لاہور۔ اس لئے دلّی کی اگلی سی حالت نہ رہی۔

آخری اور آٹھویں مرتبہ شاہ جہان نے ۱۶۳۸ء اور ۱۶۵۸ء کے درمیان فیروز شاہ اور شیر شاہ کے شہروں کے کھنڈروں پر موجودہ دلی بنائی اور اس کا نام شاہ جہان آباد رکھا۔

برنیئر لکھتا ہے کہ شاہ جہان آباد جمنا کے دائیں کنارے ہلال کی شکل میں بنایا گیا تھا فصیل کا دَور چھ سات میل کے قریب تھا۔ دروازوں کے باہر اُمراء کے لئے بہت سے باغات اور عشرت گاہیں تھیں۔ شاہی محل اگر دُنیا بھر میں نہیں تو مشرق میں اپنی نظیر آپ تھا۔ فنونِ لطیفہ اور صنعت وحرفت کا بازار اس قدر گرم تھا کہ کارواں سرائیں ہمیشہ سوداگروں سے آباد رہتی تھیں۔ مصوّروں اور کاریگروں کی حوصلہ افزائی جی کھول کر کی جاتی تھی۔

اُمراء نے بھی اپنی اپنی حیثیت کے مطابق وسیع اور عالیشان مکانات بنوائے۔ ان میں قمرالدین خاں، علی مردان خاں، غازی الدین خاں اور صفدر جنگ کی حویلیاں بہت مشہور تھیں۔ حویلیوں میں اصطبل، حمام، باغ اور محل سرائیں بھی شامل تھیں۔ دو سڑکیں بہت عمدہ تھیں۔ ایک قلعے سے دہلی دروازے کو جاتی تھی جس میں فیض بازار اور نہر تھی۔ دُوسری قلعے سے لاہوری دروازے کو جاتی تھی۔ جس میں چاندنی چوک اور کھاری باؤلی ہے۔ چاندنی چوک جس میں بارہا خُون کی ندیاں بہ چکی ہیں، دُنیا کے پُررونق اور سب سے قیمتی بازاروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ شاہ جہان نے ڈیڑھ کروڑ روپے کے صرف کثیر سے ایک شالامار باغ بھی بنوایا تھا مگر اب اُس کا کوئی نشان باقی نہیں۔

لال قلعے کی تعمیر شاہ جہان کی حکومت کے پہلے دس سالوں کے درمیان ہوئی۔ اس کی عمارت میں دیوانِ عام اور دیوانِ

خاص کر قابلِ ذکر ہیں۔ دیوانِ عام کا طرزِ تعمیر ہندوانہ ہے۔ یہ عمارت سُرخ پتھر کے ساٹھ ستونوں پر کھڑی ہے تختِ طاؤس جسے نادر شاہ ایران لے گیا تھا اسی ایوان کی کھلی دیوار کے ساتھ رکھا ہُوا تھا۔ فرانسیسی جوہری ٹیورینیر جس نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا، لکھتا ہے کہ یہ عظیم الشان تخت بیس یا پچیس انچ بلند چار سنہری پایوں پر کھڑا تھا۔ تخت کے اوپر "چھتر" کے نیچے بارہ ستون تھے۔ تخت لعلوں، زمردوں اور موتیوں سے جڑا ہُوا تھا اور اس کی لاگت کا اندازہ ساٹھ لاکھ پونڈ تھا۔ دیوانِ خاص میں سنگِ مرمر پر نقاشی مُغل آرٹ کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہے۔

قلعے کے دو سال بعد جامع مسجد کی تعمیر ہوئی۔ اُردو یعنی ہندوستانی زبان جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے کلچر کے ملاپ کی یادگار ہے، اسی کی سیڑھیوں پر پلی پھولی اور یہی سیڑھیاں اس زبان کے بچپن کا گہوارہ تھیں۔

یہ ہے دِلّی جس نے سات سو سال میں نصف درجن سے زیادہ انقلابات دیکھے جس کی عظیم الشان شاہی عمارتیں جس کے کھنڈر ہندوؤں اور مسلمانوں کی عظمت کا افسانہ سُنا رہے ہیں اور جس کی خاک میں علم و فن، فضل و حکمت اور فقر و شاہی کے وہ گوہر نایاب پوشیدہ ہیں جن کی آب و تاب اب بھی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر رہی ہے، یہ ہے دلّی! جس کا آغاز "شمشیر و سناں" سے اور جس کا انجام "طاؤس و رباب" پر ہُوا۔ علامۂ اقبال مرحوم نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

مَیں تجھ کو بتاتا ہوں، تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر

حفیظ ہوشیارپوری

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو)

اُردو

سب زبانوں سے رسیلی ہے زبانِ اُردو
ہند کی ساری زبانوں کی ہے سالار اُردو

سادہ و دلکش و شیریں ہے بیانِ اُردو
کسی عنواں سے بھی دیکھو تو ہے سردار اُردو

اس میں کچھ مذہب و ملت کی نہیں ہے تخصیص
مصری و شامی و رومی کو بھی آساں ہے یہ

عام ہے سب کے لئے لذتِ خوانِ اُردو
ہند والوں کی تو بے شبہ ہے غمخوار اُردو

غلام یٰسین (لدھیانہ)

غزل

وہ نہ ہوں تخئیل میں بھی دل کا جب ماتم رہے — ہم نفس اُن کا تصور کیوں شریکِ غم رہے

صورت ایسی بے تماشا حسرتِ پیہم رہے — جلوہ ایسا آنکھ دیکھے اور نامحرم رہے

دیدنی ہے اختیارِ گریہ پر یہ صبر و جبر — ہائے وہ آنسو کہ جو آنکھوں میں آ کر تھم رہے

تم سراپا حسن ہو پر عشق سے بیگانہ ہو — یہ وہ دُنیا ہے کہ اس دُنیا میں ہم ہی ہم رہے

دینے والے لذتِ غم ہی نہ کھو دینا کہیں — دے اور اتنا دے مجھے احساسِ رنج و غم رہے

فکر رہتی ہے یہی بگڑے نہ ظالم کا بناؤ — ہم کو اُلجھن ہو تو ہو زلفوں میں پیچ و خم رہے

سب ہی اچھے ہو گئے گلزارِ خوبی کے مریض — اُن کے بیماروں میں اک نرگس رہی اک ہم رہے

ضبط کے معنی یہ ہیں ٹپکے نہ آنسو ایک بھی — عاشقوں کی آبرو اے دیدۂ پُرنم رہے

قصۂ فرقت نہ سُننا ہی بہت اچھا ہُوا — آپ کے عشرت کدہ میں کیوں کسی کا غم رہے

چار کے کاندھوں پہ ہوں اللہ رے بیچارگی — پائے نافرماں لحد کا قرب پا کر تھم رہے

مسکراتے بزم کی بالیں پہ آ جائیں جو آپ
زندگی کو رشک ہو وہ موت کا عالم رہے

مرزا عاشق حسین بزمؔ

واقعاتِ سنہ ہجری پر ایک نظر

سنہ ۱ھ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی اور اسی سال مسجد نبوی کی تعمیر ہوئی۔

سنہ ۲ھ بدر کا واقعہ پیش آیا۔ ابوجہل اسی لڑائی میں مارا گیا اور نماز روزہ بھی اسی سال فرض ہوئے۔

سنہ ۳ھ جنگِ اُحد میں رسول اللہ صلعم کے دندانِ مبارک شہید ہوئے اور اسی سال آپ نے حفصہؓ سے نکاح کیا۔

سنہ ۴ھ شراب حرام ہوئی اور امام حسینؓ کی ولادت ہوئی۔

سنہ ۵ھ ابوسفیان کی سپہ سالاری میں دس ہزار قریش کے سیلاب نے مدینہ کا رُخ کیا۔ آنحضرتؐ نے مدینہ سے باہر نکل کر سلع کے آگے ایک خندق تیار کرائی جس کا رواج اس سے پہلے عرب میں نہ تھا۔

سنہ ۷ھ آنحضرتؐ نے چودہ سو پیدل اور دو سو سواروں کے ساتھ خیبر کا رُخ کیا اور اسی سال مرحب حضرت علیؓ کے ہاتھ سے مارا گیا۔

سنہ ۸ھ آنحضرتؐ نے مکہ فتح کیا۔

سنہ ۹ھ آنحضرتؐ نے ازواجِ مطہرات سے ناراض ہو کر علیحدگی اختیار کر لی جس کی وجہ سے لوگوں کو گمان ہوا کہ آپ نے تمام ازواج کو طلاق دے دی ہے۔ اس سے سب کو رنج تھا لیکن حضرت عمرؓ کے کہنے پر آپ نے سب کو بُلا لیا تھا۔

سنہ ۱۰ھ تمام اطرافِ عرب سے نہایت کثرت کے ساتھ سفارتیں آئیں اور ہزاروں لاکھوں آدمی اسلام کے حلقہ میں آئے۔

سنہ ۱۱ھ حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے انتقال فرمایا اور خلافت کا سب سے پہلا زینہ قائم ہوا اور تمام اُمت نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اپنا امام تسلیم کیا۔

سنہ ۱۳ھ حضرت ابوبکر صدیق سوا دو برس خلافت کر کے انتقال فرما گئے اور اسی سال حضرت عمرؓ نے عنانِ خلافت اپنے ہاتھ میں لی۔

سنہ ۱۴ھ حضرت عمر فاروق نے تراویح کی نماز کے لئے سب کو جمع کیا۔

سنہ ۱۵ھ حضرت سعد نے کوفہ آباد کیا۔

سنہ ۱۶ھ بغداد کے شہر جلولا میں ایسی زور سے آندھی آئی کہ زمین و آسمان میں اندھیرا چھا گیا اور اسی روز مسلمانوں اور ایرانیوں کی زبردست لڑائی ہو رہی تھی۔ حضرت سعد نے عراق میں سب سے پہلی بار جمعہ پڑھا اور اسی سال بیت المقدس فتح ہوا۔ حضرت عمرؓ صحابہ کرامؓ اور ہرمزان کے مشورہ سے سنہ ہجری قائم ہوا۔ آنحضرت صلعم نے

ربیع الاوّل میں ہجرت فرمائی تھی۔ اس لئے سنہ ہجری کی ابتدا ربیع الاوّل سے ہونی چاہئے تھی۔ مگر چونکہ عرب میں سال محرم سے شروع ہوتا ہے اس لئے دو مہینہ آٹھ دن چھوڑ دیئے گئے۔

سنہ ۱۷ھ شام و مصر و عراق میں سخت وبا پھیلی۔ اور اسلام کی بڑی بڑی یادگاریں خاک میں مل گئیں۔ کوفہ میں آگ لگ گئی جس سے جامع مسجد، ایوانِ حکومت، دفتر اور قید خانہ کی عمارتیں جل گئیں۔ حجاز میں سخت قحط پڑا۔ لیکن جب لوگوں نے صدق دل سے دعائیں مانگیں تو اسی وقت بارش شروع ہوئی اور کئی روز تک متواتر رہی۔

سنہ ۲۰ھ حضرت عمرؓ نے خیبر اور نجران سے یہود کو جلاوطن کیا اور اسی سال نہاوند فتح ہوا تھا۔ اس فتح سے پورے عراق عجم پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ اس لڑائی میں تیس ہزار عجمی مارے گئے۔

سنہ ۲۳ھ حضرت عمرؓ کو شہادت نصیب ہوئی۔

سنہ ۲۴ھ حضرت عثمان بن عفان تختِ خلافت پر رونق افروز ہوئے۔

سنہ ۲۶ھ حضرت عثمان نے کچھ مکانات خرید کر مسجد حرام کو وسیع کر دیا۔

سنہ ۲۸ھ امیر معاویہ پہلی مرتبہ اسلامی بیڑا لے کر بحر روم میں اترے۔

سنہ ۲۹ھ حضرت عثمان غنیؓ شہید کر دیئے گئے۔ اور امیر المؤمنین حضرت علی کرّم اللہ وجہہ مسندِ خلافت پر جلوہ فرما ہوئے

سنہ ۳۵ھ حضرت علی کرم اللہ وجہہ خلیفہ بنائے گئے۔

سنہ ۴۰ھ کوفہ میں حضرت علی کو جبکہ نمازِ صبح کے واسطے مسجد جا رہے تھے عبدالرحمٰن ابنِ ملجم نے زہر آلود تلوار سے زخمی کیا۔

سنہ ۴۱ھ حضرت امام حسنؓ کے بعد حضرت معاویہ تمام عالم اسلام کے خلیفہ مانے گئے۔

سنہ ۴۲ھ امیر معاویہ کا رومیوں سے پہلی بار مقابلہ ہوا۔ رومیوں نے شکست فاش کھائی اور ان کے بطریقوں کی بڑی تعداد کام میں آئی۔

سنہ ۴۹ھ حضرت حسن رضؓ کو زہر دے کر شہید کر ڈالا گیا۔

سنہ ۵۲ھ جنادہ ابی امیہ نے رودس کو فتح کیا اور حضرت امیر معاویہ نے یہاں بہت سے مسلمان آباد کیے۔

سنہ ۶۰ھ یزید خلیفہ ہوا۔

سنہ ۶۱ھ محرم کی دسویں کو حضرت امام حسین بمقام کربلا مع کثیر رفقاء اور عزیزوں کے شہید ہوئے۔

سنہ ۶۲ھ یزید نے مکہ معظمہ میں منجنیق سے پتھر برسائے جن کے شراروں سے کعبہ شریف کا پردہ اور اس کی چھت اور اس دنبہ کے سینگ جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کے فدیہ کے لئے بھیجا گیا تھا اور جو اب تک خانہ کعبہ کی چھت میں آویزاں تھے، سب جل گئے اور اسی سال خدا نے یزید کو ہمیشہ کے لئے سلا دیا۔

سنہ ۶۴ھ یزید کا بیٹا معاویہ وارثِ تختِ خلافت ہوا۔ لیکن وہ خود ہی چند روز کے بعد خلافت سے دستبردار ہو

کر دوسرے ماہ وفات پا گیا۔

سنہ ۸۰ھ حضرت امام ابوحنیفہ رح کوفہ میں پیدا ہوئے۔

سنہ ۸۳ھ حجاج نے شہر واسط کی بنیاد ڈالی۔

سنہ ۸۷ھ ولید نے جامع دمشق کی بنیاد ڈالی اور اسی سال مسجد نبوی کی توسیع اور تعمیر کے احکام جاری کئے۔

سنہ ۱۳۰ھ عربوں نے طارق بن زیاد کی قیادت میں ہسپانیہ کو فتح کیا اور اسی سال ہندوستان میں مسلمان داخل ہوئے۔

سنہ ۱۴۰ھ منصور نے شہر بغداد کی بنیاد ڈالی۔

سنہ ۱۴۵ھ منصور بغداد کی تعمیر سے فارغ ہوا۔

سنہ ۱۵۰ھ حضرت امام ابوحنیفہ رح نے بغداد میں انتقال فرمایا۔

سنہ ۱۵۱ھ منصور نے شہر رصافہ کو بنایا اور اُس کی دیواروں میں مضبوطی کے واسطے چونہ گچ وغیرہ لگایا۔

سنہ ۱۶۱ھ مہدی نے مکہ معظمہ کی سڑک اور سرائے اور حوض بنوائے۔

سنہ ۱۶۴ھ امام احمد بن حنبل بغداد میں تولد ہوئے۔

سنہ ۱۶۶ھ مہدی نے یمن میں سب سے پہلے اونٹوں اور خچروں کی ڈاک مقرر کی اور اُسی نے حجاز اور عراق میں بھی۔

سنہ ۱۶۷ھ مہدی نے توسیع مسجد حرام کے متعلق حکم دیا اور اس میں بہت سا رقبہ شامل کر لیا۔

سنہ ۱۶۹ھ مہدی نے شکار کے پیچھے گھوڑا ڈالا۔ شکار ایک برٹے گھر میں جا گھسا۔ گھوڑا بے تحاشا دوڑتا ہوا مکان میں گھس گیا۔ مہدی کی کمر میں دروازہ کے اندر داخل ہوتے ہوئے ایسی چوٹ لگی کہ مہدی اُسی وقت جاں بحق تسلیم ہو گیا۔

سنہ ۱۸۰ھ عہدِ ہارون الرشید میں ایک سخت زلزلہ آیا جس کے صدمہ سے اسکندریہ کے مناروں کے اُوپر کا حصّہ گر پڑا۔

سنہ ۱۸۳ھ ارمینیہ میں زبردست غدر ہُوا۔ قوم خزاج نے مسلمانوں کی بہت زیادہ خونریزی کی۔ حتیٰ کہ اُنھوں نے ایک لاکھ سے زاید مسلمانوں کو قید کر لیا اور بہت سے شہید کر دیئے۔

سنہ ۱۸۹ھ رومیوں نے اپنے یہاں سے مسلمانوں کو نکال دیا اور وہاں کوئی بھی مسلمان نہ رہا۔

سنہ ۲۱۲ھ مامون نے حدودِ روم کے قریب طوانہ میں جو ایک معمولی قصبہ تھا ایک شہر بسایا۔

سنہ ۲۱۶ھ بادشاہِ روم نے طرطوس وغیرہ پہنچ کر نہایت بے رحمی سے دو ہزار مسلمان شہید کر دیئے۔

سنہ ۲۱۸ھ خلیفہ المعتصم باللہ نے بابک کے مقابلہ میں جب فتح پائی تو سب سے پہلے بغداد میں اس کی خبر کبوتر لایا۔

سنہ ۲۲۴ھ عراق میں نہایت زور سے بادِ سموم چلی جس کی وجہ سے کوفہ، بصرہ اور بغداد کی تمام کھیتیاں جل گئیں اور مسافر ہلاک ہو گئے۔ یہ نقشہ پچاس روز تک اسی طرح رہا۔ حتے کہ ہمدان میں بھی آگ پہنچ گئی۔ اور وہاں کی کھیتیاں بھی جل گئیں اور مویشی مر گئے۔ سنجار میں بھی یہی حال ہو گیا۔ لوگوں نے بازاروں میں نکلنا بند کر دیا۔ راستوں کی آمد و رفت رُک گئی اور ایک خلقتِ عظیم اس قیامت کی نذر ہو گئی۔ اس کے بعد دمشق میں زلزلہ آیا اور ایسا

آیا کہ ہزاروں مکان گر گئے اور اُن کے نیچے صدہا اشخاص دب کر مر گئے اور یہی حال انطاکیہ جزیرہ اور موصل میں بھی ہوا۔ اس خوفناک حادثہ میں پچاس ہزار آدمی ہلاک ہو گئے۔

سنہ ۲۳۵ھ متوکل نے تمام نصاریٰ کو گلوبند باندھنے کا حکم دیا۔

سنہ ۲۳۷ھ عقلان میں آگ لگ گئی تین روز میں تمام گھر اور شہر جلا کر ڈھیر کر دیئے۔

سنہ ۲۵۱ھ المستعین باللہ نے ترکی فوج سے بغداد کا محاصرہ کرایا جس سے کہ بغداد کو سخت نقصان پہنچا۔

سنہ ۲۶۶ھ رومیوں نے کشت و خون کر کے دیار بکر پر قبضہ کیا اور اہلِ جزیرہ اور اہلِ موصل وہاں سے نکل بھاگے۔ اس سال اعراب خانہ کعبہ کے پردہ کو لوٹ کر لے گئے۔

سنہ ۲۶۹ھ بغداد میں اس شدت سے اولے پڑے کہ عمارات کو بہت ضرر پہنچا اور یک بیک کچھ ایسی شدید سردی پیدا ہو گئی کہ تمام بہنے والی چیزیں جم گئیں۔

سنہ ۲۷۰ھ دریائے نیل کا پانی سوکھ گیا۔ کہیں بھی تری کا نام و نشان باقی نہ رہا۔ جس کی وجہ سے مصر میں قحط پڑ گیا۔

سنہ ۲۸۱ھ رے، طبرستان میں پانی کی کمی آ گئی حتےٰ کہ تین طل پانی ایک درہم میں ملنے لگا۔ لوگوں نے قحط کے سبب مُردار کھانا شروع کیے اور اسی سال معتضد باللہ نے مکہ معظمہ میں دار الندوہ منہدم کر کے مسجد الحرام کے پاس ایک اور مسجد تعمیر کرائی۔

سنہ ۲۸۵ھ بصرہ میں ایک زرد رنگ کی آندھی آئی پھر سبز ہو گئی اس کے بعد سیاہ پڑ گئی اور تمام اطراف میں پھیل گئی۔ پھر آسمان سے ایک چادر گری جس کا وزن تقریباً ڈیڑھ سو درہم تھا۔ اس ہوا نے پانچ سو درخت اکھیڑ دیئے، پھر آسمان سے سیاہ سفید پتھر برسے۔

سنہ ۲۹۲ھ دجلہ میں بے حد طغیانی آنے کی وجہ سے بغداد کا اکثر حصہ تباہ ہو گیا۔

سنہ ۳۰۱ھ منصور اونٹ پر سوار ہو کر بغداد آیا اور اناالحق کا دعوےٰ کیا۔ المقتدر باللہ نے اُسے قید کر لیا۔

سنہ ۳۰۲ھ مقتدر باللہ نے اپنے پانچ لڑکوں کے ختنہ کرانے میں چھ لاکھ دینار خرچ کئے اور اسی سال قوم دیلم جو مجوسی تھی حسن بن علوی کے ہاتھ پر مسلمان ہوئی۔

سنہ ۳۰۸ھ حامد بن عباس نے جو بغداد کا حاکم تھا۔ بغداد پر بڑا ظلم توڑا جس کی وجہ سے رعایا میں بے چینی پھیل گئی اور غارت گری شروع ہو گئی۔ کئی روز تک لڑائی جاری رہی قید خانوں میں آگ لگا دی گئی۔ وزیر سلطنت کو پتھر مار مار کر ہلاک کر ڈالا۔ اور دولتِ عباسیہ کا بدتر حال کر دیا۔

سنہ ۳۰۹ھ قاضی ابو عمر وغیرہ کے فتووں کے موافق منصور سولی پر چڑھا دیا گیا۔

سنہ ۳۱۴ھ دجلہ کا پانی اتنا منجمد ہوا کہ جانور اس پر چلنے لگے۔ ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔

سنہ ۳۱۵ھ دمیاط میں رومی گھس آئے۔ شہر کو لوٹا اور جامع مسجد میں ناقوس بجا دیا۔ اور دیلم نے رے اور جبال پر حملہ کیا خلقت کو قتل اور بچوں کو ذبح کر ڈالا۔

سنہ ۳۱۶ھ مقتدر باللہ نے قرمطی کے مقابلہ کے لئے فوجیں

روانہ کیں۔ مگر شکست کھا کر واپس آگئیں۔ نوبت بایں جا رسید کہ حج بند ہو گیا۔ مکہ والے مکہ شریف چھوڑ کر ادھر اُدھر بھاگے

اہلِ روم خلاط پر حملہ آور ہوئے اور وہاں کی جامع مسجد سے منبر نکال کر اُس کی جگہ صلیب قائم کر دی۔

۳۱۷ھ عین حج کے دن ابو سعید بن حسن بن بہرام جبالی کے لڑکے نے خانہ کعبہ کو تاخت و تاراج کیا۔ چاہِ زمزم اور حرم کعبہ نعشوں سے بھر دیا۔

۳۲۲ھ محمد بن علی سمنانی کا ظہور ہوا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ میں خدا ہوں اور مُردوں کو زندہ کرتا ہوں لیکن وہ قتل کر دیا گیا۔

۳۲۳ھ جمادی الاول کے مہینے میں آندھی آئی جس سے تمام دُنیا سیاہ ہو گئی اور ذوالقعدہ میں تمام رات بڑے بڑے ستارے ٹوٹتے رہے جتنے اس سے پہلے کبھی نہ ٹوٹے تھے۔

۳۲۸ھ دجلہ میں اُنیس گز پانی چڑھ گیا جس کی وجہ سے بغداد غرق ہو گیا۔ آدمی اور چوپائے ڈوب گئے۔ مکانات منہدم ہو گئے۔

۳۳۴ھ بغداد میں اس قدر گرانی ہوئی کہ لوگ مردار اور لید تک کھانے لگے۔ بہت سوں نے کُتے کاٹ کاٹ کر کھائے۔ مسکینوں کے پاس چھوٹے چھوٹے بھُنے ہوئے بچے پائے گئے۔ گویا لوگ بچوں کو بھُون بھُون کر کھا گئے۔

۳۳۹ھ المطیع اللہ ابو القاسم نے حجرِ اسود پھر اپنی جگہ رکھا اور اس کے گرد ایک چاندی کا حلقہ بنوا دیا جس کا وزن سات سو ساڑھے ستر درہم تھا۔

۳۴۴ھ مصر میں ایک زبردست زلزلہ آیا جس کی وجہ سے بہت سے مکانات منہدم ہو گئے۔ تین ساعت برابر زلزلہ رہا۔

۳۴۶ھ سمندر اسّی گز اُتر گیا اور اُس میں پہاڑ اور جزیرے اور ایسی ایسی اشیاء نظر آنے لگیں جو پہلے کبھی نہ دیکھی تھیں۔ رَے اور اُس کے اطراف میں سخت زلزلہ آیا اور مضافات میں ڈیڑھ سَو گاؤں زمین میں اُتر گئے۔ مُردوں کی ہڈیاں زمین سے باہر نکل پڑیں۔ چشمے جاری ہو گئے۔ ایک گاؤں ہوا میں لٹک گیا پھر گر کر دھنس گیا۔

۳۴۷ھ حلوان اور پہاڑوں میں پھر زلزلہ آیا۔ جس کی وجہ سے بہت سی خلقت مر گئی۔ اس کے بعد ٹڈی آئی۔ اور دُنیا میں پھیل گئی جو کھیتوں اور درختوں کو صاف کر گئی۔

۳۵۰ھ جزیرہ اقریطش کو رومیوں نے مسلمانوں سے چھین لیا۔

۳۵۹ھ عراق میں ایک ستارہ اتنا بڑا ٹوٹا کہ جس کی روشنی دُنیا میں پھیل گئی حتےٰ کہ شعاع آفتاب کے مثل ہو گئی۔ ستارہ ٹوٹنے کے بعد ایک سخت گرج کی آواز آئی۔

۳۶۲ھ عز الدولہ کے وزیر ابو الفضل شیرازی نے بغداد میں ایسی آگ لگائی کہ بہت سے گھر اور آدمی آگ کی نذر ہو گئے حتےٰ کہ وزیر تک بھی نہ بچ سکا اور جل گیا۔

۳۷۸ھ بصرہ میں سخت گرمی پڑی اور لُو چلی۔ پھر آندھی آئی۔ دجلہ کا پانی اس قدر سُوکھ گیا کہ زمین نظر آنے لگی۔

۳۹۶ھ ہندوستان میں سخت قحط پڑا جس کی وجہ سے بہت سے آدمی ہلاک ہو گئے۔

۳۹۸ھ بغداد کے اندر شیعہ سنی فساد بہت زبردست ہوا۔

۴۰۰ھ دجلہ چڑھ آیا جس سے سخت نقصان ہوا۔

۴۱۰ھ سلطان محمود غزنوی نے دار السلطنت غزنیں میں ایک مدرسہ جاری کیا اور فتوحات ہندوستان کا ایک قیمتی حصہ اس پر صرف کر دیا اور مصارف کے لئے دوامی جاگیر بھی وقف کر دی اور مسلسل لڑائیوں کے بعد سومنات کے مندر پر فتح حاصل کی۔

۴۱۸ھ مصر کے اندر ایسا قحط پڑا جس کی نظیر سوائے یوسف علیہ السلام کے زمانہ کے اور کسی زمانہ میں نہیں ملتی یہ قحط سات سال تک رہا بعض آدمیوں نے دوسرے آدمیوں کو کاٹ کاٹ کر کھایا۔

۴۶۱ھ جامع دمشق میں آگ لگ گئی۔ اس کے نقش و نگار جل گئے ۔ اس کی تمام خوبصورتی جاتی رہی۔ چھت میں جو چاندی سونا لگا ہوا تھا وہ بھی جاتا رہا۔

۴۶۶ھ بغداد میں سیلاب چڑھ آیا۔ دجلہ میں تیس گز سے بھی زیادہ پانی آگیا جو اس سے پہلے کبھی نہ آیا تھا۔ چوپائے مر گئے۔ لوگ کشتیوں میں پناہ گزیں ہو گئے۔ ایک لاکھ بلکہ اس سے بھی زیادہ مکان مسمار ہونے کی وجہ سے بغداد ایک چٹیل میدان بن گیا۔

۴۸۹ھ سوائے ستارۂ زحل کے تمام ہفت سیارے برج حوت میں جمع ہو گئے اس پر نجوموں نے متفقہ حکم لگایا کہ عنقریب حضرت نوح جیسا طوفان آئے گا مگر اس کے سوا اور کچھ بھی نہ ہوا کہ حجاج جس وقت دار المناقب میں جمع ہوئے تو ایک سیلاب آیا اور اکثر حجاج کو بہا لے گیا۔

۴۹۰ھ اہلِ فرنگ نے شام پر پہلی پیش قدمی کی تھی اور جو لوگ دریائے قسطنطنیہ کے راستے سے ایک بڑی فوج کے ساتھ آئے تھے انہوں نے یہاں اپنی مرضی کے موافق خوب کفر جاری کیا۔

۴۹۲ھ اہلِ فرنگ نے ڈیڑھ سال کی قلعہ بندی کے بعد بیت المقدس کو فتح کیا اور اس کے ساتھ علماء و زہاد کی ایک جماعت کو جس کی تعداد ستر ہزار سے بھی زائد تھی قتل کر ڈالا۔ یہودیوں کو ایک کنیسہ میں جمع کر کے اس میں آگ لگا دی۔ باقی ماندہ لوگ بغداد آ گئے اور انہوں نے وہاں کے ایسے ایسے مظالم بیان کئے کہ جن کو سن کر لوگوں کے آنسو بے اختیار نکل آئے۔ ان اندوہناک مظالم کو سن کر شاعروں نے ایسے پُر زور قصیدے لکھے کہ بادشاہوں نے غیرت زدہ ہو کر بالاتفاق حملہ کر دیا اور بیت المقدس فرنگیوں سے چھین لیا۔

۴۹۴ھ عراق میں باطنیوں کا زور پھیل گیا۔

۴۹۸ھ بغداد میں چیچک کے مرض کا اتنا زور ہوا کہ لاتعداد بچے ضائع ہو گئے اس کے بعد سخت وبا پھیل گئی۔

۴۹۹ھ نہاوند میں ایک شخص نے نبوت کا دعوے کیا بہت سے آدمی اس کے ساتھ ہو گئے۔ آخر قتل کر دیا گیا۔

۵۰۰ھ قلعہ اصفہان جو باطنیوں کے قبضہ میں تھا، سلطان محمد نے ایک سخت محاصرہ کے بعد چھین لیا۔

۵۰۲ھ مصر میں ایسی کالی آندھی آئی کہ مارے اندھیرے

کے ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دیتا تھا۔

۵۱۱ھ ایک سیل آیا اور سخت بارش ہوئی جس کی وجہ سے بخارا اور گرد و نواح کے اکثر گاؤں ڈوب گئے بہت سے آدمی ہلاک ہو گئے۔ یہاں تک کہ شہر کے دروازے تک پانی پہنچ گیا۔ دروازہ کو چند فرسخ تک پانی بہا لے گیا اور وہ مٹی کے اندر چھپ گیا۔

۵۲۴ھ بغداد میں پردار بچھو ظاہر ہوئے جن کے دو کانٹے ہوتے تھے۔

۵۳۱ھ ۲۹ رمضان شریف کو چاند نہ دکھلائی دیا۔ اہل بغداد نے تمام دن روزہ رکھا۔ اور جس وقت شام ہوئی تو ۳۰ تاریخ کو بھی چاند نظر نہ آیا، حالانکہ مطلع بالکل صاف تھا یہ ایک ایسی بات تھی جو کبھی نہ ہوئی تھی۔

۵۳۴ھ بغداد میں سخت زلزلہ آیا اور اس مرتبہ بغداد پانی کی طرح ہل گیا۔ حلوان کا ایک پہاڑ ٹوٹ کر گرا۔

۵۴۵ھ یمن میں خون کی بارش ہوئی۔ زمین کئی روز تک سرخ رہی۔ لوگوں کے کپڑے بھی سرخ ہو گئے۔

۵۶۹ھ سلطان نورالدین نے آشیانۂ خلافت میں بہت سے تحائف روانہ کئے جن میں ایک گدھا بھی تھا جس کے بدن پر خط بنے ہوئے تھے، وہ گدھا بہت کودنے والا تھا۔ خطوط کی وجہ سے اس کو عتابی کہتے تھے۔ اس سال نارنگی کے برابر اولے پڑے جن کی وجہ سے گڑھے پڑ گئے۔ مویشی مر گئے۔ دجلہ اس قدر چڑھ آیا کہ بغداد ڈوب گیا۔ فرات چڑھ آیا جس کی وجہ سے گاؤں اور کھیتیاں غرق ہو گئیں

مگر یہ بات تعجب کی ہے کہ اس قدر پانی ہونے کے باوجود دجیل کے باغات اور کھیت بغیر پانی کے سوکھ گئے۔

۵۷۴ھ بغداد کے اندر نہایت زور و شور کی آندھی رات کے قریب آئی اور آسمان کے اطراف میں آگ کے مینار سے قائم ہو گئے لیکن صبح کو یہ بات جاتی رہی۔

۵۷۶ھ الناصرالدین کے واسطے ہندوستان سے ایک آدمی ایسا طوطا لے گیا جو "قل ہو اللہ احد" پڑھتا تھا لیکن جب وہ بغداد پہنچ چکا تو رات کو طوطا مرا ہوا پایا۔ صبح کو وہ شخص بہت پریشان ہوا۔ اتنے میں خلیفہ کا ایک خادم آیا۔ اور اس نے اس سے وہ طوطا طلب کیا۔ یہ رو پڑا اور کہا کہ وہ تو رات کو ہی مر گیا۔ خادم نے کہا ہاں مجھے معلوم ہے کہ وہ مر چکا۔ لا مرا ہوا ہی دے دے اور یہ بتلا کہ تجھے خلیفہ سے کتنے انعام کی توقع تھی اس نے کہا پانچ سو دینار کی امید کر کے چلا تھا۔ خادم نے پانچ سو دینار کھول کر رکھ دیئے [illegible] خلیفہ نے تجھے عنایت کئے ہیں جس وقت تو ہندوستان سے [illegible] کر چلا تھا اسی وقت خلیفہ کو تیری خبر ہو گئی تھی۔

۵۸۲ھ ساتوں ستارے برج میزان میں جمع ہو گئے۔ اس پر منجموں نے حکم لگایا کہ جمادی الآخر کی نویں رات کو سخت آندھی آئے گی جس سے تمام شہر کے مسمار ہونے کا اندیشہ ہے۔ لوگوں نے یہ سن کر گڑھے کھود کھود کر ان میں رہنے کا ارادہ کر لیا۔ کھانا اور پانی بھی ان گڑھوں میں لے گئے اور نہایت تشویش کے ساتھ اس رات کا

انتظار کرنے لگے جس کے متعلق کہا گیا تھا کہ قوم عاد کی سی آندھی آئے گی۔ لیکن اُس رات اتنی بھی ہوا نہ چلی کہ چراغ بھی گل کر دے۔

۵۹۱ھ ناصر الدین اللہ نے نامہ بر کبوتروں کے لئے ایک وسیع محکمہ قائم کیا۔

۵۹۲ھ مکہ معظمہ میں کالی آندھی آئی جس کی وجہ سے دُنیا میں اندھیرا چھا گیا۔ لوگوں پر سُرخ ریت برسی۔ رکن یمانی سے ایک قطعہ گر گیا۔

۵۹۳ھ ایک بہت بڑا ستارہ ٹوٹا اور اس کے ٹوٹنے کے ساتھ اس قدر سخت دھماکا ہوا جس کی وجہ سے مکان اور دیواریں ہل گئیں۔ لوگوں نے خیال کیا قیامت آگئی۔ اس سال ملک العزیز سلطان صلاح الدین کے بیٹے نے اہرام مصر کو ڈھانا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

۵۹۶ھ دریائے نیل کا پانی اُتر گیا اور تیرہ گز تک پانی اندر کی طرف ہو گیا اس کی وجہ سے اتنا سخت قحط پڑا کہ لوگوں نے مُردار اور چمڑے کھلم کھلا کھانے شروع کر دیئے۔ یہاں تک کہ لوگ بھوک کے مارے مُردوں کو قبر سے اُکھاڑ اُکھاڑ کر کھانے لگے۔ مصر بالکل تباہ ہو گیا۔ بھوک کے مارے اتنی مخلوق مر گئی کہ جدھر قدم یا آنکھ پڑتی تھی۔ مُردوں پر پڑتی تھی، مُردوں سے سڑک پٹی رہتی تھی۔ ان کا گوشت پرند یا چوپائے کھاتے ہوئے دکھلائی دیتے تھے۔

۵۹۷ھ مصر، شام میں نہایت سخت زلزلہ آیا جس کی وجہ سے مکان اور قلعے منہدم ہو گئے اور بصرہ کے قریب گاؤں دھنس گئے۔

۵۹۸ھ مصر کا قحط ختم ہوا۔

۵۹۹ھ محرم کی چاند رات کو صبح تک اس قدر تارے ٹوٹے کہ ٹڈیوں کی طرح اُڑتے ہوئے معلوم ہوتے تھے

۶۰۰ھ اہلِ فرنگ نے دریائے نیل کے راستے اشھد پر حملہ کیا۔ شہر پر قبضہ کر کے اس کو خوب لُوٹا اور قتل و غارتِ عام کر کے چلتے بنے۔

۶۵۲ھ عدن میں ایک آگ ظاہر ہوئی۔ اُس کے شرارے رات کو سمندر کی طرف اُڑتے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور دن کو دریا سے دھواں اُٹھتا ہوا دکھلائی دیتا تھا اور اسی سال مدینہ طیبہ میں بھی آگ ظاہر ہوئی۔

۶۶۱ھ بہت سے تاتاریوں نے ممالکِ اسلام میں سکونت اختیار کی۔

۶۶۲ھ مصر میں ایک سخت زلزلہ آیا۔

۶۶۳ھ قاہرہ کے مختلف مقامات میں آگ لگی اور اسی سال تاتاریوں کا سردار ہلاکو مرا۔

۶۶۵ھ الحاکم باللہ نے حسینیہ میں جامع مسجد کی تعمیر کا حکم دیا

۶۷۸ھ لکھنوتی (بنگال) میں طغرل نے بغاوت کی اور شاہی لشکر کو بار بار شکستیں دیں۔

۶۷۹ھ دیارِ مصر میں عرفہ کے روز بڑے بڑے اولے پڑے اور بجلی گری۔

۶۸۰ھ تاتاری لشکر شام پہنچا اور مسلمانوں سے گھمسان کی لڑائی ہوئی اور فتح مسلمانوں ہی کو ہوئی۔

۷۰۲ھ مصر اور شام میں ایک بہت بڑا زلزلہ آیا مکانوں

کے نیچے اکثر آدمی دب کر مر گئے۔

سنہ ۷۱۸ھ دریائے نیل برابر چڑھا رہا اور ساڑھے تین مہینے متواتر کھڑا رہا اس کا نقصان اس کے نفع سے بہت زیادہ تھا۔

سنہ ۷۱۹ھ دریائے نیل میں اتنی طغیانی آئی کہ کہیں سننے میں بھی نہ آئی تھی۔ بہت سی بستیاں اور آدمی ڈوب گئے۔

سنہ ۷۲۸ھ مکہ معظمہ کی مسجد حرام اور اُس کے دروازوں کی تعمیر کی گئی۔

سنہ ۷۳۳ھ کعبہ شریف کا دروازہ آبنوس کا بنوایا گیا۔ اور اس پر سونے کے پترے چڑھوائے گئے جن کا وزن پینتیس ہزار تین سو پینتالیس مثقال تھا۔ باب عتیق جس پر والیٔ یمن کا نام کندہ تھا اکھاڑ دیا گیا۔

سنہ ۷۴۴ھ محمد تغلق دہلی کے تخت پر بیٹھ کر منصوبہ بندی کے سلسلہ میں سب بادشاہوں پر فوقیت لے گیا۔

سنہ ۷۴۹ھ ایسا طاعون پھیلا کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

سنہ ۷۶۳ھ ہندوستان میں سخت قحط پڑا جس میں آدمی نے آدمی کو کھایا۔

سنہ ۷۷۳ھ طاغی تیمور لنگ نے خروج کیا جس نے ہزاروں لوگوں کو ہلاک اور شہروں کو تباہ کیا۔

سنہ ۷۷۷ھ دمشق میں سخت قحط پڑا۔

سنہ ۷۷۸ھ آفتاب و مہتاب دونوں کو پورا گہن لگا۔ شعبان کی ۱۴ تاریخ کو جب چاند نکلا تو گہن لگا ہوا تھا اور ۲۸ شعبان کو جب سورج نکلا تو گہن لگا ہوا تھا۔

سنہ ۷۸۴ھ حلب میں جامع مسجد کے اندر امام صاحب نماز پڑھا رہے تھے کہ کسی نے بیہودہ بکنا شروع کیا۔ امام صاحب نے نیّت نہ توڑی بلکہ نماز پوری کر کے جب سلام پھیرا تو لوگوں نے دیکھا کہ اس بیہودہ بکنے والے کی صُورت سُوّر کی سی ہو گئی ہے اور وہ جنگل کی طرف بھاگا چلا جا رہا ہے۔

سنہ ۸۱۲ھ پہلے دن دریائے نیل اس قدر نیچے اُتر گیا کہ جس کی کوئی انتہا نہ تھی۔ پھر خود بخود ہی اتنا چڑھ آیا کہ معمول سے بائیس گز اُوپر ہو گیا۔

سنہ ۸۱۹ھ مصر میں ایک شخص نے دعویٰ کیا کہ مَیں آسمان پر گیا اور وہاں خدا کو دیکھا اور ہمکلام ہوا لیکن لوگوں نے پاگل خیال کر کے پاگل خانہ میں بھجوا دیا۔

سنہ ۸۲۲ھ آذربیجان میں ایک سخت زلزلہ آیا جس کی وجہ سے اکثر آدمی مر گئے۔

سنہ ۸۲۳ھ شہر غزہ میں ایک اونٹ ذبح کیا گیا تو اس کا گوشت اس طرح چمکتا تھا جیسے چراغ چمکتا ہے۔ اس میں سے تھوڑا سا کتے کو ڈالا تو اُس نے بھی نہ کھایا۔

سنہ ۸۲۴ھ دریائے نیل اپنے پورے منتہا تک چڑھ آیا۔ جس کی وجہ سے بہت سی زراعت غرق ہو گئی۔

سنہ ۸۲۵ھ قاہرہ میں ایک خفیف زلزلہ آیا اور دریائے نیل بڑا ہو گیا۔

سنہ ۸۶۲ھ ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کیا۔

سنہ ۹۱۱ھ اسپین کے سیاح کولمبس نے سب سے پہلے امریکا کا پتہ لگایا۔ ہسپانیوں نے غرناطہ پر حملہ کیا اور عربوں کو اندلس سے نکال دیا۔

سنہ ۹۴۷ھ ترکوں نے وائنا پر حملہ کیا۔

سنہ ۹۷۵ھ ہندوستان میں اکبر اعظم تخت نشین ہوا۔

سنہ ۹۹۶ھ عمر خیام نے ۱۰ رمضان المبارک کو سنہ جلالی کی بنیاد ڈالی۔

سنہ ۱۰۰۱ھ گریگوری اول کا فرمان اسپین، اٹلی، پرتگال، فرانس سوئٹزرلینڈ، جرمنی، نیدرلینڈ کے کیتھولک فرقوں میں جاری ہوا۔

سنہ ۱۰۳۲ھ ہندوستان میں انگریز پہلی مرتبہ داخل ہوئے۔

سنہ ۱۰۵۰ھ شاہجہاں نے ممتاز محل کی یادگار میں آگرہ کے اندر دُنیا کی سب سے حسین عمارت تاج محل کی بنیاد قایم کی۔

سنہ ۱۰۷۵ھ شاہجہاں [illegible] موتی مسجد کو تعمیر کرایا۔

سنہ ۱۰۶۰ھ دہلی کی جامع مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔

سنہ ۱۰۶۱ھ بمبئی کا احاطہ قائم ہوا۔

سنہ ۱۱۰۰ھ کلکتہ کی بنیاد رکھی گئی۔

سنہ ۱۱۲۶ھ اورنگ زیب فوت ہوا۔

سنہ ۱۱۷۵ھ مشہور جنگ ہفت سالہ چھڑ گئی یورپ، ہندوستان اور امریکہ تینوں کارزار قرار پائے۔

سنہ ۱۱۷۶ھ انگلستان کے معاون فریڈرک اعظم نے فرانس کو ایک ایسی زبردست شکست دی کہ یورپ بھر میں اس کی ہوا اُکھڑ گئی اور اس فتح سے سلطنت جرمنی کی موجودہ عظمت کی بنیاد پڑی۔ کلائیو نے بھی اسی سال ہندوستان میں پلاسی کی مشہور لڑائی جیتی۔ جس سے کُل صوبہ بنگال پر انگلستان کا قبضہ ہوگیا۔

سنہ ۱۱۷۸ھ امریکہ میں جنرل وُلف نے کوبیک کی لڑائی میں فرانسیسیوں کو ایسی خبر لی کہ ان کے اس ملک سے قدم اُکھڑ گئے۔

سنہ ۱۱۷۹ھ کُل شمالی امریکہ پر انگلستان کا پھریرا لہرانے لگا۔

سنہ ۱۲۰۲ھ انگلستان کو امریکہ کی آزادی تسلیم کرنی پڑی۔

سنہ ۱۲۰۸ھ واشنگٹن امریکہ کا صدر منتخب ہوا۔

سنہ ۱۲۲۴ھ نپولین پیرس میں داخل ہوا۔

سنہ ۱۲۳۲ھ انگریزوں کا لنکا پر قبضہ ہوا اور اسی سال تھر کے چھاپے کی کل ایجاد ہوئی۔

سنہ ۱۲۴۹ھ ولایت میں پہلی مرتبہ ریل جاری ہوئی۔

سنہ ۱۲۵۷ھ حصار، گوڑگانوہ، دہلی، اٹاوہ، مین پوری وغیرہ میں سخت قحط پڑا۔

سنہ ۱۲۵۸ھ چین کی پہلی جنگ۔

سنہ ۱۲۷۶ھ ہندوستان کا غدر مشہور ہے۔

سنہ ۱۲۷۷ھ عمر خیام کی پچھتر رباعیات کا انگریزی ترجمہ سب سے پہلی بار شائع ہوا۔

سنہ ۱۲۸۰ھ اس قحط سے زیادہ ہندوستان میں کوئی سخت قحط نہ پڑا۔

سنہ ۱۲۹۵ھ چین میں ریل جاری ہوئی۔

سنہ ۱۲۹۶ھ روس اور ٹرکی میں لڑائی اسی سال ہوئی۔

سنہ ۱۳۰۰ھ مصطفٰے کمال پاشا سالونیکا میں پیدا ہوا۔

سنہ ۱۳۲۴ھ پنجاب میں ایک زبردست زلزلہ آیا۔

سنہ ۱۳۲۵ھ روس اور جاپان میں جنگ ہوئی۔

۱۳۳۸ھ افغانستان کی لڑائی مشہور ہے۔

۱۳۳۹ھ اتحادیوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرلیا اور تمام قوم پرستوں کو جزیرۂ مالٹا میں بھیج دیا۔ مجلس ملی کبیر کا اجلاس انگورہ میں۔ یونان کا حملہ۔ یونانیوں نے ترک قوم پرستوں کو قسطنطنیہ سے نکال دیا۔

۱۳۴۰ھ یونانیوں کی شکست اور مصطفےٰ کمال ترکی کا پہلا ڈکٹیٹر بنایا گیا۔

۱۳۴۱ھ سمرنا پر ترکوں نے قبضہ کرلیا اور چنک کے مقام پر انگریزوں سے لڑے۔

۱۳۴۲ھ انگورہ کو دارالسلطنت بنایا گیا۔

۱۳۴۳ھ مصطفےٰ کمال پاشا نے خلافت کو ملیا میٹ کر کے جدید ترکی کی بنیاد ڈالی اور قدامت پسند دیو کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔

۱۳۴۶ھ شام کو ایک نور آسمان پر پیدا ہوا اور اس نور میں "محمد" کا نام بخطِ نور نظر آیا۔ جو بہت دیر تک قائم رہا اور اس کو بہت سے شہروں میں لاکھوں ہندو مسلمانوں نے دیکھا اور اس واقعہ کی تصدیق جبلپور کے یوروپین کلکٹر نے کی۔

۱۳۴۷ھ کشمیر میں زبردست سیلاب آیا جس سے زبردست تباہی ہوئی۔ امیر امان اللہ خاں شاہِ کابل بھی اسی سال تخت سے دست بردار ہوئے۔

۱۳۵۳ھ صوبۂ بہار میں زلزلہ آیا جس سے بہت زیادہ نقصان ہوا۔

۱۳۵۴ھ کوئٹہ کا زلزلہ عظیم اب تک دلوں سے نہیں بھلایا جا سکا۔

۱۳۵۵ھ حبش والوں کو اپنی آزادی اٹلی کے حوالہ کرنا پڑی۔

۱۳۵۶ھ شہنشاہ جارج ششم کی تخت نشینی اور اسکندرونہ کی واپسی۔

۱۳۵۷ھ ترکی میں ایسا قیامت خیز زلزلہ آیا کہ جس کی مثال پہلے کبھی ترکی میں نہیں ملتی۔ آٹھ سو آدمی ہلاک اور لاپتہ ہیں پچاس ہزار اشخاص بے گھر بار مارے مارے پھر رہے ہیں اٹھارہ گاؤں صفحۂ ہستی سے قطعی نیست و نابود ہو گئے اور ۲۲ گاؤں تباہ و برباد ہو گئے زمین شق ہو گئی اور اس میں سے گرم پانی ابل ابل کر نکلنے لگا جاپان میں ایک زبردست سیلاب آیا اور اس سال شاعرِ اعظم علامہ اقبال کی وفات ہوئی — "اب آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟"

کامدار الدنی

نوٹ:- اس مضمون میں بعض واقعات غیر اہم اور بعض مشتبہ نوعیت کے ہیں۔ لیکن بحیثیتِ مجموعی مضمون مفید ہے۔ اور نوجوان مورخ کامدار صاحب کی کاوش حوصلہ افزائی کی مستحق ہے۔ "ہمایوں"

یادِ اقبال

آہ! اے اقبال! اے ہندوستاں کے رہنما
کاروانِ قوم کے، سارے جہاں کا رہنما

یاد آتی ہیں تری رنگیں نوائیں آہ آہ
خواب بن کر رہ گئیں تیری صدائیں آہ آہ

کیا ہُوا بزمِ جہاں میں گر نہیں موجود تُو
نام دُنیا میں ترا وردِ زباں ہے چار سُو

موت کیا ہے؟ صُورتِ ظاہر کا چھپ جانا کہیں
اس سے ہو جاتے ہیں لیکن جوہرِ شاعر مُبیں

موت پا کر جاودانی ہو گئی ہستی تری
مَوت نے پیغام نیرا کر دیا ہے سرمدی

روز و شب پیغامِ آزادی ہمیں دیتا ہے تُو
اب بھی کشتی قوم کی گرداب میں کھیتا ہے تُو

تُو پڑھاتا ہے ہمیں اب بھی وہی درسِ خودی
سونپ دی تدبیر کو تُو نے عناں تقدیر کی

رہنمائے نوعِ انساں اب بھی تیرا فلسفا
ہے جہاں میں جادۂ روشن برائے ارتقا

اب بھی کرتی ہے تری تعلیم دل پر وہ فسوں
چند لمحوں میں اُلٹ جاتی ہے تقدیرِ نگوں

کھول دیں گے اک زمانے پر خودی کا راز ہم
بسکہ ہیں گرمِ عمل سُن کر تری آواز ہم

منوہر لال ہادی

نغمۂ اقبال

مبارک تجھ کو اے اقبال ذوقِ زمزمہ خوانی
فروغِ محفلِ ملّت ہے تیری شعلہ افشانی

فضائے اوجِ انسانی پہ تو آباد ہے گویا
غلامی کے جہاں کا طائرِ آزاد ہے گویا

سوادِ ہند میں چھیڑا ربابِ دل نشیں تو نے
دیا دُنیا کو پیغامِ محبّت آفریں تو نے

تری تخئیل نے مردہ دلوں کو زندگی بخشی
جبینِ ذرّۂ ناچیز کو تابندگی بخشی

وہ تیرا نغمۂ رنگیں نشاطِ روح کا ساماں
مجسّم رقص و موسیقی، سراپا شعلۂ لرزاں

ترا نغمہ جنودِ ہند کو ہے درسِ بیداری
خرامِ موجِ آزادی، پیامِ اوجِ خودداری

ترا نغمہ عدو کے مکر کو بیکار کرتا ہے
جوانانِ وطن کو خواب سے بیدار کرتا ہے

فضائے روح پر چھایا سحابِ زندگی بن کر
گیا ہر باغِ ملّت میں شبابِ تازگی بن کر

عراق و ہند سب گرما گئے تیری نواؤں سے
عرب سے تا عجم چھائے ہوئے ہیں زمزمے تیرے

حجازی نغمہ کی لہریں ہیں بھارت کی ہواؤں میں
ہے بُوئے گلشنِ بطحا ہمالہ کی فضاؤں میں

ہربنس لعل نسیمؔ

ماضی حال اور مستقبل

یہ مضمون انگلستان کے مشہور مضمون نگار و فلاسفر مسٹر ایچ۔جی۔ ویلز کے آیندہ زمانے کے متعلق خیالات کا نچوڑ ہے۔ یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ یورپ کے حالات پر مبنی ہے۔ یعنی جب وہ یہ لکھتے ہیں کہ ۱۸۸۷ء میں یہ حالت تھی اب یہ ہے اور پچاس سال کے بعد یہ ہوگی تو وہ صرف انگلستان یا زیادہ سے زیادہ یورپ کے حالات ہی کو مدِ نظر رکھ کر خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ جاننا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ جو حالات وہ آج کل کے زمانے کے بتاتے ہیں وہ موجودہ ہندوستان پر عائد نہیں ہوتے بلکہ یورپ میں پچاس سال پہلے کی جو زندگی بیان کی گئی ہے وہ کم و بیش آج کل ہندوستان کی زندگی ہے۔ (ج)

مستقبل کے متعلق کوئی صحیح اندازہ لگانا ناممکنات میں سے ہے۔ باوجود اس کے ہم یہ ضرور سمجھ سکتے ہیں کہ آئندہ زمانے میں کیا کیا امکانات موجود ہیں۔ آج کل کی دُنیا میں چاروں طرف جنگ و جدل کے مہیب بادل چھائے ہوئے ہیں جو یقیناً انسانی زندگی کے لئے خطرناک ثابت ہوں گے لیکن پھر بھی پچاس سال آئندہ کے عام لوگ ہم لوگوں سے کئی باتوں میں اچھے ہوں گے۔ یہ بربادیاں اور آفتیں جو آج کل ہم لوگوں کے سامنے نازل ہو رہی ہیں عام زندگی کی ترقی اور نئی ایجادات کو ہرگز نہ روک سکیں گی بلکہ نئی ایجادوں میں کچھ تاخیر بھی نہ ہوگی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ترقی زندگی کا لازمہ ہے۔ شاید آدمی کبھی "انسان" نہیں بنا۔ قدیم وقتوں میں جب دُنیا میں تمام طرف تاریکی تھی اس وقت بھی دُنیا ساکت و ساکن نہ تھی بلکہ آگے بڑھ رہی تھی۔ اور وقت کی تقسیم، فنِ جہازرانی، علم کیمیا اور دھاتوں کے صاف کرنے کا فن —— یہ تمام ترقی کر رہے تھے اور واقفیت کی روشنی میں آہستہ آہستہ نمودار ہو رہے تھے۔

۱۸۸۷ء کی زندگی:-

۱۸۸۷ء میں عام لوگ گرہستی زندگی بسر کرتے تھے۔ صاحب خانہ کی ایک بیوی اور تین چار سے لے کر درجن بھر تک بچے ہوا کرتے تھے۔ تمام کام گھر میں ہی ہوا کرتا تھا، گھر کی صفائی گھر والے خود ہی کیا کرتے تھے۔ کپڑے گھر ہی میں دھوئے جاتے تھے۔ بچوں کے کپڑے گھر ہی میں سلتے تھے۔ کھانا گھر ہی میں پکتا اور گھر ہی میں کھایا جاتا تھا۔ ابھی لوگ "تیار کھانا" اور بند ڈبے کے مربے اچار وغیرہ سے ناواقف تھے۔ دیہات میں ترکاری کے کھیت تھے۔ بچوں کو جس قدر جلد ممکن ہو سکتا تھا گھر کے کام میں لگا دیا جاتا تھا۔ اُن کی تعلیم بارہ تیرہ برس کی عمر تک یا اس سے بھی پیشتر ختم ہو جایا کرتی تھی اور تعلیم کے مدارج اکثر "گھر" ہی میں طے

ہوتے تھے۔ یہ تھی وہ گھریلو زندگی جو اُن لوگوں کے نصیب میں تھی۔

معاشرتی زندگی بھی زیادہ وسیع نہ تھی۔ چند احباب کچھ ہمسائے اور زیادہ تر اپنے عزیز و اقارب بس انہی لوگوں سے ربط ضبط اور میل جول ہوتا تھا۔ مرد میل ملاپ کے لئے اکثر شراب خانوں میں کچھ وقت گزارتے تھے۔ اپنی زندگی میں تبدیلی پیدا کرنے کے نام سے وہ لوگ گھبراتے اور خوف کھاتے تھے۔ ہر نئی چیز اور نئے خیال کو ایک انوکھی حیرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

آجکل کی زندگی:۔

آج کل مذکورہ بالا قسم کے گھر کا وجود اقتصادی حالات کی وجہ سے ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ گھر میں بچوں کی تعداد میں نمایاں کمی ہوگئی ہے اور اب ان سے گھر کے کاموں میں بھی مدد نہیں لی جاتی۔ اب گھر کے معنی صرف وہ چند کمرے ہیں جس میں ایک کنبہ سوتا ہے اور کھانا کھاتا ہے، اسکول اب بچوں کی تعلیم و تربیت کا مرکز ہوگیا ہے اور بچوں کے کھیل کود اور تفریح کا سامان بھی وہیں مہیا کر دیا جاتا ہے۔ اسکولوں کی تعداد اور اہمیت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ گھروں میں اب بہت تبدیلیاں ہوتی جاتی ہیں "گھر کی زندگی" تو اب غائب ہو رہی ہے۔

آج کل کا ایک عام شہری ۱۸۰۱ء کے عام لوگوں سے زیادہ تندرست ہے اور زیادہ دلچسپ زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کی معلومات عامہ واقفیت بھی زیادہ ہے۔ اپنے آبا و اجداد کے مقابلے میں اچھا کھاتا اچھا پہنتا اور اچھے مکانوں میں زندگی گزارتا ہے۔

چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز میں ایک "حسن" ہوتا ہے جس کو معلوم کرنے کے لئے انسان اُس پر غور کرتا ہے کام کرنے کے صحیح طریقے پر جتنا غور آج کل کیا جاتا ہے شاید کبھی یہ کیفیت نہ تھی۔ آج کل کے لوگ روز بروز ترقی کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ آپ چاہے ڈکٹیٹر ہوں یا جمہوریت میں اعتقاد رکھتے ہوں۔ کوئی افسر ہوں یا کسی بھی عہدہ پر ممتاز ہوں اگر آپ پانی کا جہاز یا ہوائی جہاز بنانا چاہتے ہیں یا بجلی سے ایک شہر کو روشن کرنا چاہتے ہیں یا مدرسوں کی استعداد بڑھانا چاہتے ہیں، آپ کو بہرحالت میں چند خاص طریق اختیار کرنے پڑیں گے اگر ایسا نہ کریں گے تو کامیابی حاصل نہ ہوگی۔

آج کل دُنیا بہت منور ہے۔ روس کا مشہور حکمران پیٹر اعظم عوام اور دُنیا سے چھپ کر ہر ایک بات کر سکتا تھا مگر زبردست اسٹیلن ایسا نہیں کر سکتا۔ آج کل کے عام شہری کو خواہ وہ حاکم ہو یا غلام حکومت ایک خاص طرح رکھنے پر مجبور ہے۔ حکومت کو سب کے لئے رہنے کی جگہ کا اور کھانے پینے کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ سیر و تفریح کا سامان بھی مہیا کرنا پڑتا ہے۔ عوام کی دلچسپیوں کا خیال رکھا جاتا ہے اور انہیں کسی قدر آزادی بھی دی جاتی ہے۔

دُنیا روز بروز ترقی کر رہی ہے لاکھوں دماغ زندگی کو بہتر بنانے میں دن رات کوشاں اور مشغول رہتے ہیں۔ ہم کسی بھی بنا پر یہ یقین نہیں کر سکتے کہ یہ ترقی بند ہو جائے گی یا یہ کوششیں رُک جائیں گی۔ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ دُنیا کی ہر ایک

چیزیں بھی ترقی ہوتی رہے گی۔ آہستہ آہستہ یہ انقلاب آتا رہے گا۔" دھیمے دھیمے بڑھتے ہوئے سیلاب کی طرح، جو اس کے سامنے آنے کی کوشش کرے گا مُنہ کی کھائے گا۔"

۱۹۸۷ء کی زندگی :-

انہی حالات کو مدِّ نظر رکھ کر ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ۱۹۸۷ء کی زندگی کیا ہو گی۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ خانگی زندگی روز بروز زوال پر ہے پس ہم بلاشک یہ کہہ سکتے ہیں کہ ۱۹۸۷ء میں خانگی زندگی کا بالکل خاتمہ ہو جائے گا۔

اُس زمانے کے لوگ ہم لوگوں سے زیادہ توانا اور صحت مند ہوں گے اور قد میں بھی وسطاً ایک انچ کے لگ بھگ اُونچے ہونگے۔ وہ لوگ زیادہ آزاد، زیادہ صاف گو اور صحیح معنوں میں خوش حال ہوں گے۔ ایک دوسرے کے کام سے انہیں دلچسپی ہو گی۔ حسد کا مادہ جاتا رہے گا۔ عام لوگوں سے انہیں اُنس ہو گا۔ طبیعت کے سُست ہونے کی شکایت باقی نہ رہے گی۔

یہ خوش طبعی اُن کے لباس، اُن کی آرائش و آراستگی کے سامان ان کے مکانات بلکہ شہروں کے نقشہ جات تک سے ظاہر ہو گی کسی جگہ یہ نوٹس لگانے کی ضرورت محسوس نہ ہو گی کہ " یہ شارع عام نہیں ہے" یا " گزرنا منع ہے"۔ تمام راستے، گلیاں، سڑکیں کھیت ہر ایک کو خوش آمدید کہیں گے۔ ہر شخص ہر جگہ روک ٹوک کے بغیر جا سکے گا۔ بڑے بڑے کارخانوں میں بھی لوگ آزادی سے داخل ہو سکیں گے اور کاریگروں کو چلتی ہوئی مشینوں پر کام کرتے ہوئے دیکھ سکیں گے۔ کوئی بات پوشیدہ نہ رہے گی اور نہ رکھی جائے گی۔

دستکاروں کو بہت سی نئی نئی چیزیں استعمال میں لانے کی مِل جائیں گی مکانات اب تک لکڑی پتھر اور اینٹوں سے ہی بنا کرتے تھے۔ پھر لوہا بھی استعمال میں آنے لگا۔ اب چند ہی سال سے شیشہ بھی استعمال میں لایا جا رہا ہے کپڑے ہمیشہ سے اُون رُوئی، سلک یا سُوت کے بنتے چلے آئے ہیں مگر آج کل دستکاروں اور کاریگروں کو ہزاروں زیادہ پائیدار اور زیادہ خوبصورت نئی نئی چیزیں حاصل ہو گئی ہیں۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے ہنری فورڈ کہہ رہا تھا کہ اب میری موٹریں سویا بین کے بیجوں سے بنا کریں گی! کئی پُرانے خیالات کے کھوسٹ بُڈھے اپنی آنے والی نسلوں کو بدکار، سرکش، مصنوعی بے حس، فضول خرچ اور بے وقوف سمجھتے ہیں۔ شاید وہ ان سے نفرت کرتے ہیں۔ کہتے ہیں :" واہ تم بھی خوب ہو خوب تمہاری زندگی ہے۔ واہ ری نئی دُنیا واہ "+ آئندہ آنے والی نسلوں سے ہمیں بہت اُمیدیں ہیں۔ چاہے کتنی ہی تباہ کاریاں و حادثات پیش آئیں پھر بھی وہ لوگ ہم سے زیادہ صحت مند زیادہ کشادہ دماغ اور زیادہ وسیع تعلقات والے ہونگے۔ ہر چیز سے انہیں دلچسپی ہو گی۔ دن خوب بڑے بڑے ہوں گے۔ لوگوں کو خوب فرصت مِلا کرے گی کیونکہ بہت سے کام مشینوں سے ہُوا کریں گے عام شہری اس زمانے میں بھی ایک کاریگر ہو گا لیکن زیادہ گندہ اور محنت طلب کام سب مشینیں کیا کریں گی۔ اس زمانہ کا ایک ادنیٰ ترین کاریگر آج کل کے اچھے اچھے کاریگروں سے بہتر ہو گا + آپ یہ پوچھیں گے " کیا وہ لوگ کچھ زیادہ خوشی اور قناعت کی زندگی بسر کریں گے؟" ہرگز نہیں۔ وہ بھی ہر ایک نئی چیز کو مشکوک نگاہوں سے دیکھیں گے۔ نئی روشنی اور نئے خیالات کو بُرا بھلا کہتے پھریں گے پُرانے وقتوں کو وہ ایک حسرت بھری نگاہ سے دیکھیں گے اور شکر کریں گے کہ وہ ۲۰۳۷ء میں جب اور بھی تبدیلیاں ہو جائینگی زندہ نہیں رہیں گے

"چاند"

محفلِ ادب

آستانِ اقبال پر سجدہ ہائے عقیدت

(محمد فاضل)

حضرت علامہؒ مرحوم کی شخصیت کی عظمت و مرتبت کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ کروڑوں دلوں نے ان کے قدموں پر جبینِ نیاز خم کی لاتعداد انسانوں نے ان سے ملاقات کرنا اپنی زندگی کا سب سے بڑا اور موجبِ فخر و مباہات واقعہ سمجھا۔ انہیں شہرتِ دوام حاصل ہوئی اور ان کا نام ان کی زندگی ہی میں اقصائے عالم میں پھیل گیا۔

حضرت علامہؒ مرحوم کا نام میں نے پہلے پہل اپنے گاؤں کے سکول میں سُنا۔ "پوٹھوہار"، تحصیل گوجر خاں کے اس دیہاتی علاقہ میں جہاں علم و ادب کو عنقا و ہما کا درجہ حاصل ہے اور جس علاقہ کے باشندوں کی جہالت دیکھ کر اسے "جاہلستان" کہنا زیادہ موزوں ہے۔ لوگ دُنیا کے تمام نشیب و فراز سے ناواقف مگر حضرتِ مرحوم کے نام سے شناسا تھے۔ چوتھی پانچویں جماعت میں حضرت کا نام کانوں میں پڑا اور ساتھ ہی اپنے بعض اُستادوں سے سُننے میں آیا کہ سر محمد اقبال بڑے شاعر ہیں، لاہور رہتے ہیں اور ڈاکٹری پیشہ کرتے ہیں لیکن وہاں اس سے زیادہ کچھ نہ پتہ چل سکا کہ ڈاکٹر صاحب نے "نالۂ بلبل" اور "ہندوستاں ہمارا" کے سوا کچھ اور بھی لکھا ہے۔

مڈل کی جماعتوں میں حضرت علامہ کی نظم "کوہ ہمالہ" سماعت نواز ہوئی۔ اس نظم سے ہم اور تو کچھ حاصل نہ کر سکے۔ البتہ اس کے پہلے بند کے معانی پر اپنے اساتذہ کو خاموش اور انگشت بدنداں دیکھ کر یقین ہو گیا کہ سر اقبال کوئی بڑے آدمی ہیں کیونکہ ان کے شعر ہمارے اُستاد بھی نہیں سمجھ سکتے۔ حضرتِ علامہ کی شہرۂ آفاق نظم "شکوہ" تعلیم ختم کر چکنے کے بعد کسی کے پاس دیکھی اور پڑھی۔ "شکوہ" پڑھنے کے بعد احساس ہُوا کہ اس نظم کا لکھنے والا بڑا شاعر ہی نہیں بہت بڑا انسان بھی ہے۔

انہی ایّام میں حضرتِ علامہ کو نادر شاہ شاہِ افغانستان کی دعوت پر افغانستان جانا پڑا اور خوش قسمتی سے ایک اخبار میں ان کے جانے کی تاریخ بھی مجھے معلوم ہو گئی۔ "فرنٹیئر میل" جس پر حضرتِ مرحوم کو سفر کرنا تھا ہمارے گاؤں کے نزدیک گوجر خاں سٹیشن پر ہی ٹھہرتی تھی۔ گوجر خاں ہمارے گاؤں سے ۱۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ حضرت علامہ کے ساتھ سید راس مسعود مرحوم اور سید سلیمان ندوی بھی ہم سفر تھے۔ مولانا غلام رسول مہر پرائیویٹ سکرٹری کی حیثیت سے حضرتِ مرحوم کے ہمراہ تھے۔ میں اپنے برادرِ محترم نیک محمد صاحب کو ساتھ لے کر گوجر خاں چلا گیا۔ ٹرین آئی تو ہمیں حضرت علامہ کا شاہی ڈبہ ڈھونڈنے میں کچھ دقت نہ ہوئی جونہی ہم ڈبہ کے پاس پہنچے۔

ڈبہ کے "حصۂ کچن" کا دروازہ کھلا اور ایک ہٹا کٹا نوجوان کوٹ پتلون میں ملبوس دکھائی دیا۔ میں نے خیال کیا کہ ہو نہ ہو۔ یہ یا تو ڈاکٹر اقبال ہیں یا سید راس مسعود۔ وہ بھی نہیں تو مولانا مہر ہوں گے ورنہ راس مسعود کے پرائیویٹ سکرٹری ہوں گے۔ بہرحال میں نے جھک کر نہایت مؤدبانہ سلام کیا۔ اور مرعوب ہو کر کچھ بے معنی سا سوال کیا۔ معلوم ہُوا کہ میرے قیاسات غلط تھے اور وہ بچارے کوئی ملازمین میں سے تھے اُنہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب وغیرہ کو میں جانتا تو نہیں مگر جو ہیں وہ ڈبہ کی اگلی طرف ہیں۔ ہم آگے کی طرف بھاگے۔ دروازے بند تھے ڈرتے ڈرتے شیشوں میں سے جھانکنا شروع کیا۔ تین آدمی بیٹھے کھانا کھا رہے تھے جن میں مولانا غلام رسول مہر غالباً نہیں تھے ہم نے تینوں حضرات میں سے ایک کو ڈاکٹر اقبال، ایک کو راس مسعود مرحوم تصوّر کر کے دیکھ لیا اور مطمئن ہو گئے کہ آج ہم نے اپنی قوم کے دو بڑے آدمیوں کو دیکھ لیا۔ سید سلیمان ندوی غالباً وہاں نہ تھے کیونکہ ان تینوں میں داڑھی والا کوئی آدمی نہ تھا۔

مدرسی کے مختصر سے زمانہ میں لاہور کے اخبارات اور ادبی رسائل کو دیکھ کر جی چاہتا تھا کہ اے کاش! میں بھی اسی علم و ادب کی دُنیا میں چل رہوں۔ جو علوم و فنون کا مرکز اور سالک، مہر حفیظ، تاثیر اور ظفر علی خاں اور سب سے بڑھ کر اقبال کی قیام گاہ ہے۔ ان ناموں اور ان کے قلم سے نکلے ہوئے جواہر پاروں کو پڑھ کر دل بے اختیار پکار اُٹھتا تھا یٰلَیْتَنِی کُنْتُ مَعَھُمْ۔ خدا نے میری سُن لی اور میں اپنے ایک کرمفرما کی نوازش سے اچھی یا بُری زندگی گزارنے کے لئے لاہور آ گیا۔

لاہور آ کر بدقسمتی سے مجھے احمدیہ بلڈنگز کے لوگوں میں رہنا نصیب ہُوا جو بیشتر کورِ ذوق اور جذبات و احساساتِ لطیف سے معرّا تھے۔ ان کی کورِ ذوقی نے مجھے بھی ایک عرصہ تک لاہور کی علمی ادبی فضا اور اربابِ ذوق کی صحبتوں سے محروم رکھا۔ مگر بالآخر فطرتی میلانِ طبع تمام پابندیوں پر غالب آ گیا۔

اِدھر میرے سمندِ شوق نے پابندیوں سے آزاد ہونے کے لئے پَر تولے۔ اُدھر محترمی سالک صاحب کی محبوب شخصیت نے اپنی طرف کھینچا۔ سالک صاحب سے نیازمندانہ راہ و رسم ہو جانے اور ان مجالس سے فیضیاب ہونے کے بعد اقبال کی عظمت معلوم ہونے لگی۔ اور اقبال کو اقبال کی حیثیت سے میں نے سالک صاحب کے فیضان سے ہی دیکھا۔ ان ہی ایام میں حضرت علاّمہ کے نیاز حاصل کرنے کے لئے بے تابی پیدا ہوئی اور لحظہ بہ لحظہ بڑھتی رہی۔

انجمن حمایت اسلام کا جلسہ ہونے والا تھا۔ حضرت مرحوم کی صدارت کا اعلان ہو چکا تھا۔ میری مسرت و شادمانی کی کوئی انتہا نہ تھی اور میں اس خیال سے بے خود ہُوا جا رہا تھا کہ عنقریب اُس پیکرِ علم و فضل کے دیدار سے مشرف ہونے والا ہوں۔ جو فخرِ ایشیا، شاعرِ مشرق اور پیغمبرِ آزادی ہے۔

جلسہ سے دو تین روز قبل ایک کرمفرما کی زبانی معلوم ہُوا کہ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت علیل ہے اور وہ غالباً جلسہ میں تشریف نہیں لا سکیں گے۔ اس خبر سے دل میں مایوسی و محرومی کی ایک لہر دوڑ گئی مگر آتشِ شوق اور تیز ہو گئی۔ اور میں نے اس احساس کے باوجود کہ

ایک حقیر ذرہ آفتاب سے کسبِ فیض تو کرسکتا ہے مگر اس سے مل نہیں سکتا حضرت علاّمہ کی خدمت میں حاضر ہونے اور شرفِ باریابی حاصل کرنے کی ٹھان لی۔

انجمن کا جلسہ دیکھنے کی غرض سے میرے بچپن کے ہم ذوق دوست قاضی گلزار احمد صاحب آئے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے حضرت علاّمہ کی خدمت میں حاضری کا اشتیاق ظاہر کیا۔ میں پہلے ہی بیتاب تھا۔ قاضی صاحب کو ساتھ لیا اور حضرت علاّمہ صاحب کی کوٹھی کا رُخ کیا۔ ان ایام میں حضرت مرحوم میکلوڈ روڈ پر رہا کرتے تھے۔ اپنے مکان سے لے کر کوٹھی کے دروازہ تک ہم ہمہ تن شوق بنے چلے گئے مگر دروازہ پر پہنچ کر ہیبت طاری ہوگئی۔ قاضی صاحب جو پہلے بہت بیتاب تھے دروازہ پر پہنچ کر کہنے لگے، کہاں جا رہے ہو۔ ذرا سوچو تو، میں اور تم جہالت مآب علاقہ کے دو اکھڑ نوجوان علم و ادب سے بے بہرہ اور آفتابِ اقبالِ علم کے دربار میں! دو حقیر قطرے بحرِ بیکراں کے سامنے، کیا کرو گے وہاں جا کر۔ اور مجھے بتاؤ تو سہی کہ اگر ہم آستانِ حضرتِ اقبال تک پہنچ بھی گئے تو تم وہاں جا کر کہو گے کیا ؛

یہ باتیں خود میرے دل میں بھی پیدا ہو رہی تھیں۔ میرے پاس ان کا کوئی جواب نہ تھا۔ تاہم بے پناہ جذبۂ آستان بوسی اور آفتابِ علم کی کشش ہمیں باندھ کر وہاں تک لے ہی گئی۔ حاضری کی اجازت حاصل ہونے پر ملازم نے جس کمرے کی طرف ہماری رہنمائی کی اُسے دیکھ کر بے حد مایوسی ہوئی۔ دروازے پر لٹکی ہوئی چق زمانۂ قبلِ مسیح کی معلوم ہوتی تھی، متعدد مقامات سے ٹوٹی ہوئی اور پُرانی۔ مکان کے آس پاس کوئی امیرانہ ٹھاٹ کا سامان نہ تھا۔ بایں ہمہ ہم دونوں کے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ چق اُٹھا کر اندر داخل ہوئے تو بظاہر ٹوٹی پھوٹی اور ڈھیلی سی چارپائی اور سادہ مگر صاف ستھرے بستر پر تاجدارِ فلسفہ و شعر جلوہ فرما تھا۔ پیچواں حُقّہ پاس ہی پڑا ابلائیں لے رہا تھا۔ علیک سلیک کے بعد حضرت علاّمہ نے بیٹھ جانے کو ارشاد فرمایا اور ہم دونوں پاس ہی رکھی ہوئی کرسیوں پر مبہوت و حیران بیٹھ گئے۔ نہ معلوم ہم کب تک ساکت و صامت بیٹھے رہتے مگر حضرت علاّمہ نے ذرہ نوازی فرماتے ہوئے مزاج پُرسی کی۔ جو کچھ بن سکا جواب دیا۔ حضرت علاّمہ کے گلے میں خارش تھی اور باتیں کرتے ہوئے تکلیف محسوس کرتے تھے، مگر آپ نے باتیں کیں، ہم ہمہ تن گوش بنے سُنتے رہے۔ آدھ گھنٹے کی مختصر سی ملاقات کے بعد میں نے یہ کہہ کر اجازت لی کہ "حضرت! آج ہمیں جہانِ علم و ادب کی معراج نصیب ہوئی۔ یہ بھی حسرت مٹ گئی کہ ہم زندگی میں خدائے عشق و پیغمبرِ شعر و شاعری سے نہ مل سکے"۔ حضرت نے مسکرا کر اجازت دی۔ ہم باہر نکلے تو موسم کے اعتدال کے باوجود ہمارے جسم پسینہ میں شرابور ہو رہے تھے۔ جیسے ابھی ابھی بھٹی سے نکلے ہوں۔ یہ حاضری گو بہت مختصر تھی۔ مگر حضرت مرحوم کے فیضانِ نظر نے ان مختصر لمحات میں ہی اپنے مقام سے آگاہ کر دیا۔

حضرت علاّمہ سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد جذباتِ عقیدت کئی اور منزلیں طے کر گئے۔ حضرت علاّمہ کی شفقت نے اور بھی جرأت بڑھا دی اور کئی بار حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ بعض اوقات کئی کئی گھنٹے بیٹھے رہتے اور ارشادات سے مستفید ہونے کا موقعہ ملا۔ میں نے حضرت کو اس بیماری ہی کی حالت میں دیکھا تھا جو آخر اُن کی جان لیوا ثابت ہوئی۔ اس کے باوجود ان کی شیریں گفتاری اور حقائق بیزی کا خیال آتا ہے تو اُن لوگوں کی قسمت پر رشک کرتا ہوں جنہوں نے اس بلبلِ شیریں نوا کو موسمِ بہار میں چہکتے سُنا۔

جب حضرت مرحوم میکلوڈ روڈ سے جاوید منزل میں چلے گئے تو میں نے جاوید منزل کو کوچۂ محبوب سمجھ لیا۔ کبھی دروازہ تک جا کر اور کبھی مکان

کے گرداگرد طواف کر کے واپس آجاتا اور کبھی نیاز بھی حاصل کر لیتا۔

جون ۱۹۳۳ء میں لبنان کے ایک عرب شاعر سید جمال صاحب سیاحت کی غرض سے ہندوستان تشریف لائے۔ خوش بختی سے ان کو لاہور کی سیر کرانے اور لاہور میں مقیم ا کا۔ بر سے ملاقات کرانے کی خدمت شیخ محمد امین صاحب سوداگر چرم اور خاکسار کے سپرد ہوئی۔ سید جمال صاحب حضرت علامہ کے سوا ہندوستان کے کسی بڑے آدمی سے ملنے کے زیادہ خواہشمند نہ تھے۔ صرف حضرت علامہ مرحوم سے ملنے کے لئے بے تاب تھے۔

ایک شام کو سید جمال صاحب اور شیخ محمد امین صاحب کی معیت میں حضرت کے دولتکدہ پر حاضری ہوئی۔ خوش نصیبی سے حضرت صحن میں تنہا پلنگ پر دراز تھے طبیعت بھی مسرور تھی۔ شیخ صاحب نے تعارف کرایا تو اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ گفتگو شروع کی تو حقائق کے دریا بہنے لگے۔ اپنے سفر یورپ کے حالات، مصطفےٰ نحاس پاشا سابق وزیرِ اعظم مصر اور دیگر عمائدین و صوفیائے مصر سے ملاقاتیں۔ مصر میں ایک قادیانی کی معیت کے دلچسپ حالات۔ ممالک اسلامیہ بالخصوص قرطبہ کی سیر کے تاثرات حضرت اورنگ زیب عالمگیر کا زہد و تقوےٰ، مسلمانانِ عالم کا مستقبل غرضکہ بے شمار مسائل پر گفتگو فرمائی جو دل و دماغ کو موجب نشاط بھی تھی۔ اور ایمان و ایقان کا ذریعہ بھی۔ شگفتہ مزاجی کا یہ عالم تھا کہ بعض مواقع پر ہم بے اختیار ہنس پڑتے تھے۔

حضرت علامہ نے سید جمال صاحب سے پوچھا کہ "مجھ جیسے فقیر بے نوا سے ملنا تو آپ کی نوازش ہے۔ مگر آپ ہندوستان میں کسی بڑے آدمی سے بھی ملے؟" سید صاحب نے جواب دیا "قبلہ بعض افراد ایسے ہوتے ہیں جن کی رُوحانی طاقت بہت قوی ہوتی ہے۔ اور ان پر اسی سبب سے پوری ملت کا اطلاق ہوتا ہے۔ جیسے انبیا، شہدا اور صلحا۔ آپ بھی ان ہی میں سے ایک ہیں۔ آپ کو دیکھ کر میں سمجھتا ہوں کہ میں نے ساری ملتِ اسلامیہ کو دیکھ لیا۔"

حضرت مرحوم نے یہ سُن کر آنکھیں جھکا لیں۔ میں نے گزارش کی کہ حضرت سید صاحب کے نظریہ پر کلام مجید بھی مہرِ تصدیق ثبت کرتا ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ "کان ابراھیم اُمۃ واحدۃ" حالانکہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام فردِ واحد تھے۔ حضرت اس پر مسرور ہوئے اور قرآن مجید کی آیت سے متاثر ہو کر آنکھیں پُر آب ہو گئیں۔

حضرت مرحوم سید صاحب سے صاف سادہ شستہ عربی میں گفتگو فرماتے رہے۔ جسے میں بھی بخوبی سمجھ سکتا تھا۔ حضرت مرحوم عربی ذرا تکلف سے بولتے تھے۔ اس شام ہم نے حضرت کی محفل قدسی سے پورے تین گھنٹے حظ اُٹھایا۔ مجھے اپنی قوتِ تحریر کی تنگ دامانی کا علم ہے تاہم اگر اسی ایک ملاقات کے ارشاداتِ گرامی کا تذکرہ تفصیل سے کروں تو ایک مکمل کتاب تیار ہو جائے۔

چلتے وقت حضرت نے ایک دن چھوڑ کر سید جمال کو کھانے پر بلایا۔ شیخ محمد امین صاحب اور خاکسار بھی اس شفقت و رافت کی لپیٹ میں آ گئے۔ حضرت نے رخصت ہوتے وقت تاکیداً فرمایا کہ ہم دعوت والے روز وقت سے دو تین گھنٹے پہلے آجائیں تاکہ کچھ باتیں ہو سکیں۔ سید جمال صاحب حضرت کے اخلاقِ عالیہ سے بے حد متاثر ہوئے اور میں نے دیکھا کہ واپس آنے پر ان کا چہرہ اتنا مسرور تھا جیسے

انہیں مقصدِ حیات حاصل ہو گیا۔

حضرت مرحوم کے ارشادِ دعوت کو میں نے بصحتِ ہوش و حواس اپنے کانوں سے سُنا تھا۔ پھر بھی دل یقین نہ کرتا تھا۔ شاعرِ مشرق اور مجدّدِ وقت کے دولتکدہ پر میری دعوت! مجھے یہ بات ایک رنگین اور شیریں خواب سا معلوم ہوتی تھی اور ہونی بھی چاہئے تھی۔ میرے ماموں جان ایک دفعہ اپنے گاؤں کے فوجی جمعدار کے ہاں گئے۔ کھانا کھانے کا وقت آیا۔ تو جمعدار صاحب نے رسمی طور پر کھانا کھانے کو کہا۔ معمولی سے اصرار و انکار کے بعد ماموں جان نے کھانا کھا لیا۔ گھر آئے تو پھولے نہ سماتے تھے۔ بڑے فخر و مباہات سے بیان کرتے تھے کہ میں نے جمعدار صاحب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کئی دنوں تک اسی نشہ میں مخمور رہے۔ آپ ہی فرمایئے ایسے غریب گھرانے کا ایک حقیر فرد اگر دُنیا کے عظیم المرتبت انسان کے دولتکدہ پر مدعو ہو تو کیوں فخر نہ کرے۔ سچ پوچھئے تو میں نے یہ دو دن زمین پر نہ کاٹے۔ بلکہ اسی دعوت کے خیال میں مست آسمان کی بلندیوں پر اُڑتا رہا۔

دعوت والے دن شیخ محمد امین صاحب کی مصروفیت کے سبب ہم ذرا دیر کر کے پہنچے۔ حضرت علامہ ہمارا انتظار فرما رہے تھے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد کھانا کھایا۔ مجھے حضرت مرحوم کے بائیں پہلو میں جگہ ملی۔ حضرتِ مرحوم کھانا بھی کھاتے رہے اور مہمانوں کے لئے علی بخش کو ہدایات بھی دیتے رہے۔ مجھے کھانا تو کیا کھانا تھا۔ اسی نشہ میں مخمور اور محوِ حیرت رہا کہ آج میرا نصیبا مجھے کہاں لے آیا۔

مَیں نے دَورانِ گفتگو میں گزارش کی کہ حضرت اس زمانے کے مسلمانوں نے تو آپ کی قدر نہ کی۔ آیندہ نسل آپ کی ذاتِ بابرکات سے محروم ہو جائے گی۔ توقع تھی کہ آیندہ نسل کے لئے خدا اَور کوئی "دانائے راز" بھیج دے گا مگر آپ نے فرمادیا ہے ؎

ازتب و تابم نصیبِ خود بگیر   بعد ازیں ناید چو من مردِ فقیر

تو اس حالت میں مسلمانوں کا کیا حال ہو گا؟

یہ سُن کر حضرت کے چہرے پر انتہائی سوز و درد کی کیفیت طاری ہو گئی۔ فرمایا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ مسلمانوں کا حشر کیا ہونے والا ہے۔ مَیں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اب ذلت کی انتہا ہو چکی۔ اب یا تو خدا مسلمانوں کی حالت کو سدھارے گا یا پھر موجودہ نسل کو مٹا کر نئی اور زندہ قوم پیدا کرے گا۔ ہاں! یہ بات میں علی الاعلان کہتا ہوں کہ میں موجودہ نسل کا "آخری مسلمان" ہوں۔

وفات سے دو تین مہینے قبل ایک روز جاوید منزل میں پہنچا تو علی بخش نے اندر جانے سے روکا اور کہا ڈاکٹروں نے حضرت کو کسی سے ملنے یا بات چیت کرنے سے منع کر دیا ہے۔ مَیں نے یہ سُن کر پہلے تو ڈاکٹروں کے لئے بارگاہِ الٰہی میں حصولِ ہدایت کی دُعا مانگی۔ اور پھر علی بخش سے کہا کہ میں خاموش بیٹھا رہوں گا۔ مگر نیاز حاصل کئے بغیر جاؤں گا نہیں۔ علی بخش نے یہ الفاظ حضرت سے جا کر کہہ دیئے۔ آپ نے حاضر ہونے کی اجازت دے دی۔ مَیں سلام و دُعا کے بعد خاموش بیٹھ گیا۔ حضرت نے مزاج پُرسی کی۔ تو مَیں نے علی بخش سے عہد کا ذکر کیا۔ اور گزارش کی کہ مجھے ایک "درویش" اور "قلندر" کے دروازے پر دربان دیکھ کر کوفت ہوئی ہے۔ آپ نے علی بخش کو بلا

کر فرمایا کہ "آئندہ یہ آئیں تو ان کو بلا روک ٹوک آنے دینا۔

اسی ملاقات میں میری گزارش پر حضرت مرحوم نے مجھے ایک مولوی صاحب کا قصّہ سُنایا۔ مولوی صاحب حضرت مرحوم کی تحریر چاہتے تھے۔ پہلے تو حضرت نے انکار کیا اور مولوی صاحب کو کلامِ الٰہی کی طرف توجہ دی۔ "مقامِ مردِ مومن" سے آگاہ کرنا چاہا مگر جب مولوی صاحب کے عقیدت مندانہ اصرار میں کمی نہ ہوئی تو حضرت نے فی البدیہہ یہ قطعہ لکھ دیا ؎

بگو از ما بملّایاں سلامے | کہ پیغامِ خدا گفتند ما را
مگر تاویلِ شاں در حیرت انداخت | خدا و جبرئیل و مصطفےٰ را

ایک دفعہ میں حاضر ہوا تو کچھ ارادت کیش بیٹھے ہوئے تھے مسلمانوں کی زبوں حالی کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد باقی لوگ اُٹھ کر چلے گئے تو حضرت نے میری طرف توجہ کی اور مسلمانوں کی پستی پر گفتگو فرمانے لگے۔ باتوں باتوں میں حضرت کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے اور فرمایا خدا نے ایسی مردہ قوم میں پیدا کیا ہے جو باوجود زور سے پکڑ پکڑ جھنجھوڑنے کے خوابِ غفلت سے بیدار ہوتی ہی نہیں، اس قوم کا مرضِ کور نگاہی" بہت دیرینہ ہو گیا ہے۔ حضرت کا یہ شعر بھی ان ہی تاثرات کا مظہر ہے ؎

میں نے تو کیا پردۂ اسرار کو بھی چاک | دیرینہ ہے تیرا مرضِ کور نگاہی"

حضرت کی بارگاہ میں میری حاضری کا سلسلہ نہ بہت عرصہ رہا اور نہ بہت طول طویل ملاقاتیں ہوئیں۔ علی بخش سے کہہ کر جب حضرت نے مجھے حاضر ہونے کی کھلی اجازت دے دی تو پھر شاید میں ایک آدھ بار ہی حاضر ہوا ہوں گا۔ تاہم تھوڑی ہی ملاقاتوں میں فیضانِ نظر نے حضرت کی عظمت و مرتبت سے شناسا کر دیا۔ میں اور مجھ جیسے اور ہزاروں عقیدت مند جب آپ سے رخصت ہوتے تھے تو زبانِ حال و قال سے کہتے جاتے تھے کہ ؎

نہ تاج و تخت میں نے لشکر و سپاہ میں ہے | جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

حضرت سے ایک ہی ملاقات کر کے انسان کو یہ یقین ہو جاتا تھا کہ حضرت دورِ حاضرہ کے سب سے بڑے شاعر اور فلاسفر ہی نہیں بلکہ سب سے بڑے انسان، عاشقِ رسول اور محبِّ قرآن بھی ہیں۔ حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر آتے ہی آپ پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔ آپ کی تصانیف میں بھی جہاں کہیں حضور سرورِ کائنات کا ذکر آجاتا ہے۔ آپ پر ذوق و وجدان کا بے پناہ جذبہ طاری ہو جاتا ہے۔ آتشِ عشق تیز ہو جاتی ہے اور آپ عشقِ رسول صلعم کے بحرِ بے کراں میں بے اختیار کود پڑتے ہیں جن لوگوں کی نظر سے رموزِ بے خودی کے آخر کی نظم "التجا بحضور رحمۃ للعٰلمین" گزری ہے وہ رحمۃ للعٰلمین سے اس مردِ قلندر کے عشق کا رُتبہ سمجھ سکتے ہیں۔

حضرت مرحوم کی طبیعت میں انکسار بے حد تھا۔ وہ حقیقتہً شکوہِ خسروی اور شانِ سکندری پر درویشی اور قلندری کو ترجیح دیتے تھے۔ "یومِ اقبال" سے چند روز پیشتر میں حاضرِ خدمت ہوا۔ اور گزارش کی کہ میں نے یومِ اقبال پر پڑھنے کے لئے "اقبال اور یزداں" کے عنوان سے مضمون لکھا ہے۔ فرمایا۔ مجھے نفسِ مضمون سے بحث نہیں جو چاہو سو لکھو مگر یہ عنوان بدل دو۔ یزداں کے ساتھ اقبال اچھا نہیں لگتا۔ بہتر ہو کہ اس عنوان کو پھیلا کر "اقبال کی شاعری میں فلسفۂ یزدان و ابلیس" کر دو۔ میں نے تعمیلِ ارشاد کی مگر یہ مضمون پڑھنے کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔

حضرت کی وفات ہوئی تو میں کراچی تھا۔ ایک صاحب وفات کی خبر سُن کر دوڑے دوڑے آئے۔ اور کہنے لگے۔ کہو بھائی حضرت کے معصوم بچوں کی یتیمی کا کیا ہوگا؟ میں نے کہا۔ آپ یہ کیا سوچ رہے ہیں۔ معصوم بچوں کا تو اللہ مالک ہے۔ سوچنا تو یہ ہے کہ اب ملّتِ اسلامیہ کی یتیمی کا کیا ہوگا۔

کراچی کی ایک مسجد میں حضرت علّامہ کے بہت سے قطعے لٹکے ہوئے تھے۔ میں نے امام مسجد صاحب سے کہا۔ آج ان قطعوں کو لکھنے والا شاعر چل بسا۔ وہ کچھ نہ سمجھ سکے۔ میں نے کہا "حضرت اقبال فوت ہو گئے"۔ کہنے لگے "اقبال کون تھا" اللہ اکبر! یہ ہمارے قائدین اور رہبرانِ اسلام کی حالت ہے کہ وہ اقبال جیسے جلیل القدر فرزندِ اسلام سے ناواقف ہیں۔ ان مولوی صاحب کو جب یہ معلوم ہوا کہ اقبال داڑھی نہ رکھتے تھے تو کہنے لگے۔ ایسے شخص کا غم کیا کرنا۔ یہ سُن کر میرا سینہ شق ہو گیا اور میں نے مشیت کی تنگ بخشی پر ماتم کیا کہ وہ مولوی تو بہت پیدا کر سکتی ہے لیکن ایسے دو چار داڑھی مُنڈے نہیں پیدا کرتی تاکہ قوم کا بیڑا پار ہو جائے۔

لاہور آ کر میں نے سالک صاحب قبلہ سے پوچھا کہ مولانا اس وقت دُنیا میں کم و بیش ستر کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ فرمائیے۔ ان ستر کروڑ مسلمانوں میں کون ہے جسے مسندِ اقبال پر بٹھایا جائے اور جس کے عالمِ فانی سے رخصت ہونے پر اسی طرح غم کی گھٹائیں دُنیا پر چھا جائیں جس طرح اقبال کی وفات پر! اس کا جواب سالک صاحب کے خونیں آنسوؤں نے دیا۔

اقبال جس کے قلم نے ہزاروں دلوں کو حیاتِ تازہ بخشی جس نے ملّتِ اسلامیہ کے تنِ مردہ میں زندگی کی لہر دوڑا دی جس نے نوجوانوں کے قلوب میں انقلاب برپا کر دیا جس کے وجود میں بیک وقت لینن، نطشے، ٹالسٹائی، امام ابن تیمیہ، شاہ ہمدان، برگسان، کارل مارکس، بائرن رومی اور جمال الدین افغانی کے کمالات نظر آتے تھے جس کے حلقۂ سخن میں ایسے ایسے گداز زیرِ تربیت تھے جو خود اسی کے الفاظ میں راہ و رسمِ کج کلاہی سے آگاہ تھے۔ آہ! وہ اقبال جہانِ اسلام کا وہی آفتابِ علم ۲۱ اپریل ۳۸ء کو ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔

کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ وَّیَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ ۝

(شیرازہ)

مطبوعات

خاتم النبیین مؤلفہ ابراہیم صاحب عمادی - اُستاذ اسلامیات اسمٰعیل ہائی سکول بمبئی - یہ سیرت نئی طرز میں لکھی گئی ہے - زیادہ حجیم نہ ہونے کے باوجود خاصی جامع ہے - انداز بہت محققانہ ہے - حجم ۲۰۴ صفحات قیمت ۱۰ر - پتہ: ابراہیم عمادی صاحب استاذ اسلامیات اسمٰعیل بیگ محمد ہائی سکول بمبئی ۳ -

مولودِ ہمایوں - مرتبہ حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب رئیس دتاؤلی ضلع علی گڑھ - اس کتاب میں رسولِ مقبولؐ کی ولادت سے ہجرت تک کے حالات نہایت دلکش انداز میں لکھے گئے ہیں - مؤرخانہ تحقیق سے کام لیا گیا ہے - حجم ۱۶۶ صفحات قیمت عہ - پتہ: - مکتبہ عہد آفریں، ترپ بازار - حیدر آباد (دکن) -

محبوبِ خدا - مرتبہ چودھری افضل حق صاحب - یہ کتاب چودھری صاحب نے جیل میں لکھی ہے - اس کا صرف صرف حضورؐ کی محبت میں ڈوبا ہوا ہے - حجم ۲۰۰ صفحات، زبان سادہ و سلیس - قیمت مجلد عہ - پتہ: - تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور -

مکتوباتِ امجد - مرتبہ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی - مُلک حضرتِ امجد سے زیادہ تر ایک صوفی شاعر کی حیثیت سے واقف ہے لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ حضرتِ موصوف بہت صاف وسلیس اور بے تکلف نثر لکھنے پر بھی قادر ہیں - یہ دلچسپ کتاب حضرتِ امجد کے خطوط کا مجموعہ ہے - آج کل ادبیات میں خطوں کو بہت اہمیت حاصل ہے - اُمید ہے کہ یہ کتاب بہت مقبول ہوگی - قیمت ۸ر - پتہ: - شمس المطابع عثمان گنج حیدر آباد (دکن) -

مشاہیرِ اُردو کے خطوط :- مرتبہ پروفیسر مہیش پرشاد صاحب مولوی فاضل ہیڈ عربی، فارسی و اُردو ڈیپارٹمنٹ بنارس یونیورسٹی الٰہ آباد - اس کتاب میں اُردو ادب مشاہیر کے خطوط جمع کیئے گئے ہیں - یہ کتاب بہت دلچسپ ہے اور مہیش صاحب شکریے کے مستحق ہیں کہ اُنھوں نے یہ اہم خطوط یکجا جمع کر دیئے - قیمت ۸ر - پتہ: کے - بی اگروال صاحب - شانتی پریس الٰہ آباد -

وفاقِ ہند - از خان بہادر ڈاکٹر سید نجم الدین صاحب جعفری - آج کل مسئلہ وفاق ملک کے اہم ترین مسائل میں سے ہے - اس کتاب کی ابتدا میں ۱۸۵۷ء کے بعد کے واقعات پر ایک سرسری نظر ڈالی گئی ہے - اس کے بعد جدید دستور اور وفاقی حکومت کی تشریحات درج ہیں - کتاب پُر از معلومات اور پڑھنے کے قابل ہے - قیمت عمر - پتہ: اُردو لٹریچر کمپنی دہلی -

ہندوستان کا نیا دستورِ حکومت - مؤلفہ کشن پرشاد صاحب کول ممبر سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی لکھنؤ - اس کتاب میں جدید دستور، فیڈریشن، اور دیگر اہم سیاسی مسائل پر بہت قابلیت سے روشنی ڈالی گئی ہے - موجودہ سیاسیات کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید

ہے۔ قیمت عہ۔ پتہ: ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد۔

جدید دستور کا خاکہ از زین العابدین صاحب بی ایس سی پی ایچ ڈی (لنڈن) جدید دستور کے متعلق یہ مختصر سا رسالہ خاصا پر از معلومات ہے۔ قیمت ۲ر۔ پتہ: مکتبہ جامعہ دہلی۔

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش:۔ از سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی۔ ایڈیٹر ترجمان القرآن پٹھان کوٹ پنجاب۔ اس کتاب میں اسلامی ہند کی گزشتہ تاریخ موجودہ حالت اور مستقبل کے امکانات پر ایک دلکش تبصرہ کیا گیا ہے اور مسلمانوں کے لئے آیندہ مذہبی و سیاسی نظام عمل پیش کیا گیا ہے۔ ہر مسلمان کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ پتہ اوپر درج ہے قیمت درج نہیں۔ حجم ۱۲۶ صفحات۔

اسلام اور اشتراکیت۔ از خان بہادر حاجی محمد یوسف احمد پائی آنریری مجسٹریٹ دہلی۔ مؤلف نے بہت محنت اور تحقیق سے اس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے۔ اور اُن کی یہ قومی خدمت قابلِ داد ہے کہ اُنہوں نے اس کتاب کو مفت تقسیم کیا ہے۔ پتہ اُوپر درج ہے۔

ضمیر۔ زمانۂ حال کی زندگی کا ایک اخلاقی ناول از مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب سابق صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ۔ ترک اور انگریز احباب کے ساتھ مصنف نے اصلاحِ معاشرت، ترکِ توہمات اور احیائے قومیت پر جو بحثیں کیں، یہ ناول اُن کا نچوڑ ہے۔ جگہ جگہ نہایت مفید اور دلچسپ معلومات ہیں۔ کتاب پڑھنے کے قابل ہے۔ قیمت درج نہیں۔ پتہ: مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب ممبر مجلس اعزازی حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس، بیگم پیٹ، حیدرآباد (دکن)۔

بنات۔ حضرت علامہ راشد الخیری مرحوم کا فیض اُن کے بعد بھی جاری ہے۔ علامہ مغفور اُردو کے شہرۂ آفاق ادیب اور عورتوں کے محسنِ اعظم تھے۔ ان کی حمایت اور بہتری کے لئے اُنہوں نے جو زبردست کوششیں کیں وہ اُن کے رسالوں کے ذریعہ مستقل طور پر ہمارے سامنے ہیں۔ ان رسالوں میں ایک "بنات" ہے جو گیارہ سال سے باقاعدہ کم عمر بچیوں کے لئے نہایت مفید اور دلچسپ مضامین شائع کر رہا ہے۔ اس میں بچیوں کی لیاقت اور زبان کی صحت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ہر مہینے کہانیوں نظموں تاریخ جغرافیہ حساب اور سائنس کے مضامین کے علاوہ پہیلیاں، معمے، دستکاری اور ہنڈکلھیا کی ترکیبیں بھی شائع کی جاتی ہیں۔ زبان اتنی سادہ اور دلکش ہوتی ہے کہ ننھی بچیاں بھی مزے لے لے کر پڑھیں۔ غرض باتوں باتوں میں ایسے بہت سے سبق پڑھا دیئے جاتے ہیں جو ایک اچھی بچی کے لئے ضروری ہیں۔ سال بھر کا چندہ صرف ڈیڑھ روپیہ ہے۔ پتہ:۔ منیجر رسالہ بنات دفتر عصمت دہلی۔

قلعۂ معلیٰ کی جھلکیاں۔ از حضرت عرش تیموری۔ نوجوان مصنف نے جن کا تعلق دہلی کے شاہی خاندان سے ہے، اس کتاب میں اپنے بزرگوں کے حالات لکھے ہیں۔ اگرچہ واقعات سرسری طور پر پیش کئے گئے ہیں اور اُن میں کوئی خاص ربط بھی نہیں لیکن پھر بھی اس سے قلعۂ شاہی کی معاشرت اور شوکت و عظمت کا دھندلا سا اندازہ ہو جاتا ہے۔ کتاب خاصی دلچسپ اور مطالعہ کے قابل ہے۔ قیمت ۸ر۔ پتہ:۔ مکتبہ جہاں نما۔ اُردو بازار، جامع مسجد دہلی۔

قطراتِ شبنم ۔ یہ جناب گوردھن داس صاحب بی۔اے کے مختصر ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ مقدمہ حضرت افسر الشعراء آغا شاعر قزلباش دہلوی نے اور دیباچہ سید امتیاز علی تاج نے لکھا ہے۔ نوجوان مصنف نے مختلف تخیلات کو شاعرانہ نثر میں پیش کیا ہے اور وہ ہر قسم کی حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔ اُمید ہے کہ یہ کتاب دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔ متعدد تصاویر زینتِ کتاب ہیں۔ قیمت مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے
پتہ: تیج رام اینڈ سنز لاہور۔

اربعہ عناصر ۔ یہ حضرت محمود ماہر طبیب اکبرآبادی کی رُباعیات کا دلکش مجموعہ ہے جو خوشنما کاغذ پر مجلد چھپا ہے۔ شروع میں حضرتِ ماہر کی تصویر بھی دی گئی ہے۔ رُباعیات زندگی پر ور ہیں۔ قیمت عہ۔ پتہ: خاں صاحب محمود علی خاں صاحب ماہر، فراش خانہ، دہلی +

ایوانِ تمدن ۔ از ڈاکٹر مرزا ریاض احمد بیگ صاحب چغتائی۔ اس ناول میں تہذیبِ حاضرہ کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ قیمت عہ۔ پتہ: الامان برقی پریس، سرکی والاں، دہلی +

تفویض ۔ یہ مرزا عظیم بیگ صاحب کا ایک دلچسپ افسانہ ہے۔ مرزا صاحب کا اندازِ بیان بہت دلکش ہے۔ قصہ ہندوستانی معاشرت کا ایک نہایت دلاویز مرقع ہے۔ قیمت ۵۔ پتہ ساقی بُک ڈپو دہلی +

کیمیاگر اور دیگر افسانے ۔ یہ پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن) کے نو دلکش افسانوں کا مجموعہ ہے جو نہایت حُسنِ اہتمام سے شائع ہُوا ہے۔ یہ افسانے ہندوستانی زندگی کے بہت اچھے مرقعے ہیں۔ کتاب بہت دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے۔ حجم ۲۵۵ صفحات قیمت درج نہیں۔ پتہ: مکتبۂ جامعہ دہلی +

راسپوٹین ۔ از حضرتِ ملیح آبادی۔ یہ اُس مشہور شیطان سیرت راہب کے حالات ہیں جس کی سازشوں اور خفیہ ریشہ دوانیوں نے روس کا تختہ اُلٹ دیا۔ کتاب بہت دلچسپ ہے۔ حجم ڈیڑھ سو صفحات۔ قیمت ۸۔ پتہ:۔ دفتر اخبارِ ہند کلکتہ

طوفانِ تبسم ۔ یہ حضرتِ شوکت تھانوی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ شوکت صاحب کے مزاحیہ مضامین مقبول ہو چکے ہیں۔ کتاب میں خاصا تفریحی مسالہ ہے۔ پتہ: منیجر شوکت بُک ڈپو لکھنؤ +

صیدِ زبوں ۔ از اشتیاق حسین صاحب قریشی ایم اے۔ یہ ایک بلند مرتبہ معاشری ڈراما ہے جس کا مقصد اصلاحِ حالات ہے۔ اشتیاق صاحب یوں بھی اُردو ڈرامے کی اصلاح چاہتے ہیں اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ حجم ۹۶ صفحات۔ پتہ: مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی۔

فکر و نشاط ۔ یہ حضرتِ جوش ملیح آبادی کی پُر کیف نظموں کا ایک نہایت دلکش مجموعہ ہے۔ حضرت جوش کے کلام کی تعریف تحصیلِ حاصل ہے۔ یہ مجموعہ اُردو شعر سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کے پاس ہونا چاہئے۔ قیمت مجلد عہ۔ پتہ: مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی +

الہامی افسانے ۔ مرتضیٰ احمد خاں صاحب میکش کی یہ جدت قابلِ داد ہے کہ اُنھوں نے مذہبی کتابوں کے قصص یکجا کر کے اُردو زبان میں شائع کر دئیے ہیں۔ گویا اُن کی دلچسپ کتاب مذہب کے ایک حصے سے بھی آدمی کو واقف کر دیتی ہے۔ حجم ساڑھے تین سو صفحات کے قریب ہے اور نفیس کاغذ پر مجلد شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب ہر کتب خانے کی زینت بننے کے قابل ہے۔ پتہ: تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور +

جدید فہرست کارخانہ مفت طلب فرمائیے۔

طبقۂ نسواں میں اس کارخانہ کا عطرِ عروس نہایت مقبول ہو رہا ہے۔

اعلیٰ طبقہ کی خواتین سر میں لگانے کے لئے اس کارخانہ کا تیار کردہ تیل استعمال کرتی ہیں۔
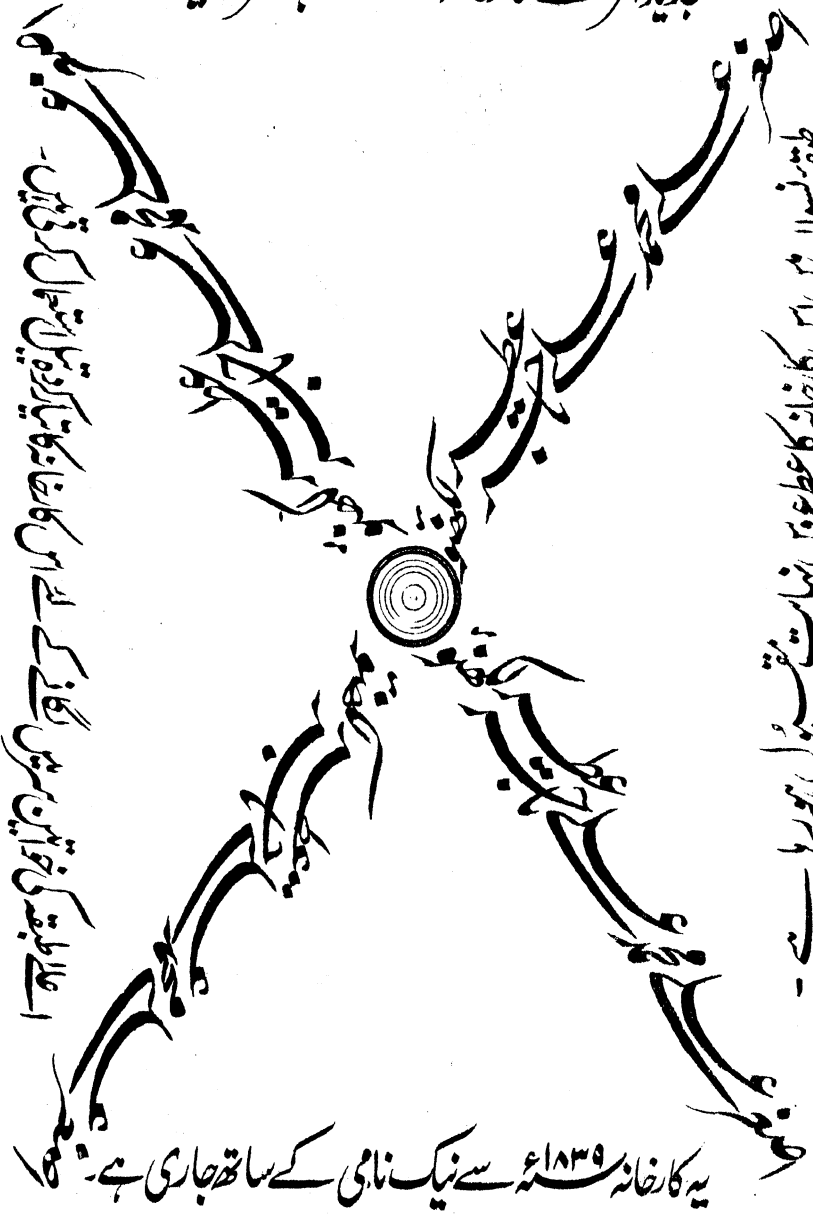
یہ کارخانہ ۱۸۳۹ء سے نیک نامی کے ساتھ جاری ہے۔

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ اکتوبر ۱۹۳۸ء

تصویر:ـــــ وینس آف مائلو

شمار	مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ
۱	بزمِ "ہمایوں"	بشیر احمد	۷۱۴
۲	جہاں نما	حامد علی خاں	۷۱۶
۳	یورپ کا اُستادِ سیاست	"مُوسٰی"	۷۲۱
۴	شکریۂ جاپان	جنابِ باری علیگ	۷۲۷
۵	سرگزشتِ دانہ (نظم)	جناب احمد علی خاں صاحب شاد عارفی	۷۲۸
۶	دو فرلانگ لمبی سڑک	جناب کرشن چندر صاحب ایم۔ اے	۷۳۰
۷	تجلیات	جناب خواجہ عبد السمیع صاحب پال اثر صہبائی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی	۷۳۶
۸	ہندوستانی	جناب سید ظفر احمد صاحب کوکب بی۔ اے۔ وی ٹی سی	۷۳۷
۹	اُردو کا ماضی اور حال	حضرتِ حفیظ ہوشیارپوری ایم۔ اے	۷۴۰
۱۰	الاُوپر، رات کا گیت	"میراجی"	۷۴۱
۱۱	افسانہ نویس (افسانہ)	راجہ مہدی علی خاں صاحب	۷۴۲
۱۲	پہلی اور آخری آرزو (نظم)	صاحبزادہ احمد ندیم صاحب قاسمی بی۔ اے	۷۴۶
۱۳	"چاند نکلا ـــ"	جناب مفضل الدین صاحب آثر اکبرآبادی	۷۴۷
۱۴	قطعہ	جناب عبد المجید صاحب حیرت	۷۴۸
۱۵	بیماریٔ روح (افسانہ)	حضرتِ عاصی عثمانی	۷۴۹
۱۶	جبریل و ابلیس (ڈراما)	جناب نند کشور صاحب جھنگن ایم۔ اے	۷۵۵
۱۷	برباد شہر	جنابِ وامق	۷۵۷
۱۸	دُنیائے ادب	جنابِ حمید نظامی بی۔ اے	۷۵۸
۱۹	غزلیات	حضراتِ شاعر، صدق، عبد الراشد، تپش، محمود و عرش	۷۶۱
۲۰	موٹا سٹنڈا داماد (افسانہ)	جنابِ مسعود حسن صاحب شمسی داناپوری	۷۶۳
۲۱	جہان کی حالت (نظم)	پرنسپل رام پرشاد صاحب ناشاد ایم اے (آکسن)	۷۷۱
۲۲	درائے کارواں (")	جناب ابراہیم صاحب ہوش کلکتوی	۷۷۲
۲۳	محفلِ ادب		۷۷۴
۲۴	مطبوعات		۷۸۲

چندہ سالانہ ۵ ششماہی ۳ (مع محصول) ـــ قیمت فی پرچہ ۸

بزمِ ہمایوں

ہمارے مکرم دوست مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو سے بڑھ کر اُردو کا سرگرم اور بے تعصب کارکن کون ہوگا! انھوں نے مُدت تک سیاسیات بلکہ لسانی سیاسیات میں آنے سے پرہیز کئے رکھا، پچھلے سال وہ لکھنؤ تو تشریف لائے مگر اُنھوں نے لیگ میں شرکت نہ کی۔ وہ زبان کے مسئلے کو سیاسیات سے بالکل علیحدہ رکھنا چاہتے تھے اور اس پر اُنھوں نے نیک نیتی سے عمل بھی کیا۔ اور اُردو کے مخالفین کو اپنے قول و فعل سے ثابت کر دیا کہ اُردو ہندو مسلمان دونوں کی مشترکہ زبان ہے۔

لیکن محض ایک طرف کی نیک نیتی سے کیا بنتا ہے اور دوسرا پہلے ہی سے اپنے دل میں پُورا فیصلہ کر چکا ہو تو ثبوت بھی سب دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ یہی اس اُردو کے معاملے میں ہُوا۔ مولوی صاحب کی معصُومیت پر پہلی بجلی بھارتیہ ساہتیہ پرشد میں ڈھائی سال ہوئے گری جب گاندھی جی نے اپنی زبانِ مبارک سے فرمایا کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ وہ قرآن کے حرُوف میں لکھی جاتی ہے مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں۔ گاندھی جی ۱۹۳۴ء میں سیاسیات سے استعفا دے کر اچھوت ادھار اور ہندی پرچار میں مصروف ہو چکے تھے یہی اُن کے نزدیک سوراج حاصل کرنے کا سیدھا رستہ تھا اور اب بھی جب کہ وہ کانگرس کے چار آنے کے ممبر نہیں لیکن کانگرس کے کرتا دھرتا ہیں وہ کانگرسی حکومتوں کے ذریعے سے اچھوتوں کو ہندوؤں میں ملانے اور ہندی کو بڑھانے اور غریب اُردو کو گرانے میں منہمک ہیں۔

مولوی عبدالحق صاحب بھی ان ڈھائی سالوں میں فارغ نہیں بیٹھے۔ نہ محض اپنی عظیم الشّان ڈکشنریوں کی تالیف میں غرق رہے بلکہ ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک اپنی محبُوب اُردو کے لئے مارے مارے پھرا کئے۔ علی گڑھ میں اُردو کانفرنس منعقد کی، صوبے صوبے میں شہر شہر میں انجمن کی شاخیں قائم کیں۔ اُردو مدرسوں کو امداد دی، لکھنؤ مسلم لیگ کو ذرا دُور ہی دیکھتے رہے کہ یہ اُردو کے حامی کیا کہتے اور کیا کرتے ہیں، پھر کانگرسی لیڈروں اور وزیروں اور خود مہاتما جی سے ملاقاتوں کے چکّر میں رہے۔ کہا کھلوایا سمجھایا جیسے کئے مگر وہاں کان پر جُوں تک نہ رینگی کہ ہندوستان کا "قومی" پروگرام پہلے ہی سے مرتّب ہو چکا تھا اور اُس میں اُردو کو دم مارنے کی اجازت نہ تھی۔

آخر بہت سے صبر کے بعد مولوی صاحب نے پچھلے مہینے گاندھی جی کے نام "مسلمان اور ودیا مندر سکیم" کے متعلق ایک کُھلی چٹھی لکھی جو ملک کے بہت سے اخباروں میں چھپی۔ مولوی صاحب نے واقعی بہت صبر کیا۔ سیاسیات کے متعلق برسوں چُپ سادھی، کبھی بُھولے سے بھی مسلمان اور اُردو کا ایک جا ذِکر نہ کیا۔ بڑی نرمی سے اور دل موہ لینے والی دلیلوں سے سمجھایا کہ اُردو تو ہندو مسلمان دونوں کی بنائی ہوئی زبان ہے اِن دونوں قوموں کے اتحاد کی نشانی ہے۔ تمدنوں کے مِلاپ کی یادگار ہے بلکہ یہ ہندو مسلمانوں کی یک جہتی اور وطنیت کی علم بردار ہے لیکن وہاں محض ویدوں اور رشیوں کے زمانے کی طرف منہ مڑ چکا تھا سو کسی نے اس "مسلمانی" شورش کو نہ دیکھا نہ سُنا، سوراج کی دُھن تھی اس میں نری ایک زبان اور اُس کے ادب نری ایک قوم اور اُس کے کلچر کی گنجائش کہاں تھی؟

"ودیامندر سکیم" "واردھا سکیم" کا ایک بچہ ہے جو سی پی میں پیدا ہوا ہے۔" واردھا سکیم" گاندھی جی کے دماغ سے پیدا ہو کر کانگرسی خیال والوں کی گود میں پل رہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ باوجود بعض نقائص کے "واردھا سکیم" کا مقصد اہلِ ملک کو تھوڑے سے تھوڑے عرصے میں تعلیم یافتہ اور خود دار شہری بنانا ہے اور وہ نیک نیتی پر مبنی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اِن ملکی اور نیک نیتی کے کاموں میں جب وہ حلقۂ عمل میں آجائیں مسلمانوں پر کوئی نہ کوئی آفت نازل ہو جاتی ہے۔ اِس لئے مجبوراً اُدھر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک کمیٹی نے اگست میں واردھا سکیم کے متعلق اپنے خیال اور اندیشے کا اظہار کیا، اِدھر مولوی عبدالحق صاحب نے گاندھی جی کے نام ستمبر میں ایک کھلی چٹھی لکھی۔

کھلی چٹھی میں لکھا ہے کہ جنوری ۱۹۳۸ء سے سی پی کے مسلمان برابر شور مچا رہے ہیں لیکن ہائی کمانڈ کوئی توجہ نہیں دیتی۔ جنوری میں انجمن اُردو ناگپور کا جلسہ ہوا اور ایک قرارداد آنریبل وزیرِ تعلیم کی خدمت میں بھیجی گئی۔ پھر انجمن کے ایک رُکن نے معزول شدہ مسلمان وزیر کی معیت میں گاندھی جی سے ملاقات کی، گاندھی جی نے تسلیم بھی کر لیا کہ واقعی ودیامندر نام بعض حیثیت سے قابلِ اعتراض ہے اور ایک وعدہ بھی کیا۔ پھر مارچ میں مسلمانوں کا ایک عام جلسہ ناگپور میں ہوا۔ انجمن ترقیٔ اُردو نے بھی دوبارہ ایک جلسہ کیا۔ لیجسلیٹو اسمبلی کے مسلمان ممبروں نے بھی اپنے دستخطوں سے اعلان کر دیا۔ نیشنلسٹ مسلمانوں کے ایک وفد نے شری بوس صدر کانگرس سے ملاقات کی اور اُنہوں نے وفد کے مطالبات سے کامل اتفاق بھی ظاہر کیا۔ صوبے کے کانگرسی مسلمانوں کی ایک کانفرنس نے بھی ودیامندر کے خلاف قرارداد منظور کی۔ اسی طرح ایجوکیشنل کانفرنس برار نے بھی ودیامندر سکیم کے خلاف سخت رنج و افسوس کا اظہار کیا یعنی جہاں تک اس سکیم کا تعلق ہے باوجود شدید سیاسی اختلافات کے صوبے کے سب مسلمانوں نے یک آواز ہو کر اس کی مخالفت کی، غل مچایا، دُہائی دی کہ ہم کو اس سکیم کی کسی کیفیت تک میں نہ لیا گیا لیکن اُدھر مصروفیت و مشغولیت نہیں بے پروائی و بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ ملکی وصندوں کی اہمیت میں گویا اُردو زبان کو زبان ہندی کا حکم مل چکا تھا!

مولوی صاحب ودیامندر کی جگہ "پڑھائی گھر" کا سبک اور آسان "ہندوستانی" نام تجویز کرتے ہیں۔ پھر مسلمانوں کے لئے اُردو اور نصاب کی کتابوں اور اُردو مدارس کے متعلق معقول مطالبے پیش کر کے آخر میں لکھتے ہیں:۔

"انڈین نیشنل کانگرس کا یہ دعوے ہے کہ وہ اقلیتوں کی زبان و تہذیب کی محافظ ہے۔ آپ کو یہ سُن کر تعجب ہو گا کہ میری انجمن کا نمائندہ قصبہ پاندھرنا (ضلع چھندواڑہ) کے مدرسے میں پہنچا تو اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اُس نے یہ دیکھا کہ اسکول کے شروع ہونے سے پیشتر ہندو اور مسلمان لڑکے سرسوتی کی مورت کے سامنے ہاتھ جوڑ کر پرارتھنا کر رہے ہیں۔ مسلمان لڑکے ان مدرسوں میں پڑھ کر سلام تک بھول گئے ہیں اور اب وہ سلام کی جگہ "نمستے" اور "رام جی کی جے" کہتے ہیں۔ کیا زبان و تہذیب کی حفاظت کے یہی معنی ہیں؟

"مہاتما جی! ہم نے ہر جائز اور آئینی کوشش کر کے دیکھ لیا۔" "آپ سے یہ آخری گزارش ہے اور اگر اس کے بعد بھی کوئی شافی جواب نہ ملا تو میں آپ کو بصد عاجزی متنبہ کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے لئے بجز اس کے کوئی چارۂ کار نہ رہے گا کہ وہ آپ ہی کے ہتھیار آپ کے مقابلے میں استعمال کریں۔"

یہ ہو گی ہندوستانی "قوم" کے اندر "قومیتوں کی ٹکر"! خدا اس ملک کو بچائے!

بشیر احمد

جہاں نما

انسانی عمر پر غلامی کا اثر

اعداد و شمار جمع کرنے والوں نے مختلف ملکوں میں مردوں اور عورتوں کی عمر کے اوسط کے نقشے بنا رکھے ہیں۔ ان نقشوں سے عموماً بیمے کی کمپنیوں والے بہت کام لیتے ہیں کیونکہ انہیں دیکھ کر وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ بیمہ کرانے والا اپنی موجودہ عمر کے بعد تقریباً کتنا عرصہ اور زندہ رہے گا۔ ذیل کے نقشے سے مختلف ملکوں کے اوسطِ عمر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ اعداد جمعیتِ اقوام کے سالانہ مجموعہ اعداد و شمار بابت ۳۷-۱۹۳۶ء سے لئے گئے ہیں:-

ملک	مرد	عورتیں
مصر	۳۱	۳۶
کینیڈا	۵۸/۹۶	۶۰/۷۳
ممالکِ متحدہ امریکا (سفید رنگ لوگ)	۶۰/۷۲	۶۴/۷۲
(غیر سفید فام)	۵۰/۸۲	۵۳/۷۴
ہندوستان	۲۶/۹۱	۲۶/۵۶
جاپان	۴۴/۸۲	۴۶/۵۴
جرمنی	۵۹/۸۶	۶۲/۸۱
آسٹریا	۵۴/۴۷	۵۸/۵۳
بلجیم	۵۶/۰۰	۵۹/۸۳
بلغاریہ	۴۵/۹۲	۴۶/۶۴
ڈنمارک	۶۲/۰۰	۶۳/۸
اسٹونیا	۵۳/۱۲	۵۹/۶۰
فن لینڈ	۵۰/۶۸	۵۵/۱۴

ملک	مرد	عورتیں
فرانس	۵۴٫۳۰	۵۹٫۰۲
آئرلینڈ	۵۷٫۳۷	۵۷٫۹۳
اٹلی	۵۳٫۷۶	۵۶٫۰۰
لیٹویا	۵۵٫۳۹	۶۰٫۹۴
ناروے	۶۰٫۹۸	۶۳٫۸۴
نیدرلینڈز	۶۱٫۹	۶۳٫۵
انگلستان و ویلز	۶۰٫۱۳	۴۴٫۳۹
سکاٹ لینڈ	۵۶٫۰۰	۵۹٫۵
شمالی آئرلینڈ	۵۵٫۴۲	۵۶٫۱۱
سویڈن	۶۱٫۱۹	۶۳٫۳۳
سوئٹزرلینڈ	۵۹٫۲۵	۶۳٫۰۵
چیکوسلوویکیہ	۵۱٫۹۲	۵۵٫۱۸
یورپی سوویٹ روس	۴۱٫۹۳	۴۶٫۷۹
آسٹریلیا	۶۳٫۴۸	۶۷٫۱۴
نیوزیلینڈ	۶۵٫۰۴	۶۷٫۸۸

مندرجۂ بالا اعداد و شمار پر ایک سرسری نظر ہی ڈالنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ تمام یورپی و امریکی ممالک، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ وغیرہ کا اوسطِ عمر ہندوستان سے بہت زیادہ ہے۔ جاپان کا اوسطِ عمر بھی ہندوستان کے مقابلے میں کافی زیادہ ہے۔ مصر کی حالت بھی ہندوستان سے اچھی ہے۔ یہاں یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ اکثر ممالک جن کا اوسطِ عمر ہندوستان سے اچھا ہے آزاد ہیں۔ کینیڈا، آئرلینڈ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ بھی عملاً آزاد ہی سمجھے جاتے ہیں۔ مصر کا شمار بھی ازلی غلاموں میں نہیں ہے اور اب بھی ہندوستان کے مقابلہ میں یہ ملک کافی آزاد ہے کیونکہ اپنے تقریباً تمام داخلی معاملات میں اسے خود مختاری حاصل ہے۔ حالات کے اس مشاہدے سے اگر ہم یہ نتیجہ نکالیں کہ درازئ عمر کا انحصار ایک بڑی حد تک کسی ملک کی سیاسی آزادی یا سیاسی غلامی پر ہوتا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ بہ ظاہر یہ خیال عجیب و غریب معلوم ہوتا ہے لیکن ہے درست معمولی سوچ بچار کے بعد معلوم ہوجاتا ہے کہ جو اسباب درازئ عمر کا موجب ہوسکتے ہیں اُن میں سے بعض یہ ہیں:۔ اچھی غذا، اچھا گھر، اور مناسب کپڑے جو صحت کے بحال رکھنے میں مدد دیں۔ صحت

جسمانی کے اصول کا علم اور شہری و خانگی صفائی کے قواعد سے واقفیت۔ ان اصُول و قواعد پر عمل پیرا ہونے کی معاشی استطاعت، بچوں کی پیدائش سے متعلقہ ضروریات کا انتظام، بیماری کے وقت طبی امداد حاصل کرنے کی سہولت، وبائی امراض کو روکنے اور ان کا مقابلہ کرنے کی طاقت وغیرہ ان سب باتوں کا انتظام اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ ملک کی معاشی حالت اچھی ہو لیکن کسی قوم کے معاشی حالات اُس وقت تک اچھے نہیں ہوسکتے جب تک وہ کاملاً نہیں تو کم از کم ایک بڑی حد تک آزاد نہ ہو۔ تعلیم کے بغیر کسی ملک کے لوگ صفائی اور صحت کے اصُولوں سے واقفیت نہیں بہم پہنچا سکتے لیکن غلام ملکوں کی تعلیم کا انتظام ہمیشہ بہت ناقص ہوتا ہے۔ غیر ملکی حکمرانوں کا فائدہ ہی اسی میں ہے کہ وہ اپنے غلاموں کو زیادہ سے زیادہ عرصے تک بے خبر اور بے علم رکھیں۔ اگر کوئی ملک چاہے کہ اس کا ہر فرد پڑھا لکھا اور اپنے نفع و نقصان کو پہچاننے والا ہو تو یہ مقصد بھی آزادی حاصل کرنے سے پہلے پورا نہیں ہوسکتا۔ بات یہ ہے کہ اگر لوگوں کو صحت اور صفائی کے قواعد معلوم بھی ہوں تو ان پر عمل کرنے کے لئے روپے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن کسی غلام ملک کے پاس کبھی اتنا روپیہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی اس قسم کی ضروریات سے عہدہ برا ہوسکے۔ شہری اور خانگی صفائی کے بلند معیار کو پہنچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مُلک کے مالیات پر اہل ملک کو پُورا اختیار حاصل ہو لیکن یہ اختیار آزادی کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔

ہمارا مدعا یہ نہیں کہ ملک کے محض آزاد ہوجانے ہی سے عمر کے اوسط میں اضافہ ہوجاتا ہے (اگرچہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے یہ خیال بھی صداقت کے شائبہ سے خالی نہیں ہے) اگر ہم اس بات پر زور دینا چاہتے ہیں کہ وہ حالات جو درازیٔ عمر میں ممد و معاون ہوتے ہیں اسی صورت میں پیدا ہوسکتے ہیں کہ ملک کم از کم معاشی طور پر کاملاً آزاد ہو۔

ان معلومات کی روشنی میں یہ کہنا بجا ہے کہ اہل ہند کو قبل از وقت موت سے بچنے کے لئے آزادی حاصل کرنی چاہئے حقیقت تو یہ ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے لئے کوئی وجہ پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔

آزادی ہر انسان کا طبعی حق ہے۔

ہندوستانیوں کا باہم انگریزی بولنا شرمناک ہے

پریزیڈنٹ سبھاش چندر بوس نے حال ہی میں ایک تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

"گزشتہ سال جب میں وائنا میں تھا ایک یوروپین دوست نے مجھے چند اور ہندوستانی دوستوں کے ساتھ کھانے کے لئے مدعو کیا۔ جب وہاں ہم سب باہم انگریزی میں گفتگو کرنے لگے تو ہمارا وہ یورپی دوست بہت حیران ہوا اور اس نے پوچھا کہ آپ لوگ آپس میں انگریزی زبان کیوں بولتے ہیں۔ اس سوال پر ہم نے شرم سے اپنے سر جھکا لئے۔"

اِس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے مدیر ماڈرن ریویو نے لکھا ہے کہ اگر تمام ہندوستانیوں کی کوئی ایک مشترک زبان نہیں ہے تو ہمیں

ہیں شرمانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہندوستان دراصل ایک برّاعظم ہے اور اس کا رقبہ یورپ منفی روس کے برابر ہے۔ اگر کوئی شخص اس پر یہ اعتراض کرے کہ یورپ مختلف ملکوں یا خطوں میں منقسم ہے اور ہندوستان کے تمام صوبے ایک ہی ملک کے حصے ہیں تو یہ بھی درست نہیں۔ بلاشبہ موجودہ سیاسی حالات ہی نے ان صوبوں کو ایک سلسلے میں پرو دیا ہے لیکن بعد میں ایسے حالات بھی پیدا ہو سکتے ہیں کہ یہ صوبے بالکل علیحدہ علیحدہ ملکوں میں تقسیم ہو جائیں۔

دراصل مدیرِ ماڈرن ریویو ہندوستانی زبان کے مخالف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہندوستانی نے ملک کے عام ذریعۂ تعلیم کی حیثیت اختیار کر لی۔ تو صوبجاتی زبانوں کی ترقی رُک جائے گی حقیقت یہ ہے کہ انہیں بنگالی زبان کی حفاظت کا خیال مضطرب کئے ہوئے ہے لیکن تعجب ہے کہ وہ دبی زبان سے انگریزی کی موجودہ حیثیت کو برقرار رکھنے کی حمایت بھی کرتے ہیں اور اس کو بنگالی کی ترقی کی راہ میں کسی قسم کی رُکاوٹ نہیں سمجھتے۔ یہ ہندوستانیوں کے ایک طبقے کی وہی تنگ دلانہ ذہنیت ہے جو انہیں پرائی بدشگونی کے لئے اپنی ناک کٹوانے پر مجبور کرتی رہتی ہے۔ انگریزی ہندوستان پر چھا جائے تو ہرج نہیں لیکن کوئی ہندوستانی زبان اگر ملک گیر حیثیت حاصل کر چکی ہو تو اُسے مٹانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگانا چاہیے۔

مدیرِ ماڈرن ریویو نے ہندوستانی کی مخالفت کے جوش میں کانگرس کے قوم پرستانہ نصب العین کے بھی پرخچے اُڑا دیئے ہیں اور یورپ منفی روس کے مساوی برّاعظم ہندوستان کو کئی ملکوں میں تقسیم کرکے "متحدہ ہندوستان" کے خیال کو ایک خوابِ پریشاں ثابت کر دیا ہے۔ معلوم نہیں پاکستان کی تحریک کے متعلق مدیرِ ماڈرن ریویو کا کیا خیال ہے؛

البتہ اپنے مضمون کے آخر میں مدیرِ ماڈرن ریویو نے کیا خوب کہا ہے:-

"کیا کانگرس والے واقعی انگریزی کے استعمال سے شرماتے ہیں۔ یا یہ بھی سو فیصدی سودیشی بن جانے کا ایک غیر شعوری ڈھونگ ہے؛ جب فی الواقع اس شرم کی جڑیں گہری چلی جائیں گی (بشرطیکہ کبھی گئیں)۔ تو کانگرس والے اپنی کتابیں، رسالے، اشتہار، اخبارات، مضامین اور خطبات وغیرہ انگریزی زبان میں لکھنا اور چھاپنا وغیرہ ترک کر دیں گے۔ اُس وقت خواہ وُہ وائسرائے ہوں گے خواہ کسی ہندوستانی شہر یا گاؤں میں، وہ ایک دوسرے سے انگریزی زبان میں گفتگو کرنا قطعاً چھوڑ دیں گے۔"

سوویٹ روس میں اعلیٰ تعلیم اور باروزگاری

موسیو مولٹوف نے کُل رُوس کے اساتذہ کی انجمن میں تقریر کرتے ہوئے بیان کیا کہ برطانیہ جرمنی، اٹلی، فرانس اور جاپان کی تمام یونیورسٹیوں اور ہائی سکولوں کے طلبہ کی مجموعی تعداد چار لاکھ سے کچھ ہی زیادہ ہے لیکن اکیلے سوویٹ روس میں ایسے طلبہ کی تعداد ساڑھے پانچ لاکھ

تک پہنچ گئی ہے۔

مولٹوف نے ایک اور اہم انکشاف کیا۔ اُس نے یہ کہہ کر کہ سرمایہ دار ملکوں میں گریجوئیٹوں، ریسرچ کرنے والوں، سائنس والوں اور ہر قسم کے علمی کام کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد بے روزگار ہے صلائے عام دی کہ اگر کوئی شخص روس میں ایک بھی ایسا سائنسدان یا ماہر فن یا پڑھا لکھا تلاش کر کے دکھائے جو بے روزگار ہو تو ہم اُسے بیش بہا انعام دیں گے (قہقہہ)

روسی یونیورسٹیوں اور ہائی سکولوں سے ہر سال ایک لاکھ فارغ التحصیل طلبہ اور ماہرین فن نکلتے ہیں لیکن بایں ہمہ ابھی کاروبار کے تمام شعبوں میں آدمیوں کی کمی ہے۔ پڑھے لکھے آدمیوں کے بیکار رہنے کا تصور ہی روس میں احمقانہ معلوم ہوتا ہے۔

مولٹوف نے بتایا کہ دوسرے ملکوں کے سکولوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کی الگ الگ تعداد حسب ذیل ہے:۔

(۱) برطانیہ ~~~~ ۵۱۰۰۰

(۲) جرمنی ~~~~ ۷۴۰۰۰

(۳) اٹلی ~~~~ ۷۳۰۰۰

(۴) فرانس ~~~~ ۷۴۰۰۰

(۵) جاپان ~~~~ ۱۴۶۰۰۰

اس موقع پر مولٹوف نے روس کے موجودہ اعلیٰ نظامِ تعلیم کا مقابلہ عہدِ زار کے روس سے کیا۔ اُس زمانے میں نوے اعلےٰ تعلیم گاہیں تھیں، جن میں ایک لاکھ پچیس ہزار طلبہ تعلیم پاتے تھے۔ اب تعلیم گاہوں کی تعداد سات سَو ہے اور اُن میں ساڑھے پانچ لاکھ طلبہ تعلیم پا رہے ہیں۔ مولٹوف نے اس بات کی طرف حاضرین کو خاص طور پر متوجہ کیا کہ قدیم روس کی طرح آج کل کے طلبہ صرف امرا اور متوسط الحال طبقے کے بچوں پر مشتمل نہیں بلکہ اُن میں وہ تمام بچے شامل ہیں جو اعلےٰ تعلیم حاصل کرنے کا شوق اور اُس سے فائدہ اُٹھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ روس کے اُن دُور اُفتادہ علاقوں میں جہاں زاروں کے عہد میں سَو فیصدی لوگ اَن پڑھ تھے اب بڑے بڑے سکول اور عظیم الشان یونیورسٹیاں روز افزوں ترقی حاصل کر رہی ہیں۔

روس کے تمام تعلیمی مصارف کا بار حکومت برداشت کرتی ہے اور عوام کے بچے اُس سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ روس میں اعلےٰ سے اعلےٰ تعلیم بھی پڑھے لکھوں کو ہندوستان کی طرح بے روزگاری کے عذاب میں گرفتار نہیں کرتی۔ اعلیٰ تعلیم اگر ملک کے نظامِ حکومت اور معاشی حالات سے ہم آہنگ ہو تو بے روزگاری کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

آہ غلام ہندوستان!

حامد علی خاں

" وینس آف مائلو "

شکریہ جاپان

چین شکریہ ادا کرتا ہے
جاپان کا
"ارضِ آفتاب" کی آتش فشانیوں کا
جنھوں نے بیدار کر دیا
خوابیدہ چین کو ——
چین شکریہ ادا کرتا ہے
جاپان کا

جس کے بم بار طیاروں نے
ہموار کر دیا سطحِ زمین کے ساتھ
خوبصورت شہروں کو،
اس دبی ہوئی راکھ سے،
چنگاریاں نکلیں،
جو جلا کر خاک کر دیں گی
جاپان کو،
چین شکریہ ادا کرتا ہے
جاپان کا
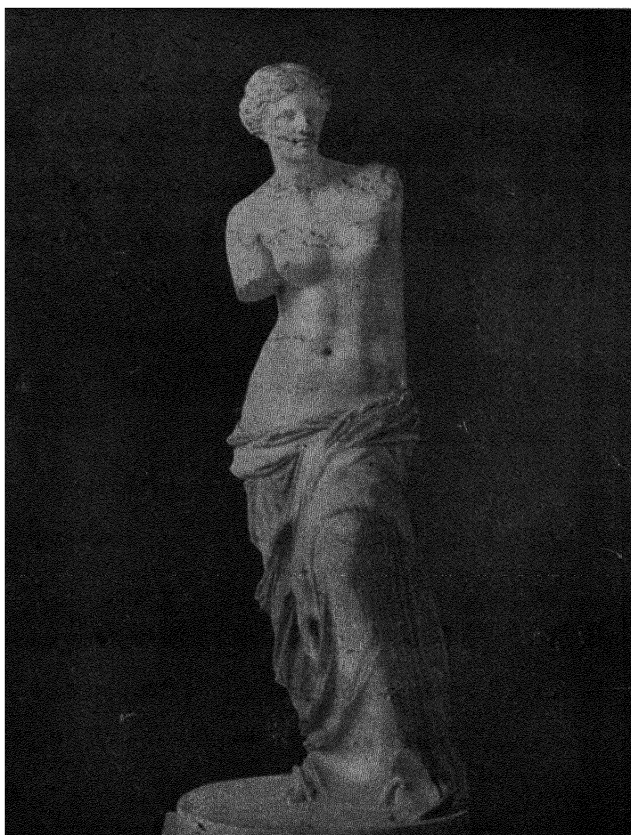
چین کمزور تھا، نحیف و لاغر
نیم گرسنہ اور نیم عریاں،
جاپان نے چھین لینا چاہا،
چین سے
زندہ رہنے کا حق، سانس لینے کا اختیار
چین متحد اور قوی ہو گیا
جاپان کے ظلم سے
چین شکریہ ادا کرتا ہے
جاپان کا

جنگ سے علیحدہ رکھنے کے لئے،
چینی مسلمانوں کو
مسجد بنائی ٹوکیو میں، جاپان نے
جب مسمار ہوتے دیکھا،
جاپان کے ہاتھوں
سینکڑوں مسجدوں کو،
بیدار ہوا، صف آرا ہوا،
چینی مسلمان،
چین شکریہ ادا کرتا ہے
جاپان کا

سرگزشتِ دانہ

پہلے میں بویا گیا جوتے ہوئے اک کھیت میں
کھو گیا برگ و نوائے زندگانی ریت میں

کچھ دنوں طاری رہا اعصاب پر اکسیرِ جمود
خوابِ غفلت کا مرادف تھا طلسمِ ہست و بود

ابر کھیتوں میں لگا جس وقت موتی ڈولنے
راہ دی مجھ میں رطوبت کو مرے ماحول نے

آ کے قدرت نے صدائے قُم باذن اللہ دی
بے حسِ اعضائے بدن میں ولولوں کو راہ دی

دی شعاعِ مہر نے تابندگی ادراک میں
میٹھا میٹھا درد جاگ اُٹھا دلِ صد چاک میں

کوششِ روئیدگی نے پھر دیا چولا بدل
قلب کے پہلو سے شاخِ آرزو آئی نکل

اب یہ "کلا" دل میں گھبرا کر سکوتِ ارض سے
قوّتِ نشو و نما کو لے کے طول و عرض سے

غُرفۂ ہستی میں مصروفِ نظارہ ہو گیا
دامنِ عافیت دل پارہ پارہ ہو گیا

دُھوپ کی گرمی سے جب آب و ہوا راس آ گئی
زرد پودے کے رگ و ریشہ پہ سبزی چھا گئی

کھیت کے آغوش میں پروان چڑھتا ہی رہا
تھا ترقی کے لئے میدان بڑھتا ہی رہا

رفتہ رفتہ نرم و نازک بالیاں آنے لگیں
سبز پتّوں میں ہوا کے ساتھ لہرانے لگیں

بالیوں میں دودھیا دانے نظر آنے لگے
مظہرِ جوشِ جوانی بن کے گدرانے لگے

ہوتے ہوتے ختمِ انجامِ شباب آ ہی گیا
فصل پک جانے سے کھیتوں پہ عذاب آ ہی گیا

کھیت کو پامال کرنے پر تُلے دہقاں کے ہاتھ
میری شہ رگ بھی کٹی اپنے جگر گوشوں کے ساتھ

آہ مَیں باندھا گیا۔ کوٹا گیا۔ جھٹکا گیا
صرصرِ موّاج کی امداد سے پھٹکا گیا

اُڑ گیا بھوسا ہوا میں رہ گیا غلّے کا ڈھیر
پھیر لایا اصل کی جانب مری قسمت کا پھیر

شعر کی دُنیا میں مستلزم ہے خرمن کو شرر
مجھ کو بجلی تھی مگر سرمایہ داروں کی نظر

دوسری جانب مری تخئیل کا رُخ پھر گیا
خود غرض چیلوں میں عنقائے تفکّر گھر گیا

ہاں تو مَیں کیا کہہ رہا تھا، سوچ لوں، یاد آ گیا
میں لباسِ اوّلیں میں ہو کے برباد، آ گیا

محفلِ ہستی میں افسانہ در افسانہ ہوں مَیں
آج کن تبدیلیوں کے بعد پھر دانہ ہوں مَیں

شاد عارفی

دو فرلانگ لمبی سڑک

کچہریوں سے لے کر لا کالج تک بس یہی کوئی دو فرلانگ لمبی سڑک ہوگی۔ ہر روز مجھے اسی سڑک پر سے گزرنا ہوتا ہے۔ کبھی پیدل، کبھی سائیکل پر۔ سڑک کے دو رویہ شیشم کے سوکھے سوکھے اداس سے درخت کھڑے ہیں۔ ان میں نہ حسن ہے نہ چھاؤں، سخت کھردرے تنے اور ٹہنیوں پر گدھوں کے جھنڈ۔ سڑک صاف سیدھی اور سخت ہے۔ متواتر نو سال سے میں اس پر چل رہا ہوں، نہ اس میں کبھی کوئی گڑھا دیکھا ہے، نہ شگاف۔ سخت سخت پتھروں کو کوٹ کوٹ کر یہ سڑک تیار کی گئی ہے، اور اب اس پر کولتار بھی بچھی ہے، جس کی عجیب سی بو گرمیوں میں طبیعت کو پریشان کر دیتی ہے۔

سڑکیں تو میں نے بہت دیکھی بھالی ہیں۔ لمبی لمبی، چوڑی چوڑی سڑکیں، برادے سے ڈھنپی ہوئی سڑکیں، سڑکیں جن پر سرخ بجری بچھی ہوئی تھی، سڑکیں جن کے گرد سرو شمشاد کے درخت کھڑے تھے، سڑکیں ——— مگر نام گنانے سے کیا فائدہ، اس طرح تو ان گنت سڑکیں دیکھی ہوں گی۔ لیکن جتنی اچھی طرح میں اس سڑک کو جانتا ہوں اور کسی اپنے گہرے دوست کو بھی اتنی اچھی طرح نہیں جانتا، متواتر نو سال سے اسے جانتا ہوں، اور ہر صبح اپنے گھر سے جو کچہریوں کے قریب ہی ہے اٹھ کر دفتر جاتا ہوں جو لا کالج کے پاس ہی ہے، بس یہی دو فرلانگ کی سڑک۔ ہر صبح اور ہر شام، کچہریوں سے لے کر لا کالج کے آخری دروازے تک کبھی سائیکل پر، کبھی پیدل۔

اس کا رنگ کبھی نہیں بدلتا، اس کی ہیئت میں تبدیلی نہیں آتی۔ اس کی صورت میں روکھا پن بدستور موجود ہے، جیسے کہہ رہی ہو مجھے کسی کی کیا پروا ہے، اور یہ ہے بھی سچ، اسے کسی کی پروا کیوں ہو؟ سینکڑوں، ہزاروں انسان، گھوڑے، گاڑیاں، موٹریں اس پر سے ہر روز گزر جاتی ہیں، اور پیچھے کوئی نشان باقی نہیں رہتا، اس کی ہلکی نیلی اور سانولی سطح اسی طرح سخت اور سنگلاخ ہے جیسی پہلے روز تھی جب ایک یوریشین ٹھیکیدار نے اسے بنایا تھا۔

یہ کیا سوچتی ہے؟ یا شاید یہ سوچتی ہی نہیں، میرے سامنے ہی ان نو سالوں میں اس نے کیا کیا واقعات، حادثے دیکھے، ہر روز ہر لمحہ کیا نئے تماشے نہیں دیکھتی، لیکن کسی نے اسے مسکراتے نہیں دیکھا، نہ روتے ہی، اس کی پتھریلی چھاتی میں کبھی ایک درز بھی پیدا نہ ہوئی۔

"ہائے، بابو، اندھے محتاج غریب فقیر پر ترس کرو رے بابا، اے بابو، خدا کے لئے ایک پیسہ دیتے جاؤ رے بابا، ارے

کوئی بھگوان کا پیارا نہیں۔ صاحب جی میرے ننھے ننھے بچے بلک رہے ہیں۔ ارے کوئی تو ترس کھاؤ ان تیموں پر۔

درجنوں گداگر اسی سڑک کے کنارے بیٹھے رہتے ہیں۔ کوئی اندھا ہے تو کوئی لنجا۔ کسی کی ٹانگ پر ایک خطرناک زخم ہے تو کوئی غریب عورت دو تین چھوٹے چھوٹے بچے گود میں لئے حسرت بھری نگاہوں سے راہگیروں کی طرف دیکھتی جاتی ہے۔ کوئی پیسہ دے دیتا ہے۔ کوئی تیوری چڑھائے گزر جاتا ہے۔ کوئی گالیاں دے رہا ہے۔ حرامزادے مسٹنڈے، کام نہیں کرتے بھیک مانگتے ہیں۔

کام۔ بیکاری۔ بھیک۔

دو لڑکے سائیکل پر سوار ہنستے ہوئے جا رہے ہیں۔ ایک بوڑھا امیر آدمی اپنی شاندار فٹن میں بیٹھا سڑک پر بیٹھی ہوئی کھ کارن کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اپنی انگلیوں سے مونچھوں کو تاؤ دے رہا ہے۔ ایک سست مضمحل کتا فٹن کے پہیوں تلے آ گیا ہے۔ اس کی پسلی کی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ لہو بہہ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں کی افسردگی، بے چارگی، اس کی ہلکی ہلکی دردناک ٹیاؤں ٹیاؤں کسی کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی۔ بوڑھا آدمی اب گدیلوں پر جھکا ہوا اس عورت کی طرف دیکھ رہا ہے جو ایک خوشنما سیاہ رنگ کی ساڑھی زیب تن کئے اپنے لوکر کے ساتھ مسکراتی ہوئی باتیں کرتی ہوئی جا رہی ہے۔ اس کی سیاہ ساڑھی کا نقرئی حاشیہ بوڑھے کی حریص آنکھوں میں چاند کی کرن کی طرح چمک رہا ہے۔

× × × × × × × × × ×

پھر کبھی سڑک سنسان ہوتی ہے۔ صرف ایک جگہ شیشم کے درخت کی چھدری چھاؤں میں ایک ٹانگے والا گھوڑے کو سستا رہا ہے گدھ دھوپ میں ٹہنیوں پر بیٹھے اونگھ رہے ہیں۔ پولیس کا سپاہی آتا ہے۔ ایک زور کی سیٹی۔ او ٹانگے والے، یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے کیا نام ہے تیرا۔ کردوں چالان؟ 'ہجور'۔ ہجور کا بچہ، چل تھانے 'ہجور' یہ تھوڑا ہے۔ اچھا جا تجھے معاف کیا۔

"ٹانگے والا ٹانگے کو سرپٹ دوڑائے لئے جا رہا ہے۔ راستے میں ایک "گورا" آ رہا ہے۔ سر پر ٹیڑھی ٹوپی، ہاتھ میں بید کی چھڑی رخساروں پر پسینہ، لبوں پر کسی ڈانس کا سر۔

کھڑا کردو، کنٹونمنٹ

آٹھ آنے صاب

ول، چھ آنے

نہیں صاب

کیا بکتا ہے، ٹم . . . .

"ٹانگے والے کو مارتے مارتے بید کی چھڑی ٹوٹ جاتی ہے۔ پھر ٹانگے والے کا چمڑے کا ہنٹر کام آتا ہے۔ لوگ اکٹھے ہو رہے

ہیں، پولیس کا سپاہی بھی پہنچ گیا ہے، حرامزادے، صاحب بہادر سے معافی مانگو، تانگے والا اپنی میلی پگڑی کے گوشے سے آنسو پونچھ رہا ہے، لوگ منتشر ہو جاتے ہیں۔

اب سڑک پھر سنسان ہے،

شام کے دھندلکے میں بجلی کے قمقمے روشن ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ کھمبوں کے قریب چند مزدور، بال بکھرے، میلے لباس پہنے باتیں کر رہے ہیں۔

بھیا بھرتی ہو گیا

ہاں

تنخواہ تو اچھی ملتی ہو گی

ہاں

بڑھئو کے لئے کما لائے گا، پہلے بیوی تو ایک ہی پھٹی ساڑھی میں رہتی تھی۔

سنا ہے، جنگ شروع ہونے والی ہے

کب شروع ہو گی؛

کب؛ اس کا تو پتہ نہیں، مگر ہم گریب ہی تو مارے جائیں گے

کون جانے گریب مارے جائیں گے کہ امیر

ننھا کیسا ہے؛

بخار نہیں ٹلیا۔ کیا کریں، ادھر جیب میں پیسے نہیں ہیں، ادھر حکیم سے دوائی ــــ

بھرتی ہو جاؤ

سوچ رہے ہیں

رام رام

رام رام

پھٹی ہوئی دھوتیاں، ننگے پاؤں، تھکے ہوئے قدم۔ یہ کیسے لوگ ہیں، یہ نہ تو آزادی چاہتے ہیں نہ حریت۔ یہ کیسی عجیب باتیں ہیں۔ پیٹ، بھوک، بیماری، پیسے، حکیم کی دوائی، جنگ!

قمقموں کی زرد زرد روشنی سڑک پر پڑ رہی ہے۔

دو عورتیں - ایک بوڑھی، ایک جوان، اُپلوں کے ٹوکرے اُٹھائے، خچروں کی طرح ہانپتی ہوئی گزر رہی ہیں - جوان عورت کی چال تیز ہے -

"بیٹی، ذرا ٹھہر تو"۔ بوڑھی عورت کے چہرے پر بے شمار جھریاں ہیں، اُس کی چال مدھم ہے، اُس کے لہجے میں بے کسی ہے -

بیٹی، میں ذرا ٹھہر، میں تھک گئی . . . . . میرے اللہ

اماں، ابھی گھر جا کر روٹی پکانی ہے . تُو تو باؤلی ہوئی ہے،

اچھا، بیٹی، اچھا بیٹی

بوڑھی عورت جوان عورت کے پیچھے بھاگتی ہوئی جا رہی ہے، بوجھ کے مارے اُس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں - اُس کے پاؤں ڈگمگا رہے ہیں -

وہ صدیوں سے اسی سڑک پر چل رہی ہے، اپلوں کا بوجھ اُٹھائے ہوئے، کوئی اُس کا بوجھ ہلکا نہیں کرتا، کوئی اُسے ایک لمحہ ستانے نہیں دیتا، وہ بھاگی ہوئی جا رہی ہے، اُس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں، اُس کے پاؤں ڈگمگا رہے ہیں، اُس کی جھریوں میں غم ہے اور بھوک اور فکر اور غلامی، صدیوں کی غلامی!

تین چار نوخیز لڑکیاں، بھڑکیلی ساڑھیاں پہنے، باہوں میں باہیں ڈالے ہوئے جا رہی ہیں -

بہن، آج شملہ پہاڑی کی سیر کریں،

بہن، آج لارنس گارڈن چلیں

بہن، آج انارکلی

ریگل!

شٹ اپ یو فول

× × × × × × × ×

آج سڑک پر سُرخ جلوان بچھا ہے، آر پار جھنڈیاں لگی ہوئی ہیں، جا بجا پولیس کے سپاہی کھڑے ہیں، کسی بڑے آدمی کی آمد ہے، جبھی تو سکولوں کے چھوٹے چھوٹے لڑکے نیلی پگڑیاں باندھے سڑک پر دو رویہ قطاروں میں کھڑے ہیں - اُن کے ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں ہیں - اُن کے لبوں پر پپڑیاں جم گئی ہیں، اُن کے گال دُھوپ کی حدت سے تمتما اُٹھے ہیں، اسی طرح کھڑے کھڑے وہ ڈیڑھ گھنٹہ سے بڑے آدمی کا انتظار کر رہے ہیں، جب وہ پہلے پہلے یہاں سڑک پر کھڑے ہوئے تھے تو ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے، اب سب چپ ہیں، چند لڑکے ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گئے تھے، اب اُستاد اُنہیں کان سے

پکڑ کر اُٹھا رہے ہیں۔ شفیع کی پگڑی کُھل گئی تھی، اُستاد اُسے گھور کر کہہ رہا ہے، "او شفی، پگڑی ٹھیک کر، پیارے لال کی شلوار اُس کے پاؤں میں اٹک گئی ہے اور ازاربند جوتیوں تک لٹک رہا ہے۔ تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے، پیارے لال"

"ماسٹر جی، پانی"

پانی کہاں سے لاؤں، یہ بھی تم نے اپنا گھر سمجھ رکھا ہے، دو تین منٹ اور انتظار کرو، بس ابھی چھٹی ہوا چاہتی ہے۔

دو منٹ، تین منٹ، آدھ گھنٹہ

ماسٹر جی، پانی

ماسٹر جی، پانی

ماسٹر جی، بڑی پیاس لگی ہے۔

لیکن اُستاد اب اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے، وہ اِدھر اُدھر دوڑتے ہوئے پھر رہے ہیں، لڑکو ہوشیار ہو جاؤ، دیکھو جھنڈیاں اس طرح ہلانا، ابے تیری جھنڈی کہاں ہے، قطار سے باہر ہو جا، بدمعاش کہیں کا ... سواری آ رہی ہے،

موٹر سائیکلوں کی پھٹ پھٹ، بینڈ کا شور، پتلی اور چھوٹی جھنڈیاں بیدلی سے ہلتی ہوئی، سوکھے ہوئے گلوں سے پژمردہ نعرے بڑا آدمی سڑک سے گزر گیا، لڑکوں کی جان میں جان آگئی ہے، اب وہ اُچھل اُچھل کر جھنڈیاں توڑ رہے ہیں، شور مچا رہے ہیں۔

خوانچے والوں کی صدائیں، ریوڑیاں، گرم گرم چنے، حلوا پوری، نان کباب،

ایک خوانچے والا ایک طرّے والے بابو سے جھگڑ رہا ہے، مگر آپ نے میرا خوانچہ اُلٹ دیا، میں آپ کو نہ جانے دوں گا، میرا تین روپے کا نقصان ہو گیا، میں غریب آدمی ہوں، میرا نقصان پورا کر دیجئے تو میں جانے دوں گا۔

× × × × × × × ×

صبح کی ہلکی ہلکی روشنی میں بھنگی سڑک پر جھاڑو دے رہا ہے، اُس کے مُنہ اور ناک پر کپڑا بندھا ہے، جیسے بیلوں کے مُنہ پر جب وہ کولھو چلاتے ہیں، وہ گرد و غبار میں اٹا ہوا ہے اور جھاڑو دیئے جا رہا ہے۔

میونسپلٹی کا پانی والا چھکڑا آہستہ آہستہ سڑک پر پانی چھڑک رہا ہے، چھکڑے کے آگے جُتے ہوئے دو بیلوں کی گردنوں پر زخم پیدا ہو گئے ہیں، چھکڑے والا سردی سے ٹھٹھرتا ہوا کوئی گیت گانے کی کوشش کر رہا ہے، بیلوں کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ ابھی سڑک کا کتنا حِصّہ باقی ہے۔

سڑک کے کنارے ایک بُوڑھا گداگر مرا پڑا ہے، اُس کے میلے دانت ہونٹوں کے اندر دھنس گئے ہیں۔ اُس کی کُھلی ہوئی

بے نور آنکھیں آسمان کی طرف تک رہی ہیں۔

خدا کے لئے مجھ غریب پر ترس کر جاؤ رے بابا

کوئی کسی پر ترس نہیں کرتا، سڑک خاموش اور سنسان ہے، یہ سب کچھ دیکھتی ہے سنتی ہے مگر ٹس سے مس نہیں ہوتی، انسان کے دل کی طرح بے رحم، بے حس اور وحشی ہے۔

انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں اکثر میں سوچتا ہوں کہ اگر اسے ڈائنا میٹ لگا کر اُڑا دیا جائے، تو پھر کیا ہو، ایک بلند دھماکے کے ساتھ اس کے ٹکڑے فضا میں پرواز کرتے نظر آئیں گے، اُس وقت مجھے کتنی مسرت حاصل ہوگی، اس کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ کبھی کبھی اس کی سطح پر چلتے چلتے میں پاگل سا ہو جاتا ہوں، چاہتا ہوں کہ اسی دم کپڑے پھاڑ کر ننگا سڑک پر ناچنے لگوں اور چلّا چلّا کر کہوں، میں انسان نہیں ہوں، میں پاگل ہوں، مجھے انسانوں سے نفرت ہے، مجھے انسانوں سے نفرت ہے۔ مجھے پاگل خانے کی غلامی بخش دو، میں ان سڑکوں کی آزادی نہیں چاہتا۔

× × × × × × × ×

سڑک خاموش ہے اور سنسان۔ بلند ٹہنیوں پر گدھ بیٹھے اُونگھ رہے ہیں۔

یہ دو فرلانگ لمبی سڑک

کرشن چندر

اپنے سپاہیوں سے گیری بالڈی کا خطاب

سپاہیو! میں جو کچھ تمہیں پیش کر سکتا ہوں، ماندگی ہے، خطرات ہیں اور مشقت ہے ـــــ رات کو میدان میں کڑکڑاتی سرد ہوائیں اور دن کو دہکتے ہوئے سُورج کی چلچلاتی دھوپ۔ نہ سر چھپانے کا ٹھکانا ہے، نہ گولی بارود ہے اور نہ خوراک۔ بلکہ جبری کوچ ہیں، خطرناک چوکیاں ہیں اور سنگینوں کے ساتھ توپ خانوں کا مسلسل مقابلہ ہے۔ وہ جنہیں آزادی اور وطن عزیز ہے، میرے پیچھے آ سکتے ہیں۔

حامد علی خاں

تجلّیات

جچتے نہیں نگاہ میں سرو و سمن یہاں
کشتِ خیال میں ہیں ہزاروں چمن یہاں

میرے حریمِ دل میں ہے وہ نور موجزن
صد مہر و مہ بدوش ہے اِک اِک کرن یہاں

طاری ہے ایک رقصِ طرب فرش و عرش پر
خود مطربِ الست ہؤا نغمہ زن یہاں

ہوں بادہ نوشِ میکدۂ ہست و بود کا
اِک ساغرِ شکستہ ہے چرخ کہن یہاں

کچھ اُٹھ کے چل دیئے تو کئی اور آ گئے
صبحِ الست سے ہے بپا انجمن یہاں

راہِ حرم نہیں ہے یہ ہے راہِ عاشقی
ہر گام پر ہیں سینکڑوں دار و رسن یہاں

باطل کی فوج تیرے مقابل ہے صف بہ صف
لا ذوالفقار و بازوئے خیبر شکن یہاں

یہ بزمِ لطف و عیش نہیں رزمگاہ ہے
زخموں کے لالہ زار سے ہے بانکپن یہاں

حُسنِ عمل کی تیغ و سپر کبریا سے مانگ
ہے جنگ میں حریف ترا اہرمن یہاں

تاریکیوں کا ایک سمندر ہے موجزن
تاریکیوں میں غرق ہیں دشت و دمن یہاں

منزل ملے گی مشعلِ عرفاں سے اے اثرؔ
کچھ کام آ سکے گی نہ شمعِ سخن یہاں

اثر صہبائی

ہندوستانی

ابھی ابھی مسٹر سی جی گریوز، پروپیگنڈا آفیسر کرسچین سوسائٹی مدراس نے ایک مختصر سی کتاب "تاریخ ادبِ ہندی" بہ زبانِ انگریزی شائع کی ہے دیباچہ میں آپ نے "ہندوستانی" کی نامکمل سی بحث بھی اُٹھائی ہے۔ آپ اُردو سے بھی کافی دلچسپی رکھتے ہیں۔ میں نے ایک خط اس سلسلے میں ان کو لکھا تھا جس کا جواب مجھ کو فوراً مل گیا۔ دونوں خطوط کے تراجم درج ذیل ہیں:-

ڈیر مسٹر گریوز،

کچھ دنوں سے ہندوستان میں "ہندوستانی" کا مسئلہ چھڑا ہوا ہے آپ کو معلوم ہوگا کہ شمالی ہندوستان میں عام طور پر دو زبانیں بولی اور لکھی جاتی ہیں یعنی ہندی اور اُردو۔ ہندی خاص طور پر ہندو قوم کی زبان ہے اور اُردو عام طور پر سب لوگوں کی مشترکہ زبان ہے لیکن مسلمانانِ ہند اس سے خصوصاً اس لئے وابستہ ہیں کہ ان کے طرزِ معاشرت، اخلاقیات اور مذہبی جذبات کی اس سے ترجمانی ہوتی ہے۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ سیاسی تفرقہ کے ساتھ ہندی اور اُردو کا بھی جھگڑا پیدا ہوگیا ہے اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ اُردو دُنیا کا ایک بڑا ادیب جو ایک زبردست مذہبی پیشوا بھی ہے اس بات کا مدعی ہے کہ ایک نئی زبان "ہندوستانی" کی طرح ڈالی جائے۔

ایک دفعہ کسی تقریب کے سلسلے میں جو ان سے میری ملاقات موضع اوکھدی (ضلع مظفرنگر) میں ہوئی تو اس "ہندوستانی" کا ان کو اس درجہ شیدائی پایا کہ خدا کی پناہ۔ آپ نے فرمایا کہ گذشتہ سال جب میں علی گڑھ یونیورسٹی میں ایم اے کا ممتحن ہوا تو میں نے طلبہ سے اسی "ہندوستانی" پر رائے طلب کی تھی اور نتیجہ کے طور پر دیکھا کہ نوّے فی صدی طلبہ نے اس کے حق میں رائیں دیں۔ کسی منچلے نے فوراً وہیں کہہ دیا کہ "علی گڑھ" کے طلبہ آپ کے جذبات سے واقف تھے چنانچہ صرف نمبر حاصل کرنے کے لئے مصلحتہً انہوں نے ایسا کیا ہوگا!

چونکہ ابھی ابھی آپ کی کتاب "تاریخ ادب ہندی" میری نظر سے گزری ہے جس میں آپ نے سرسری طور پر اس ہندوستانی کا مختصر تذکرہ کیا ہے، مَیں آپ سے یہ گزارش کرتا ہوں کہ آپ مہربانی فرما کر یہ بتائیں کہ یہ "ہندوستانی" کہاں تک ملک کے لئے مفید ثابت ہوسکتی ہے اور کہاں تک مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

نیازمند

ظفر احمد کوکب

مدراس

ڈیر مسٹر ظفر،

آپ کا خط ملا۔ اگر برا نہ مانیئے تو آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ میں اس طرح کے اختلافی سوالات کے جواب دینے کا بالکل اہل نہیں ہوں میں نے اپنی کتاب میں ہندوستانی کا جتنا تذکرہ کیا ہے وہ صرف مضمون کے تعارف کی غرض سے ہے۔ بہرحال چونکہ آپ نے اپنے سوال میں میرے لئے کافی دلچسپی پیدا کر دی ہے اس لئے اس کے متعلق تھوڑا بہت بھی لکھ دینا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ انسان کی خدمت ہم لوگوں کا فرض ہے۔ میں جو کچھ لکھوں گا اپنی ذاتی رائے کی بنا پر لکھوں گا۔ ممکن ہے اس میں چند ایسی باتیں ہوں جو آپ کے حسب منشا ہوں لیکن اکثر نکات ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو آپ کے جذبات کے خلاف ہوں، اس کے لئے اُمید ہے کہ آپ مجھے قابلِ معافی سمجھیں گے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہندوستان میں فی الحقیقت اُردو اور ہندی سے مل کر کوئی ایک نئی زبان پیدا ہو جائے تو یہ ملک کی خوش قسمتی ہوگی۔ نام سے کوئی بحث نہیں۔ آپ اس کو ہندوستانی کہیئے یا عربی۔ الفاظ کے خزانوں کے لحاظ سے اپنی اپنی جگہ اُردو اور ہندی دونوں فخر کر سکتی ہیں۔ اگر موجودہ ہندی پر زیادہ تر سنسکرت کا احسان ہے تو اُردو پر فارسی اور عربی دونوں کا ہے۔ افسوس کہ اُردو نویس بڑے بڑے عربی اور فارسی الفاظ اور ہندی نویس کٹے کٹے سنسکرت الفاظ ترک کر دیں۔ مجھ کو بالکل بچپن سا معلوم ہوتا ہے۔ حق یہ ہے کہ اُردو کی خوبصورتی فارسی اور عربی سے اور ہندی کی سنسکرت اور بھاشا سے ہے۔ ہاں اگر یہ انتظام ہو سکے کہ ہندی اور اُردو کے تمام الفاظ ایک زبان میں جمع کر دیئے جائیں اور ان کا استعمال عام ہو جائے تو خیر اس طرح کی ایک زبان قابلِ قبول ہو سکتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ قابلِ عمل نہیں۔

موجودہ "ہندوستانی" کی تحریک خلافِ عقل ہے۔ زبان کو مصنوعی طور پر سہل بنانے سے تو بہتر یہ ہے کہ وہ بازاری زبان بولی اور لکھی جائے جو روزانہ ہم آپ شہروں کے بازاروں میں، کارخانوں میں اور ریل گاڑیوں پر ایک صوبہ والے کو دوسرے صوبہ والے سے بولتے ہوئے سنتے ہیں۔ یہی ایک بہترین "ہندوستانی" ہو سکتی ہے۔ مگر پھر اس کے لئے اہتمام اور پروپیگنڈا کی چنداں ضرورت نہیں ہے کیونکہ ایسی زبان تو ایک صدی سے اس ملک میں بولی جا رہی ہے۔ صرف ضرورت اتنی ہے کہ علمائے ادب اس کا فتویٰ دے دیں، کہ ہر عامی جو زبان بھی جس طرح اُلٹ پلٹ کر بولتا ہے فصیح ہے۔

اگر زبان کو جُول توں کر کے سہل بنانا ضروری ہو تو ظاہر ہے کہ ہندی سے زیادہ اُردو میں اس کی صلاحیت موجود ہے۔ اُردو کی طرح ہی اس لئے پڑی تھی کہ اکثر زبانوں کے اچھے الفاظ "مصادر چھوڑ کر" اس میں لے لئے جائیں۔ مثال کے طور پر اُردو میں "پوجا" اور "پرستش" دونوں رائج ہیں، "گل اندازی" اور "مٹی بھرنی" دونوں صحیح۔ مگر اُردو میں چند الفاظ فارسی اور عربی سے مل کر اس طرح

بنے ہیں کہ اگر اُن کے لئے ہندی لفظ لایا جائے تو بالکل لچر ہوگا۔ مثلاً فارسی کے لفظ "چشم" اور عربی کے لفظ "عین" سے الفاظ "چشمہ" اور "عینک" بنے ہیں۔ ہندی میں لفظ "آنکھ" یا "نین" ہے۔ اگر ہندی نوازی کے پھیر میں آکر ہم "عینک" کی جگہ "نینک" لکھیں تو یقیناً فصاحت کا خون ہوگا۔ علاوہ اس کے اُردو میں چند ایسے الفاظ ہیں جن کے لئے آپ ہندی لا ہی نہیں سکتے۔ جیسے اگر پاجامے کے لئے دھوتی، مسجد کے لئے مندر اور نماز کے لئے پوجا لکھئے تو مطلب ہی فوت ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندی میں بھی چند ایسے الفاظ ہیں جن کے لئے فارسی یا عربی سے مدد نہیں لی جا سکتی لیکن ساتھ اس کے یہ بھی ظاہر ہے کہ ہندی کے ایسے الفاظ تو اُردو ہی سمجھے جاتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ وقتاً فوقتاً "السلام علیکم" کے بدلے "آداب عرض" کہا جائے تو ہرج نہیں۔ "محبت" کے لئے "پریم" اور "دل" کے لئے "ہردے" استعمال کیا جائے تو بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اس سے اُردو زبان کی ایک گونہ ترقی ہو سکتی ہے۔ ہاں مجھ کو یہ اچھا نہیں لگتا کہ اُردو میں لوگ "زلزلہ" کے بدلے "بھوئیں کمپ"، "امید" کے بدلے "آشا"، ہندوستان کے بدلے "ہندوستھان" لکھیں۔

ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے جس کو صحیح معنی میں بر اعظم کہا جا سکتا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ اس میں قطعی اس کی ضرورت نہیں کہ ایک ہی زبان بولی اور لکھی جائے۔ اس سے سیاسی اتحاد میں کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ اُردو ایک ایسی زبان ہے کہ بغیر پڑھے لکھے ہر شخص بول سکتا ہے اور سمجھ سکتا ہے لیکن ہندی ایک ایسی چیز ہے کہ خصوصاً مسلمانوں کے لئے لکھنا تو کجا سمجھنا بھی مشکل ہے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ رسم الخط میں اس کو بڑی آسانی ہے اور خصوصاً طباعت کے معاملے میں۔ لیکن جو زبان عام طور پر ہندوستان میں سمجھی جاتی ہے، وُہ اُردو ہے۔ اب رہا رسم الخط کا معاملہ تو اصل جھگڑا یہی ہے۔ ضرورت ہے کہ اُردو چھاپہ خانہ کی سائنس کو ترقی دی جائے لیکن ہر حرف کو علیحدہ لکھنے کو میں بُرا سمجھتا ہوں۔ اس میں انگریزی کی نقل ہوتی ہے۔ یوں بھی انگریزی میں چار قسم کے حروف ہیں۔ چھاپنے کے دو حروف ہیں ایک بڑے اور ایک چھوٹے، اس طرح لکھنے کے بھی دو۔

اخیر میں عرض ہے کہ یہ مسئلہ ایسا نہیں کہ آپ میرے خیالات معلوم کر لیں اور معاملہ طے ہو جائے۔ زمانہ کا انتظار کیجئے اور دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ اتنا یقین رکھئے کہ ایک سو سال تک یہی اُردو قائم رہے گی۔ صرف فرق اتنا ہوگا کہ اس کشمکش میں اُردو کو ایک دو ہزار الفاظ ہندی کے مل جائیں گے اور جو کثرتِ استعمال سے عام ہو جائیں گے۔

آپ کا

سی۔ جی گریوز

اُردو کا ماضی اَور حال

۱۹۰۳ء میں

"اخبار انڈین مرر (Indian Mirror) کو ایک انگریزی اخبار کے ذریعہ سے معلوم ہؤا ہے کہ سینکڑوں پروفیسر اور ہزاروں اور آدمی اس بات کے نہایت خواہش مند ہیں کہ ایک ایسی زبان بنائی جائے یا ایجاد کی جائے جو تمام یورپین قوموں کا کام دے سکے۔ ایک جنٹلمین نے لنڈن کے ایک اخبار کو لکھا ہے کہ "یہ خیال ہندوستان میں پیدا ہؤا اور یہاں بار آور ہؤا۔ ہندوستانی (اُردو) اُس قسم کی زبان کا اعلےٰ نمونہ ہے جس کی یورپ میں اب ضرورت محسوس ہوتی جاتی ہے"۔ اس معاملہ میں تو ہندوستان شاباش کا مستحق ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارے بعض ملکی بھائی اُس ترقی کو جو ہمارے مُلک میں زبان نے کی ہے روک کر ملک کو دس بیس پُشت پیچھے لے جانا چاہتے ہیں"۔

("زمیندار" ۔ ۸ جون، ۱۹۰۳ء)

۱۹۳۸ء میں

سردار سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب نے اسمبلی کے ایوان میں ۵ جولائی کو پہلی مرتبہ اُردو میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:—

"میری مادری زبان وُہی ہے جو تمام ہندوستان کی مادری زبان ہے، یعنی اُردو!"

("سول اینڈ ملٹری گزٹ" ۔ ۶ جولائی، ۱۹۳۸ء)

حفیظ ہوشیارپوری

"چاند نکلا"

(انتساب:۔ اپنی ایک عزیزہ محمودہ خاتون کے نام جو اس نظم کے وجود کی ذمہ دار ہیں۔)

چاند نکلا آسماں پر، نور برساتا ہُوا
کم ضیا تاروں کو اپنی ضَو سے شرماتا ہُوا

تنگئ مشرق سے اُٹھتا آ رہا ہے اس طرح
جیسے زنداں سے رہا ہو کوئی گھبراتا ہُوا

دولتِ تابندگی دیتا ہُوا ظلمات کو
اور ہوا پر اَبر کے ٹکڑوں کو سرکاتا ہُوا

خامشی میں بجلیاں بھرتا ہُوا کُہسار کی
نیند میں کھوئے ہوئے ذرّوں کو چونکاتا ہُوا

اُٹھ رہا ہے دُور اُفق سے رفتہ رفتہ اس طرح
جیسے آئے کوئی بیخود ٹھوکریں کھاتا ہُوا

اضطرابِ رُوح کو دیتا ہُوا اذنِ شگفت
زندگی کی خشکیوں پر کیف برساتا ہُوا

اپنی تابانی سے خود ہوتا ہُوا حیراں کبھی
جیسے شبنم کا ستارہ گُل پہ تھرّاتا ہُوا

روشنی دیتا ہُوا وادی کے خوش رُو پھول کو
برگ ہائے خشک کو کرنوں میں اُلجھاتا ہُوا

شاعری کو گدگداتا رُوح کی گہرائی میں
دِل کی گہری ظلمتوں میں برق چمکاتا ہُوا

حسُن کے معصوم چہرے سے نقاب اُلٹے ہوئے
ذہنِ شاعر میں محبّت کی قسم کھاتا ہُوا

تک رہا ہوں میں تجھے نَو عمر بچّوں کی طرح
اور تو گزرا چلا جاتا ہے کتراتا ہُوا

یا شریکِ حال ہو جا تُو مری تنہائی میں
یا فلک سے ٹوٹ کر گر جا کسی گہرائی میں

فضل الدین اثر اکبر آبادی

قطعہ

کہہ رہا تھا کوئی یہ دن ڈھلتے
دِن مصیبت کے کیوں نہیں ٹلتے

اور بھی اہلِ حرص ہیں لیکن
دانے دانے کو یوں نہیں ڈلتے

خُون پیتے ہیں جو غریبوں کا
پھُولتے ہیں، مگر نہیں پھلتے

دل ہی رکھا نہیں ہوس سے جُدا
ورنہ اس آگ میں نہیں جلتے

ہم تو اُس آستیں کے قائل ہیں
سانپ جس میں کبھی نہیں پلتے

جن کا دامن عمل سے خالی ہے
کفِ افسوس کیوں نہیں ملتے

ٹھوکریں کھا رہے ہو کیوں حیرت
راہ کیوں دیکھ کر نہیں چلتے

عبد المجید حیرت

جبریل و ابلیس

(حضرتِ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی نظم "جبریل و ابلیس" ایک مختصر ڈرامے کی صورت میں)

کردار

جبریل ——— ابلیس ——— اقبال

مقام ——— ہمالہ

زمانہ - دَورِ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو (جب ورجس صدی میں علامہ مغفور رہا ہیں)

(**پس منظر**:- ایک پُر فضا جنگل ہے۔ سبزہ زار، گُل بُوٹے اور تنا ور درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ پہاڑی ڈھلانوں پر کھڑے ہیں۔ پہاڑی نالے کا پانی شور مچاتا ہوا آبشار کی صورت میں گر رہا ہے۔ شام کی تاریکی بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ رنگِ شفق کوہسار پر کانپتا پھرتا ہے۔ خوش گلو پرندوں کی عبادت اثر راگنیوں کے درمیان اقبال، سوزِ درونِ کائنات، رزمِ خیر و شر، اور قصۂ آدم کی رنگینی جیسے مسائل کی گہرائیوں میں کھوئے ہوئے سے نظر آتے ہیں۔ یکایک دُور سے ایک سامعہ نواز آواز توحید کا نغمہ گاتی قریب آتی ہوئی سُنائی دیتی ہے)

اللہ ھُو، اللہ ھُو، اللہ ھُو، اللہ ھُو، اللہ ھُو، اللہ ھُو، اللہ ھُو

[ابلیس (فرشتوں کا کبھی اُستاد تھا۔ اب راندۂ درگاہِ کبریائی) اُدھر آ نکلتا ہے۔ "اللہ ھُو" کی آواز سُن کر ٹھٹکتا ہے اور پھر گویا حیرت سے کہتا ہے] آہ جبریل!

(اللہ ھُو کی آواز قریب آ جاتی ہے۔ حضرتِ جبریل نمودار ہوتے ہیں۔ ابلیس کو پہچان کر اُس کی طرف بڑھتے ہیں۔ صاحب سلامت کے بعد دونوں سبزۂ نوخاستہ کے فرشِ زمردیں پر آبشار کے پاس ہو بیٹھتے ہیں۔ حضرتِ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ گوشِ تخیل سے سنتے ہیں:-)

جبریل ——— ہمدمِ دیرینہ! کیسا ہے جہانِ رنگ و بُو؟

ابلیس ——— سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو

جبریل ——— ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو
کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاک دامن ہو رفو

ابلیس ——— آہ! اے جبریل! تو واقف نہیں اس راز سے
کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبُو

اب وہاں میری گزر ممکن نہیں ممکن نہیں
کس قدر خاموش ہے وہ عالمِ بے کاخ وکُو
جس کی نومیدی سے ہو سوزِ درُونِ کائنات
اُس کے حق میں تقنطُوا اچھا ہے یا لا تقنطُوا ؟

جبریل — کھو دیئے انکار سے تُو نے مقاماتِ بلند
چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو ؟

ابلیس — ہے مری جراُت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو
میرے فتنے جامۂ عقل وخرد کا تار وپُو
دیکھتا ہے تُو فقط ساحل سے رزمِ خیر وشر
کون طُوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے؟ میں کہ تُو ؟
خضر بھی بے دست وپا، الیاس بھی بے دست وپا
میرے طُوفاں یم بہ یم دریا بدریا جُو بجُو
گر کبھی خلوت میسّر ہو تو پُوچھ اللہ سے
قِصّۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہُو ؟
میں کھٹکتا ہُوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تُو فقط اللہُ ھُو، اللہ ھُو، اللہ ھُو

شفق غائب ہو جاتی ہے، تاریکی اپنے دامن میں دُنیا کو چھُپا لیتی ہے۔ فرشتے جا چکے ہیں۔ ہمارا شاعرِ اعظم زیرِ لب کچھ گنگناتا ہوُا اُٹھتا ہے، اور بادلِ ناخواستہ قیامگاہ کا رُخ کرتا ہے۔

(پردہ گرتا ہے)

معذرت:- حضرت علامہ کی نظم کے محض ایک شعر میں معمولی سا تصرّف اس لئے کرنا پڑا کہ ڈرامے کے اسٹیج کو آسمان سے زمین پر لانا اس کے سوا ممکن نہ تھا۔ ہم صدقِ دل سے اس گُستاخی کے لئے اُن کی رُوح سے عذرخواہ ہیں۔

"اب یہاں میری گزر ممکن نہیں ممکن نہیں — کس قدر خاموش ہے یہ عالمِ بے کاخ وکُو"

میں یہاں کی بجائے وہاں اور یہ کی بجائے وہ کرنا پڑا"۔

نند کشور جھنگن ایم۔ اے

اُس جگہ جہاں شب و روز ماندہ خلیج میں سُست پانی رہتا ہے
میں نے بیکاری کے شغل کے طور پر سنہری ریت کا ایک ڈھیر جمع کیا
جُونہی میری نظر اُس پر پڑی ایک شاداب قطعۂ زمین پر ایک شہر کا
نہایت ہی روشن اور دلکش تصوّر میرے پیشِ نگاہ تھا۔

مجھے سوائے نفیس برجوں، گنبدوں اور میناروں کے جو
ہزاروں گھنٹیوں کی آواز سے گونج رہے تھے کچھ بھی
دکھائی نہ دیا۔ ان کے کلس فضائے نیلگوں میں سفید نظر آرہے تھے
اپنی خواہشات سے بیقرار ہزاروں انسان شعلہ کی طرح متحرّک . . . .
اِدھر اُدھر چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔

اس سے قبل کہ میں کچھ سوچوں میں نے بے پروائی سے اس چھوٹے سے ڈھیر کو برابر کر دیا۔
اور ساتھ ہی عالمِ تصوّر کا وہ شہر بھی غائب ہو گیا۔
وہ تباہ ہو کر میرے پاؤں میں پڑا تھا۔
او خدا تُو نے کتنی بستیاں دیکھیں جو
خاموش پہاڑ اور ماندہ خلیج کے کنارے آباد ہوئیں اور ویران ہوئیں۔

(ترجمہ) وامق

دُنیائے ادب

سنسکرت

سچّی دوستی:- جھوٹے دوست بہت ہیں
لیکن جب فطرت دو سعید روحوں کو دوستی کے مقدس رشتہ میں منسلک کردے
تو اس سے بیش قرار نعمت اور کیا ہو سکتی ہے؟

مصیبت کے وقت:- بیوی، ماں، بیٹے اور بھائی کے بجائے سچے دوست پر بھروسا کر!
زمانہ حقیقی دوستی کی مسرتوں کے جامِ شیریں کو مکدر نہیں کر سکتا۔
کوئی بدباطن اس خزانہ کو چرانے پر قادر نہیں صرف موت ہی اس رشتہ کو توڑ سکتی ہے۔
(پنچ تنتر)

جھوٹا اور بیوقوف آدمی:- دانا اور پاکباز آدمی کی دوستی ایک نعمت ہے۔
اسے حاصل کر!
جھوٹے اور دانا آدمی سے بڑی احتیاط کے ساتھ پیش آ!!
ایک بیوقوف اور سچا آدمی تیرے رحم کا مستحق ہے
لیکن ایک بیوقوف اور جھوٹے آدمی کے سایہ سے بھی بچنا لازم ہے!!!

افلاس:- ایک گداگر قبرستان میں گیا اور کہنے لگا
"مرنے والو! میری زندگی لے لو اور کم از کم ایک لمحہ کے لئے میرے سینہ سے افلاس کا بوجھ ہٹا دو۔

میں اب گھبرا گیا ہوں اور مجھے سکون کی تلاش ہے
تم اگرچہ مردہ ہو لیکن مجھ سے اچھے ہو"
مرنے والوں نے کچھ جواب نہ دیا
وہ جانتے تھے کہ موت افلاس سے بہتر ہے!

جاپانی

ایک سوال:۔ تم تنہا خزاں کے پہاڑ کو کیسے عبور کر سکو گی؛
وہ تو اس وقت بھی بڑا دشوار گزار تھا
جب ہم دونوں اکٹھے وہاں گئے تھے۔

(می نیا شو)

میری محبت:۔ میری محبت اُس گھاس کی طرح ہے جو پہاڑ کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے
اگرچہ یہ روز بروز بڑھ رہی ہے لیکن کسی کو اِس کا علم نہیں

(کاکن شو)

گلِ لازوال:۔ دُنیا میں صرف انسان کا دل ہی ایک ایسا پھول ہے
جو کبھی نہیں مرجھائے گا

(کاکن شو)

وہ صبح:۔ میں جانتا ہوں کہ دن بہت جلد ختم ہو جائے گا
اور رات واپس آجائے گی
اس کے باوجود مجھے اُس صبح سے کتنی نفرت ہے جو
مجھے یہاں سے چلے جانے کا حکم دے گی

(ہیاکونن شو)

دو نظمیں:۔ اے تیزی سے گرنے والی شبنم!

کیا میں اس ذلیل زندگی کو تجھ سے دھو سکتا ہوں ؟

(باشو)

اے جھینگر !

تیری مسرور آواز سے

کسی کو شک بھی نہیں گزر سکتا کہ تو بہت جلد مرجائے گا

(باشو)

چینی

عورت :- ایک ہشیار آدمی شہر آباد کرتا ہے

اور ایک ہشیار عورت اسے تباہ کرتی ہے

اپنی تمام خوبیوں کے باوجود ہشیار عورت ایک منحوس پرندہ ہے !

زبان دراز عورت ایک ایسی سیڑھی ہے جو تباہی کی طرف لے جاتی ہے۔

کیونکہ مصیبت آسمان سے نہیں آتی

اس کا باعث تو عورتیں ہیں !

خواجہ سراؤں اور عورتوں کی تعلیم و تربیت قطعاً ناممکن ہے۔

(شی کنگ)

حمید نظامی

مگو ز ناوران عمر از تاریکی شب ہا کہ می آید

سحر چوں انجم ز خورشید و داغ سیما ہا کہ من دارم

اقبال

غزلیات

(۱)

آہ ۔ مجبور زندگی میری | جو تمہاری ۔ وہی خوشی میری
کٹ گئی کیسی آنکھوں آنکھوں میں | اِک تماشا تھی زندگی میری
جو کبھی بار بار آتی تھی | وہ ۔ رُلاتی ہے اب ہنسی میری
اپنے ہاتھوں سے جو کیا میں نے | وُہی تقدیر بن گئی میری
چشم مخمور اور شرم آلود | دیدنی ہے یہ بےخودی میری
اب جھجکنے لگے وہ غیروں سے | اب تو کچھ گئی ذرا دبی میری

شاعر اس کو خیال کہتے ہیں
خواب تھی خواب زندگی میری

آغا شاعر قزلباش دہلوی

(۲)

دے دے کے وہ بل روز نیا زُلفِ دوتا کو | کرتے ہیں اسیر اور اسیرانِ بلا کو
دیکھو نہ کہیں مجھ کو نگاہوں سے گرانا | دیتے تو ہو آنکھوں میں جگہ شرم و حیا کو
ٹھہرے دلِ مضطر تو کریں وصل کی تدبیر | سینے سے جُدا ہوں تو اُٹھیں ہاتھ دُعا کو
منظور مِٹانا ہی مجھے ہے تو مٹاؤ | پہلے مری ہستی سے مرے نقشِ وفا کو
نازک ہے بہت حالتِ بیمارِ محبت | اب دخل ہے اس وقت دوا کو نہ دُعا کو

صدق جائسی

(۳)

جذبۂ دل کا اثر شادان دکھائے گا تمہیں | مر گئے پر بھی وہ یاد اے دوست آئے گا تمہیں
پہلے جب تم رُوٹھتے تھے تو منا لیتا تھا وہ | اب جو رُوٹھو گے تو کون آکر منائے گا تمہیں
دین و دل، ایمان و جان و آبرو اس کی طرح | اے ستمگر! کون سب کچھ کھو کے پائے گا تمہیں

عبدالراشد چشتی شاداں بی۔اے (مرحوم)

(۴)

حُسن اور پھر شباب کیا کہنا — اب بھلا اے جناب کیا کہنا
قطع کر دی زبانِ شکوہ سرا — میرے حاضر جواب کیا کہنا
ساری دُنیا میں کر دیا بدنام — آرزوئے خطاب کیا کہنا

خاک میں مِل گئے تپشؔ آخر
عاشقِ بُو تراب کیا کہنا

عبد اللطیف تپشؔ

(۵)

کہنے کو گُلوں کی وادی سے سو حُسن کے دریا بہتے ہیں — لیکن ہیں یہ جلوے دو دن کے جو بزمِ چمن میں رہتے ہیں
مژگاں کے تصوّر سے کیا کیا دیتی ہے لہو رگ رگ دل کی — اللہ یہ کیسے نشتر ہیں جو خُون میں ڈُوبے رہتے ہیں
کیا پچھلے پہر کا عالم ہے اِک حُسن کا چشمہ پھُوٹا ہے — جو تارے اس میں رقصاں تھے وہ دھیمے دھیمے بہتے ہیں
گوہر کی چمک ہے شبنم میں عنبر کی مہک ہے پھُولوں میں — دیکھو تو یہ جلوے کِس کے ہیں ہر شئے میں جو پنہاں رہتے ہیں
جانے سے ترے کیا کیف مٹا کیا ہوش ہؤا میخواروں کو — بیخود جو ہمیشہ رہتے تھے بیہوش وہ اب بھی رہتے ہیں

جو رنگ تھا دِل کے زخموں کا، محمودؔ وہی رنگینی ہے
ناسُور جو پہلے بہتے تھے ویسے ہی اب بھی بہتے ہیں

محمود علی خاں

(۶)

عشق کا سوز کیا ہؤا، عشق کا ساز کیا ہؤا — تُو ہی بتا کہ اے جگر تیرا گداز کیا ہؤا
آہ نہ بن فغاں نہ بن آگ نہ بن، دھُواں نہ بن — سینے سے جو نکل گیا راز وہ راز کیا ہؤا
کعبۂ عشق چھوڑ کر پھرتا ہے تُو جو در بدر — تیری جبینِ شوق کا ذوقِ نماز کیا ہؤا

طبعِ بلندِ عرشؔ اب فرش نشیں ہے کِس لئے
پستیوں میں نہاں تھا جو اب وہ فراز کیا ہؤا

عرشؔ ملسیانی بی۔ اے

جہان کی حالت

زمیں ہے گر مائلِ شکایت تو محوِ فریاد آسماں ہے
یہی ہے بزمِ جہاں کی حالت کہیں ہے شکوہ کہیں فغاں ہے

بشر ہے صحرا کا اک بگولا، قیام ہو کس طرح سے اس کو
پھرے نہ کیوں دربدر وہ ہر دم کہ تابعِ گردشِ زماں ہے

اِدھر ہے صحنِ چمن اور اس میں ہوائے ہستی کے تند جھونکے
اُدھر ہے شاخِ کہن اور اس پہ غریب بلبل کا آشیاں ہے

قدم قدم پر ہے دامِ پنہاں، نگاہ رکھنا سنبھل کے رہنا
قفس ہے اے مرغِ دل یہ تیرا جسے سمجھتا تو گلستاں ہے

ہے شوقِ پرواز تجھ کو بیشک، مگر ہے محدود تیری وسعت
کہ ایک جانب ترے زمیں ہے تو دوسری سمت آسماں ہے

نگاہِ صیاد سے بچے گا کہاں تک آخر چمن میں رہ کر
کہ زد میں تیرِ قضا کی اے دل بنا ہوا تیرا آشیاں ہے

پڑھے گا ناشاد شوقِ دل سے ترے سوانح کو سارا عالم
یہ دردِ الفت کا ہے فسانہ یہ دردِ ہستی کی داستاں ہے

(رام پرشاد ناشاد)

درائے کارواں

برادرانِ نوجواں پکارو حریت کی جے!

مجاہدینِ حریت بڑھے چلو غرور سے
رُکے نہ اپنا کارواں چلا ہے تو چلا چلے

عبث ہے خوفِ ناکساں
غلط ہے فکرِ این و آں

جو دل میں ہے کرو عیاں

پکارو حریت کی جے برادرانِ نوجواں
رُکے نہ اپنا کارواں جھکے نہ ہند کا نشاں

دکھا دو اپنا حوصلہ
اچھالو نام قوم کا

کرو بلا کا سامنا

کلاہ کج کئے ہوئے نشان دوش پر دھرے
جہادِ حریت میں پیش پیش ہر جواں رہے

ہوا ہے تیز اگر۔ تو ہو
بھنور پہ ہے بھنور تو ہو

فغاں ہے بے اثر۔ تو ہو

امیدِ مادرِ وطن ہو، نازشِ چمن ہو تم
عصائے بیکساں ہو تم چراغِ انجمن ہو تم

غلام ہم رہیں تو کیوں؟
جفا و غم سہیں تو کیوں؟

نہ اب بھی کچھ کہیں تو کیوں

اُٹھو کہ بندگی کا رشتہ آج مل کے توڑ دیں اُٹھو کہ پست ہمتی کی گردنیں مروڑ دیں
مٹا کے اپنی مفلسی بسر کریں وہ زندگی
بڑھا دیں شانِ ہند کی

اُلٹ دو صفحۂ زمیں کو اپنے جوشِ عزم سے بدل دو صورتِ زمانہ کو خروشِ رزم سے
فدا، تمہارے عزم کے نثار، شانِ رزم کے
بنو چراغ بزم کے

عزیز ہے جو آبرو تو فکرِ حرّیت کرو ہر ایک نوجوان کو اسی کی تربیت کرو
عبث ہے خوفِ باغباں قفس کی توڑو تیلیاں
بساؤ اپنا آشیاں

وطن کے دشمنوں سے چھین لو عنانِ رہبری انہیں نہ سر چڑھاؤ تم کہ ہے اسی میں بہتری
وطن کی فکر ہے اگر نہ سمجھو ان کو راہبر
یہ راہبر ہیں پُر خطر

پکار و حُرّیت کی سب بجے۔ برادرانِ نوجواں
رُکے نہ اپنا کارواں جُھکے نہ ہند کا نشاں

ابراہیم ہوش کلکتہ

محفلِ ادب

بدحواسیاں

ایک دفعہ کا ذکر ہے، چند دوست بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ بدحواسیوں کا ذکر چلا تو ایک نے کہا کہ بعض اوقات آدمی کے مُنہ سے نادانستہ اُنمل بے جوڑ الفاظ نکل جاتے ہیں اور دماغ کی غیر حاضری کے باعث حرفوں، لفظوں اور آوازوں کی ترتیب بگڑ جاتی ہے مثلاً جنازے کی نماز کو نمازے کی جناز کہہ دیا یا "گھٹنے کی چوٹ" کو "چٹنے کی گھوٹ" کہہ گئے۔ ایک دوست جن کو اپنی ہوشمندی کا بہت بڑا دعویٰ تھا کہنے لگے کہ صحیح الدماغ آدمی سے ایسی بدحواسی سرزد نہیں ہوسکتی۔ کوئی پاگل ہی ہوگا جس کی زبان قابو میں نہ ہوگی۔ اُن کو بہتیر اسمجھایا گیا کہ یہ ایک نہایت عامۃ الورود بات ہے۔ اس کو دماغ کے خلل سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کو انگریزی میں Spoonerism کہتے ہیں کیونکہ ایک مشہور پروفیسر ڈاکٹر سپونر سے ایسی بدحواسیاں اکثر سرزد ہوا کرتی تھیں اور وہ نہایت قابل، فاضل اور عالی دماغ انسان تھے۔

لیکن ہوش مند دوست نہ مانے۔ انہیں اُسی وقت کہیں جانا تھا۔ اصرار کر رہے تھے کہ ایک تانگہ منگا دو۔ اتنے میں ہماری نشستگاہ کے آگے سے جو سرِ بازار واقع تھی۔ ایک خالی تانگہ گزرا۔ ہمارے ہوشمند دوست نے بے اختیار اُٹھ کر کھڑکی کا رُخ کیا۔ اور پکار کر کیا فرماتے ہیں "ارے بھئی کوچوان۔ ٹانگی خالہ ہے؟"

بس پھر کیا تھا۔ دوستوں نے قہقہوں پر دھر لیا اور ہمارے ہوشمند دوست بہت ہی کھسیانے ہوئے۔

ایک صاحب بھاگم بھاگ ریلوے سٹیشن کی طرف جارہے تھے۔ گاڑی کے آنے کا وقت بالکل قریب تھا۔ اور ان کے اضطراب کی کوئی انتہا نہ تھی۔ گھڑی ان کے پاس نہ تھی۔ رستے میں ایک خوش پوش جنٹلمین نظر آئے جن کی کلائی پر گھڑی بندھی تھی۔ ان صاحب نے آواز دے کر جنٹلمین کو ٹھیرالیا اور فرمایا "حضنت معاف فرمایئے، آپ کی بجی میں کیا گھڑا ہے؟"

اب آپ خود ہی تصور فرما لیجئے کہ یہ فقرہ سن کر اُس جنٹلمین پر کیا کیفیت طاری ہوئی ہوگی اور اس نے اِن صاحب کے متعلق کیا رائے قائم کی ہوگی۔

ایک دفعہ ہمارے مرحوم دوست مولانا حامد حسین بیدل شاہجہانپوری کے پاس ایک لکھنوی صاحب تشریف لائے اور مولانا سے نہایت نیازمندی کے ساتھ ملے۔ دورانِ گفتگو میں مولانا نے سوال کیا۔ آپ کا دولت خانہ لکھنؤ کے کس محلّے میں ہے؟ لکھنوی صاحب نے جواب دیا "غریب خانہ حکیم مقبری کے مہدے کے پاس ہے"۔ یعنی حکیم مہدی کے مقبرے کے پاس۔ مولانا ہنس دیئے اور فرمانے

لگے حکیم مغربی تو خیر۔ لیکن یہ "مہدا" تو اپنی مثال نہیں رکھتا۔

ایک دفعہ ایک حضرات کے موجد تشریف لائے۔ ان کے ساتھ ایک اور صاحب تھے جو بعض احباب کے ساتھ موجد صاحب کا تعارف کراتے پھرتے تھے۔ کہنے لگے "حضرت۔ یہ فلاں صاحب ہیں۔ انہوں نے ایک تیل ایجاد کیا ہے جو دو منٹ میں کال بالے کردیتا ہے"۔ مخاطب کچھ سمجھ نہ سکا۔ تو آپ نے اپنے فقرے کو زیادہ صحیح کرکے ارشاد فرمایا "اجی بس دو منٹ میں بالے کال ہوجاتے ہیں"۔

اس قسم کی قولی بدحواسیوں کی مثالیں بے شمار ہیں لیکن آج کی تقریر میں میرا ارادہ زیادہ تر عملی بدحواسیوں کے تذکرے کا ہے۔

آپ کے پاس تار کا چپراسی آتا ہے۔ آپ پنسل اٹھا کر رسید کے کاغذ پر دستخط کردیتے ہیں اور وہ کاغذ چپراسی کے حوالے کرکے تار کا لفافہ کھولتے ہیں۔ لیکن بارہا یہ بدحواسی دیکھنے میں آئی ہے کہ رسید پر دستخط کرکے رسید کا کاغذ تو اپنے پاس رکھ لیا اور تار کا لفافہ اور پنسل چپراسی کے حوالے کررہے ہیں۔

کیا سگرٹ جلاتے وقت کبھی آپ کو یہ اتفاق نہیں ہوا کہ آپ دیا سلائی جلا کر اپنے منہ کے قریب لارہے ہیں۔ حالانکہ سگرٹ ابھی وہاں تک نہیں پہنچا۔

انگلستان میں بدحواسی کا یہ واقعہ بے حد مشہور ہے کہ ایک میم صاحبہ کسی دوسرے شہر کو جارہی تھیں۔ شوہر ان کو ریلوے سٹیشن تک پہنچانے گیا۔ قلی نے میم صاحب کا سامان ریل گاڑی میں رکھ دیا۔ اب میم صاحب کا شوہر اور وہ قلی دونوں پلیٹ فارم پر کھڑے تھے اتنے میں انجن نے سیٹی دی۔ میم صاحب نے بدحواس ہوکر قلی کا تو بوسہ لے لیا اور دو پنس نکال کر اپنے شوہر کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

میں عینک لگاتا ہوں۔ بارہا ایسا ہوا کہ غسل خانے میں داخل ہوکر نہانے کا ارادہ کیا۔ تو عینک اتارنا بھول گیا اور یہ غلطی اُس وقت معلوم ہوئی۔ جب چہرے پر پانی کا چھینٹا مار کر آنکھوں کو ملنے کی کوشش کی۔

ایک دفعہ کا واقعہ سُن لیجئے اور یہ واقعہ عینک والوں کو اکثر پیش آتا ہے۔ دفتر جانے کے لئے کپڑے پہنے تو سامنے عینک کا کیس نظر آیا۔ اس کو کھول کر دیکھا۔ تو عینک اُس میں نہ تھی۔ اب تلاش شروع ہوئی۔ لکھنے کی میز۔ بستر۔ غسل خانہ غرض جہاں جہاں عینک کے رکھنے کا گمان ہوسکتا تھا۔ کونا کونا دیکھ ڈالا۔ پتہ پتہ چھان مارا لیکن عینک کہیں نہ ملی۔ آخر گھروالی کو بلا کر اپنی یہ مشکل اس کے سامنے پیش کی تو گھروالی ہیں کہ کھلکھلا کر ہنس رہی ہیں اور بات نہیں کرتیں۔ عینک نہ ملنے سے کھسیانے تو ہو ہی رہے تھے۔ غصے میں آکر دو چار سُنا دیں۔ یہ کیا بیہودگی ہے۔ میں تو ایک گھنٹے سے عینک کے لئے پریشان ہو رہا ہوں اور تم ہو کہ ہی ہی ہی کئے جاتی ہو۔ آخر بیوی نے کہا، اے ہے تم تو ہوا سے لڑتے ہو، عینک تو حضور کی آنکھوں پر چڑھی ہوئی ہے اور گھر بھر میں تلاش کررہے ہیں۔ ڈھنڈورا شہر میں لڑکا بغل میں"۔ ہاتھ لگا کر جو دیکھا تو سچ مچ آنکھوں پر موجود تھی!

ایک نوجوان نے اپنی بدحواسی کا نہایت دلچسپ قصہ سُنایا۔ وہ کہتا ہے کہ میں انٹرنس کے امتحان کا اُمیدوار تھا۔ جب امتحان

شروع ہوا تو ایک دن کا ذکر ہے۔ میں رات کے دو بجے تک پڑھتا رہا۔ صبح سات بجے امتحان میں بیٹھنا تھا۔ کوئی ساڑھے چھ بجے میری آنکھ کھلی۔ جب گھڑی دیکھی تو بدحواس ہوگیا۔ سامنے کھونٹی پر کپڑے لٹک رہے تھے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ جھٹ پٹ قمیص شلوار پہن ایک کوٹ اوپر سے ڈال امتحان کے ہال کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ اور عین اس وقت وہاں پہنچا جب تقریباً تمام طلبہ اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ چکے تھے۔ مجھ کو دیکھ کر بعض نوجوانوں نے آوازے کسے "شریمتی جی۔ لڑکیوں کا امتحان دوسرے کمرے میں ہو رہا ہے"۔ کسی نے کہا "جانی ذرا ہمارے پاس تو آکر بیٹھو"۔ غرض طرح طرح کی بولیاں کانوں میں پڑنے لگیں۔ میں نے خفیف سا ہو کر سر جھکا لیا۔ سر کا جھکنا تھا کہ میرے ہوش کے طوطے اڑ گئے۔ میں غلطی سے اپنی بہن کی سفید ریشمی قمیص اور شلوار پہن آیا تھا۔

پچھلے دنوں ایک دوست نے کسی جنٹلمین کا واقعہ سنایا۔ آپ دفتر جانے کے لئے تیار ہوئے۔ تو پگڑی کہیں نظر نہ آئی۔ بیوی کو بلا کر پوچھا "کیوں جی۔ ہمارا دستار کہاں ہے؟" بیوی جی نے ہنس کر جواب دیا۔ دستار؟ وہ تو آپ کے سر پر سج رہا ہے اور آپ کو معلوم ہی نہیں۔

آپ نے سر کو ہاتھ لگایا۔ تو سچ مچ پگڑی سر پر موجود تھی۔ اُس وقت آپ کیا فرماتے ہیں "واہ واہ۔ تم نے اچھا کیا۔ مجھے بتا دیا۔ نہیں تو شاید میں ننگے ہی سر دفتر چلا جاتا"۔

جلیل القدر اہلِ علم اور کالجوں کے پروفیسر چونکہ اپنے علمی مشغلوں میں بہت زیادہ منہمک ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کے دماغ دُنیا کے عام کاروبار سے بالکل بیگانہ اور غیر حاضر رہتے ہیں۔ ایک بہت بڑے پروفیسر کے متعلق ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا اس میں اصلیت بھی ہے یا نہیں۔ لیکن بدحواسی کا اس سے بہتر نمونہ شاید آج تک تصنیف بھی نہیں کیا گیا۔ پروفیسر صاحب کالج میں طلبہ کے ساتھ مغز زنی کرنے کے بعد چھڑی گھماتے ہوئے گھر کو چلے تو بیحد تھکے ہوئے تھے۔ آپ نے یہ پکا ارادہ کر رکھا تھا کہ گھر پہنچتے ہی چھڑی کونے میں رکھ کر کپڑے اُتارے بغیر ہی بستر پر لیٹ جاؤں گا۔ اور جب تک دماغ تر و تازہ نہ ہو جائے گا۔ بستر سے نہ اُٹھونگا۔ اسی خیال میں غرق آپ گھر پہنچے۔ وہاں پہنچتے ہی دماغی ترتیب بدل گئی۔ آپ نے چھڑی کو تو بستر پر لٹا دیا۔ خود کمرے کے کونے میں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے اور آنکھیں بند کرلیں۔

ایک پروفیسر صاحب کالج سے اپنی موٹر کار میں سوار ہوئے اور گھر کو چلے۔ اس وقت آپ سگار پی رہے تھے اور بارش بہت زور شور سے ہو رہی تھی۔ جب گھر پہنچے اور اپنے کمرے میں داخل ہوئے تو ایک ہاتھ میں ہیٹ تھی اور دوسرے میں سگار۔ آپ نے ہیٹ تو کھڑکی میں سے باہر پھینک دی اور جلتے ہوئے سگار کو کھونٹی پر رکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ جب سگار فرش پر گر پڑا تو آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ سگار کو وہیں چھوڑ کر باہر بھاگے۔ آپ کی ہیٹ سڑک پر کیچڑ و پانی میں لت پت پڑی تھی۔ اسے اٹھا کر بھیگتے بھاگتے کمرے میں آئے۔ تو سگار کی وجہ سے قالین سُلگ رہا تھا"۔

ایک اور پروفیسر صاحب کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ آپ اپنے دولتکدے کے کتب خانے میں تشریف رکھتے تھے۔ اتنے میں نوکر نے اطلاع دی کہ چھوٹی لڑکی بیہوش ہوگئی ہے۔ آپ گھبرا کر اُٹھے اور سیدھے ایک الماری کی طرف گئے تاکہ گلاب کے عرق کی بوتل ساتھ لیتے جائیں۔ جھٹ پٹ بوتل نکالی اور وہاں پہنچے۔ جہاں بچی بیہوش پڑی تھی۔ آپ نے کاگ نکال کر بوتل کی بوتل بچی کے سر اور مُنہ پر انڈیل دی۔ اب دیکھتے کیا ہیں کہ بچی کا سر، مُنہ اور بستر اور تکیہ "بلیک سیاہی" سے شرابور ہو رہے ہیں۔ پروفیسر صاحب بدحواسی میں گلاب کی جگہ سیاہی کی بوتل اُٹھا لائے تھے۔

ایک ڈاکٹر صاحب کا ملازم ہر روز دوپہر کے وقت گھر جا کر ڈاکٹر صاحب کے لئے ناشتہ دان میں کھانا لایا کرتا تھا اور ایک چھوٹے سے کمرے میں میز پر رکھ دیا کرتا تھا۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد ڈاکٹر صاحب اس کمرے میں داخل ہوتے اور کھانا تناول فرما لیتے۔

ایک دن کا ذکر ہے۔ نوکر کھانا لا رہا تھا کہ موسلادھار بارش شروع ہوگئی۔ ایک تو غریب آدمی اپنے بعض تفکرات میں غرق تھا۔ اُوپر سے پڑا مینہ، کچھ بدحواس سا ہوگیا۔ جب ڈاکٹر صاحب کے دفتر کے پاس پہنچا۔ تو کیا دیکھتا ہے کہ بارش کا پانی سڑک پر جمع ہو رہا ہے۔ اس نے اپنے جوتے اُتار کر ایک ہاتھ میں لے لئے اور دوسرے ہاتھ میں ناشتہ دان اُٹھائے پانی میں سے شپ شپ کرتا ہوا دفتر میں داخل ہوگیا۔ حواس بالکل پراگندہ ہو رہے تھے۔ اس نے ناشتہ دان تو دروازے کے پاس ہی پاانداز پر رکھ دیا۔ اور اپنے جوتے کھانے کے کمرے کی میز پر لگا دیئے۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر صاحب اس کمرے میں داخل ہوئے۔ تو میز پر یہ عجیب وغریب "کھانے کی چیز" دیکھ کر آگ بگولا ہوگئے۔ بیچارے نوکر نے پاؤں پڑ کر معافی مانگی۔

انگلستان کے ایک نوجوان پروفیسر کا حال بیان کرتے ہیں کہ وہ نہایت خود فراموش اور غیر حاضر طبیعت کا آدمی تھا اور طالب علم اس سے اکثر دل لگی کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ پروفیسر صاحب فلسفۂ ازدواج پر ایک لیکچر تیار کر رہے تھے۔ بے شمار کتابیں میز پر کھلی پڑی تھیں کہ اتنے میں نوکر نے ایک لفافہ لاکر دیا۔ پروفیسر صاحب نے اس کو کھول کر پڑھا تو اُس میں لکھا تھا:۔

"جناب پروفیسر صاحب تسلیم۔ آپ کی نیکی اور آپ کی علمیت میں تو کوئی شبہ نہیں لیکن آپ کی میم صاحبہ آپ کے علمی انہماک کی وجہ سے بہت آوارہ ہو رہی ہیں۔ چنانچہ فلاں بیرسٹر کے ساتھ اُن کا تعلق ہو چکا ہے محض خیرخواہی کی وجہ سے آپ کو یہ اطلاع دے رہا ہوں۔ اگر آپ کو یقین نہ ہو تو آپ شام کے چھ سات بجے ہائیڈ پارک کے شمال مغربی گوشے میں پہنچ جائیں، وہاں بیرسٹر صاحب سے اپنی میم صاحبہ کی خوش فعلیاں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔"

اِس خط کے نیچے کسی کا نام نہ تھا۔ بلکہ صرف یہ لکھا تھا۔ "آپ کا حقیقی خیرخواہ"

اس خط کو پڑھ کر پروفیسر صاحب کی رگوں میں خون کھولنے لگا۔ غصّہ وغیرت کے جوش سے ان کا سر دھم دھم کرنے لگا۔ کیسا لیکچر اور کیسی تیاری۔ یہاں آبرو پر بن گئی تھی۔ شام ہونے میں ایک آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ یہ وقت پروفیسر صاحب نے انتہائی اضطراب میں بسر

کیا اور وقت مقررہ پر آپ ہائیڈ پارک کو روانہ ہو گئے۔ "خیر خواہ" نے جو مقام بتا رکھا تھا۔ اس پر جا کر کھڑے ہو گئے اور لگے انتظار کرنے کہ وہ قطامہ اپنے آشنا کے ساتھ کب یہاں آتی ہے۔ یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ باغ سیلانیوں اور تماشائیوں سے خالی ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ رات کے بارہ بج گئے۔

پروفیسر کے پیٹ میں بھوک سے آگ لگ رہی تھی اور عین اُس وقت جب وہ کسی ہوٹل کی تلاش میں اِدھر اُدھر اپنی نظریں دَوڑا رہے تھے، دفعتہً آپ کو یاد آیا کہ میں تو ابھی کنوارا ہوں۔ میری تو شادی بھی نہیں ہوئی۔ پھر یہ بیوی کیسی اور اس کی آوارگی کیا معنی؟

پروفیسر صاحب اپنی بدحواسی پر لاحول پڑھتے ہوئے گھر کو روانہ ہوئے۔

سالک (ریڈیو ۲۹ جولائی)

شیرازہ

سڑے حیدری خاں

(ذیل کا ٹکڑا مولینا عبدالحلیم شرر کی مشہور تصنیف "گذشتہ لکھنؤ" سے لیا گیا ہے۔) شیرازہ

غازی الدین حیدر کے زمانے میں اس فن کا ایک بڑا کامل و اکمل شخص لکھنؤ میں موجود تھا جس کا نام حیدری خاں تھا۔ یہ صاحب اپنی وارفتہ مزاجی کی وجہ سے "سڑے حیدری خاں" مشہور تھے اور گولہ گنج میں رہتے تھے۔ غازی الدین حیدر کو ان کا گانا سننے کا بڑا شوق تھا مگر کبھی اس کا موقع نہیں ملا تھا۔ ایک روز سہ پہر کو غازی الدین حیدر ہوادار پر سوار دریا کنارے تفریح کو نکلے۔ رومی دروازے کے نیچے لوگوں نے دیکھا کہ "سڑے حیدری خاں" چلے جاتے ہیں۔ بادشاہ سے عرض کی قبلۂ عالم حیدری خاں یہی ہیں۔ بادشاہ کو تو اشتیاق تھا ہی۔ حکم دیا کہ "بلاؤ"۔ لوگ پکڑ لائے اور سامنے کھڑا کر دیا۔ بادشاہ نے کہا "ارے میاں حیدری خاں کبھی ہمیں اپنا گانا نہیں سناتے؟" بولے "جی ہاں کیوں نہ سناؤں گا مگر مجھے آپ کا مکان نہیں معلوم ہے۔" بادشاہ بے اختیار ہنس پڑے اور کہا "اچھا ہمارے ساتھ چلو۔ ہم خود تمہیں اپنے مکان پر لے چلیں گے۔" "بہت خوب" کہہ کر ساتھ ہو لئے۔ چھتر منزل کے قریب پہنچے تھے کہ حیدری خاں ہتھے پر سے اُکھڑ گئے اور بولے "میں چلتا تو ہوں مگر پوریاں اور بالائی کھلوایئے گا تو گاؤں گا۔" بادشاہ نے وعدہ کیا اور محل میں بیٹھ کے گانا سننے لگے۔ تھوڑی ہی دیر سن کے بہت محظوظ ہوئے۔ وجد کا عالم طاری ہوا اور بے خود و بے تاب ہو گئے۔ یہ حالت دیکھ کر حیدری خاں خاموش ہو گئے۔ بادشاہ نے پھر گانے کو کہا تو بولے "حضور یہ تنباکو جو آپ کے پیچوان میں بھرا ہوا ہے، بہت ہی اچھا معلوم ہوتا ہے، آپ کس کی دُکان سے منگواتے ہیں۔" غازی الدین حیدر خود بھی آشفتہ مزاج تھے اور سڑی مشہور تھے۔ اس سوال پر منغض ہوئے تو مصاحبوں نے عرض کیا "قبلۂ عالم! یہ سڑی تو ہئی ہے، ابھی تک یہی نہیں سمجھا ہے کہ کس سے باتیں کر رہا ہوں۔"

اب لوگ بادشاہ کے ایما سے حیدری خاں کو دوسرے کمرے میں لے گئے۔ پوریاں، بالائی کھلوائی۔ حقہ پلوایا۔ آپ نے پاؤ بھر پوریاں، آدھ پاؤ بالائی اور ایک پیسہ کی شکر منگوا کے اپنی بی بی کو بھجوائی (جو اُن کا ہر جگہ معمول تھا) جب تک ان کاموں میں رہے۔ بادشاہ بلادہ نا

کے جام پئے۔ اور جب نشے کا زور ہُوا تو پھر حیدری خاں کی یاد ہوئی۔ فوراً بُلوا کے گانے کا حکم دیا۔ مگر جیسے ہی اُنہوں نے اپنا نغمہ شروع کیا۔ روک کے کہا "حیدری خاں سنتے ہو؟ اگر مجھے خالی خوش کیا اور رُلایا نہیں تو یاد رکھو کہ گومتی میں ڈبوا دوں گا۔" اب تو حیدری خاں کی عقل چکّر میں آئی، سمجھے کہ یہ بادشاہ ہیں۔ کہا "حضور اللہ مالک ہے۔" اور جی توڑ کے گانے لگے۔ خدا کی قدرت یا یہ کہئے کہ حیدری خاں کی زندگی تھی کہ تھوڑی ہی دیر میں بادشاہ پر اثر ہُوا۔ بے اختیار رونے لگے اور خوش ہو کے کہا "حیدری خاں مانگ کیا مانگتا ہے؟" عرض کیا جو "مانگوں گا دیجئے گا؟" بادشاہ نے وعدہ کیا اور حیدری خاں نے تین دفعہ قبولوا کے کہا "حضور یہ مانگتا ہوں کہ مجھے پھر کبھی بُلوا ئیے گا نہیں اور نہ گانا سنیئے گا۔" بادشاہ نے تعجب سے پوچھا "کیوں؟" عرض کیا "آپ کا کیا ہے مجھے مروا ڈالیئے گا۔ پھر مجھ سا حیدری خاں نہ پیدا ہو گا۔ اور آپ مر جائیں گے تو فوراً دوسرا بادشاہ ہو جائے گا۔" اِس جواب پر غازی الدین حیدر نے ناراض ہو کر منہ پھیر لیا۔ یہ موقع پاتے ہی حیدری خاں اپنی جان لے کے بھاگے اور اپنے گھر آئے۔

(نثرِ اعظم)

مرزا غالب کا آخری خط

دیگر از خویشتم خبر نبود تکلف برطرف
این قدر دانم کہ غالب نام یارے داشتم

ہجومِ غم سے فراغ نہیں۔ عبارت آرائی کا دماغ نہیں، اگرچہ گوشہ نشین و خانماں خراب ہوں لیکن بحسبِ رابطۂ ازلی کثیر الاحباب ہوں۔ اطراف و جوانب سے خطوط آتے ہیں۔ ادھر سے بھی ان کے جواب لکھے جاتے ہیں جو اشعار واسطے اصلاح کے آتے ہیں، بعدِ اصلاح بھیج دیئے جاتے ہیں۔

ان صاحبوں میں سے اکثر ایسے ہیں کہ نہ میں نے انہیں نہ اُنہوں نے مجھے دیکھا ہے۔ محبت دلی و نسبت روحانی سہی لیکن صاحبانِ بلاد دور دست کیا جانیں میرا حال کیا ہے۔ ہفتاد و یک سالہ عمر کی کتاب میں سے فصلِ آخر کی حقیقت یہ ہے کہ دس پندرہ برس سے ضعفِ سامعہ اور قلتِ اشتہا میں مبتلا ہُوا اور یہ دونوں علتیں روز افزوں رہیں۔ حسِ حافظہ کا بُطلان علاوہ۔ جوں جوں عمر بڑھتی گئی یہ امراض بھی بڑھتے گئے۔ قصّہ مختصر اب سامعہ کا حال یہ ہے کہ ایک تختہ کاغذ کا مع دوات قلم سامنے دھرا رہتا ہے، جو دوست آتے ہیں، پُرسشِ مزاج کے سوا اور کچھ کہنا ہوتا ہے وہ لکھ دیتے ہیں۔ میں ان کی تحریر کا جواب زبانی دیتا ہوں۔ غذا کی حقیقت یہ ہے کہ صبح کو آٹھ دس بادام کا شیرہ، دوپہر کو سیر بھر گوشت کا پانی، دو گھڑی دن رہے دو یا تین تلے ہوئے کباب۔ نسیان حد سے گزر گیا۔ رعشہ، دوران و ضعفِ بصر یہ یارانِ نو آمدہ سے ہیں۔ میر تقی مرحوم کا مطلع وردِ زبان ہے۔

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم
القصہ نہ در پے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

خط بکس ہیں یا کتاب میں رکھ دیتا ہوں اور بھول جاتا ہوں۔ آگے لیٹے لیٹے خط لکھتا تھا اب رعشہ یوں بھی نہیں لکھنے دیتا۔
صاحب اکمل الاخبار اور صاحب اشرف الاخبار نے جو ہمیشہ مجھ سے ملتے جلتے رہتے ہیں اور میرا حال جانتے ہیں از روئے مشاہدہ میرے کلام کی تصدیق کرکے اسی اعتذار کو اپنے اخبار میں چھاپا ہے۔ کل دیگر صاحبان مطبع اور راقمان اخبار اگر اسی عبارت کو اپنے اخبار کے اوراق میں درج کریں گے تو فقیر ان کا احسان مند ہوگا۔ اس نگارش کی شہرت سے مقصود یہ ہے کہ میرے احباب میرے حال سے اطلاع پائیں۔ اگر خط کا جواب یا اصلاحی غزل دیر میں پہنچے تو تقاضا اور اگر نہ پہنچے تو شکایت نہ فرمائیں۔ میں دوستوں کی خدمت گزاری میں کبھی قاصر نہیں رہا اور خوشی خوشنودی سے کام کرتا رہا، جب بالکل نکما ہوگیا نہ حواس باقی نہ طاقت، پھر اب کیا کروں بقول خواجہ وزیر ع

میں وفا کرتا ہوں لیکن دل وفا کرتا نہیں

اگر کسی کو میری طرف سے رنج و ملال ہو تو خالصاً للہ معاف فرمائیں۔ اگر جوان ہوتا تو احباب سے دعائے صحت کا طلبگار رہتا اب جو بوڑھا ہوں تو دعائے مغفرت کا خواہاں ہوں۔ غالب

"دین و دنیا"

فیضِ اقبال

۱۹۲۵ء میں ایک روز شام کے وقت میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر تھا کہ علی بخش نے اطلاع دی کہ چند طالب علم ملنے کو آئے ہیں، جاڑے کا موسم تھا: ڈاکٹر صاحب بڑے کمرے میں بیٹھے تھے (بالعموم وہ شام کے وقت بستر پر بیٹھتے تھے اور ملاقاتی وہیں کرسیوں پر بیٹھ جاتے تھے) لڑکے اندر آئے، یہ اسلامیہ کالج کے طلبہ تھے، میں چونکہ اسلامیہ کالج میں ملازم تھا، اس لئے ان کی گفتگو سننا چاہتا تھا۔ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں وہ شام کے وقت وفد کی صورت میں کیوں حاضر ہوئے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے دریافت فرمایا "کیوں بھئی کیسے آئے"؟ انھوں نے جواب دیا کہ ایک مشاعرہ کرنے کا ارادہ ہے جناب والا اگر اس کی صدارت قبول فرمائیں تو عزت افزائی ہوگی اور لوگ بھی بہت جمع ہوں گے، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ "صدر" تو میں کسی مجلس یا جلسہ کا بننا نہیں چاہتا، البتہ "شعر بازی" سے تمہیں روکتا ہوں، اس وقت ہندوستان کو اور بالخصوص مسلمانوں کو شعر بازی کی ضرورت نہیں، اور نہ ہر شخص شعر کہنے کے قابل ہوتا ہے، لوگ شعر بازی کی طرف اسی لئے جلد متوجہ ہو جاتے ہیں کہ بغیر کاوش، مطالعہ اور محنت کے انہیں شہرت حاصل کرنے کی خواہش دامنگیر ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس وقت بہت کم ایسے شاعر ہیں جن کے کلام میں بقا کا عنصر موجود ہو، آپ نوجوان ہیں، آپ کو اس غلط روش پر ہرگز نہ چلنا چاہئے، ضرورت ہے نثر نگاروں کی جو

محنت اور مطالعہ کے بعد اُردو زبان میں مختلف موضوعوں پر کتابیں، رسالے، تراجم وغیرہ لکھیں اور اپنی قوم کو اور خود اپنے آپ کو بہتر بنائیں، ڈاکٹر صاحب کی تقریر کا کم وبیش یہی ماحصل تھا، چنانچہ ان کی تقریر نے ان نوجوان شعراء کے جوش کو ٹھنڈا کیا اور وہ یہ لیکچر سن کر بورڈنگ ہاؤس سدھارے۔

۱۹۲۵ء میں ایک نامور بزرگ لاہور میں تشریف لائے، ان کی لیاقت، وسعتِ علم اور بالخصوص فصاحت وبلاغت کے متعلق عوام میں بہت مبالغہ آمیز باتیں مشہور تھیں۔ فنِ تقریر میں بہت کم لوگ ان کی ہمسری کر سکتے تھے اور انگریزی زبان، محاورہ، تلفظ اور ادب میں تو انہیں بلا کی دسترس حاصل تھی، میں نے ایک روز ڈاکٹر صاحب سے ان کی بہت تعریف کی، وہ بزرگ ابھی نئے نئے وارد ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ انگریزی فنِ تقریر میں ان کا پایہ مسلّم ہے، لیکن یاد رکھو کہ (انبیاء اور مصلحینِ اقوام کو چھوڑ کر) جو لوگ بے ضرورت اُٹھتے بیٹھتے تقریریں کرتے رہتے ہیں ان میں روحانیت کا فقدان ہوتا ہے

In people other than prophets and great national reformers, too much of public speaking is very often a sign of spiritual poverty.

"باقی حضرات کے متعلق تو یہ نظریہ بالکل صحیح ہے، لیکن افسوس تو یہ ہے کہ بعض بڑے بڑے مقرروں کے متعلق بھی یہ نظریہ غلط نہیں" ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ کہ انگلستان میں طالب علمی کے زمانہ میں، مَیں بھی تقریروں کے مشغلہ میں کچھ عرصہ کے لئے بہت منہمک رہا لیکن بعد میں مَیں نے اسے بالکل ترک کر دیا۔

"معارف"

مائلو کا مجسمۂ وینس

آج سے دو ہزار سال پہلے کے یونانی صنّاعوں نے بُت تراشی کی صنعت کو اس درجۂ کمال تک پہنچا دیا تھا کہ اس فن میں آج تک کوئی اُن کا ہمسر پیدا نہیں ہو سکا۔ اس پرچہ میں وینس[1] کے بُت کی جو تصویر شائع ہو رہی ہے اس کا صنّاع ایک قدیم یونانی بت تراش مائلو تھا۔ اگرچہ مائلو کے حالاتِ زندگی سے دنیا ناواقف ہے لیکن اس کا یہ مجسمہ بُت سازی میں قوّتِ اظہار کا بہترین نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ نامعلوم صنعت گر نے اس میں تناسبِ اعضاء اور سکونِ قلب کا اظہار جس دلاویزی سے کیا ہے وہ انتہائے کمال کو پہنچ گئی ہے۔

حامد علی خاں

صنعت گر نقاش چیں رو صورتِ یارم ببیں ❊ یا صورتے کش این چنیں یا ترک کن صورت گری

نامعلوم

اے چہرۂ زیبائے تو رشکِ بتانِ آزری ❊ ہر چند وصفت میکنم در حسن از اں بالا تری

آفاق را گردیدہ ام، مہرِ بتاں ورزیدہ ام ❊ بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

خسرو

[1] زہرہ۔ محبت کی یونانی دیوی۔

مطبوعات

ریاض رضواں - یہ حضرتِ ریاض خیر آبادی مرحوم کا دیوان ہے جو قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے کی توجہ اور اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ دیباچہ نگاروں میں یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد بھی شامل ہیں۔ ریاض غزل نگار اساتذۂ قدیم کے سلسلے کی ایک آخری چمکتی ہوئی کڑی ہیں۔ ان کے بعد اب اس پُرانے رنگ کی شاعری ڈھونڈے سے بھی نہیں مِل سکتی۔ شراب کے متعلق حضرتِ ریاض کے شعر خاص طور پر پُرلطف ہیں ملاحظہ فرمائیے:-

وہ جانا مرا رُوٹھ کر میکدے سے — صُراحی کا مجھکو وہ آواز دینا

توبہ سے ڈرایا مجھے ساقی نے یہ کہہ کر — توبہ شکنی کے لئے اصرار نہ ہوگا

یہ اپنی وضع اور یہ دشنامِ مے فروش — سُن کر جو پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا

تغزل کا رنگ ملاحظہ ہو:-

کبھی حرفِ محبت تا بہ لب آیا تھا چُپکے سے — اُسی نے رفتہ رفتہ طُول کھینچا داستانوں میں

چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی — تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی

کوئی مُنہ چُوم لے گا اِس نہیں پر — شکن رہ جائے گی یُونہی جبیں پر

اس طرح کہ گھنگرو کوئی چھاگل کا نہ بولے — جب چھم سے چلیں گود میں چُپکے سے اُٹھالے

ایک دُوسرا رنگ ملاحظہ ہو:-

یہ محشر ہے یہاں اب ہوش میں دیوانہ آتا ہے — خداوندا مرے لب پر مرا افسانہ آتا ہے

بنائے کعبہ پڑتی ہے جہاں ہم خشتِ خم رکھدیں — جہاں ساغر پٹک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے

ریاض نے بہت پاکبازانہ زندگی گزاری لیکن اس کا ایک ایک شعر صہبائے شاعری کا ایک ایسا مست و طربناک جام ہے جسے پی کر رندانِ سیاہ مست بھی اگر افشردۂ انگور کو بھول جائیں تو تعجب نہیں۔ کتاب کا غذ، کتابت، طباعت اور جلد کے لحاظ سے نہایت نفیس ہے۔ حجم تقریباً ۸۷۲ صفحات، قیمت ۲ روپے، پتہ:- دائرۃ الادب حیدر آباد (دکن) یا دفتر شاہکار گورکھپور۔

مکاتیبِ مہدی - مرتبہ محترمہ مہدی بیگم صاحبہ۔ یہ کتاب "افاداتِ مہدی" کے مشہور مصنف جناب مہدی حسن صاحب افادی الاقتصادی کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ خطوط چونکہ آدمی کی زندگی کا ایک نہایت بے تصنع اور بے تکلفانہ مرقع ہوتے ہیں، اس لئے مشاہیر کے خطوط سے عموماً

بہت دلچسپی لی جاتی ہے، اور ادب کی اس صنف کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ مقامِ مسرت ہے کہ اُردو کتب کے ناشرین بھی اس باب میں اب بیش از پیش سرگرمی دکھا رہے ہیں اور آئے دن اُردو زبان کے اُدبا کے مکاتیب کے مجموعے شائع ہونے لگے ہیں۔

مولوی مہدی حسن کوئی بہت بڑے عالم نہ تھے لیکن ادبِ اُردو اور مصنفینِ زبانِ اُردو سے انہیں بہت دلچسپی تھی اور اُردو زبان کی وقتی تحریکات کے سلسلے میں وہ خاصے وسیع المعلومات آدمی تھے۔ اُن کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اُن کی کامیاب انشا پردازی اور شگفتہ اندازِ تحریر ہے۔ مکاتیبِ مہدی میں بھی قدرتی بے تکلفی کے ساتھ اندازِ بیان کی وہی شگفتگی ملتی ہے جو "افاداتِ مہدی" میں نظر آتی ہے۔ اس مجموعے کے خطوط مشاہیرِ اُردو کے نام ہیں لیکن مہدی بیگم صاحبہ نے وعدہ کیا ہے کہ اگر اہلِ ملک نے ان مکاتیب کی قدر کی تو وہ مہدی حسن مرحوم کے خانگی خطوط کو بھی ایک مجموعے کی صورت میں شائع کر دیں گی۔ مہدی حسن ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"سچ کی تحریروں میں چونکہ اہتمام کو دخل نہیں ہوتا یعنی اظہارِ خیال میں صنعت گری طبع کی جگہ صرف آمدِ جذبات ہوتی ہے، اس لئے لٹریچر کا یہ ایک ایسا اضطراری حصّہ ہے جو لکھنے والے کے مرتبۂ انشا پردازی کی صحیح غمازی کرتا ہے۔ اچھے اچھے بولنے والوں، چوٹی کے شاعروں کو دیکھا کہ دو سطریں سیدھی سادھی نہیں لکھ سکتے۔"

یہ خیال عام لوگوں یا قدیم اُدبا کے خطوط کے متعلق درست ہو تو ہو لیکن آجکل کے مشہور اُدبا کے غیر خانگی خطوط کے متعلق اب یہ خیال زیادہ درست نہیں رہا کیونکہ اکثر اُدبا خط لکھتے وقت یہ احتیاط ملحوظ رکھتے ہیں کہ ان کے چھپنے کی نوبت بھی ضرور آئے گی اور بعض حضرات خط لکھتے ہی چھاپنے کی نیت سے ہیں چنانچہ اُن کے ہر خط کا مسودہ ان کے پاس محفوظ رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مصنفوں کی اس ہوشیاری یا پُرکاری سے خطوط کی اشاعت کا اصل مقصد بڑی حد تک فوت ہو چکا ہے۔

مہدی حسن صاحب کے خطوط میں خاصی بے تکلفی بلکہ شوخی موجود ہے، اس شوخی کے ڈانڈے کہیں کہیں عُریانی سے جا ملتے ہیں جو شاید کچھ ناگوار سی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن مہدی صاحب کے خطوط بالعموم نہ صرف خاصے دلچسپ ہیں بلکہ اس لحاظ سے بھی قابلِ قدر ہیں کہ اُن سے آج سے پچیس تیس سال قبل کی ادبی زندگی کے حالات و کوائف کے متعلق قابلِ قدر معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ یہ خط اس قابل ہیں کہ اُردو کے ہر کتب خانے میں موجود رہیں۔ حجم بڑی تقطیع کے ۳۰۲ صفحات، کاغذ اور طباعت نفیس ہے۔ قیمت عہ؍ پتہ:- محترمہ مہدی بیگم صاحبہ بسنت پور ضلع گورکھپور +

ذکرِ غالب:- گزشتہ تین سال سے غالب کے متعلق گراں قدر تالیفات کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے اُس میں تازہ ترین اضافہ مسٹر مالک رام ایم۔ اے کی موسومۂ بالا کتاب ہے۔ یہ مرزا غالب کی مختصر مگر جامع سوانحعمری ہے جو انگریزی اصطلاح میں "خارجی" نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے اور حق یہ ہے کہ اس طرز کے فنِ سوانح نگاری میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس سے پہلے جناب غلام رسول مہر بھی اسی "خارجی" انداز میں سوانحِ غالب کے متعلق اپنی بیش بہا کتاب شائع کر چکے ہیں، اُن کے بعد اسی موضوع پر ایک ایسی سیر حاصل اور پُر مغز

معلومات کتاب مرتب کرنا یقیناً مستحقِ تحسین و آفرین ہے۔ جناب مہر کی کتاب کو بوجہ اولیت وہ تمام مباحث جو صحیح طور پر حاشیۂ کتاب کا
حصہ تھے متن میں لینے پڑے تھے۔ اس سے اُن کی کتاب کی ضخامت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ مسٹر مالک رام نے سوانح غالب کو ایک
مناسب حجم کی کتاب میں منتقل کر دیا ہے جس کی زبان دلکش اور سلیس ہے۔ کتاب کے حجم کو دیکھ کر شاید کسی کو شبہ ہو کہ سوانح میں انتخاب
کیا گیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ مسٹر مالک رام کی کتاب "بہ قامت کہتر و بہ قیمت بہتر" کی مصداق ہے۔ اُنہوں نے نہ صرف تمام پہلا فراہم شدہ
مواد اپنی کتاب میں درج کیا ہے بلکہ بعض نئے اور مفید انکشافات کا بھی اضافہ کیا ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ اس اختصار میں مطالب کی فراوانی
کے باوجود تحقیق کے انداز کو قائم رکھا ہے۔ حسنِ ترتیب اور نکھرے ہوئے اندازِ بیان کے لحاظ سے اس کتاب کو غالب کی سوانح عمریوں
میں ایک مستقل حیثیت حاصل رہے گی۔ ملنے کا پتہ:- مکتبہ جامعہ، دہلی۔ قیمت ۸ر

تجلیاتِ تخیل۔ از جگیشور ناتھ صاحب ورما بیتاب۔ یہ مصوری کے متعلق بارہ نکتہ آموز مضامین کا مجموعہ ہے۔ ذیل کے عنوانوں سے
اس کے موضوع کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے:- ہند قدیم کی مصوری، بُدھ مصوری، مُغل مصوری، راجپوت مصوری وغیرہ۔ کتاب پڑھنے کے
قابل ہے۔ حجم ۱۸۲ صفحات، قیمت مجلد عہ۔ پتہ:- رائے صاحب دیال اگروال پبلشر، الہ آباد (یو۔پی)

سبدِ گل۔ یہ "بزمِ ادب" نیروبی (مشرقی افریقہ) کے جلسوں اور مشاعروں کے مضامینِ نظم و نثر کا ایک دلکش اور دلچسپ مجموعہ
ہے۔ مشرقی افریقہ جیسے دُور دراز مقام میں بزمِ ادب اُردو کا قیام اور طباعت و کتابت کی ہزار ہا دشواریوں کے باوجود اس کی روئدادوں
کا ایک دلکش مجموعہ کی صُورت میں چھپ جانا اُردو زبان کی حیرت انگیز مقبولیت کا ایک روشن ثبوت ہے۔ بزمِ ادب میں غالب و اقبال
وغیرہ مشہور شعراء پر تنقیدی مضامین بھی پڑھے جاتے ہیں اور مشاعروں میں تمام ہندوستانی بلا امتیاز مذہب و ملت حصّہ لیتے ہیں۔
غیر متعصب ہندو مسلمانوں کو اُردو سے جو محبت ہے اس کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اپنی تفریح اور ذہنی ترقی کے لئے وطن سے دُور
اُنہوں نے جو انجمن بنائی ہے اس میں خیالات و افکار کا ذریعۂ اظہار یہی اُردو زبان ہے۔ شعراء میں محمد حیات احقر اور بدر الدین بیدل
جیسے ناموں کے ساتھ رام کشن شرما، دیو راج دیوا، لکشمی نراین گردش اور دلیپ سنگھ غریب جیسے نام بھی نظر آتے ہیں۔ بزمِ ادب نیروبی
کے کارپرداز ہر قسم کی حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔ قیمت مجلد ایک شلنگ پچاس سینٹ۔ پتہ:- محمد شریف قریشی ناظمِ عمومی بزمِ ادب
پوسٹ بکس ۱۰۱۲ نیروبی۔ مشرقی افریقہ۔

شعراء کا گراموفون ریکارڈ۔ گراموفون کمپنی لمیٹڈ نے ہمیں اپنا ایک ریکارڈ ۱۶۰۴۴ ریویو کے لئے بھیجا ہے جس میں حضرت جوش،
حضرت تاجور، حضرت سیماب اور حضرت بیخود دہلوی نے اپنی ایک ایک غزل خود سنائی ہے۔ یہ ایک دلچسپ جدت ہے۔ ریکارڈ سنتے
ہوئے یوں معلوم ہوتا ہے، گویا ہم مشاعرے میں بیٹھے ہیں۔ اس ریکارڈ کی ایک تاریخی حیثیت رہے گی۔ ہر مشہور دکان سے مل سکتا ہے۔

فہرستِ مضامین

نمبر (۵)

ہمایوں بابت ماہ نومبر ۱۹۳۸ء

تصویر:- پرنس بسمارک

شمار	مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ
۱	بزمِ ہمایوں	بشیر احمد	۷۹۰
۲	جہاں نما	حامد علی خاں	۷۹۲
۳	بسمارک	〃	۷۹۵
۴	شعر، اس کی تخلیق اور چینی شاعری	جناب پروفیسر سید فیاض محمود صاحب ایم۔ اے	۷۹۷
۵	مقبرۂ شیخ چلی پر (نظم)	مسٹر محمد ہادی حسین ایم اے آئی سی ایس سابق ایڈیٹر "ہزار داستان"	۸۱۳
۶	اوراقِ پارینہ	حضرتِ حفیظ ہوشیارپوری ایم۔ اے	۸۱۵
۷	پرسکیلا (افسانہ)	جناب مرزا باور علی صاحب	۸۱۶
۸	محبت کا پہلا مظاہرہ (نظم)	جناب سید علی منظور صاحب حیدرآبادی	۸۲۳
۹	جاپان کے متعلق برطانی حکمتِ عملی	جناب عبدالحفیظ صاحب	۸۲۴
۱۰	کیلاش کنول (تراجمِ پیامِ مشرق)	جناب سید مقبول حسین صاحب مقبول احمدپوری، بی۔ اے۔ ایل، ایل، بی	۸۳۰
۱۱	موتی (افسانہ)	جناب ویندرناتھ صاحب اشک بی۔ اے۔ ایل ایل بی	۸۳۳
۱۲	غزلیات	محترمہ زیب عثمانیہ، وحضراتِ برہم دت وشمیم وعرش "مسرور منگر"	۸۴۰
۱۳	رہبر صاحب	حضرتِ حمید نظامی بی۔ اے	۸۴۲
۱۴	چند پُراضطراب لمحے (نظم)	جنابِ مجید لاہوری	۸۴۷
۱۵	آہ اقبال (نظم)	جنابِ رام کرشن صاحب بھارتی	〃
۱۶	محفلِ ادب		۸۴۸
۱۷	مطبوعات		۸۵۹

چندہ سالانہ صہ ششماہی سے (مع محصول) قیمت فی پرچہ ۸ر

بزمِ ہمایوں

"کُتّے بھونکتے ہیں مگر کارواں چلے جاتا ہے"—— چند سال ہوئے انگلستان کے ایک مشہور قدامت پسند سیاست کار نے ہندوستان کے قومی شورش برپا کرنے والوں پر یہ فقرہ کسا تھا۔ اس زوردار تقریر کے تھوڑے ہی عرصے بعد آخر اس "کارواں" کو ذرا ٹھنا ہی پڑا تاکہ "یہ بھونکنے والے کُتّے" اس کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ یہ کارواں اب پھر رواں ہے لیکن اب کی بار ان پست ہستیوں کو ساتھ لئے ہوئے جو خدا کی شان آج اس کارواں کی نگہبانی کا کام دیتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں!

جس وقت یہ فقرہ چسپاں کیا گیا تھا کانگرس ہر جگہ کی حکومت میں مخالف پارٹی کے فرائض پورے کرتی تھی۔ آج جبکہ کانگرس سات آٹھ صوبوں میں خود حکومت کر رہی ہے۔ برطانوی حکومت کا اور اُس کا کم از کم صوبوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اب یہ نیا کارواں گاندھی جی مہاراج کی جے پکارتا ہوا چلے جاتا ہے اور اَور کُتّے جن میں بیچارے اُردو والے بھی شریک ہیں اس پر فضول بھونک رہے ہیں۔ کیا نیا کارواں بھی کسی دِن تھمنے پر مجبور ہوگا؟ اس کا جواب زمانے کے پاس ہے!

حکومت میں سفید عنصر کے کم ہونے پر ہر ہندوستانی کو خوش ہونا چاہئے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ سیاہ عنصر میں حکومت پاتے ہی مختلف جھلکیاں نظر آنے لگی ہیں جو بہت سی سیاہ آنکھوں کو چندھیا دینے والی ہیں۔

اِن میں ایک جھلکی زبان کی ہے۔ جب سے کانگرس نے وزارت کا قلمدان سنبھالا ہے غریب اُردو کی جگہ "ہندی ہندوستانی" کا چپراسی اُس کے دائیں بائیں گھومتا نظر آتا ہے۔

زبان کے متعلق اس قلابازی سے اُردو والے اپنی پریشانی کا اظہار کرتے ہیں تو انہیں یہ کہہ کر مطمئن کر دیا جاتا ہے کہ کانگرس کے ریزولیوشن کو دیکھو اور سُنو، وُہ تو کھُلے لفظوں میں ہندوستانی کو ہندوستان کی قومی زبان قرار دے چکی ہے۔ اس کے بعد ہندوستانی کی باقاعدہ تعریف بھی کر دی جاتی ہے کہ یہ وہ زبان ہے جو شمالی ہندوستان میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے اور فارسی اور ناگری ہر دو رسمِ خط میں لکھی جاتی ہے۔ چلئے قِصّہ طے ہُوا۔ اب اس کے بعد جو زبان کے جھگڑے کا نام لے وہ اِس قابل ہے کہ اُسے قومیت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا جائے! قول و قرار ہو گیا عمل کی کیا ضرورت ہے؛ وعدہ کافی ہے۔

زبان کوئی ایسی چیز نہیں کہ ایک کپڑے کی طرح صبح پہن لی اور شام کو اُتار کے رکھ دی لیکن بدقسمتی سے کانگرسی حکومتیں زبان کے ساتھ کچھ ایسا ہی برتاؤ کر رہی ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ جیسے پتلون کوٹ کی جگہ ہم نے حکومت کی کرسی پر بیٹھتے ہی دھوتی اور گاندھی ٹوپی پہن لی اسی طرح اب ہم انگریزی بلکہ اُردو بلکہ ہندوستانی کی جگہ بھی سنسکرتی ہندی استعمال کر سکتے ہیں۔ ہندوستان کو تمام اجنبی اثرات سے یکسر پاک ہو جانا چاہئے۔ اور نئے سرے سے پھر پُرانے زمانے کی طرف مُنہ موڑنا چاہئے۔ اس کے لئے خالص پوتر راشٹر بھاشا کا رواج دینا ضروری ہے۔

زندہ دِلی اچھی چیز ہے، انسان پر مُردنی کیوں چھائی رہے لیکن حیف زندگی کے اُس جوش پر جو دوسرے کے جذبات کا دھیان

رکھے ۔ آج کل دُنیا میں ایسی ہی زندگی کا جوش ہے ۔ بدقسمتی سے نئے ہندوستان میں بھی اس کا جلوہ نظر آرہا ہے ۔

ہوا کا رُخ کدھر ہے ؟ شمال اور مغرب سے مُنہ پھر چکا ہے ۔ اب پُورب اور دکن پر نظر ہے ۔ اب پروا اور دکھنی ہوا چلتی ہے ، اب شیوگاؤں کی زبان ہندوستان کی زبان بن رہی ہے کم از کم بنائے جانے کی پُوری کوشش کی جارہی ہے ۔

جناب سمپورن نند وزیرِ تعلیم یوپی نے ۱۹ راگست کو ناگری پرچارنی سبھا بنارس کے ایڈریس کے جواب میں فرمایا کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہندی کو جسے ہندوستانی بھی کہا جاتا ہے ہمارے جنوبی ہند کے ہم وطن آسانی سے سیکھ لیں تو لازم ہے کہ ہم ہندی زبان میں سنسکرت کے کافی الفاظ استعمال کریں "۔

اس کے دُوسرے ہی دن بنارس کے پاٹ شالاؤں کے طلبہ اور پنڈتوں کے ایک وفد نے آنریبل وزیر کو ایک ایڈریس سنسکرت میں دیا جس کے جواب میں وزیر صاحب نے فرمایا کہ " میں سنسکرت اچھی طرح نہیں جانتا اِس لئے میں ہندی میں بولونگا۔ ٹوٹی پھوٹی سنسکرت میں نہ بولوں گا "۔

لیکن رام بھلا کرے محکمۂ اطلاعات یوپی گورنمنٹ کا جس نے شری سمپورنانند جی کا ایک " ویاکھیان " چھاپ کر ثابت کر دیا ہے کہ شری جی ہندی سے محض نابلد اور ٹوٹی پھوٹی سنسکرت کے ماہر بے بدل ہیں ۔ ملاحظہ فرمایئے چند سطریں اس مشہور تقریرِ دل پذیر کی :-

" آدھنک کال جس میں کہ ہم رہ رہے ہیں اس کی یہ بھی ایک وِشیشتا ہے کہ شکشِت سمُدائے کے بہُت لوگوں کا آگرہ شتر بہت وِشدۂ اور بیاپک ہو گیا ہے ۔ یہ بات اِدھکانش بِشیے سنسار پر گھٹت ہوتی ہے اور تراہ سار ہم اپنے دیش میں بھی اس شُبھ بیاپک اندولن کے بھِن بھِن پہلوؤں کو دیکھ رہے ہیں اور ان کا اَن بھو کر رہے ہیں ۔ آج کل ہم اپنے کو جس مانسِک اور پدھارتک پرستھتی میں پاتے ہیں اور ہماری اس اِس استھِتی کا جو سماجک راج نیتِک اور آرتھِک آدھار ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہم نے اپنے پُوروجوں سے جو سنسکر پائی ہے اُس سے اِس وشیو ویاپی پرگت کو ہمارے سُمکہ نِش سندیہ ایک وشیش رُوپ میں اُپستھت کیا ہے اور ایک وشیس بھارتیہ سمسیہ بنا دیا ہے "۔

یہ ہے بقولِ نگار " مشترک ہندوستانی زبان کا نمونہ جس کی سفارش ہائی کمانڈ نے کی ہے " اور جس کی داد دینے کی مدیرِ رسالہ نے مولانا ابوالکلام آزاد سے درخواست کی ہے ۔

اس تقریر کو نگار سے اس لئے بجنسہ نقل کیا گیا ہے تاکہ کبھی آیندہ زمانے میں پُوربی دوکنی قومیت " شمالی ہندوستان پر چھا کر اسے تاخت وتاراج کردے اور لاہور کے کھنڈرات میں " ہمایوں " کے فائل برآمد ہوں تو ہندوستانی زبان کا یہ نمونہ کسی رحم دل ہمدرد محقق کے کتب خانے کی زینت بن جائے

بشیر احمد

جہاں نما

یادگارِ اقبال

علامۂ اقبال رح کے عقیدت مند مدت سے منتظر تھے کہ علامۂ مرحوم کی کوئی مناسب یادگار قائم کرنے کا فیصلہ جلد ہو جائے۔ اور وہ اس میں حصہ لینے کی سعادت حاصل کر سکیں۔ اِس بارے میں اب تک جو ڈھیل ہوئی اس کا باعث یہ تھا کہ وہ اکابر جن کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا کچھ عرصے کے لئے لاہور سے باہر رہنے پر مجبور تھے۔

اقبال علیہ الرحمۃ کے انتقال کے بعد لاہور کے ٹاؤن ہال میں ایک عظیم الشان تعزیتی جلسہ ہُوا تھا جس میں بلا امتیازِ مذہب و ملت ہر فرقے اور ہر قوم کے افراد شامل ہوئے تھے۔ سر سکندر حیات خاں وزیرِ اعظم پنجاب نے اس جلسے کی صدارت فرمائی تھی۔ اسی جلسے میں یہ فیصلہ ہُوا تھا کہ سر محمد اقبال کی یادگار قائم کرنے کا کام ایک خاص کمیٹی کے سپرد کیا جائے جس کے صدر آنریبل سر ڈگلس ینگ چیف جسٹس پنجاب ہائی کورٹ ہوں۔ سر ڈگلس نے بخوشی صدارت قبول کر لی تھی۔ اور لفٹنٹ کرنل سر ہیرلڈ ولبر فورس بیل، سر سندر سنگھ راجا نرندر ناتھ، سر سکندر حیات خاں، نواب صاحب ممدوٹ، مسٹر ایس پی سنگھا، سید مراتب علی اور مسٹر ہومی رستم جی اس مجلس کے رُکن منتخب ہوئے تھے۔ نواب احمد یار خاں دولتانہ مجلس کے معتمد اور لالہ گوپال داس اور سردار اجل سنگھ نائب معتمد قرار پائے تھے۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے، صدر اور ارکان کی لاہور سے غیر حاضری کے باعث کچھ عرصے تک یہ کمیٹی کوئی کام نہ کر سکی۔ لیکن اب سر ڈگلس ینگ کی انگلستان سے مراجعت اور دوسرے ارکان کی شملہ وغیرہ سے واپسی پر یادگار کا کام نہایت مستعدی سے شروع کر دیا گیا ہے۔

اس کمیٹی کے ارکان نے بہت غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ علامۂ مرحوم کی مناسب ترین یادگار یہ ہو گی کہ پنجاب پبلک لائبریری لاہور کے ساتھ ایک نئی عمارت کا اضافہ کیا جائے جس میں شعر و فلسفہ کی نادر اُردو اور فارسی کتابیں جمع کی جائیں۔ مجوزہ کتب خانے کا نام "اقبال میموریل لائبریری" قرار پایا ہے۔ عمارت اور کتابوں کے مصارف کا اندازہ ڈیڑھ لاکھ روپے کے قریب ہے۔ اور اقبال میموریل فنڈ کمیٹی کی طرف سے چندے کے لئے اپیل شائع ہو چکی ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ اہلِ مُلک اس فنڈ میں حصہ لینا اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھیں گے اور یہ قلیل سی رقم بہت جلد جمع ہو جائے گی۔ اُس کام کے لئے کم استطاعت حضرات کم سے کم رقم بھی بھیج سکتے ہیں۔ ہر رقم امپیریل بنک آف انڈیا لاہور کے نام بھیجنی چاہیئے اور منی آرڈر کے کوپن پر صراحت کر دینی چاہیئے کہ یہ رقم "اقبال میموریل فنڈ" کے لئے بھیجی جا رہی ہے۔

اسلام اور بولشوزم

روس میں بولشویکوں نے مذہب عیسوی کے خلاف جو جوش و خروش دکھایا اس کا ذکر اخباروں رسالوں اور کتابوں میں اکثر ہوتا رہا ہے لیکن بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ سوویٹ روس نے اُن لاکھوں کروڑوں مسلمانوں سے کیا سلوک کیا جو روس میں آباد تھے۔ اکثر لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ دولتِ روس کے ماتحت کتنی زبردست اسلامی آبادی تھی۔ روسی سلطنت کی توسیع کے زمانے میں ترکستان جو مدتوں اسلامی سطوت و جبروت کا گہوارہ رہ چکا ہے رُوس کے زیرِ نگیں ہو گیا۔ قدرتاً ترکستان کے بہت سے باشندے یورپی روس میں بھی داخل ہو کر آباد ہو گئے جب روس میں سوویٹ حکومت برسرِ اقتدار آئی تو لازم تھا کہ اس اسلامی عنصر کو بھی کسی نہ کسی طرح سوویٹ میں مدغم کیا جائے۔

ابتدا میں جدید روسی حکومت کے لئے اسلام ایک عقدۂ دشوار بن گیا لیکن بولشویکوں نے جلد ہی فیصلہ کر لیا کہ اس معاملے میں کامیابی حاصل کرنے سے قبل بہت احتیاط ملحوظ رکھنی چاہئیے۔ چنانچہ روس نے مسلمانوں کے دلوں کو مٹھی میں لینے کے لئے اعلان کیا کہ آزادی ہر قوم کا طبعی حق ہے۔ اور رُوسی ترکستان آزاد کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سوویٹ حکومت نے مقامی بولیوں اور مقامی ثقافتوں کی سرپرستی شروع کر کے عوام میں ہر دلعزیزی حاصل کر لی۔ اس کے بعد بولشویکوں نے قرآنِ مجید کی اُن آیتوں سے فائدہ اُٹھایا جن میں غیر مُنصف اور مغرور اہلِ دولت کو جو غریبوں پر ظلم کرتے ہیں بُرا بھلا کہا گیا ہے بولشویکوں نے اس پراپیگنڈا کے سلسلہ میں کہا کہ در اصل بنیادی طور پر اسلام اُور بولشوزم ایک ہیں۔ عیسائی کلیسا پر بولشویکوں کے جبر و تعدی نے عام مسلمانوں کو اس کا یقین دلا دیا۔

بولشوزم کے ابتدائی ایام میں کئی مسلمان اس بات سے خوش تھے کہ بولشوزم اسلامی اصولِ مساوات کی علمبردار ہے لیکن بہت جلد سب کو معلوم ہو گیا کہ بولشوزم میں کسی مذہب کی گنجائش نہیں۔ آخر اسلامی مساجد اور مدارس کا بھی وہی حشر ہُوا جو عیسائی گرجاؤں اور سکولوں کا ہو چکا تھا۔ غالباً بہت سے مسلمانوں نے بولشوزم قبول کر لی لیکن اب بھی اُن میں ایک ایسا زبردست عنصر (بالخصوص ترکستانی عنصر) موجود ہے جو اسلام کو کسی حال میں چھوڑنا نہیں چاہتا۔

ریاست جے پور میں اصلاح دیہات

ہندوستان کی ریاستوں کی حالت برطانی ہندوستان سے بھی زیادہ پسماندہ ہے۔ اس لئے جب ہم کسی ریاست کو ترقی کی طرف قدم اُٹھاتے ہوئے دیکھتے ہیں تو قدرتاً خوشی ہوتی ہے۔ حال ہی میں ریاست جے پور کے محکمۂ مال کی ایک رپورٹ ہماری نظر سے گزری ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ریاست کے بیدار مغز حکام نے اپنی رعایا کے مرض کی تشخیص کر لی ہے اور اس مرض کے دفعیہ کے لئے نہایت کامیاب علاج شروع کر دیا ہے۔ ہندوستان کی زیادہ آبادی دیہات میں ہے اور بدقسمتی سے

یہی آبادی دُنیا کی تقریبًا پسماندہ ترین مخلوق پر مشتمل ہے۔ ہندوستان کے مرض کا علاج دیہات کی تعلیمی اور اقتصادی حالت کی اصلاح کے سوا اور کچھ نہیں۔

یہ خوشی کی بات ہے کہ مہاراجہ صاحب جے پور کے ایما پر ریاست کے قابل ریوینیو منسٹر نے تعلیمی، طبی، قانونی اور انتظامی معاملات میں دیہات کے رہنے والوں کی امداد اور رہنمائی کا بیڑا اُٹھایا ہے اور ایک نہایت قلیل عرصے میں ہر شعبہ نے نہایت اچھی کارگزاری دکھائی ہے۔

یہاں ہم مختصرًا ریاست کی تعلیمی ترقی پر ایک نظر ڈالتے ہیں تاکہ دیگر شعبوں کی ترقی کا اندازہ بھی کیا جا سکے:۔

۳۶-۱۹۳۵ء میں لڑکوں کے لئے ۳۹۵ ورنیکلر مدرسے تھے جن میں ۲۲۱۵۰ طلبہ تعلیم پاتے تھے۔ ۳۷-۱۹۳۶ء میں اس قسم کے مدرسوں کی تعداد ۴۲۲ ہو گئی اور طلبہ کی تعداد ۲۴۹۵۹ تک پہنچ گئی۔

جے پور کے دیہاتی مدارس میں صرف ایسی تعلیم دی جاتی ہے جو اہلِ دیہات کے حالات کے مطابق ہو اور انہیں پورا فایدہ پہنچا سکے۔ ادبی مضامین کے علاوہ زراعت، صنعت و حرفت اور حفظانِ صحت کے قواعد و اصُول کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ تجربے کے لئے مدرسوں میں باغ لگا دیئے گئے ہیں اور تعلیم کا وقت دیہاتی ضروریات کو پیشِ نظر رکھ کر معین کیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ فصل کے وقت والدین اپنے لڑکوں سے بھی کام لے سکتے ہیں۔

ان مدارس کے علاوہ دیہاتی اُستادوں کے لئے ٹریننگ سکول بھی قائم کیے گئے ہیں۔ ہر ایک ٹریننگ سکول میں باغ اور کھیت موجود ہیں۔ اور بہت سے ایسے مدرّس تیار کر لئے گئے ہیں جو طلبہ کو حفظانِ صحت اور سکاؤٹنگ کی تعلیم کے علاوہ درزی، بڑھئی کا کام، کشیدہ، چمڑے کا کام، نواڑ بُننا، ٹوکری بنانا، کاتنا، جلد سازی، روشنائی بنانا اور ٹوپی مفلر وغیرہ بُننا سکھا سکتے ہیں۔

سب سے زیادہ مسرت کا مقام یہ ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم پر بھی خاص توجہ دی جا رہی ہے اور اُن کے لئے بھی بہت سے مدرسے کھول دیئے گئے ہیں جن میں لڑکیاں بہت شوق سے تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔

مدرّسوں کو جے پور میں خاص طور سے ہدایت کی جاتی ہے کہ تعلیم کے ساتھ طلبہ کی اخلاقی ترقی کا بھی خیال رکھیں۔ اگر ریاست جے پور کی یہ کوششیں کامیاب ہوئیں اور کوئی وجہ نہیں کہ کامیاب نہ ہوں تو اس ریاست کا شمار ہندوستان کی بہترین ریاستوں میں ہونے لگے گا۔

حامد علی خاں

بسمارک

بسمارک

سنہ ۱۸۱۵ - ۹۸ء

آٹو ایڈورڈ لیوپولڈ فان بسمارک کا نام تاریخ عالم میں اس لحاظ سے عدیم النظیر ہے کہ اُس نے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کر کے ایک دوسرے شخص کو شہنشاہ بنا دیا۔ سنہ ۱۸۱۵ء سے جرمنی میں جمہوری طرزِ حکومت کی خواہش بیدار ہو چکی تھی۔ چنانچہ سنہ ۱۸۳۰ء میں فرانسیسی انقلاب کے بعد جرمنی میں بھی کچھ فسادات ہوئے۔ سنہ ۱۸۴۰ء میں جب فریڈرک ولیم چہارم پرشیا کے تخت پر بیٹھا تو عوام کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اب ہمیں نیابتی طرزِ حکومت حاصل ہو جائے گا۔ شاہِ پرشیا کی حالت بہت بے چارگی کی تھی۔ مارچ سنہ ۱۸۴۸ء میں برلن میں بغاوت ہو گئی اور بادشاہ قلعہ میں نظر بند کر کے مجبور کیا گیا کہ حکومت کے اختیارات عوام کے نمائندوں کی ایک مجلس کے سپرد کر دے۔

بسمارک جو ایک جرمن جاگیردار کا بیٹا تھا بڑا زبردست شاہ پسند تھا۔ وہ اس وقت تک مختلف حیثیتوں سے سیاسی اُمور میں دخل دے چکا تھا۔ جب اس نے بادشاہ کو اس کم پرسی کے عالم میں دیکھا تو وہ بھیس بدل کر کسی نہ کسی طرح محل میں داخل ہوا اور بادشاہ سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے بعد بسمارک کو معلوم ہو گیا کہ بادشاہ نہایت کمزور آدمی ہے لیکن اُس نے فیصلہ کر لیا کہ اس بادشاہ کے باوجود بادشاہی قائم رہے گی۔

سنہ ۱۸۴۸ء کے موسمِ گرما میں بسمارک نے بہت محنت کی۔ اس نے شاہ پسندی کے خیالات کی نشر و اشاعت کے لئے ایک اخبار جاری کیا اور انقلاب پسندی کے سیلاب کو روکنے کیلئے ایک مجلس قائم کی۔ اِن کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بسمارک جرمن فوج کو برلن لا کر انقلاب پسندوں کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس سلسلے میں عوام کو بظاہر حکومت میں کسی قدر نمائندگی حاصل ہو گئی لیکن بسمارک کے اثر سے عوام کے نمائندے اپنے حقوق کا قطعاً استعمال نہ کرتے تھے۔

جرمنی اُن دنوں اُنتالیس متحدہ ریاستوں پر مشتمل تھا اور ہر ریاست کا الگ خود مختار بادشاہ تھا۔ اب بسمارک کی شخصیت اتنی اہم ہو گئی تھی کہ سنہ ۱۸۵۱ء میں وہ ڈائٹ آف فرینکفورٹ میں پرشیا کے نمائندے کی حیثیت سے شامل ہوا۔ یہ مجلس جرمنی کی اُنتالیس ریاستوں کے باہمی تعلقات اور دیگر مشترک اُمور کا فیصلہ کیا کرتی تھی۔ تمام جرمن ریاستوں میں آسٹریا کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی اور آسٹریا کا نمائندہ ہی ہمیشہ ڈائٹ کا صدر ہوا کرتا تھا۔ اِن دنوں آسٹریا کی یہ کوشش تھی کہ پرشیا کی بڑھتی ہوئی طاقت یا تو مٹ جائے یا کم از کم محدود ہو جائے۔ بسمارک کو آسٹریا کا یہ غرور ناقابلِ برداشت معلوم ہوتا تھا چنانچہ ایک دفعہ وہ مجلسِ متحدہ میں پرشیا کی اہم حیثیت اور رتبہ تسلیم کرانے کے لئے آسٹریا کے نمائندے سے ڈوئل بھی لڑا تھا۔

سنہ ۱۸۵۷ء کے موسمِ خزاں میں شاہِ پرشیا کا دماغ چل گیا اور کچھ عرصے کے بعد وہ مر گیا۔ اس کے بعد اُس کا بھائی ولیم اوّل تختِ حکومت پر بیٹھا۔ ولیم کے دل میں بسمارک کی بہت قدر و منزلت تھی اور وہ اسے وزیرِ اعظم بنانا چاہتا تھا لیکن پارلیمنٹ کے باقی رکن بسمارک کے راستے میں کچھ دیر تک حائل رہے کیونکہ وہ سب کے سب جمہوریت پسند گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آخر ایک دن ایسا آیا جب اس جماعت کی سرگرمیوں کے طفیل بادشاہ حکومت سے دستبردار ہونے کا ایک اعلان سامنے رکھے بیٹھا ہوا نظر آیا۔ ابھی اس اعلان پر دستخط نہ ہوئے تھے۔ بسمارک جو اُن دنوں روس میں تھا اِن حالات سے بے خبر تھا۔ وہ ٹھیک وقت پر برلن آ پہنچا اور محل میں جا کر اُس نے اپنے ہاتھوں سے اعلانِ دستبرداری چاک کر دیا۔ اب وزیرِ اعظم فان رُون نے جو بسمارک کی قابلیت کا مداح تھا خود وزارتِ عظمیٰ کا قلمدان بسمارک کے سپرد کیا اور ایک جدید وزارت مرتب ہوئی۔ اگرچہ اب

بھی جمہوریت پسند جماعت کی سرگرمیاں روز افزوں ترقی پر تھیں لیکن کسی نہ کسی طرح بسمارک کامیابی سے اُن کا مقابلہ کرتا رہا۔

دراصل بسمارک کی حکمت عملی یہ تھی کہ آسٹریا کو رفتہ رفتہ باقی جرمن ریاستوں سے علیحدہ کر دے۔ آخر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ پرشیا اور آسٹریا کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ پرشیا کی فوجیں زیادہ باقاعدہ تربیت یافتہ اور بہتر طریقے سے مسلح تھیں نتیجہ یہ ہوا کہ آسٹریا کو شکست ہوئی اور تمام شمالی مغربی جرمنی پرشیا کے زیر نگین آ گیا۔ اس طرح مزید پچاس لاکھ افراد کی آبادی شاہِ پرشیا کی رعایا میں شامل ہو گئی اور آسٹریا بالکل علیحدہ کر دیا گیا۔

اب بسمارک نے ایک نئی متحدہ جرمن سلطنت قائم کی جس کا صدر آسٹریا نہیں بلکہ پرشیا تھا۔ تمام شمالی جرمن ریاستیں متحد ہو گئیں اور ریشتاغ کے نام سے ایک مجلسِ حکومت قائم کی گئی۔ اب پرشیا کی پارلیمنٹ بھی پرنس بسمارک سے خوش ہو گئی اور پارلیمنٹ کی طرف سے اسے بیش بہا انعام دیا گیا۔

۱۸۷۰ء میں سپین کا بادشاہ کوئی وارثِ تخت چھوڑے بغیر مر گیا۔ اس سلسلے میں جرمنی کے ایک شہزادہ کو بادشاہی قبول کرنے کی دعوت دی گئی۔ نپولین ثالث شاہِ فرانس کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور بالآخر جب حالات کی ناساعدت کے باعث یہ دعوت واپس لے لی گئی تو نپولین نے جرمنی کو ایک بہت ہتک آمیز خط لکھا۔ نتیجۃً فرانس اور جرمنی کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی جس نے اہلِ فرانس کے چھکے چھڑا دیئے اور فرانس کا ایک خاصا رقبہ جرمنی کے قبضے میں آ گیا۔ اس اثنا میں بسمارک برابر اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ تمام جرمن ریاستوں کو متحد کر کے پرشیا کے زیر نگیں کر لے۔ ۱۸۷۰ء کے اخیر میں جب آخری ریاست بوریا سے بھی بسمارک کا معاہدہ ہو چکا تو اتحاد کا یہ کام مکمل ہو گیا اور بسمارک کی کوششوں سے تمام ریاستیں ایک جرمن شہنشاہی قائم کرنے پر آمادہ ہو گئیں۔ چنانچہ بسمارک کے ایما پر خود شاہِ بوریا نے شاہِ ولیم اول کو جرمنی کی شہنشاہی قبول کرنے کیلئے دعوت نامہ بھیجا۔ اس دعوت نامے کا مسودہ بھی بسمارک نے خود تیار کیا تھا۔ جنوری ۱۸۷۱ء میں تمام جرمن بادشاہوں کی موجودگی میں قیصر ولیم اول کے شہنشاہِ جرمنی ہونے کا اعلان کیا گیا۔ گویا اب بسمارک نے اپنی زندگی کا مقصد حاصل کر لیا۔ بہت کم لوگ ایک سلطنت بنا سکتے ہیں لیکن سلطنت بنا کر کسی دوسرے کے سپرد کر دینا ایک ایسا کام ہے جو دنیا میں غالباً صرف بسمارک ہی نے کیا۔ فرانس کی شکست اور جرمن ریاستوں کے اتحاد کے بعد جرمنی براعظم یورپ کی سب سے زبردست طاقت بن گیا۔

بسمارک اور اس کا آقا شہنشاہ ولیم اول ساتھ ساتھ بڈھے ہوئے۔ آخر ۹ مارچ ۱۸۸۸ء کو شہنشاہ کا انتقال ہو گیا۔ ولیم اول وہ ستون تھا جس پر پرنس بسمارک کی طاقت کی عمارت قائم تھی۔ نیا شہنشاہ نوجوان قیصر ولیم ثانی مطلق العنانی چاہتا تھا لیکن اسے ہر جگہ بسمارک کے اختیارات حائل نظر آتے تھے۔ قیصر یہ صورتِ حال دیکھ کر تنگ آ گیا۔ آخر ایک دن نوجوان شہنشاہ اور بوڑھا وزیر دونوں ترش چہروں کے ساتھ ایک دوسرے کے سامنے کھڑے نظر آئے۔ بسمارک نے انگریزی میں کہا "اعلیٰحضرت، معلوم ہوتا ہے کہ میں آپ کا راستہ روک کر کھڑا ہوں"۔ قیصر ولیم نے جواب دیا "یقیناً"۔ بسمارک کے لئے یہ جواب کافی تھا۔ اس نے رخصت چاہی اور اپنا استعفا لکھنے کے لئے گھر چلا گیا۔

مستعفی ہونے پر بسمارک اعزاز و اکرام کے ساتھ رخصت کیا گیا تاکہ اس کا استعفا دوستانہ اور رضامندانہ ظاہر ہو لیکن بوڑھے وزیر کی اسّیویں سالگرہ کے موقع پر قیصر ولیم ثانی خود اسے مبارکباد دینے کے لئے فریڈرکسروہ گیا اور دونوں میں صلح ہو گئی۔ آخری وقت تک بسمارک سیاسی حالات کا امعانِ نظر سے مطالعہ کرتا رہا اور جولائی ۱۸۹۸ء میں دنیا سے رخصت ہوا۔

بسمارک کو سیاسی خدمات پر ۱۸۶۵ء میں کاؤنٹ اور ۱۸۷۱ء میں پرنس کا خطاب ملا تھا۔

حامد علی خاں

شعر، اُس کی تخلیق اور چینی شاعری

کسی غیر زبان کی شاعری پر تبصرہ کرنا شاید اُس وقت غیر معقول نہیں کہا جا سکتا جب مبصر کو اس زبان سے کما حقہ واقفیت ہو۔ مگر کسی ایسی زبان کی شاعری پر کچھ لکھنا جس سے لکھنے والا مطلقاً ناواقف ہو کم از کم تعجب انگیز ضرور ہے۔ چینی شاعری سے میری آشنائی اس کے انگریزی تراجم کے ذریعہ سے ہے۔ ان ترجمہ در ترجمہ منظومات سے چند اصحاب کو اور بھی اُلجھن ہو گی مگر میں اس کی حمایت میں ایک ہی عذر پیش کر سکتا ہوں اور وہ یہ کہ مسٹر آرتھر ویلی جن کی ۱۷۰ چینی نظموں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے خود چینی زبان کے عالم ہیں اور ترجمہ کی تمام مشکلات کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس لئے اُن کا ترجمہ حتیٰ الوسع اصل کے مطابق ہے اور ظاہری شوکت اور صنعتوں سے پاک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں اکثر اوقات اصل جذبہ کی کسک اور کیفیت کا مزا آ جاتا ہے۔ راجہ مہدی علی خان بھی جن کے چند تراجم میں نے اس مضمون میں استعمال کئے ہیں چینی شاعر کے احساسات کا احترام کرتے ہیں۔ اور تکلف اور تصنع کو کام میں نہیں لاتے۔ خود میں نے ترجمہ کرتے وقت حتےٰ الوسع سادگی اور خلوص سے کام لیا ہے۔

چونکہ میں نے اپنا مضمون ترجموں کے ذکر سے شروع کیا ہے شاید یہ مناسب ہو گا کہ میں شعر اور اس کے ترجمہ کے متعلق کچھ کہوں۔ اس لئے بھی کہ میری مثالیں ہر وقت آپ کو یہ بات یاد دلائیں گی کہ آخر میں کسی چینی نظم کا چربہ ہی آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ مگر اس سے پہلے لازم ہو گا کہ خود شعر اور اس کی تخلیق کے متعلق کچھ کہا جائے۔ کیونکہ اس کو بیان سے اور پھر ترجمہ سے بہت گہری نسبت ہے۔

شاعری کی تعریف کرنا غالباً بے فائدہ ہے۔ کیونکہ اکثر اوقات شاعر کسی تعریف، یا قانون اور کلیہ کے جاننے کے بغیر ہی اپنے جذبات کو یا دُنیا کی خوبصورتی کو الفاظ کی مدد سے کوئی حسین شکل دے کر، اشعار کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کرتا رہتا ہے۔ وہ قدرتی طور پر عام لوگوں سے زیادہ حسّاس ہوتا ہے، اس لئے اس کے جذبات اور اس کے احساسات عام لوگوں کی نسبت زیادہ گہرے، زیادہ رنگین اور متنوع ہوتے ہیں۔ الفاظ کی مدد سے وہ اپنے تجربۂ زندگی کو حسین سے حسین اور مرئی سے مرئی جامہ پہنانا چاہتا ہے۔ اس کے لئے اسے تشبیہوں اور استعاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی اسے اپنے احساسات کو بیان کرنے کے لئے کسی مرئی شئے کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاعر قدرت کے نظاروں سے

روزمرّہ زندگی سے، عام سے عام اشیا کی صُورتیں یا معنوی یگانگت سے اپنے جذبات کو متصوّر کرتا ہے۔ ان سب باتوں کے لئے اسے وہ الفاظ تلاش کرنے پڑتے ہیں جو مناسب سے مناسب طریق پر اس کی کیفیات کو بیان کر سکیں۔ اب یہ ایک اتفاقِ حسنہ ہے کہ اکثر اوقات جب ہم اپنی روزمرّہ کی زبان کو بھی کسی جذبہ کے ماتحت استعمال کرتے ہیں تو الفاظ میں ایک ایسی ترتیب قائم ہوجاتی ہے۔ جس سے آواز اور پھر الفاظ میں ایک قسم کا زیروبم یا رقص سا پیدا ہوجاتا ہے جس سے الفاظ اور بھی مؤثر ہوجاتے ہیں۔ تقریباً ہر زبان میں یہ ملکہ قدرتاً موجود ہوتا ہے۔ شاعر کی زبان چونکہ تمام تر جذباتی ہوتی ہے اس لئے شعر لکھتے وقت اس کے الفاظ میں خود ہی موسیقی پیدا ہوجاتی ہے۔ اور جب اظہار کے لئے وہ کوشش اور تلاش کے بعد الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اور فقط وہی الفاظ، جو اس کا مطلب بدرجۂ اتم ادا کر سکیں، تو ان الفاظ میں ایک خاص قسم کی رعنائی آجاتی ہے۔ وہی الفاظ جو عام طور پر ہر شخص نہیں تو ہر تعلیم یافتہ شخص روزانہ کام میں لاتا ہے، جب کسی شاعر کے کلام میں استعمال ہوتے ہیں تو وہ ایک سے زیادہ معنی کے حامل ہوتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب شعر کی تخلیق شاعر کے دماغ میں ہوتی ہے تو اس وقت ضروری نہیں کہ شاعر ایک ہی جذبہ کے اظہار کی کوشش کر رہا ہو اور چونکہ یوں بھی اس کا دماغی ماحول مختلف حسیات کی آماجگاہ بنا ہوتا ہے، اس لئے شاعر کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ اس کا بیان جتنا جامع ہو سکے ہوجائے۔ چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ الفاظ جب اس کے دماغ سے اُترتے ہیں تو وہ اپنے ذاتی معانی کے علاوہ شاعر کے وجدانی ماحول سے متاثر ہوئے ہوتے ہیں۔ یہی باعث ہے کہ ایک شعر اکثر اوقات کئی ایک مطالب کا متحمل ہوسکتا ہے۔

اب ایک طرف شاعر کے تاثرات ہوتے ہیں اور دوسری طرف الفاظ۔ چونکہ شاعر صانع کی حیثیت میں، اپنے جذباتی مواد سے اور خیالات کی مدد سے پڑھنے والے یا سننے والے کے لئے ایک جذباتی فضا پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے اسے ایسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے جو خود اس کے حواس کا بدل بن سکے۔ شاعر اپنے حواس کے ذریعہ سے دُنیا کو اور زندگی کو محسوس کر چکا ہوتا ہے اور اس کے تاثرات انہی حواسِ لطیفہ کے ذریعہ سے اس کی دماغی دُنیا میں اُتر چکے ہوتے ہیں۔ مگر وہ یہ چاہتا ہے کہ یہ جذبات کسی طرح سامعین یا قارئین پر وہی اثر پیدا کردیں جو خود اس پر ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ سادے سے بیان سے سامع کو یہ علم ہوسکتا ہے کہ شاعر نے بُلبل کو دیکھا ہے یا پھولوں کو، بلکہ ہم سب کئی دفعہ پھولوں کو دیکھ کر ان کے خوشنما رنگوں سے متاثر ہوئے ہوں گے، ہم نے یہی کہا ہوگا "کیا خوب رنگ ہیں، کیا بہار ہے!"۔ اگر ہمارا انداز شاعرانہ ہے تو ہم نے یہ بھی کہہ دیا ہوگا کہ زمین جوبن پر ہے، کسی فلسفی نے یہ بھی خیال کیا ہوگا کہ پھول زمین کی ایک جذباتی حالت کا اظہار ہیں۔ غالب کہتا ہے :- نشۂ رنگ سے ہے واشدِ گل - مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

شاعر کی نظر موجودات کی سطح سے گزر کر اشیا کی ماہیت تک پہنچ جاتی ہے اور اس دُنیا میں اسے ہر چیز کی حقیقت ایک معلوم ہوتی ہے اسی لئے شاعر دُور اُفتادہ اور بظاہر لاتعلق چیزوں میں ایک نسبت محسوس کرتا ہے اور اس احساس کے ماتحت وہ اپنے ذاتی جذبہ کو نظام دہر کا ایک جزو تصوّر کرتے ہوئے دُنیا کی ہر چیز کے ذریعہ سے جس میں اسے کوئی مشابہت دکھائی دے، واضح کر دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی احساس کی بنا پر وہ اپنے خیالات میں ایک ایسی قدرت پاتا ہے جس سے وہ ایک نئی دُنیا اور ایک نیا نظام تخلیق کر لیتا ہے۔ اس قدرت کو ہم تخیل کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر ایک معمولی سے جذبہ کو ظاہر کرتے وقت بھی اپنے دائرۂ احساسات میں عالمِ موجودات کی ہر چیز کو اپنی اپنی جگہ دیکھ سکتا ہے اور ان میں ایک نسبت قائم کر دیتا ہے۔ جو فہمِ عام میں پہلے نہیں آئی ہوتی۔ مثلاً معشوق سے شکوہ سب ہی کرتے ہیں۔ غالب کہتا ہے:—

نفس موجِ محیطِ بے خودی ہے　　　تغافلہائے ساقی کا گلہ کیا

ایک عام سے جذبہ کو پہلے شاعر نے ذاتی طور پر محسوس کیا ہے، پھر اس کے ادا کرنے میں اس نے کائنات کی ایک چیز سے نہیں ساری کائنات سے ہی مدد لے لی ہے۔ اس سے بیان میں جو زِلالِ عمق پیدا ہو گیا ہے وُہ ظاہر ہے۔ چنانچہ شاعر اپنے جذبہ کو مؤثر اور پُرزور بنانے کی غرض سے تشبیہ اور استعارہ یعنی کائنات کی ہر ممکن چیز کی مدد ڈھونڈتا ہے۔

اس طویل چکر کے بعد بھی اگر شاعری کی تعریف درکار ہو تو یہ سمجھ لیجئے کہ شاعری سے میری مُراد کسی جذباتی ماحول یا چند جذباتی تاثرات کو مناسب الفاظ کے ذریعہ اس طرح ظاہر کرنا ہے کہ اس موقع پر وہ الفاظ فقط معمولی الفاظ ہی نہ ہوں بلکہ ایک فضا اور کیفیت کے حامل ہوں۔ یوں تو ہر شخص ہی ردیف و قافیہ لے کر، تھوڑی سی دماغی کاوش کے بعد کچھ نہ کچھ مترنم نہیں تو متوازی اور ہم وضع سطور لکھ سکتا ہے۔ سجیلے الفاظ بھی استعمال کر لینا زیادہ مشکل نہیں مگر وہ الفاظ جو اپنی نمائش اور بھڑکیلے پن کے علاوہ کسی جذبہ کو ظاہر کرنے کے متحمل ہو سکیں، ملنے ضرور مشکل ہوتے ہیں۔ اور پھر زبان میں الفاظ ضرور ہی کسی خاص اثر اور فضا اور ہم رنگ خیالات کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ گویا جب شاعر کسی لفظ کو استعمال کرتا ہے تو اس کے لغوی معنوں کے علاوہ وہ اس لفظ کے جذباتی ماحول اور متعلقہ خیالات سے بھی اظہارِ مطلب میں مدد لیتا ہے۔ ایک اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ جب شاعر کسی چیز یا انسان یا کیفیت سے متاثر ہوتا ہے تو ضروری نہیں کہ فوراً ہی اسے مناسب الفاظ بنے بنائے سُوجھ جاتے ہیں۔ بہت دفعہ اسے خاص ذہنی کاوش کرنی پڑتی ہے۔ پھر حسّاس ہونے کی وجہ سے اس کے دل میں چھوٹے چھوٹے اثرات اور حسیات ہر وقت نقش ہوتے رہتے ہیں، جس وقت کوئی زبردست تجربہ یا احساس اسے اظہار کی تحریک کرتا ہے تو یہ عام اثرات اسے نئے احساس کی تعبیر اور تخلیق میں لاشعوری طور پر مدد دیتے ہیں۔ یہ شاعر کا جذباتی پس منظر ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہر شعر علاوہ لغوی معانی اور ذاتی احساس کے ایک خاص فضا کا حامل ہوتا ہے، جو شاعر کی زندگی

ماحول اور حالات کا پرتَو لئے ہوتی ہے۔

مگر ترجمہ میں جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں ان کی تاریخ، شعری اثر، اور متعلقہ خیالات اور فضا اور ہوتی ہے۔ اسی لئے اگر مترجم صحیح معنوں میں صاحبِ بصیرت نہ ہو تو ترجمہ کے الفاظ اور ہی اثر پیدا کر دیتے ہیں جو بعض دفعہ اصلی فضا اور احساس کے منافی نہیں تو اس سے مختلف ضرور ہوتا ہے۔ مگر جیسا کہ میں اُوپر ذکر کر آیا ہوں آرتھر ویلی اور مہدی صاحب جن کے تراجم سے میں نے مدد لی ہے ترجمہ کرتے وقت ایسے الفاظ چُنتے ہیں جو نظر کو یا ذہن کو اپنی طرف نہیں کھینچتے اور دونوں حضرات ترجمہ میں اسی کفایت سے کام لیتے ہیں جس سے چینی شاعر۔ میں نے اپنے تراجم میں بھی انہیں اُمور کو ملحوظ رکھا ہے اور چونکہ شاعری کی رُوح، شاعر کے جذبات ہیں اس لئے ترجمہ میں بھی اُس کی آواز ہم تک آتی رہتی ہے۔

میرا ارادہ چینی شاعری کی تاریخ بیان کرنا یا مختلف شعراء کا ذکر کرنا نہیں۔ یہ سب کچھ بآسانی کسی کتاب سے لیا جا سکتا تھا۔ اور اس سے آپ حضرات کی معلومات میں کوئی قابلِ قدر اضافہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اس مضمون کے لکھنے کا محرک یہ خیال تھا کہ چینی شعراء اپنے افکار اور جذبات کو بغیر مبالغہ اور فضول استعارات کے بعض دفعہ کسی خیالی تصویر کی مدد سے سادہ الفاظ میں بہت اختصار کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔ اس کے خلاف ہمارے شعراء عام طور پر رنگین الفاظ اور خواب آور اور خمار آلود تراکیب کے بہت دلدادہ ہیں اور بعض دفعہ تو وہ کسی خاص جذبہ کے بجائے ایک موہوم اور مبہم جذباتی دھند کو فقط قوتِ بیان سے نظم کی صورت میں تبدیل کر دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیا اچھا ہو اگر وہ دُوسرے ملکوں کی شاعری کو خواہ وہ تراجم میں ہی مل سکے، پڑھیں اور ان سے اپنے جذباتی نشوونما میں مدد لے سکیں ــ اسی خیال کو مدِ نظر رکھ کر اپنے تاثرات کی بنا پر یہ چھوٹا سا مقالہ قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہ تھی کہ چینی شاعر کو چینی مصوّر کی طرح غیر ضروری اذکار اور جزئیات کا شوق نہیں۔ وہ الفاظ کے مختلف مطالب سے مرعوب نہیں ہوتا اور اپنا خیال صریح اور سادہ بلکہ تقریباً "عریاں" انداز میں بیان کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر اس نظم کو لیجئے۔ عنوان تنہائی ہے:۔

شام کا سُنہری سُورج گاؤں کے بازار پر چمک رہا ہے
تنہائی میں میرے خیالات کس قدر غمناک ہو جاتے ہیں
سڑک پر مجھے کوئی مسافر نہیں ملتا
صرف خزاں کی اُداس ہوا کھیتوں پر سے ہوتی ہوئی اس طرف آ رہی ہے۔

پہلی سطر میں شاعر نے نہایت اختصار کے ساتھ لیکن واضح طور پر ایک سین کو ہمارے دماغ میں قائم کر دیا ہے۔ شام، سنہری سورج،

گاؤں کا بازار اور بس۔ جذبات ہمارے تخیل پر چھوڑ دی گئی ہیں۔ دوسری سطر میں اس کے احساس کا سادہ سا اظہار ہے تیسری میں بالواسطہ اور اشارۃً یہ کہا گیا ہے کہ اس وقت مسافر بھی شاعر کے لئے ہم نشین اور ہمدم ثابت ہوتا۔ چوتھی سطر میں فطرت کی طرف توجہ دلا کے، موسم کے حزن اور ارد گرد کے بسیط علاقہ کا اپنی تنہائی سے مقابلہ کر کے نظم کو اور بھی مؤثر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس چھوٹی سی نظم میں نہ استعارہ ہے نہ کوئی تلمیح نہ کوئی صنعت، شاعر کا بیان روشن اور یقینی ہے۔ اس نے لفظی آرائش سے کام نہیں لیا۔ یا اختصار کا ایک اور نمونہ لیجئے، عنوان جدائی سمجھ لیجئے۔ نظم ہے:۔

میرا پلنگ اتنا خالی ہے کہ میں رات کو جاگ جاگ اُٹھتا ہوں
رفتہ رفتہ سردی بڑھتی ہے، رات کی ہوا چلنے لگتی ہے
وہ پردوں میں ایسی سرسراہٹ پیدا کرتی ہے جیسے سمندر کی موجوں کی آواز
کاش یہ موجیں ہوتیں اور مجھے تمہارے پاس واپس لے جاتیں۔

(شہنشاہ چین۔ دینتی۔ چھٹی صدی ب۔م)

مگر قبل اس کے کہ میں چینی شاعری کے متعلق تفصیل سے کچھ کہہ سکوں دو ایک اور باتوں کے متعلق ذکر کر دینا شاید بے محل نہ ہوگا۔ ہر زبان اور ادب کی روایات الگ ہوتی ہیں۔ مثلاً انگریزی شاعری میں کئی اصناف بہت مقبول ہیں مگر جس صنف کے ساتھ شروع ہی سے سب شاعروں کو لگاؤ رہا ہے وہ لِرک ہے۔ لرک سے مراد ایسی نظم ہوتی ہے جس میں شاعر اپنے ذاتی جذبات کو خواہ وہ گریز پا سے گریز پا، یا نازک سے نازک یا موہوم سے موہوم احساس پر مبنی ہوں اور خواہ وہ کسی عمیق یا جامع یا وسیع جذبہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ بلاواسطہ اور مؤثر طریق سے بیان کر دے۔ اس میں شاعر عام طور پر ایک جذبہ کو داخلی پہلو سے لے کر اسے وسعت دے دیتا ہے یا کبھی دفعہ شاعر اس جذبہ کو جامع نقطۂ نگاہ سے اپنی حالت کی طرف، یا اپنی ذات تک محدود کر دیتا ہے۔ ہر دو حالتوں میں شاعر اپنے جذبہ کو ظاہر کرنے میں دُنیا کی ہر چیز جس میں اسے اپنی حالت سے کوئی مشابہت دکھائی دے، مدد لے لیتا ہے۔ بلکہ بعض دفعہ تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے جذبہ یا درد یا احساس کو مرئی یا محسوس اشیاء بلکہ دُنیا یا تمام فطرت کے محسوسات کے ذریعہ سے بیان کر رہا ہے۔ اس کے لئے فطرت کوئی علیحدہ چیز نہیں۔ وہ خود فطرت کا حصّہ ہے۔ چنانچہ فطرت کی اشکال کا احساس اسے ہر وقت رہتا ہے۔ بائرن کے ایک مشہور لرک کی پہلی سطر کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے:۔

اس کے حسن میں نکھرے ہوئے آسمانوں کی دلکشی نہاں ہے
اس کا حسن تاروں بھری راتوں کا سا ہے

یا برنز کا ایک مقبول و معروف گیت اِس طرح شروع ہوتا ہے :۔

میری محبوبہ اس سُرخ گلاب کے مانند ہے جو بہار میں نیا نیا کھلا ہو

میری محبوبہ اس گیت کے مانند ہے جو شیریں اور مترنم سُر میں گایا گیا ہو

تو گویا مغربی شاعر، یا یہ کہئے کہ انگریزی شاعر عام طور پر اپنے سادہ احساس بھی تشبیہ یا استعارہ کی مدد سے بیان کرتا ہے، وہ فطرت کی وساطت سے اظہار میں خوبی پیدا کرتا ہے۔ بخلاف اس کے ہمارے ہاں شاعر، جہاں اسے محض الفاظ کی شوکت اور تراکیب کی نمائش مقصود نہ ہو، عام طور پر دُنیا کو اپنے جذبات کے ذریعہ سے دیکھتا ہے۔ اور جذبات کی ماہیت تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس نفسیاتی تحلیل کی وجہ سے وُہ دُنیا اور کائنات کو ایک بشری پہلو سے دیکھتا ہے۔ اس کی طبیعت فکر پسند اور اس کا نقطۂ نگاہ عمیق اور رسا ہوجاتا ہے۔ اگر وہ کسی جگہ ذاتی جذبہ کا اظہار نہیں کر رہا تو وہ تمام بنی آدم کے احساسات بلکہ زندگی کی حقیقت کی ترجمانی کر رہا ہوتا ہے۔ مثلاً غالب کہتا ہے :۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا	نہ ہو جینا تو مرنے کا مزا کیا

یا پھر :۔ سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں	خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

یہاں شاعر کا پہلو ذاتی نہیں، نوعی ہے۔

یا بیک وقت جذبہ ذاتی بھی ہے اور اس کا اطلاق جامع بھی ہے :۔ مثلاً ؎

کیا کس نے جگر داری کا دعوےٰ	شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا

یا :؎ ناچار بیکسی کی بھی حسرت اُٹھائیے	دشواریٔ رہ و ستمِ ہمرہاں نہ پُوچھ

مگر جہاں جذبہ تمام تر ذاتی ہے وہاں شاعر کا انہماک اس قدر گہرا ہے کہ اپنے سوا اس کے دماغ میں کوئی اور چیز موجود نہیں، مثلاً غالب کہتا ہے :؎

گو میں رہا رہینِ ستمہائے روزگار	لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

یا میر درد کا شعر ہے ؎ اُس نے قصداً بھی میرے نالے کو	نہ سُنا ہو گا گر سُنا ہو گا

یا میر تقی کا ؎ ایک محروم چلے میر ہمیں دُنیا سے	ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ

ظاہر ہے کہ ذاتی عنصر ہی ایسے اشعار کا جوہر ہے اور ان اشعار کا اثر اور درد اور اُن کی گہرائی اور صداقت، شاعر کے شخصی انہماک کا نتیجہ ہیں۔ وہ وارداتِ قلب اور اپنی کیفیات میں اتنا جذب رہتا ہے کہ اس کے لئے دُنیا کی اہم ترین اور سب سے قیمتی چیز اپنی ذات اور اس کے بعد جذبات کا نفسیاتی ادراک ہے! اس کے بعد انسان کے وہ جذباتی

تجربات جو ہم سب پر یکساں طور پر وارد ہوتے ہیں یعنی جو مقتضائے زندگی ہیں۔ اسی لئے ہمارے شاعر ان نفسیاتی اور جذباتی انکشافات کی جو مشاہداتِ حیات انہیں سکھلاتے ہیں تعمیم کر دیتے ہیں۔ چنانچہ جہاں حفیظ کا یہ شعر ذاتی سوز سے بھرا ہوا ہے کہ

رزاقِ دو جہاں کے خزانوں کو کیا ہوا   ملتا ہے رنج وہ بھی کسی کا دیا ہوا

وہاں ایسے شعر بھی شاذ نہیں جہاں شاعر کا نقطۂ نگاہ تمام جنسِ آدم کو شامل ہے:۔ مثلاً

غالبؔ: غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے   غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

یا دردؔ: دل زمانے کے ہاتھ سے سالم   کوئی ہوگا کہ رہ گیا ہوگا

اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہماری شاعری میں شاعر یا اپنی ذات اور اپنے جذبات میں منہمک رہتا ہے یا زندگی اور کارخانۂ حیات کے ان حالات میں جن کا اثر ہماری جذباتی زندگی پر پڑتا ہے چنانچہ وہ اپنے آنسوؤں اور اپنی ہنسی کی کیفیت ہمیں اس سچائی سے، کہ ان کا اثر وہی ہو جو شاعر کے اپنے دل میں تھا، مترنم الفاظ کے ذریعہ سے دیتا رہتا ہے۔ یا وہ دنیائے انسان کا حزن اور مسرت ہم پر منکشف کرتا رہتا ہے۔ مگر تعمیمی نقطۂ نگاہ سے دیکھنا اس کے خمیر میں داخل ہے۔ یہ وسعتِ نظر مشرق کی بہت سی شاعری میں ہے۔

مگر چینی شاعری میں اگرچہ چینی لوگ فطرۃً فکر پسند واقع ہوئے ہیں تعمیمی نقطۂ نگاہ کم پایا جاتا ہے۔ چینی شاعر نہ انگریز کی طرح فطرت کے مظاہر کی تشبیہات سے اور نہ اپنے جذبات اور فطرت کے گوناگوں مظاہر میں یگانگت کی مثالوں سے، اور نہ اردو شاعر کی طرح کلیتہً بلکہ گرد و پیش کے مناظر کو اپنے احساس کے لئے بطور پس منظر کے استعمال کرتے ہوئے، بغیر کسی پیچیدگی یا جذباتی دھند کے، صراحت اور نہایت اختصار کے ساتھ اپنی کیفیات کا اظہار کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ نظم لیجئے:۔

موسم خزاں کی ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی کہاں سے آتی ہے؛

اور قریب سے گزرتے ہوئے بطخوں کے جھنڈ کہاں سے آئے ہیں؛

آہ! جب موسم سرما کی ہوائیں چلنے لگیں گی

پہلے پہل، تنہا مسافر ہی اُن کی آواز کو سُنے گا۔   ہو جی چانگ

یہاں شاعر نے استفہامیہ انداز میں اور فقط خزاں کی ہوا اور بطخوں کے جھنڈ، دو جملوں سے ایک فضا پیشِ نظر کرنے کی کوشش کی ہے اور پھر آخری سطر میں پہلے پہل کے لفظ سے ساری نظم میں ایک عجیب سا درد پیدا کر دیا ہے۔ یا اس نظم کو لیجئے جو پہلی صدی قبل مسیح میں کسی گمنام شاعر نے لکھی تھی:۔

سبز، بہت سبز

دریا کے کنارے اُگنے والی گھاس
گھنے، بہت گھنے
باغ میں لگے ہوئے بید کے درخت
اُداس، بہت اُداس
محل میں رہنے والی خاتون
سفید بہت سفید
کھڑکی میں بیٹھنے والی
حسین بہت حسین
اس کا پھول سا گلابی چہرہ
نازک بہت نازک
زرد ہاتھ جو وہ باہر نکالتی ہے۔
وہ کبھی ایک رقاصہ تھی
اب ایک سیلانی شخص کی بیوی ہے
سیلانی اسیر چلا گیا، مگر واپس نہ آیا۔
اکیلا ایک چوڑے پلنگ پر سونا کتنا مشکل ہے؛

{انیس قدیم چینی نظمیں
اوّل صدی قبل مسیح}

اس میں بھی دریا، گھاس، بید کے درخت، محل نقطۂ پس منظر کا کام دیتے ہیں، پیشِ نظر ایک غمگیں عورت کا دُکھ اور اُس کی حسرت ناک جوانی ہے۔ یا ایک اور نظم لیجیے جو شہنشاہ دو۔ ٹی نے دوسری صدی قبلِ مسیح میں اپنی محبوبہ کی وفات پر لکھی تھی:۔

اس کے ریشمی لہنگے کی آواز اب نہیں آتی
مرمریں فرش پر گرد جم گئی ہے
اس کا خالی کمرہ سرد اور خموش ہے
مُرجھائے ہوئے پتے دروازوں کے باہر آ آ کر ڈھیر ہو رہے ہیں
اس حسین محبوبہ کی یاد میں دلگیر
مَیں کس طرح اپنے دُکھ بھرے دِل کو آرام کے لئے کہوں؛

دو۔ ٹی
(قبل مسیح ۱۵۷-۸۷)

اس سے زیادہ مختصر اور مؤثر پیرایہ اور کیا ہو سکتا ہے ؛

ایک اور بات جو چینی شاعری میں قابلِ ذکر ہے وہ شاعر کا چھوٹی چھوٹی جزئیات سے ایک سماں باندھ دینے کا کمال ہے۔ یہ قوتِ تخلیق چینی شاعری کا خاص جوہر ہے۔ شاعر دو تین اشارات سے ایک کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ ضروری نہیں کہ اس کا بیان مفصّل یا مکمل ہو۔ وہ یہی چاہتا ہے کہ جذبہ کی تکمیل پڑھنے والے کا دل اور اس کے تاثرات کریں۔ عام طور پر چینی مصوّر بھی دو تین خطوط سے اور رنگ کے ہلکے یا گہرے دو تین دھبوں سے ایک تصویر وضع کر لیتا ہے۔ مثلاً چینی یا جاپانی شاعری اور مصوّری میں بہت مماثلت ہے۔ خصوصیت سے چونکہ جاپانی مصوّری کا آغاز چینی تاثرات سے ہوتا ہے۔ اس لئے دونوں کی مصوّری میں بہت ہی مشابہت ہے۔ مجھے ایک بہت مشہور جاپانی مصوّر ہانٹسو کی ایک تصویر یاد آتی ہے۔ اس میں مصوّر نے دو خمیدہ اور باریک سیاہ خطوط سے، جن میں کہیں کہیں ذرّات کی طرح کچھ باریک نقطے پڑے ہوئے ہیں، دو ایک ٹیلوں کا خاکہ کھینچا ہے۔ دونوں خطوں کے درمیان کچھ جگہ ہلکا سا نیلا رنگ کر دیا ہے۔ اس نیلی زمین میں کہیں کہیں باریک عمودی خطوط سے سرکنڈوں اور کچھ سیاہ دھبّوں سے درختوں کا اندازہ دے دیا ہے اور بس۔ تصویر کو دیکھ کر ہرگز یہ خیال نہیں ہوتا کہ اس میں کوئی کمی یا کوئی خامی ہے۔ تصویر مکمل ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو ٹیلوں کے درمیان دُور سے نظر آتا ہؤا ایک دلفریب زیرِ آب قطعہ ہے جس میں کچھ سرکنڈے اُگ رہے ہیں اور جس کے کناروں پر درخت کھڑے ہیں۔ اسی طرح چینی شاعر دو ایک باتوں سے ایک منظر قائم کر دیتا ہے اور ایک اشارہ کے ذریعہ سے ایک مکمل جذبہ اور اس کے متعلقہ احساسات دماغ میں پیدا کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر دو نظمیں ملاحظہ کیجئے :۔

وہ دروازہ سفید پانیوں کے سامنے کھُلتا تھا
لکڑی کے پُل کے قریب
یہاں ایک جوان عورت رہتی تھی
تنہا، بغیر کسی عاشق کے

چنگ۔ سی

اور :۔

میری پرورش پتھر کے قلعے میں ہوئی
میری کھڑکی قلعے کے مینار کی طرف کھُلتی تھی
مجھے قلعے میں خوبصورت نوجوان نظر آتے
جب وہ اندر یا باہر جاتے تو مجھے ہاتھوں سے اشارہ کیا کرتے

سانگ جِو
(چھٹی صدی)

ان دونوں نظموں میں شاعر نے مصور کے انداز کو استعمال کرتے ہوئے دو ایک نقوش سے ایک منظر قائم کرکے ایک سادہ سے بیان کے ذریعہ پہلی نظم میں ایک عورت کے رائگاں شباب کی مکمل تصویر کھینچی ہے۔ دوسری میں اشارۃً ایک جوان لڑکی کی بےکیف زندگی اور لاحاصل اشتیاق کو پوری طرح ہم پر روشن کر دیا ہے۔ اور خوبی یہ ہے کہ یہ اظہار خشک اور بے رنگ نہیں، بلکہ ان میں حقیقی شاعری کے تمام اوصاف درد و گداز، صداقت، عمق، جذباتی ماحول سب تاثرات موجود ہیں۔ البتہ ایک صنعت زیادہ ہے اور وہ اس کفایت اور اختصار سے ایک مکمل کیفیت کا اظہار ہے۔

ہمارے ہاں خواہ تغزل کو لغوی خواہ اصطلاحی معنوں میں لیا جائے، خواہ ادبی روایات کی رو سے اسے دیکھا جائے اس کی بنا محبت اور عشق پر ہے۔ مگر چینی شاعری تمام تر عشقیہ نہیں۔ اس میں ایسا ہی محترم جذبہ دوستی بھی ہے۔ دوستوں کے فراق میں وہ اتنے ہی محزون و ملول ہوتے ہیں جتنے ہمارے ہاں لوگ عشق میں۔ اگرچہ ہمارے شعرا نے غزل کو وہ وسعت دی ہے کہ اس میں وہ اپنے جذبات سے لے کر تمام کائنات کی حقیقت تک کو ایک ہی منزل میں بیان کر جاتے ہیں مثلاً غالب کی ایک غزل کے فقط چار شعر لیجئے:۔

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے	نالہ پابندِ نَے نہیں ہے
ہرچند ہر ایک شے میں تُو ہے	پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے
ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی	ہرچند کہیں کہ ہے، نہیں ہے
شادی سے گزر کہ غم نہ ہووے	اُردی جو نہ ہو تو دَے نہیں ہے

ان اشعار میں سوائے ایک خاص جذباتی فضا کے کوئی ربط نہیں ہے۔ اور ان میں شاعر نے ہستی، رُوح، کائنات، درد، موسیقی، خوشی، غم جیسے دقیق نفسیاتی مسائل کا علمی نقطۂ نگاہ سے نہیں، جذباتی پہلو سے ادراک کیا ہے۔ ان اشعار میں عقلی ادراک اور جذباتی احساس کا اس طور پر امتزاج ہے کہ حقیقت اور تاثیر نے اشعار کو بہت بلند بنا دیا ہے۔ بخلاف اس کے چینی نظموں میں خواہ وہ حسنِ فطرت کے متعلق ہوں، خواہ وہ دوستی، جُدائی، زندگی، شہرت یا بے ثباتی کے تاثرات کا اظہار ہوں، وحدتِ مضمون ضرور ملحوظ رکھی جائے گی۔ یہی بات انگریزی یا مغربی لرک میں بھی پائی جاتی ہے۔

چینی شاعر ایک وقت میں فقط ایک مضمون یا جذبے یا احساس پر قلم اُٹھاتا ہے۔ اور اس میں بھی اسے ترتیب و ریاضت کا بہت خیال رہتا ہے۔ وہ عام طور پر مضمون کو پوری طرح سے ادا نہیں کرتا بلکہ تھوڑے سے تھوڑے الفاظ میں اور اگر ہو سکے تو اشارۃً اسے سُجھانے کی کوشش کرتا ہے اور ہمارے تخیل میں ایک مکمل جذباتی فضا اور اثر پیدا کرنے کے لئے نقطہ ان الفاظ کو استعمال کرتا ہے جن سے وہ جذبہ بہتر سے بہتر طریق پر مگر اپنی تمام کیفیات کے ساتھ پڑھنے والے کو محسوس ہو سکے مثلاً

ایک نظم ملاحظہ کیجئے۔ لئوہُن نامی ایک جرنیل نے اپنی بیوی کو کسی اور لڑکی کے عشق میں پڑ کر اس کے میکے بھیج دیا۔ اس کی بیوی نے یہ نظم کہی :۔

ہلتارہ! ہمارے بستر کے سامنے لگے ہوئے پردے، ہلتارہ!
میں نے تجھے اس لئے لٹکایا تھا کہ تُو سورج کی روشنی کو ہمارے پاس نہ آنے دیگا
مَیں تجھے اپنے ساتھ لائی۔ جب میں اپنے باپ کے گھر سے آئی تھی
اب میں تجھے واپس وہیں لے جا رہی ہوں
میں تجھے تہ کر دُوں گی اور صندوق میں سیدھا لٹا دُونگی
پردے! کیا میں تجھے پھر کبھی نکالوں گی؛

(تیسری صدی)

یا پہلی صدی قبل مسیح کی یہ نظم لیجئے :۔

میرے محبوب کا گھر ہے
بڑے سمندر کے جنوب میں
مَیں اس کے لئے کیا تحفہ بھیجوں؛
دو موتی اور سیپ کی بنی ہوئی کنگھی
مَیں سنگِ سبز کے ڈبے میں یہ چیزیں اسے بھیجوں گی۔
وہ مجھے بتاتے ہیں، میرا محبوب باوفا نہیں
وُہ کہتے ہیں اس نے میرا ڈبہ زمین پر دے مارا
زمین پر دے مارا اور اسے جلا دیا
اور اس کی راکھ ہواؤں میں بکھیر دی
اس دن سے لے کر قیامت تک
مجھے اس کا خیال نہ کرنا ہوگا!
پھر کبھی اسے یاد نہ کرنا ہوگا! +
مُرغ بانگ دے رہے ہیں،
کُتے بھونک رہے ہیں؛

میرے بھائی اور میری بھاوج کو سب کچھ جلد ہی معلوم ہو جائے گا۔

خزاں کی ہوا چل رہی ہے

صبح کی ہوا ٹھنڈی سانسیں لے رہی ہے

ایک لمحہ میں سورج مشرق سے نکل آئے گا

اور پھر اسے بھی معلوم ہو جائے گا!

ایک نوخیز لڑکی کے لطیف جذبات کو کس نزاکت سے بیان کیا ہے!

یا ایک اور نظم دیکھئے:-

خزاں کی راتوں میں جب پتلے کا جاڑا ہوتا ہے

میں ہاتھ میں بربط لیے باہر جا کر آوارہ پھرنے لگتا ہوں

اس وقت میرا دل تمہاری یاد میں روتا ہے

لوگ سمجھتے ہیں، یہ بربط کے نغموں کی آواز ہے!

جب صنوبر کا پھل گر گر کر پہاڑیوں پر بکھرتا ہے

کیا تم میرے خوابوں کو جگا رہی ہوتی ہو؟

لی - پو

ان تینوں نظموں میں مختلف وقتوں کے شاعروں نے ایک ہی انداز میں اپنے اپنے جذبہ کو مختصر سے مختصر طریقہ پر سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ کسی کا بیان مفصل نہیں، کسی نے جذبات کو استعمال نہیں کیا اور ہر ایک نے ہمارے ہی تخیل کی مدد سے ہمارے دل و دماغ میں اپنی نظم کی تکمیل کر دی ہے۔ یہ ہے شاعری کا کمال کہ شاعر دوغیر زبانوں کے قالب میں ڈھل کر بھی اپنی آواز اور اپنا جذبۂ دل ہم تک پہنچا دیتا ہے۔

چینی شاعر فطرت نگاری میں بھی اسی بداہت اور سادگی سے کام لیتا ہے۔ کسی منظر کا نقشہ لیجئے۔ محض پھیکے الفاظ ہی سے کسی سین کا خاکہ نہیں کھینچا ہوتا، بلکہ پُر اثر الفاظ سے اس نقش میں جان ڈالی ہوتی ہے۔ مثلاً شہنشاہ یانگ۔تی نے ساتویں صدی عیسوی میں، جب کہ چینی شاعری اپنے پہلے عروج کے دن پورے کر چکی تھی، یہ نظم لکھی تھی:-

شام کا وقت ہے اور دریا کی سطح ہموار اور نیم جان ہو چکی ہے۔

پھولوں کے دلفریب نظارے اب بھی دکھائی دے رہے ہیں

یکایک ایک لہر چاند کو بہا لے جاتی ہے:

اور ستارے کانپتے رہ جاتے ہیں۔ (یانگ۔تی)

یا ایک اور نظم لیجیے :۔

ایک کچھوا کنول کے پھول پر بیٹھا آرام کر رہا تھا
ایک پرندہ نئے کے پودوں اور جھاڑیوں میں گھونسلا بنا رہا تھا
کسی ملاح کی حسین لڑکی، چھوٹے سے ڈونگے میں بیٹھی سیر کر رہی تھی
جس کے گیت تیز بہتے ہوئے پانی پر فضا میں جذب ہو رہے تھے۔ لی۔پو

پہلی نظم میں شاعر نے فطرت کو خارجی پہلو سے محسوس کیا ہے۔ دوسری میں ہر چیز اس کے دل میں پیوست ہو کر اور اس کی دماغی کیفیات سے لبریز ہو کر ظاہر ہوئی ہے۔ مگر دونوں کس قدر شفاف ہیں! یا ان دو نظموں کو دیکھئے :۔

میں اپنے وطن کو واپس آیا
عمر نے میری کمر جھکا دی تھی
بال چاندی کی طرح سفید ہو چکے تھے
لیکن میرے خیالات اب بھی وہی تھے
افسوس میرے ہی بچوں نے مجھے نہ پہچانا
مسکرا کر پوچھنے لگے
"او پردیسی تم کہاں سے آئے ہو؟" ہوچی۔چانگ

دُوسری نظم یہ ہے :۔

تمہارے گھوڑے اور گاڑیاں چلی گئی ہیں
اور میں مغموم ہوں
اُس محبت کے لئے جسے میں کبھی نہیں بھول سکتی
دُور دراز ملکوں میں بسنے والے مسافر!
کاش میں تمہارا سایہ ہوتی
اگرچہ کبھی بادل کا سایہ مجھے تم سے دُور کر دیتا
لیکن سُورج کی تیز روشنی میں تو میں تمہارے ساتھ ہوتی!

کس قدر سادگی سے، کتنے لطیف انداز میں، کتنے صاف الفاظ کے ذریعے سے شاعر نے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے! دونوں نظموں میں جذباتی کثافت کا شائبہ تک نہیں۔ پہلی نظم میں درد ہے رِقّت نہیں، دوسری میں نزاکت حسّی ہے مگر ابتذال نہیں۔ دوسری نظم کو لکھتے ہوئے مجھے پنجابی زبان کے ایک دلکش گیت کا پہلا "بول" یاد آیا ہے۔ یہ گیت بھی کسی عورت ہی کا کہا ہوا ہے۔ جُدائی کے دن قریب ہیں۔ کہتی ہے: ؎

جے ٹُر چلیوں چپ کری بیٹھی ہر ٹل دیواں دُھوں
شالا سکھ وسّے اوہ دیسڑا جتھے مسافر توُں!

طوالت کے خوف سے میں لمبی نظموں کی مثالیں نہیں دے سکا۔ لیکن مجھے اُمید ہے کہ مذکورۂ بالا سطور سے آپ حضرات کو چینی شاعری سے کچھ دلچسپی ہوگئی ہوگی۔ میرے خیال میں فنّی لحاظ سے چینی شاعری دُنیا کی مہذب ترین شاعری میں سے ہے۔ لفظ مہذّب سے میری مُراد یہ ہے کہ چینی شاعر اپنے بیان میں کفایت اور ضبط سے کام لے کر فقط اتنا ہی کہتا ہے جس سے ایک ذہین سامع یا قاری کا دل، دماغ اور تخیّل، اس کے جذبہ کی ماہیت اور کیفیت کو پُوری طرح سمجھ لے۔ افراط اور غلو، دونوں اس شاعری میں آپ کو نہیں ملیں گے۔ سادہ تشبیہات کہیں کہیں استعمال ہوتی ہیں مگر دیگر صنائع و بدائع سے کامل احتراز ہوتا ہے۔ چینی شاعر فطرت کی طرف سے کبھی بے خبر نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ہمارے ہاں کے شاعر، مگر مغربیوں کی طرح وہ فطرت میں کسی قسم کی رُوحانیت کا متلاشی بھی نہیں ہوتا۔ فطرت اس کے لئے کوئی غیر یا اجنبی چیز نہیں۔ وہ اس کی زندگی کا ایک جز ہے، اسی لئے وہ اس کے ہر جذبہ میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔

ایک اور بات جس کے متعلق مَیں پہلے بھی اشارہ کر آیا ہوں، قابلِ ذکر ہے۔ وہ یہ کہ عشق کے علاوہ دوستی کا جذبہ، چینی شاعری میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ مثلاً ایک نظم ملاحظہ فرمایئے، پہلی صدی قبل مسیح میں لکھی گئی تھی:۔

شنگ یا!
مَیں تمہارا دوست بننا چاہتا ہوں
ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، بغیر شکست اور زوال کے
جب سب پہاڑیاں میدان بن جائیں گی
اور سب دریا سُوکھ جائیں گے
اور جب سردیوں میں بادل چمکنے اور گرجنے لگیں گے
اور گرمیوں میں بارشیں اور برفباریاں ہوں گی

جب آسمان اور زمین مل جائیں گے

اس وقت سے پہلے میں تم سے جدا نہیں ہوں گا (پہلی صدی قبل مسیح)

زندگی کی کشاکش آدمی کو کہیں سے کہیں لے جاتی ہے، اس لئے دوستوں کی جدائی اور ملاقات کے تاثرات سے چینی شاعری کا کوئی دور خالی نہیں۔ اس کی بڑی وجہ چین کا تمدن ہے۔ جہاں مردوں کا صنفِ نازک سے تعلق محض ازدواجی زندگی تک محدود تھا۔ اس لئے ان کے تعلقات خواہ وہ سماجی ہوں، خواہ علمی اور ادبی، مردوں ہی سے ہوتے تھے اور ان تعلقات کی وہ لوگ بہت قدر کرتے تھے۔ مگر اس سے یہ مطلب نہیں لینا چاہئے کہ چینی شاعری کا رجحان اسی طرف رہا ہے۔ چینی شاعر دُنیا اور فطرت کی ہر خوبصورت چیز سے متاثر ہو کر اپنے جذبات کی حسین سے حسین تشکیل کر دیتا ہے۔ صداقت اور سادگی اس کے کلام کا جوہر ہیں۔ اس کے احساسات سے پڑھنے والے کا دل شگفتہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک آخری نظم ملاحظہ فرمایئے۔ سُوما سُنگ جو ایک جوان شاعر بیماری کی وجہ سے درباری ملازمت سے علیحدہ ہو گیا۔ ایک دن چو۔ وین چُن ایک امیر کی لڑکی نے اُسے اپنے باپ کے ہاں کسی تقریب پر شعر گاتے سُنا۔ اسی رات وہ دونوں وہاں سے بھاگ نکلے، اور اُنھوں نے کہیں اور جا کر ایک چھوٹی سی شراب کی دُکان کھول لی۔ کچھ عرصہ کے بعد سُنگ جو اپنے شعروں کی وجہ سے مشہور ہو گیا اور اسے دولت کی ہوس ہو گئی۔ وہ اپنی نظموں کو امیرزادیوں کے پاس بیچ دیتا، آخر ایک دن اس نے شہر "مولنگ" کی چند خواتین کو تحفے بھیجے تاکہ اسے ایک خوبصورت کنیز حاصل ہو جائے۔ اس بات سے دِل برداشتہ ہو کر اس کی سابق معشوقہ چو وین چُن نے یہ نظم لکھی۔ یہ واقعہ پہلی صدی قبل مسیح کا ہے۔ اس کا عنوان ہے "سفید بالوں کا گیت":-

ہماری محبت پاک تھی

جیسی پہاڑوں پر بچھی ہوئی برف

اس چاند کی طرح سفید

جو بادلوں سے گھرا ہو +

لوگ مجھ سے کہتے ہیں

تمہارا دِل اب میرا نہیں رہا

اِسی لئے میں آئی ہوں

کہ ہم اس رشتہ کو توڑ دیں +

آج ہم شراب کا ایک پیالہ اکٹھے پئیں گے

کل ہم جُدا ہو جائیں گے

نہر کے پاس

اس کے کنارے کنارے چلتے ہوئے

جہاں اس کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں۔

مشرق اور مغرب کی طرف +

افسوس! افسوس!

صد افسوس!

اسی طرح لڑکی کے لئے رونا ہوتا ہے

جب اس کی شادی ہو جائے

اور اسے ایسا سچا مرد نہ ملے

جو اس کے ساتھ رہے

یہاں تک کہ اس کے بال سفید ہو جائیں

یوں - ڈین چن

آخر میں فقط دو ایک جملے اور کہوں گا۔ ہمارے نوجوان شعراء کے احساسات میں، شاید ہماری معاشرت یا ہماری زندگی میں اچھے مواقع کی کمی کی وجہ سے یا شاید حسرت و یاس کی برودت کے سبب ایک قسم کا جمود پیدا ہو جاتا ہے جسے وہ رنگین اور خمار آگیں الفاظ سے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں، بلکہ اکثر اوقات وہ اپنے الفاظ کی رعنائی یا اشعار کے صوری حسن سے خود ہی مرعوب ہو جاتے ہیں، برعکس اس کے چینی شاعر احساس کی سادگی سے، اگر وہ کسی دلی کیفیت کا نتیجہ ہو، نہیں شرماتا۔ اس لئے اس کا بیان بھی سادہ، بے تکلف اور نکھرا ہوا ہوتا ہے —— اچھا ہو، اگر چینی شاعر کی یہ صفت ہمارے نوجوان شعراء میں آجائے۔

سید فیاض محمود

مقبرۂ شیخ چلّی پر

مشہور تاریخی مقام کورکشیتر میں ایک مقبرہ ہے جو شیخ چلّی کے مقبرے کے نام سے مشہور ہے۔ میں نے یہ دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی کہ آیا یہ شیخ چلّی وہی بزرگ ہیں جن کا نام لطائف وظرائف میں ضرب المثل ہے یا کوئی اور شیخ چلّی تھے جن کا مرقد عقیدت مندوں کی زیارت گاہ ہے۔ بہرحال لطفِ شعری کے لئے میں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ یہ وہی مشہورِ زمانہ فرد ہیں۔

ھادی

یہ بوسیدہ عمارت یادگارِ شیخ چلّی ہے — نشانِ بے نشاناں یہ مزارِ شیخ چلّی ہے

ہم اب تک یہ سمجھتے تھے کہ یہ دلچسپ شخصیت — فقط افسانہ گویوں کے تخیّل کی ہے اک جدّت

مگر اس مقبرے کو دیکھ کر ثابت ہوا ہم پر — کہ تھی جلوہ نما وہ فی الحقیقت روئے عالم پر

وہ لطف انگیز قصّے جن سے ہی منسوب نام اُس کا — وہ دلکش کارنامے جن کے سر ہے دوام اُس کا

ہوئے تھے وہ بساطِ دہر پر سچ مچ عیاں اک دن — بنے تھے باعثِ دلچسپئ اہلِ جہاں اک دن

ادا فہمی نے دُنیا کی دیا ہے یہ صلا اُس کو — بنا کر اُس کا مرقد غیر فانی کر دیا اُس کو

مگر اُس زندہ دل نے بھی غضب کی داد دی اسکی — نظیر اُس کے لطیفوں میں بھی مل سکتی نہیں جسکی

کہ مر جانے پہ رُتبہ دے دیا اُس کو ولایت کا — نرالا کس قدر ہے اعتراف اُس کی ظرافت کا

ستم کا یہ لطیفہ ہے غضب کا یہ تماشا ہے — کہ مرقد شیخ چلّی کا زیارت گاہِ دُنیا ہے!

یہاں انبوہ در انبوہ اب تک لوگ آتے ہیں، — چڑھاوے آ کے تربت پر عقیدت کے چڑھاتے ہیں

ادب اے دل نہیں ہے یہ مقامِ خندۂ بےجا
تو اس مردِ یگانہ کی حقیقت کو نہیں سمجھا

تجھے افسانہ گویوں نے غلط نقشہ دکھایا ہے
اُسے سامانِ تفریح و تفنّن کا بنایا ہے

حقیقت میں وہ شاہنشاہِ اقلیمِ تخیّل تھا
کہ جس کی ہمّتِ عالی کے آگے ہیچ تھی دُنیا

یہ زنداں خانۂ اسباب تھا ناسازگار اُس کو
یہ جھگڑے علّت و معلول کے تھے ناگوار اُس کو

وُہ ٹھکراتا تھا منطق کو سرِ پائے تغافل سے
بجائے عقل کے وہ کام لیتا تھا تخیّل سے

جہاں اُس کا تخیّل اُس کو لیجاتا وہ جاتا تھا
مدد سے اُس کی دُنیا میں نئی اپنی بناتا تھا

وُہ دُنیائیں کہ جن میں خواہشوں کو کامرانی تھی
وُہ دُنیائیں کہ جن میں زیست یکسر شادمانی تھی

جو سچ پوچھو تو اُس کی زندگی تھی رشک کے قابل
اور اُس کے سامنے ہے زیست اپنی سعیِ لاحاصل

خوشی کی جستجو میں آدمی پھرتا ہے سرگرداں
مگر ہے یہ سعادت مبدءِ فیّاض کا احساں

کہ ڈھونڈے سے کبھی دُنیا میں حاصل ہو نہیں سکتی
تلاشِ راحتِ دل راحتِ دل ہو نہیں سکتی

سمجھتے ہیں جنہیں دُنیا کے عاقل جاہل و ناداں
وہ اپنے جہل و نادانی میں اُن سے بڑھ کے ہیں شاداں

زمانے بھر کی حکمت سے ہے قلبِ شادماں بہتر
ہے داناؤں کی دوزخ سے بہشتِ ابلہاں بہتر

محمد ہادی حسین

(آئی۔سی۔ایس۔ سابق اڈیٹر ہزار داستان لاہور)

مَحبّت کا پہلا مظاہرہ

اے شریکِ زندگی اے طلعت افروزِ حیات
میرے حق میں تیرا جلوہ عشرت اندوزِ حیات

تیرا ہر انداز کیف آور پیامِ ذوق ہے
ہاں تجھی سے مطمئن میری نگاہِ شوق ہے

تُو جہانِ حسن، میں ناظر جہانِ حُسن کا
دل بڑھا اے حُور اپنے رازدانِ حُسن کا

اپنے کنگن دیکھتی بیٹھی ہے اب جس ناز سے
کاش اِدھر بھی دیکھ لیتی تُو اُسی انداز سے

تیری ان نیچی نگاہوں کی قسم اے دلنواز
تیرے ہی آگے جھکے گا اب مرا فرقِ نیاز

یہ تری شرمیلی آنکھیں ہیں نشیلی کس قدر
ہے تخیل حُورِ عیں کا تیرے ہی زیرِ اثر

پاک ہر اِک عیب سے دامن ترا اے مہ جمال
تیرے اِس معصوم جلوہ پر فدا حُسنِ ہلال

یہ "سراپا" میرے ذوقِ دید کا معیار ہے
ہاں، یہی پروردگارِ حُسن کا شہکار ہے

نازشِ حُسن آفریں کا راز ہے تیرا جمال
جس کا دِل قائل ہے وہ اعجاز ہے تیرا جمال

تیری خوش وضعی سے قائم اعتبارِ حُسن ہے
تیرے دلکش رنگ سے رنگیں بہارِ حُسن ہے

مجھ کو تیرے حُسن نے سمجھائے اسرارِ نیاز
تیری صُورت سے عیاں میری محبت کا ہے راز

جانتا ہوں میں جو تجھ کو حاصلِ کشتِ حیات
ذوقِ فطری پیش کر دیتا ہے ساری کائنات

کائناتِ آرزُو کی جان ہے تیری نمُود
اِس "عروسی شان" سے پاتا ہوں میں ذوقِ شہود

میرے دِل میں چٹکیاں لے کیوں نہ تیرا لحاظ
ہے تجھے بھی میری جاں میری محبت کا لحاظ

نیند کے آتے ہیں جھونکے پھر بھی تُو ہشیار ہے!
مانعِ خواب آج میرا طالعِ بیدار ہے

علی منظور حیدر آبادی

جاپان کے متعلق برطانی حکمتِ عملی

ایک سال سے زیادہ عرصہ ہوچکا ہے کہ جاپان نے چین پر حملہ کیا تھا۔ اس وقت سے جاپان قتل وغارت گری میں سرگرمی سے مصروف ہے۔ دُنیا حیران ہے کہ یہ چھوٹا سا ملک جو پچاس سال قبل بالکل "غیر متمدن" تھا۔ آج ظلم وستم اور ہوسِ ملک گیری میں "متمدن" ممالک کے کس قدر قریب ہے۔ بلکہ ان سے دوچار قدم آگے نظر آرہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خون آشام طاقت جس کے مظاہرے جاپان چین میں کر رہا ہے اس نے "کُن" کہہ کر پیدا نہیں کی۔ یقیناً کچھ حالات و اسباب کچھ تاریخی واقعات ضرور ہوں گے جو اس طاقت کا موجب بنے۔ جنگِ عظیم کے بعد ۱۹۳۱ء سے چین پر جاپانی حملوں کا دُوسرا دَور شروع ہوتا ہے۔ اس سال سے یہ لڑائی تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد جاری رہتی ہے۔ اس سات سال کے عرصے میں جاپان منچوکوؤ، جیہول، اندرونی منگولیا اور شانسی کو فتح کرچکا ہے۔ شمالی چین کے کئی صُوبوں پر اسے عسکری اقتدار حاصل ہے۔ اس مفتوحہ علاقے کا رقبہ انگلستان، فرانس، جرمنی، اٹلی اور اسپین کے مجموعی رقبہ سے کہیں زیادہ ہے۔ اس علاقے کی آبادی دس کروڑ ہے۔ اب جاپان بیرونی منگولیا فتح کرکے سوویٹ روس پر حملے کرنے کے منصوبے باندھ رہا ہے۔ اٹلی جرمنی اور جاپان کے درمیان جو "معاہدۂ ثلاثہ" ہوا ہے وہ اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

جاپان کی اس طاقت اور قوت کی سب سے بڑی وجہ برطانیہ کی وہ حمایت ہے جو ۱۸۹۴ء سے ۱۹۳۶ء تک یعنی اس چینی جنگ سے پہلے ہمیشہ جاپان کو حاصل رہی۔ اس کے علاوہ اور وجوہ بھی ہیں مثلاً جاپان کی فاشی عسکری حکومت جس کا اصل اصُول ہی قتل وغارت گری ہے۔ (۲) جاپان کی طبقہ وارانہ کش مکش (۳) چین کی وسعت اور زرخیزی جس پر ہمیشہ جاپان کی للچائی نظریں رہتی ہیں۔ مگر یہ تینوں اسباب سب سے اہم اور سب سے قدیم سبب یعنی برطانیہ کی حمایت کے پیدا کردہ ہیں۔ آج برطانیہ کی اس حمایت کی مختصر تاریخ بیان کی جائے گی۔

اُنیسویں صدی تک دولتِ برطانیہ کو جو "ملکۂ بحر" کہلاتی تھی مشرقِ بعید میں پورا پُورا اقتصادی اقتدار حاصل تھا اور چین پر تو انگریز بے طرح حاوی تھے جیسا کہ افیون کی لڑائیاں ہمیں بتاتی ہیں + ہانگ کانگ پر انگریزوں کا قبضہ تھا اور یہی برطانوی درآمد کی سب سے بڑی بندرگاہ تھی۔ بین الاقوامی بستی (International Settlement) بھی انگریزوں ہی کی نگرانی میں تھی اور دوسرے ممالک بھی ان کے توسّل سے چین میں تھوڑی بہت تجارت کر لیتے تھے

مگر تجارت کا بڑا حصّہ انگریزوں ہی کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے علاوہ ریلوں، بنکوں اور صنعت و حرفت کے تمام کارخانوں کے مالک عموماً انگریز ہی تھے۔

اُنیسویں صدی کا اختتام تھا۔ دوسری قومیں (خصوصاً روسی، جرمن اور امریکن) بھی صنعت کے میدان میں آ گئی تھیں۔ شہنشاہیتوں کے اندرونی اختلافات اپنے لئے نوآبادیات یعنی کٹ مرنے کے لئے نئی رزم گاہیں تلاش کر رہے تھے۔ امریکہ نے جزائرِ فلپائن فتح کر لئے تھے اور بحرالکاہل پر اپنا اقتدار قائم کرنے کی فکر میں تھا۔ جاپان نے ۱۸۹۰ء میں چین سے خلیج کیچو مستعار لی تھی۔ روس نے پورٹ آرتھر اور فرانس نے خلیج وانگ چاؤ چینی حکومت سے حاصل کر لی تھی۔ ادھر یہ نئی شہنشاہیت پسند قومیں انگریزی شہنشاہیت سے چین میں "صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے" کا اصول منوانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اُدھر یورپ میں جرمن شہنشاہی برطانوی شہنشاہی کے لئے بحیرۂ شمالی (North Sea) میں ایک مدمقابل بن رہی تھی۔ واقعات کی رفتار نے برطانیہ پر یہ حقیقت بالکل واضح کر دی تھی کہ اسے مشرق و مغرب میں بہت سخت حریفوں کا مقابلہ کرنا ہے اور مغربی حریف چونکہ گھر کے قریب ہے اس لئے اس کا سدِّباب سب سے زیادہ ضروری ہے اور ساتھ ہی اسے مشرقِ بعید خصوصاً چین میں بھی ہینگ پھنکڑی لگے بغیر اپنی "چودھرات" برقرار رکھنی ہے۔ اس وقت اور اس صورتِ حالات میں اُس نے جاپان کے ساتھ رابطۂ اتحاد پیدا کرنے کا "خوشگوار" فرض انجام دیا۔ اس زمانے میں جاپان اگرچہ ترقی کر رہا تھا مگر ابھی تک مشرق کی سیاسیات میں بہت ہی ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔ اور برطانوی شہنشاہیت پسندوں کو پورا یقین تھا کہ اگر جاپان کی پیٹھ ٹھونک دی گئی اور اسے برطانیہ نے اسلحۂ جنگ سے مسلح کر دیا تو وہ برطانیہ کا ہمیشہ ممنون رہیگا۔ کٹ پتلی بن کر اُن کے اشاروں پر چلے گا اور ساتھ ہی امریکن اور روسی شہنشاہی کے لئے زبردست حریف کی صورت اختیار کر لے گا اور اُن کی اُبھرتی ہوئی طاقت کی خوب روک تھام کر لے گا۔

ان خیالات کو پیشِ نظر رکھ کر ۱۸۹۴ء میں برطانیہ نے انگریزی جاپانی معاہدہ کیا جس کی رو سے اس نے جاپانی بحری طاقت کو مستحکم اور مضبوط بنانے کا وعدہ کیا۔ اس کے پندرہ ہی دن بعد اس معاہدے پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔

۱۹۰۲ء میں ایک انگریزی جاپانی معاہدہ ہوا جس میں دونوں ملکوں نے اپنے تعلقات زیادہ خوش آیند اور استوار بنانے کا وعدہ کیا۔ برطانیہ کے اس دستِ شفقت نے جاپان کا حوصلہ اتنا بڑھا دیا کہ اس نے اسی سال کوریا پر حملہ کر کے اسے اپنے قبضے میں لے لیا۔ جرمنی، امریکہ، فرانس اور روس نے متفق ہو کر (برطانیہ ان سے الگ رہا) جاپان کو کوریا پر سے قبضہ اُٹھا لینے کے لئے مجبور کیا اور جاپان نے مجبوراً کوریا کو چھوڑ دیا۔

---

[۱] ۱۹۱۳ء تک چین کی درآمد کا ½ حصّہ انگریزوں کے ہاتھ میں تھا، ⅙ حصّہ جاپان کے ہاتھ میں اور ⅙ حصّہ امریکہ کے ہاتھ میں تھا۔

۱۹۰۵ء میں ایک اور معاہدہ جاپان اور برطانیہ کے درمیان ہوا جس کے الفاظ بہت ہی گول مول تھے مگر جس کا مطلب سیدھے سادے الفاظ میں یہ تھا کہ دونوں جنگ کے موقع پر ایک دوسرے کی مدد کریں گے ظاہر ہے کہ جاپان برطانیہ کی کوئی مدد نہ کرسکتا تھا کیونکہ وہ خود بہت کمزور تھا اور اس سے محض برطانیہ کو جاپان کی امداد مقصود تھی۔ اسی سال جاپان اور روس کے درمیان جنگ ہوئی۔ جاپان کو فتح[1] ہوئی۔ کیونکہ برطانیہ اس کی پشت پناہ تھا۔ غرضکہ اس طرح جاپان برطانوی شہنشاہی کے سایۂ عافیت میں ترقی کرتا اور یہ بھی اپنے مذکورۂ بالا مقاصد کی تکمیل کے لیئے اس کی ہمت بڑھاتا رہا یہاں تک کہ جنگِ عظیم چھڑ گئی۔

جاپان نے اس جنگ سے فائدہ اٹھا کر ۱۹۱۵ء میں چین کی گورنمنٹ کے سامنے ۲۱ نکات پیش کیئے اور اس کے بعد ہی شانٹنگ، فوکین، منچوریا اور اندرونی منگولیا پر قابض ہوگیا مگر جنگِ عظیم کے بعد پیرس کانفرنس اور واشنگٹن کانفرنس میں امریکہ نے جاپان کو مجبور کیا کہ وہ مفتوحہ علاقے چین کو واپس کردے۔ جنگ کے بعد امریکن شہنشاہی دنیا پر چھائی ہوئی تھی اس لیئے جاپان کو بھی اس کی بات ماننی پڑی۔

جنگِ عظیم میں گو فتح انگریزی شہنشاہی کو ہوئی تھی مگر یہ فتح امریکن شہنشاہی کی بروقت امداد سے ہوئی تھی اور اب امریکہ ہی دنیائے سیاست کا باوا آدم تھا۔ اس کے خواب کی جو اس نے سیاسیاتِ عالم کی کرسئ صدارت پر جلوہ گر ہونے کے متعلق دیکھا تھا، اب تعبیر پوری ہو رہی تھی۔ وہ خطرہ جو جنگ سے پہلے برطانوی شہنشاہی کو روسی اور امریکن شہنشاہی سے چین میں لگا رہتا تھا اب کئی گنا طاقت سے نمودار ہو رہا تھا۔ ایک طرف امریکہ اپنی برتری ظاہر کرچکا تھا اور دوسری طرف روس میں اشتراکی حکومت قائم ہوچکی تھی جو یورپ کے شہنشاہیت پسندوں کی نظروں میں عموماً اور برطانیہ کی نظروں میں خصوصاً جو جنگ سے پہلے ان کا علمبردار رہ چکا تھا خار کی طرح کھٹک رہی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ خاص چین میں انقلابی تحریکِ آزادی قوت پکڑ رہی تھی۔ برطانوی شہنشاہی کی بقا اور موت کا سوال تھا اسے ان تینوں خطروں سے نبرد آزما ہونا تھا۔ ان کو کچلنا تھا۔

روس میں ابتدا میں اس نے رجعت پسندوں کی جو اشتراکی حکومت کے خلاف لڑ رہے تھے۔ روپے پیسے اور سامانِ جنگ سے خوب مدد کی مگر وہاں اسے ناکامی ہوئی۔ اس نے چین کی حکومت سے امریکن درآمد کے خلاف سازباز کرنا چاہا مگر وہاں بھی اس کی کوشش کوئی ثمر نہ لائی، امریکن درآمد کی مقدار چین میں بڑھتی رہی۔ اس نے دوسری شہنشاہیت پسند حکومتوں کے ساتھ مل کر چین کی انقلابی تحریک کو کچلنے کی کوشش کی مگر یہ تحریک ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۷ء تک کنگ منٹنگ پارٹی کی سرکردگی میں خوب پھولی پھلی اور اس نے ہر موقع پر رجعت پسند جرنیلوں کو شکست دی جو ممالک غیر کے سرمایہ داروں کی مدد

---

[1] اس وقت جاپان کی اس فتح نے ایشیا والوں کے دلوں میں ایک نیا جذبہ پیدا کردیا تھا اور سب کی آنکھیں جاپان کی طرف تھیں۔ مگر بعد کے حالات نے لوگوں کو بہت مایوس کیا اور اب جاپان کی بجائے سوویٹ روس سے اظہارِ عقیدت ہورہا ہے۔

سے ان کی مخالفت کر رہے تھے اور قریب تھا کہ شنگھائی پر علم آزادی بلند ہو کہ متوسط طبقہ جس کا لیڈر جنرل چیانگ کائی شک تھا عوام کی اکثریت کی طاقت سے ڈر کر رجعت پسندوں سے جا ملا اور تحریک کو کچل ڈالا۔

جنگ سے پیدا شدہ ان خطرات کے پیشِ نظر برطانیہ نے پھر اپنی پرانی پالیسی اختیار کی اور پھر جاپان کے ساتھ جس نے جنگ کے بعد مشرقی سیاسیات میں خاصی اہمیت حاصل کر لی تھی اپنے تعلقات خوشگوار اور پائدار بنائے تاکہ امریکن شہنشاہی اور روسی اشتراکیت کی روک تھام ہوتی رہے۔ مگر ۱۹۲۹ء تک امریکن شہنشاہی دُنیا پر حاوی تھی، اس لئے برطانوی شہنشاہی کو زیادہ کامیابی نہ ہوئی اور جاپان نے جہاں ذرا اُبھرنا چاہا، امریکہ نے فوراً ڈانٹ کر ڈرا دیا۔ ۱۹۲۹ء میں وہ اقتصادی زلزلہ آیا جس نے امریکہ کو خصوصاً اور یورپ کو عموماً بہت شدید نقصان پہنچایا۔

جنگ عظیم کے بعد یورپ کے اکثر ملکوں نے امریکہ سے قرضہ لے کر اپنی صنعت وحرفت کو فروغ دیا تھا۔ صنعت وحرفت کے تمام آلات وہ امریکہ ہی سے خریدتے تھے۔ یہ حالت جنگ کے بعد ۱۹۲۹ء تک رہی۔ اس زمانے میں امریکن صنعت و حرفت خوب زوروں پر تھی اور وہاں اقتصادی خوشحالی کا دَور دورہ تھا۔ مگر اب وہ وقت آیا کہ ہر ملک میں کارخانے خوب کھل چکے تھے۔ اور ہر ملک تجارتی پیمانے پر چیزیں بنا رہا تھا اور اس بات کی کوشش میں تھا کہ ممالکِ غیر میں اس کا بنایا ہوا مال فروخت ہو، فروخت کرنے والے زیادہ تھے اور خریدار کم۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ کسا دبازاری شروع ہو گئی۔ ہزاروں کارخانے بند ہو گئے۔ لاکھوں مزدور بے کار ہو گئے۔ اقتصادی پژمُردگی چاروں طرف چھا گئی۔ اِدھر یہ حالت اور اُدھر امریکہ کے سود خوار اپنا قرضہ وصول کرنا چاہتے تھے، وہاں جواب یہ تھا کہ قرضہ اسی صورت میں ادا ہو سکتا ہے جب ہمارے ملک میں امریکن مال کی درآمد کم ہو اور امریکہ میں ہمارے ملک کا مال زیادہ خریدا جائے۔ یہ قطعی ناممکن تھا کہ امریکہ میں درآمد کی مقدار بڑھ جائے۔ لہٰذا ان ممالک نے اپنے ملک میں امریکن درآمد کم کر دی۔ اب امریکہ کے سرمایہ کو زوال آیا۔ اس کے اس انحطاط نے اس کی قدر سیاسیات عالم میں بھی بہت کم کر دی۔

جاپان بھی اس زریں موقع کی تلاش میں تھا اس نے ۱۹۳۱ء میں منچوریا پر حملہ کر دیا۔ امریکہ نے چاہا کہ اسے ہیں ڈانٹے مگر یہ اکیلا لڑنے سے گھبراتا تھا، اس نے مجلسِ اقوام میں جاپان کی اس دست درازی کے خلاف کوئی متحدہ اقدام کرنے پر زور دیا مگر سر جان سائمن نے جو برطانیہ کے نمائندے تھے اس کی شدید مخالفت کی اور جاپان کا ساتھ دیا۔ لارڈ لٹن[1] نے برطانیہ کے اس رویہ پر ان الفاظ میں افسوس کا اظہار کیا ہے: "ریاست ہائے متحدہ نے اپنا دستِ تعاون ہماری طرف بڑھایا مگر افسوس ہے کہ ہم نے اس سے بے رُخی برتی۔ ہماری گورنمنٹ کا یہ سکوت اس کی افسوسناک کمزوری ہے" مگر شاید انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ یہ بے رُخی برطانوی شہنشاہی کے مفاد کے عین مطابق تھی۔

[1] لارڈ لٹن مجلسِ اقوام کے اس تحقیقاتی کمیشن کے صدر تھے جو منچوریا میں تحقیقات کرنے اسی سال گیا تھا۔

۱۹۳۳ء میں جاپان نے جیہول فتح کرلیا اور مجلس اقوام سے مستعفی ہوگیا۔

۱۹۳۴ء میں جاپان نے یہ اعلان کیا کہ واشنگٹن کا "خلافِ عدل" عہدنامہ ختم ہوچکا ہے۔ یورپ اور امریکہ چین کے حالات اور یہاں کے باشندوں کی روایات سے قطعی ناواقف ہیں اس لئے انہیں کوئی حق چین کے معاملات میں دخل دینے کا نہیں پہنچتا اس اعلان کو سُن کر امریکہ نے پھر برطانیہ سے کہا کہ آؤ مل کر اس "حریفِ گرم گفتار" کی زبان بندی کردیں مگر وہاں جوابِ خاموشی تھا۔ برطانیہ دل میں خوش ہو رہا تھا کہ اب چین میں امریکن شہنشاہی کی شکست اور اس کی فتح یقینی ہے، اسے یقین تھا کہ جاپان اسے کبھی دھوکا نہ دے گا۔ اب وہ وقت آیا جو برطانیہ کی ساری اُمیدوں کو سپردِ خاک کرنے والا تھا۔

۱۹۳۵ء میں برطانیہ نے "لتھ راس کا صنعتی مشن" جاپان بھیجا تاکہ جاپان کے مفتوحہ علاقے میں برطانیہ کے لئے تجارتی مراعات حاصل کرے مگر جاپان نے کسی قسم کے مراعات دینے سے انکار کردیا۔ برطانیہ اب بھی مایوس نہ ہؤا کیونکہ اُس کا خیال تھا کہ ممکن ہے صبح کا بھُولا شام کو گھر لَوٹ آئے۔ مگر یہاں تو بھولے ہوئے نے اپنے لئے ایک الگ شاندار گھر بنالیا تھا۔

۱۹۳۵-۳۶ء میں جاپان نے اندرونی منگولیا اور شمالی چین کا کافی حصّہ فتح کرلیا۔

۱۹۳۶ء میں جاپان میں غدر ہؤا۔ جاپانی سپاہیوں نے ان تمام افسروں کو مار ڈالا جو جاپانی فاشی عسکریت کے مخالف تھے اور ہروٹا کی وزارت قائم ہوئی جس نے اپنے اور چین کے درمیان سمجھوتے کی تین شرائط قرار دیں:-

(۱) چین اور جاپان کا اشتراک کمیونزم کے خلاف

(۲) چین یہ وعدہ کرے کہ کسی دوسرے ملک سے جاپان کی مرضی اور رائے کے بغیر کسی قسم کے تعلّقات پیدا نہ کریگا۔

(۳) چین جاپان اور مانچوکوؤ ایک واحد اقتصادی حلقہ قائم کریں گے۔

چین نے ان شرائط کو مسترد کردیا اور اس کے کچھ عرصے بعد جاپان نے چین پر حملہ کردیا۔ اب وہ صوبہ شانسی، بین الاقوامی لبتی، چین کا شمالی میدانِ اعظم اور وادی ینگ سی پر قابض ہوگیا ہے۔ جنگ برابر جاری ہے۔ جاپان بغیر کسی امتیاز کے ہر مُلک کو مفتوحہ علاقہ میں کسی قسم کی مراعات دینے سے انکار کرچکا ہے۔ برطانوی امپیریلزم زوال پر ہے۔ اور بین الاقوامی سیاسیات اس قدر پیچیدہ ہوچکی ہیں کہ برطانیہ جاپان سے نبرد آزما ہونے کی جراُت نہیں کرتا۔ اقبال نے شاید ایسے ہی موقع کے لئے کہا تھا ؎

آشنا ہم نے جسے لُطفِ تکلّم سے کیا
اُس حریفِ بے زباں کی گرم گفتاری بھی دیکھ

امریکہ برطانیہ سے نااُمید ہوکر ایک فیصلہ کُن جنگ کی تیاری میں مشغول ہے۔ فتح و شکست کا دارومدار تین باتوں

پر ہے :-

(۱) برطانیہ کا رویہ - اگر برطانیہ نے امریکہ اور روس کے ساتھ مِل کر کوئی مؤثر کارروائی کی تو جنگ یقیناً رُک جائیگی۔

(۲) چین کی تحریکِ آزادی - جس میں پھر نئی جان پڑ گئی ہے اگر اس نے عوام میں اعتماد حاصل کر لیا تو یقیناً جاپان کو شکست ہوگی۔

(۳) سوویٹ رُوس کی پالیسیؔ[1] کیونکہ روس کبھی یہ نہیں دیکھ سکتا کہ فاشی عسکری جاپان اس کے پہلو میں خنجر کی طرح پیوست ہو جائے۔

عبدالحفیظ

دُعا

اے خدا مجھے دانشمندوں اور نیکوں کی غلطیوں سے بچا!

(رابرٹ لیٹن)

زندگی

جوں جوں زندگی گزرتی جاتی ہے، مجھے دنیا کی جو چیز زیادہ پسندیدہ نظر آنے لگی ہے وہ اس کی محبّت، مہربانی اور حلم ہے ——— اس کی عقل، چالاکی، اور شوکتِ علم نہیں (گو علم کی شوکت مسلّمہ ہے) بلکہ چھوٹے بچوں کے قہقہے، دوستوں کی دوستی، سردیوں میں انگیٹھی کے گرد دھیمی دھیمی باتیں، پھولوں کا نظارہ اور گانے کی آوازیں ا

جان رچرڈ گرین

قدرت کا راگ

خدا ارگن بجا رہا ہے
اور ایک عظیم الشان راگ کی آواز دُور و نزدیک گونج رہی ہے
خدا ارگن بجا رہا ہے
اور اس ارگن کے کان موجیں مارتے ہوئے سمندر، طوفان زدہ دلدلیں اور گھنے جنگل ہیں۔
خدا ارگن بجا رہا ہے
اور ایک عظیم الشان راگ کی آواز دُور و نزدیک گونج رہی ہے۔

البرٹ سینٹ فورٹ

حامد علی خاں

---

[1] جونہی یہ مضمون ختم ہوا خبریں آرہی ہیں کہ روس اور جاپان میں مانچوکوؤ کی سرحد پر جنگ شروع ہو چکی ہے۔

یہ مضمون اگست ۱۹۳۸ء میں موصول ہوا - ہمایوں

کیلاش کنول

تراجم از پیامِ مشرق (حسبِ اجازت علامہ اقبال رح)

[illegible]

(۳۴)

سرِ کیقباد اکلیلِ جم خاک
کلیسا و بُتستان و حرم خاک
ولیکن من ندانم گوہرم چیست
نگاہم برتر از گردوں تنم خاک

ترجمہ

خاک ہوئے راون[1] دریودھن
خاک ہیں کعبہ اور مہابن
کون رتن ایسا جیون میں
آنکھ ہے عرش پہ خاک ہے یہ تن

[1] یعنی راون اور دریودھن کا غرور اور ان کی سب ٹیم ٹام۔
راون راجہ رام چندر کا دشمن تھا اور دریودھن سری کرشن جی کے ساتھیوں یعنی پانڈو کا حریف تھا۔ ایک کا تعلق رامائن سے، دوسرے کا مہا بھارت سے۔

(۳۵)

اگر در مشتِ خاکِ تو نہادند
دلِ صد پارۂ خونابہ بارے
ز ابرِ نو بہاراں گریہ آموز
کہ از اشکِ تو روید لالہ زارے

ترجمہ

پریت کے دکھ سی دُکھی ٹوٹا دِل
خاک میں تیری رکھے جو وہ الیشور
سیکھ لے برکھا[1] میگھ[2] سے رونا
بھر دیں یہ آنسو کنول[3] سے ساگر

[1] برکھا: برشگال۔ بارش کا موسم۔ [2] میگھ: ابر۔ بادل
[3] لالے میں داغِ عشق ہوتا ہے اور کنول میں پریم کے آنسو۔ فارسی اور ہندی دونوں زبانوں میں حسب مراتب یہ رعایتیں مستند حیثیت رکھتی ہیں۔

(۳۶)

دما دم نقش ہائے تازہ ریزد
بیک صورت قرارِ زندگی نیست
اگر امروز تو تصویرِ دوش است
بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

(ترجمہ)

پَل پَل، نئی نئی، ریکھائیں[1]
بیا کُل اِس جیون کو بنائیں
چِتر[2] جو کل کا ہے آج بھی تیرا
آگ نہ راکھ میں تیری پائیں

[1] نقوش [2] تصویر

(۳۷)

چو ذوقِ نغمہ ام در جلوہ آرد
قیامت افگنم در محفلِ خویش
چو می خواہم دمے خلوت بگیرم
جہاں را گم کنم اندر دلِ خویش

(ترجمہ)

اپنی سبھا میں ہوں ڈالتا ہلچل
دُھن جو کبھی سنگیت میں لاتی
چاہوں اکیلے رہن کو جو دم بھر
یہ دُنیا دل میں کھو جاتی

(۳۸)

چہ می پُرسی میانِ سینہ دل چیست
خرد چوں سوز پیدا کرد دل شُد
دل از ذوقِ تپش دل بود لیکن
چو یک دم از تپش اُفتاد گل شُد

(ترجمہ)

پُوچھتے کیا دِل تن میں کیا ہے
پریت سے گیان تپا تو بنا دِل
یہ دل اسی تپن تک دِل تھا
تج کے تپن مٹّی میں گیا مِل

(۸۶)

چہ گویم نکتۂ زشت و نکو چیست
زباں لرزد کہ معنی پیچ دار است
بروں از شاخ بینی خار و گُل را
دروںِ اُو نہ گُل پیدا نہ خار است

(ترجمہ)

بھید نہ پُوچھو بھلے بُرے کا
بھید کہَن سے کانپے بانی[1]
پھُول کے ساتھ نکلتے کانٹے
پیڑ کو سینچے ایک ہی پانی[2]

[1] بانی معنی زبان۔ [2] آخری بیت کا لفظی ترجمہ یہ ہے "پھُول اور کانٹے دِکھیں باہر سے۔ شاخ کے اندر پھُول نہ کانٹے"

---

(۱۰۸)

دِلا رمزِ حیات از غنچہ دریاب
حقیقت در مجازش بے حجاب است
زخاکِ تیرہ می روید و لیکن
نگاہش بر شعاعِ آفتاب است

(ترجمہ)

جیون بھید کلی بتلاوے
اپنے سرُوپ سے تتّو[1] دکھاوے
یوں تو کلی مٹّی سے اُپجے[2]
سُورج سے پر آنکھ مِلاوے

[1] تتّو معنی حقیقت۔ پڑھنے میں اسے "تت" کہیں گے۔ [2] اُپجے معنی نکلے۔ اُگے۔

مقبول احمد پوری

آ کہ دشتِ عشق خالی ہے جنونِ قیس سے   سعیِ پیہم سے نشانِ قیس پھر پیدا کریں
حُسن کے پندارِ باطل کو جنوں سے توڑ دیں   آ کہ سازِ زندگی میں پھر نوا پیدا کریں
آ پلٹ دیں کائناتِ زندگانی کا نظام
آ کہ بازارِ جنوں میں عقل کو رسوا کریں

مظفر حسین شمیم

صدائے بے نوا

دلِ مُردہ کو پھر پیامِ بقا دے   مری موت کو زندگانی بنا دے
مَیں اُس شمعِ ہستی کو خورشید سمجھا   کہ ہلکی سی اِک سانس جسکو بجھا دے
دلِ بدگماں میں نہ اُتریں گے جلوے   یہی ایک پردہ ہے اُس کو اُٹھا دے
مرے مُردہ ارماں ترے منتظر ہیں   تو ان سونے والوں کو اب تو جگا دے
مَیں تیرے لئے اِک دُعا کر رہا ہوں   یہ مقبول ہو مجھکو اتنی دُعا دے
سمجھتا ہوں تجھ کو مَیں اپنا مقدر   بنا دے مجھے یا سرے سے مٹا دے
بنا اپنا کعبہ تُو اِک آستاں کو
نہ ہر در پہ اے عرشؔ جا کر صدا دے

عرشؔ ملسیانی بی۔اے

غزل

ہر اشکِ یاس ہمدم ہے جانِ آرزو کی   تصویرِ حسرتِ دل بُوندیں مرے لہُو کی
مٹ مٹ کے بن رہی ہے دُنیائے دل خدایا   بن بن کے مٹ رہی ہے ہر شکل آرزُو کی
سب باعثِ محبت، سب کارسازیِ دل!   اِک خوابِ زندگی کا ہر شکل آرزُو کی
عہدِ وفا سے پہلے اَے کاش ہم سمجھتے   مشکل غمِ نظر کی، حسرت کی جستجُو کی
احساسِ نامُرادی، اے کاش تُو نہ ہوتا
دامانِ دل کو حاجت ہر وقت ہے رفُو کی!

"مسرُور منکر"

میر صاحب[1]

(ایک اشتراکی دوست کے نام)

میر صاحب کا پورا نام تو نہ پوچھئے خواہ مخواہ مجھ سے ہمیشہ کے لئے ناراض ہو جائیں گے البتہ اتنا ضرور بتائے دیتا ہوں کہ میر صاحب ہیں بہت بڑے آدمی! خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ بیوی ہے، بچے ہیں، موٹر ہے، کوٹھی ہے، بنک میں بھی دو چار لاکھ سے کیا کم جمع ہوگا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قسامِ ازل نے انہیں دردمند دل عطا کر رکھا ہے۔ اس دل میں سارے جہاں کا درد موجود ہے۔ کبھی میر صاحب غریبوں کے غم میں بے قرار ہیں تو کبھی انہیں مزدوروں کی ہمدردی کے باعث نیند نہیں آتی۔ ہم نے تو جب دیکھا انہیں غریبوں اور مزدوروں کی اصلاح کے خیال میں سرگرداں پایا۔

میر صاحب میرے پرانے دوست ہیں اور میرے حال پر بہت شفقت فرماتے ہیں۔ ہماری دوستی اکثر لوگوں کے لئے اچنبھے کی بات ہے۔ میر صاحب دو موٹروں کے مالک ہیں۔ میرے پاس ایک ٹوٹی پھوٹی بائیسکل ہے جس کے نہ گھنٹی ہے اور نہ بریکیں۔ میر صاحب شہر سے باہر ایک خوش وضع اور کشادہ کوٹھی میں رہتے ہیں۔ میرا مکان لاہور کی ایک نو آبادی میں واقع ہے اور ابھی تک بجلی کی روشنی سے محروم۔ پھر اسی پر بس نہیں میر صاحب ایک مشہور لیڈر ہیں اور مجھے محلے والے بھی نہیں جانتے۔ خود مجھے آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ میر صاحب مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہیں؛ اور سچ پوچھئے تو میں نے کبھی اس مسئلہ پر غور ہی نہیں کیا۔ میرا خیال ہے کہ میر صاحب ہر غریب آدمی کے حال پر اسی طرح شفقت فرماتے ہیں۔

مجھے سیاسیات سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں اور ہو بھی کیسے سکتی ہے؛ تیس روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے اور چھ گھنٹے روزانہ دفتر میں گھس گھس کرنی پڑتی ہے۔ والدین نے چھوٹی عمر میں شادی کر دی تھی۔ ہمارا گھر جامع مسجد کے قریب ہی تھا۔ مولوی صاحب ہر وعظ میں اس بات پر بہت زور دیا کرتے تھے کہ شادی کے بغیر ایمان ناقص رہتا ہے۔ اب والد صاحب ہمارے ایمان کی تکمیل کے درپے تھے اور والدہ کو یہ فکر دامنگیر تھی کہ مرنے سے پہلے اپنے لاڈلے کو دولہا بنا دیکھ لوں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے احتجاج کے باوجود ہمیں چچا کی لڑکی سے بیاہ دیا گیا۔ مولوی صاحب ایک اور مسئلہ بیان فرمایا کرتے تھے کہ قیامت کے دن رسولِ کریمؐ اس مسلمان سے بہت خوش ہوں گے جو اُمت کی تعداد میں اضافہ کرے گا۔ ہم تو مولوی صاحب کے کچھ زیادہ معتقد نہیں تھے البتہ والد صاحب کے نزدیک ان کا ہر ارشاد الہام کا درجہ رکھتا تھا۔ چنانچہ مولوی صاحب کے وعظ،

---

[1] روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ۔

والد صاحب کی خوش اعتقادی، والدہ کی دُعاؤں اور ہندوستانی دواخانے کی دواؤں کا یہ اثر ہے کہ آج ہم خدا کے فضل سے تین بچوں کے باپ ہیں اور ابھی ع آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟

خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ تذکرہ میر صاحب کا تھا اور ہم اپنی داستان لے بیٹھے۔ ہمارا مطلب صرف یہ تھا کہ ایک غریب آدمی سیاسیات میں دلچسپی لینے کے لئے وقت ہی نہیں نکال سکتا اور پھر یں تو یُوں بھی بدقسمتی واقع ہوا ہوں شادی سے پہلے تھوڑی بہت ذہانت اور زندہ دلی پائی جاتی تھی۔ وہ بیوی کے مہر میں ادا کر چکا ہوں۔ میری پارلیمنٹ میرا گھر ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ میں اس پارلیمنٹ کا رُکن چھوڑ دوٹر بھی نہیں ہوں۔ سپیکر، منسٹر، وہپ سب کچھ میری بیوی ہیں۔ البتہ میرے تین بچوں کو نامزد ارکان سمجھ لیجئے اور وہ بھی غیر سرکاری نہیں بلکہ سرکاری، نہ ہم ایجی ٹیشن کریں گے اور نہ ہمیں ذمہ دار حکومت عطا کی جائے گی۔ لیکن بایں ہمہ جب ہم میر صاحب کی خدمت میں جا پہنچتے ہیں تو زیادہ تو نہیں لیکن پارلیمنٹ میں سب سے پچھلے بنچ پر بیٹھنے والے ممبر ضرور بن جاتے ہیں۔ میر صاحب حقہ سامنے رکھ دُنیا بھر کے سیاسی معاملات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ مَیں کبھی ان کے مُنہ کی طرف دیکھتا ہوں اور کبھی ان کے صاف شفاف اور چمکدار حقے میں اپنا مُنہ دیکھ لیتا ہوں۔ بہت تیر مارا تو کبھی کبھار "جی ہاں" کہہ دیا۔

ایک دن میر صاحب بڑے مغموم نظر آرہے تھے۔ میں سمجھا بیگم صاحبہ کی طبیعت ناساز ہو گی اس لئے چپکا ہو رہا۔ بات یہ ہے کہ مَیں میر صاحب کے ہر معاملے میں دخل دے دیتا ہوں لیکن ان کی بیگم صاحبہ کے کسی معاملہ میں نہیں بولتا۔ خود میر صاحب بیگم صاحبہ سے بہت دبتے ہیں۔ آخر ہیں تو لیڈر ہی نا۔ مانا کہ انگریزی حکومت سے نہیں ڈرتے لیکن بیوی اور حکومت میں تو بہت فرق ہے۔ حکومت ناراض ہو تو اسے کلاس ملتی ہے۔ صبح چائے، انڈے اور "سٹیٹس مین"، دوپہر کو پُر تکلف لنچ۔ سہ پہر کو پھر چائے اور شام کو ڈنر۔ بیوی ناراض ہو تو میر صاحب کی چائے بند اور ہمارے پان موقوف۔ لیکن ہمارا اندازہ غلط نکلا۔ اُس دن میر صاحب مزدوروں کے غم میں گھل رہے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے:۔

"تم جانتے ہو کہ دنیا کا مظلوم ترین انسان کون ہے؟"

میں نے عرض کی "میں جسے تیس روپیہ ماہوار میں اپنے علاوہ ایک بیوی اور تین بچوں کے پیٹ کی دوزخ بھرنی پڑتی ہے۔"

کہنے لگے "بالکل غلط۔ تم میری بات ہی نہیں سمجھے۔ دُنیا کا مظلوم ترین انسان مزدور ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ بیگم صاحبہ کی طبیعت تو ناساز نہیں البتہ بیوی نے کسی بات پر میاں کی گوشمالی ضرور کی ہے۔ میں نے کہا "جی ہاں"

کہنے لگے "کچھ غور بھی کیا کہ کیوں یا یونہی جی ہاں کہہ دیا؟"

میں نے کہا "میر صاحب جب آپ ایسا عالم و فاضل یہ کہہ رہا ہے کہ مزدور دُنیا کا مظلوم ترین انسان ہے تو مجھے سوچنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

فرمانے لگے "لیکن کبھی کبھی اپنے دماغ سے بھی تو کام لیا کرو۔ جب تک ہندوستانیوں میں حریتِ فکر نہیں آئے گی ہندوستان آزاد نہیں ہوسکتا۔ یہاں یہ تو سیدھی سی بات ہے۔ اُمراء کے سربفلک اور عالیشان محل کون تیار کرتا ہے؟ مزدور۔ لیکن محل کی تکمیل کے بعد اسے کوئی ڈیوڑھی میں بھی قدم نہیں رکھنے دیتا۔ آخر یہ بے انصافی کیوں؟ یہ صریح ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟ سماج کے مظالم کی اس سے زیادہ شرمناک مثال اور کیا ہوگی؟"

اس وقت مجھے یہ خیال آیا کہ میر صاحب خود ایک عالیشان کوٹھی میں رہتے ہیں لیکن اگر ان مزدوروں میں سے جنہوں نے یہ کوٹھی بنائی تھی کوئی شامت کا مارا پھاٹک پر بھی آ نکلے تو اسے کسولی جانا پڑے کیونکہ ایسے لوگوں کی پیشوائی کے فرائض جو موٹر پر نہ آئیں یا انگریزی لباس میں ملبوس نہ ہوں میر صاحب نے اپنے کتے "جان" کے سپرد کر رکھے ہیں۔ اوّل اوّل ایک دو مرتبہ انہیں میری شرافت کے متعلق بھی شبہ پیدا ہو چلا تھا اور ایک دفعہ تو اُنھوں نے میری بوسیدہ اچکن سے مشقِ ناز بھی شروع فرمادی تھی مگر بزرگوں کے نیک اعمال آڑے آگئے اور میر صاحب ہماری امداد کو آنکلے۔ میں اس سلسلہ میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا مگر میں نے سوچا میر صاحب بڑے آدمی ہیں ان کی باتیں ہی جانیں۔ شاید اس میں بھی کوئی مصلحت ہو اس لئے میں نے کہا تو صرف یہ کہا:-

"بجا فرمایا آپ نے میر صاحب، واقعی اس سے بڑی بے انصافی اور کیا ہوسکتی ہے؟"

ایک دفعہ مقامی کاٹن مِل میں ہڑتال ہوگئی۔ مزدوروں کا مطالبہ یہ تھا کہ کام کے گھنٹے گھٹا دیئے جائیں اور اُجرت میں اضافہ کیا جائے۔ کارخانے کے مالکوں کو یہ شرائط منظور نہ تھیں۔ مزدوروں نے کام کرنے سے انکار کردیا۔ اس ہڑتال میں میر صاحب نے مزدوروں کی بہت امداد کی۔ سچ پوچھئے تو مزدوروں کے اصل قائد وہی تھے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے انہیں مِل کے پھاٹک پر پکٹنگ کرتے دیکھا ہے۔ آخر میں کارخانہ داروں کو جھکنا پڑا اور مزدوروں کی فتح ہوئی۔ ہاں اس سلسلہ میں مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آگیا۔ میر صاحب کا ڈرائیور رزا جانگلو تھا۔ اس نے ہڑتال میں مزدوروں کی فتح سے متاثر ہوکر میر صاحب کی غریب پروری کا ناجائز فائدہ اُٹھانا چاہا اور میر صاحب سے کہنے لگا بیس روپے ماہوار میں میرے بیوی بچوں کا گذارہ نہیں ہوسکتا۔ میری تنخواہ پچیس روپے کردیجئے۔ اور جب میر صاحب نے ذرا ڈانٹ بتائی تو اس نے انہیں ہڑتال کے حربے سے ڈرانا چاہا۔ میر صاحب نے اُسی وقت اُسے کوٹھی سے نکال باہر کیا۔ دو تین دن بعد اس کے پاس

درست ہو گئے۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ میر صاحب اسے معاف کر دیں اور دوبارہ ملازم رکھ لیں لیکن میر صاحب بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے کہ ایسے نکم ملازموں کے بھرے میں آجاتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے آزمودہ را آزمودن جہل است کے پیش نظر اسے دوبارہ ملازم نہ رکھا۔

میر صاحب گرمیوں میں ہمیشہ کشمیر چلے جاتے ہیں۔ ایک دفعہ ناک میں پھنسی نکل آئی تھی اس لئے وہ اس خیال سے سوئٹزرلینڈ چلے گئے تھے کہ گرمیاں بھی مزے سے گزر جائیں گی اور ناک کا اپریشن بھی ہو جائے گا۔ اچھے اچھے سرجن تو ہندوستان میں بھی مل جاتے ہیں لیکن آزاد ملکوں کے ڈاکٹروں کے ہاتھ میں جو شفا ہے وہ بیچارے غلام ہندوستانیوں کو کہاں نصیب۔ اس کے علاوہ سودیشی کی تحریک کو صرف کھدر تک ہی محدود رکھنا چاہیئے۔ اگر تعلیم اور طب کو بھی جغرافیائی حدود میں قید کر دیا جائے تو تہذیب کی ترقی رک جائے گی۔

ایک دفعہ میر صاحب کو زکام کی شکایت ہو گئی۔ میں نے پوچھا "میر صاحب کہیں آپ نے سینما کا دوسرا شو تو نہیں دیکھا؟"

کہنے لگے "میں سینما بہت کم جایا کرتا ہوں"۔

میں نے کہا "کیوں؟ آپ کے خیال میں سینما جانا معیوب ہے؟"

کہنے لگے "نہیں تو۔ البتہ جو چیز عوام کو میسر نہیں اس سے ہم کیوں فائدہ اٹھائیں؟"

بات تو ٹھیک تھی لیکن مجھے خیال آیا کہ بیچارے عوام کو تو موٹر چھوڑ تانگہ بھی میسر نہیں اور میر صاحب کے پاس دو موٹریں ہیں۔ آخر میں نے جرأت کر کے پوچھ ہی لیا۔

"میر صاحب اگر یہ بات ہے تو آپ موٹر پر کیوں سوار ہوتے ہیں۔ عوام کو تو یہ بھی میسر نہیں"۔

کہنے لگے "تم نرے بدھو ہی نکلے۔ ارے میاں موٹر تو میری ضروریاتِ زندگی میں سے ہے۔ اور سینما محض سامانِ تفریح ہے۔ موٹر سے وقت بچتا ہے اور میں اسے قوم کی خدمت میں صرف کر سکتا ہوں۔ سینما جانے سے وقت ضائع ہوتا ہے اور قوم کی حق تلفی ہوتی ہے"۔

جواب معقول تھا اس لئے میں خاموش ہو رہا۔

سینما کے تذکرے میں مجھے ایک اور واقعہ یاد آگیا ہے۔ ایک دفعہ میر صاحب مجھے اپنے ساتھ سینما لے گئے۔ انقلاب فرانس کی فلم تھی۔ میر صاحب باکس میں بیٹھے۔ میں چونی میں بیٹھنے والا اس دن یہ محسوس کر رہا تھا کہ مجھے ہفت اقلیم کی بادشاہت مل گئی ہے۔ میں ادھر ادھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا کہ کسی شناسا پر نظر پڑ جائے تو اشاروں

ہی اشاروں میں اُسے بتاؤں کہ دیکھو ہم کہاں بیٹھے ہیں۔ میر صاحب کہنے لگے :۔

" نچلے درجے میں بیٹھنے سے بچت تو ضرور ہو جاتی ہے لیکن یہ کفایت شعاری جھوٹی کفایت شعاری ہے ۔ کیونکہ نچلے درجے میں بیٹھنے سے آنکھیں خراب ہو جاتی ہیں"۔

" تصویر" واقعی بہت اچھی تھی ۔ مزدوروں پر اُمرائے فرانس کے زہرہ گداز مظالم کے مناظر بہت دردناک تھے جب " وقفہ" ہوا تو میں نے دیکھا کہ میر صاحب کی آنکھیں پُرنم ہیں اور رومال آنسوؤں سے تر ۔ اثر تو مجھ پر بھی ہوا تھا لیکن رونے کی وجہ میری سمجھ میں نہ آئی ۔ میر صاحب نے مجھ سے کہا :۔

" تم بہت سنگدل ہو ۔ تم اس غربت و افلاس سے متاثر نہیں ہوئے"۔

مَیں نے کہا " میر صاحب آپ نے یہ منظر صرف سینما کے پردے پر دیکھا ہے ۔ میں اس سے زیادہ تلخ مناظر ہر روز اپنے گرد و پیش دیکھتا ہوں ۔ دُور کیوں جائیے میں خود اسی افلاس اور غربت کا زخم خوردہ ہوں"۔

اتنے میں " تصویر" دوبارہ شروع ہو گئی اور ہمارا سلسلۂ گفتگو منقطع ہو گیا ۔ جب " تصویر" ختم ہو گئی اور ہم باہر نکلے تو موٹر پر سوار ہوتے وقت ایک بڑھیا نے میر صاحب کو گھیر لیا اور ایک پیسہ کا مطالبہ بڑی شدت سے شروع کر دیا ۔ میر صاحب نے اسے اس زور سے جھڑکا کہ بیچاری سہم گئی ۔ مجھے اس تضاد پر بہت تعجب ہوا ۔ میں نے کہا " میر صاحب ۔ یہ ہے افلاس کی جیتی جاگتی تصویر" میر صاحب کچھ کبیدہ خاطر ہو کر فرمانے لگے " ہمارا فرض یہ نہیں کہ ہم افلاس کی حوصلہ افزائی کریں ۔ ہم تو اس کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں ۔ اگر ہم برسرِ حکومت ہوتے تو ہمارے نزدیک سب سے بڑا جُرم افلاس ہوتا"۔

میں نے جی میں کہا " آپ کی حکومت پر کیا موقوف ہے سبھی حکومتوں کے نزدیک سب سے بڑا جُرم افلاس ہی ہے"۔

حمید نظامی

بڑے آدمی کی موت

اب زندگی کم شیریں اور موت کم تلخ ہو گئی ہے ۔

(تھیوڈور ہنزا کیلون کی موت پر)

حامد علی خاں

۲۵ جُون کی شام کے چند پُر اضطراب لمحات

(مجھے اس شام کو علامۂ اقبال مرحوم نوّر اللہ مرقدہٗ کے مزارِ اقدس کی زیارت سے مشرف ہونے کی سعادت نصیب ہوئی)

غضب غضب کہ وہ فطرت کا رازداں نہ رہا — ستم ستم کہ خودی کا فسانہ خواں نہ رہا
حذر حذر کہ قیامت کی ساعت آ پہنچی — سکُون و امن کہیں زیرِ آسماں نہ رہا
لُٹی متاعِ عزیز و یگانہ صد افسوس — رہا ہی کیا جو وہ سرتاجِ عارفاں نہ رہا
وہ داغ و حالی و غالب کا گھر ہُوا ویراں — وُہ آہ سعدی و رومی کا ہمزباں نہ رہا
ہے کارواں کا ہر اِک فرد آج خاک بسر — کہ کارواں میں کوئی میرِ کارواں نہ رہا
نشاطِ رُوح و قرارِ دلِ حزیں ہے کہاں — وہ انبساطِ نظر وہ سرورِ جاں نہ رہا
ہیں دیدۂ گل و لالہ سے اشکِ خوں جاری — دلِ چمن نہ رہا جانِ گلستاں نہ رہا

مجید سرد ہیں شعر و سخن کے ہنگامے
ادب کی بزم میں اقبالِ نکتہ داں نہ رہا

مجید لاہوری

آہ اقبال![1]

ہر دل ترے خیال کی مستی سے چُور ہے — اب عالمِ خیال میں تیرا ہی نُور ہے
اقبال! تیرے ذکر سے فارغ نہیں ہیں ہم — گو سچ یہ ہے کہ ہم سے کہیں اب تُو دُور ہے
نغموں سے تیرے زندہ ہُوا ہے دیارِ ہند — بانگِ درا نہیں ہے یہ آوازِ صُور ہے

اِقبال کا بدل نہیں بھارت میں بھارتی!
یہ قول ہر زبان پہ نزدیک و دُور ہے

رام کرشن بھارتی

[1] بزمِ اقبال کوئٹہ کے مشاعرہ میں یہ نظم پڑھی گئی۔

محفلِ ادب

اقبال علیہ الرحمۃ کے چند جواہر ریزے

(از جناب پروفیسر خواجہ عبدالحمید صاحب، لکچرار گورنمنٹ کالج، ملتان)

۱۹۲۶ء کے شروع میں ایک شام کو میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں بحیثیتِ مدیر کریسنٹ (Crescent) (رسالہ اسلامیہ کالج لاہور) حاضر ہوا، اور ملتجی ہوا کہ نئے سال کا پہلا نمبر نکلنا ہے۔ براہِ کرم کوئی پیغام یا ارشاد طلبہ کے لئے دیجئے تاکہ پہلے ورق پر اسے چھاپا جائے، فرمانے لگے مضمون لکھنے کا تو وقت نہیں البتہ یہ شعر چھاپ دو سہ

پشیماں شو اگر لعلے ز میراثِ پدر خواہی — کجا عیشِ برون آوردنِ لعلے کہ در سنگ است

میں نے اسے چھاپ دیا، اس سے بہتر پیغام مسلمان طلبہ کے لئے تو شاید ناممکن تھا،

۱۹۲۷ء یا ۱۹۲۸ء میں جب مسٹر منوہر لال وزیرِ تعلیم پنجاب تھے، تو مسلمانوں میں اپنی حق تلفی کا بہت چرچا تھا، ڈائرکٹر صاحب محکمۂ تعلیماتِ پنجاب ان دنوں سر جارج انڈرسن تھے مسلمان ممبرانِ کونسل کا ایک مختصر سا وفد اس معاملہ پر بحث کرنے کے لئے ڈائرکٹر صاحب کے پاس گیا، ڈاکٹر صاحب چونکہ ان دنوں کونسل کے ممبر تھے اور تعلیمی حالات سے واقف، وہ بھی وفد میں شامل تھے، رسمی باتیں جو ایسے موقعوں پر ہوتی ہیں، ہوئیں، ڈائرکٹر صاحب بہادر نے وعدہ فرمایا کہ میں ضرور اس معاملہ پر غور کروں گا، اور جہاں جہاں حق تلفی یا بے قاعدگی ہوئی ہے، اس کی تلافی کی پوری کوشش کروں گا۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً ظرافتِ سقراط سے کام لیا۔ اور سر جارج سے فرمانے لگے، اجی صاحب آپ اتنی کاوش مت کیجئے گا، ہم لوگ تو مسلمان ہیں، آپ کے اس وعدہ ہی سے خوش ہو گئے ہیں، اب کچھ کرنے کرانے کی ضرورت نہیں۔

۱۹۲۲ء میں جب ڈاکٹر صاحب کو نائٹ ہُڈ (Knight - hood) کا خطاب ملا۔ تو اسلامیہ کالج کے کریسنٹ ہوسٹل کے طلبہ نے آپ کو چائے پر مدعو کیا، ڈاکٹر صاحب نے کمال مہربانی سے (جو اُن کا عمر بھر شیوہ رہی) یہ دعوت قبول فرمائی، چنانچہ وقتِ مقررہ پر آپ تشریف لائے، آپ کے دوست نواب سر ذوالفقار علی خان صاحب بھی ساتھ تھے۔ چائے کے بعد طلبہ نے درخواست کی کہ ان کی ہدایت کے لئے چند کلمات فرمائے جائیں، ڈاکٹر صاحب نے ایک مختصر سی

تقریر کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ قوموں کے اخلاق کو خراب کرنے والی چیزوں میں سے ایک نہایت خطرناک بلکہ مہلک چیز وہ نظریہ ہے، جسے "فن برائے فن" (Art for art's sake) کہتے ہیں، اس نظریہ سے مراد یہ ہے کہ جمالیات کا ہر شعبہ یا فن صرف اپنے اصولوں کو ہی اپنا معیارِ صحت اور نصب العین مقرر کرے، اپنے ان اصولوں سے باہر کوئی اصول (مثلاً اخلاقیات یا روحانیات کا کوئی اصول) اس فن کی راہبری کا حقدار نہ ہو، وہ فن خود اپنا راہبر ہو، اس کی ترویج یا ترتیب یا اس کا ارتقا کسی فوق الفن اصول کے ماتحت نہ ہو، وغیرہ، مختصر یہ کہ حسن خود اپنا معیار ہے، اور اپنے سے بالاتر کسی معیار یا مدعا یا نصب العین کو ماننے کے لئے تیار نہیں، یہ نظریہ آج کل مغربی دنیا میں بہت مقبول ہے، اور اس کی مقبولیت کی رفتار اگر اسی طرح تیز رہی تو مجھے یقین ہے کہ ان اقوام کو گرا کر رہے گا، میں نے اپنے کلام میں اس مہلک نظریہ کے خلاف جہاد کیا ہے اور میں تم نوجوانوں کو متنبہ کرتا ہوں کہ اس خطرناک غلطی میں نہ پڑنا، فن، جب اخلاقیات اور حیاتیات سے علیحدہ ہوتا ہے، تو وہ بہت جلد مخربِ اخلاق بن جاتا ہے، اعلیٰ مقاصد کی تکمیل یا پیروی کے لئے جمالیات کے کسی فن کو لوگے تو وہ اپنے بہترین مدارج طے کرے گا، اور قوم و ملت میں ایک نئی روح پھونک دے گا، لیکن وہی فن جب ان مقاصد سے بچھڑ جائے گا، تو قوم و ملت کے حق میں زہرِ قاتل بن جائے گا۔"

میں نے اوپر ڈاکٹر صاحب کی مختصر تقریر کا ماحصل (جو شاید دس بارہ منٹ سے زیادہ نہ تھی) اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے، بالخصوص اس نظریہ "فن برائے فن" کی تعریف کو واضح کر کے بیان کرنا میں نے مناسب سمجھا ہے، یہ تقریر سنے مجھے کئی سال گزر چکے ہیں، لیکن بعد کے واقعات نے ان خیالات کو میرے ذہن سے محو ہونے نہیں دیا، ہر طرف "فن برائے فن" کی تباہ کاریاں ایک وبا کی صورت اختیار کر رہی ہیں، جرمنی اور اٹلی میں تو ہٹلر اور مسولینی کی کوششوں نے اس نظریہ کی اچھی خاصی بیخ کنی کی ہے لیکن دوسرے مشہور مغربی ممالک میں اس کے خلاف کوئی منظم جہاد نہیں کیا گیا، ہندوستان میں کچھ عرصہ سے یہ نظریہ نام نہاد تعلیم یافتہ طبقہ میں رائج ہو رہا ہے، آزاد خیال فنین (Artists) اس کے مبلغ ہیں اور عریانیت ان کے فن کے اسرار کی کلید، ڈاکٹر صاحب نے اس نظریہ کے مہلک نتائج کو جگہ جگہ اپنی تصانیف میں مثلاً محکوم اور زوال پذیر اقوام کے جمالیات کے تذکرہ میں بیان کیا ہے، اس نظریہ کے برعکس انہوں نے اپنی تعلیم اس شعر میں نہایت بلیغ طریقہ سے بیان کی ہے، ؎

دلبری بے قاہری جادو گری است　　　دلبری با قاہری پیغمبری است

۱۹۲۷ء میں میں نے اسلامیہ کالج کو چھوڑا، ممبرانِ سٹاف نے کمال مہربانی سے چائے کی ضیافت دی، ڈاکٹر صاحب سے چونکہ مجھے عقیدت تھی، اس لئے انہیں بھی مدعو کیا گیا (یعنی اساتذہ کے علاوہ صرف وہی مہمان تھے) وہ از راہِ ذرہ نوازی شامل ہوئے، باتیں ہوتی رہیں، دورانِ گفتگو میں منتظم صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی شرکت کا شکریہ ادا کیا۔

فرمانے لگے، پروفیسر میرا دوست ہے، اس کے ملازمتی جنازہ کے لئے مجھے ضرور وقت نکالنا تھا۔ The professor is my friend - I had to find time for his official funeral اس پر قہقہہ پڑا، فرمانے لگے۔ کہ میں نے ان الوداعی پارٹیوں کے لئے "ملازمتی جنازے" کی اصلاح وضع کی ہے۔

اس پارٹی میں ڈاکٹر صاحب، مسٹر یوسف علی (جو پرنسپل تھے) کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی رہے تھے۔ باتوں باتوں میں پردہ کا معاملہ زیر بحث آیا، یوسف علی صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا، کیوں صاحب، آپ کو تو پردہ کی مخالفت ضرور کرنی چاہیئے؛ اُنہوں نے جواب دیا کہ میں تو پردہ کا بہت حامی ہوں، یوسف علی صاحب نے وجہ دریافت کی، تو فرمایا کہ پردہ سے، جنسیت کی خواہش تیز تر ہوتی ہے، بے پردگی اور عریانی سے وہ راز کھل جاتا ہے، جو جنسیت کی جان ہے، اس مختصر سے جواب میں اُنہوں نے انسانی نفسیات کے ایک اہم اصُول کو لطیف پیرایہ میں بیان کر دیا۔

ڈاکٹر صاحب کو پورا یقین تھا کہ ان کا کلام اور ان کا کام باقی رہے گا، عرصہ ہوا، میں نے ایک روز عرض کی کہ یورپی زبانوں میں آپ کا کلام اگر ترجمہ کی صُورت میں شائع ہو جائے تو نہ صرف خود یورپ کے حق میں مفید ہوگا، بلکہ صحیح اسلامی نقطۂ نگاہ اور تعلیم کے متعلق بھی اہلِ یورپ میں جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں، وہ بہت حد تک دُور ہو جائیں گی، آپ ترجمہ کی اجازت ضرور دیں، فرمانے لگے، کہ میرا کلام باقی رہے گا (My work shall live) تراجم آہستہ آہستہ ہو ہی جائیں گے۔

گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں انگلستان میں ڈاکٹر صاحب کو اکابر اور فضلاء سے تبادلہ خیالات کا موقع ملا۔ ایک بزرگ نے عیسائی پادریوں کا مشہور اور جھوٹا اعتراض اسلام کے خلاف دُہرایا، اور پوچھا کہ "سر محمد کیا یہ سچ ہے کہ اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ عورت کے رُوح نہیں ہوتی؟" ڈاکٹر صاحب نے پوچھا "کیا رُوح سے آپ کی مُراد وہی شے ہے جو آپ لوگوں کے خیال میں جسم سے بالکل علیحدہ اور مختلف ہوتی ہے۔" معترض صاحب نے کہا 'جی ہاں'۔ اُنہوں نے جواب دیا "تو پھر صاحب اسلام کے مطابق عورت کیا مرد میں بھی رُوح نہیں ہے"۔ اس دقیق اور لطیف جواب کو سمجھنے کے لئے یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے فلسفیانہ مضامین میں اس نظریہ پر بہت زور دیا ہے کہ رُوح اور جسم کی تقسیم قرآنی تعلیم کے بالکل خلاف ہے، اور یہ پُرانے مذاہب اور فلاسفہ کی غلط تعلیم کا نتیجہ ہے، قرآن کے مطابق انسان ایک فرد ہے، جس میں روحانی اور جسمانی خاصیتیں موجود ہیں، لیکن رُوح اور جسم دو الگ الگ چیزیں موجود نہیں، جن سے وہ بنا ہو، روح اور جسم کی یہی غلط تقسیم ہے، جس کی وجہ سے بیسیوں ناقابلِ حل مسئلے فلسفہ مذہب میں پیدا ہو چکے ہیں، اسلام انسان کو ایک زندہ شخصیت (Spiritual and organic being) تصور کرتا ہے۔

اور یہ تصور قرآن میں نہ صرف اسی ارضی زندگی کے لئے استعمال ہوتا ہے، بلکہ حشر اور حیات بعد الموت کے لئے بھی قائم رہتا ہے، چنانچہ حیات بعد الموت میں انسان کے لئے جو جزا اور سزا مقرر ہے جس کا ذکر قرآن میں بار بار آتا ہے، وہ روحانی بھی ہے اور جسمانی بھی، ڈاکٹر صاحب نے مندرجۂ بالا جواب میں اسی مسئلہ کو واضح کیا ہے کہ اسلام کے مطابق رُوح جسم سے علیحدہ کوئی شے نہیں، اس لئے نہ وہ عورت میں پائی جاتی ہے اور نہ مرد میں۔ کس بلاغت اور ظرافت سے ایک ہی بات میں نہ صرف ایک جھوٹے الزام کی تردید کی گئی ہے، بلکہ ایک اہم اصُول کو بھی واضح کر دیا گیا ہے؛ ڈاکٹر صاحب کی روزمرہ کی گفتگو میں یہی خاصیت بار بار نمایاں ہوتی تھی۔

دوسری گول میز کانفرنس کے زمانہ میں انگلستان کی مشہور سیاح خاتون مس روزیٹا فوربس نے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کا شوق ظاہر کیا، چنانچہ مس صاحبہ نے انہیں اپنے ہاں مدعو کیا، یہ خاتون شمالی افریقہ اور اسلامی ممالک میں بہت پھری ہیں اور ان پر اس سیاحت کا بہت اچھا اثر پڑا ہے، ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے کہ ان کا محل جو لندن میں ہے، وہ ایشیائی بلکہ اسلامی طرزِ آرائش کا نہایت لطیف اور شستہ نمونہ ہے، سامان، آرائش، غالیچے، زیب و زینت کے انداز ہر لحاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہارون الرشید کے بغداد کے کسی محل کا خاکہ ہے، اسی محل میں ڈاکٹر صاحب کی ضیافت ہوئی اور پُرلطف مجلس رہی۔ لیکن اُنہیں خاتون کے محل کی تعریف کا موقع نہ ملا۔ روانگی کے وقت مس صاحبہ سے نہ رہا گیا۔ پوچھنے لگیں کہ "سر محمد میرے اس مکان کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟" ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا "آپ نے اپنی بہشت دُنیا میں پائی، میں اپنی بہشت کا منتظر ہوں"

دوسری گول میز کانفرنس سے واپسی پر ڈاکٹر صاحب کی ملاقات روما میں مسولینی سے ہوئی۔ اس ملاقات میں مسولینی نے ان کی تعلیم سے دلچسپی کا اظہار کیا، اور اس کی تعریف کی گفتگو آدھ گھنٹہ سے زیادہ رہی۔ دورانِ گفتگو میں قوم اور مذہب کا بھی ذکر ہوا، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اطالیہ کی موجودہ حالت (اور اس کی حل طلب مشکل) بہت حد تک ایسی ہے جیسے کہ قبل از اسلام ایران کی تھی، ایران کی تہذیب فرسودہ تھی اور قوم کے قویٰ شل ہو چکے تھے، ان کو تازہ خون کی ضرورت تھی، ایران کی خوش قسمتی سے اس کے جوار میں عرب کی جری اور بادیہ پیما قوم تھی، جس نے ایران کو اپنا تازہ اور خالص خون دیا۔ نتیجہ یہ ہوا، کہ ایران میں حیات کی ایک نئی لہر دوڑ گئی، اور یہ قوم ایک پُرشکوہ تہذیب کی حامل اور علم بردار ہوئی، عربی خون کی بدولت ان میں بہترین اہلِ فن، اہلِ سیاست اور اہلِ سیف پیدا ہوئے۔ اسی طرح روما کے زوال کے بعد گاتھ اور جرمن قوموں نے اطالیہ کو اپنا خون دیا، اور اسے قرونِ وسطیٰ میں نشأۃ ثانیہ نصیب ہوئی، اب پھر ایران اور اطالیہ دونوں کو تازہ خون کی ضرورت ہے۔ ایران اب بھی اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ اس کے شمال میں جری اور نیم مہذب

ترکمان موجود ہیں، اور مغرب میں اندرونِ عرب کے حربی قبائل، یہ قومیں اپنا خون دے کر ایران کو پھر زندہ اور قوی کردیں گی لیکن موجودہ اطالیہ کے گرد اسی کی جیسی مہذب قومیں آباد ہیں، جن میں صحرائی وحشت اور تازگی نام کو موجود نہیں، اطالیہ تازہ خون کہاں سے لے گی؟" ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے کہ مسولینی اس اچھوتے خیال سے بہت متاثر ہوا۔

ڈاکٹر صاحب پر حسن کا اثر بہت گہرا اور فوری ہوتا تھا، روما کے اسی قیام کے زمانہ میں (جو صرف چند روزہ تھا) ان کی ایک دوست خاتون نے (غالباً اسی خاتون نے مسولینی کی ملاقات کے لئے وقت مقرر کرایا تھا) جو اطالیہ کے طبقۂ اُمرا سے تھی، ان سے دریافت کیا، اگر آپ کو یہاں کوئی خاص چیز دیکھنی ہے، تو فرمائیے؛ تاکہ اس کا انتظام کیا جائے۔ فرمایا کہ اطالیہ کا حُسن مشہور ہے، میں اس شہر روما کی حسین ترین خواتین دیکھنا چاہتا ہوں، چنانچہ موصوفہ نے ایک ٹی پارٹی میں اعلیٰ سوسائٹی کی چند حسین خواتین مدعو کیں، جن سے ڈاکٹر صاحب نے ملاقات کی، فرماتے تھے کہ اطالیہ کا حُسن یورپ میں بہترین ہے اور اس ضیافت میں روما کے حسن کے بعض لطیف نمونے تھے۔

گول میز کانفرنس سے واپسی پر ڈاکٹر صاحب کی ملاقات پیرس میں پروفیسر برگساں سے ہوئی، برگساں کی تصانیف کا اثر ان پر بہت تھا۔ اس کا نظریۂ واقعیتِ زمان (Reality of Time) ڈاکٹر صاحب کے خیال میں اسلامی نقطۂ نگاہ کے بہت قریب تھا، چنانچہ دورانِ ملاقات میں اس پر بحث ہوئی، ڈاکٹر صاحب نے برگساں کو یہ حدیث سُنائی، کہ "زمانہ کو بُرا مت کہو کہ زمانہ خدا ہے" فرماتے تھے، کہ جس وقت برگساں نے یہ حدیث سُنی تو وہ کرسی سے اُچھل کر آگے بڑھا اور مجھ سے پُوچھنے لگا "کیا یہ سچ ہے؟"

گول میز کانفرنس کے اختتام پر ڈاکٹر صاحب نے ہسپانیہ کا سفر کیا، اس سفر کے واقعات انہوں نے کمال مہربانی سے مجھے مفصل سنائے، قرطبہ کے جس ہوٹل میں آپ ٹھہرے تھے، اُس کے مالک (مینیجر) سے آپ نے سب سے پہلے یہی پوچھا کہ کیا اس علاقہ میں قدیم مراکشی نسل کے لوگ آباد ہیں، اس نے جواب دیا، کہ بڑی تعداد میں، آپ نے خواہش ظاہر کی کہ مجھے ان میں سے کسی ایک سے ضرور ملایا جائے۔ مینیجر مسکرا کر بولا، اس کام کے لئے ہوٹل سے باہر جانے کی ضرورت نہیں، میں خود مراکشی اصل سے ہوں (جنوبی ہسپانیہ کے ان باشندوں کو مورسکو (MORISCO) کہا جاتا ہے) حسنِ اتفاق سے آپ کو پُرانی عمارتیں دکھانے کے لئے جو راہبر مقرر کیا گیا تھا، (آپ نے شرط یہ رکھی تھی کہ راہبر انگریزی جانتا ہو، کیونکہ میں ہسپانوی زبان سے آشنا نہیں) وہ بھی مراکشی اصل سے تھا، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اس علاقہ میں عربی مراکشی اثر چہروں کی ساخت میں بہت نمایاں ہے، چنانچہ "مسجد قرطبہ" میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے:۔

آج بھی اِس دیس میں عام ہے چشمِ غزال ‏ ‏ ‏ اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دِل نشیں

بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے — رنگ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

اسی سفرِ ہسپانیہ میں آپ کو پروفیسر آسین (ASIN) سے بھی ملاقات کا موقع ملا، یہ وہی پروفیسر ہیں، جنہوں نے قریباً پندرہ سال یا شاید کچھ زیادہ ہوتے ہیں، ایک معرکۃ الآرا تصنیف کی تھی، جس میں یہ ثابت کیا تھا کہ اطالوی شاعر دانتے پر عربی بالخصوص ان حدیثوں اور روایتوں کا اثر جو معراجِ نبوی صلعم اور عذابِ دوزخ سے متعلق ہیں، کسی قدر غالب تھا، دانتے کی شہرۂ آفاق تصنیف ڈیوینا کامودیا میں یہ اثر صفحہ صفحہ پر نمایاں ہے، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، کہ پروفیسر آسین کی خواہش تھی کہ مسلمان طالب علم بالخصوص ہندوستان کے مسلمان طالب علم ہسپانیہ میں آئیں، اور ملک کی زبان سیکھ کر ان قیمتی اور بے شمار عربی مخطوطوں کا مطالعہ کریں، جو ہسپانیہ کے بعض کتب خانوں مثلاً اسکوریال میں بند پڑے ہیں، (خدا جانے اس خوفناک جنگ میں ان نایاب مخطوطوں کو کس قدر نقصان پہنچا ہو۔)

ڈاکٹر صاحب کو سفرِ ہسپانیہ میں معلوم ہوا، کہ اس ملک میں قومیت اور وطنیت کی ایک نئی لہر دوڑ رہی تھی، ملک میں ایسے نوجوان اور فضلا نکل آئے تھے، جو ہفت صد سالہ اسلامی حکومتِ ہسپانیہ کے کارناموں کو فخریہ بیان کرتے تھے اور اس کو اندلس کا بہترین زمانہ کہہ کر یاد کرتے تھے، اسی تحریک کا نتیجہ تھا کہ مسجد قرطبہ کو کیتھولک چرچ کے مختلف فرقوں سے چھین لیا گیا۔ حالانکہ کئی سو سال سے ان فرقوں نے مسجد کے مختلف حصّوں میں اپنی عبادت گاہیں بنالی تھیں، وطنیت کی اس تحریک کا چونکہ مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا، اس لئے مسجد کو محکمۂ آثارِ قدیمہ کے حوالے کر دیا گیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر صاحب نے حکمتِ الٰہی کی ایک دلپذیر مثال یہ سنائی کہ مسلمانوں کے اخراج کے بعد جب مسجد قرطبہ (جو تعمیری جمالیات کے لحاظ سے دُنیا کی نادر ترین عمارتوں میں سے ہے) عیسائی راہبوں کے قبضہ میں آئی، تو انھوں نے آیاتِ قرآنی پر جو سنہری حروف میں مسجد کی دیواروں اور محرابوں پر لکھی ہوئی تھیں، پلستر کرا دیا۔ آج قریباً پانچ چھ سو سال کے بعد جب وہ پلستر محکمۂ آثارِ قدیمہ کے حکم سے اُکھاڑا جاتا ہے، تو وہی نقوش اپنی پرانی شان میں دُنیا کے سامنے آتے ہیں اگر پلستر نہ ہوتا، تو یہ نقوش غالباً اس وقت تک بالکل محو ہو جاتے، ڈاکٹر صاحب کا یہ فقرہ میرے ذہن میں نقش ہے، کہ "مسجد اور اس کے نقوش کو دیکھ کر جو لذت قرآن اور اسلام کے مفہوم کے تعلق میں نے حاصل کی، وہ بیسیوں تفسیروں سے حاصل نہ کر سکا!" ایک بات ڈاکٹر صاحب کو اسپین کے سفر میں خاص طور سے نوٹ کرنی پڑی، کہ اس وقت اس ملک میں پرانی مساجد کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں، (۱) یا مسلمانوں کے ہسپانیہ سے اخراج کے بعد تعصب کی وجہ سے عیسائیوں نے ان تمام مساجد کو سخت بے دردی سے گرا دیا ہوگا۔ (۲) اور یا خود مراکشی اندلسی مسلمانوں کو بے ضرورت مساجد تعمیر کرنے کا وہ شوق نہ تھا جو ہندوستانی مسلمانوں کو ہے، پہلا خیال غالباً زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب ہسپانیہ کی آب وہوا کی بے حد تعریف کرتے تھے، فرماتے تھے، کہ اس ملک میں دو تین مقامات ایسے ہیں اور ان کی فضا اس قدر پاک اور شستہ ہے کہ آج کا پکا ہُوا سالن کئی مہینوں تک نہ بگڑے گا۔
دو سال کے قریب ہوئے جب اسپین کی موجودہ ملکی جنگ کا آغاز ہُوا تو یہ خبریں بھی پہنچنا شروع ہوئیں کہ جنرل فرانکو کی فوج کا زیادہ حصّہ خصوصاً وہ حصّہ جو یلغاروں میں اور فیصلہ کُن لڑائیوں میں (Storm Troops) صف شکنی کا کام دیتا ہے، تمام تر مراکشی سپاہیوں اور رضا کاروں پر مشتمل ہے، کچھ عرصہ کے بعد ان جفاکش اور جری سپاہیوں کی تصاویر بھی اخباروں میں چھپنا شروع ہوئیں، ان خبروں سے ہندوستان کے ہر پڑھے لکھے مسلمان پر گہرا اثر ہُوا تھا اور ہے۔ مَیں نے ایک روز ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں اس خیال کے اثر کا ذکر کیا، کہ سرزمینِ اُندلس قریباً بارہ سَو سال کے بعد پھر مسلمان مراکشی بہادروں کے قوی بازوؤں سے سر ہو رہی ہے، ڈاکٹر صاحب فوراً بولے تمہیں میری نظم مسجد قرطبہ کا آخری بند یاد نہیں رہا، اس میں مَیں نے پیشینگوئی کی تھی۔

آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی	دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کے خواب!
عالمِ نَو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں	میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اُٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے	لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

ڈاکٹر صاحب پر جرمن مفکر نٹشے کا بہت اثر تھا "خودی" کے اسرار ان پر اس وضاحت اور جدت سے فاش نہ ہوتے اگر نٹشے کی تصانیف سے وہ لاعلم رہتے۔ بالِ جبریل چھپنے کے کچھ عرصہ بعد ایک دفعہ مَیں نے ان سے عرض کیا کہ پچھلے دنوں میں نے نٹشے کی فلاں فلاں کتابوں کو کئی سالوں کے بعد اور شاید تیسری بار پڑھا ہے، لیکن اس کی فکر میں وُہ تازگی، جوش اور گہرائی ہے کہ ہر بار معلوم ہوتا ہے کہ پہلی بار پڑھ رہا ہوں، اس کے بنیادی خیالات اسلام سے اِس قدر قریب ہیں، کہ افسوس ہوتا ہے کہ کسی نے اس کے سامنے اسلامی نقطۂ نظر پیش نہ کیا۔ قرآن سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے اسے اپنے فلسفہ میں "انکارِ الہیت" (Godlessness) کی تعلیم دینا پڑی، عیسائیت نے خدا کے بیٹے کو "بکری کا بچہ" اور اخلاق کو روحانی پست ہمتی کے مترادف بنا کر اسے صحیح مذہب سے متنفر کر دیا، وغیرہ، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ "تمہارا یہ خیال بالکل صحیح ہے، اسی لئے تو میں نے نٹشے کے متعلق کہا ہے،

دلش مومن، دماغش کافر است

ڈاکٹر صاحب کی تصانیف میں شاہین کا فقیر و درویش ہونا نٹشے کے زردشت کے اس وعظ سے بہت قریب ہے، جس میں وُہ اپنے کوہستانی نشیمن کو اس لئے پسند کرتا ہے، کہ وہاں اسے عقاب اور ستاروں کی ہمسائیگی نصیب ہے۔

ڈاکٹر صاحب سے میں نے دو تین موقعوں پر مرزا بیدل کی شاعری کے متعلق پوچھا۔ بیدل کے متعلق ان کی رائے نہایت اچھی تھی، میں نے ایک بار کہا کہ اس کی فارسی میں بے ضرورت مشکل پسندی ہے، فرمانے لگے کہ تھوڑی سی کاوش سے یہ مشکل دور ہو سکتی ہے، بیدل نے اپنی خاص اصطلاحات وضع کر رکھی ہیں جنہیں وہ اپنے اشعار میں استعمال کرتا ہے، اگر ان اصطلاحات کو پہلے سمجھ لیا جائے تو بیدل میں مشکل باقی نہیں رہتی، بیدل اس قابل ہے کہ اس کا مطالعہ بغور کیا جائے۔

پچھلے سال اگست یا ستمبر میں ایک روز جب میں شام کے وقت حاضرِ خدمت ہوا تو آپ حسبِ معمول جاوید منزل کے صحن میں بستر پر لیٹے تھے، اس سے چند مہینے پہلے ایک دو مرتبہ اُنھوں نے اپنے بچوں کے لئے ایک معلمہ یا اتالیقہ کی ضرورت کا ذکر کیا تھا، کچھ دیر سیاسی خبروں کے متعلق باتیں ہوتی رہیں، اس دوران میں ایک یورپین خاتون بچوں کو لے کر گزریں، میرے دریافت کرنے پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، کہ یہ خاتون بچوں کی اتالیقہ ہیں، جرمن نسل سے ہیں، اور نہایت شریف الطبع ہیں، انہیں ہر وقت بچوں کی پرورش کا خیال رہتا ہے، اور فرصت کا کوئی وقت بھی وہ بے کار نہیں گزارتیں کچھ کام نہ ہو تو کمرہ ہی جھاڑنا شروع کر دیتی ہیں، چنانچہ بچوں کی طرف سے تو میری طبیعت اب بالکل مطمئن ہے۔ البتہ مجھے کچھ عرصہ سے تنہائی بہت محسوس ہو رہی ہے، علی بخش میری ضروریات کی نگہداشت کرتا ہے، لیکن میرے لئے اب زیادہ توجہ کی ضرورت ہے، صبح سے دوپہر تک کا وقت اچھا گزرتا ہے، لوگ آتے جاتے رہتے ہیں، شام کا وقت بھی اسی طرح گزرتا ہے، البتہ دوپہر سے چار بجے تک کا وقت سخت تکلیف دہ ہوتا ہے، پڑھنا بند ہو چکا ہے، اور سوئے انسان کب تک، میں نے عرض کی کہ موسیقی کا انتظام ہو جائے تو طبیعت کو تسکین ہو گی، فرمایا کہ مجھے موسیقی کی بہت خواہش ہے میری طبیعت بھی اس کی طرف مائل ہے، لیکن افسوس ہے کہ ہندوستانی موسیقی بہت الم انگیز اور پژمردہ ہے جس موسیقی کی مجھے ضرورت ہے، وہ ابھی شروع نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال کہ ہندوستانی موسیقی میں المیت کا عنصر بہت غالب ہے، اور ذوقِ حیات اس سے پیدا ہو ہی نہیں سکتا، میں نے کئی بار ان کی زبان سے سُنا، اس نتیجہ پر وہ برسوں پہلے پہنچ چکے تھے۔

۱۹۳۷ء میں سید سر راس مسعود مرحوم کی وفات کی خبر اخباروں میں نکلی، اس کے چند روز بعد مجھے ڈاکٹر صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا، مجھے معلوم تھا کہ مرحوم ان کو بہت عزیز تھے، چنانچہ جب میں نے اُن کی خدمت میں اظہارِ افسوس کیا تو اُنھوں نے مرحوم کی بہت تعریف کی، میں نے پوچھا کہ مرحوم میں خاص خوبیاں کیا تھیں، فرمانے لگے کہ "دو باتیں ان میں نمایاں تھیں ایک یہ کہ وہ بے حد فیاض تھے، ہر کسی کے دُکھ درد میں شریک ہوتے تھے، کسی کی تنگدستی کو برداشت نہ کر سکتے تھے، اسی لئے ان کی تنخواہ (اگرچہ معقول تھی) ان کے لئے کافی نہ تھی۔ کوئی سائل ان کے گھر سے خالی نہ جاتا تھا، میں تمہیں ایک مثال

دیتا ہوں، ان کی بیماری سے کچھ عرصہ پہلے میں نے انہیں لکھا کہ میں نے اپنی وصیت میں چار اشخاص کو اپنے بچوں کا سربراہ مقرر کیا تھا، ان میں سے ایک صاحب فوت ہوگئے ہیں، مجھے بہت خوشی ہوگی، اگر آپ سربراہ بننا منظور فرمائیں، اُنہوں نے جواب میں لکھا کہ میں لاہور سے بہت دُور ہوں اس لئے بحیثیتِ سربراہ میں بچّوں کو کیا فائدہ پہنچا سکوں گا، البتہ آپ براہِ مہربانی اپنی وصیت میں یہ الفاظ ضرور درج فرمائیں کہ اگر بچّوں کو خدانخواستہ کبھی مالی تکلیف ہو تو سب سے پہلے اطلاع کا حقدار مجھے سمجھا جائے۔ دوسری نمایاں خصوصیت مرحوم میں یہ تھی کہ ان کا دسترخوان بہت فراخ تھا اور ان کا کھانا بہترین، ان کے پاس بہترین باورچی ملازم تھے اور عمدہ کھانوں اور ضیافتوں پر وہ بے دریغ خرچ کرتے تھے، چنانچہ اُنہوں نے اسی غرض سے خالص عربی میزبانی کا سامان مکمل جمع کیا تھا، الغرض مرحوم ہندوستان کے خوش وضع اور مخیّر اکابر میں سے تھے، اب ان کا جانشین یا ثانی مشکل سے ملے گا۔"

ڈاکٹر صاحب سے میری آخری ملاقات اخیر دسمبر ۱۹۳۷ء میں ہوئی، اس وقت وہ خوابگاہ میں پلنگ پر بیٹھے تھے، کچھ دیر تک وہیں باتیں ہوتی رہیں، پھر علی بخش نے آکر اطلاع دی، کہ کھانا تیار ہے، (دوپہر کا وقت تھا) فرمانے لگے چلو دوسرے کمرہ میں بیٹھیں، ڈاکٹر صاحب سوفا پر بیٹھ گئے، علی بخش نے کرسی سامنے رکھ دی، اور کھانا اس پر چُن دیا، میں کھانا کھا کر گیا تھا، اس لئے قریب ہی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا، آپ اشتہا سے کھانا کھاتے رہے، اور باتیں بھی ہوتی رہیں، اتنے میں رحما (دوسرا ملازم) اندر آیا اور اطلاع دی کہ مسٹر یوسف علی اور چھوٹے میاں (نواب سر ذوالفقار علی خاں صاحب مرحوم کے صاحبزادے) آئے ہیں، آپ نے فرمایا یہیں بُلا لو، چنانچہ کرسیاں قریب ہی رکھ دی گئیں، اور دونوں صاحب اندر تشریف لائے، مسٹر یوسف علی نے سلام علیک کے بعد مزاج پرسی کی، ڈاکٹر صاحب نے حسبِ عادت فرمایا، بہت اچھا ہوں، مسٹر یوسف علی نے فرمایا، میرا بھی یہ خیال ہے، کیونکہ کھانا کھانا خود صحت کی نشانی ہے، ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، ڈاکٹر صاحب نے پوچھا، بتائیے انگلستان سے کیسے آمد ہوئی، یوسف علی صاحب نے جواب دیا، کہ قرآن کریم کے آخری تین پاروں کا ترجمہ زیرِ طبع ہے، یہ کام اپنی نگرانی میں کروانے کے لئے آیا ہوں، کسی بات پر آپ نے مسٹر یوسف علی کو ایک لطیفہ سنایا، (جو میں بھول گیا، اس میں وہابیوں کی یبوست" کا ذکر تھا) میں مسٹر یوسف علی کے سامنے بیٹھا تھا۔ لیکن غالباً وہ مجھے پوری طرح سے پہچان نہ سکے، ڈاکٹر صاحب نے ان سے کہا آپ پروفیسر حمید کو پہچانتے ہیں؛ اسلامیہ کالج میں دو سال آپ کے ماتحت کام کر چکے ہیں، مسٹر یوسف علی بولے، ہاں، ہاں، بعد میں تمہیں گجرات میں بھی تو دیکھا تھا، لیکن بھئی تم نے اپنے بال کیوں اس قدر سفید کر رکھے ہیں؟ میں نے عرض کی کہ خاندانی رجحان سفید بالوں کی طرف زیادہ ہے، ڈاکٹر صاحب نے مسٹر یوسف علی کی طرف مُڑ کر کہا، آپ کی صحت پہلے سے بہت اچھی ہے، وہ بولے، پہلے (اسلامیہ کالج میں) میں غلام تھا، آج کل آزاد۔

ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "نہیں، بلکہ بات یہ ہے کہ ان کے لئے (میری طرف اشارہ کرکے) زمان (Time) کی رو آگے کی طرف بڑھ رہی ہے، اور آپ کے لئے پیچھے کی طرف (Time is moving forwards for the professor and backwards for you)۔ اس کے بعد حسبِ ذیل باتیں ہوئیں:۔

یوسف علی صاحب۔ فرمائیے آج کل کچھ زیرِ تصنیف ہے؟

ڈاکٹر صاحب۔ اُردو اور فارسی دونوں میں کچھ کلام جمع ہو رہا ہے۔

یوسف علی صاحب۔ آپ کو میرے ساتھ وہ وعدہ یاد ہے، کہ آئندہ فارسی چھوڑ کر اُردو کی طرف دوبارہ متوجہ ہوں گا۔ میں۔ بانگِ درا کے بعد ڈاکٹر صاحب کی دو اور کتابیں اُردو میں شائع ہو چکی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب۔ جی ہاں میں اُردو میں چند سالوں سے لکھ رہا ہوں۔

یوسف علی صاحب۔ موجودہ تصنیف کب مکمل ہوگی؟

ڈاکٹر صاحب۔ اگلے سال، انشاء اللہ مدینہ منورہ میں پہنچ کر،

یوسف علی صاحب۔ آیندہ سال حج کو ضرور تشریف لے جایئے گا؟

ڈاکٹر صاحب۔ جی ہاں ارادہ تو یہی ہے، اطالوی کونسل جنرل نے مجھے دعوت دی ہے کہ اطالوی کمپنی لائڈ ٹریسٹینو کے کسی جہاز میں سفر کیجئے گا، یہ جہاز جدّہ میں تو نہیں ٹھہرتے۔ لیکن جدّہ کے سامنے اطالوی سمالی بندرگاہ پر ٹھہرتے ہیں، وہاں سے وہ میرے لئے ایک خاص اگن بوٹ کا انتظام کرنے کا وعدہ کرتے ہیں، جو مجھے جدّہ پہنچا دے گی۔ اس طرح سفر میں مجھے تکلیف نہ ہوگی، اس کے متعلق خط و کتابت جاری ہے۔

یوسف علی صاحب۔ بے شک اطالوی حکومت کو اسلامی دُنیا میں آپ کی اہمیت کا پُورا علم ہوگا، اور وہ ہر طرح سے آپ کو سہولت پہنچانے کی کوشش کرے گی۔

ڈاکٹر صاحب۔ مَیں بھی چاہتا ہوں کہ سفر کی کوفت سے بچوں، صحت کی موجودہ حالت میں اس کوفت کو برداشت نہ کر سکوں گا۔

چند منٹ اور گفتگو ہوئی، اس کے بعد دونوں صاحب تشریف لے گئے، اس ملاقات سے پہلے بھی ایک دو بار مجھ سے ڈاکٹر صاحب نے سفرِ حجاز کے متعلق اس تجویز کا ذکر کیا تھا، انہیں حج کی اس قدر لو لگی تھی، کہ غالباً انتقال کے وقت انہیں اسی ایک آرزو کے پُورا نہ ہونے کا رنج رہا ہوگا۔

دس پندرہ منٹ کے بعد میں بھی اجازت لے کر رخصت ہوا، اس وقت میرے دل میں یہ خیال ہرگز نہ آسکتا تھا

کہ چار مہینہ میں کے قلیل عرصہ میں ڈاکٹر صاحب اپنے عقیدتمندوں کو داغ مفارقت دے جائیں گے۔ اس وقت ان کے چہرہ سے صحت ٹپک رہی تھی، خط تھوڑی دیر پہلے بنوا کر بیٹھے تھے، موچھوں کو قدرے تاؤ بھی دے رکھا تھا، چہرہ کی شان جرمن جرنیلوں کی سی تھی، طبیعت بہت بشاش تھی، صرف دو تکالیف تھیں، ایک آواز جو کسی طرح نہ کھلتی تھی، اور دوسرے موتیا بند جو کچھ عرصہ سے اُتر آیا تھا، آواز کے نہ کھلنے کا انہوں نے کبھی گلہ نہ کیا تھا۔ اور موتیا بند کا وہ مارچ ۱۹۳۸ء میں اپریشن کرانا چاہتے تھے۔ ان کی شکل و ہیئت سے کوئی ایسے آثار ظاہر نہ تھے، جن سے میرے یا اور کسی شخص کے دل میں یہ وہم پیدا ہوتا، کہ خودی کا یہ دانائے راز سفرِ آخرت کے لئے تیار بیٹھا ہے، اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ

"معارف"

بصیرت

کیوں کر نہ زندگی ہو سعادت مرے لئے
ہر جنبشِ نظر ہے عبادت مرے لئے

جس کی ہر ایک سطر ہے اِک راہِ مستقیم
اُترا ہے وہ صحیفۂ قدرت مرے لئے

ظاہر کروں تو کفر کے فتوے لگائے خلق
اُتری ہے عرش سے وہ شریعت مرے لئے

جب ذہن کے اُفق پہ چمکتی ہے برقِ فکر
آتا ہے گھر کے ابرِ ہدایت مرے لئے

تابندہ جس مقام پہ ہے وجہِ ذوالجلال
مختص ہے وہ فرازِ بصیرت مرے لئے

شکرِ خدا کہ ہر سحر و شامِ زندگی
لاتی ہے ایک تازہ بشارت مرے لئے

ہر آن ہے نزولِ ملائک مرے حضور
ہر سانس ہے نویدِ رسالت مرے لئے

اپنے ضمیرِ زندہ و خلاق کی قسم
اک حرفِ پوچ ہے بشریت مرے لئے

جس کی چمک سے جیبِ مشیت ہے تابناک
مخصوص ہے وہ گوہرِ حکمت مرے لئے

(کلیم) —— جوش

مطبوعات

پنجابی صوفی پوئٹس - (پنجابی زبان کے صوفی شعراء) یہ کتاب مس لاجونتی راما کرشنا پی۔ ایچ۔ ڈی (لنڈن) (رمال مسز جے۔ این مدن) نے انگریزی زبان میں بہت تحقیق، کاوش اور محنت سے لکھی ہے اور آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کی ہے۔ ابتدا میں ڈاکٹر اے سی وُلسنر (مرحوم) کا مختصر سا "تعارف" درج ہے۔ مس لاجونتی نے خود بھی ہندوستان سے باہر تصوف کی ابتدا اور نشو ونما کے متعلق ایک پُر از معلومات دیباچہ لکھا ہے جس میں بتایا ہے کہ تصوف کیونکر ہندوستان میں پہنچا اور پنجابی شاعری میں تصوف کو کیا اہمیت حاصل ہے۔ اس کے بعد مؤلفہ نے شیخ ابراہیم فرید ثانی (۱۴۵۰-۱۵۵۵ء) سے شروع کر کے ہاشم شاہ (۱۷۹۰-۱۸۲۰ء) تک مشہور صوفی شعراء کے مختصر حالات، تنقید کلام، اور نمونۂ کلام پیش کیا ہے۔ آخر میں چند کم مشہور شعراء کے حالات بھی لکھ دیئے ہیں اور بعض اور مفید اضافے بھی کئے ہیں۔ یہ کتاب ہر اس شخص کے مطالعہ کے قابل ہے جسے ادبیات سے کچھ بھی واسطہ ہو۔ حجم ۱۴۲ صفحات۔ قیمت ۵ٍ۔ پتہ:۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس پوسٹ بکس نمبر ۳۱ بمبئی۔

یدِ بیضا۔ یہ خان بہادر ڈاکٹر سید نجم الدین احمد صاحب جعفری بیرسٹر ایٹ لاء کے اسلامی اور معاشری مضامین کا مجموعہ ہے۔ چند عنوانات یہ ہیں:۔ سرزمینِ عرب اور ظہورِ اسلام، اسلام اور عالمگیر مساوات، اسلام اور وطنیت، واقعۂ کربلا کی اہمیت وغیرہ، کُل اکیس مضامین ہیں جو پڑھنے کے قابل ہیں۔ قیمت عہ۔ پتہ:۔ مینجر صاحب آرمی پریس شملہ۔

شہزادۂ زرتاش۔ سید حمید علی صاحب ایڈیٹر پھول لاہور نے یہ افسانہ کنبین کے فوائد کی تبلیغ کے لئے لکھا ہے۔ "اصلاح دیہات" کے محکمہ نے سید صاحب کو اس کامیاب کتاب کی تصنیف پر انعام بھی دیا ہے۔ قیمت مجلد عمر۔ پتہ:۔ دار الاشاعت پنجاب لاہور۔

انسان۔ از لالہ کانشی رام صاحب چاولہ۔ یہ چند مضامین کا مجموعہ جس میں انسان کی زندگی کے متعلق مختلف خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ مثلاً انسانیت کا جوہر انسانی خواہشات، تقدیر وغیرہ حجم ۲۸۴ صفحات۔ قیمت ۸ر۔ پتہ۔ لالہ کانشی رام چاولہ۔ دفتر ڈپٹی کمشنر ہوشیار پور۔

(۱) بوستانِ مزمل ۸ر (۲) گلزارِ محبوبی ۸ر (۳) آئینۂ عثمانی ۸ر (۴) بہارِ سحوری ۴ر (۵) گنجینۂ معانی ۸ر (۶) نیترِ سعد ۸ر (۷) گنجِ خسروانی۔ یہ پروفیسر عبد القوی فانی ایم۔ اے کی فارسی نظمیں یا نظموں کے مجموعے ہیں۔ پروفیسر صاحب کو

فارسی شعر کہنے پر خوب قدرت حاصل ہے۔ اکثر نظمیں امراء و اکابر کے قصاید پر مشتمل ہیں۔ قیمتیں حجم کے لحاظ سے زیادہ معلوم ہوتی ہیں۔ فارسی کلام کے شائقین ان سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ پتہ پروفیسر عبدالقوی صاحب فانی لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ۔

ملت اور وطن۔ اس چھوٹے سے رسالے میں ادارہ روزنامہ "شمس" ملتان نے وہ تمام منظوم و منثور بحث جمع کر دی ہے جو مولانا حسین احمد کے نظریۂ وطنیت پر علامۂ اقبال رحمتہ اللہ علیہ کے اعتراض سے پیدا ہوئی تھی۔ یہ رسالہ بہت دلچسپ ہے اور چونکہ اس میں علامۂ اقبال رح کا مفصل تصریحی بیان بھی درج کر دیا ہے اس لئے نکتہ آموز بھی ہے۔ قیمت ۲/ر۔ پتہ اوپر لکھا ہے۔

مرثیہ اقبال۔ از حضرت اسد ملتانی۔ حضرت اسد ملتانی بہت اچھے شاعر ہیں اور ان کا لکھا ہوا یہ مرثیہ پڑھنے کے قابل ہے۔ قیمت ۳/ر۔ پتہ: دفتر روزنامہ شمس ملتان۔

عدلِ جہانگیری۔ جہاں گیر کے انصاف کے متعلق یہ مثنوی پروفیسر عبدالقوی فانی ایم۔اے نے لکھی ہے۔ پروفیسر صاحب کو فارسی شعر کہنے کا بہت اچھا سلیقہ ہے۔ یہ مثنوی بہت دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے۔ حجم ۶۲ صفحات۔ قیمت ۸/ر علاوہ محصول۔ پروفیسر صاحب لکھنؤ یونیورسٹی میں ہیں اور وہیں سے یہ کتاب مل سکتی ہے۔

تاریخ ادبیات ایران۔ مشہور انگریز مستشرق پروفیسر ایڈورڈ براؤن کی کتاب لٹریری ہسٹری آف پرشیا انگریزی زبان میں فارسی ادبیات کی مستند ترین تاریخ سمجھی جاتی ہے اور آج کل ایرانی ادبیات کی تاریخوں میں اس کتاب کو جو مرتبہ حاصل ہے وہ کسی دوسری کتاب کو میسر نہیں۔ انجمن ترقیٔ اردو ہند اورنگ آباد دکن اہلِ ملک کے شکریہ کی مستحق ہے کہ اس کے کارکنوں نے سید سجاد حسین صاحب ایم۔اے مددگار پروفیسر اردو (عثمانیہ یونیورسٹی) سے اس مشہور کتاب کا اردو ترجمہ کرا کے شائع کر دیا ہے۔ ترجمہ جیسا بھی ہے غنیمت ہے لیکن ہمیں افسوس ہے کہ پروفیسر سجاد صاحب نے ترجمے کا کام بہت بے پروائی سے کیا ہے۔ جگہ جگہ زبان الجھی ہوئی ہے اور زبان کے خلافِ محاورہ استعمال کا نتیجہ اس کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ کاش سید صاحب اصل کو سمجھنے میں اور پھر اسے اپنی زبان سے ادا کرنے میں ذرا سی زیادہ توجہ سے کام لیتے۔

بہرحال سید صاحب کا شکریہ ادا کرنا لازم ہے۔ آخر انہوں نے ایک ضخیم کتاب کا ترجمہ کرنے میں کافی زحمت اٹھائی ہوگی۔ اور پھر اردو جاننے والے تو صرف انہیں کی وساطت سے براؤن کی شہرۂ آفاق کتاب کے مطالب تک پہنچ سکتے ہیں۔ امید ہے کہ طبع دوم کے وقت سید صاحب کو نظرِ ثانی کرنے کا موقع مل جائے گا اور ان کی کتاب کا نقشِ ثانی پہلے سے بہتر ہوگا۔ اردو کا کوئی کتب خانہ اس کتاب سے خالی نہ رہنا چاہئے۔ مجلد للعہ۔ غیر مجلد للعہ۔ پتہ اوپر لکھا ہے۔

تصحیح:- مکاتیبِ مہدی کی قیمت گزشتہ پرچے میں عہ درج ہوئی ہے۔ اصل قیمت ۸/ر ہے۔

نمبر (۶)

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ دسمبر ۱۹۳۸ء

تصاویر:۔ (۱) غازی مصطفےٰ کمال پاشا۔ (۲) رؤف پاشا (۳) عصمت پاشا (۴) کمال اتاترک

شمار	مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ
۱	غازی مصطفےٰ کمال	بشیر احمد	۸۶۲
۲	اُردو ادبیات کی تجدید	جناب محمد صادق صاحب قریشی رامداسی بی۔اے	۸۶۹
۳	دُعا (نظم)	حضرتِ اثر صہبائی	۸۷۴
۴	جمہوریہ ہسپانیہ اور خانہ جنگی	جناب عبدالحفیظ صاحب	۸۷۵
۵	فکر و عمل (نظم)	حضرتِ ماہر القادری	۸۸۶
۶	فارسی شاعری میں ظرافت	مولانا مہر محمد خاں صاحب شہاب	۸۸۷
۷	میری ہستی (نظم)	حضرتِ الطاف مشہدی	۸۹۳
۸	انتقام (افسانہ)	ملک عطاء اللہ صاحب کلیم ایم۔اے	۸۹۴
۹	دو نغمے	جناب محمد ایوب صاحب	۹۰۴
۱۰	آئینۂ حیرت (غزل)	جناب عبدالمجید صاحب حیرت	۹۰۵
۱۱	"ساری"	جناب حمید نظامی۔ بی۔اے	۹۰۶
۱۲	کیلاش کنول (تراجم از پیامِ مشرق)	حضرتِ مقبول احمد پوری	۹۱۳
۱۳	گداگر	جناب محمد حسین صاحب غازی، ایڈیٹر "امدادِ باہمی" جموں	۹۱۵
۱۴	نعت	جناب امرچند صاحب قیس جالندھری	۹۱۶
۱۵	چچا ہمبرق کی جائداد (افسانہ)	جناب ف۔م افضل صاحب ایم۔اے	۹۱۷
۱۶	اوراقِ پارینہ	حضرتِ حفیظ ہوشیارپوری ایم۔اے	۹۲۳
۱۷	جوانی (نظم)	خانصاحب حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر اکبرآبادی	۹۲۴
۱۸	جوانی "	جناب اختر ہوشیارپوری	۹۲۵
۱۹	آرام (افسانہ) اوراق غائب	صاحبزادہ احمد ندیم قاسمی بی۔اے	۹۲۶
۲۰	محفلِ ادب		۹۳۰
۲۱	مطبوعات		۹۳۵

چندہ سالانہ ... ششماہی ... مع محصول ... قیمت فی پرچہ ...

غازی مصطفےٰ کمال

"ہم ایک کام کرنے والی قوم ہیں ایک غریب قوم جو اپنی معاش کے لئے کام کرتی ہے جو اپنی آزادی کے لئے جد و جہد کرتی ہے"۔ شاید سترہ اٹھارہ سال ہوئے کہ کمال پاشا نے یہ الفاظ کہے۔ ان سترہ اٹھارہ سالوں میں اُس نے اس کام کرنے والی غریب قوم کو جسمانی و روحانی بندشوں سے آزادی دلائی اور اُسے ایک باعزت معاشی زندگی کے رستے پر لگایا یعنی اس مقابلے کی دُنیا اور اس کشمکش کی زندگی میں اس نے اپنی قوم کو صحیح طور پر جد و جہد کرنا سکھا دیا!

ایک اکیلا آدمی کیا کچھ کرسکتا ہے ایک فرد اپنی تدبیر و ہمت سے ساری قوم کی بگڑی ہوئی تقدیر کو کس طرح بنا سکتا ہے یہ کمال نے کرکے دکھایا!

مصطفےٰ کمال ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ سالونیکا میں ایک معمولی کلرک تھا جو بڑی مشکل سے اپنا گزارہ کرتا تھا۔ مصطفےٰ نو سال کا تھا کہ اُس کا باپ مرگیا۔ وہ شروع سے خود دار اور آزاد مزاج تھا۔ ایک روز اُس کے معلم نے اُسے خوب پیٹا اس پر وہ سکول سے بھاگ آیا اور پھر وہاں جانے سے اُس نے قطعاً انکار کردیا۔ اُس کے باپ کی خواہش تھی کہ وہ تجارت کرے، ماں چاہتی تھی کہ وہ مُلا بنے۔ باپ کی وفات کے بعد ایک روز ماموں نے کہا کہ اُسے سپاہی بننا چاہیے۔ یہ تجویز مصطفےٰ کو دل سے پسند آئی، ماں نے بہتیری مخالفت کی لیکن وہ خاموشی سے ایک فوجی سکول میں داخل ہوگیا۔ وہاں اُس کا اُستاد کپتان مصطفےٰ اُس کے کام سے اتنا خوش ہوا کہ اس نے دُوسرے ہی سال ہی سے عارضی طور پر ایک جماعت کا معلم بنا دیا اور اپنے آپ سے تیز کرنے کے لئے اور غالباً اُس کی قابلیت سے متاثر ہوکر اُسے مصطفےٰ کمال کا نام دے دیا۔ سترہ سال کی عمر میں وہ مناستر کے فوجی مدرسے میں اور بیس سال کی عمر میں قسطنطنیہ کے شاف کالج میں داخل ہوا۔ ۱۹۰۵ء میں اُسے فوج میں کمیشن دے کر دمشق بھیج دیا گیا۔

۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۸ء تک کمال ترکی کی سب لڑائیوں میں لڑا۔ روسیوں کے خلاف ارمنوں کے خلاف طرابلس میں بلقان میں درہ دانیال میں فلسطین میں وہ ہر جگہ موجود تھا لیکن فطرۃً وہ انقلاب پسند تھا اور شروع سے ترکی حکومت کی خرابیوں اور کمزوریوں پر دانت پیستا تھا جب وہ کالج میں گیا تو اُس نے دیکھا کہ وہاں طلبہ کی ایک انقلابی انجمن "وطن" کے نام سے قائم ہے وہ اُس کا سرگرم رکن بن گیا۔ سلطان کی حکومت کو اس کا پتہ چلا تو اُس نے کمال کو جیلخانے میں ڈال دیا عجب نہ تھا کہ یہاں اُس کا خاتمہ کردیا جاتا لیکن خوش قسمتی سے وہ رہا کردیا گیا۔ باوجود اس کے کالج چھوڑنے کے بعد بھی وہ جہاں گیا اُس نے اس انجمن کی شاخیں قائم کیں اور اس سلسلے میں تن دہی سے کام کیا۔ ۱۹۰۸ء کے ترکی انقلاب میں اُس نے نمایاں حصہ لیا لیکن انور پاشا اور اُس کے رفقاء نے اُسے لوگوں کی نظروں سے دُور رکھا یہی حال دوسری بلقانی جنگ میں بھی ہوا جب انور پاشا نے مصطفےٰ کمال کی معیت میں ادریانوپل پر جاکر قبضہ کرلیا۔ لیکن جنگِ عظیم کے چھڑنے پر درہ دانیال میں کمال کی قابلیت چھپائے نہ چھپ سکی۔ ایک نازک وقت پڑ رہی تھا جس کی ذکاوت اور ہمت ترکی کے آڑے آئی اور قسطنطنیہ انگریزوں کی گرفت سے بچ گیا۔ مشہور واقعہ ہے کہ یہاں اُس کی گھڑی پر ایک انگریزی گولی لگی۔ یہ گھڑی کمال نے تحفۃً جرمن کمانڈر کو دے دی۔ ۱۹۳۶ء میں ترکی حکومت نے ۳ ہزار پونڈ کا انعام مقرر کیا [illegible] طرح یہ دلچسپ یادگار ترکی کے قبضے میں آ

جائے مگر بدقسمتی سے گھڑی کہیں گم ہو چکی تھی۔ گیلی پولی کے اس معرکے کے بعد مصطفےٰ کمال کو کوئی گمنامی میں نہ رکھ سکتا تھا۔ ترکی کے سب سے قابل فوجی سرداروں میں ایک وہ بھی تھا۔ لیکن جنگ کے خاتمے اور ترکوں کی شکست پر قدرت نے صرف ایک اسی کو تاکا کہ وہی ہے جو اپنے کمزور وطن کو ہلاکت اور تباہی سے بچائے گا!

قدرت نے پکارا اور مصطفےٰ کمال نے لبیک کہا۔ ترکی کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ جرمنی اور اس کے حلیف ہتھیار ڈال چکے تھے، دُنیا اتحادیوں کا لوہا مان رہی تھی اور وہ ترکی کے حصے بخرے کر چکے تھے، جو کچھ برائے نام باقی تھا وہاں بھی ترکوں کی آزادی پر ہزار بندشیں عائد کیے جانے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ اتنے میں ملک میں خانہ جنگی شروع ہو گئی اور اتحادی اشارے پر یونانی سمرنا میں اُتر پڑے لیکن ترک سرفروشوں کا ایک گروہ ابھی باقی تھا جو موت کو غلامی پر ہزار بار ترجیح دیتے تھے۔ مصطفےٰ کمال نے اس منتشر جماعت کو اکٹھا کیا اور اپنے عزم و ہمت سے مُردہ قوم میں ایک نئی روح پھونک دی۔

سلطان نے اُسے اناطولیہ بھیجا کہ قومی شورش کرنے والوں کی سرکوبی کرے۔ ۱۹ مئی ۱۹۱۹ء کو جب وہ سمسون کی بندرگاہ میں اُترا تو اس نے سُنا کہ چار روز پہلے یونانی سمرنا میں ڈیرے ڈال چکے ہیں۔ اُس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وطن ڈوب رہا ہے اس کا بچاؤ لازم ہے۔ یہ خاموشی اور انتظار کا وقت نہیں عمل اور جدّوجہد کی گھڑی ہے۔ سلطان نے اُسے واپس بلا بھیجا۔ اُس نے جواب دیا کہ میں یہیں اناطولیہ میں ہوں گا جب تک کہ قوم اپنی آزادی حاصل نہ کر لے۔ پہلے ارض روم اور پھر سیواس میں قومی مجلس طلب کی گئی اور قومی ترتیب و تنظیم کا کام بڑے زور شور سے ہونے لگا۔ یہ دیکھ کر قسطنطنیہ کی حکومت نے پہلے تو قوم پرست نمائندوں کی گرفتاری کا حکم دیا جس کے سلسلے میں کمال بال بال بچ گیا لیکن بعد میں اسی حکومت نے مصلحتہً اس قومی پارلیمنٹ کو قسطنطنیہ آنے کی دعوت دی۔ باوجود کمال کی مخالفت کے ارکان دارالخلافہ میں خوش خوش پہنچے اور وہاں اُنہوں نے اپنا "قومی معاہدہ" شائع کیا جس کی رو سے ترکی کو اپنے قومی حدود میں پوری آزادی کا حق حاصل ہونا تھا۔ اس کے ڈیڑھ ماہ بعد اتحادیوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا اور جتنے قوم پرست اُن کے ہاتھ آئے اُن کو پکڑ کر جلاوطن کر دیا۔ جون میں یونانی سمرنا کی طرف بڑھے، جولائی میں وہ قسطنطنیہ پر چھا گئے۔ اگست میں ترکی کی موت کا حکم عہد نامہ سیورے کی صورت میں سُنایا گیا! اس کے بعد مصطفےٰ کمال کو کچھ کہنے سُننے کی ضرورت باقی نہ رہی اور ایک ایک ترک اُس کے جھنڈے تلے جمع ہونے اور لڑنے مرنے کو ہمہ تن تیار ہو گیا۔

کمال کا کام سخت دشوار تھا۔ سلطان کی حکومت نے اُس کے اور اُس کے رفقا کے خلاف موت کا حکم صادر کر دیا تھا اور مذہبی پیشواؤں کی مدد سے اعلان کیا تھا کہ جو شخص ان لوگوں کو قتل کرے گا وہ دونوں جہان میں سُرخ رو ہو گا۔ فوج ندارد، روپیہ ندارد، دُنیا کی بڑی سے بڑی طاقتیں مخالف۔ اُدھر یہ سب کچھ تھا لیکن اِدھر ایک عزم کی چنگاری اور ہزاروں لاکھوں دل اس ایک چنگاری سے جل اُٹھنے والے موجود اور یہ محسوس کرنے والے کہ جو ہو سو ہو اب زندہ رہیں گے تو آزاد ہو کر رہیں گے ورنہ لڑیں گے اور لڑتے لڑتے جان دے دیں گے۔ کمال ایک تھا لیکن یہ سب لوگ تھے گویا اُس کے کمالات! ایسی آگ کے آگے خاک کی کیا حقیقت تھی! ۱۹۲۰ء میں کمال نے ترکوں سے خطاب کر کے کہا کہ "یا فتح پاؤ یا مر مٹ جاؤ"!

پہلے یونانی بڑھے اور کئی سو میل تک بڑھتے گئے۔ وہ ہر جگہ فتحیاب ہوئے البتہ ۱۱ جنوری ۱۹۲۱ء کو اِنونو کی لڑائی میں ترکوں نے عصمت پاشا کی قیادت میں اُن پر کامیابی حاصل کی۔ یہ پہلی ترکی فتح تھی اور اسی کی یاد میں کمال نے بعد کو عصمت کو عصمت اِنونو کا خطاب دیا۔ پھر بھی یونانی سیلاب نہ رُک سکا۔ یہاں تک کہ وہ انگورہ سے چالیس میل پر پہنچ گیا۔ یہاں دریائے سقاریہ کے کنارے ۲۴ اگست سے ۱۲ ستمبر ۱۹۲۱ء تک اکیس دن تک وہ جنگ برپا رہی جو دُنیا کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔ یونانی اسی ہزار تھے ترک صرف پچیس ہزار لیکن یہ جان توڑ کر لڑے۔ دن کو مہلک راتوں کو

...کمال روز و شب اس رُوح فرسا جنگ کی روحِ رواں بنا رہا۔ آخر ایک رات محاذ سے ٹیلیفون آئی۔ کمال نے کہا "اچھا تو تم کہتے ہو کہ آج لڑائی ہمارے حق میں ہے"۔ اس جنگ میں ۶۵۰۰ ترک کام آئے لیکن ان کی موت سے ترکی کو ایک نئی زندگی مل گئی۔

پھر کیا تھا، کمال نے قدم بڑھایا، کامیابی نے پاؤں چومے۔ ہر طرف حالات موافق ہوتے گئے۔ شاہِ یونان کو ایک بندر نے کاٹ کھایا۔ وہ مر گیا تو جرمن دوست قسطنطین تخت پر بیٹھا جسے دیکھ کر اتحادیوں کی یونان دوستی سرد پڑ گئی۔ فرانس نے چپکے سے ترکی سے ایک معاہدہ کر لیا۔ روس پہلے ہی مددگار تھا، اطالیہ بھی ہتھیار بیچ رہا تھا۔ کمال کے ساتھیوں نے بہتیرا زور دیا کہ صلح کر لینی چاہئے مگر کمال ارادہ کر چکا تھا کہ جب تک سارے مُلک کو دشمن کے خونی پنجوں سے نہ چھڑا لوں گا دم نہ لوں گا۔ چنانچہ آئندہ سال ۲۶ اگست کو اُس نے جارحانہ کارروائی شروع کی اور ترکی فوج کے نام پیغام بھیجا کہ "جنگجوؤ! بڑھے چلو، تمہاری منزلِ مقصود بحرِ روم ہے"۔ اس پر ترکوں نے اس زور سے حملہ کیا کہ چودہ دن میں شکستوں پر شکستیں کھاتے ہوئے یونانیوں کو سمرنا میں اپنے جہازوں میں سوار ہو کر بھاگتے بنی۔

دُنیا مرحبا کہہ اُٹھی، ملک ملک سے مبارکباد کے پیغامات آنے لگے، ترکوں کی خوشی کی انتہا نہ تھی لیکن کمال جانتا تھا کہ یہ اُس کے کام کی محض ابتدا ہے، ابھی فقط بنیاد رکھی گئی ہے، ابھی نئی ترکی کی وہ تعمیر ہونی ہے جس میں ہزاروں مشکلوں کا سامنا ہوگا لیکن وہ مصطفٰے کمال نہ ہوتا اگر وہ ان مشکلوں سے ڈر یا جھک جاتا نہیں بلکہ اس عظیم الشان انسان نے خود پُرانی آسانیوں کو نئی مشکلوں میں تبدیل کیا اور پھر ان مشکلوں کو ایک ایک کر کے یوں حل کیا کہ دُنیا حیرت میں رہ گئی!

اُس نے سُلطان کا عُہدہ اُڑا دیا۔ اور لوزان کے معاہدے کے ذریعے سے جس میں لارڈ کرزن چار ماہ تک عصمت کے مدبرانہ بہرے پن سے فضول بحث کرتا رہا ترکی نے جو اعلان چار سال پہلے دُنیا کے سامنے کیا تھا اُس کے مطابق صلح کی شرائط منوا لیں۔ ترکی اپنی قومی حُدود میں صحیح معنوں میں آزاد ہو گیا، ایسا جیسا وہ کبھی اپنی وسیع سلطنت کے زمانہ میں بھی نہ ہُوا تھا۔ ترکی کی سب سے بڑی فتح یہ تھی کہ اُس نے دُنیا کی سب سے بڑی طاقت انگلستان کو شکست دی، انگلستان جس کی سلطنت پر سُورج کبھی نہیں ڈوبتا، اُس کے غرور کا جھنڈا پہلی بار کمال کے ہاتھوں سرنگوں ہُوا۔ نہ صرف دردانیال میں اور قطالعمارہ میں بلکہ دریائے سقاریہ کے کنارے اور لوزان کانفرنس میں ترکی کو فتح نصیب ہوئی اور انگلستان اور اُس کے حواریوں کو فاش شکست ملی۔ لائڈ جارج سے گرگ کی شیخی کرکری ہوئی اور کمال کے نام کا چار دانگ عالم میں ڈنکا بجنے لگا۔ اب کسی بیرونی طاقت کو ترکی کے کسی مُلکی معاملے میں دخل دینے کا حق باقی نہ رہا تھا۔ انگورہ دارالسلطنت قرار پایا اور ۲۹ اکتوبر ۲۳ء کو جمہوریہ ترکیہ کا اعلان کیا گیا اور مصطفٰے کمال اُس کا مستقل صدر بنا۔

آئندہ سال خلافت منسوخ کی گئی اور کمال نے اپنی اُن اصلاحات کو نافذ کرنا شروع کیا جن سے اُسے ترکی کو ایک نیا ترکی بنانا مقصود تھا۔ درویشوں کا اثر اور مُلاؤں کا اقتدار مٹا دیا گیا۔ ۲۵ء میں رُومی ٹوپی کی جگہ یورپی ہیٹ کا پہننا لازمی کیا گیا۔ ۲۶ء میں قوانین کے ضمن میں سوئٹزرلینڈ کا دیوانی ضابطہ، اطالیہ کا فوجداری ضابطہ اور جرمنی کا تجارتی ضابطہ رائج کیا گیا۔ پردہ حکماً اُٹھا دیا گیا۔ عورتوں کے لئے ملازمت کے دروازے کھول دیئے گئے اور تین سال بعد ۱۹۲۹ء میں اُنہیں مقامی انتخابات میں رائے دینے کا حق دیا گیا۔ ۸ فروری ۱۹۳۵ء کو سترہ عورتوں نے ترکی پارلیمنٹ میں رُکنیت کا حلف اُٹھایا۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کمال جس نے ترکی عورتوں کو

اتنے حقوق دیئے خود خانگی زندگی کی خوشیوں سے زیادہ لطف نہ اُٹھا سکا۔ جب وہ صاحبِ اقبال ہُوا تو وہ اپنی ماں کو استنبول میں لے آیا لیکن وُہ ۲۳ء میں وفات پاگئی۔ ۲۵ء میں شاید بمشکل تین سال کی رفاقت کے بعد اُس میں اور اُس کی بیوی لطیفہ خانم میں ناچاقی اس قدر بڑھ گئی کہ کمال نے اُسے طلاق دے دی۔ اس کے بعد اُس نے ایک لڑکی زہرہ کو متبنّیٰ بنایا اور اُس کو بہترین تعلیم دی لیکن بدقسمتی سے نومبر ۳۵ء میں وہ ایک حادثے میں مرگئی اور کمال پہلے کی طرح تن تنہا رہ گیا۔ لیکن کمال کی تنہائی کی تاریکیوں میں ہمیشہ قومی خدمت کی روشنی جلوہ گر رہتی۔ اُس نے کئی یتیموں کی پرورش کی اور اُنہیں اچھے رُتبے پر پہنچایا۔ اپنے ہم قوموں کی ترقی کے سوا اور کوئی چیز اُس کے پیشِ نظر نہ تھی۔

۱۹۲۷ء میں کمال نے سات لمبی راتوں کی تیاری کے بعد مجلس ملّیہ کے سامنے ایک زبردست تقریر کی جو برابر چھ روز تک جاری رہی۔ اس میں اُس نے بتایا کہ نیا ترکی کیا کر چکا ہے اور ابھی کیا کچھ کرنا باقی ہے۔

اُس نے مُلکی زندگی کے ایک ایک شعبے کی طرف توجہ کی۔ نومبر ۲۸ء میں لاطینی حروف جاری کیے گئے۔ کمال خود لاطینی حروف سیکھنے کے بعد اپنے تمام وزیروں کو قسطنطنیہ لے گیا اور وہاں اُس نے بڑے پیمانہ پر ایک پارٹی دی جس میں تختہ سیاہ پر چاک سے اس نے نئے حروف کا پہلا سبق ترکوں کو دیا اور صرف یہی نہیں بلکہ یہ تختہ سیاہ اور چاک لے کر وہ شہروں میں اور گاؤں گاؤں پھرا۔ اس پر عصمت نے کمال پر پروفیسرِ اعظم (ہیڈ پروفیسر اِن چیف) کی پھبتی کہی۔

اِن اصلاحات پر مُلک کے بعض طبقوں میں ناراضی پھیلی لیکن مصطفےٰ کمال اپنا ارادہ پکا کر چکا تھا۔ پہلے ۲۶-۲۵ء میں اور پھر ۳۰-۲۹ء میں کُردوں کی بغاوت ہوئی، شورشیں ہوئیں، جہاد کا نعرہ بلند کیا گیا۔ آرم سٹرانگ کمال کا انگریزی سیرت نگار جو کمال کی انگریز دُشمنی سے جلا بُھنا بیٹھا ہے اُس کی شراب نوشی اور زن پسندی کا طعنہ دیتا ہے، بیان کرتا ہے کہ ہر بار جب کوئی شورش اُٹھتی تھی تو کمال اپنے عیش و آرام کو چھوڑ کر اس طرح اپنے کام اور میدانِ جنگ کی طرف لپکتا تھا جیسے وہ کوئی جنگھاڑنے والا "بھورا بھیڑیا" ہو۔ ہر بار جب مُلک میں بدامنی پھیلی اور لوگ سمجھے کہ شاید اب کمال میں پہلے سا جوش و خروش باقی نہیں رہا تو اُس نے دن رات مہینوں تک ایسی سرگرمی دکھائی کہ دُنیا واہ وا اور قوم آمنّا و صدقنا کہہ اُٹھی!

اگست ۳۰ء میں اُس نے تجربے کے طور پر مجلسِ ملّیہ میں ایک مخالف پارٹی کے قیام کی اجازت دے دی لیکن جب اس سے مُلک میں خرابی پیدا ہوئی تو اسے موقوف کر دیا۔ اور اپنی آمریت کا خود اعلان کیا۔

وُہ ترکوں کی نبض پہچانتا تھا۔ وہ ترکی کی ضروریات سمجھتا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اُسی نے ترکی کو زندہ کیا ہے اور وُہی ابھی اُسے زندہ رکھ سکتا ہے۔ ۱۹۲۶ء میں جب بغاوت ہوئی تو اُس نے کہا کہ "میں ترکی ہوں۔ مجھے تباہ کرنا ترکی کو تباہ کرنا ہے۔" ۱۹۲۸ء میں جب عصمت نے کہا کہ گو غازی قوم کا نمائندہ ہے لیکن مُلک کی حاکم حکومت ہے" تو کمال نے مختصر لفظوں میں صاف کہہ دیا کہ "حکومت میں کرتا ہوں۔"

یہ سب کچھ محض مُلک کی خاطر تھا ورنہ اُسے کوئی ہوس نہ تھی۔ جون ۳۷ء میں اُس نے اپنی تمام جائداد قوم کی نذر کر دی جس پر مجلسِ ملّیہ نے اُسے "اتاترک" یعنی ترکوں کے باپ کا خطاب دیا۔

بعض جزوی اُمور میں اُس کی رائے اور قدم غلط ہی لیکن یہ واقعہ ہے کہ اُس نے جو کچھ کیا نیک نیتی سے کیا۔ اُس کے پیشِ نظر ترکی کی بہبود تھی۔ اور سوائے چند قدامت پسندوں کے کسی نے اُس کی مخالفت نہ کی۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ اُس کی ہر بات کو دُرست سمجھتے تھے بلکہ یہ کہ وہ اُن کا

اتاترک تھا، یہ وہی تھا جس نے اُن کے تباہ شدہ مُلک کو زندہ و تابندہ کیا تھا پھر وہ کس طرح اُس کے حکم سے سرتابی کرتے، اُسی نے ترکی کو ترکی بنایا تھا سو وہ اُن سب کا محبوب اور اُن کی آنکھوں کا تارا تھا اور وہ جان و دل سے اُس کے پیرو تھے۔ کمال نے جس مضبوطی سے ترکی کی ملکی بنیادوں کو اُستوار کیا اُس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اُس کے انتقال پر ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر نہایت اطمینان سے عصمت انونو کو جمہوریہ کا صدر منتخب کیا گیا اور نئے صدر نے فوراً اتاترک کی پالیسی پر قائم رہنے کا اعلان کر دیا۔

کمال نے اپنے ہم وطنوں کی نظر میں یہ مرتبہ آسانی سے حاصل نہ کیا تھا۔ آغازِ جوانی میں وُہ قید ہُوا پھر کئی بار وہ قید ہونے سے بمشکل بچا اور ۱۹۱۹ء کی قومی جدوجہد شروع ہونے پر تو اُس کی زندگی ہر وقت خطرے میں تھی۔ صدرِ جمہوریہ بن کر بھی اُسے چین لینا نصیب نہ ہُوا کئی شورشیں اُٹھیں، کئی بغاوتیں برپا ہوئیں۔ اس کے علاوہ عمر بھر وہ دوسروں کے رشک و حسد کا نشانہ بنا رہا لیکن کمال سی شخصیتیں نہ امن ڈھونڈتی ہیں نہ پا سکتی ہیں، ایسے انسان مخالفت سے اُبھرتے اور خطروں میں پنپتے ہیں۔ وہ دوسروں کی تعریف کے بھوکے پیاسے نہیں رہتے۔ دُنیا کچھ کہا کرے وہ اپنا منصبی کام کئے جاتے ہیں اور اسی کو منتہائے زندگی تصوّر کرتے ہیں۔

ایک لغو بہتان اس پر باندھا جاتا ہے کہ وہ اسلام سے منحرف تھا اور اس کے اثر سے تُرک اپنے مذہب سے بے پروا ہو گئے مگر نمازِ عید میں اُس کی شرکت اُس کے اعتقاد کا ثبوت ہے، خطبے میں اُس نے ترکوں سے کہا کہ اپنے دین پر قائم رہو اور اپنے وطن سے محبت رکھو۔ وہ اپنے آپ کو پیغمبرِ اسلام کے غلاموں میں شمار کرتا تھا۔ ڈاکٹر راندرن جو ۱۹۳۲ء کے سرما میں انگورہ میں کمال کے مہمان رہے لکھتے ہیں کہ "اُس کے دِل میں اسلام کی تڑپ ہے اور مسجدیں پہلے سے زیادہ آباد ہیں"۔ کمال نے ایک موقع پر کہا کہ "ہم نے ناموسِ اسلام کی خاطر مسلسل جہاد کیا اور آئندہ بھی تلواروں کے سائے میں اسلام کی حفاظت کریں گے۔ اسلام ہماری عزیز ترین متاع ہے ہاں ہم فریب کار اور دغاباز مذہبی پیشواؤں کے دشمن ہیں"۔

نپولین کی طرح کمال میں یہ وصف تھا کہ وہ نہ صرف ایک بہادر سپاہی اور ایک قابل سپہ سالار تھا بلکہ ایک دُور اندیش مدبّر اور ایک سرد مزاج ناظم بھی تھا۔ اور اُس نے اپنی معاشی اصلاحات سے ترکی کی قومی بنیادوں کو خوب مستحکم کر دیا۔ بنک قائم ہوئے اور ریلیں کارخانے بجلی گھر بنائے گئے۔ ۱۹۲۷ء میں ملک میں نوّے کروڑ کی چیزیں تیار ہوئی تھیں۔ ۱۹۳۶ء میں ۴ ارب ۳۸ کروڑ کی۔ شکر، کپڑا، کاغذ یہ ملک کے اندر ہی تیار ہونے لگے۔ معاشی ترقی کے لئے دسمبر ۱۹۳۳ء میں پہلی پنجسالہ سکیم کا آغاز ہُوا اور ۱۹۳۷ء کے اخیر سے پہلے ہی دوسری پنجسالہ سکیم شروع کر دی گئی جس میں زراعت اور معدنیات کو خاص جگہ دی گئی۔

کمال کی آزاد خیالی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُس نے جرمنی کے دھتکارے ہوئے یہودیوں کو بُلا کر اپنی بعض درسگاہوں کی خدمت اُن کے سپرد کی، اُس نے دو ہزار ملک بدر روسیوں کو بھی ترکی میں شہری حقوق دیئے۔ شہریت کے سلسلے میں اُس نے ایک اور عجیب و غریب تجربہ کیا۔ خالدہ ادیب لکھتی ہیں کہ اُس نے دس سے پندرہ برس تک کے سکول میں پڑھنے والے بچوں کو سال میں ایک ہفتے کے لئے شہروں اور قصبوں کا انتظام کرنے کا اختیار دے دیا۔ دُنیا میں کتنے جنگجو گزرے ہیں جنہوں نے آئین بندی اور شہری حقوق کے معاملے میں ایسی توجہ اور اتنی مہارت دکھائی ہو؟ کمال واقعی صاحبِ کمال تھا

زندگی کے آخری چار سالوں میں کمال نے یورپ و ایشیا کی کئی طاقتوں سے ترکی کا رشتہ جوڑا اور معاہدے اور اتحاد قائم کئے۔ لیکن یہ کس طرح ممکن ہُوا؟ محض اس طرح کہ پہلے اُس نے ملک کو آزاد کیا، قوم کو متحد کیا، فضول رسمیں موقوف کیں، قسمت کی جگہ انسانی ہمت کو اُبھارا۔ معاشی حالت درست کی پھر جب ملک مضبوط ہو گیا اُس کی طاقت ہر طرح دوسروں پر عیاں ہونے لگی تو اُس نے قوموں اور مُلکوں کو جو صدیوں سے ترکوں کے خون کی پیاسی تھیں، ترکی سے سیاسی رشتے قائم کرنے کے لئے انتہا درجہ خواہش مند پایا، اس طرح خودداری حاصل کر کے کمال نے اپنی فیاضی اور دُور اندیشی کا ثبوت دیا۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں یونان سے معاہدہ ہُوا۔ ۱۹۳۴ء میں بلقانی معاہدہ یعنی ترکی، یونان، رومانیہ اور یوگوسلاویہ کے درمیان صلح کا عہدنامہ ہُوا۔ یہ محض ترکی کی طاقت کا باعث تھا کہ ۲۰ر جولائی ۱۹۳۶ء کو دردانیال کے متعلق مونٹرو کی اہم مفاہمت عمل میں آئی جس سے اطالیہ کے سوا باقی اکثر دولِ یورپ نے ترکی کا دردانیال کی قلعہ بندی کا حق تسلیم کر لیا۔ ۱۹۳۷ء میں اسکندرونہ کی سنجق کے متعلق فرانس اور ترکی کا معاہدہ ہُوا اور تُرکوں کو اسکندرونہ میں خاص حقوق حاصل ہو گئے۔ اسی سال سعدآباد کا وہ مبارک اسلامی عہدنامہ ہُوا جس کی رُو سے تُرکی، عراق، ایران اور افغانستان کی اسلامی حکومتوں نے آپس میں اتحاد قائم کر لیا۔ اپنی زندگی کے آخری سال میں کمال نے انگلستان اور جرمنی سے تعلقات بڑھائے اور اُن سے قرضے لے کر اُسے تُرکی کی بحری طاقت اور معاشی ترقی میں صرف کرنا شروع کیا۔ اس سے کمال کا تدبّر اور زمانہ شناسی ظاہر ہوتی ہے۔ دراصل ترکی کو کمال نے اس قدر مضبوط بنا دیا تھا کہ نہ صرف چھوٹی چھوٹی بلقانی ریاستیں بلکہ بڑی بڑی یورپی طاقتیں بھی اب تُرکی سے تعلقات بڑھانے کی خواہش مند نظر آنے لگیں۔ فلسطین کے متعلق اُس کے احتجاج کا انگلستان پر خاصا اثر پڑا۔ تُرکی اب ایک الگ تھلگ مُلک نہ رہا تھا۔ یورپ اور ایشیا کے اکثر چھوٹے ملک خود بخود اُس کی طرف کھنچے چلے آئے اور بڑی طاقتوں نے بھی اُس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ کمال نے اُدھر رُوس سے اور اِدھر انگلستان اور جرمنی اور فرانس سے رابطہ پیدا کیا۔ مغرب میں وُہ بلقانی ریاستوں کا مددگار ہُوا، مشرق میں وہ اسلامی ملکوں کا حلیف بنا۔ گویا تُرکی مشرق و مغرب کو مِلا دینے والی طاقت بن گئی!

تُرکی کی یہ اندرونی طاقت اور یہ بیرونی وقار سب فقط ایک شخص کی پُرخلوص کوششوں کا نتیجہ تھا۔ پھر اُس کا مُلک اور دُنیا اُس کی جتنی بھی تعریف کرے کم ہے۔ انگلستان کے اخبارات نے اُس کے انتقال پر ایسے ایسے مضامین لکھے جو آج کل کے زمانے میں کسی غیر حکمران کو نصیب نہ ہوئے تھے۔ ٹریبیون اخبار (لاہور) نے لکھا کہ اُس کے کارناموں کی نظیر دُنیا کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔ متعدد لوگوں نے اُس کے کام کو معجزہ سے تعبیر کیا ہے۔ کمال کی وفات پر ترکی مجلس مِلّی نے فیصلہ کیا کہ اس موقع پر ایک لاکھ پونڈ صرف کئے جائیں۔ نیز انقرہ کو اُس کی یادگار کے طور پر اتاترک کا نام دیا گیا۔

کمال کی سیرت کی مضبوطی ایک چٹان کی طرح تھی۔ مرنے سے تین ہفتے پہلے ۱۲ر اکتوبر ۱۹۳۸ء کو وُہ سخت بیمار ہو گیا۔ وزیر

سب استنبول میں جمع ہو گئے اور اُس کے جانشین کی تلاش ہونے لگی۔ لیکن ایک صبح وہ اُٹھا، اُس نے لیمونیڈ اور تازہ اخبار منگایا اور پھر پُرزور آواز میں کہا "میں اچھا ہو جاؤں گا۔" اور وزیرِ اعظم سے اُس نے کہا کہ "تم سمجھتے تھے کہ میں مرنے لگا ہوں لیکن میں مروں گا نہیں، میں زندہ رہوں گا۔" چنانچہ صحت بحال ہو گئی اور جمہوریت کی پندرھویں سال گرہ بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔

لیکن تقدیر کو کچھ اور منظور تھا۔ چند روز کے بعد پھر مرض کا دَورہ ہُوا اور ۱۰ ر نومبر ۱۹۳۸ء کو یہ عظیم الشان انسان دُنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔

۱۸ ر نومبر کو استنبول میں والہانہ جوش کا بے نظیر منظر دیکھنے میں آیا۔ ایک لاکھ سے زائد ترک دو دو اور چار چار کی قطار میں جنازے کے پاس سے روتے ہوئے گزرتے تھے۔ ایک وقت میں ہجوم کا اس قدر زور ہو گیا کہ گیارہ آدمی ہلاک اور کئی سخت زخمی ہوئے اور ایک ہزار بچے عورتیں اور مرد بے ہوش ہو گئے۔ جمہوریہ ترکیہ کے میموریل کے سامنے تیس ہزار طلبہ نے جمع ہو کر حلف اُٹھایا کہ جس نصب العین کے حصول میں غازیِ اعظم نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی اُسی کے لئے وہ بھی اپنی جانیں وقف کر دیں گے۔ بالخصوص ترکی طالبات نے "دُنیا کے سب سے محبوب حکمران" کی یاد میں جس نے ترکی عورتوں کو مردوں کے برابر رُتبہ دیا، سب سے پُرجوش مظاہرہ کیا۔

۲۱ ر نومبر کو استنبول میں کمال کا جنازہ ایسی دھوم دھام سے نکلا کہ آج تک کسی بڑے سے بڑے سلطان کو بھی نصیب نہ ہُوا تھا۔ جنازہ کے ساتھ مختلف ملکوں کے نمائندے تھے۔ سر پر ہوائی جہازوں کا شور تھا۔ دُور سے توپوں کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ سڑکوں کے دو رویہ ہزارہا انسان کھڑے تھے اور عورتیں روتی ہوئی چلاتی تھیں "تم کہاں ہو اتاترک؛ اتاترک تم کہاں ہو!" توپ گاڑی کے پیچھے پیچھے مرحوم کی بہن بھی روتی جا رہی تھی۔ نمازِ جنازہ کے بعد ملک بھر میں تین منٹ تک خاموشی منائی گئی اور یہ دن مُلکی ماتم کا دِن قرار دیا گیا۔

کمال کو فی الحال استنبول کے ایک عجائب گھر میں عارضی طور پر دفن کیا گیا ہے۔ تجویز ہے کہ اناطولیہ کے پہاڑوں میں جہاں اُس نے ترکی قوم کو تباہی سے بچا کر دُنیا بھر میں سربلند کیا تھا، کسی موزوں مقام پر اُس کا ایک عظیم الشان مقبرہ تعمیر کیا جائے۔ مصطفےٰ کمال مر گیا لیکن ترکی کو زندہ کر گیا! وہ ایک سچا غازی تھا!

بشیر احمد

اُردو ادبیات کی تجدید

(چند افکار)

اس امر پر سب اُدبا، اور محققین متفق ہیں کہ اُردو ادبیات میں ایک زبردست انقلاب کی ضرورت ہے۔ ہمارا ادب بوسیدہ اور کمزور ہے اس لئے کہ ہم خود بوسیدہ اور کمزور ہیں۔ اسے دیرینہ غلامی کا نتیجہ کہیے یا کچھ اور۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ ہمارے اعضا مفلوج اور ناکارہ ہو چکے ہیں۔ ہمارا اپنی زبوں حالی اور پست خیالی پر قانع ہونا اس سے بھی زیادہ افسوسناک امر ہے۔ ہم دوسروں کے پھینکے ہوئے ٹکڑوں اور چبائے ہوئے نوالوں کو چبا کر جسم اور روح کا تعلق قائم رکھتے ہیں زندگی کے تمام شعبوں میں ہماری ذہنیت حد درجہ پست ہو گئی ہے۔

اس کا ثبوت محض ہماری سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی زندگی ہی سے واضح نہیں۔ سب سے زیادہ صریح اور مبرہن ثبوت ہمارے ادب سے ملے گا۔ ادب قوم کی زندگی کا آئینہ دار ہوا کرتا ہے۔ حکمار کو جب کسی ملک یا قوم کی زندگی کا مطالعہ مقصود ہوتا ہے تو سب سے پہلے ان کی نظر اس ملک یا قوم کے ادب پر پڑتی ہے۔ غلاموں کا ادب بجائے خود غلامی کی جیتی جاگتی تصویر ہوگی۔ اور اس میں بالصراحت اور بالترتیب وُہ تمام عیوب و نقائص پائے جائیں گے جو ان کی ذہنیت میں موجود ہونگے۔

ہمارے ادبیات کا سب سے بڑا نقص اصلیت کا فقدان ہے، ہمارے خیالات ہمارے اپنے نہیں۔ جو کچھ ہم لکھتے ہیں اس کا بیشتر حصہ کسی اور دماغ کی اختراع ہوا کرتا ہے۔ ہم دوسروں کے دماغ سے سوچتے ہیں۔ دوسروں کے ماحول میں بستے ہیں۔ دوسروں کی باتوں کو دلچسپ اور پُرمعنی تصوّر کرتے ہیں۔ اپنے ماحول، اپنے وطن، اپنے مشاہدات اور ذاتی جذبات قلمبند کرنے کو عار سمجھتے ہیں۔

ہندوستانی (اُردو) ادب کے محسن، مربی اور دلدادہ کس چیز کی تلاش میں مارے مارے "دیارِ غیر" میں پھر رہے ہیں۔ وُہ کونسی چیز ہے جو خود اُن کے گھر میں موجود نہیں، ان کے ماحول میں کونسی کمی، اور دوسروں کے ہاں کونسی جاذبیت ہے جو ان کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔

اے اُدبائے باکمال! خدارا بتائیے کہ آپ قمری و شمشاد۔ نرگس و نسترن۔ لالہ و ریحان اور ساقی و ساغر و مینا و جام کے پیچھے کیوں ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ سمرقند و بخارا کے بجائے دہلی اور لاہور میں رہتے ہیں۔

آپ کا وطنِ عزیز ایران یا انگلستان نہیں، ہندوستان ہے۔ آپ سرو و شمشاد کے بجائے آم اور جامن کا ذکر کیوں نہیں کرتے : بڑ اور پیپل کے سامنے آپ کو بلوط کا درخت کیوں پسند ہے ؛ چنبیلی اور موتیے کے پھول، کنول دھان کے لہلہاتے ہوئے سرسبز پودے، گندم کے سنہری کھیت۔ پھولی سرسوں کے بسنتی فرش۔ فاختاؤں کی کوکو، پپیہے کی پی کہاں، کونجوں اور بگلوں کی ڈاریں، مور اور چکور، مچھلیاں، خرگوش اور گلہریاں ـــــ یہ سب چیزیں کیا آپ کو پسند نہیں ؛ کیا آپ کو شیشم اور سرس کی ٹھنڈی چھاؤں مرغوب نہیں ؛ کیا آپ کو ساون کے کالے کالے بادل نہیں بھاتے ؛ کیا کبھی آم کے بور کی ہلکی ہلکی اور بھینی بھینی خوشبو نے آپ کے مشامِ جاں کو معطر نہیں کیا ؟ کیا کبھی پچھلے پہر کوئل کی کوک آپ کے سینے میں اترتی نہیں چلی گئی ؟ کیا سردیوں میں آپ کبھی دیر تک دھوپ میں نہیں بیٹھے ؛ اور گرمیوں میں دیر تک نہر کے پانی میں کلیلیں نہیں کرتے رہے ؟

یقیناً آپ ان تمام باتوں سے بخوبی آشنا ہیں۔ مگر صاحب ! آپ کے قلم سے ان کا ذکر بہت ہی کم ہوتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے ؟ آپ اپنے ماحول سے کیوں اس قدر بیگانہ رہتے ہیں۔ اسی ماحول میں وہ تمام "رومانیت" اور جاذبیت موجود ہے جس کے آپ شیدائی ہیں۔ غیروں کی خوشہ چینی درست نہیں۔ آپ بے تکان دوسری زبانوں اور غیر ملکی ادب سے افسانوں کے پلاٹ اور نظموں کے تخیل اڑا لیتے ہیں اور حوالہ دیئے بغیر انہیں اپنے ادب میں منتقل کئے جاتے ہیں۔ اس سے آپ شہرت تو حاصل کرلیں گے، مگر ادبی گناہ آپ کے سر لازم آئے گا اور اصل مصنف کی روح کو جو صدمہ پہنچے گا اس کے آپ ذمہ دار ہوں گے۔

یقین کیجئے، اپنے دورانِ زندگی میں مجھے سب سے زیادہ رنج اور دلی بے چینی اس وقت محسوس ہوتی ہے جب میں اپنے ادب میں کوئی ایسا افسانہ یا مضمون پڑھتا ہوں جو بلا حوالہ کسی اور جگہ سے اخذ کیا گیا ہو۔ چوری اور سینہ زوری اسی کا نام ہے۔ پلیجیارزم (Plagiarism) یعنی ادبی چوری دنیائے ادب کا گناہِ کبیرہ ہے۔ ایک دفعہ میں ایک اردو افسانہ "اتفاقات" پڑھ رہا تھا۔ افسانہ ختم کرکے دیر تک "افسانہ نویس" کی تعریف کرتا رہا۔ اور رسالہ کے حاشیہ پر اس کے فنِ واقعہ سازی کی توصیف میں ایک طویل شذرہ لکھا۔ مگر افسوس کہ وہ شذرہ مجھے حرفِ غلط کی طرح قلمزن کرنا پڑا۔ اگلے ہی دن شیکسپیئر کا ڈرامہ "شبِ دوازدہم" پڑھنے لگا۔ پلاٹ کا مطالعہ کیا تو میرے تن بدن میں گویا آگ لگ گئی اور تمام فخر ندامت میں بدل گیا۔ وہی پلاٹ تھا اور وہی کردار صرف ناموں کا تغیر۔ اس مثال سے کسی کی تضحیک مقصود نہیں۔ اپنے ادب کی بے مایگی کا دکھڑا رونا مطلوب ہے۔ یہ ایک ہی مثال نہیں۔ بیسیوں دفعہ مجھ سے یہی اتفاق ہوا ہے۔ یہ غلامانہ ذہنیت کا کھلا مظاہرہ ہے۔ اگر آپ کسی دیگر ادب سے استفادہ کرتے ہیں تو اخلاقی جرأت سے کام لیتے ہوئے اس کا اعتراف کیوں

نہیں کر لیتے ؟ اور آپ اِدھر اُدھر کیوں مارے مارے پھرتے ہیں ؟ آپ کے ہاں کس چیز کی کمی ہے ؟

آپ اپنے افسانوں اور مضامین میں مقامی رنگ پیدا کیجیے۔ کیا آپ کو اپنے ماحول میں بیسیوں افسانوں کے لئے پلاٹ نہیں ملتے ؟ کیا آپ کے اردگرد محبت نہیں کی جاتی ؟ اور ناکامی، عداوت، بے گناہی، حسد، رقابت وغیرہ جذبات اور حالات موجود نہیں۔ کیا آپ کے ماحول میں کبھی حق و باطل میں آویزش نہیں ہوئی۔ کیا آپ نے کبھی اپنی آنکھوں سے دو سچائیوں کی افسوسناک ٹکر نہیں دیکھی ؟ کیا آپ کے ملک میں بے وقت اموات واقع نہیں ہوتیں ؟ کیا آپ نے کسی ناکامِ آرزو کی خودکشی کی بابت نہیں سُنا ؟ کیا آپ کے ہاں کبھی واقعات ایسی صُورت اختیار نہیں کر لیتے کہ آپ کو امرِ واقع پر افسانہ کا شبہ ہونے لگے اور عالمِ بیداری میں خواب کا سماں نظر آئے۔ بتایئے افسانوں میں اسی قسم کی باتیں مذکور ہوتی ہیں یا کچھ اور ؟ اگر یہی ہیں تو آپ انہیں دُور دُور سے کیوں ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ غیروں کو چھوڑیئے اور اپنے گھر کی باتیں کیجیے ڈینیوب اور نیل کے بجائے چناب اور گنگا کا ذکر کیوں نہ ہو۔ مائیکل اور مارتھا کے بجائے کریم اور عائشہ، موہن اور ساوتری، کی طرف توجہ کیوں نہ کی جائے۔ ان کے جذبات قلمبند کیجیے۔ ان کی معاشرت کے خاکے پیش کیجیے، اور اس کے نقائص واضح کیجیے۔ سماج کی اصلاح ادب کے ذریعے کیجیے۔ ادب آپ کی قوم کی ذہنیت، اوضاع و اطوار، سیرت اور تقدیر تک کو بدل سکتا ہے۔ دُنیا میں اگر زندہ رہنا ہے تو اپنے ادب کو زندہ کیجیے۔ اپنے گھر کے ادب کی طرف توجہ کیجیے۔ آپ رومیو جولیٹ اور وامق وعذرا کے افسانے تو بڑے غور سے پڑھتے ہیں کبھی ہیر رانجھا اور سوہنی مہینوال کا نام بھی سُنا ؟ گوئٹے اور شیکسپیئر کے ساتھ ہی کالی داس کا بھی کوئی ڈراما دیکھا ؟ اصل نہیں تو ترجمہ ہی سہی۔ شیلے اور حافظ کے رموزِ عشق کے مقابلہ میں وارث کے خیالات کا بھی مطالعہ کیا ؟ خیام کی رُباعیات کے ساتھ بُلّھے کے "قوافی" بھی دیکھے ؟ کبھی کبیر اور تُلسی داس کے فلسفیانہ نکات پر بھی غور کیا ؟ مَیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ ان سے کسی لحاظ سے بھی ادنے یا کمتر نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم ہر چیز کو مغرب کی عینک لگا کر دیکھنے کے عادی ہو چُکے ہیں۔ اگر وُہ عینک چڑھی ہو تو چیزیں روشن اور صاف نظر آئیں گی ورنہ مدھم اور دُھندلی۔ ہمارے ہی آسام کی چائے مغرب میں جاتی ہے اور وہاں سے خوش نما ڈبوں میں بند ہو کر مختلف ناموں کے ساتھ ہمارے پاس واپس آتی ہے اور ہم اسے بہت زیادہ قیمت پر خریدنے کو تیار ہوتے ہیں۔ بالکل یہی حال ہمارے ادب کا ہے۔ مغرب کی کوئی باریک بین آنکھ اور نکتہ رس دماغ انہیں باتوں کو لیتا ہے اور ایک دلکش پیرائے میں پیش کرتا ہے۔ پھر ہمیں بھی وہ بات کچھ کچھ پسند آنے لگتی ہے۔ ایران والے خیام کو کبھی کے بھول چکے ہوتے اگر فٹز جیرالڈ اُسے ایسے محکم انداز میں اہلِ ذوق کے سامنے پیش نہ کرتا۔ جب مغرب نے نوبل پرائز دے کر ٹیگور کی قدر کی تو ہم بھی ٹیگور ٹیگور کرنے اُٹھے۔ ہم اپنے مشاہیر کو بلا واسطہ نہیں پہچان سکتے۔ کسی دن مغرب کا کوئی مردِ خدا اقبالؒ

کا پیغام سمجھے گا اور اسے حیرت انگیز وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کرے گا۔ پھر ہم اسے سمجھیں گے۔ ہمارے ملک کی تاریخ لکھتے ہیں تو مغرب کے لوگ۔ جغرافیہ لکھتے ہیں تو وُہ۔ کیا آپ نے کبھی فرشتہ اور بیرونی کی تحریریں بھی دیکھیں یا محض سمتھ اور لین پول کے دعاوی کو ناقابلِ تردید تصور کئے بیٹھے ہیں ؟

ہمارے مذہب کا جائزہ اگر کوئی لیتا ہے تو مغرب سے آکر۔ ہمارے رسم و رواج، ہمارا فن، ہماری عقل و دانش، ہماری معاشرت اور ہمارا اپنا حال لکھتے ہیں تو مغربی نقاد سے

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی!

کیا آپ نے کبھی اس امر کی وجہ دریافت کرنے کی سعی کی ؟ سبب نہایت آسان ہے، مغرب والے بیدار ہیں اور ہم خوابیدہ۔ اِن میں تجسس اور تفحص کا مادہ بہت زیادہ ہے اور ہم میں اندھا دُھند پیروی کرنے کی قابلیت لامتناہی کاش ہم زمانے کی نزاکت کو محسوس کرسکیں۔ ہم کیا کر رہے ہیں اور زمانہ کیا پُکار رہا ہے۔ ہم کدھر جا رہے ہیں، اور ترقی خواہ جماعتیں کس طرف رجُوع رکھتی ہیں۔ سنبلِ پیچاں اور نرگسِ فتاں کا ذکر چھوڑیئے۔ تیشہ، کوکنی اور کمند سے دِل اُٹھائیے۔ شمشیر و سِناں کا زمانہ ہوچکا اب توپ اور تفنگ کا دَور دَورہ ہے۔ محمل اور ناقہ کے بجائے اب طیارے اور جہاز ہیں۔ ساربان اور حدی خواں کے بجائے بڑے بڑے عالی ہمت ہوا باز اور ڈرائیور ہیں۔ شمع کافوری کی جگہ اب برقی قمقمے نے لے لی ہے۔ نامہ بر کے بجائے اب ٹیلیفون اور لاسلکی ہے۔ بین، ستار، دف، بربط، طاؤس رباب، طبلہ اور ڈھولک، تمک اور ناڑی وغیرہ کے بجائے اب پیانو، بینجو، گراموفون، ریڈیو، ٹاکیز اور بینڈ ہے۔ نقارخانہ و طوطی، گنبدِ افراسیاب، نوبت خانۂ چند وبوم، کا مطلب اب سمجھ میں نہیں آسکتا۔

پالکی، شکرم، ہوادار، چوکڑی، ہاتھی اور ہودج کی جگہ اب ٹریموے، ڈاج، آسٹن، شورلے، "این، ڈبلیو، آر"، اور "بی بی اینڈ سی آئی" ہے۔ غرض اب زمانہ اَور ہے، اس کا تقاضا اَور ہے۔ لکیر کے فقیر بنے رہنا معقولیت سے بعید ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم سب مِل کر اپنے ادب کو زندہ کریں۔ گُل و بُلبل کا ذکر چھوڑیں اور اپنی زندگی کے سامان پیدا کرنے کی فکر کریں۔ ادب زندہ ہوگا تو قومیت زندہ ہوگی۔

آخر وجہ کیا ہے کہ آپ زندگی سے اس قدر بیزار ہیں ؟ آپ کے دِل کو وہ کون آزار لاحق ہے جس سے غیر ممالک کے لوگ مبرّا ہیں۔ جب آپ شعر کہتے ہیں تو اس کا بیشتر حصّہ موت، چادر، فاتحہ، بالیں، مزار، لحد، یاس، اضطراب، نزع، بیکلی، کلفت وغیرہ الفاظ پر مشتمل کیوں ہوتا ہے ؟ آپ جیتے جی کیوں موت سے ہمکنار ہوا چاہتے ہیں۔ زندہ

قوموں کے افراد کو تو ہمیشہ طویل زندگی کی تمنا ہوا کرتی ہے۔ آپ بھی اپنی خبر لیجئے۔ اپنی رگوں میں زندگی کا خون دوڑتا ہوا دیکھئے۔ اپنی سانس کو اُکھڑتا ہوا تصور نہ کیجئے۔ درآں حالیکہ سانس نہایت آسانی سے جاری ہو۔ جب آپ جسمانی طور پر زندہ ہیں تو معنوی طور پر بھی اپنی زندگی کا وجود ثابت کیجئے۔

رفعت پسند لوگوں کو ادنیٰ عشق و محبت کے علاوہ دُنیا میں اور بھی بہت سے کام ہوتے ہیں۔ آپ کیوں خواہ مخواہ "کسی" کے ہاتھوں مٹے جا رہے ہیں۔ خدارا اپنے ادب اور اپنی قومیت کی زبوں حالی کی طرف توجہ کیجئے۔ اس کی موجودہ علمی و فنی بے بضاعتی پر غور کیجئے اور اس ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو کسی ساحل تک پہنچانے کی سعی فرمایئے ؎

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

محمد صادق قریشی رامداسی (بی۔اے)

وقت

وقت سست رفتار ہے، اُن کے لئے جو انتظار میں ہوں
وقت تیز رو ہے، اُن کے لئے، جنہیں خطرہ درپیش ہو
وقت طویل ہے، اُن کے لئے جو غمگین ہوں
وقت مختصر ہے، اُن کے لئے، جن کی آرام سے گزر رہی ہو
لیکن
وقت ہے ہی نہیں ـــــ اُن کے لئے ـــــ جو محبت کرتے ہیں

(ہنری وین ڈائیک)

حامد علی خاں

دُعا

آگاہ مری رُوح کو اسرار سے کر دے
جویائے حقیقت ہُوں حقیقت کی خبر دے

جو دیکھ سکے شوکتِ باطل کی حقیقت
یارب تو مجھے اپنے کرم سے وُہ نظر دے

دُھل جائے مری رُوح کی آلودگی جس سے
یارب مجھے وہ اشکِ شب و آہِ سحر دے

ہو جس میں چمک صدق و صفا مہر و وفا کی
یارب مری قسمت کو وُہ تابندہ گہر دے

کر دے جو فنا خرمنِ باطل کو جلا کر
یارب مرے نغموں کو وہ بیباک شرر دے

غم ہو کہ خوشی جادۂ حق سے نہ ہٹوں مَیں
یارب وہ بصیرت وہ عزیمت وہ جگر دے

آیا ہوں ترے میکدۂ جود و سخا میں
یارب مئے عرفاں سے مرے جام کو بھر دے

اثر صہبائی

جمہوریہ ہسپانیہ اور خانہ جنگی

اسپین میں خانہ جنگی ۱۸ جولائی ۱۹۳۶ء کو شروع ہوئی تھی اور اِس سال ۱۸ جولائی کو اس کی دُوسری سال گرہ تھی جسے خانہ جنگی کے دونوں حریفوں نے خوب زور شور سے منایا تھا۔ دونوں نے دعوے کے ساتھ کہا تھا کہ فتح و نصرت کا "وہ تاجِ زرین" جس کی قیمت لاکھوں انسانوں کے خُون سے ادا کی جائے گی ان ہی کے سر کو زینت بخشے گا۔ اس خانہ جنگی کی نوعیت مداخلتِ اقوامِ یورپ سے بہت ہی عجیب و غریب ہوگئی ہے۔ یہ سب اپنے اپنے سیاسی مفاد کے پیشِ نظر ہسپانیوں کے خون کی ہولی کھیل رہی ہیں اور سیاسیاتِ یورپ کو ایک نئے راستے پر ڈال رہی ہیں۔ اس کے آغاز سے پیشتر فرانسیسی ملوکیت برطانوی ملوکیت کے اُس اقتدار کو جو اُسے بحیرۂ روم میں حاصل تھا اس سے چھین لینے کی کوشش میں لگی رہتی تھی۔ مگر اب اطالوی اور جرمن ملوکیتیں اس اقتدار کو اپنے قبضہ میں لانے کے لئے جدّ و جہد کر رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فرانسیسی اور برطانوی ملوکیتیں اپنے باہمی تنازعات کو چھوڑ کر کچھ عرصے کے لئے متحد ہوگئی ہیں تاکہ اطالوی اور جرمن ملوکیتوں کے اس بڑھتے ہوئے سَیلاب کو روک لیں۔ اسپین کی اس خانہ جنگی میں وہاں کا شاندار قدیم تمدّن اور پُرانی عمارتیں تباہ و برباد ہو چکی ہیں۔ قرطبہ کی مقدس اسلامی عمارتوں اور الحمرا کے شاہی محلوں کا اب شاید نام و نشان بھی نہ ملے گا۔ اس مضمون میں مَیں اسی خانہ جنگی کے متعلق کچھ عرض کروں گا:-

آج سے سات سال پہلے ۱۹۳۱ء میں اسپین میں پہلی مرتبہ ایک جمہوریت قائم ہوئی تھی۔ اس سے پیشتر وہاں کا بادشاہ الفانسو سیزدہم تھا جس کا خاندان پانسو سال سے اسپین پر حکمرانی کر رہا تھا۔ اس کی مستبد حکومت کا قصر تین ستونوں کے بل پر کھڑا تھا یعنی جاگیردار، فوج اور کلیسا۔ ملک میں جاگیرداروں کی آبادی ایک فیصدی تھی اور کاشت کی زمین ۲۷ فیصدی تھی، اس زمین کے ۵۰ فیصدی پر انہیں جاگیرداروں کا تصرف تھا۔ کسان عموماً ان کی رعایا ہوا کرتے تھے اور بے گار پر اپنی بسر اوقات کرتے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ ان میں سے اکثر ایسے تھے جنہیں ایک وقت بھی مشکل سے پیٹ بھر کر کھانے کو ملتا تھا۔ اُن بیچاروں کی تو یہ حالت تھی اور اُدھر ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے کہ صرف ایک جاگیردار

• اس مضمون کو لکھتے وقت مندرجہ ذیل دو کتابیں اور دو اخبار پیشِ نظر تھے:

کتابیں: (1) Inside Europe by John Gunter (2) History of Russian Revolution by Trotsky

اخبار: (1) The Statesman (2) The Hindustan Times

ڈیوک آف البا کے قبضے میں اتنی بڑی جاگیر تھی جتنا مملکتِ بلجیم کا رقبہ ہے۔ یہ جاگیردار ان زمینوں کا کرایہ اور ان سے پیدا شدہ غلّہ تو غریب کسانوں سے لے لیتے تھے مگر کبھی انہیں یہ توفیق نہ ہوتی کہ ان کی دیکھ بھال اور زرخیزی پر کچھ روپیہ صرف کردیں۔ ان کی اس بے پروائی کا یہ نتیجہ تھا کہ بہت سی زمینیں بنجر ہو گئی تھیں اور بعض میں سال بھر میں صرف ایک فصل کی کاشت ہوتی تھی۔ مگر اس بربادی کا الزام بھی یہ جاگیردار غریب کسانوں ہی کو دیتے تھے اور ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھاتے تھے۔ اب ذرا فوج کی حالت بھی ملاحظہ فرمائیے۔ فوج کیا تھی بے کار اور کم ہمّت عیّاشوں کا گروہ جس نے ۱۵۴۶ء کے بعد (جب انگریزوں اور ہسپانیوں میں امریکن نوآبادیوں کی تقسیم پر جنگ ہو رہی تھی) کبھی کسی قابلِ ذکر جنگ میں کوئی حصّہ نہ لیا تھا۔ اس فوج کے افسروں کی تعداد اکیس ہزار تھی جو اُن جرمن افسروں کی تعداد سے بھی زیادہ تھی جنہوں نے جنگِ عظیم میں حصّہ لیا تھا اور اگر ہم ریاضی کے تناسب و توازن کے قاعدے سے حساب لگائیں تو ہم ایک افسر اور چھ سپاہیوں کی نسبت پائیں گے۔ اب رہا مقدس کلیسا تو اس کے ظلم کی بھی کوئی انتہا نہ تھی۔ چالیس ہزار پادری ملک کو گھن کی طرح لگے ہوئے تھے جو ہمیشہ بادشاہ، جاگیرداروں اور فوج کے ساتھ مِل کر عوام کے حقوق کا خون کیا کرتے تھے۔ کلیسا کے یہ پادری عموماً جیسوئٹ فرقے (gesuit order) سے تعلق رکھتے تھے اور کثیر تعداد میں کانوں، بنکوں بحری تجارت، ذرائع آمدورفت، باغوں اور زمینوں کے مالک ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ حکومت کی سیاسی پالیسی میں بھی ان کو کافی دخل تھا۔ ان کی قوّت ظلم و استبداد کا اندازہ کرنے کے لئے مذہبی تعزیرات کے قانون (Inquisition) کی مثال پیش کی جاسکتی ہے جو ۱۹۳۱ء تک اسپین کی قانونی کتاب سے خارج نہیں کیا گیا تھا۔ عوام کو تعلیم دینے کی خدمت بھی انہیں پادریوں کے سپرد تھی اور یہ روحانی اور مادّی ہر دو قسم کی تعلیم عوام دیتے تھے۔ ان کی اس تعلیم کا اثر یہ تھا کہ اسپین میں اَن پڑھوں کی تعداد سوائے پرتگال کے یورپ کے اور تمام ممالک سے زیادہ تھی۔ اگرچہ اسپین میں ایک پارلیمنٹ بھی تھی مگر اس میں بھی اکثریت ان ہی تینوں طبقوں کے افراد کی ہوا کرتی تھی۔ جو عوام کو بہلا پھسلا کر ان سے رائے حاصل کر لیتے تھے اور پھر ممبر بن جانے کے بعد بادشاہ کے اشاروں پر چلتے تھے اور ان کے حقوق کو خوب پامال کرتے تھے۔

تقریباً تین سَو سال سے اسپین میں واقعات اسی رفتار سے چل رہے تھے کہ ۱۹۳۱ء میں ان کی رفتار میں بلا کی تیزی پیدا ہو گئی یعنی اس سال جب وہاں کی اسی پرانی پارلیمنٹ کا نیا انتخاب ہوا، تو خلافِ معمول اس میں ملک کے جمہوریت پرستوں کو ایک شاندار اکثریت حاصل ہوئی اور انہوں نے بادشاہ کو تخت و تاج چھوڑنے پر مجبور کیا۔ بادشاہ کو ان کے سامنے جھک جانا پڑا۔ دراصل اسپین میں شاہی نظام اپنی عمر سے زیادہ زندہ رہ چکا تھا۔ اور اب وُہ اس بات کا منتظر تھا کہ اسے ذرا سا جھٹکا لگے اور وُہ دم توڑ دے۔ ۱۹۳۱ء کے اس انتخاب نے یہ جھٹکا اسے دیا اور اس ظالم نظام

کا خاتمہ ہوگیا۔ اسپین میں ایک جمہوریت قائم ہوئی جس کے کابینۂ وزارت کا صدرِ اعظم[1] آذانا مقرر ہوا اور بادشاہ کو اس کے ظلم وستم کی جو سزا ملی وُہ یہ تھی کہ اُسے صحیح سلامت *Cartagena* کے شہر میں پہنچا دیا گیا۔ اسپینی تاریخ میں یہ ایک ایسا انقلاب تھا جو بہت پُر امن طریقے سے رُونما ہُوا تھا۔

اس نئی جمہوریت نے بادشاہ کو تو تخت سے اُتار دیا مگر ان فوجی افسروں اور جاگیرداروں اور پادریوں کے خلاف جو بادشاہ کے پشت پناہ اور ردِّ عمل کے سورما تھے یہی اقدام کافی سمجھا کہ ان کے خطابات ضبط کر لئے اور ان کی ذات سے جو ردِّ عمل کی جامع تھی کوئی تعرض نہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ جمہوریت کے قیام کے ایک سال بعد ہی ردِّ عمل کے یہ سورمے (۱۹۳۲ء میں) جنرل سن جرجو کی قیادت میں اُٹھے اور اس کے خلاف بغاوت کردی۔ جمہوریہ نے ان کی اس بغاوت کو فوراً ہی دبا دیا اور تمام جاگیرداروں اور پادریوں کی جاگیریں ضبط کرلینے اور فوجی افسروں کو پنشن دے کر فوج سے علیحدہ کردینے کے قوانین بھی نافذ کردیئے۔ مگر اس کے اربابِ اقتدار کی فراخ دِلی ملاحظہ فرمائیے کہ سوائے فوجی افسروں کی پنشن کے قانون کے جس میں جمہوریت کا اپنا ہی نقصان تھا اور کسی قانون پر عمل کرنا اُنھوں نے گوارا نہ کیا۔ شاید وہ اسٹالن کا یہ قول بھول گئے تھے کہ "انقلاب کبھی ریشمی دستانے پہن کر پیدا نہیں کیا جاسکتا" یعنی انقلاب کے مخالف طبقوں کو ہمیشہ مٹانا ہی پڑتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ ان سے فراخ دلی برتی جائے اور انہیں کچھ نہ کہا جائے۔ ؎

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند ۔۔۔ می ندانی اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

پھر بھی اس اخلاقی کمزوری کے باوجود جس کا ثبوت یہ اربابِ اقتدار ان رجعت پرست طبقوں کو کھلے بندوں چھوڑ دینے سے دے رہے تھے اس قدر ضرور مسلّم ہے کہ اسپین کے اس تاریخی دَور کی سیادت اور قیادت کے لئے جو اس جمہوری انقلاب کے بعد شروع ہُوا تھا ان سے بہتر اشخاص بھی ملنا مشکل تھے۔ تاریخ ہر جمہوری انقلاب کے بعد ایسے ہی افراد کو منظرِ عام پر لے آتی ہے جیسے کہ آذانا اور اس کے دوسرے ساتھی تھے۔ یہ لوگ لبرل کہلاتے ہیں اور اس انقلاب کے بعد جو دور شروع ہوتا ہے اس کی رہنمائی کے لئے بہت ہی موزوں ہوتے ہیں۔ یہ عموماً متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جس میں دفتر کے کلرک، ناول نگار، مصنّف، معمولی سرمایہ دار، اسکولوں کے اُستاد اور یونیورسٹی کے پروفیسر شامل ہوتے ہیں۔ یہ انقلابِ اسپین ہی کی کوئی نرالی خصوصیت نہ تھی بلکہ ہر جمہوری انقلاب کے بعد اس کا ہونا ضروری ہے۔ رُوس میں فروری ۱۹۱۷ء کے انقلاب

---

[1] آذانا جمہوریت پرستوں کا لیڈر تھا۔ سٹیٹس مین کی ییئر بک (۱۹۳۱ء) میں وزیرِ اعظم کا نام "*Zemora*" درج ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ *Zemora* کچھ دنوں وزیرِ اعظم رہ کر مستعفی ہوگیا تھا اور پھر آذانا ہی وزیرِ اعظم مقرر ہُوا تھا۔ مگر وزیرِ اعظم ہونے سے پہلے بھی جب آذانا وزیرِ خارجہ تھا کابینۂ وزارت اور وزیرِ اعظم اس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی طرح تھے اور یہ جو چاہتا تھا ان سے منوا لیتا تھا۔

کے بعد جو مخلوط وزارت وہاں قائم ہوئی تھی وہ بھی اس قانونِ تاریخ سے مستثنیٰ نہ تھی۔ ان دونوں وزارتوں کو ایک دوسرے کے مشابہ بتاتے ہوئے ٹراٹسکی اپنی کتاب "تاریخِ انقلابِ روس" میں ہمیں بتاتا ہے کہ کیوں متوسط طبقے کے یہ لبرل اس دَور کے بہترین قائد ہوتے ہیں؛ وہ لکھتا ہے:۔

"ہماری یاد اسپین کے موجودہ حالات کو دیکھ کر پھر تازہ ہوتی ہے، یہ حالات ہمیں بتاتے ہیں کہ کس طرح ہر انقلاب اپنی کامیابی کے ابتدائی زمانے میں پُرانی سیاسی روایات کی حدبندیوں کو توڑ کر ہر شخص کو ایک سنہری انجام کی شعاعوں میں ڈھانپ لیتا ہے۔ اس وقت اس کے مخالف بھی ان رنگین شعاعوں سے اپنے آپ کو رنگ لیتے ہیں۔ یہ رنگ برنگ کا لباس اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ رجعت پسند طبقہ بھی ان تبدیل شدہ حالات کے سانچے میں ڈھلنا چاہتا ہے تاکہ اس نقصان سے بچ جائے جو انقلاب کے بعد اسے برداشت کرنا پڑتا ہے۔ قوم کا یہ اتحاد جو صرف مبتذل مقولوں پر قائم ہوتا ہے اپنا نصب العین "حافظا گر وصل خواہی صلح کُن با خاص و عام" بنا لیتا ہے۔ متوسط طبقے کے تخیل پرست طبقہ وارانہ تمیز کو نظر انداز کرتے ہوئے اور یہ نہ جانتے ہوئے کہ انہیں کرنا کیا ہے، پُرانے خیالات و افکار کی رَو میں بہ جاتے ہیں اور ہر شخص کو خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی افراد اس وقت اکثریت کے رہنما ہوتے ہیں"۔

اس اقتباس کو پڑھنے کے بعد یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ آخر وہ کیا ذہنیت ہوتی ہے جو ان کے اس صلح کے تخیل کی محرک ہوتی ہے؛ یہ ذہنیت عوام کے پرولتاری انقلاب کا خطرہ ہوتا ہے جو ہر جمہوری انقلاب کے بعد جلد یا بدیر رُونما ہوا کرتا ہے اور متوسط طبقے کے ان تمام حقوق کو جو وہ پہلے انقلاب کے بعد حاصل کرتا ہے، پامال کر دیتا ہے۔ یہاں بھی یہی ذہنیت تھی جو شعوری یا غیر شعوری طور پر ہسپانی ریپبلک کے ان اربابِ حکومت کے فراخ دِلی کے تخیل میں پوشیدہ تھی۔ یہ حضرات اِدھر تو عوام کو مراعات و حقوق، انسدادِ بے کاری اور اراضی کاشت دینے کے وعدوں کا نشہ پلا کر پرولتاری انقلاب کی جدوجہد سے باز رکھنا چاہتے تھے، اور اُدھر رجعت پرستوں سے بھی مِل کر رہنا چاہتے تھے تاکہ ان کے ساتھ اتحادِ عمل کر کے عوام کی انقلابی طاقت کو اُبھرنے سے روکتے رہیں۔ ان کی اسی پالیسی کے متعلق ٹراٹسکی نے لکھا تھا:۔

"اب جبکہ یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں ـــــ مئی ۱۹۳۱ء کے شروع میں ـــــ اسپین کا "غیر خونی"، پُر امن اور شاندار انقلاب (ان محاسن کی فہرست ہمیشہ یہی ہوتی ہے) اپنے "ایامِ جولائی" ـــــ اگر ہم فرانسیسی انقلاب کو مدِّ نظر رکھ کر شمار کریں ـــــ یا "ایامِ جولائی" ـــــ اگر ہم رُوسی انقلاب کے پیشِ نظر حساب لگائیں ـــــ کی تیاری میں مصروف ہے۔ میڈرڈ کی "وقتی گورنمنٹ" ـــــ مقولوں کے نشے میں مست (جن کا بیشتر حصہ رُوسی زبان کے مقولوں کا ترجمہ ہے) بے روزگاری کے انسداد اور اراضی کاشت کی مانگ کو پورا کرنے کے وعدے تو ضرور کرتی ہے مگر اس کی اتنی جرأت نہیں کہ کسی پُرانے سوشل زخم کو ذرا ہاتھ

بھی لگائے ۔۔ ۔ غم و غصے کی اس لہر کا اندازہ کرنا مشکل نہیں جو مزدوروں اور کسانوں کے دِلوں میں دوڑ رہی ہے؛ تحریکِ انقلاب عوام اور برسرِ اقتدار جماعت کی پالیسی میں ایک سخت کش مکش پیدا ہو رہی ہے جو یا تو پہلے ماہ اپریل کے انقلاب کی بھی بیخ کنی کر دے گی یا ایک اور انقلاب کی آمد کی خبر دے گی ۔

ریپبلک کے اس طرزِ عمل کے خلاف جو اس نے انقلاب کے ان مخالفوں کے لئے اختیار کر رکھا تھا اور جیسے ٹراسکی نے مندرجہ بالا الفاظ میں بیان کیا ہے، عوام میں شورش ہوتے ہوتے بالآخر وہ وقت آیا کہ جب ان کے دلوں میں اس کی کوئی وقعت نہ رہی۔ انقلاب کے مخالفوں نے اس موقعے سے فائدہ اُٹھا کر ۱۹۳۳ء کے موسمِ خزاں میں آزانا اور دوسرے وزراء کو کرسیٔ وزارت سے اُتار دیا اور دائیں[۱] بازو کی ایک مخلوط وزارت قائم کر لی۔ جس نے برسرِ اقتدار آتے ہی سب سے پہلا کام جو کیا۔ وہ یہ تھا کہ تمام حریت پرست جماعتوں کو تشدد کے ذریعہ سے کچل ڈالا۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں جب ہسپانی اشتراکیوں نے اس کی اس پالیسی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تو انہیں سزائے موت اور سزائے قید دے کر خاموش کر دیا گیا اور جب عسطوریہ کے مزدوروں اور کان کنوں نے ان مظلوم اشتراکیوں سے اظہار ہمدردی کیا تو انہیں بھی اسپینی مراکش کے سپاہیوں کی تلواروں نے ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا۔ چودہ سو آدمی مارے گئے اور تیس ہزار اشتراکی قید کر لئے گئے اور ردِ عمل کی وہ پہلی قسط جس کی دُوسری اور آخری قسط جنرل فرانکو کی بغاوت ہے ادا ہو گئی اور " ماہِ اپریل کی بیخ کنی" کے متعلق جو پیشین گوئی ٹراسکی نے کی تھی وہ بھی پُوری ہو گئی +

ردِ عمل کے تشدد کا یہ پہلا دَور ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء تک قائم رہا۔ ۱۹۳۶ء ابھی شروع ہی ہُوا تھا کہ عوام میں پھر اس تشدد کے خلاف غصے کی ایک عظیم الشان لہر دَوڑ گئی اور انہوں نے دائیں بازو کی اس ظالم وزارت کو نئے الیکشن کے انعقاد کے لئے مجبور کیا۔ فروری ۱۹۳۶ء میں یہ نیا انتخاب ہُوا۔ بائیں بازو کی تمام جماعتوں نے مل کر ایک "Front Populaire" کی بنیاد ڈالی اور اس انتخاب کے لئے اپنے اُمیدوار کھڑے کئے جو کثرتِ آراء سے کامیاب ہوئے اور "Front populaire" کی ایک نئی وزارت قائم ہوئی جس کا وزیرِ اعظم پھر آزانا ہی مقرر ہُوا۔ تاریخ نے جس تاریخی دَور کی قیادت کے لئے اسے چُن رکھا تھا وہ ابھی ختم نہیں ہُوا تھا۔ متوسط طبقے کے تمام افراد میں سے شاید وہی اس تاریخی دَور کی تکمیل کو ایک اعلےٰ پیمانے پر سرانجام دے سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عمل تاریخ اسے بار بار منظرِ عام پر لاتا تھا

---

[۱] ریپبلک کے قیام کے بعد اسپین کی پارلیمنٹ کی تمام جماعتیں دو جانب تقسیم ہو گئی تھیں (اوّل) دائیں بازو والے اور دوم بائیں بازو والے۔ بائیں بازو میں تمام حریت پرست اور قومی فلاح اور بہبودی کے خواہاں شامل تھے۔ اور دائیں بازو میں تمام جبت پرست اور ردِ عمل کے پرستار، اب ان ہی کی وزارت قائم ہوئی تھی۔

اس نئے کابینہ وزارت کو برسرِ اقتدار آئے ہوئے مشکل سے پانچ مہینے گزرے ہوں گے کہ ردِّ عمل پھر جنرل فرانکو کی قیادت میں سربلند ہوا مگر ریپبلک نے اس کے سامنے جُھک جانے سے انکار کر دیا اور خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ خانہ جنگی کے وقت "Front Populaire" میں مندرجہ ذیل جماعتیں شامل تھیں۔

(۱) متوسط طبقے کی تمام جمہوریت پرست جماعتیں جن کا لیڈر آذانا تھا۔

(۲) Basque اور کیٹیلونیا کے خود مختار صوبوں کے لیڈر + ان دونوں صوبوں کو جمہوریہ نے صوبجاتی خود مختاری عطا کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یہ اس کا ساتھ دے رہے تھے۔

(۳) سنڈی کلسٹ۔ جن کا کیٹیلونیا اور اُندلس میں بہت رسوخ تھا۔

(۴) انارکسٹ۔ ان کی تعداد تمام اسپین میں صرف آٹھ ہزار تھی۔

(۵) اشتراکی۔ ان کی دو جماعتیں تھیں۔ ایک جماعت کا لیڈر لارگو کیبلرو تھا یہ انتہا پسند مارکسی تھے اور دوسری جماعت جس کا لیڈر انڈشیو پرائی ٹو تھا اعتدال پسند مارکسی تھے۔

(۶) اشتمالی۔ جن کے نمائندوں کی تعداد چار سو تہتر ممبروں کی پارلیمنٹ میں صرف چودہ تھی۔

(۷) پی۔ او۔ یو۔ ایم (Party of Marxist Unification)، اس جماعت کے افراد ٹراسکی کے پیرو تھے اور ان کے رہنما انڈرزنن اور میوزن تھے جن کا زیادہ تر اثر بارسلونا میں تھا۔

علمِ بغاوت بلند کرنے سے پہلے باغیوں نے اِٹلی اور جرمنی سے امداد حاصل کر لی تھی اور جب انہیں یہ یقین ہو گیا تھا کہ ان کی یہ بغاوت ایک کامیاب بغاوت ہو گی تو انہوں نے جمہوریہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا تھا۔ جنرل فرانکو کے مندرجہ ذیل مددگار تھے۔

(۱) اسپین کی تمام رجعت پرست جماعتیں۔ یہ وہاں کے فوجی افسروں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور جیسوئٹ فرقے کے پادریوں اور اسپینی فسطائیوں پر مشتمل تھیں۔

(۲) اسپین کے فوجی سپاہی۔ یہ اپنے افسروں کی فرمانبرداری کرتے ہوئے جنرل فرانکو کی فوج میں شامل ہو گئے تھے۔

(۳) اسپینی مراکش کے جنگجو سپاہی۔ انہیں باغیوں نے فتح کے بعد کامل آزادی دے دینے کا لالچ دے کر اپنا معاون بنا لیا تھا۔

(۴) اطالوی طیارے اور رضا کار۔ ان کی تعداد تھوڑے ہی عرصے میں ساٹھ ہزار ہو گئی تھی۔

(۵) جرمن طیارے، انجنیئر اور رضا کار۔ ان کی تعداد آٹھ اور دس ہزار کے درمیان تھی۔

دوسری طرف جمہوریت کی حمایت وہ تمام جماعتیں کر رہی تھیں جو آزادی کی خواہاں تھیں اور ردِ عمل کی لعنتوں سے خوب واقف تھیں۔ ان میں اسپین کے جمہوریت پرست، لبرل، اشتراکی، اشتمالی، انارکسٹ سنڈی کلسٹ اور Basque کے رومن کیتھولک شامل تھے۔ اسپین کے مزدور اور کسان بھی ریپبلک کا ساتھ دے رہے تھے۔ اگرچہ وہ یہ جانتے تھے کہ اس نے ان کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ردِ عمل کی فتح ۱۹۳۴ء کے دورِ تشدد کو اپنے ساتھ لائے گی۔ آغازِ خانہ جنگی میں چونکہ تمام فوج جنرل فرانکو کے ساتھ تھی اور جمہوریہ کی فوج میں صرف کسان اور مزدور اور نچلے متوسط طبقے کے افراد شامل تھے جو فوجی تربیت سے قطعی محروم تھے۔ اس لئے اس کی فوجوں میں بہت بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ ادھر تو یہ حالت تھی اور دوسری طرف اسپین کی تمام فوج اور اٹلی اور جرمنی کی تمام طاقتیں جنرل فرانکو کی بہت سرگرمی سے امداد کر رہی تھیں۔ مگر یہ حالت زیادہ عرصے تک قائم نہ رہی۔ دُنیا نے جب یہ دیکھا کہ فسطائی اٹلی اور نازی جرمنی کس شدو مد سے جنرل فرانکو کی امداد کر رہے ہیں تو ان کے اس غیر منصفانہ رویہ کے خلاف ردِ عمل شروع ہوا اور ریپبلک کو بھی امداد ملنے لگی۔ یہ امداد مندرجہ ذیل دو طریقوں سے ملی۔

(اوّل) تمام دُنیا سے رضاکار آنا شروع ہوئے۔ جو اپنی خوشی سے اسپین میں آئے تھے۔ ان تمام غیر ملکی رضاکاروں نے ایک بین الاقوامی[1] دستہ بنایا۔ جس نے نومبر ۱۹۳۶ء میں محاذِ میڈرڈ پر پہلی مرتبہ اپنی جوانمردی کے جوہر دکھائے اور جو ابھی تک میڈرڈ کو بچائے ہوئے ہے۔ اس دستے میں وہ تمام جوان مرد شامل تھے جو فسطائی اور نازی ظلم و استبداد کے سخت مخالف تھے خواہ وہ کسی ملک میں کسی شکل میں نمودار ہوا ہو۔ تاریخ نے ایسے دستے کی مثال اس سے پہلے کبھی پیش نہ کی تھی۔

(دوم) سوویٹ روس سے امداد ملنا شروع ہوئی۔ جنرل فرانکو، اٹلی اور جرمنی کا "اسپین میں سُرخ خطرے" کا پروپیگنڈا سراسر غلط ہے۔ خانہ جنگی کے ابتدائی زمانے میں رُوس کو اسپین کی اس خانہ جنگی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اسے ایک مقامی چیز سمجھے ہوئے تھا۔ مگر جب اٹلی اور جرمنی نے اسپین میں سُرخ خطرے کا بہانہ لے کر کھلم کھلا باغیوں کو مدد دی تو رُوس بھی ریپبلک کی امداد کرنے پر مجبور ہوا ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ اُس کی طرف سے ریپبلک کو جو امداد پہنچی، وہ طیاروں، ٹینکوں اور فوجی مشیروں کی شکل میں تھی۔ رُوس نے جرمنی اور اٹلی کی طرح روسی رضاکار اسپین میں نہیں بھیجے۔ اس کی یہ امداد جمہوریت کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی اور اس نے ۱۹۳۷ء کے آغاز ہی سے اسپین کی فضا پر اپنا تسلط قائم کر لیا تھا۔

---

[1] اس بین الاقوامی دستے میں اہلِ بلجیم، اہلِ پولینڈ، امریکن اور وہ اطالوی اور جرمن جو فسطائیوں اور نازیوں کے مخالف تھے شامل تھے ان کی تعداد بیس ہزار تھی۔

اس خانہ جنگی کے شروع ہونے پر جنرل فرانکو نے آبنائے جبل الطارق کے گرد و پیش تمام ساحلی علاقے اور شمالی اسپین کے ایک بہت بڑے رقبہ پر اپنا قبضہ کر لیا اور خلیج بسکے میں اطالوی اور جرمن بحری بیڑے کی مدد سے ریپبلک پر تمام ذرائع آمد و رفت بند کر دیئے۔ ریپبلک کے پاس سارا جنوبی ساحل، کیسٹائل کا وسطی میدان اور کیٹیلونیا کا صوبہ باقی رہ گیا۔ خانہ جنگی جاری رہی اور جنرل فرانکو نے تین چار مہینے میں کئی مشہور مقامات فتح کر لیے۔ ستمبر ۱۹۳۶ء میں آذانا کی وزارت مستعفی ہوئی کیونکہ یہ اس خانہ جنگی میں ریپبلک کی فوجوں کو ایک عمدہ پیمانے پر مرتب کرنے میں کامیاب نہ ہوئی تھی اور لارگو کیبلیرو نے ایک نئی وزارت بنائی اور آذانا کو ریپبلک کا صدرِ اعظم بنا دیا گیا۔ مئی ۱۹۳۷ء میں لارگو کی وزارت کا بھی خاتمہ ہو گیا اور ڈاکٹر جوان[1] نگرن نے پھر ایک اور نئی وزارت قائم کی۔ اس کے کابینۂ وزارت میں بھی بہت سی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں مگر ڈاکٹر جوان نگرن ابھی تک وزیرِ اعظم ہے۔

الغرض، ۷ نومبر ۱۹۳۶ء کو باغی جو اس عرصے میں طلیطلہ، اشبیلیہ، سان سباسٹین اور ارون فتح کر چکے تھے میڈرڈ کی جانب بڑھے جس بے سروسامانی کی حالت میں جمہوریہ کی فوجیں تھیں اس سے تو قیاس یہی چاہتا تھا کہ میڈرڈ چوبیس گھنٹے میں فتح ہو جائے گا۔ ریپبلک کی حکومت نے یہاں سے بھاگ کر ویلنسیا کو اپنا مستقرِ حکومت بنایا مگر میڈرڈ کو مذکورہ بالا بین الاقوامی دستے[2] اور روسی طیاروں اور توپوں کی بروقت امداد نے بچا لیا۔ دو سال ہونے کو آتے ہیں مگر میڈرڈ ابھی تک فتح نہیں ہوا حالانکہ باغی اس کے ایک تہائی حصے کو بمباری کے ذریعے سے تباہ و برباد کر چکے ہیں۔ اور نہ وہ ابھی تک ویلنسیا ہی کو فتح کر سکے ہیں اگرچہ اُنہوں نے اس پر بھی تقریباً ایک سو بیس مرتبہ بمباری کی ہے۔ باغیوں کو شاید یہ معلوم نہیں ہے کہ جب تحریکِ آزادی عوام میں پھیل جاتی ہے تو وہ انہیں کس قدر جوانمرد اور سخت دل بنا دیتی ہے۔

میثاقِ عدمِ مداخلت۔ یہ میثاق برطانیہ اور فرانس نے تجویز کیا تھا۔ اس میں جو تجاویز پیش کی گئی تھیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ وہ تمام غیر مُلکی رضاکار جو اسپین کی خانہ جنگی میں حصہ لے رہے ہیں وہاں سے واپس بُلا لئے جائیں۔

۲۔ غیر ممالک کے ان تمام جہازوں کا داخلہ جو جمہوریہ یا جنرل فرانکو دونوں میں سے کسی ایک کے لئے بھی سامانِ جنگ لائیں، اسپین کی بندرگاہوں میں بند کر دیا جائے۔

۳۔ ان دونوں تجویزوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک بین الاقوامی عدمِ مداخلت کمیٹی بنائی جائے۔

۴۔ اور جب ان تجویزوں پر عمل درآمد ہو چکے اس وقت دونوں فریقوں میں سے ہر ایک کو اسپین کی اس خانہ جنگی کا جائز

---

[1] Dr. Juan Nigran

[2] حال ہی میں یہ خبر اخباروں میں شائع ہوئی تھی کہ اس دستے کے بہت سے سپاہی اپنے اپنے وطن کو واپس جا رہے ہیں۔

فریق تسلیم کر لیا جائے۔

اس میثاق کا جو فائدہ ظاہر کیا گیا تھا وہ تو یہ تھا کہ اس پر عمل پیرا ہونے سے یہ خانہ جنگی اسپین ہی کی حدود تک محدود ہو جائے گی اور تمام یورپ جنگ کے آتشکدہ میں کودنے سے بچ جائے گا۔ مگر جن حقیقی خطرات کے پیشِ نظر یہ معرضِ وجود میں آئی تھی اور جو اس کے اصل محرک تھے وہ مندرجہ ذیل ہیں :۔

(۱) برطانوی اور فرانسیسی ملوکیتیں اس بات کو خوب جانتی تھیں کہ اگر جنرل فرانکو فتحیاب ہو گیا تو بحیرہ روم کا وہ اقتدار جسے حاصل کرنے کے لئے یہ ایک دوسرے کی حریف بنی ہوئی ہیں اطالوی اور جرمن ملوکیتوں کے قبضے میں چلا جائے گا اور یہ دونوں اس سے محروم ہو جائیں گی۔

(۲) اس صورت میں اسپینی مراکش میں اطالوی اور جرمن ملوکیتوں کو حلقہ ہائے اقتدار حاصل ہو جائیں گے جو فرانس اور برطانیہ کے افریقی مقبوضات کے لئے ایک مستقل اور شدید خطرے کا باعث ثابت ہوں گے۔

(۳) میڈرڈ، روم اور برلن کے درمیان ایک اتحادِ ثلاثہ قائم ہو جائے گا جو فرانس کی طاقت کو بہت نقصان پہنچائے گا اور اسے اپنی باقی ماندہ تیسری سرحد کی حفاظت بھی کرنا پڑے گی۔

(۴) اسپین کی درآمد اور برآمد پر جو اقتدار برطانوی ملوکیت کو حاصل ہے وہ جرمن اور اطالوی ملوکیتوں کے اقتدار سے بدل جائے گا۔

ان چار خطرات کی بنا پر برطانوی اور فرانسیسی ملوکیتیں اس میثاق کے نفاذ کی آرزومند تھیں۔ وہ خوب جانتی تھیں کہ اگر جرمنی اور اٹلی نے اسے منظور کر لیا، اپنے رضاکار اسپین سے واپس بلا لیے اور وہاں سامانِ جنگ بھیجنا بند کر دیا تو جنرل فرانکو جس کی فتح کا دارومدار ان دونوں کی امداد پر ہے فوراً شکست کھا جائے گا اور اسپین کی عنانِ حکومت پھر جمہوریہ کے ہاتھوں میں آ جائے گی۔ جو پہلے کی طرح ان کے مفاد کی ان کے حسب منشا نگرانی کرے گی۔ قدرتی طور پر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں یہ دونوں ملوکیتیں تلوار کے بجائے ان پُرامن طریقوں سے کام نکالنا چاہتی تھیں؛ حقیقت یہ ہے کہ برطانوی ملوکیت اس وقت تک لڑنے کے لئے تیار نہیں جب تک اس کا مسلح ہونے کا پروگرام مکمل نہ ہو جائے کیونکہ وہ اپنے موجودہ سامانِ جنگ کے ساتھ اٹلی اور جرمنی کو شکست نہیں دے سکتی۔ رہی فرانسیسی ملوکیت تو یہ برطانوی ملوکیت کی امداد اور تائید کے بغیر نہ لڑے گی کیونکہ وہ تن تنہا ایک لمحے کے لئے بھی ان دونوں کے سامنے نہیں ٹھہر سکتی۔ یہی وجہ تھی کہ یہ دونوں ملوکیتیں بہت ہی پُرامن ذرائع سے اپنا مطلب حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ مگر اٹلی اور جرمنی بھی ان کی اس کمزوری سے خوب واقف تھے۔ انہوں نے پہلے تو اس مجوزہ میثاق کی خوب مخالفت کی اور اسے منظور کرنے سے صاف انکار کر دیا مگر جب برطانیہ اور فرانس

نے ان کی اس "امن سوزی" کے خلاف ایک کامیاب پروپیگنڈا شروع کیا تو انہوں نے بھی اپنی امن پرستی کا سکہ جمانے کے لئے اسے منظور کر لیا اور عدم مداخلت کمیٹی میں شامل ہو گئے۔ لیکن امن پرستی کی یہ سند حاصل کر لینے کے بعد بھی جب کبھی ضرورت پڑتی تھی جنرل فرانکو کی خوب مدد کرتے تھے۔ ؎

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالبؔ ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

میثاق عدم مداخلت پر کل ستائیس حکومتوں نے دستخط کئے تھے۔ یہ تو سب کو یقین تھا کہ اٹلی اور جرمنی اس میثاق کی کچھ پروا نہیں کرتے اور جنرل فرانکو کو برابر امداد پہنچاتے رہتے ہیں مگر اس فریب ہی کا راز اس روز قطعی طور پر فاش ہو گیا جس روز جرمن بحری بیڑے نے اپنے بحری جہاز Deutschland پر بمباری کا بدلہ لینے کے لئے جمہوریہ کی بندرگاہ المریا پر بمباری کی۔ اس جہاز کا واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ جمہوریہ کے طیاروں نے اسے باغیوں کا کوئی جہاز خیال کرتے ہوئے اس پر بمباری کی تھی مگر اس کے بعد جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ یہ ایک جرمن جہاز تھا تو انہوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا تھا پھر بھی جرمن بحری بیڑا المریا پر بمباری کرنے سے باز نہ آیا۔ یہ حادثہ ۲۹ مئی ۱۹۳۷ء کو پیش آیا تھا۔ اس کے کچھ دنوں بعد لیپزگ جہاز کا حادثہ پیش آیا۔ یہ بھی ایک جرمن جہاز تھا۔ اس پر کسی گم نام آب دوز کشتی نے حملہ کیا تھا۔ اکثر مدبرین یہی کہتے ہیں کہ یہ حادثہ کبھی معرض وجود ہی میں نہیں آیا۔ بلکہ اسے ہٹلر نے محض اپنے دل سے گھڑ لیا تھا۔ خیر جو کچھ بھی ہو۔ اس کے بعد ہٹلر نے اسپین سے متعلق بحیرۂ روم میں ایک بین الاقوامی فوجی مظاہرے کا مطالبہ پیش کیا۔ جسے فرانس، برطانیہ اور سوویٹ روس نے مسترد کر دیا اور اٹلی اور جرمنی عدم مداخلت کمیٹی سے مستعفی ہو گئے اور ان کے مستعفی ہونے کے بعد یہ کمیٹی بھی ایک بے کار سی چیز ہو گئی۔

اب اس کے بعد بحیرۂ روم میں غیر ملکی جہازوں پر حملوں کا دور شروع ہوتا ہے جو آج تک جاری ہے۔ یہ ایک بہت ہی واضح حقیقت ہے کہ حملہ کرنے والے اطالوی اور جرمن جہاز ہوتے ہیں۔ شروع شروع میں جب تک برطانوی اور فرانسیسی جہاز ان حملوں کا نشانہ بنتے رہے۔ یہ ملوکیتیں انہیں خاموشی سے برداشت کرتی رہیں مگر جب دو روسی جہازوں پر حملہ ہوا تو روس نے اس کا الزام فسطائی اٹلی کو دیا اور اس سے بدلہ لینا چاہا۔ اس وقت فرانس اور برطانیہ نے سوئٹزرلینڈ میں نیون کے مقام پر ایک کانفرنس کا انعقاد کیا تاکہ ان حملوں کو روکنے کے لئے کوئی متحدہ قدم اٹھایا جائے۔ اس کانفرنس میں اٹلی اور جرمنی نے شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ لیکن اب برطانیہ اور فرانس نے جرأت کر کے ایک کامیاب "بحری نگرانی" شروع کی۔ اٹلی اور جرمنی نے جب یہ دیکھا کہ اسپین کے ساحلی علاقوں پر برطانیہ اور فرانس کا قبضہ ہو گیا ہے تو انہوں نے بھی اس نگرانی میں شرکت کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ جسے برطانیہ نے بخوشی منظور کر لیا اور انہوں نے اس نگرانی میں شریک ہو کر اسے بھی

ایک بے اثر چیز بنا دیا۔

تین چار مہینے ہوئے پھر اس بات کی کوشش کی گئی تھی کہ عدم مداخلت کمیٹی میں رُوح پھونکی جائے۔ رضاکاروں کو واپس بلانے کی تجویز سے اٹلی اور جرمنی نے بھی اتفاق کر لیا تھا۔ فرانس، برطانیہ، رُوس اٹلی اور جرمنی ہر ایک نے ایک معینہ رقم بھی اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے دے دی تھی اور اگست ۱۹۳۸ء میں ایک برٹش کمیشن اس تجویز پر عمل درآمد کرنے کے لئے اسپین روانہ ہو گیا تھا کہ پھر یہ خبریں آنا شروع ہوئیں "جنرل فرانکو نے اس تجویز کو ٹھکرا دیا ہے اور اٹلی اس کوشش میں ہے کہ کمیشن کا کام شروع ہونے سے پہلے ہی جنرل فرانکو جمہوریہ کو ایک فیصلہ کُن شکست دینے میں کامیاب ہو جائے"[1]

اب صورتِ حالات یہ ہے:۔

(۱) برطانوی ملوکیت کا اقتدار مائل بہ تنزل ہے اور وہ اس وقت تک کسی سے بھی لڑنا نہیں چاہتی جب تک اس کا مسلح ہونے کا پروگرام مکمل نہ ہو جائے۔

(۲) فرانسیسی ملوکیت جرمنی اور اٹلی سے گھری ہوئی ہے وہ بھی اس وقت تک نہ لڑے گی جب تک برطانیہ کی امداد کا اسے پوری طرح یقین نہ ہو جائے۔

(۳) سوویٹ رُوس مشرق بعید میں زیادہ دلچسپی لے رہا ہے کیونکہ وہاں جاپانی امپیریلزم اس کے لئے ایک مستقل خطرہ بن چکا ہے اس کے علاوہ اس ملک میں جیسا کہ وہاں کے روزمرّہ کے پھانسی کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے سیاسی بدامنی کے آثار نمایاں ہیں جو اس کی قوت میں بہت انتشار پیدا کر رہے ہیں۔

(۴) ان حالات سے فائدہ اُٹھا کر اطالوی اور جرمن ملوکیتیں بحیرۂ رومِ اور بحر اوقیانوس میں اپنی حیثیت کو بہت مضبوط بنا رہی ہیں اُنہوں نے دورانِ خانہ جنگی میں ان دونوں سمندروں کے تمام قدیم ہسپانوی مقبوضات پر اپنا قبضہ کر لیا ہے اور اب فرانس اور برطانیہ کے افریقی اور ایشیائی مقبوضات کو جانے والے تمام بحری راستے ان کے رحم و کرم پر ہیں۔

(۵) اگرچہ میڈرڈ، بارسلونا، ویلنشیا ابھی تک فتح نہیں ہوئے مگر پھر بھی جنرل فرانکو روز بروز اسپین میں فتوحات حاصل کر رہا ہے۔ جرمنی اور اٹلی کی امداد کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ جنرل فرانکو کی پالیسی یہ ہے کہ مذکورہ بالا تینوں شہروں کے درمیان سلسلۂ آمد و رفت منقطع کر کے اور ایک وسیع محاذ پر لڑ کر ریپبلک کی افواج کو بہت دور تک پھیلا دیا جائے تاکہ ان کی طاقت کئی حصّوں میں تقسیم ہو کر کمزور ہو جائے اور وُہ بہت جلد شکست کھا جائیں۔ واقعات کی رفتار بتلا رہی ہے کہ اگر فرانسیسی اور برطانوی ملوکیتوں نے متحد ہو کر جرمنی اور اٹلی کی اس جارحانہ حکمت عملی کے خلاف کوئی مؤثر اقدام نہ کیا (جس کی ابھی تک کوئی اُمید نہیں ہے) تو اسپین میں نازی اور فسطائی قوتوں کی فتح یقینی ہے۔

عبدالحفیظ

[1] میونک کے معاہدے کے بعد یہ توقع تھی کہ اسپین میں بھی کسی سمجھوتے کی صُورت نکل آئے گی مگر سمجھوتہ اور پھر وُہ بھی باعزت امپیریلزم کے مفاد کے بالکل منافی ہے۔ اگر کوئی سمجھوتا ہو سکتا ہے تو بس وہ ایک ہی ہے یعنی اسپین کی حکومت فرانکو کے حوالے کر دی جائے۔

فکر و عمل

عمل کا نام ہے ناداں! فروغِ مستقبل
اُلٹ بھی پردۂ تقدیر سوچتا کیا ہے

یہ حادثات کی دُنیا، یہ کارزارِ حیات
عمل کے جذبۂ پر جوش کے سوا کیا ہے

نظر کو پست نہ کر، عشق کو ہوس نہ بنا
چمن میں لالہ و گل کے سوا دھرا کیا ہے

خدا جمُود کی ہرگز مدد نہیں کرتا،
ترے لبوں پہ یہ ہنگامۂ دُعا کیا ہے

ہے اِک گناہ، غُلاموں کی پارسائی بھی
تجھے خبر ہے کہ فطرت کا مقتضا کیا ہے؟

تجھے تو خاک کے ذرّوں سے کام لینا ہے
فلک کے چاند ستاروں کو دیکھتا کیا ہے

کہیں خیال سے ہوتی ہے مُنقلب دُنیا
تو کس خیال میں ہے، یہ تجھے ہُوا کیا ہے

تجھے تو عشق کے طوفاں میں کُود پڑنا ہے
عبث نہ سوچ محبّت کی انتہا کیا ہے

بہ فیضِ حضرتِ رومیؒ سفالِ ماہرؔ میں
فروغِ بادۂ اقبال کے سوا کیا ہے

ماہر القادری

فارسی شاعری میں ظرافت

عام طور پر Humour کے لئے فارسی زبان میں دو لفظ بولے جاتے ہیں۔ اوّل ظرافت، دوم مزاح۔ پھر ظرافت کے معنی دو ہیں۔ اوّل دانائی، دوم خوش طبعی۔ اور اس کے مقابلے میں لفظ مزاح کے معنی صرف "خوش طبعی" کے ہیں۔ اس لئے فارسی ادب و شعر میں مزاح کی نسبت ظرافت اور Humorist کے لئے "ظریف" کے الفاظ مستعمل ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ "خوش طبعی" کا اظہار ایسے بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں دانائی کا عنصر کم ہو مگر دانائی کے ساتھ خوش طبعی کا اظہار ایک کمال ہے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مسخروں کی کمی نہیں، ظریف بہت کم لوگ ہوا کرتے ہیں۔

جس طرح ہم ہر آواز کو لفظ نہیں کہہ سکتے اسی طرح ہم ہر "خوش طبعی" یا ہنسی کی بات کو ظرافت یا HUMOUR نہیں کہہ سکتے، گو ہنسنا ہنسانا تمام قوموں میں عام ہے لیکن ان کی ہنسی یا ان کی خوش طبعی کے مدارج مختلف ہیں۔ علمی و ذہنی و اخلاقی لحاظ سے جس درجہ کا آدمی ہوگا اُسی درجہ کی اُس کی خوش طبعی و ظرافت ہوگی، ہاں کبھی کوئی نشانہ بنائے گا اور کبھی زخمی بھی ہوگا

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن که جاہا سپر باید انداختن

ظرافت پر سیاست کا بھی اثر پڑتا ہے اور مذہب کا بھی، جس قسم کا سیاسی ماحول ہوگا اُسی قسم کی ظرافت ہوگی، جہاں استبداد ہوگا وہاں اکثر و بیشتر ظریف "گفتہ آید در حدیثِ دیگراں" پر عمل کریں گے، ورنہ شعرا ان لوگوں کو اپنے ظریفانہ تیروں کا نشانہ بنایا کرتے تھے جو کسی نہ کسی حیثیت سے بادشاہوں پر اثر رکھتے، چنانچہ فارسی شاعری میں بنے ہوئے صوفی اور جھوٹے واعظ سے شاعروں کی جنگ کے جو مناظر اکثر نظر آتے ہیں، اُن کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ بادشاہوں کو ایسے لوگوں کی اندرونی حالت سے کسی قدر آگاہ کر دیں، اور جہاں آزادیٔ افکار و گفتار عام ہوگی وہاں بڑی سے بڑی شخصیت کے رد در رد ظرافت کے پیرایہ میں حکمت کے موتی پروئے جائیں گے۔ غلط مذہبیت سے لوگوں میں زہدِ ریائی اور تقشفِ خشک آ جائے گا، ایسے زاہدانِ خشک کی سرکہ جبینی ظریفوں کو بذلہ سنجی پر آمادہ کرے گی اور یہ لفظوں کے ہتھیاروں سے ان کے پندار کے قلعوں کو مسمار کر دیں گے ورنہ صحیح طور پر مذہب اور دھرم کو سمجھنے والے حکمت کی بات کہہ کر خود حظ لیں گے اور دوسروں کے دلوں کی دُنیا کو آباد اور رُوحانی پریم کی کھیتیوں کو سیراب کریں گے۔ فارسی ادب میں جس کا بہترین نمونہ سعدی شیرازی کا زندۂ جاوید کلام نظم و نثر ہے۔

یہ مضمون ۲۶ر اکتوبر ۱۹۳۸ء بروز چہار شنبہ بوقت ۷½ بجے شام بمبئی ریڈیو سٹیشن سے براڈ کاسٹ کیا گیا اور اب باجازت ڈائرکٹر صاحب شائع کیا جاتا ہے۔ "شہاب"

جہاں سیاسی استبداد کا زور ہو جیسا کہ فارسی ادبیات کے عہدِ زریں میں تھا، شاعر اپنے ممدوح بادشاہوں اور امیروں کی تعریف ایسی کرتا ہے کہ ممدوح اگر غور کرے تو شرما جائے اور اگر ایسی تعریف کرنے میں ذرا بھی بے احتیاطی سے کوئی کھٹکتی ہوئی بات جو دو پہلو رکھتی ہو شاعر کی زبان سے نکل جائے تو غریب شاعر زندگی سے محروم ہو جاتا ہے جیسا کہ ہمارے ہندوستان میں نواب سعادت علی خاں والیٔ لکھنؤ اور میر انشاءاللہ خاں کے متعلق شمس العلماء آزاد مرحوم کی روایت عام طور پر مشہور ہے، ایسے درباروں میں نہ علم و ادب کا کام ہوتا ہے نہ حکمت و شعر کا بلکہ اچھے اچھے عالموں اور داناؤں کو نقال بننا پڑتا ہے، چنانچہ آزاد مرحوم ہی کا بیان ہے کہ انشاءاللہ کے علم و فضل کو ان کی شاعری نے ڈبویا اور ان کی شاعری کو سعادت علی خاں کی درباداری نے کھویا۔

فارسی شاعروں پر بھی دربار کا یہی اثر پڑا تھا، بہت سے اہلِ علم نے جب دیکھا کہ شاہی دربار میں علم و ادب کا کوئی پرسانِ حال نہیں تو اُنہوں نے فارسی کے مشہور عالم و شاعر عبید زاکانی کی طرح کسی کی نصیحت "رو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز" پر عمل کر کے اکبری دربار کے روایتی ملّا دوپیازہ کا لباس پہن لیا تھا۔

ایسے دور میں جو لوگ حق بات کہنا چاہتے تھے وہ تمام شاہی درباروں سے الگ رہتے تھے، ایسے حق گو یا مجذوب اور دیوانے بن جاتے تھے یا ترکِ دُنیا کر کے اپنے جھونپڑوں کو شاہی محلات و مناصب پر ہزار بار ترجیح دیتے تھے اور ان کی اسی گریز پائی کی وجہ سے اُمراء و وزراء خود ان کے پاس آتے تھے اور حق و حکمت کی بات سُن کر جاتے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہر زبان کے ادب کی طرح شعر و ادب میں بھی ہر قسم کے مزاح، ظرافت، تمسخر اور پھکڑپن کے نمونے بکثرت پائے جاتے ہیں، جیسا کہ قاعدہ ہے دُوسری زبانوں کی طرح فارسی شاعری کی ظرافت لفظوں ہی میں نہیں ہوتی، بلکہ اشارے کنائے اور کہنے کے لہجہ میں بھی ہوتی ہے۔

یہ مدارجِ مزاح و ظرافت و تمسخر ایسے ہیں کہ بدنام پھکڑ شاعروں سے قطع نظر انوری و قاآنی وغیرہ جیسے عالم اور قادر الکلام شعراء بھی درباری یا زمانہ کے دیگر اثرات کے باعث لغویت سے اپنے کلام کو نہ بچا سکے، بعض جگہ ان کی ظرافت، لطیف ظرافت نہیں رہتی بلکہ بدبودار کثافت ہو کر رہ جاتی ہے، ہم اس وقت ایسی ظرافتِ کثیف سے قطع نظر کر کے چاہتے ہیں کہ مختصراً زندہ دلی و ظرافت کے چند نمونے پیش کریں جس سے فارسی گو شعراء کی علمی و ادبی بلند نظری، پاکیزہ خیالی اور لطافتِ بیان اور شان کا ہلکا سا منظر سُننے والوں کے سامنے آجائے۔

(۱)

ظہیر فاریابی اپنے ممدوح قزل ارسلان کے گھوڑے کا قدم عرش سے بھی اُوپر بتاتا اور اتنا اونچا خیال کرتا ہے کہ قوتِ

خیال بھی اگر اس کی رکاب کو احتراماً چومنا چاہے تو اسے پہلے نو افلاک سے اونچی ایورسٹ پر چڑھنا پڑے گا ؎

نہ کرسیٔ فلک نہد اندیشہ زیر پاے — تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلاں زند

یہ مبالغہ کیا ہے؛ اس شعر کا ممدوح پر کیا اثر ہوا ہوگا؛ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، سنو کہ اسی شعر کو سامنے رکھ کر سعدی براہِ راست بادشاہوں سے خطاب کرتا اور کہتا ہے کہ ممدوح کے قدموں کے نیچے نو آسمان رکھنے کی ضرورت نہیں بلکہ اسے یہ کہنا چاہیئے کہ اگر تم تخت پر بیٹھے ہو تو خدمتِ خلق کرو اور خدا کے اس احسان کے شکریہ کے جذبہ سے متاثر ہو کر سر بسجود ہو جاؤ ؎

چہ حاجت کہ نُہ کرسیٔ آسماں — نہی زیر پای قزل ارسلاں

مگو پای عزت بر افلاک نہ — بگو روی اخلاص بر خاک نہ

(۲)

شاہجہانی دور کے مشہور شاعر ملا شیدا نے ایک شعر میں شراب کو حسن کا خدا اور عشق کا پیغمبر کہہ دیا ؎

چیست دانی بادۂ گلگوں مصفّا جوہری؛ — حسن را پروردگاری عشق را پیغمبری

دین پناہ شاہجہان نے ناراض ہو کر حکم دیا کہ شاعر میری مملکت سے نکل جائے، شاعر نے منظوم توبہ نامہ پیش کیا مگر شاہی غصہ فرو نہ ہوا، آخر شاعر نے جب ظرافت سے کام لے کر یہ کہا کہ اب "شاہِ جہاں" ہی مجھے بتائیں کہ ان کی مملکت سے باہر کونسی جگہ ہے؛ تو بادشاہ نے اسے معاف کر دیا۔

(۳)

کسی سلطان کا گھوڑا بھڑکا، سلطان کی ران اکھڑ گئی، گرا معمولی سی چوٹ بھی آئی۔ درباری شاعر نے فوراً اس حادثہ کو ظرافت کے رنگ میں پیش کر کے چوٹ کے درد کو کم اور گرنے کی شرمندگی کو ہلکا بنا دیا کہ شاہا آسمان نے بہت سر اٹھایا ہے ذرا اس کو ادب سکھا کیونکہ اس نے بادشاہ کے روئے مبارک کو گزند پہنچایا، اگر گنبد روباہی کرتی ہے اور ادھر ادھر جاتی ہے تو چوگان سے اس کو سرزنش کر اور اگر گھوڑے کی خطا ہے تو اسے میرے حوالے کر دے ؎

شاہا! ادبی کن فلک بدخو را — کافت برسانید رخ نیکو را

گر گوی غلط کرد بچوگانش زن — ور اسپ خطا کرد بمن بخش او را

آسمان کی اصلاح معلوم، بال کو چوگان سے مارنا معقول، لیکن لطیفہ چوتھے مصرعہ میں ہے کہ اگر آپ گھوڑے کی خطا سے گرے ہیں تو وہ مجھے دے دیجئے، اس آخری مصرعہ کے کم از کم تین معنے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً (۱) میری خاطر سے نالایق گھوڑے کو معاف کر دیجئے (۲) مجھے عطا کر دیجئے کہ یہ آپ کی سواری کے قابل نہیں مگر رباعی کے پہلے تین مصرعوں کے تیور کہتے ہیں کہ

شاعر نے حسنِ طلب کو مزاح کے باریک لباس میں یہ کہہ کر چھپا دیا کہ حضور یہ گھوڑا مجھے دیجئے، میں اسے سزا دُوں گا۔ درباری شاعر کا کمال یہ ہے کہ اس نے آسمان کی بُھول نکالی، گیند کو سزا دلائی، گھوڑے کو گناہگار ٹھہرایا، مگر گرنے والے کی ناتجربہ کاری کی طرف اشارہ بھی نہ کیا، گو سواری کی خطا میں سوار کی خطا بھی چھپی ہوئی ہے، لیکن اصل لطیفہ کہ واہ کیا شہسوار ہے، اس کا لفظوں میں کہیں پتہ نہیں، شاعر نے اس کو اتنا چھپایا کہ پتہ لگانا مشکل ہو گیا۔

(۴)

ریاکاروں نے حافظ شیرازی پر زبانِ طعن کھولی کہ حافظ ایسا ہے اور ویسا ہے، پاک من حافظ ان کے جواب میں یہ نہیں کہتا کہ تم جھوٹ کہتے ہو یا میں فرشتہ ہوں بلکہ بظاہر ان کے اعتراضوں کو تسلیم کر کے اپنا وار ان کی پاکدامنی کے اظہار میں چھپا دیتا ہے کہ خیر میں بُرا سہی ماشاء اللہ آپ تو بے عیب ہیں،

من ارچہ عاشقم و رندمست و شاہد باز   ہزار شکر کہ یارانِ شہر بے گنہ اند

(۵)

ایک شخص نے کسی کو بُرا کہا، بھلا گالیاں کس کو اچھی لگتی ہیں کہ اُسے اچھی لگتیں مگر اس نے بظاہر بُرا کہنے کا بُرا نہ مانا بلکہ اس کے جواب میں اپنے بدگو کو اچھا کہا ہاں اسی کے ساتھ اتنا اور اضافہ کر دیا کہ ہم دونوں اپنے اپنے قول میں جھوٹے ہیں غور کرو کہ دونوں کے جھوٹ میں کتنا فرق ہے۔

گر خواجہ زہبرِ ما بدی گفت   ما چہرہ زغم نمی خراشیم
ما غیر نکوئی اش نگوییم   تا ہر دو دروغ گفتہ باشیم

(۶)

کسی نے شاہجہان پر اعتراض کیا کہ صرف شاہِ ہند، شاہجہاں کیسے کہلا سکتا ہے، درباری شاعر نے بادشاہ کی زبان سے کہا کہ معترض بے خبر ہے ایسا بے خبر کہ ابجد بھی نہیں جانتا، اگر جانتا تو اسے معلوم ہوتا کہ بحسابِ ابجد "ہند" اور "جہان" کے اعداد ایک یعنی انسٹھ ہی ہیں، اس لئے ہند کے بادشاہ کو شاہجہاں کہنا بالکل بجا ہے۔

"ہند" و "جہاں" زروی عدد چوں برابر است   بر ما خطابِ شاہِ جہاں زاں مقرر است

مگر جو بات تین ساڑھے تین سو برس پہلے صرف ابجد کا ایک لطیفہ تھی آج سیاسی حیثیت سے دیکھئے کہ ہند کا قبضہ ساری دُنیا پر قبضہ رکھنے کے لئے کیسا اہم سیاسی مسئلہ بنا ہوا ہے۔

(۷)

شاعر نے کسی اپنے پیارے کو لکنت کے ساتھ بولتے دیکھا تو کہا کہ یہ لکنت نہیں بلکہ لفظوں کو اس دہنِ شیریں سے جُدائی ناگوار ہے ؎

زلکنت نیست آں مہ را سخن کز دیر می آید　　جدائی از دہانِ او سخن را عار می آید

(۸)

ایک دفعہ ایران میں کال پڑا، پانی کی ایک ایک بُوند کو جاندار ترسنے لگے۔ آسمان کی یہ سرد مہری دیکھ کر لوگوں کو خدا یاد آیا، اپنے اپنے رنگ میں لوگ فریادیں کرنے لگے۔ ایک اسکول مدرس صاحب شاگردوں کا لشکر ساتھ لے کر جنگل کو چلے۔ راستہ میں ایک ظریف ملا، پوچھا حضرت کدھر کے ارادے ہیں اور کس دشمن پر چڑھائی ہے، ماسٹر صاحب نے کہا کہ بچوں کو جنگل میں لے جا کر دُعا کراؤں گا کہ ان بے گناہوں اور بھولے بھالوں کی دُعا سے خدا مینہ برسائے گا، ظریف نے کہا "بجا فرمایا لیکن اتنا تو سوچئے کہ اگر بچوں کی دُعائیں اتنی ہی مقبول ہوتیں جتنا کہ آپ سمجھے ہوئے ہیں تو پھر دُنیا میں غریب مدرّسوں کا نام و نشان بھی باقی نہ رہتا ؎

اگر ایزد دعائے شاں شنودی　　معلّم در جہاں کے زندہ بودی

(۹)

شاید کوئی صاحب ہر وقت آرام آرام پکارا اور نکھٹو بنے بستر پر پڑا رہنے کو زندگی سمجھا کرتے تھے، اُنہوں نے ایک مصرعہ کہا

ع　بقدرِ ہر سکوں راحت بود بنگر تفاوت را

شاعر نے سنا تو برجستہ کہا ع　دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن و مُردن

یعنی بجا ارشاد ہُوا کہ ہر سکون کے مطابق راحت ہوتی ہے، ملاحظہ ہو دوڑنے کے مقابلہ میں چلنا اور چلنے کے مقابلہ میں کھڑے ہونا اور کھڑے ہونے کے مقابلہ میں بیٹھنا اور بیٹھنے کے مقابلہ میں سونا اور سونے کے مقابلہ میں مر جانا، یہ سب سکون و راحت کے مدارج ہیں، اس لئے راحت طلبوں کے لئے موت بڑی نعمت ہے۔

(۱۰)

کہتے ہیں کہ مولانا جامی نے کسی کور ذوق کے سامنے اپنا یہ شعر پڑھا ؎

بس کہ در جانِ فگار و چشم بیدارم توئی　　ہر کہ پیدا می شود از دور پندارم توئی

مطلب یہ کہ اے دوست تم میرے دیدہ و دل میں ایسے سمائے ہوئے ہو کہ جب بھی مجھے کوئی دُور سے آتا نظر آتا ہے تو یہی سمجھتا ہوں کہ وہ تم ہی ہو، سننے والے نے اس نازک خیالی کی یہ داد دی کہ فرمایا اگر وہ آنے والا گدھا ہُوا؛ شاعر کب بند تھا، بے ساختہ بولا کہ "پندارم توئی"

(۱۱)

کسی نے اپنی سفید داڑھی پر سیاہ خضاب کیا، بے تکلّف دوست نے دیکھ کر کہا کہ ماشاء اللہ آپ خضاب کی تاریکی میں جوانی کے اب دیکھتے ہیں

زندہ دل بوڑھے نے کہا۔ جی نہیں، میری داڑھی نے جوانی کے سوگ میں کالا لباس پہنا ہے، ؎

ریش سفید من نہ سیاہ است از خضاب ‌ ‌ ‌ در ماتم شباب سیہ پوش گشتہ است

۱۲۔ آنے والے بڑھاپے سے بےخبر، جوانی کے دنوں میں جہانگیر نے کبڑے بوڑھے کو دیکھ کر کہا کہ یہ تجربہ کار جہاندیدہ بوڑھے جھکے جھکے کیا ڈھونڈتے پھرتے ہیں، نورجہاں نے سنتے ہی کہا کہ اور کیا ڈھونڈتے، بچارے مٹی میں ملی ہوئی اپنی جوانی کے دنوں کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں ؎

چرا خم گشتہ می گردند پیران جہاں دیدہ ‌ ‌ ‌ بزیر خاک می جویند ایام جوانی را

۱۳۔ فخر رازی کی طرف یہ شعر منسوب ہیں، خدا کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے ؎

در رہگزرم ہزار جا دام نہی ‌ ‌ ‌ گوئی کشمت اگر دراں گام نہی

یک ذرہ زمیں ز دام تو خالی نیست ‌ ‌ ‌ گیری وکشی و عاصیم نام نہی

ہر قدم پر جال بچھا کر ارشاد ہوتا ہے بچ کر چلو، جب ذرہ بھر زمین جال کے حلقوں سے خالی نہیں تو ہمارے قدم اٹھانے کے معنی موت کے ہیں، قدم اٹھا اور پھنسے، اس اہتمام کے باوجود پھر بھی کہا جاتا ہے کہ تم ہی گناہ گار ہو۔

۱۴۔ سعدی کہتا ہے کہ امیروں کے بنگلوں پر بے وسیلہ جانا نہ صرف ناکام رہنا ہے بلکہ اپنی آبروریزی کرانا، چور کہلا کر دربانوں کے دھکے کھانا اور کتوں سے گوشت نچوانا ہے ؎

در میر و وزیر و سلطاں را ‌ ‌ ‌ بے وسیلت مگرد پیرامن

سگ و درباں چوں یافتند غریب ‌ ‌ ‌ ایں گریباں گرفت و آں دامن

۱۵۔ ہماری ہندوستانی زبان کی کہاوت ہے کہ "سارا جاتا دیکھئے آدھا دیجے بانٹ" جب جان جارہی ہو تو مال کی فکر حماقت نہیں تو اور کیا ہے، یہی معاملہ کسی سمرقندی کو پیش آیا، سعدی نے اس کا نقشہ کھینچا ہے ؎

مردکی غرقہ بود در جیحوں ‌ ‌ ‌ از سمرقند بود پندارم

بانگ می کرد و زاری نالید ‌ ‌ ‌ کای دریغا کلاہ و دستارم

کسی ڈوبتے ہوئے کا "میری ٹوپی سنبھالو اور میری پگڑی تھامو" کس قدر دانائی کی بات ہے۔

۱۶۔ محض کتابیں پڑھ لینے کا نام علم نہیں، کتاب کے ساتھ عقل کی بھی ضرورت مسلّم ہے ورنہ دیکھو گدھا بیٹھ پر کتابیں اٹھا کر بھی گدھا ہی رہتا ہے، سعدی فرماتے ہیں ؎

علم چنداں کہ بیشتر خوانی ‌ ‌ ‌ چون عمل در تو نیست نادانی

نہ محقق بود نہ دانشمند ‌ ‌ ‌ چارپائی بر او کتابی چند

آن تہی مغز را چہ علم و خبر ‌ ‌ ‌ کہ برا و ہیزم است یا دفتر

مہر محمد خاں شہاب

آئینۂ حیرت

اُتر کر دل میں دِل پر بار کیوں ہے
محبت جان کا آزار کیوں ہے

دوا ہو یا دُعا، بیکار کیوں ہے
یہاں اِتنا کوئی ناچار کیوں ہے

یہاں دامانِ شوق و آرزو میں
گُلِ تر کیوں نہیں ہی خار کیوں ہے

بہت کچھ دیکھ لینے پر بھی دِل کو
وہی اِک حسرتِ دیدار کیوں ہے

علاجِ دردِ دل ہوتے ہوئے بھی
دگرگوں حالتِ بیمار کیوں ہے

یہ دِل میں درد، یہ آنکھوں میں آنسو
یہ لب پر آہِ آتشبار کیوں ہے

یہاں تو سانس لینا بھی ہے مشکل
یہ منزل اس قدر دشوار کیوں ہے

سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کوئی
وفا کے نام سے بیزار کیوں ہے

کسی کے نام سے منسوب ہو کر
کوئی رُسوا سرِ بازار کیوں ہے

زباں بھی جب نہیں مُنہ میں کسی کے
کسی کے ہاتھ میں تلوار کیوں ہے

خطا کوئی نہیں، لیکن خطا کا
کسی کے سامنے اقرار کیوں ہے

کِسی کی سرفروشی سے، کِسی کو
نہیں معلوم، یہ انکار کیوں ہے

کِسی کو، اِس قدر، اِس بے رُخی پر
خیالِ خاطرِ دلدار کیوں ہے

کِسی کے ظلمہائے نارِوا کی،
جو پہلے تھی، وہی رفتار کیوں ہے

چلو، جانے بھی دو اِس گفتگو کو
اِسی اِک بات کی تکرار کیوں ہے

نہیں سُنتا اگر کوئی کِسی کی
کِسی کو اِس قدر اصرار کیوں ہے

بھروسا ہے اگر اپنے پہ حیرت
تو پھر یہ منتِ اغیار کیوں ہے

عبدالمجید حیرت

"سُماری"

(ڈائری کا ایک ورق)

بعض لوگوں کو یہ مرض ہے کہ وہ خواہ مخواہ نئی تہذیب میں کیڑے ڈالنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ پُرانی دقیانوسی تہذیب جسے تہذیب کے نام سے موسوم کرنا بھی دراصل بدتہذیبی میں داخل ہے "تہذیبِ جدید" کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتی۔ لیکن سادہ لوحی اور خوش فہمی کا کیا علاج ؛ اکثر لوگ آہیں بھرتے ہوئے یہ کہتے سُنے جاتے ہیں کہ "پُرانا زمانہ کیا ہی اچھا تھا۔ پُرانے بزرگوں کا کیا کہنا، وُہ تو وضعداری اور تہذیب کے مجسّمے تھے۔ بیسویں صدی! توبہ!! توبہ!! اسے تہذیب سے کیا تعلق ؛ صاحب! زمانے سے مروّت تو بالکل اُٹھ ہی گئی ہے۔ خون سفید ہوگئے ہیں۔ شرم وحیا مفقود ہے۔ دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے"۔ اِس طویل اور دلدوز مرثیے کا اختتام ہمیشہ ان الفاظ پر ہوتا ہے " دُنیا روز بروز قعرِ مذلّت میں گرتی جا رہی ہے۔ تمام انسان (ہمیں چھوڑکر) جوہرِ انسانیت سے عاری واقع ہوئے ہیں اور اللہ ہی جانتا ہے، اس کا انجام کیا ہوگا"۔

لیکن پُرانے زمانے کو "سُنہری زمانہ" کہنے والوں نے کبھی اِس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ جس طرح ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوسکتی اِسی طرح ہر "سُنہری" چیز بھی دراصل سُنہری نہیں ہوتی۔ آخر کسی چیز کے سنہری ہونے کا معیار کیا ہے ؛ یہی نا کہ ہمیں اس سے زیادہ سے زیادہ فواید حاصل ہوں۔ مادّی و روحانی کی بے معنی بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ رُوح اور مادّہ کے امتزاج ہی سے پیکرِ انسانی تیار کیا گیا ہے، اگر جسدِ بے رُوح کسی کام کی چیز نہیں تو خالی رُوح بھی کوئی قدر وقیمت نہیں رکھتی۔ رُوح اور مادہ لازم وملزوم ہیں اس لئے مادی فواید بھی اتنے ہی اہم ہیں جتنے رُوحانی۔ اب اگر یہ معیار صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے تو پھر پُرانا زمانہ سُنہری نہیں بلکہ سیاہ زمانہ کہلانے کا مستحق ہے۔ آج سے ایک صدی پہلے جو کام سینکڑوں روپے صرف کرنے پر بھی نہیں نکل سکتا تھا آج کل ایک آدھ دلفریب جملہ یا دو چار دلکش الفاظ کہہ دینے سے نکل آتا ہے۔ اُن دنوں ہر خدمت کا صلہ نقد یا جنس کی صُورت میں ادا کرنا پڑتا تھا۔ آج کل اِن جھمیلوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ کسی نے آپ پر احسان کیا ہے یا کوئی آپ کے کسی کام آیا ہے ایک دفعہ مسکرا کر "تھینک یُو" کہہ دیجیے۔ چلیئے قصّہ ختم ہوُا۔ اور سچ پوچھئے تو اصلی رُوحانیت بھی یہی ہے۔ جو مزہ بے غرض خدمت میں ہے اور جو رُوحانی مسرّت "تھینک یُو" سُننے سے ہوتی ہے، روپے

پیسے کا جھگڑا درمیان میں آجائے تو اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جو ترنم "تھینک یو" میں ہے وہ روپوں کی جھنکار میں کہاں؟ اور صرف ایک لفظ پر منحصر نہیں نئی تہذیب نے ہمیں کئی اور لفظ دیئے ہیں جن سے وہ وہ کام نکل سکتے ہیں جو پرانے زمانے میں نہ سیم و زر سے نکل سکتے تھے نہ خنجر و سناں سے۔ مثلاً "ساری" Sorry کے لفظ ہی کو لیجیے۔ تاریخ اس افسوسناک حقیقت کی شاہد ہے کہ پرانے زمانے میں عرب قبائل معمولی معمولی باتوں پر ایک دوسرے سے الجھ پڑتے تھے۔ دو مختلف قبیلوں کے دو سوار اپنے اپنے گھوڑے کو لے کر کسی چشمہ پر پانی پلانے گئے۔ ایک گھوڑے نے ذرا بے صبری دکھائی اور دوسرے گھوڑے کو دعوت دیئے بغیر پانی پینا شروع کر دیا۔ بس پھر کیا تھا تلواریں میانوں سے نکل آئیں۔ نیزے فضا میں چمکنے لگے ایک سوار وہیں ڈھیر کر دیا گیا اور اس کے زخمی گھوڑے نے واپس جا کر اس کے قبیلے کو زبانِ حال سے اپنے بہادر آقا کے قصاص کے لئے ابھارا۔ "دانت کے بدلے دانت" اور "آنکھ کے بدلے آنکھ" کے اصول پر ایمان رکھنے والے عرب رجز پڑھتے ہوئے گھروں سے نکل کھڑے ہوتے۔ اور مؤرخ کہتے ہیں کہ قبائل کی اس قسم کی باہمی لڑائیاں بیسیوں سال جاری رہتی تھیں۔ حالانکہ اگر وہ بہادر سوار تہذیب کی مبادیات سے بھی واقف ہوتے تو ان میں سے کوئی بھی اپنا گھوڑا آگے نہ بڑھاتا بلکہ "آپ پہلے"۔ "نہیں صاحب آپ پہلے"۔ "نہیں قبلہ میں یہ گستاخی کیسے کر سکتا ہوں آپ پہلے"۔ "اجی مجھے گنہگار نہ کیجیے آپ پہلے" کی گردان شروع ہو جاتی۔ اور اگر کوئی بدتمیز گھوڑا پیاس کی شدت سے مجبور ہو کر پانی میں منہ ڈال دیتا تو اس کا مالک فوراً "ویری ساری" کہہ دیتا۔ ان دو لفظوں میں اتنا جادو ہے کہ نہ تلواریں میانوں سے باہر نکلتیں نہ نیزے فضا میں چمکتے نہ ایک سوار کی لاش زمین پر تڑپتی ہوئی نظر آتی اور نہ اس کا زخمی گھوڑا اس کے قبیلے کو قصاص پر ابھارتا بلکہ دونوں سوار اپنے اپنے گھوڑوں کو پانی پلانے کے بعد اکٹھے گاؤں کو لوٹتے اور راہ میں اس مسئلہ پر بحث و تمحیص کرتے جاتے کہ کیا گھوڑوں کو آداب مجلس سکھانے کے لئے کوئی مدرسۂ شبینہ نہیں کھولا جا سکتا؟

لیکن اس کو کیا کہا جائے کہ ہم لوگوں کی زندگی کا اصول "دور کے ڈھول سہانے" پر مبنی ہے۔ ہم بیسویں صدی کو کوستے ہیں اور پندرھویں صدی کو تہذیب کے عروج کا زمانہ گردانتے ہیں۔ پندرھویں صدی کے لوگ اپنے زمانے کو تاریک زمانہ سمجھتے تھے اور ہماری طرح کفِ افسوس مل مل کر کہا کرتے تھے کہ اے کاش ہم تیرھویں صدی میں پیدا ہوئے ہوتے! یہ "پیچھے دیکھنے کی عادت" ہی ہماری قنوطیت اور یاس انگیزی کا سبب ہے۔ اس کا نفسیاتی اثر یہ ہوا ہے کہ ہمیں تہذیب جدید کی کوئی خوبی بھی دکھائی نہیں دیتی۔ دور کیوں جائیے کل تک خود ہمارا یہی حال تھا۔ ہم ہر وقت پرانے زمانے کی شان میں قصیدے پڑھتے رہتے تھے۔ اور یہ بات ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتی تھی کہ کبھی ہم بھی نئی تہذیب کی خوبیوں کے معترف ہوں گے۔ لیکن آج کچھ اس قسم کے واقعات پیش آئے ہیں کہ ہمیں اپنی دقیانوسیت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیرباد کہنی پڑی ہے۔

صبح چار بجے کے قریب آنکھ کھل گئی۔ دوبارہ سونے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی کیونکہ ہمارے پڑوس میں ایک صاحب کے جسم میں تان سین کی رُوح حلول کئے ہوئے تھی اور وہ اپنے بھدّے سُروں میں دادِ موسیقی دے رہے تھے۔ غالب کی ایک آدھ غزل "ذبح" کرنے کے بعد وہ "مطمئن" ہو جاتے تو خیر ایک بات بھی تھی مگر وہ تو آج یہ تہیہ کئے بیٹھے تھے کہ متقدمین و متاخرین میں سے کوئی بھی بچ کر نہ جانے پائے۔

میرا دماغ تعزیرات ہند کے اس نقص پر کھول رہا تھا کہ اس میں تین بجے رات کو اُٹھ اُٹھ کر گانے والے کریہ الصّوت "مغنی" کے لئے حبسِ دوام بعبور دریائے شور کی سزا کیوں تجویز نہیں کی گئی۔ آج کل نوجوانوں کا دماغ ضرورت سے زیادہ آوارہ گرد واقع ہوا ہے۔ سلسلۂ خیال کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ گھڑی نے پانچ بجائے تو ہم یہ سوچ رہے تھے کہ آخر ایم۔ اے پاس کرنے کا فائدہ ہی کیا ہے؟ اس کی بجائے رس گلوں کی ایک اَپ ٹُو ڈیٹ اور فیشن ایبل دُکان کیوں نہ کھول لی جائے۔ بلا سے گاہک آئیں یا نہ آئیں خود پیٹ بھر کر رس گلے کھانے کا موقع ملے گا۔ اتنے میں دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔ انگریزی تہذیب کے دلدادہ لوگ اسے "ناک" کہتے ہیں۔ ہم نے کہا "تشریف لائیے"۔ دروازہ کھلا۔ ایک صاحب اندر داخل ہوئے لیکن ہمیں دیکھتے ہی کچھ گھبرا سے گئے۔ اسی اضطراب میں ان کے منہ سے نکلا "اوہ اِساری" اور پچھلے پاؤں لوٹ گئے۔ میں اس "ساری" کی شانِ نزول نہ سمجھ سکا۔ میں نے آواز دی "اجی صاحب ٹھہریئے تو ـــ بات تو سُنتے جائیے"۔ بجائے اندر آ گئے لیکن بدستور گھبرائے ہوئے تھے۔ میں نے کہا "تشریف رکھیے۔ آخر آپ اس قدر گھبرا کیوں گئے؟"

کہنے لگے "میں سمجھا اختر صاحب اس کمرہ میں رہتے ہیں۔ میں نے آپ کو ناحق تکلیف دی۔ میں بہت "ساری" ہوں"

میں نے کہا "آپ خواہ مخواہ "بہت ساری" ہو رہے ہیں۔ مجھے تو قطعاً کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ اور آپ کے آنے سے پہلے جو تکلیف میں اُٹھا چکا ہوں اس کے مقابلے میں تو یہ تکلیف عین راحت ہے ـــــ یہ تو بتائیے کہ ان صاحب کا جو ہر وقت گاتے رہتے ہیں کوئی علاج کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟"

ہمارے نئے دوست بھی "تان سین" صاحب سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ ہم دونوں نے انہیں خوب ہی صلواتیں سنائیں اور اس طرح دل کی بھڑاس نکال لی۔

دس بجے کالج پہنچنا تھا۔ خاں صاحب نو بجے ہی آ دھمکے "ارے میاں تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے؟ سُستی کی بھی کوئی حد ہونی چاہیئے"۔

میں نے کہا "خاں صاحب ابھی تو نو ہی بجے ہیں۔ پانچ منٹ میں کالج پہنچ سکتے ہیں۔ آپ ابھی سے گھبرا گئے؟

ارشاد ہُوا" چند منٹ پہلے چلے جاؤ گے تو کونسی قیامت آجائے گی۔ اب اُٹھو گے یا مجھے کان پکڑ کر اُٹھانا پڑے گا۔"
ناچار ہم نے کپڑے بدلے۔ سائیکل لی اور خان صاحب کے ساتھ کالج کو چل پڑے۔

پچھلے ہفتے ہمارے ایک دوست نے ہمیں یہ طعنہ دیا تھا کہ تمہاری قوتِ مشاہدہ بہت کمزور ہے۔ وجہ یہ کہ ہم انہیں نہیں بتاسکے تھے کہ چوبُرجی کے سامنے چارہ بھی بکتا ہے یا نہیں؛ ہم نے لاکھ کہا کہ چارے کی فروخت کو ہم سے کیا تعلق۔ لیکن وہ یہی فرمائے جاتے تھے کہ انسان آنکھیں کھول کر چلے تو ہر چیز خود بخود نظر آجاتی ہے۔ ہم نے سوچا چلو آج" آنکھیں کھول کر" چلیں۔ پھر کبھی کوئی بات پُوچھ بیٹھے تو جواب دے سکیں گے۔

چوراہے پر مُڑتے ہی دائیں ہاتھ ایک لیڈی ڈاکٹر رہتی ہیں۔ سامنے ایک کمپنی کا دفتر ہے۔ اس سے آگے لڑکیوں کا ایک کالج ہے۔ بائیں ہاتھ چھڑکاؤ کرنے والی ایک موٹر کھڑی تھی۔ خان صاحب بولے" یہ تم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہو؟ ذرا تیز چلاؤ سائیکل کو۔" مَیں نے کہا" خان صاحب ہم" آبزرویشن Observation کر رہے ہیں، سُنا آپ نے؛ مشاہدہ ہو رہا ہے مشاہدہ!"

خانصاحب کہنے لگے" ارے احمق کبھی اس طرح بھی مشاہدہ ہُوا ہے؛ ہمارے ساتھ کسی دن کالج سے بھاگو پھر بتائیں گے تمہیں" آبزرویشن" کیسے ہُوا کرتی ہے۔"

مَیں نے کہا" خان صاحب وہ تو بعد میں دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو یہ یاد رکھیئے کہ ہمارے دائیں ہاتھ کینارڈ کالج ہے اور بائیں ہاتھ یونیورسٹی گراؤنڈ میں وہ ننگ دھڑنگ لالہ جی جنہوں نے چھ انچ لنگوٹی سے ستر ڈھانکنے کی ناکام کوشش کی ہے، غالباً" سن باتھ" فرما رہے ہیں۔"

" ارے میاں ادھر دیکھو اس کُتّے کی ذہنیت کتنی مجرمانہ واقع ہوئی ہے۔"

بات یہ تھی کہ میونسپلٹی نے ایک جگہ یہ نوٹس لگا رکھا تھا۔

" اس جگہ پیشاب کرنا منع ہے۔ خلاف ورزی کرنے والا حوالۂ پولیس کیا جائے گا۔"

مین اس نوٹس پر ایک کُتا اپنے" مخصوص انداز" میں ایک ٹانگ اُٹھائے" شاشیدن" کی گردان کر رہا تھا۔ ہمارے خان صاحب کے لئے یہ منظر کچھ ایسا جاذبِ توجہ تھا کہ سائیکل روک وہیں کھڑے ہو گئے۔ اور کہنے لگے۔

" دیکھا یہ کُتا کتنا دلیر ہے۔"

" ہاں صاحب یہ وزیر روشن ہیں قانون شکنی کر رہا ہے۔"

" اس کا سبب بھی سمجھے؟"

"آپ ہی سمجھا دیجئے!"

"تم تناسخ کے قایل ہو یا نہیں؟"

"اس کا یہاں کیا تعلق؟"

"یہی تو بات ہے۔ اِس کُتّے نے پچھلے جنم میں سیول نافرمانی کی تھی اور دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرتے ہُوئے گرفتار ہُوا تھا، اب یہ دفعہ ۳۴ کو توڑ رہا ہے"۔

یہ کہہ کر خان صاحب نے میرے مُسکرانے کا انتظار کئے بغیر خود بخود ایک فلک شگاف قہقہہ لگا دیا۔ میں سائیکل روکے بایاں پاؤں زمین پر ٹکائے کھڑا تھا۔ خانصاحب کا ایک ہاتھ اپنے سائیکل کے ہینڈل پر تھا دُوسرا میرے کندھے پر۔ یکایک ایک نہایت کرخت "ساری" کی آواز اس حالت میں سُنائی دی کہ مَیں حالتِ سجُود میں زمین پر پڑا تھا۔ مجھ پر میرا سائیکل تھا، اس کے بعد خان صاحب کا سائیکل اور سب سے آخر میں خان صاحب کا نمبر تھا۔ دو سائیکل اور اُن پر دو من کی ایک لاش میرا تو کچومر ہی نکل گیا۔ مَیں نے کپڑے جھاڑتے ہوئے کہا:۔

"خان صاحب اگر آپ اپنا توازن قایم نہ رکھ سکتے تھے تو قہقہہ لگانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟"

"کیا بکتے ہو؟"

"حضور مَیں نے یہ عرض کی کہ آپ اپنے اِردگرد دیکھ کر ہنسا کیجئے کہ کوئی غریب آپ کے قریب ہی تو کھڑا نہیں"۔

"ہم نے ایک دفعہ "ساری" کہہ دیا۔ تُم اس پر بھی مذاق کرتا ہے۔ اگر ہم قتل کرنے کے بعد بھی "ساری" کہہ دیتا تو معاملہ ختم ہو جاتا"۔

سُبحان اللہ! کیا خوب منطق ہے۔ آخر پٹھان ہی نکلے۔ ابھی تک اچھی خاصی اُردو بول رہے تھے۔ اب "ہم" اور "کہہ دیتا" پر اُتر آئے۔ اگر مَیں کچھ اور کہتا تو شاید کہیں سے چھُرا بھی نکال لیتے۔

قِصّہ مختصر ہمارا مشاہدہ ختم ہُوا اور ہم نے سائیکل کو "بھگانا" شروع کیا۔ کالج کے دروازہ میں داخل ہو رہے تھے کہ پھر ایک مہیب "ساری" کی آواز کانوں میں پڑی اور ساتھ ہی ایک سردار صاحب کا سائیکل اس زور سے ہمارے سائیکل کے ساتھ ٹکرایا کہ ہم تو ہم خان صاحب بھی جو ہمارے کندھے پر ہاتھ رکھے چلے آرہے تھے زمین پر جا رہے۔ مَیں تو چُپ کا رہا کیونکہ مجھے ابھی ابھی یہ سبق دیا گیا تھا کہ "ساری" کہہ دیا جائے تو قتل بھی معاف ہو جاتا ہے۔ اِس لئے میں نے احتجاج کرنا مناسب نہ سمجھا لیکن خان صاحب اُس سبق کو جو وہ چند منٹ پہلے مجھے دے چکے تھے بھُول گئے اور اُنہوں نے زمین سے اُٹھ بغیر کسی تمہید کے سردار صاحب کے ایک دو لگا دیں۔ اُنہوں نے بھی جوابی حملہ کرنا چاہا لیکن جب یہ دیکھا کہ مدِ مقابل چھ فٹ لمبا اور تین

فٹ چوڑا جوان ہے تو آپ نے خیریت اسی میں سمجھی کہ عدم تشدد کے سنہری اصول سے کام لیا جائے۔ اور کہنے لگے "خاں صاحب میں نے دیکھا ہی نہیں۔ بائی گاڈ میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔"

ادھر خان صاحب گرج رہے تھے "اگر تم جان بوجھ کر ایسا کرتا تو ہم تم کو زندہ نہ چھوڑتا۔ بیوقوف کو بریک باندھنا بھی نہیں آتا اور کہیں سائیکل سوار بنا بیٹھا ہے۔ گدھا کہیں کا!"

میں نے کہا "ارے یار چھوڑو بھی، اس نے تو پہلے ہی 'سوری' کہہ دیا تھا، تم نے شاید سنا ہی نہیں۔"

"چپ رہو جی۔ تم بیچ میں مت بولو۔"

خیر دوسرے لڑکوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا، ورنہ خان صاحب کی نیت نیک نظر نہیں آتی تھی۔

کالج سے چھٹی ہوئی تو ہم نے خان صاحب سے کہا "آج آپ مجھے تو معاف کیجیے۔ اکیلے ہی واپس چلے جائیے۔ مجھے دو بجے ایک دوست کے ہاں جانا ہے۔ نہایت ضروری کام ہے۔"

ان سے اجازت لے کر اپنے دوست کے ہاں پہنچے۔ ملاقات کا وقت پہلے سے مقرر ہو چکا تھا اس لئے خیال تھا کہ وہ میرا انتظار فرما رہے ہوں گے لیکن گھنٹی بجنے پر ان کے نوکر نے کھڑکی میں سے گردن نکالی اور کہنے لگا "صاحب ابھی باہر گئے ہیں، وہ کہہ گئے تھے کہ آپ دوبارہ پانچ بجے تشریف لائیے۔" غصہ تو آیا لیکن بہت کم۔ میں نے سوچا کوئی ضروری کام پڑ گیا ہوگا ورنہ اتنا مہذب اور وضعدار آدمی یہ حرکت کیسے کر سکتا ہے کہ کسی کو دو بجے آنے کو کہے اور خود پونے دو بجے ہی گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ خیر صاحب دوستی بری بلا ہے۔ پانچ بجے ہم پھر پہنچے۔ لیکن "صاحب" ندارد۔ نوکر نے کہا "صاحب آئے تھے۔ کہتے تھے آپ کو واپس نہ جانے دینا، بہت ضروری کام ہے، میں بہت جلد واپس آجاؤں گا۔" ہم نے جی میں کہا۔ "واقعی کوئی بہت ضروری کام معلوم ہوتا ہے، انتظار کرنا چاہئیے۔" میز پر تازہ اخبار پڑا تھا۔ اگرچہ ہم صبح اخبار پڑھ کر آئے تھے، لیکن اب کسی طرح وقت تو کاٹنا تھا ہم نے دوبارہ سارا اخبار پڑھ ڈالا۔ ایک ایک اشتہار کا ایک ایک لفظ نہایت غور سے دیکھا لیکن "صاحب" کو نہ آنا تھا نہ آئے۔ ناچار اٹھ کر دیواروں پر لگی ہوئی تصویریں دیکھنی شروع کر دیں۔ یہ وہی تصویریں تھیں جنہیں میں پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا تھا لیکن اب میں نے فوٹوگرافروں کے نام پڑھنے شروع کر دیئے۔ پونے چھ بج چکے تھے لیکن ہمارے دوست کا کوئی پتہ نہ تھا۔ ہم نے کہا، پندرہ منٹ اور انتظار کرنے کے بعد چلے جائیں گے، لیکن چھ بج گئے اور وہ ابھی تک غایب ہیں۔ "چلو پانچ منٹ اور سہی اب تو آتے ہی ہوں گے۔" چھ بج کر پانچ منٹ۔ سوا چھ، چھ بج کر بیس منٹ، حتیٰ کہ پچیس۔ "صاحب" تو غایب تھے ہی اب نوکر بھی مفقود ہے۔ ہمیں سخت غصہ آ رہا تھا۔ ساڑھے چھ بجے

ہم مایوس ہو کر واپس چلے آئے۔ راستہ بھر اپنے دوست کی غیر معقولیت پر غصہ آتا رہا۔ یہ حرکت اس شخص سے سرزد ہوئی تھی جو بڑا مہذب، بڑا شائستہ اور بڑا خوش اخلاق ہے۔ ہم نے سوچا اب اگر یہ شخص ہزار بار بلائے تب بھی نہ جاؤں گا لیکن کم بخت دوستی کا کیا کیا جائے پھر خود بخود یہ ترمیم کر دی کہ اگر جانا ہی پڑا تو ایک سال بعد جاؤں گا . . . . نہیں ایک سال زیادہ ہے چھ ماہ ٹھیک رہیں گے۔ گھر پہنچ کر یہ چھ ماہ بھی گھٹتے گھٹتے ایک ماہ رہ گئے تھے۔

مَیں سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ نوکر نے کہا "کوئی صاحب آپ کو ٹیلیفون پر بُلا رہے ہیں"

مَیں نے پوچھا "کوئی نام بھی بتایا یا نہیں؟"

"جی نہیں۔ آپ خود ہی جا کر بات کر لیجیے۔"

ٹیلیفون پر پہنچے "کوئی صاحب" غالباً سو گئے تھے کیونکہ دس بار "ہیلو" کہنے کے بعد۔ ایک باریک سی "ہیلو" سنائی دی۔

مَیں نے کہا، "کون صاحب ہیں؟"

"مَیں ہوں ——"

ہمارے وُہی دوست تھے۔

"کہیے پھر مکان پر حاضر ہونے کا حکم ہے؟"

"اچھا تو تم پانچ بجے بھی آئے تھے۔ تمہیں بڑی تکلیف ہوئی ہوگی۔"

"جی آیا تو تھا۔ تکلیف ہوئی یا نہیں یہ آپ خود ہی سمجھ لیجیے۔"

"ساری . . . . ."

مَیں نے فون بند کر دیا۔ مَیں قتل معاف کر سکتا ہوں لیکن اتنی بڑی بدتمیزی محض ایک "ساری" پر معاف نہیں کی جا سکتی!

حمید نظامی

کیلاش کنول

تراجم از پیامِ مشرق — حسبِ اجازت علامہ اقبالؒ

(۴۰)

کنشت و مسجد و بُت خانہ و دَیر
جُز این مُشتِ گلے پَیدا نہ کردی
زحکمِ غیر نتواں جُز بدل رست
تو اے غافل دِلے پیدا نہ کردی

(ترجمہ)

مٹھ، مسجد، گرجے اور مندر
بس یہی خاک کے ڈھیر بنائے
دِل ہی چھُڑائے تو یہ سب چھُوٹے
دِل ترا غافل بجھتا جائے

۴۱

نہ پیوستم درین بُستاں سرا دل
زبندِ این و آن آزادہ رفتم
چو بادِ صُبح گردیدم دمے چند
گلاں را آب و رنگے دادہ رفتم

ترجمہ

دِل نہ لگاؤں اِس اُپون سے
دُور رکھوں یہ، وُہ، سب من سے
جیسے ہوا، مَیں آؤں سویرے
رنگ دوں پھولوں میں، جاؤں چمن سے

۴۲

بخود باز آورد رندِ کہن را
مئے برنا کہ من در جام کردم
مرس مے چوں مغانِ دور پیشیں
زچشمِ مستِ ساقی وام کردم

ترجمہ

یہ نئی مدرا میرے من کی
ہوش میں مَن موجی کو لائے
ست گُرنین سے رِشیوں کی بھاتی
پریم کا رس ہم بھی پی آئے

(۴۳) — (ترجمہ)

سفالم را مئے او جامِ جم کرد
درونِ قطرہ ام پوشیدہ یم کرد
خرد اندر سرم بتخانہ ریخت
خلیلِ عشق دیرم را حرم کرد

پریم نے اُس کے سنوارا جیون
اَمرت سے بھرپور کیا مَن
گیان نے موہ کا دَرپَن ڈھالا
پریم نے توڑ دیا یہ دَرپَن

(۶۰) — (ترجمہ)

میا را بزم بر ساحل کہ آنجا
نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش درآویز
حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

کر نہ سبھا ساگر کے کنارے
ہیں مدھم واں جیون کے سُر
پھاند پڑا اور بھڑ جا لہروں سے
یہی اَمرت جیون کا ہے گر

وہاں

(۷۶) — (ترجمہ)

بپائے خود مزن زنجیرِ تقدیر
تہِ ایں گنبدِ گرداں رہے ہست
اگر باور نداری خیز و دریاب
کہ چوں پا وا کُنی جولاں گہے ہست

ڈال نہ پیر میں بھاگ کی بیڑی
کھُلی ہے راہ آکاش کے نیچے
چل تو سہی میدان پڑا ہے
کوئی نہ روکے آگے پیچھے

مقبول احمد پوری

گداگر

ایک گداگر بازار کے ایک نکڑ پر کھڑا صدا لگا رہا ہے
"کچھ راہِ خدا دے جا۔ جا تیرا بھلا ہوگا۔" اتنے میں مغربی لباس
پہنے ایک نوجوان نہایت کرّوفر کے ساتھ پاس سے گزرتا ہے۔

گداگر۔ (لپک کر) بابا کچھ بھوکے فقیر کو بھی ——

نوجوان (جھٹکتے ہوئے) معاف کرو اس وقت

گداگر۔ کل سے بھوکا ہوں بابوجی! کھانا کھلا دیجیے۔ دُعا دُوں گا۔

نوجوان۔ سب یہی کہتے ہیں "بھوکا ہوں، کل سے کچھ نہیں
کھایا۔" تم لوگوں کا یہی وتیرہ ہے۔

گداگر۔ وتیرہ نہیں بابوجی۔ حقیقت ہے، اکثر بھوکے
ہی ہوتے ہیں ہم غریب۔

نوجوان۔ تو کچھ کام کرو

گداگر۔ بھیک جو مانگتے ہیں

نوجوان۔ ہاتھ پھیلاتے شرم نہیں آتی تمہیں۔

گداگر۔ اور کچھ کام بھی تو نہیں آتا ہمیں

نوجوان۔ کچھ سیکھو تو آئے

گداگر۔ سکھائے کون؟

نوجوان۔ دھوبی کا سارہ جاتا ہے، سکھائے کون!
(پھر ناصحانہ انداز میں) دیکھو میاں دوسروں پر بوجھ ڈالنا
اچھا نہیں۔ ہماری طرح کما کر کھاؤ۔

گداگر۔ اس سنسار کا یہی طریقہ چلا آیا ہے بابوجی! کچھ لوگ
کماتے ہیں اور خود ہی کھاتے ہیں اور کچھ عالی ہمت اپنی کمائی
سے ہم جیسے محتاجوں کا پیٹ پالتے ہیں۔ اور کچھ ہم جیسے نادار
دُوسروں پر بوجھ بنے رہتے ہیں۔ اور ہر ایک کو کام بھی تو
نہیں مِلتا بابوجی۔

نوجوان۔ یہ بہانہ ہے تم لوگوں کا۔ کام کرنے سے جی چُراتے
ہو، مانگنے کا چسکا ہو گیا ہے تمہیں! کاہلی تمہاری ہڈیوں
میں رچ گئی ہے۔ تم سے جبرًا کام لینا چاہیے۔ یہی
تمہارا علاج ہے۔

گداگر۔ ٹھیک فرمایا آپ نے بابوجی۔ واقعی یہ کام تو آپ
خُوب کر سکتے ہیں۔ اختیار والے جو ہوئے قسمتوں کے بنانے
والے۔ باقی نہ آپ ہمیں روٹی دے سکتے ہیں نہ کام کبھی
آپ نے سوچا ہے کہ ہم بدبخت اگر بھیک نہ مانگیں گے
تو چوری کریں گے ڈاکا ڈالیں گے۔ مکروفریب سے کام لیں گے
آخر اس دوزخ کو تو بھرنا ہوگا کسی نہ کسی طرح بابوجی!

نوجوان کا ہاتھ خود بخود جیب کی طرف بڑھتا ہے اور
وہ چند پیسے نکال کر گداگر کے ہاتھ پر رکھ کر آہستہ سے آگے بڑھ جاتا
ہے۔ اُس کے بُشرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس نے اس معاملہ پر
اس زاویۂ نگاہ سے کبھی غور نہ کیا تھا اور یہ کہ اُس کا موجودہ طرزِ عمل اس
• بیماری کا شافی علاج نہیں ہو سکتا۔

گداگر پھر صدا لگاتا ہے، "کچھ راہِ خدا دے جا۔ جا تیرا بھلا ہوگا۔"

محمد حسین غازی

نعت

حامد بھائی!

السلام علیکم! چند نعتیں لکھی ہیں جو عنقریب کتابی صورت میں شائع ہو رہی ہیں۔ ایک نعت "ہمایوں" کے لئے بھیج رہا ہوں۔ جو گذشتہ عید میلاد النبی کی تقریب پر اسلامیہ سکول ہوشیارپور کے مشاعرہ میں پڑھی گئی تھی۔ اُمید ہے میری اس کوشش کو آپ پسند فرمائیں گے۔

نیاز کیش قیس

اے قیس! انبیاء میں ہے یہ شانِ مصطفےٰؐ
قرآں میں خدا ہے ثنا خوانِ مصطفےٰؐ

اللہ رے یہ رتبۂ عرفانِ مصطفےٰؐ
قرآنِ پاک مطلعِ دیوانِ مصطفےٰؐ

دونوں جہاں کی اُس کو میسر ہیں نعمتیں
جو خوانِ مصطفےٰؐ پہ ہے مہمانِ مصطفےٰؐ

محتاج ہی نہیں ہیں کسی خضرِ راہ کا
جبتک ہے میرے ہاتھ میں دامانِ مصطفےٰؐ

محشر کے روز اُمّتِ عاصی کی مغفرت
ارمانِ مصطفےٰؐ ہے یہ ارمانِ مصطفےٰؐ

سائل ہیں اُس کے در پہ زمانے کے بادشاہ
جس کو ملا ہے رتبۂ دربانِ مصطفےٰؐ

کاٹینگے جس قدر اسے اعدائے خیرہ سر
پھولے پھلے گا اور گلستانِ مصطفےٰؐ

سچ یہ ہے سو امیروں کا وہ اک امیر ہے
پائی ہے جس نے دولتِ ایمانِ مصطفےٰؐ

پڑھتا ہوں جب میں نعت تو کہتے ہیں اہلِ دل
اے قیس! تو ہے بلبلِ بستانِ مصطفےٰؐ

امرچند قیس امرتسری

اوراقِ پارینہ

انگریزی زبان اور مسلمان

ہندوستان میں پہلے پہل انگریزی زبان کی تعلیم کا رواج ہوا تو بعض دقیانوسی مُلاؤں نے اس کی سخت مخالفت کی جس کی وجہ سے مسلمان "یارانِ تیز گام" سے بہت پیچھے رہ گئے۔ سر سیّد احمد مرحوم نے اس غلط نظریئے کا ازالہ جس تندہی اور خلوص کے ساتھ کیا اس کی تفصیل حاصل ہے۔

قارئین "ہمایوں" کی دلچسپی کے لئے "علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ" مؤرخہ، رنومبر ۱۸۸۵ء سے دو فارسی قطعے ذیل میں نقل کرتا ہوں جن میں ایک بزرگ مولوی صفدر حسین صاحب نے تغزّل کے رنگ میں مسلمانوں کی "انگریزی دشمنی" کا رونا رویا ہے۔ ان قطعات سے جہاں انگریزی زبان کی طرف سے مسلمانوں کی بیگانگی کا اظہار ہوتا ہے، وہاں اس بات پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اُس زمانے میں رنگِ تغزّل زندگی کے ہر شعبے پر حاوی تھا یہاں تک کہ پیرایۂ طنز میں پند و نصائح کے لئے بھی اسی کا دامن پکڑا جاتا تھا۔ (ح-ہ)

جوانی

زہے گلشنِ پُر بہارِ جوانی | زہے جنتِ رنگ بارِ جوانی
زہے قسمتِ کامگارِ جوانی | فدائے جوانی، نثارِ جوانی

ہر اک شے میں ہے دلستانی کا عالم | ہر اک چیز پر ہے جوانی کا عالم
خزاں میں بھی ہے گلفشانی کا عالم | فدائے جوانی، نثارِ جوانی

ہر اک دل میں گڑنے لگی ہیں نگاہیں | ہر اک رُخ پہ پڑنے لگی ہیں نگاہیں
حسینوں سے لڑنے لگی ہیں نگاہیں | فدائے جوانی، نثارِ جوانی

غم و رنج میں بھی خوشی کا سماں ہے | بیاباں بھی مثلِ چمن گلفشاں ہے
زمیں بھی جواں آسماں بھی جواں ہے | فدائے جوانی، نثارِ جوانی

خوشی ہی خوشی شب سے لیکر سحر تک | طرب ہی طرب دل سے لیکر جگر تک
فقط حُسن ہی حُسن حدِ نظر تک | فدائے جوانی، نثارِ جوانی

نظر ہر طرف کیف برسا رہی ہے | جدھر دیکھئے بیخودی چھا رہی ہے
فضا وجد میں ہے، ہوا گا رہی ہے | فدائے جوانی، نثارِ جوانی

وُہ پیہم حسینوں کی نظروں کا پڑنا | وُہ دلکش اداؤں کا ہر دل میں گڑنا
وُہ ضد اور وہ ہٹ وُہ مچلنا وُہ اڑنا | فدائے جوانی، نثارِ جوانی

نذرِ دولتِ شادمانی لُٹانا | بلا خوف جنسِ جوانی لُٹانا